دینی و عصری تعلیمی اداروں کے لئے اسلامی تاریخ کا

مُستند نِصاب

جلد اوّل

آئینہ تاریخِ اُمت

رنگین نقشوں کے ساتھ











بایماء

شیخ الاسلام جسٹس (ر) مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

کاوش

مولانا محمد اسماعیل ریحان

المنہل پبلشرز

Al Manhal Publishers

آئینہ تاریخِ امت

سن اشاعت ۱۴۴۶ھ۔ 2024ء

جلد اول

(پہلا ایڈیشن)

کاوش
مولانا محمد اسماعیل ریحان

78222

ادارۃ النور
021-34914596, 0324-2855000
idaratunnoor@gmail.com

0321-3135009
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com
admin@almanhalpublisher.com

فہرستِ مضامین

یہ کتاب کیوں مرتب کی گئی؟ 27
عرضِ مؤلف 29
اس کتاب کو کیسے پڑھایا جائے؟ 32
علامات ورموز اور حوالوں کی مراجعت کے لیے اشارات 35
مقدمہ 36
یونٹ 1.1: مبادیاتِ تاریخ 37
تاریخ کی لغوی واصطلاحی تعریف 37
موضوع 37
غرض وغایت 37
تاریخ کے فوائد 38
تاریخ اور دیگر علوم میں فرق 39
خلافِ اصول تاریخ پڑھنے کے نقصانات 39
خلاصہ کلام 40
تاریخ کی تاریخ 41
تقویم 42
کتب تاریخ اور ان کے مؤلفین 43
تاریخ خلیفہ بن خیاط 44
تاریخ طَبَری 44
الکامل فی التاریخ 45
تاریخ الاسلام 46
البدایة والنهایة 47
تاریخ ابنِ خلدون 48
تاریخ الخلفاء 48
تاریخ نگاری کے مآخذ 49
تاریخ نویسی کے انداز 50
واقعات کی منطقی ترتیب 50
خبریت کے چھ بنیادی سوال 50
تاریخی روایات کی تحقیق 51
عدالتِ صحابہ اور تاریخی روایات 51
صحابہ معصوم نہیں مگر محفوظ ہیں۔ 52
طعنِ صحابہ پر مشتمل روایات کی تحقیق کیوں ضروری ہے؟ 53
تاریخی روایات کی جانچ پڑتال۔ راویوں اور روایات کے درجات 53
روایت کے درجات، صحیح، حسن، ضعیف 54
طعنِ صحابہ پر مشتمل ضعیف روایات 54
طعنِ صحابہ پر مبنی صحیح روایات کو مانا جائے گا یا نہیں؟ 54
تاریخ کی ضعیف روایات کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کا پیمانہ 55
حدیث اور تاریخ میں فنی حیثیت سے فرق 56
سند کی تحقیق کب لازمی ہے؟ 57

مشہور تاریخی راویوں کا تعارف	57
محمد بن اسحاق رحمہ اللہ (م ۱۵۱ھ)	58
عمر بن شَبّة البصری رحمہ اللہ (م ۲۶۲ھ)	58
ابو مخنف، لوط بن یحییٰ: (م ۱۵۷ھ)	58
محمد بن سائب کلبی (م ۱۴۶ھ)	58
ہشام بن محمد کلبی (م ۲۰۴ھ)	58
محمد بن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ)	58
ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ (م ۱۲۴ھ)	59
ابوالحسن المدائنی علی بن محمد رحمہ اللہ (م ۲۲۵ھ)	59
محمد بن سعد رحمہ اللہ (م ۲۳۰ھ)	59
خلیفہ بن خیاط رحمہ اللہ (م ۲۴۰ھ)	59
سیف بن عمر (م ۱۸۰ھ)	59
زبیر بن بکار (۱۷۲ھ تا ۲۵۶ھ)	59
علم سیرتِ نبویہ کا تعارف	60
علم سیرت کے فوائد	61
سیرتِ نبویہ کی تدوین۔ علم سیرت اور علم تاریخ میں تعلق	61
سیرت نگاری کے مواد کے ذرائع	62
سیرت نگار	62
عروہ بن زبیر رحمہ اللہ (م ۹۴ھ)	62
ابان بن عثمان بن عفان رحمہ اللہ (م ۱۰۵ھ)	62
وہب بن منبہ رحمہ اللہ: (م بعد ۱۱۰ھ)	62
عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری رحمہ اللہ (م ۱۲۱ھ)	63
ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ (م ۱۲۴ھ)	63
موسیٰ بن عُقبہ رحمہ اللہ (م ۱۴۱ھ)	63
محمد بن اسحق رحمہ اللہ (م ۱۵۱ھ)	63
معمر بن راشد رحمہ اللہ (م ۱۵۴ھ)	63
محمد بن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ)	64
عبد الملک بن ہشام رحمہ اللہ: (م ۲۱۳ھ)	64
ابن حِبّان رحمہ اللہ: (م ۳۵۴ھ)	64
محمد بن سعد رحمہ اللہ (م ۲۳۰ھ):	64
امام محمد بن عیسیٰ الترمذی رحمہ اللہ (م ۲۷۹ھ)	64
محمد بن جریر الطبری رحمہ اللہ (م ۳۱۰ھ)	64
مشق	65
حصہ اول: سیرتِ نبویہ ﷺ	66
پہلا باب: انبیائے سابقین اور گزشتہ امتیں	67
یونٹ 1.2: ابتدائے کائنات اور تخلیقِ آدم	68
انسان کی دنیا میں آمد	69
شیطان کی انسان سے عداوت	69
نسلِ انسانی کی افزائش	70
بھٹکی ہوئی انسانیت اور بعثتِ انبیائے کرام	70
حضرت نوح علیہ السلام	70
حضرت ہود علیہ السلام	71
حضرت صالح علیہ السلام	71
بعثتِ ابراہیمی	71

دعوتِ ابراہیم علیہ السلام	71
حضرت اسماعیل علیہ السلام اور تعمیر کعبہ	72
انبیائے بنی اسرائیل	73
حضرت یوسف علیہ السلام	74
حضرت موسیٰ علیہ السلام	74
حضرت یوشع بن نون علیہ السلام	76
عہدِ قضاۃ اور عہدِ ملوک	76
بنی اسرائیل کی گمراہی، زوال اور غلامی	76
حضرت عیسیٰ علیہ السلام	78
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی حالت	78
مشق	80
دوسرا باب: اسلام سے قبل دنیا کی حالت	81
اہداف ومقاصد	81
یونٹ 1.3: اسلام سے قبل دنیا کی حالت	82
ہندومت	82
بدھ مت	83
ایران کی مذہبی اُفتاد	83
چین کی اعتقادی حالت	85
یورپ کی اخلاقی وروحانی ابتری	85
فلاسفۂ یونان	87
لفاظی ہی لفاظی	88
یہود گمراہی میں غلطاں	88
اہل عرب کی دینی حالت	90
عربوں کی اخلاقی حالت	92
عربوں کی شاعری	92
جزیرۃ العرب پر عنایتِ آسمانی کیوں؟	93
مشق	95
تیسرا باب: سیرت ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم	96
اغراض ومقاصد	96
یونٹ 1.4: سیرت ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم (مکی دور)	97
ولادتِ باسعادت	97
رضاعت	97
کفالت	98
پاکیزہ بچپن	98
حربِ فجار	98
حِلف الفُضول	98
کسبِ معاش	99
حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح	99
تعمیر کعبہ اور حجرِ اسود کی تنصیب	99
پہلی وحی	100
دعوت کا آغاز	101
خفیہ دعوت	101
خاندان کو دعوتِ اسلام کا حکم	101
قبیلے کو دعوتِ اسلام	102
ہجرتِ حبشہ	103

حضرت حمزہ مسلمان ہوتے ہیں	103
حضرت عمر بن خطاب کا قبولِ اسلام	104
شعب ابی طالب میں محصوری اور سماجی مقاطعہ	105
حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات	106
سفر طائف	106
سفر معراج	108
اوس اور خزرج میں اسلام کی اشاعت	109
مشق	111
یونٹ 1.5: سیرت ختم الرسل ﷺ مدنی دور	112
ہجرتِ مدینہ	112
یثرب میں استقبال	113
تعمیر مسجد نبوی اور تحویلِ قبلہ	113
مہاجرین وانصار میں عقدِ مواخاۃ (بھائی چارہ)	113
میثاقِ مدینہ	114
غزوۂ بدر	114
جہاد کی مشروعیت	115
ابتدائی سرایا اور پہلا غزوہ	115
قریشی قافلے کی آمد	116
مسلمانوں کی روانگی	116
صحابہ کرام سے مشورہ	116
میدانِ بدر میں	117
حق و باطل کی لڑائی، ابوجہل کا قتل	117
کفار کی شکست	118
غزوۂ اُحد	119
لشکرِ اسلام کی روانگی	119
میدانِ اُحد میں	119
صحابہ کی بے مثال جاںنثاری	120
ابوسفیان سے مکالمہ	122
شہدائے اُحد	122
جنگ کا نتیجہ	123
سانحۂ رجیع	123
سانحۂ بئرِ معونہ	124
غزوۂ بنی لحیان	124
غزوۂ بدر الموعد (زوالقعدہ ۴ھ)	125
غزوۂ بنو مُصطَلِق (شعبان ۵ھ)	125
غزوۂ خندق	126
خندق کی کھدائی	126
مورچہ بند لڑائی	127
کفار کی ناکام واپسی	128
صلح حدیبیہ	128
قریش سے مذاکرات، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سفارت، بیعتِ رضوان	129
صلح نامہ	129
ابوجندل رضی اللہ عنہ کی واپسی	131
عمرۂ قضا	131

یہود سے جنگیں	132
غزوۂ بنو قینقاع	132
غزوۂ بنو نضیر	133
غزوۂ بنو قریظہ	133
غزوۂ خیبر	133
وادی القریٰ کی فتح	134
فتح مکہ	135
قریش کی عہد شکنی	135
لشکرِ اسلام کی مکہ روانگی	135
مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخلہ	136
مکہ کے نواحی بت کدوں کا انہدام	137
غزوۂ حنین	137
غزوۂ طائف	138
اسلام کی عالمی دعوت	138
رومیوں سے کش مکش	139
جنگِ موتہ	140
غزوۂ تبوک	142
منافقین کی ریشہ دوانیاں	143
جنگِ اُحد میں فتنہ انگیزی	143
غزوۂ مریسیع میں منافقوں کی شرانگیزی	143
واقعۂ افک	144
غزوۂ خندق میں منافقوں کا کردار	144
فریضۂ حج کی ادائیگی	145
حجۃ الوداع	146
سفرِ آخرت	147
جیشِ اسامہ کی تیاری	147
آخری خطبہ	148
واقعۂ قرطاس	148
سانحہ وفات	150
صحابۂ کرام کی حالت	150
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خطبہ	151
مسئلہ خلافت کی اہمیت	152
تجہیز و تکفین، نمازِ جنازہ اور تدفین	152
مشق	154
یونٹ 1.6: شمائلِ حمیدہ	155
حلیہ مبارکہ	155
آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی نہیں	156
چودھویں کا چاند	156
سب سے زیادہ حسین	157
بدنِ مبارک کی خوشبو	157
اندازِ کلام	157
شرم وحیا اور ادب	158
ہاتھ نہ اُٹھایا	158
اللہ کی نافرمانی ناقابلِ برداشت	158
خادم کو اُف نہ کہا	158

اُمت کے لیے سہولت	158
لوگوں سے معاملہ	159
حسنِ انتظام	159
مجلس کا حسن و جمال	159
انبساط اور کشادہ روئی	160
تین چیزوں سے احتراز	161
اللہ کا ذکر اور خشیت	161
حرفِ آخر	161
کیا اسلام جبراً پھیلایا گیا تھا؟	162
غزوات میں جانی نقصان کتنا ہوا؟	164
اُمّہاتُ المؤمنین	165
اُم المؤمنین سَیِّدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا	165
اُم المؤمنین سَیِّدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا	167
اُم المؤمنین سَیِّدہ عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا	167
اُم المؤمنین سَیِّدہ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا	170
ہند بنت ابی اُمیہ، اُم المؤمنین سَیِّدہ اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا	171
اُم المؤمنین سَیِّدہ زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا	173
اُم المؤمنین رملہ بنت ابی سفیان، سَیِّدہ اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنہا	174
اُم المؤمنین جُوَیریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا	175
اُمّ المؤمنین سَیِّدہ صَفِیّہ بنت حُیَی رضی اللہ عنہا	176
اُم المؤمنین سَیِّدہ زینب بنت خزیمہ ہلالیہ رضی اللہ عنہا	176
اُم المؤمنین سَیِّدہ میمونہ بنت حارث ہلالیہ رضی اللہ عنہا	176
ذُرّیتِ طیّبہ	177
فرزندانِ گرامی	177
دخترانِ ذی شان	178
سَیِّدہ زینب رضی اللہ عنہا	179
سَیِّدہ رُقَیّہ رضی اللہ عنہا	180
سَیِّدہ اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہا	180
سَیِّدہ فاطمة الزهراء رضی اللہ عنہا	181
نواسے اور نواسیاں	183
سَیِّدہ زینب رضی اللہ عنہا کی اولاد	183
سَیِّدہ رُقَیّہ رضی اللہ عنہا کی اولاد	184
سَیِّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد	184
حضراتِ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما	184
مشق	187
جدول:	
اہم واقعات سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم	188
حصہ دوم: خلافتِ راشدہ	189
پہلا باب: خلفائے راشدین	190
تعارف	190
اہداف و مقاصد	190
یونٹ 1.7: خلافتِ راشدہ سے کیا مراد ہے؟	191
خلافتِ راشدہ کے لیے ایک غلط کسوٹی	192
خلافتِ راشدہ کی وجوہِ فضیلت	192
خلافتِ راشدہ خلفائے اربعہ میں محدود ہے	193

ایک شبہے کا ازالہ 195
خلفائے راشدین کی خصوصیات 196
خلافتِ راشدہ کا تعارف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے قلم سے 197
مشق 199
یونٹ 1.8: خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ 200
فضائل ومناقب 200
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر ایک نظر 201
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کچھ مناقب 201
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سانحۂ وفات اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قائدانہ کردار 202
سقیفہ بنو ساعدہ میں صحابہ کرام کی مشاورت 202
حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیعت کرنا 203
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بطور خلیفہ 204
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پہلا خطاب 204
مسئلہ فدک 205
سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور خانوادۂ صدیقی کے تعلقات 207
فتنوں کا انسداد 208
منکرین زکوٰۃ سے معاملہ 209
لشکرِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی 209
منکرین ختم نبوت سے جہاد۔ طُلَیحہ بن خُوَیلِد کے خلاف یلغار 210
مالک بن نُوَیرہ کا قتل 211
اسود عنسی کا فتنہ 213
مسیلمہ کذاب کا فتنہ 213
ایران اور شام کی مہمات 214
عراق پر فوج کشی 215
ایرانیوں سے پہلی جنگ۔ ذات السلاسل 215
مُثَنّیٰ اور وَلَجہ کے معرکے 216
اَمْغِیْشِیا کا مالِ غنیمت 216
فتح حِیرہ 216
معرکۂ عَینُ التمر 217
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دُومۃ الجَندل میں 217
فِراض کی جنگ 217
شام کی فتوحات 217
لشکروں کی شام روانگی اور خلیفہ کی تاریخی وصیت 218
شکست اور نئی حکمت عملی 219
خلیفۂ اوّل کی وفات 220
مشق 221
یونٹ 1.9: خلافت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ 222
فضائل ومناقب 222
ایران کی فتوحات 223
جنگِ جسر 223
جنگِ بُوَیب 224
جنگِ قادسیہ 224

قادسیہ تا خراسان	226
بابل، بہرشیر اور مدائن کی فتح	227
اسلامی لشکر دریائے دجلہ سے گزر گیا	228
ایک مجاہد کی کرامت	228
مالِ غنیمت	228
جنگ جلولاء	229
جنگِ نہاوند (۲۱ھ)	229
ایران اور خراسان میں عمومی فوج کشی	230
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی اور اس کی اصل وجہ	231
شام کی فتوحات	233
فحل کی جنگ	233
حمص کی فتح	233
جنگِ یرموک	234
فتح بیت المقدس	236
طاعون عمواس	238
مصر کی مہم	238
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا سانحۂ شہادت	239
آخری وصیتیں	240
تاریخ شہادت	240
مشق	241
یونٹ 1.10: خلافت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	242

فضائل ومناقب	242
خلافت کے لیے تقرر کس طرح ہوا	243
دورِ فتنہ شروع ہونے کے خدشات	243
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکمتِ عملی	244
انتظامات میں کشادگی اور وسعت	245
فتوحات	246
آرمینیا کی فتح	247
رومیوں کو شکستِ فاش	247
اسکندریہ کا معرکہ	247
ان معرکوں کی حیثیت اور مقاصد	248
افریقہ کی فتوحات	248
فتح اِصطخر	251
طبرستان کی فتح	251
یزدگرد کی موت	251
فتح نیشاپور	252
خراسان کی فتوحات	252
بحری جنگیں	253
قبرص کی فتح	254
قسطنطنیہ کا محاذ	254
قبرص کی از سرِ نو فتح	255
غزوہ ذات الصواری	255
قسطنطنیہ کی فتح کا منصوبہ	256
اندلس پر حملہ	256

یونٹ 1.11:

عبداللہ بن سبا کی سازشی تحریک 257

نئے عقائد کی تدوین 257

فتنے کے تین مراکز: کوفہ، بصرہ، مصر 258

اسلامی امراء کی کردار کشی کا منصوبہ 259

براہِ راست خلیفہ پر الزام تراشی 259

عبداللہ بن سبا شام میں 259

حضرت عثمان ؓ کا حضرت ابوذر غفاری ؓ سے معاملہ 260

ابن سبا کا اثر مصر میں 260

سازشی تحریک کا ڈھانچا 261

۳۳ ہجری کا آغاز، نئے حوادث 261

ابن سبا عراق میں 262

۳۴ ہجری۔ جب سازشی عناصر منظر عام پر آئے 262

فتنے کا عروج اور حضرت عثمان ؓ کے محتاط اقدامات 263

پروپیگنڈا اور تین جھوٹے الزام 263

حضرت عثمان ؓ پر اقربا نوازی کا الزام 264

ابن سبا کا نیا کھیل 265

حضرت عثمان ؓ کا تحقیقاتی وفد 265

حضرت معاویہ ؓ کے خدشات 266

سازشی گروہ کے نمائندے مدینہ منورہ میں 266

شورش پسندوں کی روانگی 267

مفسدین مدینہ کے باہر 268

مذاکرات اور مفسدین کی واپسی 269

فسادیوں کے اعتراضات اور ان کے جوابات 269

جعلی خط اور بلوائیوں کا دوبارہ حملہ 272

مدینہ میں ہنگامہ اور دارِ عثمان ؓ کا محاصرہ 274

حضرت عثمان ؓ نے استعفاء کیوں نہ دیا 275

حضرت عثمان ؓ نے تلوار نہ اُٹھانے کا فیصلہ کیوں کیا؟ 275

کھانے اور پانی کی بندش 276

خلیفہ ثالث کو جان سے زیادہ حج کے انتظامات کی فکر 276

اصلاحی خطاب 277

سانحۂ شہادت 278

نمازِ جنازہ اور تدفین 282

اس سانحے پر اکابر کے تاثرات 282

کیا قاتلوں میں بعض صحابہ بھی تھے؟ 284

مشق 285

یونٹ 1.12:

خلافت حضرت علی بن ابی طالب ؓ 286

فضائل ومناقب 286

حضرت علی ؓ کی خلافت کا انعقاد 287

کیا حضرات طلحہ وزبیر ؓ سے جبری بیعت لی گئی؟ 289

حضرت علی ؓ کی بیعت سب پر لازم 289

بعض اکابر صحابہ کے بیعت نہ کرنے والی ضعیف روایات کا محاکمہ 290
کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے والوں میں زیادہ تر فسادی تھے؟ 291
حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اہم اقدامات اور ان کی درست توجیہات 292
پہلا خطاب 292
باغیوں سے بیعت کیوں لی؟ 292
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمال کو معزول کیوں کیا گیا؟ 293
مسلمانوں کے چار طبقات 293
حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کرنے والوں کا موقف 294
مسئلہ قصاص و بغاوت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف 296
باغی از خود ہتھیار ڈال کر مامون ہو جاتے ہیں 296
قصاص انہی پر نافذ ہوگا جو قاتلانہ ضرب میں شریک ہوں 297
حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فقہی موقف کا خلاصہ 299
حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتظامی موقف 300
کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ بے بسی کے باعث مرکز سے مربوط ہونے کی دعوت دے رہے تھے؟ 300
حضرت علی رضی اللہ عنہ عراق میں 301
جنگِ جمل 304
تاریخی روایات 305
حاصلِ کلام 306
حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کا اپنے اجتہاد سے رجوع اور شہادت 307
ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اپنے اجتہاد سے رجوع 307
اہلِ شام سے اختلاف اور کش مکش 308
فقہائے اُمت کا ضابطہ 308
جنگِ صفین 309
حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی شہادت 310
دورانِ جنگ اخلاق و شرافت کی مثالیں 310
لیلۃ الهریر 311
جنگ بندی اور مذاکرات کا دور 313
کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ بندی سے انکار کر رہے تھے؟ 314
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنے اجتہاد سے عملی رجوع اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصویب 315
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قولی رجوع 316
اہلِ جمل اور اہلِ شام مجتہد تھے 317
نتائج 317
مشاجرات اور غیر جانبدار صحابہ 317
اجتہادی اختلاف کا حکم 318
یونٹ 1.13: قضیہ تحکیم 319
حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے انتخاب کی وجہ 319
حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے تقرر کی وجہ 320

تحکیم کا واقعہ: کیا درست اور کیا غلط!!	320
گفتگو کا آخری دور	321
شام میں حضرت معاویہ ؓ کی بطور حکمران بیعت	323
چند جھڑپیں،	
مصر کا قضیہ اور خوارج	323
مصر کا سیاسی بحران	324
حضرت معاویہ ؓ کا مصر پر قبضہ	325
حضرت علی ؓ کا ارشاد حضرت معاویہ ؓ کے حق میں	325
خوارج کا ظہور	325
خوارج کی قہر انگیزی اور جنگِ نہروان	326
حالات کی بہتری، معاہدہ، حضرت علی ؓ کی شہادت	327
حضرت معاویہ ؓ کا حضرت علی ؓ سے سرحدوں کے احترام کا معاہدہ	327
ایک سبق آموز واقعہ	327
حضرت علی ؓ نے کسی کو ولی عہد نہیں بنایا	328
حضرت علی ؓ کی شہادت	328
آخری وصیت	329
کیا حضرت علی ؓ ایک ناکام حکمران تھے؟	330
سیرت کی کچھ درخشاں جھلکیاں	331
دورِ حکومت کی اصل خصوصیت	332
مشق	333
یونٹ 1.14: خلافت حضرت حسن بن علی ؓ	334
فضائل ومناقب	334
ایک اعتراض کا جواب	334
کیا حضرت حسن ؓ نے مجبوراً صلح کی؟	335
حضرت حسن ؓ کا اعلانِ صلح اور شر پسندوں کی مخالفت	335
حضرت معاویہ ؓ کی عراق پر لشکر کشی اور حضرت حسن ؓ کا اقدام	335
شرائطِ صلح	338
صلح کی شرائط کے بارے میں بعض شبہات کا ازالہ	339
انتقالِ اقتدار	340
دورِ خلافتِ راشدہ کا اختتام	340
حضرت حسن ؓ خلافت سے دست برداری کے بعد	341
حضرت حسن ؓ کی صلح پسندی	341
حضرت معاویہ ؓ کا حسنین کریمین سے حسن سلوک	342
صلح سے غلط عقائد پر ضرب	342
حضرت حسن ؓ کی وفات	342
چند مفید مباحث	343
مشاجراتِ صحابہ تکمیلِ شریعت کے لیے تھے	343
کیا صحابہ کرام کے تنازعات "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کے خلاف ہیں؟	345

عبداللہ بن سبا کا انجام کیا ہوا؟	346
مشق	347
دوسرا باب: خلافتِ راشدہ میں نظم ونسق اور تہذیب وتمدن	348
تعارف	348
اہداف ومقاصد	348
یونٹ 1.15: خلافتِ راشدہ کی انتظامی وتمدنی خصوصیات	349
شورائیت	349
انتقالِ اقتدار کا ضابطہ	349
عہدے داروں کی تقرری	349
مرکزِ خلافت	349
شعائرِ خلافت	350
مرکزی عہدے	350
عاملین کی ذمہ داریاں	351
قبائلی سرداری نظام	351
تبادلہ اور برطرفی	352
مالی معاملات میں احتیاط	352
ہدایت اور تادیب پر مشتمل مراسلے	353
مملکت کی تقسیم......مرکز اور صوبوں کا رابطہ	353
تجارتی شعبہ	353
نظام کفالت۔ ادارۃ الغرفاء	354
عدلیہ	354
غیر مسلم شہریوں کے حقوق	355
ذاتی زندگی میں بے جا اختلاط سے اجتناب	355
ذرائع آمدن	356
زرعی ترقی۔ مالی خوشحالی	356
بیت المال کے مصارف	356
حرمین شریفین اور مساجد کی تعمیر وتوسیع	357
نوجوانوں کی صلاحیتوں کی آزمائش	358
خلافتِ راشدہ میں علمی سرگرمیاں	358
قرآنِ مجید کی حفاظت	359
سنت کی حفاظت کی کوشش	360
فقہ پر توجہ	361
اِفتاء	362
شعروادب، تاریخ، زبان دانی	362
طب وحکمت اور کیمیا	362
مشق	363
جدول: دورِ خلافتِ راشدہ	364
حصہ سوم — خلافت بنو امیہ وخلافت زبیریہ	365
پہلا باب — خلافتِ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ	366
تعارف	366
اہداف ومقاصد	366
یونٹ 1.16: خاندانِ بنوامیہ کا تعارف	367

خلافت حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ	369
دورِ خلافت	370
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی شرعی حیثیت	370
عالمِ اسلام کا دفاع اور جہاد	371
(الف) برصغیر	371
(ب) خراسان	371
(ج) وسطِ ایشیا	372
(د) افریقہ	372
(ہ) رومیوں سے جنگیں	374
زیاد بن ابی سفیان کی کارکردگی	376
اندرونی قضیے	377
کوفہ میں خوارج کی بغاوتیں	377
حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کا قضیہ	378
یزید کی ولی عہدی	381
یزید کی ولی عہدی پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے رفقاء کے تحفظات	382
اکابرِ مدینہ کے یزید کی ولی عہدی پر تحفظات	383
یزید کی ولی عہدی پر جمہور علماء کا مسلک	385
ذاتی کردار کے لحاظ سے یزید کی اہلیت	386
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت اور حکومت کی خوبیاں	388
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وصیتیں	390
یزید کی ولی عہدی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ	391
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کی اصل حیثیت	392
مشق	394
دوسرا باب: عہدِ یزید بن معاویہ	395
تعارف	395
اہداف	395
یونٹ 2.1: عہدِ یزید بن معاویہ	396
بیعت لینے کی کوشش	396
اکثر صحابہ و تابعین کی بیعت کا سبب	396
حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا موقف	397
یزید کا سخت طرزِ عمل	397
یزید کی جانب سے حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت لینے کی کوششیں	397
حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے مدینہ سے نکلنے کا سبب	398
نئے حاکمِ حجاز کا مکہ پر حملے کا عزم	399
حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سفرِ کوفہ کا اصل مقصد	399
اہلِ کوفہ کے خطوط	400
عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا مشورہ	401
یزید کی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو دھمکی	401
کوفہ کا سفر	402
مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کی کوفہ آمد اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا حکیمانہ طرزِ عمل	402
ابن زیاد کی کوفہ آمد اور مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کی شہادت	403

صحابہ کرام کی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے شفقت	403
حضرت حسین رضی اللہ عنہ عزیمت کے راستے پر	404
یزید کا ابن زیاد سے رابطہ	404
حضرت حسین رضی اللہ عنہ واپسی پر آمادہ	404
حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اقدام خروج نہ تھا	405
میدانِ کربلا میں	406
واقعہ کربلا سے متعلق مشہور تفصیلات کی کیا حیثیت ہے؟	409
سانحۂ کربلا کی ذمہ داری کس پر	409
حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی عظیم تھی	410
سانحۂ کربلا، اسباقِ تاریخ	411
جنگِ حرہ (ذوالحجہ ۶۳ھ)	413
اہلِ مدینہ کے کتنے افراد جاں بحق ہوئے	414
شامی لشکر کے اہلِ مدینہ پر مظالم	414
مسلم بن عقبہ کا زبردستی بیعت لینا	415
سانحۂ حصارِ کعبہ (صفر ۶۴ھ)	416
کعبہ شریف کی آتش زدگی	419
یزید کے دور کی عسکری مہمات پر ایک نظر	419
مشق	422
تیسرا باب خلافتِ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ	423
تعارف	423
اہداف ومقاصد	423
یونٹ 2.2: خلافتِ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ	424
فضائل ومناقب	424
دورِ خلافت	426
ایک جعلی روایت	427
عبید اللہ بن زیاد کی ہوسِ اقتدار	427
عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا منصبِ خلافت سنبھالنا	428
مروان بن الحکم کی بغاوت	429
عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب افسانہ	429
جنگِ مرج راہط۔ شام سے خلافتِ زبیریہ کا خاتمہ	430
شکست کی وجوہ	432
معرکہ مرج راہط پر تبصرہ	432
مروان کا شام اور مصر پر قبضہ، بنو امیہ کی مروانی شاخ کا دورِ اقتدار	433
مروان بن حکم کے کردار پر ایک نظر	434
مختار ثقفی کا فتنہ	436
تحریک توابین	436
مختار کوفہ میں	437
توابین کی شکست کی وجوہ	437
مختار کا عروج	437
عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور مختار میں کشیدگی	439
مصعب بن زبیر رحمہ اللہ اور مختار کا مقابلہ (۶۷ھ)	440
خلافتِ زبیریہ کے لیے بڑھتی ہوئی مشکلات	441

خوارج کی شورش	441
دمشق کا نیا حکمران عبدالملک	442
کوفہ کا قصرِ امارت...... سروں کی نمائش گاہ	443
عبدالملک کے غلبے کی وجوہ	444
عراق میں عبدالملک کے نئے انتظامات	444
مصعب رحمہ اللہ کی شہادت پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا تاریخی خطبہ	444
عبدالملک کی حجاز میں دخل اندازی	445
حجاج بن یوسف کا ظہور	445
حجاج بن یوسف کا مکہ پر حملہ	446
سانحہ شہادتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ	447
لاش کی بے حرمتی۔ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے تاثرات	450
عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کی عبدالملک سے ملاقات	452
عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق اور امرائے شام باغی تھے	452
عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور پر ایک نظر	453
خلافتِ زبیریہ کے سقوط کے اسباب	454
عہدِ صحابہ کی حکمرانی اور بعد کی سیاست و حکمرانی کا موازنہ	455
دورِ صحابہ کی سیاسی کش مکش کا خلاصہ	457
مشق	460
چوتھا باب: عہدِ بنو مروان	461
تعارف	461
اغراض و مقاصد	461
یونٹ 2.3: عبدالملک بن مروان	462
عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت	462
خوارج کی شورش	463
عراق میں حجاج بن یوسف کا تقرر اور کوفہ میں اس کا مشہور خطبہ	464
قطری بن فجاۃ خارجی کی سرکوبی	465
افریقہ کی فتوحات	465
عبدالرحمن بن اشعث کا خروج	466
بصرہ پر قبضہ۔ دَیر جماجم کا محاذ	466
خروج کے احکام و شرائط پر فقہاء کا غور و فکر	467
عبدالملک کے دور کے کچھ اہم مباحث	468
عبدالملک کی وفات	468
اولاد	468
بیٹوں کے لیے ولی عہدی کی بیعت	468
سعید بن مسیب رحمہ اللہ پر تشدد کی روایت	468
عبدالملک کی زندگی پر ایک تبصرہ	469
حلیہ اور علم و فضل	469
تعمیری و ترقیاتی کارنامے	470
اسلامی سکے کا اجراء	470
دفتری نظام عربی زبان میں	470
بیت المقدس کی خدمت	470

نئے شہر 470

خلاصہ کلام 471

ولید بن عبدالملک 472

قتیبہ بن مسلم الباہلی کی فتوحات 473

فتح اندلس 474

برصغیر میں مسلمانوں کی فتوحات 478

حجاج بن یوسف کی وفات 481

سعید بن جُبیر رحمہ اللہ کی شہادت 481

حجاج بن یوسف کے کردار کا محاکمہ 482

ولید کے تعمیری و ترقیاتی کارنامے 485

جامع اُموی دمشق 485

مسجد نبوی کی جدید تعمیر اور توسیع 486

ولید بن عبدالملک کی وفات 486

مشق 487

یونٹ 2.4: سلیمان بن عبدالملک 488

قُتیبہ بن مسلم کا قتل 489

محمد بن قاسم کے قتل کا سانحہ 489

موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ سے سلوک 490

طارق بن زیاد کی گوشہ نشینی 490

اندلس کے نائب حکمران عبدالعزیز کا قتل 491

سلیمان کے عہد کی اصلاحات 491

سلیمان بن عبدالملک کے عہد کی فتوحات 491

سلیمان کے دور پر ایک نظر 493

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ 494

تعلیم و تربیت 494

دو جھنجھوڑ دینے والے واقعات 495

سلیمان بن عبدالملک کے مشیر کی حیثیت سے 496

دورِ خلافت 496

تین فوری احکام 497

سرکاری مراعات و اعزازات قبول کرنے سے انکار 497

اس دور کی حکومتی اور معاشرتی خرابیاں 498

اہلِ بیت کے بارے میں بدکلامی 498

بعض بدعات 499

جاگیروں کی دوڑ، اقربا پروری اور عیش و تنعم 500

اصلاحات اور احتساب 501

فدک کا مسئلہ 501

خاندان کا دباؤ مسترد 502

پکڑ دھکڑ کی سیاست کا خاتمہ 502

سزاؤں میں احتیاط اور نرمی 502

ظالم افسران کا محاسبہ اور مؤاخذہ 503

عوام سے رابطہ 503

ٹیکس معاف 503

حکمران خاندان کے تجارت میں حصہ لینے پر پابندی 504

خطبوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعن طعن کی بندش 504

علوم کی اشاعت و حفاظت 504

دین کی دعوت	505
خلیفہ کی سادہ اور زاہدانہ زندگی	505
لباس میں سادگی	506
اپنے کام اپنے ہاتھ سے	506
سرکاری اخراجات میں احتیاط	506
دوسروں کو زہد وقناعت کا سبق	506
فکر مندی کی انتہاء	507
آخری ایام اور بنو مروان کی مخالفت	507
خوارج سے مناظرہ اور آپ کی طلبِ مہلت	508
سانحۂ وفات	508
آخری لمحات اور وصیت	508
اصلاحات کا معاشرے پر اثر	509
اندرونی شورشیں ختم	509
زکوٰۃ کے حق دار نایاب ہوگئے	509
لوگوں کے مزاج اور رجحانات میں تبدیلی	509
سرکاری آمدن میں اضافہ ہوگیا	509
عمر بن عبدالعزیز کی محبوبیت ومقبولیت، ایک لمحۂ فکریہ	510
عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بعد	510
مشق	511
یونٹ 2.5:	
یزید بن عبد الملک (یزید ثانی)	512
اندرونی خطرات	512
سیرت وکردار	513
ہشام بن عبدالملک	514
جہادِ سندھ	514
مہماتِ ترکستان	514
گرجستان اور آرمینیا کا جہاد	516
رومیوں سے معرکے	517
بربروں کی بغاوت	517
جہادِ فرانس	518
اندلس کا استحکام اور ترقی	518
عرب قبائل کی باہمی عصبیت میں اضافہ	519
زید بن علی رحمہ اللہ کا خروج اور قتل	519
ہشام بن عبدالملک کی وفات	519
سیرت وخصوصیات	519
خلاصۂ کلام	520
ولید بن یزید بن عبدالملک (ولید ثانی)	521
یزید بن ولید بن عبدالملک (یزیدِ ثالث)	523
ابراہیم بن ولید بن عبدالملک	524
مروان بن محمد بن مروان (مروانِ ثانی)	525
بنوہاشم کی انقلابی دعوت	526
تحریکِ بنوعباس	528
محمد بن علی عباسی کی تحریک	530
حکام کی طرف سے عباسی داعیوں کی پکڑ دھکڑ	531
ابو مسلم خراسانی اور عباسی تحریک کا غلبہ	532

ابنِ ھُبیرہ کا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر ظلم 533
ابو العباس سفاح کا ظہور 533
بنو سفیان و بنو مروان کے دور پر ایک نگاہ 535
دولتِ بنو امیہ (بنو سفیان و بنو مروان) کے 535
زوال کے اسباب
بنو عباس کی کامیابی کی وجوہات 536
جدول عہدِ بنو امیہ مع خلافتِ زبیریہ 537
مشق 539

پانچواں باب
عہدِ اُموی میں تہذیب وتمدن اور معاشرہ 540

تعارف 540
اہداف 540

یونٹ 2.6:
عہدِ اُموی میں تہذیب وتمدن اور معاشرہ 541

نظمِ حکومت 541
صوبوں کی تقسیم 541
مالیات اور محصولات 541
شعائرِ خلافت 542
مہرِ خلافت 543
سرکاری لباس 543
دفتری زبان عربی 543
موروثیت اور ولی عہدی 543
سکہ سازی 543
ڈاک کا نظام 543
کتابت و انشاء 544
دیوان الجند والخراج وبیوت
الاموال و الخزائن 544
دیوانِ خاتم 544
امارتِ حج 545
تعمیراتی کام 545
نئے شہروں کی تعمیر 545
زراعت 545
اُموی دور میں علوم اسلامیہ 546
قرآن مجید اور علم قراآت 547
تفسیر 548
حدیث 548
فقہ 550
مغازی وسیرت 551
تاریخ 551
علمی حلقے اور تعلیمی مراکز 552
کتب خانے 552
اُموی دور میں فنونِ ثقافت 553
شعر وادب 553
فنِ خطابت 554
لغت 554
انساب 555

صنعت وحرفت 555
طب وحکمت اور کیمیا 555
عہدِ اُموی میں معاشرہ 556
طبقاتی تقسیم 556
حکمران طبقہ 557
عام مسلمان 557
ذمی 557
غلام اور باندیاں 557
موالی 557
اعتقادی ونظریاتی تقسیم 558
شیعانِ علی اور شیعانِ عثمان 558
شیعہ 559
نواصب یا مروانی 560
خوارج 561
مُرجئہ 562
معتزلہ 562
جبریہ 563
قدریہ 563
جہمیہ 563
علاقوں کے لحاظ سے سیاسی ومذہبی میلانات 564
جھوٹی اور مبالغہ آمیز روایات کی تشہیر کے پیچھے فرقہ ورانہ جذبات 564
اہلِ سنت والجماعت کا ممتاز گروہ 565
مشق 566
حصہ چہارم: خلافتِ عباسیہ بغداد 567
پہلا باب
دولتِ عباسیہ بغداد: تاسیس، استحکام، عروج 568
اہداف 568
یونٹ 2.7: ابوالعباس سفاح 569
انبار میں پایۂ تخت 570
مظالم اور عہد شکنی 570
بغاوتیں 571
سفاح کی وفات 571
بعض بدعات کا ازالہ 572
ابوجعفر المنصور 573
ابومسلم خراسانی کا انجام 573
اعتقادی فتنے اور شورشیں 573
افریقہ میں خوارج کا ظہور 574
فاطمی حضرات کا خروج 575
نفسِ زکیہ اور ابراہیم کے خروج کے مابعد اثرات 577
جمہور سادات اور روافض کے عقائد کا فرق 578
بیرونی ممالک اور منصور 578
بغداد کی تعمیر 580
منصور عباسی کے دور میں تدوینِ فقہ 581
امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر سرکاری عتاب اور ان کی وفات 583

منصور کی وفات 583

منصور کی سیرت پر ایک نظر 584

علم اور بخل 585

علوم وفنون کی سرپرستی 585

منصور اور عبدالملک میں مشابہت 586

خلاصہ 586

المهدی بن منصور 587

اُموی وہاشمی قیدیوں کی رہائی 587

رومیوں سے معرکے 588

زندقہ کا فتنہ اور مہدی کا کردار 588

تعمیری وترقیاتی کام 589

ولی عہدی کا معاملہ 589

وفات 589

الهادی بن مهدی 590

حسین بن علی کا خروج 590

ولی عہدی کا مسئلہ اور ہادی کی اچانک موت 590

مشق 591

یونٹ 2.8: هارون الرشید بن مهدی 592

ایرانی اثرات 592

بغاوتیں 592

یحییٰ بن عبداللہ ہاشمی کا خروج 593

دولتِ ادارسہ کا قیام 593

افریقی قبائل کی شورش اور دولتِ اغالبہ کا قیام 593

برامکہ کا عروج وزوال 593

بیرونی مہمات 595

رومیوں سے جنگیں 595

فرانس سے دوستانہ تعلقات 595

ہارون کی وفات 595

فقہ حنفی کا عروج 597

امین بن الرشید 598

مامون بن الرشید 599

خلافت کا آغاز اور خاندان سہل کا تسلط 599

فتنہ وفساد اور خروج کی تحریکیں 599

طاہر بن حسین کا خراسان میں تقرر 600

خراسان اور یمن کی نئی حکومتیں۔ 600

دولتِ طاہریہ۔ دولتِ زیادیہ

بابک خرمی کا ظہور 601

علمی وسائنسی سرگرمیاں 601

رومیوں سے جہاد 602

زبیدہ خاتون کا انتقال۔ زبیدہ کی سیرت 602

وکردار۔ نہرِ زبیدہ

مسئلہ خلقِ قرآن۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی

گرفتاری 603

عہدِ مامونی پر ایک تبصرہ 603

معتصم باللہ بن الرشید 604

محمد بن قاسم علوی کا خروج 604

ترک افسران کی ترقی	604
نیا شہر......سامرا	604
بابک خرمی کا خاتمہ	605
رومیوں سے جہاد	605
ترکوں کی بغاوت	605
مسئلہ "خلقِ قرآن" پر شدت	606
معتصم کی وفات	606
الواثق باللہ بن معتصم	607
امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی روپوشی اور امام احمد بن نصر رحمہ اللہ کا قتل	607
امام ابوعبدالرحمٰن الازدی رحمہ اللہ کی حق گوئی	608
واثق کی وفات	608
المتوکل علی اللہ	609
جہادی مہمات	610
متوکل کا قتل	610
اخلاق و کردار اور کارنامے	610
مشق	611
دوسرا باب: دولت عباسیہ: دورِ زوال	612
اہداف	612
یونٹ 2.9: بنو عباس۔عہدِ زوال کے پچھلے مراحل	613
اَلْمُنْتَصِر باللہ	615
اَلْمُسْتَعِیْن باللہ	615
علویوں کا خروج	615
مستعین کا قتل	615
اَلْمُعْتَز باللہ	616
مصر میں دولتِ طولونیہ کا قیام	616
دولتِ صفاریہ کا قیام	616
اَلْمُهْتَدِی باللہ	616
اَلْمُعْتَمِد علی اللہ	617
دولتِ طالبیہ طبرستان	617
صاحب الزنج علی بن محمد کا فتنہ	617
رومیوں کے حملے	618
دولتِ سامانیہ	618
ولی عہد کی تبدیلی	618
اَلْمُعْتَضِد باللہ	618
قَرامِطہ کا ظہور	619
اَلْمُکْتَفِی باللہ	619
دولتِ طولونیہ کا خاتمہ	619
جہاد	619
اَلْمُقْتَدِر باللہ	620
عبیدیوں کا تیونس، مصر اور مراکش پر قبضہ	620
منصور حلاج کو سزائے موت	620
رومیوں سے صلح اور جنگ	620
دیلمی شیعوں اور قرامطہ کی یورش	620
خواتین کا راج اور ناکام بغاوت	621

القاہر باللہ 621
دیلمیوں کا تسلط۔ قاہر کا انجام 621
الراضی باللہ 622
دولتِ بنوبُوَیہ کا قیام 622
ابن رائق کی خودمختاری۔ حکمرانِ اندلس کا
دعوائے خلافت 622
دولتِ اِخشیدیہ کا قیام 622
امراء کی خودمختاری 622
المُتّقی للہ 623
بیرونی حملے 623
خلیفہ متقی کا قتل 623
اَلْمُستَکفی باللہ 624
بنو بُوَیہ کا تعارف 624
خلفاء اور بنو بُوَیہ کے تعلقات 625
خلیفہ مُستَکفی کی جبری معزولی 625
المطیع للہ 625
حجرِ اسود کی واپسی 626
شیعہ سنی فساد اور ماتمی جلوسوں کا آغاز 626
عالم اسلام روافض کے نرغے میں 626
رومیوں کے تباہ کن حملے 626
الطائع للہ 627
عَضُدُ الدولہ کی موت: بنوبُوَیہ میں خانہ جنگی 628
القادر باللہ 628
عمید الجیوش کا دورِ نظامت۔ جلوس بند۔
فسادات ختم 628
بنوبُوَیہ کے مابین اقتدار کی کش مکش 629
خلیفہ قادر باللہ اور سلطان محمود غزنوی 629
القائم بِاَمرِاللہ 630
سلجوقیوں کا ظہور 630
بنوبُوَیہ کا دور ایک نظر میں 632
بنوبُوَیہ کے حکمرانوں کی فہرست 634
مشق 635
یونٹ 2.10: القائم (دوبارہ حکمرانی) 636
طغرل بیگ کی وفات 636
الپ ارسلان اور جنگِ ملازکرد 636
اَلْمُقتَدِی بِاَمرِاللہ 637
تین مجاہد صفت بادشاہوں کا عروج 637
سقوطِ صِقِلّیہ 638
ملک شاہ 638
نظام الملک طوسی 638
اَلْمُستَظہر باللہ 639
سلجوقی حکمرانوں کی مختلف شاخیں 639
یورپ میں بیت المقدس کی بازیابی کی تحریک 640
سقوطِ بیت المقدس 640
سلجوقیوں میں جنگ اور صلح 641
شام میں فرنگیوں کی مسلسل فتوحات 641

باطنیوں کا فتنہ	641
سلطان محمد سلجوقی اور خلیفہ مستظہر کی وفات	641
اَلْمُسْتَرْشِد باللہ	642
عراق میں خانہ جنگیاں	642
دُبیس بن صدقہ کا فتنہ	642
سلطان مسعود سلجوقی اور خلیفہ کے مابین کش مکش	642
الراشد باللہ	643
اَلْمُقْتَفِی لِاَمْرِاللہ	644
دنیائے اسلام کا نیا محافظ، عماد الدین زنگی	644
نور الدین زنگی اور دوسری صلیبی جنگ	644
سلطان مسعود اور خلیفہ کے مابین کش مکش	645
سلاجقہ کے دور پر ایک نظر	645
سلجوقیوں کے زوال کے اسباب	645
خلیفہ مُقْتَفِی آزادانہ حیثیت کی بحالی کے بعد	646
اَلْمُسْتَنْجِد باللہ	646
نور الدین زنگی کے کارنامے	646
مُسْتَنْجِد کی وفات	647
اَلْمُسْتَضِیْءِ بِاَمْرِاللہ	647
مصر میں بنو عبید کی حکومت کا خاتمہ۔ ایوبی سلطنت کا قیام	647
خلیفہ کی بیماری اور وفات	648
اَلنَّاصِر لِدِیْنِ اللہ	648
خلیفہ کی عالم اسلام کے مسائل سے بے اعتنائی	648
ناصر پر فالج کا حملہ اور وفات	649
صلیبی جنگیں اور تاتاری حملہ	649
الظاہر بامر اللہ	649
اَلْمُسْتَنْصِر باللہ	650
رفاہی کام	650
سلطان جلال الدین کا انجام	651
عظیم الشان فوج	651
اَلْمُسْتَعْصِم باللہ	651
سقوطِ بغداد۔ خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ	652
عباسیوں کے زوال کے اسباب	653
دورِ عروج کے عباسی خلفاء	655
دورِ زوال کے عباسی خلفاء	656
مشق	658

بسم الله الرحمن الرحيم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یہ کتاب کیوں مرتب کی گئی؟

تاریخ ایک ایسا موضوع ہے جسے سمیٹنا بھی مشکل ہے اور جانچنا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر لوگ تاریخ کی تحقیق سے کترا کر گزر جاتے ہیں۔ حالاں کہ تاریخ کو اصول وقواعد کے مطابق پڑھا جائے تو اس کے فوائد بے پناہ ہیں۔ تاریخ صدیوں کے تجربات چند صفحات میں سمیٹ کر پیش کر دیتی ہے، ماضی کے آئینے میں حال کا درست تجزیہ کرنے اور مستقبل کی بہتر پیش بندی کرنے کے قابل بناتی ہے۔ تاریخ سے ہمیں دوست اور دشمن کی پہچان ہوتی ہے اور ہم اس کے ذریعے مختلف اقوام کی نفسیات سمجھ کر اس کے مطابق معاملہ کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا میں لاتعداد اہلِ علم وقلم تاریخ پر کام میں جٹے ہوئے ہیں اور اس طرح اپنی قومی، تہذیبی اور تمدنی خصوصیات کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ دوسری طرف مستشرقین [1] کی ایک بڑی جماعت، ان کے تربیت یافتہ آزاد خیال اسکالرز اور باطل فرقوں کے اہلِ قلم اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے میں مصروف ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ سے مسلسل دور ہوتے جا رہے ہیں جبکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس ملاوٹ شدہ تاریخ کو پڑھ کر دین سے برگشتہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا علاج یہ نہیں کہ ہم تاریخ کو ترک کر دیں اور لوگوں کو اس سے دُور رہنے کی تاکید کرتے رہیں بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ ہم تاریخ کے تحقیقی منہج کو اپنائیں اور اس پر بھرپور انداز میں کام کریں تاکہ گمراہیوں اور غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا جا سکے۔

اس حوالے سے یہ ناچیز اپنی استطاعت کے بقدر سعی میں مصروف ہے اور گزشتہ بارہ برس سے تاریخ کی تنقیح وترتیب کے ایک طویل المیعاد منصوبے پر کام کر رہا ہے۔ جس قدر کام ہوا ہے وہ ''تاریخ اُمت مسلمہ'' کے نام سے پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکا ہے جن میں انبیائے سابقین، سیرت نبویہ، خلافتِ راشدہ، خلافتِ اُمویہ، خلافتِ عباسیہ، سلطنتِ عثمانیہ اور اسلامی اُندلس کے حالات آ گئے ہیں۔ یہ کام بڑے سائز کے لگ بھگ ساڑھے چار ہزار صفحات میں

---

[1] مستشرقین سے مراد مغربی دُنیا کے وہ اہلِ علم ہیں جو شرقی ممالک خصوصاً عالمِ اسلام کے علمی مصادر وماخذ کا مطالعہ کر کے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔ ان میں معتدل مزاج بہت کم ہوتے ہیں۔ اکثریت اسلام کے بارے میں شدید بغض وعناد رکھتی ہے اور اس کا علمی کام درحقیقت اسلام دشمنی سے لبریز ہوتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کی تالیف: ''نظریاتی جنگ کے اصول'' اور ''نظریاتی جنگ کے محاذ''

شائع ہوا ہے جسے علماء و مشائخ، اہلِ علم و دانش اور اُمت کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے سرگرم احباب بنظرِ تحسین دیکھ رہے ہیں۔ چھٹے حصے پر کام شروع ہونے والا ہے جس میں تاریخ برصغیر اور جدید مسلم دُنیا کی تاریخ جیسے اہم مباحث آئیں گے۔

تاہم اس کام کے ساتھ ساتھ تاریخ کی ایک ایسی کتاب مرتب کرنا بھی ضروری تھا، جو تعلیمی اداروں میں طلبہ کو بطورِ نصاب پڑھائی جاسکے اور وہ قرآن وسنت سے ثابت شدہ خالص اسلامی عقائد وتعلیمات سے ہم آہنگ ہونے کے علاوہ مختصر بھی ہو اور جامع بھی۔ گزشتہ تین سالوں میں متعدد اکابر علماء و مشائخ راقم کو اس اہم کام کی طرف متوجہ فرماتے رہے۔ چنانچہ نومبر ۲۰۲۱ء میں راقم رائے ونڈ کے سالانہ اجتماع میں حاضر ہوا جہاں ہندوستان سے آئے ہوئے اکابرِ دعوت وتبلیغ کی زیارت کا موقع ملا۔ اس دوران محترم بزرگ بھائی فاروق بنگلور والے سے بھی شرفِ ملاقات نصیب ہوا جنھوں نے عصری تعلیمی اداروں کے لیے تاریخ کی ایک کتاب مرتب کرنے کی اشد ضرورت بیان فرمائی۔

گزشتہ سال جب ''تاریخ اُمت مسلمہ'' کا پانچواں حصہ شائع ہوا تو راقم نے ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ (۱۸ دسمبر ۲۰۲۲ء) کو حضرت مولانا محمد زکریا مدنی مدظلہ (استاذِ حدیث معہد الخلیل الاسلامی، کراچی) اور دیگر علماء کی معیت میں دارالعلوم کراچی حاضر ہو کر اس کا نسخہ حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت نے دورانِ گفتگو تاریخ پر ایسی کتاب کی تدوین کی ضرورت کا اظہار فرمایا جو مدارسِ دینیہ میں درسی طور پر پڑھائی جاسکے۔ راقم نے اس حوالے سے حضرت سے رہنمائی کی درخواست کی اور حضرت نے کچھ اہم ہدایات دیں۔ اس کے بعد راقم حضرت سے یہ وعدہ کر کے رخصت ہوا کہ اب بندہ ترجیحی بنیادوں پر یہی کام کرے گا اور اسے ان شاء اللہ جلد از جلد مکمل کرے گا۔ چنانچہ حسن ابدال واپس آ کر بندہ ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوگیا۔ حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم کی ہدایات اس بارے میں ملحوظ رہیں۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا محمد عابد مدنی مدظلہ العالی (استاذِ حدیث، جامعہ خیر المدارس، ملتان) شفقت فرماتے ہوئے اس حوالے سے بہت مفید رہنمائی فرماتے رہے اور دونوں جلدوں کے مسودے کا مکمل مطالعہ کر کے ضروری اصلاحات وترامیم بھی کراتے رہے۔

بحمد اللہ! اب یہ کام مکمل ہو چکا ہے جسے ''آئینۂ تاریخ اُمت'' کے نام سے شائع کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ طلبہ کے لیے اس کے ذریعے تاریخ کو پڑھنا اور سمجھنا آسان ہوجائے گا۔

محمد اسماعیل ریحان

جمعرات یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۴۵ھ

۱۶، نومبر ۲۰۲۳ء

ادارہ علوم القرآن، خالقداد، تحصیل حسن ابدال

عرضِ مؤلّف

ساڑھے چودہ صدیاں پہلے کفر وشرک کے گھٹاٹوپ اندھیروں کے درمیان شمعِ اسلام روشن ہوئی اور حق نے جہالت کی تاریکیوں کو چیر کر اپنا لوہا منوایا، نہایت ناسازگار ماحول میں نبی امی فداہ ابی وامی ﷺ نے اسلام کی دعوت کا آغاز کیا اور وہ نیک اور سعادت مند ہستیاں جنہیں صحابہ کرام کہا جاتا ہے، آپ کے گرد جمع ہوئیں۔ حضور اکرم ﷺ کو مکہ سے نکالا گیا تو انصارِ مدینہ نے آپ کو سرآنکھوں پر بٹھایا۔ مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست قائم ہونے کے بعد دعوت کے ساتھ جہاد کا سلسلہ شروع ہوا اور آخر کار دس برس کے اندر اندر پورے عرب میں توحید کا کلمہ گونجنے لگا۔ مکہ فتح ہوا۔ لات وہبل توڑ دیے گئے اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ خلفائے راشدین کے دور میں اسلام کے نام لیواؤں نے جزیرۃ العرب سے نکل کر قیصر وکسریٰ کی استبدادی حکومتوں سے ٹکر لی اور صدیوں سے ظلم وستم کی زنجیروں میں جکڑی انسانیت کو نجات دلا کر ان کی جبینوں کو ایک معبودِ حقیقی کے سامنے جھکنے کی آزادی بخشی۔ چند عشروں میں ایک ایسا بہترین معاشرہ وجود میں آگیا جس پر تاقیامت انسانیت فخر کرتی رہے گی۔

فتوحات کے بعد اندرونی فتنوں نے سر اٹھایا۔ یہ اُمت کی تاریخ میں فتنوں کا پہلا دور تھا جس کا دورانیہ ۳۴ھ سے ۴۰ھ تک لگ بھگ سات سال بنتا ہے۔ بظاہر فتنے کی ابتداء ۳۴ ہجری میں ہوئی تھی مگر اس کی جڑیں پہلے سے لگ چکی تھیں۔ اس فتنے کے نتیجے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا جس نے پوری اُمت کو ششدر کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں بھی فتنہ پرور عناصر سرگرم رہے۔ اس دوران ہماری تاریخ کے دو مزید سانحے: ''جنگ جمل'' اور ''جنگِ صفین'' کی شکل میں پیش آئے جن میں پہلی بار ہم اُمتِ محمدیہ کے مابین تلوار چلتے دیکھتے ہیں۔

اس منظر نامے میں چار گروہ تھے: ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا۔ دوسرا اُن سے اختلاف کرنے والے صحابہ کرام کا۔ تیسرا غیر جانبدار حضرات کا اور چوتھا ان عناصر کا جو پس پردہ رہ کر جنگ کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ یہ ہنگاموں کا دور تھا۔ ایسے حالات میں اصل خبروں سے کہیں زیادہ افواہوں کا زور ہوتا ہے، جنہیں عموماً سماج دشمن عناصر عام کیا کرتے ہیں۔ پس اس دور کے بارے میں بھی اصل خبروں سے زیادہ شہرت افواہوں اور جھوٹی روایتوں کو ملی۔ یہ چیزیں بھی بعد میں تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ ان میں سے بیشتر روایات صحابہ کرام کے مابین کش مکش کا غیر حقیقی اور مسخ شدہ روپ دکھاتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس دور کو غیر معمولی اہتمام اور احتیاط سے دیکھا جائے اور اسماء الرجال کی روشنی میں مشکوک روایات کی تحقیق کی جائے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد رجب ۶۰ھ سے ۷۳ھ تک کے دورانیے میں سانحۂ کربلا، وقعۂ حرہ اور مدینہ اور مکہ پر شامی افواج کی فوج کشی سمیت کئی نازک ابحاث سامنے آتی ہیں۔ ان واقعات میں بھی ضعیف اور من گھڑت روایات کا ایک انبار شامل ہے جس میں سے صحیح مواد کا انتخاب کرنے اور حقیقت تلاش کرنے میں طویل مدت اور غیر معمولی محنت صرف ہوئی ہے۔ اس تحقیق کے لیے راقم نے دورِ قدیم و جدید کی جن کتب کو کھنگالا ہے وہ ایک ہزار سے متجاوز ہیں۔ مؤرخین میں سے ابن جریر طبری، بلاذری، خلیفہ بن خیاط، ابن اثیر الجزری، حافظ ابن حجر، علامہ ابن عبدالبر، علامہ ذہبی، حافظ ابن کثیر اور علامہ ابن خلدون رحمہم اللہ کی کتب سے بکثرت مواد لیا ہے۔ قریبی دور میں مرتب ہونے والی "صحیح وضعیف طبری" سے بھی بہت استفادہ کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت تک کے احوال بڑی دقتِ نگاہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ مشاجراتِ صحابہ اور ہماری تاریخ کے کئی نازک ترین مباحث اسی دور میں آتے ہیں۔ ان واقعات کے بارے میں مختلف طبقاتِ فکر اور فرقوں کی الگ الگ آراء ہیں۔ اُدھر مؤرخین کا طرز یہ ہے کہ وہ تاریخی مواد کی نقل میں تسامح سے کام لیتے ہیں۔ ان وجوہ سے ہماری تاریخی کتب میں سینکڑوں غیر معتبر روایات شامل ہوگئی ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے تاریخی موادکی تحقیق کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے جو اصولی بات تحریر کی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"ہمارے پاس علمِ تاریخ پر کتابوں کا جو ذخیرہ موجود ہے، اس میں ایک ہی واقعے سے متعلق کئی کئی روایتیں ملتی ہیں۔ اور تاریخ میں روایت کی چھان پھٹک اور جرح وتنقید کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو حدیث میں حضراتِ محدثین نے اختیار کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتبِ تاریخ میں ہر طرح کی روایتیں درج ہوگئی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔ کسی معاملے کی حقیقت پسندانہ تحقیق کرنی ہو تو یہ ضروری ہے کہ رطب و یابس کے اس مجموعے میں سے صرف ان روایات پر اعتماد کیا جائے جو روایت اور درایت کے اصولوں پر پوری اترتی ہوں۔ اگر کوئی عالم جسے جرح وتعدیل کے اصولوں سے واقفیت ہو، ان روایتوں کو انہی اصولوں کے مطابق چھانٹتا ہے تو شکوک وشبہات کا ایک بہت بڑا حصہ وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری زمانے میں عبداللہ بن سبا کی سازش نے جو تحریک شروع کی تھی، اس کے دو بڑے مقاصد تھے: ایک صحابہ کی عظمت کو مجروح کرنا، اور دوسرے جھوٹی روایتیں پھیلانا۔ چنانچہ انہوں نے بے شمار غلط سلط حکایتیں معاشرے میں پھیلانے کی کوشش کی۔ حضراتِ محدثین نے پوری تندہی اور جانفشانی کے بعد احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس سبائی تحریک کے اثرات سے، جدوجہد کرکے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی، الگ کر دیا۔ لیکن علمِ تاریخ میں اہتمام نہ ہو سکا اور وہ روایتیں کتابوں میں درج ہوتی رہیں جو خالص سبائی پروپیگنڈے کی پیداوار تھیں۔

ہاں محتاط مؤرخین نے اتنا ضرور کیا ہے کہ ہر روایت کی سند لکھ دی ہے، اور اب تحقیقِ حق کرنے والوں کے

لیے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ علم اسماء الرجال کی مدد سے وہ روایتوں کی تحقیق کریں۔ اور جن روایتوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ وہ سبائی تحریک کے کسی فرد کی بیان کی ہوئی ہیں، ان پر صحابہ کے بارے میں اعتماد نہ کریں۔ کیوں کہ صحابہ کے فضائل ومناقب اور ان کا اللہ کے نزدیک انبیاء کے بعد محبوب ترین اُمّت ہونا قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت ہے۔ لہٰذا اس سبائی پروپیگنڈے پر کان دھر کر قرآن وسنت کے واضح ارشادات کو دریا برد نہیں کیا جاسکتا۔"①

معلوم ہوا کہ ہمارے اکابر اور اسلاف کے نزدیک تاریخی روایات کو دیکھے بھالے بغیر صحابہ کرام اور اس دور کے مسلم معاشرے کے بارے کوئی رائے اختیار کر لینا بالکل غلط ہے اور تاریخی روایات کا یہ مواد بہرحال قابلِ تحقیق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راقم نے دورِ صحابہ سے متعلق روایات کو پوری احتیاط اور ذمہ داری سے جانچا ہے۔ ان روایات کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں اکثر مقامات پر خود کتبِ رجال کھول کر راویوں کے احوال کو دیکھا ہے۔ سینکڑوں روایات کو جانچا اور ایک ایک راوی کے حالات کو چھانا ہے۔ اس کام کے دوران اکابر واساتذہ کرام، اہلِ علم اور دوستوں سے مذاکرے اور مشاورت کا سلسلہ بھی چلتا رہا جس سے کام کو بہتر بنانے میں بہت مدد ملی۔ اللہ ایسے تمام مخلص حضرات کی علمی وفکری مساعیٔ جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

محمد اسماعیل ریحان

جمعہ ۳۰ محرم الحرام ۱۴۴۵ھ

۱۸، اگست ۲۰۲۳ء

ادارہ علوم القرآن، خالقداد، تحصیل حسن ابدال

❁❁❁

① فتاویٰ عثمانی: ج ۱ ص ۱۷۶، ۱۷۷

اِس کتاب کو کیسے پڑھایا جائے؟

یہ کتاب اَصلاً تعلیمی اداروں میں بطورِ نصاب پڑھانے کے لیے ترتیب دی گئی ہے (جس کے طرزِ تدریس پر ہم چند سطور بعد بات کریں گے) مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ یہ کسی عام قاری کے لیے بطورِ مطالعہ مفید اور کسی ابتدائی تحقیق کے لیے بخوبی کارآمد ہو۔

عام قارئین کا لحاظ رکھتے ہوئے کتاب کی زبان تدریسی کتب کی طرح خشک اور سپاٹ نہیں رکھی گئی بلکہ اس میں کسی قدر ادبی چاشنی کی آمیزش بھی کی گئی ہے تاکہ اس کا مطالعہ ذہن کو بوجھل نہ کردے۔ اسی بناء پر کتاب میں عموماً دقیق مباحث سے گریز کیا گیا ہے۔

ابتدائی تحقیق کے لیے یہ کتاب اس طرح کارآمد ہے کہ اس میں اصل مآخذ کو حواشی میں پیش کردیا گیا ہے۔ ان کی طرف مراجعت کرکے تحقیقی ذوق کی تسکین کی جاسکتی ہے۔ (عموماً درسی کتب میں مآخذ ظاہر نہیں کیے جاتے۔)

اب کتاب کے طریقِ تدریس کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کی جاتی ہیں:

❶ کتاب کو اس انداز میں ترتیب دیا گیا ہے کہ یہ دینی مدارس کے ساتھ ساتھ عصری تعلیمی اداروں کی نصابی ضرورت کے لیے کافی ہو۔

❷ دینی مدارس میں یہ ثالثہ سے سابعہ تک کسی بھی سال میں پڑھائی جاسکتی ہے۔

❸ کتاب کے متن کی زبان اتنی آسان رکھی گئی ہے کہ اگر اس کے منتخب مباحث (مثلاً خلفائے راشدین، صلیبی جنگیں، تاریخِ برصغیر وغیرہ) کو نویں یا دسویں کے نصاب میں داخل کیا جائے تو طلبہ باآسانی انہیں سمجھ سکتے ہیں۔

❹ اسی طرح اگر کوئی ادارہ تعلیم بالغان کے کورسز میں اس کے بعض ابواب کو شامل کرے یا اہلِ علم ودانش اس کے منتخب مباحث کو ہفتہ وار یا ماہانہ محاضرات (لیکچرز) میں پیش کریں تو یہ کتاب اس مقصد کے لیے بھی مددگار ہوگی۔

❺ ضخامت اتنی رکھی گئی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں اسے شامل کرنا مشکل نہ ہوگا، وہ اس طرح کہ:

کتاب میں سے فہرست، پیشِ لفظ، جداول، نقشے، معروضی سوالات وغیرہ چھوڑ کر فقط متن کے صفحات کو دیکھا جائے تو وہ "۱۰۶۲" ہیں۔ پھر مجموعی متن کا لگ بھگ دسواں حصہ حواشی پر مشتمل ہے۔ اسے نکال کر اصل متن تقریباً "۹۵۴" صفحات رہ جاتا ہے۔ اگر سال میں تعلیمی ہفتوں کی تعداد ۳۸ ہو اور ہر ہفتے میں تاریخ کے تین پیریڈز ہوں تو پیریڈز کی تعداد "۱۱۴" بنتی ہے۔ اگر "۹۵۴" صفحات کو ان پیریڈز پر تقسیم کیا جائے تو اوسطاً یومیہ خواندگی کم وبیش "۸" صفحات ہوتی ہے۔ چوں کہ متن کی عبارت مشکل اور پیچیدہ نہیں بلکہ سہل، واضح اور دلچسپ ہے، اس لیے ۴۵ منٹ کے ایک پیریڈ میں آٹھ صفحے کی خواندگی کوئی مشکل نہیں۔ یوں سال بھر میں یہ کتاب پڑھائی جاسکتی ہے۔

(ب) ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کتاب کی ایک جلد درساً پڑھائی جائے اور اس کا باقاعدہ امتحان لیا جائے۔ ایک جلد کی تدریس سے طلبہ میں تاریخ کا ضروری فہم پیدا ہو جائے گا۔ اس کے بعد طلبہ پر لازم کر دیا جائے کہ وہ دوسری جلد کا از خود مطالعہ کریں۔ اس کا امتحان لینا یا نہ لینا مدارس کے اربابِ انتظام کی صوابدید پر موقوف ہوگا۔

❻ عصری تعلیمی اداروں (ایف اے تا بی اے، یا اے لیول) کی سہولت کے لیے کتاب کو یونٹوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ کتاب تین سمسٹرز کے لیے "۴۸" یونٹوں پر مشتمل ہے جن کی تفصیل یہ ہے کہ:

پہلا سمسٹر: یونٹ (1.1) تا یونٹ (1.16)

❀ مبادیاتِ تاریخ ❀ انبیائے سابقین ❀ اسلام سے قبل دنیا کی حالت ❀ سیرتِ نبویہ ❀ خلفائے راشدین ❀ خلافتِ راشدہ کی انتظامی وتمدنی خصوصیات ❀ خلافتِ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

(۳۶۰ صفحات۔ ۱۶ ہفتے۔ اوسطاً ہر ہفتے میں ۲۲ صفحات)

دوسرا سمسٹر: یونٹ (2.1) تا یونٹ (2.16)

❀ عہدِ یزید بن معاویہ ❀ خلافتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ❀ خلافتِ بنو اُمیہ مروانیہ ❀ عہدِ اُموی میں تہذیب وتمدن اور معاشرہ ❀ خلفائے بنو عباس ❀ بنو عباس کی معاصر حکومتیں ❀ صلیبی جنگیں ❀ تاتاری یلغار ❀ مصر کے مملوک سلاطین ❀ خلافتِ عباسیہ قاہرہ ❀ عباسی دور میں حکومتی نظم ونسق اور تہذیب وتمدن

(۴۱۱ صفحات۔ ۱۶ ہفتے۔ اوسطاً ہر ہفتے میں ۲۵ صفحات)

تیسرا سمسٹر: یونٹ (3.1) تا یونٹ (3.16)

❀ اسلامی اَندلُس کے حکمران اُموی دور سے سقوطِ غرناطہ تک ❀ اسلامی اَندلُس میں تہذیب وتمدن ❀ سلطنتِ عثمانیہ: دورِ تاسیس واستحکام ❀ خلافتِ عثمانیہ: دورِ عروج ❀ خلافتِ عثمانیہ: دورِ زوال ❀ برصغیر کا مسلم دورِ حکومت ❀ برصغیر دورِ استعمار میں ❀ برصغیر میں مسلم تہذیب وتمدن

(۳۴۶ صفحات۔ ۱۶ ہفتے۔ اوسطاً ہر ہفتے میں ۲۱ صفحات)

❼ طلبہ کو چاہیے کہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک گھنٹہ نکال کر ایک مکمل یونٹ کا مطالعہ کر لیں اور جو سوالات ذہن میں آئیں، انہیں نوٹ کر کے اساتذہ اور اہلِ علم سے پوچھیں۔ اس طرح سبق انہیں دلچسپ اور آسان لگے گا۔

❽ مدرسین پر لازم ہے کہ وہ سبق پڑھانے سے قبل مطالعہ ضرور کر لیں۔ صرف اتنے حصہ کے مطالعے پر انحصار کرنا کافی نہ ہوگا جو انہوں نے اگلے دن پڑھانا ہو۔ بلکہ ہر باب کا پورا مطالعہ کر کے پھر اسے پڑھانا شروع کیا جائے۔ اگر حواشی میں دیے گئے مآخذ میں سے بھی دو تین کو زیرِ مطالعہ رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

❾ تاریخ کے اسباق کو بطورِ لیکچر (محاضرہ) پڑھایا جائے یا متنِ کتاب پڑھایا جائے؟ اس کا انحصار ہر تعلیمی ادارے کی مجلسِ تعلیمی یا اس کے بورڈ کی پالیسی اور اس کے بعد استاذ کی مہارت اور طلبہ کی سہولت پر ہے۔ اگر استاذ

موضوع کا ماہر نہیں ہے تو پھر کتاب سے پڑھانا بہتر ہے۔
ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پہلی جلد کا نصاب متن پڑھا کر مکمل کیا جائے جبکہ دوسری جلد میں کتاب کے مباحث کا خلاصہ بطورِ محاضرہ پیش کیا جائے۔ اس طرح ایک سال میں نصاب کی تکمیل با آسانی ہو جائے گی۔

⑩ ہر یونٹ کے آخر میں "مشقی سوالات" دیے گئے ہیں جنہیں حل کرنے سے موضوع پر عبور حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ نیز موضوع پر وسعتِ نگاہ کے لیے کتب برائے مطالعہ بھی تجویز کی گئی ہیں۔ کچھ عملی کام بھی دیا گیا ہے مثلاً خوشخطی، نقشہ فہمی، مباحثہ، قریبی عجائب گھر کی سیر وغیرہ۔ اس کے لیے طلبہ کو ایک الگ "جرنل" (بیاض) بنانا ہوگا۔

⑪ نقشہ فہمی کے لیے کتاب میں دیے گئے نقشوں کے علاوہ درجِ ذیل کتب سے مدد لی جا سکتی ہے:

❀ اطلس فتوحاتِ اسلامیہ، مطبوعہ دارالسلام
❀ اطلس تاریخ الاسلام، از دکتور حسین مؤنس
❀ اطلس تاریخ العربی الاسلامی، از دکتور شوقی ابو خلیل

⑫ دوسری جلد کے آخر میں معروضی سوالات کی مشقیں دی گئی ہیں۔ ہر مشق تین حصوں پر مشتمل ہے:
(۱) خالی جگہ پُر کیجیے۔ (۲) درست جواب منتخب کریں۔ (۳) غلط یا درست کی نشاندہی کریں۔
یہ ہر ادارے کی اپنی حکمتِ عملی پر منحصر ہے کہ وہ مشقوں کو حل کرنا لازمی قرار دے یا انہیں اختیاری رکھے، یا وقت کی کمی یا کسی اور وجہ سے انہیں بالکل ترک کر دے۔ نیز مشقیں چاہے معلّم کی نگرانی میں حل کی جائیں یا طلبہ اپنی صلاحیت اور خواندگی کو آزمانے کے لیے اپنے طور پر انہیں حل کریں، بہر حال فائدہ دونوں صورتوں میں ہوگا۔
راقم کی رائے میں مشقوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور حل کروایا جائے۔ اگر مکمل مشق اس طرح حل کرائی جائے کہ طلبہ تمام کام اپنے بل بوتے پر کریں اور اساتذہ کام کو اچھی طرح چیک کرتے رہیں تو ان شاء اللہ طلبہ کی صلاحیت بہت اچھی ہو جائے گی۔

⑬ آپ اس کتاب کو از خود بھی پڑھ کر تاریخ پر اچھی دسترس حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ایک یونٹ کا دو تین بار مطالعہ کریں۔ پھر اس یونٹ کی مشق (مع عملی کام) کو حل کریں۔ اگر وقت کی کمی کے باعث یہ مشکل لگے تو دوسری جلد کے آخر میں دیے گئے معروضی سوالات (خالی جگہ پُر کیجیے، درست جواب منتخب کریں، غلط یا درست کی نشاندہی کریں) کو ضرور حل کریں۔ اگر آپ اچھی طرح مطالعہ کر چکے ہوں گے تو ایک یونٹ سے متعلقہ معروضی سوالات کو حل کرنے میں بمشکل پانچ سات منٹ لگیں گے۔ الغرض فقط دو کام (مطالعہ اور حلِ مشق، کم از کم معروضی سوالات) کرنے سے آپ ان شاء اللہ تعالیٰ مضمون پر حاوی ہوتے چلے جائیں گے۔

❀❀❀

علامات ورموز اور حوالوں کی مراجعت کے لیے اشارات

☆ م ...... متوفی۔ متوفیٰ (تاریخ وفات بیان کرنا مقصود ہے۔)[①]

☆ تر ...... ترجمہ (حالاتِ زندگی)

☆ ۱۲۲/۳ ...... جلد نمبر تین، صفحہ نمبر ۱۲۲ (نشان / کے دائیں طرف جلد نمبر، بائیں طرف صفحہ نمبر)

☆ ص ...... صفحہ نمبر ....

☆ ۴ص۳۰۰ ...... جلد نمبر چار، صفحہ نمبر تین سو (ص کے دائیں طرف جلد، بائیں طرف صفحہ)

☆ ح ...... حدیث نمبر، روایت نمبر

☆ ط ...... مطبع/ناشر

☆ ت ...... تحقیق (کتاب پر کس محقق نے تحقیق کی ہے۔)

تنبیہ ❶: بہت سے مقامات پر ایک ساتھ دو یا زائد کتب کے حوالے نقل کر دیے گئے ہیں۔ ایسا عموماً اس بناء پر کیا گیا ہے کہ قارئین کو ان میں سے جو مأخذ دستیاب ہو، اس میں دیکھ لیں۔ مگر بعض اوقات اس ضرورت کی بناء پر بھی متعدد مآخذ کا حوالہ ایک ساتھ دے دیا گیا ہے کہ واقعے کے اجزاء منتشر شکل میں کچھ ایک مأخذ میں ہیں اور کچھ دوسرے میں۔ اس لیے مراجعت کے وقت تمام مآخذ کو دیکھا جائے۔

تنبیہ ❷: حوالوں کے لیے حتی الامکان کتب کے نئے، تحقیق شدہ اور مروج نسخوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ کتابوں کے مصنفین، مطابع اور سنِ اشاعت کی تفصیل "تاریخ اُمتِ مُسلمہ" کی مختلف جلدوں کے آخر میں دی گئی کتابیات سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ قارئین اسی مطبع کے نسخے کو دیکھیں گے تو ان شاء اللہ فوراً اپنی مطلوبہ چیز پا لیں گے۔ مگر بعض اوقات ایک ہی مطبع کی کتاب کے نئے ایڈیشن میں دو چار صفحات کی کمی بیشی ہو جاتی ہے، لہٰذا قارئین کو محولہ صفحے پر مطلوبہ مواد نہ ملے تو دو چار صفحے آگے پیچھے بھی دیکھ لیں۔

تنبیہ ❸: اگر نسخوں کے فرق کی وجہ سے کوئی واقعہ محولہ جلد اور صفحے میں نہ ملے تو اکثر کتب تاریخ میں اسے سن ہجری کے تحت تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یا حکومتوں اور حکمرانوں کے تحت تلاش کر لیں۔ ان شاء اللہ ناکامی نہیں ہوگی۔

تنبیہ ❹: اس ایڈیشن میں درہم و دینار کی قیمت ۲۸ نومبر ۲۰۲۳ء کے مطابق ہے یعنی:

☆ ایک درہم (3.4 گرام چاندی) = (2.72 امریکی ڈالر = (789) پاکستانی روپیہ

☆ ایک دینار (4.8 گرام سونا) = (310.90) امریکی ڈالر = (90160) پاکستانی روپیہ

---

① اس لفظ کو "مُتَوَفّٰی" اور "مُتَوَفِّی" (فا کے کسرہ یا فتحہ کے ساتھ) دونوں طرح پڑھنا درست ہے۔

مُقَدَّمَہ

مبادیاتِ تاریخ

اہداف ومقاصد:

اس باب کو پڑھ کر ان شاء اللہ آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1. تاریخ کی تعریف، موضوع، غرض وغایت، اہمیت اور قوائد سے آگاہ ہوں۔
2. تاریخ نویسی کے آغاز وارتقاء پر بحث کرسکیں۔
3. تاریخ کے مشہور راویوں اور مصنفین سے شناسا ہوں۔
4. اہم کتب تاریخ سے واقفیت ہو اور ان کی خوبیوں یا خامیوں کا علم ہو۔
5. تاریخی روایات کو قبول یا مسترد کرنے کے بنیادی قواعد سے آگاہ ہوں۔

(یونٹ:1.1)

مبادیاتِ تاریخ

تاریخ کی لغوی واصطلاحی تعریف:

عربی زبان میں تاریخ کا لغوی مطلب ہے: الاعلام بالوقت (وقت بتانا)

اہل عرب کہا کرتے ہیں: "اَرَّخَ زید الکتاب"

(زید نے مکتوب لکھ کر اس پر تاریخ درج کی) ①

علمِ تاریخ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے: "ھُوَ علمٌ یُبْحَثُ فِیْهِ عَنِ الزَّمَانِ وَ اَحْوَالِهٖ وَعَنْ اَحْوَالِ مَا یَتَعَلَّقُ بِهٖ مِنْ حَیْثُ تَعْیِیْنِ ذَالِکَ وَ تَوْقِیْتِهٖ" (یہ ایسا علم ہے جس میں وقت کے تعین کے ساتھ زمانے، اس کے حالات اور متعلقات کے احوال پر بحث کی جاتی ہے۔) ②

موضوع:

تاریخ کا اصل موضوع گزرے ہوئے لوگوں اور گزرے ہوئے زمانے کے حالات ہیں۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ نے اسی کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

"مَوْضُوْعُهُ الْاِنْسَانُ وَالزَّمَانُ"

تاریخ کا موضوع "انسان اور زمانہ" ہے۔ ③

پس ایک مؤرخ ہمیشہ اسی کی تلاش میں رہتا ہے کہ کس کس دور میں لوگوں کو کیا کیا واقعات و حالات پیش آئے۔ سو یہی اس علم کا اصل موضوع ہے۔

غرض وغایت:

تاریخ پڑھنے پڑھانے کے بنیادی مقاصد دو ہیں:

❶ انسانوں اور زمانے کے حالات سے عبرت ونصیحت حاصل کرنا

❷ قومی روایات، خصوصیات اور صفات سے آگاہ رہنا اور انہیں برقرار رکھنا۔

---

① الصحاح تاج اللغۃ لابی نصر الجوھری، مادہ: ارخ: ۴۱۸/۱، ط، دار العلم

② المختصر فی علم التاریخ للکافیجی، ص ۵۵

③ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ للسخاوی: ص ۱۷

قومی خصوصیات میں اخلاق وآداب، معاشرتی اقدار، سماجی رویے، بین الاقوامی تعلقات، مستقبل کی سوچ اور ماضی سے رشتہ بھی شامل ہیں۔ ①

تاریخ کے فوائد:

مطالعہ تاریخ کے بے شمار فوائد ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

❶ تاریخ ہمیں حالات کا صحیح تجزیہ کرنے اور کسی تازہ صورتحال میں درست فیصلہ کرنے کے قابل بناتی ہے؛ کیوں کہ تاریخ پڑھنے والا ماضی کے بہت سے حالات سے واقف ہوتا ہے جو حال کے مشابہ ہوتے ہیں۔

❷ تاریخ انسان کو تجربہ کار بناتی ہے۔ ایک سالار ایک عام سپاہی سے اس لیے اعلیٰ نہیں کہ اس میں طاقت اور پھرتی زیادہ ہے۔ طاقت میں بہت سے عام سپاہی سالار سے فائق ہوتے ہیں۔ بنیادی فرق تجربے اور قوتِ فیصلہ کا ہوتا ہے۔ تاریخ ماضی کے تجربات سے آگاہ کر کے انسان کو چند گھنٹوں میں صدیوں کے تجربات سے روشناس کراتی اور قوتِ فیصلہ بخشتی ہے۔

❸ تاریخ انسان کو چوکنا رکھتی ہے۔ حزم واحتیاط کا درس دیتی ہے۔ دور اندیشی پیدا کرتی ہے۔ سیاسی داؤ پیچ سمجھاتی ہے۔ دشمن کے حربوں سے بچنے کے گر بتلاتی ہے۔

❹ تاریخ اپنے اسلاف سے رشتہ جوڑ کر قومی غیرت وحمیت پیدا کرتی ہے جو تمام شریفانہ خصائل کی روح ہے، اس کے برخلاف بے حیائی اور بے غیرتی تمام رذائل کی جڑ ہے۔ غیرت وحمیت نہ ہو تو انسان بد سے بدتر کام کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتا۔ لیکن جسے اپنی شرافتِ نسبی کا احساس ہو، وہ اپنی عزت کو بٹا نہیں لگنے دیتا۔ یہی حال قوم کے اجتماعی ضمیر کا ہوتا ہے۔ اگر قوم کو معلوم ہو کہ وہ کن اسلاف کی وارث ہے تو وہ ہر آزمائش میں ڈٹ جائے گی اور بڑی سے بڑی طاقت کے آگے سر نہ جھکائے گی۔ لیکن اگر یہ احساس مر چکا ہو تو پھر قوم میں غدار اور کم ظرف لوگ جنم لینے لگتے ہیں۔

❺ تاریخ کا مطالعہ کیے بغیر ہم یہود ونصاریٰ اور دوسری اسلام دشمن طاقتوں کی سازشوں، مکاریوں اور نفسیات سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔

❻ تاریخ کا گہرا مطالعہ کر کے ہی ہم گمراہ فرقوں، سیکولر مؤرخوں اور مستشرقین کی ان نام نہاد تحقیقات کے تار و پود بکھیر سکتے ہیں جو وہ تاریخ کے نام پر پیش کر رہے ہیں۔

❼ اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے اچھی صحبت اور بڑے لوگوں کی مجالست سے زیادہ مفید چیز کوئی اور نہیں۔ تاریخ ہمیں کبھی دورِ نبوت میں لے جاتی ہے، کبھی عہدِ صحابہ کی بہاریں دکھلاتی ہے، کبھی شبلی اور جنید بغدادی کی مجالس میں بٹھا دیتی ہے، کبھی صلاح الدین ایوبی اور سلطان محمد فاتح کے دربار میں پہنچا دیتی ہے۔

---

① الاعلان بالتوبیخ: ص ۵۰ تا ۸۰

تاریخ اور دیگر علوم میں فرق:

تاریخ میں واقعات کو اس طرح ترتیب سے جمع کر کے پیش کرنے پر توجہ دی جاتی ہے کہ جو واقعہ پہلے ہوا ہے وہ پہلے سامنے آئے جو بعد میں ہوا ہے وہ بعد میں آئے۔ یا الگ الگ سلطنتوں اور ممالک کے حالات ایک ساتھ آجائیں۔

واقعات کتب حدیث اور کتب ادب میں بھی بیان کیے جاتے ہیں مگر ان کو تاریخ نہیں کہا جاتا؛ کیوں کہ حدیث یا ادب میں واقعات زمانے کی ترتیب سے نہیں ہوتے۔ اکثر جگہ واقعے کا مہینہ یا سال بھی بیان نہیں کیا جاتا۔ ادب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک واقعہ سامنے آجائے اور اس سے پڑھنے والا کوئی سبق یا تفریح حاصل کرے۔ حدیث میں واقعات کو فقہی احکام، شرعی آداب، سند کی حیثیت یا رواۃ کے ناموں کے لحاظ سے جمع کیا جاتا ہے جبکہ تاریخ میں حکمرانوں اور حکومتوں کے حالات وانقلابات کی واقعاتی ترتیب ملحوظ رکھی جاتی ہے کیوں کہ یہی تاریخ کا موضوع ہے۔

خلافِ اصول تاریخ پڑھنے کے نقصانات:

بہت سے لوگ تاریخ پڑھ کر ماضی سے بے زار اور اسلاف سے متنفر ہو جاتے ہیں کیوں کہ:

❶ کوئی اچھی چیز بھی اگر اصول کے خلاف استعمال کی جائے تو وہ مضر بن جاتی ہے۔ اکثر لوگ تاریخ پڑھتے پڑھاتے ہیں مگر علمائے اسلام کے مدون کردہ اصولِ تاریخ سے ناواقف رہتے ہیں۔ کسی بھی علم وفن کو اس کے اصول کی خلاف ورزی کے ساتھ اخذ کیا جائے تو کج فکری ہی جنم لیتی ہے۔

❷ تاریخی مآخذ میں گمراہ فرقوں کے راویوں نے جگہ جگہ اپنی خانہ ساز روایات شامل کی ہوئی ہیں جن کی تطہیر کا کام پوری طرح نہیں ہو سکا۔ ایسے مواد کا اندازہ ماہر علماء ہی لگا سکتے ہیں۔ عوام ان روایات پر یقین کر کے مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

❸ تاریخ نام ہے واقعات کے مجموعے کا۔ واقعات بعض اوقات پس منظر اور توجیہ سے خالی ہوتے ہیں۔ جس سے غلط فہمیاں جنم لے سکتی ہیں۔ کبھی کسی شخصیت کے مقام سے ناواقفیت کے باعث بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور کبھی کسی ہستی سے بغض وعناد کے باعث تاریخ کے مشکوک مواد کو بھی اس کے خلاف حجت بنا لیا جاتا ہے۔

❹ ہمارے اکثر تاریخ دان عربی وفارسی نہ جاننے کی وجہ سے تاریخ کے اصل مآخذ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے اور اردو یا انگریزی تراجم پر گزارا کرتے ہیں۔ اس طرح علم کی گہرائی حاصل نہیں ہو پاتی۔

❺ تاریخ کے اکثر پروفیسر اور ڈاکٹر حضرات انگریزی خوانی کی عادت کے باعث مستشرقین کی کتب سے استفادہ کرتے ہیں جو علمی تحقیقات کی آڑ میں نظریاتی وفکری زہر سے بھری ہوتی ہیں۔

❻ لوگ علم اسماء الرجال سے ناواقفیت کی بناء پر کذاب راویوں کی روایات کو بھی یقینی درجہ دینے لگتے ہیں۔

❼ بعض لوگ فنِ روایت سے جہالت کے باعث کسی روایت میں باعثِ تشویش مواد دیکھ کر راوی کے بارے میں متشددانہ آراء قائم کر لیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو سیرت اور تاریخ کے بنیادی مآخذ ہی کو منافقین اور مجوسیوں کے

افسانے قرار دے دیتے ہیں اور بعض اس قسم کا کچھ مواد ذخیرۂ حدیث میں پاکر انکارِ حدیث تک جا پہنچتے ہیں۔

تاریخ کے انہی مہالک سے خبردار کرتے ہوئے نامور مصری عالم شیخ علی طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مؤرخین کی روایت عامیانہ قسم کی ہوتی ہے، علمی کسوٹی پر پوری اترنے والی روایت محدثین حضرات کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کا پہلا مأخذ وہ ہے جو محدثین نے روایت کیا ہے۔ جو شخص محدثین کی اصطلاحات اور علم سے ناواقف ہو، اسے مؤرخ شمار نہیں کیا جاسکتا۔''

نیز وہ لکھتے ہیں:

''ہر وہ تجزیہ نگار جو کسی بحث کے آخر میں طبری کے صفحات کا حوالہ دینا کافی سمجھتا ہے وہ اس بات کا اظہار کررہا ہے کہ وہ اندھیری رات میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کا عادی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کیا لیا جائے اور کونسی چیز ترک کی جائے۔ اسلامی مؤرخ یا تاریخ اسلام کا استاذ وہی شخص بن سکتا ہے جو فنِ رجال سے واقف ہو، ان کے احوال سے باخبر ہو، علمِ حدیث اور اس کے اصول جانتا ہو، عربی کا ماہر ہو، کلامِ عرب کے ظاہری معنیٰ اور باطنی مفہوم کا فرق کرسکتا ہو، اس کے اشارے اور کنایے سمجھ سکتا ہو، تعصب اور خود غرضی سے پاک ہو، سچائی اور اللہ کی رضا کا طلب گار ہو۔ اگر وہ ان صفات سے عاری ہے تو پھر وہ تاریخ سے جاہل بلکہ دھوکہ باز شمار ہوگا چاہے وہ کسی یونیورسٹی میں استاذِ تاریخ ہو یا بڑی بڑی ڈگریوں کا حامل ہو۔ اس لیے کہ سرکاری ادارے تو کسی بھی شخص کو ڈگری دیکھ کر استاذ مقرر کردیتے ہیں اور ایسی ڈگریاں جعل سازی سے بھی حاصل کرلی جاتی ہیں۔ مگر کوئی حکومت یہ نہیں کرسکتی کہ جاہل کو عالم بنادے، متعصب کو پاک باز کردے یا دروغ گو کو سچا انسان بنادے۔''①

خلاصہ کلام:

(الف) تاریخ وہ علم ہے جس میں زمانے کے حوادث وواقعات پر وقت کی ترتیب ملحوظ رکھ کر بحث کی جاتی ہے اور قوموں، ملکوں، بادشاہوں اور مشہور شخصیات کے احوال بیان کیے جاتے ہیں۔

(ب) تاریخ کا بنیادی مقصد گزشتہ واقعات سے عبرت حاصل کرنا اور دوسروں کے تجربات سے سبق سیکھنا ہے۔

(ج) تاریخ ماضی کے تجربات کی روشنی میں حال و مستقبل کے لیے بہتر لائحہ عمل طے کرنے میں مدد دیتی ہے۔

(د) جو قوم بھی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی خواہاں ہوتی ہے وہ اپنی تاریخ سے رابطہ استوار رکھتی ہے۔ جو قوم اپنا ماضی بھلا دیتی ہے وہ دنیا میں کوئی مقام پانا تو درکنار اپنا تشخص تک باقی نہیں رکھ سکتی۔

❁❁❁

① قصص من التاریخ للطنطاوی، مقدمۃ، ص ۱۳، ۱۴، ط دار المنارۃ السعودیہ

تاریخ کی تاریخ

تاریخ نویسی کی ابتدائی شکلیں قدیم رومی، یونانی، چینی، شامی، مصری اور ہندی تہذیبوں میں نظر آتی ہیں۔قدیم دور کا انسان جب تک لکھنے پڑھنے سے واقف نہ تھا تب بھی وہ گزرے ہوئے لوگوں خصوصاً اپنے آباؤاجداد کے قصے سننے کا شوقین تھا۔قبیلوں کی مائیں اپنے بچوں کو گزشتہ دور کے بہادروں اور نامور لوگوں کے واقعات سنا کر ان کی تربیت کیا کرتی تھیں۔قوم یا قبیلے کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کا ایک مشہور طریقہ شعروشاعری تھا۔شاعر اور گویے عام محفلوں میں پرانے قصوں کو منظوم انداز میں پیش کیا کرتے تھے اور قوی الحافظہ لوگ ان اشعار کو یاد کر لیتے تھے۔یہ اشعار نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے تھے۔عموماً یہ شاعری رزمیہ ہوا کرتی تھی یعنی اس میں قوم کے بہادر لوگوں کے کارنامے بیان کیے جاتے تھے۔تاریخ کے قدیم ترین چینی، آریائی اور عربی مآخذ نظموں ہی کی صورت میں ملتے ہیں۔آج بھی خانہ بدوش قبائل اور غیر متمدن علاقوں میں یہ طریقہ رائج ہے۔

لکھنے پڑھنے کے فن کو کچھ ترقی ہوئی تو مہذب و متمدن بادشاہتوں میں تاریخ کے بعض واقعات کو حکمرانوں کے ایماء پر قلم بند کیا جانے لگا۔مذہبی کتب اور آسمانی صحائف میں بھی بعض اقوام کے حالات کا کچھ حصہ محفوظ ہو گیا۔اشعار کے علاوہ اس دور کے تاریخی مآخذ میں بائبل یعنی عہد نامہ عتیق و جدید، بھگوت گیتا، مہابھارت اور رامائن وغیرہ مشہور ہیں۔یہ مآخذ اپنی تحریفات کے باوجود قدیم دور کے حالات کے بنیادی مآخذ سمجھے جاتے ہیں۔

اس دور کو ہم باقاعدہ تاریخ نگاری کا دور نہیں کہہ سکتے مگر اس دور کے مآخذ کی اہمیت بعد کے دور میں بہت بڑھ گئی کیوں کہ قدیم دور کے انسان کے حالات کو جاننے کا ذریعہ ان کے سوا کچھ اور نہیں رہا تھا۔

روم اور یونان کی تاریخ میں پانچ سو سال قبل از مسیح اور اس کے بعد کے حالات وواقعات کو محفوظ مانا جاتا ہے کیوں کہ یہ حکمائے یونان یعنی سُقراط، اَفلاطون اور اَرِسطو کا دور تھا جس میں اہلِ یورپ کے ہاں پڑھنا لکھنا رائج ہو چکا تھا، اسی لیے ہنی بال، سکندرِ اعظم اور سیزر جیسے بادشاہوں کے حالات کا خاصا حصہ ان کے ہاں محفوظ ہو گیا۔یہ الگ بات ہے کہ یہ تاریخ سلسلۂ اسناد سے محروم ہے۔

یورپ میں تاریخ نویسی کی اس ترقی کے باوجود مشرق میں دیر تک اندھیرا چھایا رہا، تاریخ ہندوستان پانچ سو سال قبل از مسیح میں بھی تاریک نظر آتی ہے۔اشوکا، گوتم بدھ اور کنشک اعظم کے متعلق منظوم و بے سروپا داستانوں کے سوا یہاں کچھ نہیں ملتا۔

تاریخ نویسی نے ایک قدم مزید آگے تب بڑھایا جب دنیا کی مختلف قوموں میں لکھنے پڑھنے کا رجحان بڑھ جانے کی

وجہ سے وقائع نگاری کا آغاز ہوا۔ وقائع نگار وہ مخبر یا منشی ہوتے تھے جو ملک کے مختلف حصوں کی اہم خبریں قلم بند کر کے حکمران کو بھیجا کرتے تھے۔ ان کے روزنامچوں کا ریکارڈ مؤرخین کو ماضی کے حالات جمع کرنے میں بڑی مدد دیتا تھا۔

تقویم:

کسی واقعے یا حادثے کا وقت یاد رکھنے کا سادہ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسے کسی ایسے بڑے واقعے کے ساتھ منسوب کر دیا جائے جو سب کو معلوم ہو۔ قدیم دور میں عوام وخواص سب کے ہاں یہی طریقہ رائج تھا؛ کیوں کہ تقویم (کیلنڈر) کا کوئی رواج نہیں تھا۔ پس لوگ مشہور واقعات سے تاریخ کا اندازہ لگاتے تھے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شروع میں لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے دنیا میں اتارے جانے سے تاریخ کا حساب لگاتے تھے، جب طوفان نوح میں مخلوق ہلاک ہوگئی تو باقی ماندہ لوگوں نے طوفانِ نوح سے تاریخ کا آغاز کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد دنیا میں پھیل گئی اور ہر ایک نے اپنے اپنے طرز پر تاریخ یاد رکھنا شروع کی۔ عربوں نے ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے سے حساب رکھا۔ پھر اولادِ اسحٰق (یہود) سالوں کا تخمینہ لگانے کے لیے یوسف علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام تک، پھر موسیٰ علیہ السلام سے سلیمان علیہ السلام تک اور بعد میں سلیمان علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک کے زمانوں کا حساب لگاتے رہے۔ اولادِ اسماعیل نے کعبۃ اللہ کی تعمیر سے تاریخ شروع کی۔ بعد والوں نے کعب بن لُوی کی وفات سے نیا حساب رکھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر قریش نے عام الفیل سے سالوں کو شمار کرنا شروع کیا۔ بعد میں مسلمانوں نے ہجرت نبویہ سے ہجری سن کا حساب شروع کیا۔ دوسری طرف اہل روم سکندر اعظم کے دور سے تاریخ شمار کرتے تھے۔ اہلِ فارس اپنے ہر بادشاہ کی تخت نشینی سے سالوں کا تخمینہ لگاتے تھے۔

تقویم یا کیلنڈر کا آغاز تاریخ نگاری کے لیے اہم سنگ میل تھا۔ مختلف اقوام اور حکومتوں نے مختلف اوقات میں اپنے اپنے کیلنڈر جاری کیے مگر عالم گیر شہرت دو ہی تقویمات کو ملی: ایک عیسوی تقویم کو جسے نصرانی پادریوں اور حکومتوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سال ولادت سے شروع کیا۔ یہ شمسی تقویم ہے۔ دوسری ہجری تقویم کو جسے مسلمانوں نے ہجرتِ مدینہ سے شروع کیا، یہ چاند کے حساب سے ہے۔

عربوں نے اپنی سہولت کے لیے قمری مہینے: محرم، صفر، ربیع الاوّل وغیرہ اختیار کیے تھے مگر ان کے لیے سالوں کا شمار نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ سالوں کو کسی اہم واقعے کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مثلاً فلاں جنگ کے بعد والا محرم اور فلاں معاہدے سے پہلے والا رمضان۔ اس سے ان کے سادہ تمدن کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ اکثر معاملات زبانی طے ہوتے تھے۔ دستاویزات، رقعوں اور خطوط کا استعمال تو ہوتا تھا مگر انہیں عرصہ دراز تک محفوظ رکھنے کا رواج نہ تھا، اس لیے ان پر الگ الگ سالوں کے اندراج کی نوبت نہیں آتی تھی، پس اس حوالے سے کبھی کوئی الجھن پیش نہ آئی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں جب عرب پہلی بار دنیا کے مشرق ومغرب کے مالک بنے اور سرکاری دفاتر میں مراسلوں، رسیدوں اور دوسری دستاویزات کا ایک تانتا بندھنے لگا تو یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا کہ کون سی تحریر کس سال کی

ہے۔ایسے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اس طرف توجہ دلائی اور پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس آپ کے ایسے خطوط آتے ہیں جن پر تاریخ کا اندراج نہیں ہوتا۔آپ کوئی تاریخ مقرر فرمائیے۔یہ بھی روایت ہے کہ یمن سے آئے ہوئے ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ اہل یمن اپنے خطوط پر تاریخ لکھتے ہیں،آپ بھی ایسا کوئی انتظام کیجیے۔

ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک خط آیا جس پر فقط شعبان لکھا تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ کونسے سال کا شعبان ہے؟''پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے فرمایا:''لوگوں کے لیے کوئی وقت مقرر کردیں،جس سے وہ تاریخ شمار کیا کریں۔''بعض نے کہا:''اہل روم کی تاریخ اختیار کرلی جائے۔''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''رومیوں کی تاریخ کا شمار بہت طویل ہے،وہ سکندر کے دور سے شمار کرتے ہیں۔''کسی نے کہا:اہل فارس کی تاریخ اختیار کرلیں۔''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''ان کے ہاں ہر بادشاہ کی تخت نشینی پر تاریخ نئے سرے سے شروع ہوتی ہے۔''آخر یہ طے پایا کہ اپنی الگ تقویم رکھی جائے۔اب سوال اٹھا کہ کب سے؟تین آراء سامنے آئیں: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے۔ہجرت سے۔وفات سے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا:

''ہجرت سے تقویم کا آغاز کیا جائے؛کیوں کہ اسی سے حق وباطل کے درمیان فرق ہوا۔''

جب صحابہ کرام کی مشاورت میں یہ فیصلہ ہوگیا کہ اسلامی تاریخ کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے شروع کیا جائے گا تو اگلا سوال یہ پیدا ہوا کہ کس ماہ سے؟چونکہ ہجرت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی اس لیے بعض حضرات کی رائے اسی مہینے کو ہجری سال کا آغاز قرار دینے کی تھی۔بعض نے ماہ رمضان کی فضیلت کی بناء پر اس کا مشورہ دیا مگر فیصلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے پر ہوا جنہوں نے محرم کے فضائل بیان کرتے ہوئے کہا:''محرم سے تقویم شروع کی جائے کہ یہ حرمت والا مہینہ ہے۔یہی سال کا پہلا مہینہ ہے۔اس میں لوگ حج سے لوٹتے ہیں۔''

اس طرح یہ طے ہوگیا کہ سال ہجری محرم سے شروع ہوگا۔یہ واقعہ سن ۱۷ یا ۱۸ ہجری کا ہے۔

یہ ہجری تقویم کا آغاز تھا جو اسلامی تاریخ نگاری کا بنیادی پیمانہ ہے۔[1]

❀❀❀

کتب تاریخ اوران کے مؤلفین

مسلمانوں کی کتب تاریخ کی فہرست بہت طویل ہے جن میں چند مفید اور مقبولِ عام تصانیف یہ ہیں:

❶ تاریخ خلیفہ بن خیاط ❷ تاریخ طبری ❸ الکامل فی التاریخ ❹ تاریخ الاسلام ذہبی ❺ البدایہ والنہایہ ❻ تاریخ ابن خلدون ❼ تاریخ الخلفاء۔ان کتب اوران کے مؤلفین کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

---

① الشماریخ فی علم التاریخ للسیوطی: ص ۷ تا ۱۵؛ تاریخ الطبری: ۲/۲۸۸

① تاریخ خلیفہ بن خیاط:

یہ امام خلیفہ بن خیاط رحمہ اللہ (م ۲۴۰ھ) کی تالیف ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ تھے۔ اسے مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ تاریخ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے خلیفہ متوکل عباسی کے دور تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ سالوں کی ترتیب کا پورا لحاظ اور اسلوب میں اختصار اس کتاب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اکثر روایات ثقہ راویوں سے لی گئی ہیں۔

② تاریخ طَبَری:

اس کا اصل نام تاریخ الامم والملوک ہے۔ اس کے مؤلف ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری رحمہ اللہ ہیں جو اہلِ سنت کے عظیم فقیہ، مفسر، محدث اور مؤرخ ہیں۔ انہی کے ہم نام ایک شیعہ مؤرخ، ابوجعفر محمد بن جریر بن رُستم الطبری ہیں۔ نام کی مشابہت کی وجہ سے کئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ سنی طبری کو شیعہ سمجھ لیا جاتا ہے۔

محمد بن جریر بن یزید الطبری رحمہ اللہ ۲۲۵ھ میں طبرستان میں پیدا ہوئے۔ مصر، شام اور دوسرے شہروں کے مشائخ سے حدیث، قراءت اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ آخر میں بغداد آگئے، یہاں درسِ حدیث، فتویٰ نویسی اور تصنیف کا مشغلہ اختیار کیا۔ بعد میں ہمہ تن تصنیف وتالیف میں مصروف ہوگئے اور بڑی تعداد میں انتہائی مفید تصانیف پیش کیں۔ ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

امام طبری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ کو انبیائے کرام علیہم السلام سے شروع کر کے ۳۰۲ھ کے احوال پر ختم کیا ہے۔ اس میں دورِ رسالت، دورِ خلافتِ راشدہ اور خلافتِ بنوامیہ کے علاوہ عہدِ بنوعباس کے ابتدائی آٹھ عشروں کی تفصیلات موجود ہیں۔ یہ تاریخ بعد میں آنے والی اکثر وبیشتر اسلامی تواریخ میں دوسری ہجری تک کے حالات کا بنیادی ماخذ ہے۔

تاریخ طبری کی چند خصوصیات یہ ہیں:

❶ اس میں ہر روایت کی سند بیان کردی گئی ہے تاکہ اہلِ علم اس کی حیثیت کا اندازہ کرلیں۔

❷ مؤرخ خود بہت بڑے فقیہ، محدث اور مفسر ہیں، اس لیے کسی اور مؤرخ کی بہ نسبت ان پر زیادہ اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

❸ طبری نے مصادر سے روایات کو من وعن لیا ہے، کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس لیے طبری کا مطالعہ کرنے والا گویا سابقہ زمانے کی تواریخ کا لفظ بلفظ مطالعہ کرتا ہے۔

امام طبری نے روایات کو کسی قسم کے تبصرے کے بغیر پیش کیا ہے، رواۃ پر کوئی بحث کی ہے نہ کسی روایت کی وضاحت۔ اس لیے بعض اوقات یہ غلط فہمی پیدا ہوجاتی ہے کہ مصنف ہر قسم کی روایات سے متفق ہیں۔ پھر چونکہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ شیعہ مؤرخ ابن جریر طبری کے ہم نام ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ میں صحابہ کرام پر طعن سے آلودہ بہت سی روایات بھی شامل ہیں اس لیے ان کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ وہ شیعہ ہیں۔ اسی وجہ سے ان پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ وہ شیعوں کے لیے روایت سازی کرتے تھے مگر یہ الزام درست نہیں۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس

الزام کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"هذا رجم بالظن الكاذب بل ابن جرير من كبار أئمة الاسلام المعتمدين ."

"یہ ایک قیاس محض اور جھوٹا گمان ہے، ابن جریر تو اسلام کے بڑے اور قابلِ اعتماد ائمہ میں سے تھے۔"①

رہی یہ بات کہ اس میں ایسی نامناسب روایات موجود ہیں جن سے گمراہ فرقے استدلال کر کے اعتراضات اٹھاتے ہیں تو اس کا جواب خود امام طبری رحمہ اللہ نے کتاب کے مقدمے میں دے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"میری اس کتاب میں جو بھی روایت ایسی ہو جسے پڑھنے والا عجیب سمجھے یا سننے والا ناپسند کرے کہ اس کے صحیح ہونے کی کوئی منطق سمجھ میں نہ آرہی ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی روایات ہماری اختراع نہیں، بلکہ وہ ناقلین سے ہمیں اسی طرح پہنچی ہیں۔ ہم نے اسی طرح پیش کر دی ہیں جیسے ہمیں پہنچی تھیں۔"②

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مصنف نے روایات کے صحیح یا غلط ہونے کی ذمہ داری نہیں اٹھائی۔ انہوں نے ہر طرح کی روایات جمع کر کے جانچ پڑتال کا کام قارئین اور بعد کے علماء کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ ذمہ داری ان پر ڈال دی ہے کہ وہ اس میں سے صحیح وسقیم کی پہچان کر لیں۔ دوسرے لفظوں میں امام طبری نے "تاریخ بالروایۃ" پیش کی ہے۔ اس زمانے کے اکثر مؤرخین ومحدثین کا طریقہ یہی تھا کہ وہ روایات نقل کر دیتے تھے، استدلال نہیں کرتے تھے۔

رہی یہ بات کہ کسی روایت کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا فیصلہ بعد والے کیسے کریں گے؟ اس کے لیے طبری نے ہر روایت کی سند بیان کر دی ہے۔ رواۃ کے احوال کو جانچ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کونسی روایت کس قدر معتبر ہے۔

پس امام طبری رحمہ اللہ یا دیگر جلیل القدر علماء کی مرتب کردہ تواریخ میں ایسی ضعیف یا ناقابلِ قبول روایات کے آجانے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ یہ حضرات ان روایات سے صحابہ کی عدالت کے خلاف استدلال کر رہے تھے، یا ان کا مقصد لوگوں کو کسی غلط نظریے پر آمادہ کرنا تھا۔

③ الکامل فی التاریخ:

"الکامل فی التاریخ" علامہ محمد بن محمد بن اثیر الجزری رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ وہ ۵۵۵ھ میں موصل کے قریب جزیرہ ابن عمر میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے علم کے لیے عراق، شام اور القدس کے اسفار کیے۔ آخر میں موصل آگئے اور وفات تک وہیں تصنیف وتالیف کا مشغلہ اپنائے رہے۔ ۶۳۰ھ میں دارِ فانی سے کوچ کیا۔

الکامل فی التاریخ ان کی شہرۂ آفاق تالیف ہے جس نے ہر دور میں اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ دورِ آدم سے لے کر عالمِ اسلام پر چنگیز خان کے حملے کے حالات پوری شرح وبسط سے بیان کیے ہیں اور گزشتہ صدیوں میں مرتب کیے گئے عربی وفارسی مآخذ سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔

---

① میزان الاعتدال: ۳/۴۹۹ ط دار المعرفة بيروت

② تاریخ الطبری: ۱/۷، ۸

الکامل فی التاریخ کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

❶ واقعات میں ترتیب زمانی پر اصل مدار رکھا گیا ہے۔ یعنی ایک سال کے واقعات چاہے وہ عرب کے ہوں یا فارس وہندوستان کے، ایک ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ پھر اگلے سال کے واقعات ذکر کیے گئے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ کوئی واقعہ پڑھتے ہوئے ہم پورے اعتماد کے ساتھ اس کے سن وقوع سے آگاہ رہتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر ہمیں کسی واقعے کا سن معلوم ہو اور ہم ''الکامل فی التاریخ'' میں اس کی تفصیل دیکھنا چاہیں تو چند لمحوں میں مطلوب کو تلاش کر سکتے ہیں۔

❷ گزشتہ تاریخی کتب میں روایات کو من وعن درج کرنے کا طرز عام تھا جس سے ضخامت بڑھ جاتی تھی اور قارئین اکتا جاتے تھے۔ ابن اثیر نے اس طرز کو ترک کر کے روایات کا نچوڑ نکال لیا ہے اور ان واقعات کا انتخاب کیا ہے جو حال اور مستقبل پر اثر انداز ہوئے ہوں۔

❸ ہر سال وفات پانے والے مشاہیر کا ذکر پورے اہتمام سے کیا ہے۔

❹ سال کے آخر میں نادر اور عجیب واقعات بھی نقل کیے ہیں۔

❺ تصنیف کو دلچسپ بنانے کا خاص خیال رکھا ہے۔ جابجا علماء، فاتحین اور بادشاہوں کے سبق آموز واقعات اور پرلطف قصے بیان کیے ہیں۔

❻ حکمرانوں کے غلط فیصلوں پر تنقید بھی ہے اور موقع بموقع تاریخ سے عبرت دلائی ہے۔

''الکامل فی التاریخ'' کی کمزوریاں درجِ ذیل ہیں:

❶ ابن اثیر رحمہ اللہ نے روایت لینے کے معاملے میں توسع اپنایا ہے اور بہت سی غیر معتبر روایات بھی نقل کی ہیں۔

❷ روایات کی سند کہیں بیان نہیں کی گئی لہٰذا طلبہ کے لیے تحقیق کرنا بہت مشکل ہے کہ مواد کس حد تک معتبر ہے۔

الغرض مجموعی طور پر یہ ایک مفید تالیف ہے۔ اگر اس میں روایات کا معیار کچھ بلند رکھا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔

④ تاریخ الاسلام:

اس کے مؤلف حافظ شمس الدین محمد بن احمد الذہبی رحمہ اللہ ہیں جو ۶۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ترکمان قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ آخر میں دِمشق میں رہائش اختیار کی اور تصنیف وتالیف اور تدریس میں زندگی گزار دی۔ سو کے قریب معرکۃ الآراء تصانیف ان کا علمی وقلمی شاہکار ہیں۔ انہیں خاتمۃ الحفاظ کہا جاتا ہے۔ علامہ سخاوی رحمہ اللہ کے بقول لوگ حدیث اور رجال کے فنون میں چار شخصیات کی اولاد ہیں: ''مزی رحمہ اللہ، ذہبی رحمہ اللہ، عراقی رحمہ اللہ اور ابن حجر رحمہ اللہ۔''

ان کی تاریخ الاسلام کا پورا نام '' تَارِیخُ الْإِسْلَامِ وَوَفِیَاتُ الْمَشَاهِیْرِ وَالْأَعْلَامِ '' ہے۔ یہ ''تاریخ دِمشق'' کے بعد اسلامی تاریخ کا سب سے ضخیم مأخذ ہے۔ ''تاریخ الاسلام'' کی خوبیاں درجِ ذیل ہیں:

❶ اس میں زمانے اور شخصیات کو طبقات میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر طبقے کے حالات کو ''حوادث'' کے عنوان سے

بیان کیا گیا ہے، پھر اس زمانے کے مشاہیر کے حالات ''وفیات'' کے عنوان سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح اس میں تین علوم: تاریخ، رجال اور طبقات کو جمع کر دیا گیا ہے۔

② تاریخی روایات پر بقدرِ ضرورت تبصرہ بھی ہے اور مؤرخین و رواۃ پر جرح بھی۔

③ حافظ ذہبی رحمہ اللہ معتدل المزاج اور وسیع النظر ہیں، اس لیے روایات اور شخصیات کے متعلق نہایت محتاط اور نپی تلی رائے دیتے ہیں جو اکثر و بیشتر نہایت وزنی ہوتی ہے۔

④ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے روایات کے انتخاب میں بھی گزشتہ تمام مؤرخین سے بہتر اور محتاط منہج اپنایا ہے، اس لیے ان کی تاریخ رطب و یابس اور من گھڑت باتوں سے بڑی حد تک پاک ہے۔ محققین کے لیے یہ نہایت قیمتی ماخذ ہے۔

البتہ اس کی ضخامت غیر معمولی ہے، لہٰذا ہر کسی کے لیے اسے خریدنا اور اس سے استفادہ کرنا آسان نہیں۔ نیز اس میں ''وَفیات'' کا حصہ اصل تاریخ کی بہ نسبت بہت بڑھ گیا ہے، جس کے باعث واقعات کی رفتار میں بہت طویل وقفے آجاتے ہیں۔

⑤ البدایہ والنہایہ:

یہ حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے جو بیک وقت محدث، ناقد، مفسر اور فقیہ تھے۔ ۷۰۱ھ میں شام کے شہر بُصریٰ میں پیدا ہوئے اور ۷۷۴ھ میں دِمَشق میں وفات پائی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''البدایہ والنہایہ'' میں جو خصوصیات مدنظر رکھی ہیں وہ یہ ہیں:

① سیرت نبویہ میں بہت تفصیل کے ساتھ روایات جمع کی ہیں اور ان میں اسناد کے ساتھ نقد و نظر کا اہتمام کیا ہے۔

② دورِ صحابہ اور زمانہ فتن کی اکثر روایات طبری یا الکامل فی التاریخ سے لی ہیں اور حسبِ ضرورت جرح بھی کی ہے۔

③ حافظ ابنِ کثیر نے احوالِ انبیائے کرام، سیرتِ نبویہ اور سیرتِ صحابہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے وہاں تحقیق اور تفصیل سے کام لیا ہے، تاکہ اس بارے میں قابلِ قبول روایات جمع ہو جائیں۔ سلاطین اور خلفاء بنواُمیہ اور بنوعباس کے حالات انہوں نے مختصراً بیان کیے کہ یہ چیزیں دیگر ماخذ (الکامل، طبری) میں مفصل آچکی تھیں۔

④ اپنے دور کے واقعات کو جو بغداد پر ہلاکو خان کے حملے سے لے کر مصر و شام کے مملوک سلاطین کی فتوحات تک ہیں، بہت تفصیل سے بیان کیا ہے؛ کیوں کہ یہ احوال کسی اور مفصل تاریخ میں اس طرح مدوّن نہیں تھے۔

تاہم ان خوبیوں کے باوجود ''البدایہ والنہایہ'' میں بعض مقامات پر مصنف سے تسامح ہوا ہے اور وہاں ناقابلِ اعتبار روایات بلا نقد لے لی گئی ہیں۔[1] نیز واقعات اور احوال کو الگ الگ سالوں میں ذکر کرنے کے باعث واقعات کا تسلسل بار بار منقطع ہو جاتا ہے۔

---

① ملاحظہ ہو: البدایہ والنہایہ: ۱۱/ص ۶۴۳، مطبوعہ دارہجر، محمد بن زکریا الغلابی کی روایت

⑥ تاریخ ابنِ خلدون:

اس کتاب کا اصل نام ''تاریخ العبر و دیوان المبتدأ والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر'' ہے۔ اس کے مصنف علامہ عبدالرحمن ابن خلدون رحمہ اللہ کی ولادت ۷۳۲ھ میں اور وفات ۸۰۸ھ میں ہوئی۔ اسلامی سلطنتوں میں ریاست وقضا کے عہدوں پر فائز رہے لہٰذا سیاسی اتار چڑھاؤ دیکھنے اور رموزِ حکمرانی سمجھنے کا خوب موقع ملا۔

تاریخ ابن خلدون گزشتہ تمام تاریخی کتب سے الگ ہے۔ اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

❶ اس کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں جغرافیہ، تاریخ، معاشرے کی تشکیل، ترقی، عروج وزوال کے اسباب اور تمدنی حقائق پر ایسی روشنی ڈالی گئی ہے جس کی پہلے کوئی مثال نہ تھی۔ یہ تاریخ اسی مقدمے کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوئی۔ ''مقدمۂ ابن خلدون'' کے باعث ابن خلدون کو عمرانیات کا بانی شمار کیا گیا ہے۔

❷ تاریخی واقعات کی ترتیب میں زمانے پر مدار نہیں رکھا گیا بلکہ مختلف بادشاہتوں اور خاندانوں کو لے کر ان کے آغاز سے انتہاء تک تمام واقعات کو ایک تسلسل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح قارئین کا ذہن منتشر ہونے سے بچ جاتا ہے۔

❸ انداز غیر جانبدارانہ ہے۔ زبان سادہ اور مدلل ہے۔

❹ واقعات میں ربط ہے۔ خود بخود سمجھ آجاتا ہے کہ یہ واقعہ گزشتہ واقعے کا ردِ عمل ہے اور اگلے واقعے کا سبب ہے۔

❺ روایت میں درایت (عقل وقیاس کے مطابق ہونے) کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

❻ بڑے بڑے واقعات کے اتار چڑھاؤ کو مختصر الفاظ میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ کوئی اہم جزو حذف نہیں ہونے پاتا اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تاریخ کا علم حاصل ہوتا ہے۔ آپ تاریخ ابن خلدون کے دس اوراق پڑھ کر کسی بھی دوسری تاریخ کے پچاس صفحات سے زیادہ مواد پر حاوی ہو سکتے ہیں۔

ان خوبیوں کے باوجود اس تاریخ کا اندازِ بیان خشک ہے جس کے باعث اس میں ''الکامل فی التاریخ'' یا ''البدایہ والنہایہ'' کی طرح دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔

⑦ تاریخ الخلفاء:

''تاریخ الخلفاء'' علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (م ۹۱۱ھ) کی تالیف ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے۔ اس میں خلفائے راشدین، خلفائے بنواُمیہ، خلفائے بنوعباس بغداد اور خلفائے بنوعباس قاہرہ کے حالات کو جو تقریباً نو صدیوں پر مشتمل ہیں، ایک جلد میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ یوں ہزارہا صفحات میں بکھرے ہوئے مباحث کا مطالعہ بہت کم وقت میں کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس میں بعض من گھڑت روایات بھی شامل ہیں مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے متعلق ایک طویل روایت نقل کی گئی ہے جو بالکل غیر معتبر ہے۔ ایسی روایات اس بہترین کام کی شان کو کم کر دیتی ہیں۔

❁❁❁

تاریخ نگاری کے مآخذ

تاریخی مواد ہمیشہ چار قسم کے مآخذ سے حاصل کیا جاتا ہے:

① ذاتی مشاہدہ ② آثارِ منقولہ یعنی سینہ بسینہ روایات ③ آثارِ مضبوطہ یعنی تحریری مواد ④ آثارِ قدیمہ۔

❶ ذاتی مشاہدہ: مؤرخ اپنی زندگی یا اپنے دور کے چشم دید حالات قلم بند کرتا ہے تو وہ ذاتی مشاہدہ کہلاتا ہے جیسے مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر کی ''تزکِ بابری'' اور والیٔ افغانستان امیر عبدالرحمن کی ''تاج التواریخ'' ان کے اپنے مشاہدات پر مبنی ہیں۔ مؤرخ کے اس بیان کو جو ذاتی مشاہدے پر مبنی ہو، بہت معتبر تسلیم کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ دیگر ہم عصر مؤرخین کے متفقہ بیانات اور دوسرے واضح قرائن وشواہد سے نہ ٹکراتا ہو۔

❷ آثارِ منقولہ، سینہ بسینہ روایات: اس سے مراد وہ مواد ہے جو مؤرخ اپنے ہم عصر لوگوں سے سنتا ہے۔ ان میں امرائے دربار، حکام، سفیر، علماء، افسرانِ فوج، سپاہی، تاجر، سیاح، بڑے بوڑھے اور وہ عام لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو حالاتِ حاضرہ یا ماضی قریب سے براہِ راست واقف ہوتے ہیں اور ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

❸ آثارِ مضبوطہ یعنی تحریری مواد: مؤرخ ہر شے کا مشاہدہ خود نہیں کرسکتا، نہ ہی ہر بات کسی راوی سے سن سکتا ہے، پہلے زمانے کی تاریخ تو وہ دوسرے ذرائع سے لیتا ہے۔ یہ ذرائع تحریری شکل میں ہوں تو انہیں آثارِ مضبوطہ کہا جاتا ہے۔ ان میں خطوط، فرامین، رسیدیں، مراسلے، معاہدے، سرکاری ریکارڈ اور ہر قسم کا تحریری مواد شامل ہوتا ہے۔ اکثر طویل زمانی فاصلوں کے باعث گزشتہ ادوار کے حالات سے آگاہی کا کوئی اور ذریعہ نہیں رہتا۔ ایسے میں گزشتہ دور کی تاریخی کتب ہی سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

❹ آثارِ قدیمہ: تاریخ کو سمجھنے اور اس میں عمق پیدا کرنے کے لیے آثارِ قدیمہ کی بڑی اہمیت ہے۔ آثارِ قدیمہ میں قدیم شہر، محلات، پرانے قلعے، مساجد، کنوئیں، فصیلیں، مزارات اور کتبے بھی شامل ہیں۔ اسی طرح وہ پہاڑ، وادیاں اور میدان بھی مؤرخ کے لیے اہم ہوتے ہیں جہاں جنگیں ہوئی تھیں۔ کھدائی سے برآمد ہونے والے تہذیبی آثار مثلاً: برتن، ہتھیار، سکے اور اَوزار بھی اس حوالے سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ موئن جوڈرو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کے کھنڈرات سے برآمد ہونے والی چیزوں کو دیکھ کر ہم قدیم لوگوں کی تہذیب وثقافت کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

آثارِ قدیمہ سے صحیح استفادہ جبھی ممکن ہے، جب ہمارے پاس بنیادی تاریخی مواد بقدرِ ضرورت موجود ہو۔ اسے بنیاد بنا کر آثارِ قدیمہ سے جزئیات اور مزید دقیق تفصیلات معلوم کی جاسکتی ہیں یا کسی واقعے کے مزید شواہد حاصل کیے جاسکتے ہیں یا کئی احتمالات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ کتبِ تاریخ کے بغیر فقط آثارِ قدیمہ سے مدد لے کر کسی واقعے کو پوری طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔ پس اگر کوئی شخص محض آثارِ قدیمہ کے مشاہدات کے بل بوتے پر تاریخ کے مستند مواد کو مسترد کرے گا تو اس کا یہ طرزِ عمل قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

تاریخ نویسی کے انداز:

تاریخ نویسی تین انداز کی ہوتی ہے: ① تاریخ بالروایۃ ② تاریخ بالدرایۃ ③ تاریخ بالراویۃ والدرایۃ

''تاریخ بالروایۃ'' میں روایات کو من وعن نقل کر دیا جاتا ہے۔ مؤرخ اپنی طرف سے کوئی تشریح یا تبصرہ نہیں کرتا۔ اس کی حیثیت صرف ناقل کی ہوتی ہے۔ واقعے سے نتیجہ نکالنا قارئین کا کام ہوتا ہے۔ قدیم کتب تاریخ مثلاً ''طبقات ابن سعد''، ''تاریخ طبری''، ''انساب الاشراف'' اور ''فتوح البلدان'' وغیرہ اسی انداز کی ہیں۔

''تاریخ بالدرایۃ'' میں مؤرخ چند روایات یا قرائن کو لے کر کسی واقعے کی کڑیاں ملاتا چلا جاتا ہے۔ آثار قدیمہ اور دوسرے شواہد اور کچھ قیاسات سے ایک تاریخ مرتب کر دیتا ہے۔

''تاریخ بالروایۃ والدرایۃ'' یہ ہے کہ روایات اور عقلی امکانات دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلیں۔ اصل مدار تاریخی روایات پر رکھا جائے مگر گری پڑی باتوں کو جمع نہ کیا جائے۔ واقعات کی حقیقت سے قریب تر اور غیر جانبدارانہ تشریح کی جائے۔ یہ تاریخ نویسی کا سب سے بہتر انداز ہے۔

واقعات کی منطقی ترتیب:

واقعات، حالات اور انقلابات جس قدر غیر معمولی ہوتے ہیں، ان کا سبب بننے والے واقعات بھی اسی کے مطابق خاص ہوتے ہیں۔ اللہ مسبب الاسباب نے کائنات کو عالم اسباب بنایا ہے۔ شاذ و نادر صورتوں کو مستثنیٰ کر کے یہ طے ہے کہ ہر کام اور ہر واقعہ اپنے سے گزشتہ کسی واقعے کا اثر ہوتا ہے اور پھر خود یہ واقعہ آگے کسی نہ کسی واقعے کا سبب بن رہا ہوتا ہے۔ واقعات کے مابین اس تعلق کو ''منطقی ربط'' کہتے ہیں جسے سامنے لانا تاریخ نگار کے لیے ضروری ہے۔ اگر تاریخ منطقی ربط سے خالی ہو تو وہ عبرت و نصیحت کی جگہ ایک پہیلی بن کر ذہنی تشویش کا باعث ہو جاتی ہے۔ منطقی ترتیب کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر طور پر ضعیف روایات سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔

خبریت کے چھ بنیادی سوال:

منطقی ربط اسی وقت واضح ہوتا ہے جب تاریخی واقعات ''خبریت'' کے معیار پر پورے اُتر رہے ہوں۔ ''خبریت'' کی پہلی شرط ہے بات کا قابلِ ذکر ہونا۔ اگر کوئی کہے کہ ''آج تاجروں نے دکانیں کھولیں۔'' تو یہ کوئی خبر نہیں۔ لیکن اگر اطلاع ملے کہ ''آج شہر بھر میں دکانیں بند رکھی گئیں۔'' تو یہ ایک ''خبر'' کہلائے گی۔ اطلاعات اور معلومات کی بھرمار میں سے جو باتیں ''خبر'' کے معیار پر ہوتی ہیں، ان کے مجموعے سے ''اخبار'' بنتا ہے۔ پھر کچھ مدت بعد ''اخبار'' کے مجموعوں سے تاریخ مرتب کی جاتی ہے۔ تاریخ اگر ''خبریت'' کے تقاضے پورے نہ کرے تو اسے تاریخ نہیں کہا جا سکتا۔ ''خبریت'' کا تقاضا ہے کہ ہر واقعے میں چھ سوالوں کا جواب سامنے لایا جائے: کیا؟ کیوں؟ کیسے؟ کہاں؟ کون؟ کب؟

یعنی: ① کیا ہوا؟ ② کیوں ہوا؟ ③ کیسے ہوا؟ ④ کہاں ہوا؟ ⑤ کس نے کیا؟ ⑥ کب کیا؟

''کیا ہوا'' کے جواب میں کوئی قابلِ ذکر بات ہونی چاہیے یعنی ایک نئی بات معلوم ہونی چاہیے۔ اگر بتایا جائے کہ

’’تاجروں نے دکانیں نہیں کھولیں‘‘ تو یہ ایک قابلِ ذکر بات ہے مگر یہ بتانا کہ دکانیں بازار میں تھیں، قابلِ ذکر نہیں۔

’’کیوں ہوا‘‘ اور ’’کیسے ہوا‘‘ کے جواب سے منطقی ربط پتا چلتا ہے اور ’’کب‘‘ سے وقت اور تاریخ کا تعین ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ بتایا جائے گا کہ تاجروں نے دکانیں بند رکھیں تو خود بخود سوالات پیدا ہوں گے کہ ایسا کب ہوا اور اس کی وجہ کیا تھی؟ اب ایک صحافی اور اسی طرح بعد کے زمانے کا ایک مؤرخ ان کے جوابات کے لیے مزید تفصیل تلاش کرے گا۔ مثلاً وجہ یہ سامنے آئے کہ ’’۲۴ مارچ کو ملک کی اپوزیشن پارٹیوں کے اتحاد نیشنل فرنٹ کی اپیل پر ملک کے تمام بڑے شہروں میں مہنگائی کے خلاف احتجاج کے طور پر پُرامن شٹر ڈاؤن ہڑتال ہوئی اور دکانیں بند رکھی گئیں۔‘‘ تو ہمیں ان دو سطروں میں چھ کے چھ سوالات کے جوابات مل جاتے ہیں اور خبر مکمل ہو جاتی ہے۔ مؤرخ کو بھی ایسی مکمل خبر کی تلاش ہوتی ہے اور ایسی جزئیات کو ترتیب دے کر وہ ایک مفید اور مربوط تاریخ پیش کرتا ہے۔ تاریخ میں یہ جزئیات عموماً منتشر حالت میں ملتی ہیں اور ان میں ضعیف روایات بکثرت ہوتی ہیں۔ مؤرخ اگر ضعیف روایات کو یکسر چھوڑ دے تو وہ منطقی ربط ظاہر کرنے والے بہت سے مواد سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس لیے شرائط کے تحت ضعیف روایات سے استفادہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کتبِ تاریخ میں ضعیف روایات کو جمع کرنے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ ①

❀❀❀

تاریخی روایات کی تحقیق

تاریخی روایات کو فقط پڑھنا کافی نہیں بلکہ اہلِ علم کی ذمہ داری ہے کہ دیگر علوم کی طرح یہاں بھی تحقیق و تفتیش سے کام لیں تاکہ اس علم کا معیار بہتر سے بہتر ہو سکے اور تاریخ پڑھنے والے غلط فہمیوں کا شکار نہ ہوں۔

عدالتِ صحابہ اور تاریخی روایات:

تاریخ کے مطالعے میں ایسی روایات بھی دکھائی دیتی ہیں جو صحابہ کرام کی سیرت و کردار اور ان کے مقام کے خلاف محسوس ہوتی ہیں جو شریعت نے انہیں دیا ہے۔ اس لیے صحابہ کرام کے مقام کو سمجھنا اور پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت و کردار اور مقام کے بارے میں صحیح عقیدے کو مختصراً ’’عدالتِ صحابہ‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فقہاء و محدثین کی اصطلاح میں ’’عدالت‘‘ ایک ایسی صفت ہے جس کا حدیث کے راوی میں ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا آگے نقل کرنا ایک اہم ذمہ داری ہے، جس طرح قاضی کے سامنے کسی مقدمے میں گواہی دینے والے کا عادل ہونا ضروری ہے، اسی طرح حدیث کو محفوظ اور قابلِ اعتماد بنانے کے لیے یہ شرط عائد کی گئی کہ راوی عادل ہو۔ فاسق کی روایت قبول نہیں ہو سکتی۔ صحابہ کی امانت و دیانت، پاکبازی و پرہیزگاری، رشد و ہدایت اور عظمت و شرافت

ماخذ: ❀ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ از علامہ شمس الدین سخاوی

❀ قاعدۃ فی المؤرخین للعلامۃ تاج الدین السبکی، ط دار البشائر بیروت

❀ دراسات تاریخیۃ للدکتور اکرم ضیاء العمری، ص ۲۷ ❀ المختصر فی علم التاریخ، از علامہ کافیجی، ص ۷۱

وشرافت کی گواہی خود قرآن مجید میں جگہ جگہ مذکور ہے، اس لیے ان کی عدالت قطعی طور پر ثابت ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ۝

(وہ سب کے سب ہدایت یافتہ ہیں۔) ①

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ

(یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں کو پرہیزگاری کے لیے جانچ لیا ہے۔) ②

اگر کبھی صحابہ کرام سے انسان ہونے کے ناطے کوئی غلطی یا کوتاہی ہوئی بھی تو اللہ نے ان کے گناہوں اور لغزشوں کو معاف کرنے کا اعلان فرما دیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ (میں ضرور ان کے گناہوں کو ان سے دور کر دوں گا۔) ③

اور اللہ کی جانب سے ان کے لیے اپنی رضا کا اعلان ہے:

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (اللہ ان سب سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔) ④

صحابہ معصوم نہیں مگر محفوظ ہیں:

یہ بات ذہن نشین رہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق صحابہ کرام معصوم نہیں، مگر مغفور ومأجور اور محفوظ ضرور ہیں۔ یعنی اگر ان سے لغزشوں اور گناہوں کا صدور ہو بھی گیا ہو تو اللہ نے ان کی مغفرت کر کے انہیں اپنی ناراضی اور اُخروی عقوبت سے محفوظ کر دیا ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اہل سنت کا یہ عقیدہ نہیں کہ صحابہ کا ہر فرد تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم تھا بلکہ فی الجملہ ان سے گناہ صادر ہو سکتے ہیں مگر ان کے فضائل اتنے ہیں کہ اگر کوئی گناہ صادر ہوا بھی ہو تو یہ فضائل ان کی مغفرت کا موجب ہیں۔'' ⑤

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی ''عدالتِ صحابہ'' کے درست مفہوم کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

''صحابہ کرام نہ تو معصوم تھے اور نہ فاسق۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کسی سے بعض مرتبہ بتقاضائے بشریت ''دو ایک یا چند'' غلطیاں سرزد ہو گئی ہوں۔ لیکن تنبیہ کے بعد انہوں نے توبہ کر لی اور اللہ نے انہیں معاف فرما دیا۔ اس لیے وہ ان غلطیوں کی بناء پر فاسق نہیں ہوئے۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی صحابی نے گناہوں کو اپنی ''پالیسی'' بنا لیا ہو، جس کی وجہ سے اسے فاسق قرار دیا جا سکے۔'' ⑥

گویا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ صحابہ محفوظ ہیں گناہوں پر قائم رہنے سے۔ اگر کبھی کسی صحابی سے گناہ ہو بھی جاتا تھا تو وہ گناہ پر قائم نہیں رہتے تھے بلکہ توبہ واستغفار کر کے اپنے رَب کو منائے بغیر انہیں سکون نہیں ملتا تھا۔

---

① سورۃ الحجرات، آیت: ۷ ② سورۃ الحجرات، آیت: ۳ ③ سورۃ آل عمران: آیت ۱۹۵
④ سورۃ البینۃ: آیت ۸ ⑤ شرح عقائد الواسطیہ ۲۵۱ ⑥ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۳۰

طعنِ صحابہ پر مشتمل روایات کی تحقیق کیوں ضروری ہے؟

حضرات صحابہ کرام سیرت و کردار کے لحاظ سے نہایت سچے، ایثار پیشہ، مخلص، پاکباز اور مقرب تھے جیسا کہ قرآن مجید شروع سے آخر تک جگہ جگہ اس کا اعلان کرتا ہے۔ اگر کوئی روایت اس کے برخلاف منظر کشی کرے تو وہ یقیناً محلِ نظر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اُمت نے صحابہ کرام کے طعن پر مشتمل روایات کی تحقیق کو ضروری قرار دیا ہے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"صحابہ کے معائب کے بارے میں اکثر روایات جھوٹی ہیں یا اپنے اصل پس منظر سے ہٹادی گئی ہیں۔ جہاں تک اس بارے میں صحیح روایات کا تعلق ہے تو اہل سنت، صحابہ کرام کو ان باتوں میں معذور مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے تاویل اور اجتہاد کے ساتھ ایسا کیا تھا۔"①

اور علامہ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

"جو شخص (صحابہ کی لغزشوں سے متعلق) کچھ سنے اس پر واجب ہے کہ اس بارے میں تحقیق سے کام لے۔ اور صرف کسی کتاب میں دیکھ لینے یا کسی شخص سے سن لینے کی بناء پر اس غلطی کو ان میں سے کسی سے منسوب نہ کرے۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس کی پوری تحقیق کرے۔ یہاں تک کہ اس بات کی نسبت ان کی طرف صحیح طور پر ثابت ہو جائے۔ اس موقع پر یہ واجب ہے کہ ان کے لیے تاویلات تلاش کرے۔"②

غرض یہ ہمارے ایمان وعقیدے کا تقاضا ہے کہ صحابہ سے متعلق منفی روایات کی تفتیش کی جائے۔

تاریخی روایات کی جانچ پڑتال۔ راویوں اور روایات کے درجات:

خبر نگاروں اور راویوں کے معیار کے جائزے کو "فنِ رجال" اور "علم الاسناد" کہا جاتا ہے۔ اس فن میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کوئی روایت کتنے واسطوں سے، کن کن لوگوں سے منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ ایک ایک فرد کے علم، دیانت، تقویٰ اور قوتِ حافظہ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بیچ میں کوئی کڑی ٹوٹی ہوئی تو نہیں۔ اس طرح کئی پہلوؤں کا جائزہ لے کر کسی روایت کی مضبوطی یا کمزوری کی تعیین اور درجہ بندی کردی جاتی ہے۔

فنِ رجال کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب محدثین نے دیکھا کہ بہت سی مشکوک روایات بھی ذخیرۂ حدیث میں شامل ہیں۔ اس لیے ایسے اصول طے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جن سے معلوم کیا جائے کہ کون سی روایت مستند ہے اور کونسی غیر مستند۔ پس محدثین نے راویوں کے حالات دیکھ کر ان کے کچھ درجات متعین کیے، چنانچہ:

❶ اعلیٰ درجے کے قابلِ اعتماد راویوں کو "حجۃ"، "ثقہ" یا "ثبت" کہا گیا۔

❷ درمیانے درجے والوں کو "صدوق"، "صالح" یا "لا بأس بہ" کہا گیا۔

---

① شرح العقیدۃ الواسطیہ: ص ۲۵۱ ② الصواعق المحرقہ: ص ۱۲۹

۳ کمزور راویوں کو "ضعیف"، "لَیْسَ بِالْقَوِی" یا "لا یُحْتَجُّ بِہٖ" (نا قابلِ استدلال) کہا گیا۔
۴ نا قابلِ اعتماد راویوں کو متھم بالکذب، متھم بالوضع، متروک، ساقط، ہالک اور تالف کہا گیا۔
۵ انتہائی درجے کے نا قابلِ اعتماد راوی "کذاب"، "وضاع" یا "دجال" کہلاتے تھے۔
۶ اگر کسی راوی کے حالات معلوم نہ ہوں تو اسے "مجہول" کہا جاتا تھا۔

روایت کے درجات، صحیح، حسن، ضعیف:

راویوں کے حالات دیکھتے ہوئے روایات کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کے درجات متعین کیے گئے۔ جن روایات کے تمام راوی نہایت ثقہ، دیانت دار، بہترین حافظے والے اور محتاط ہوں اور سند میں کوئی عیب نہ ہو وہ مضبوطی کے لحاظ سے پہلے نمبر پر ہوتی ہیں اور انہیں "صحیح" کا درجہ دیا جاتا ہے۔ مضبوطی میں دوسرے نمبر کی روایات کو "حسن" کہا جاتا ہے۔ حسن سے کم درجے کی روایت کو "ضعیف" کہا جاتا ہے۔ ضعیف روایت کی کئی قسمیں بنتی ہیں:

اگر ضعف اس لیے ہے کہ متن میں کوئی عجیب وغریب بات ہے جو معتبر روایات کے متن کے خلاف ہے تو ایسی ضعیف روایت کو "منکر" کہا جاتا ہے۔ اگر ضعف کی وجہ یہ ہے کہ سند مکمل نہیں، ناقلین کا سلسلہ کہیں سے ٹوٹا ہوا ہے تو ایسی روایت کو "منقطع" یا "مرسل" کہا جاتا ہے۔ (مرسل روایت بعض شرائط کی موجودگی میں معتبر بھی ہو سکتی ہے۔)

اگر سند میں کوئی کذاب، کوئی جھوٹ گھڑنے والا راوی ہے اور اس روایت کا متن یقینی خبروں کے خلاف ہے تو ایسی روایت کو "موضوع" یعنی من گھڑت قرار دیا جاتا ہے۔ ایسی روایت بالکل غیر معتبر ہوتی ہے۔ غرض راویوں کے احوال کے ذریعے روایات کے درجات متعین کیے جاسکتے ہیں۔ درجات کی تعیین کے بعد علمی ابحاث میں کسی روایت کو قبول اور کسی کو مسترد کرنا سہل ہو جاتا ہے۔ تقابل اور تعارض کے وقت ہمیشہ قوی روایت کو ترجیح دی جاتی ہے اور کمزور روایت کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ یہی وہ اصول ہے جو فقہاء اور محدثین نے اسلامی احکام کی تدوین کے لیے اپنایا تھا۔

طعنِ صحابہ پر مشتمل ضعیف روایات:

قاعدہ: "اگر کسی ضعیف روایت میں کسی صحابی کی طرف کسی برائی کی نسبت مذکور ہو، تو چاہے وہ روایت ذخیرۂ حدیث کی ہو یا ذخیرۂ تاریخ کی، اس روایت سے صحابی کے خلاف استدلال جائز نہیں ہوگا۔"

اس ایک اصول کو مضبوط پکڑ لینے سے صحابہ کے خلاف اکثر ابحاث خود بخود نمٹ جائیں گی کیوں کہ صحابہ کی برائیوں پر مشتمل اکثر روایات سنداً ضعیف یا شدید ضعیف ہیں، ان کے راوی غیر ثقہ ہیں۔ بعض بدعتی، گمراہ، ناصبی یا رافضی ہیں۔ پس ایسی روایات سند کے ضعف اور طعنِ صحابہ پر مبنی ہونے کی وجہ سے خود بخود متروک ہو جائیں گی۔

طعنِ صحابہ پر مبنی صحیح روایات کو مانا جائے گا یا نہیں؟

صحابہ کرام کی تقصیرات سے متعلقہ صحیح یا حسن روایات بہت کم ہیں۔ ان کے متعلق چند اصولی باتیں یاد رکھنی چاہییں:

❶ ایسی اکثر روایات میں تاویل کی پوری گنجائش ہے۔ سیاق وسباق پر غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ روایت کا مطلب وہ نہیں جو ظاہری الفاظ سے سمجھ آرہا ہے۔ شارحین نے ایسی روایات میں موجود مختلف معانی کو بڑے اہتمام سے بیان کیا ہے۔ شروحِ حدیث پڑھنے والے حضرات سے یہ حقیقت مخفی نہیں۔

❷ بعض واقعات میں جو چیز واقعہ پڑھنے والے کو غلطی محسوس ہوتی ہے، وہ صحابی کا اجتہاد ہوتا ہے، یعنی انہوں نے اپنے علم کے لحاظ سے صحیح اقدام کیا تھا۔ یا وہ کوئی سیاسی یا انتظامی فیصلہ تھا۔ اس سے کسی گناہ کا ارتکاب لازم نہیں آتا۔

❸ صحابہ کی لغزشوں پر مشتمل ایسی صحیح روایات جن کی تاویل نہ ہوسکے اور نہ ان پر خطائے اجتہادی کا اطلاق ہوسکے، بہت کم ہیں، اِکا دُکا بعض صحابہ کے بارے میں ہی ایسی روایات ثابت ہیں۔

❹ یہ بھی طے ہے کہ اللہ نے ان حضرات سے صادر ہونے والی لغزشیں معاف فرمادی ہیں۔

❺ اگر کسی صحیح روایت میں کسی صحابی کی کسی تقصیر یا گناہ کا ذکر منقول ہو اور اسلاف کی آراء کو دیکھنے سے معلوم ہو کہ جمہور فقہاء اور شارحینِ حدیث نے اس میں کسی تاویل کی راہ نہیں پائی اور اسے لغزش، گناہ یا خطائے اجتہادی مانا ہے تو ہم اسی معنیٰ میں لیں گے جیسا کہ بعض روایات سے بعض صحابہ کا سرقہ، شربِ خمر، خروج وغیرہ کا مرتکب ہونا معلوم ہوتا ہے، تو وہاں ان تقصیرات کا انکار نہیں کیا جائے گا کہ ایسا کرنا انکارِ حدیث کی طرف لے جائے گا۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ایسے واقعات کا ظہور اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے تحت ضروری تھا۔ بعض حکمتیں یہ تھیں:

(الف) صحابہ اور پیغمبر کے مراتب میں فرق واضح ہوسکے کہ نبی معصوم ہیں اور صحابہ غیر معصوم۔

(ب) ان لغزشوں کے صدور میں اللہ کی تکوینی حکمتیں کارفرما تھیں۔ ایک حکمت بعض شرعی احکام کی تعلیم اور ان کا عملی نفاذ تھا جیسے قصاص، شراب، چوری اور زنا کی سزائیں نافذ ہونا، خروج سے متعلق احکام لاگو ہونا وغیرہ۔ ان شرعی سزاؤں کا عملی نمونہ تبھی سامنے آسکتا تھا جب کسی امتی سے قابلِ سزا کام ہوا ہوتا۔ اللہ کی حکمتِ بالغہ نے صحابہ کے حالات میں ایسے نمونے بھی پیدا کردیے تاکہ سزاؤں کا نفاذ ہو اور ہر لحاظ سے شریعت کی تکمیل ہوجائے۔

❻ یہ حضرات ایسی لغزشوں سے پہلے بھی برگزیدہ تھے، ان کے ارتکاب کے بعد بھی ویسے ہی مقدس اور پاکیزہ رہے۔ توبہ واستغفار یا شرعی سزا کے ذریعے نہ صرف انہیں معافی مل گئی بلکہ ان کے درجات پہلے سے بھی بلند ہوگئے۔

یہ ساری گفتگو صحیح روایات سے ثابت شدہ لغزشوں کے بارے میں ہے۔ ان سے حضراتِ صحابہ کی عظمت اور شان میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ ایسے واقعات کے باوجود صحابہ کرام اُمت میں سب سے اعلیٰ وافضل ہیں اور ان کی لغزشیں نصِ قرآنی ''عَفَا اللّٰہُ عَنْھُمْ'' کے تحت معاف کی جاچکی ہیں، لہٰذا وہ بہر صورت فسق وفجور سے دور اور صالح وراشد ہیں۔

تاریخ کی ضعیف روایات کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کا پیمانہ:

ہم جانتے ہیں کہ ضعیف روایت وہ ہوتی ہے جس کے راویوں کی دیانت یا حافظہ قابلِ اعتماد نہ ہو۔ اس لیے احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام ضعیف روایات کو ترک کردیا جائے مگر اس طرح تاریخ کا خاصا حصہ متروک ہوجائے گا۔ ایک

مؤرخ تاریخی تفصیلات کا کھوجی ہوتا ہے، واقعات کو تفصیل سے پیش کرنا اس کی ذمہ داری ہوتی ہے اس لیے وہ ضعیف روایات کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ پس ایسی ضعیف روایات جن کا تعلق عقائد واحکام سے نہ ہو بلکہ وہ معلوماتِ عامہ کے باب سے ہوں، تاریخ نویسی میں انہیں قبول کرنے کی گنجائش ہے۔

بہرکیف تاریخ صحابہ میں ہمارا اصل مدار اور ہماری اصل کسوٹی قرآن وسنت، اجماعِ اُمت اور صحیح روایات ہیں۔ جو ضعیف روایات ان کا ساتھ دیتی ہوں وہ قبول کی جائیں گی، جو ان کے خلاف ہوں، وہ ہرگز قابلِ التفات نہیں۔

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنی مایہ ناز تصنیف ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق'' میں ''تاریخی روایات کا مسئلہ'' کے ذیل میں اس موضوع پر گراں قدر بحث کی ہے جس کا ضروری حصہ درج ذیل ہے:

''تاریخی روایات میں ان راویوں کے قابلِ اعتماد ہونے کے معنی یہ نہیں کہ ان کے بیان کیے ہوئے وہ واقعات بھی بے چوں وچرا تسلیم کرلیے جائیں جن کی زد عقائد یا احکام پر پڑتی ہے۔ کسی بات کے محض ''تاریخی'' ہونے کا فیصلہ صرف اس بات سے نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی تاریخ کی کتاب میں لکھی ہوئی ہے بلکہ اگر تاریخی کتابوں میں عقائد واحکام سے متعلق کوئی چیز آئے گی تو اسے جانچنے کے لیے لازماً وہی اصول استعمال کرنے پڑیں گے جو عقائد واحکام کے استنباط کے لیے مقرر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض راویوں کے بارے میں علماء نے جو کہا ہے کہ ''ان کی روایتیں احکام کے معاملے میں مردود اور سیر وتواریخ میں مقبول ہیں'' اس سے مراد سیر وتواریخ کے وہ واقعات ہیں جن سے عقائد واحکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کون سا غزوہ کس سن میں ہوا؟ اس میں کتنے افراد شریک تھے؟ اس کی قیادت کس نے کی؟ اس میں کس کو فتح اور کس کو شکست ہوئی؟ ظاہر ہے یہ اور اس جیسے دوسرے واقعات ایسے ہیں کہ ان سے عقائد واحکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ ان معاملات میں ضعیف راویوں کی روایات کو بھی گوارا کرلیا گیا ہے۔ لیکن مشاجراتِ صحابہ اور صحابہ کی عدالت کے وہ مسائل جو خالص عقائد سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی بنیاد پر اسلام میں کئی فرقے ہوگئے ہیں، ان میں راویوں کی روایات ہرگز قبول نہیں کی جاسکتیں۔ مذکورہ بالا مسائل کا فیصلہ قرآن وسنت اور اجماع کے مضبوط دلائل ہی سے ہوسکتا ہے۔''[1]

حدیث اور تاریخ میں فنی حیثیت سے فرق:

روایتِ حدیث اور روایتِ تاریخ میں کچھ شرائط تو مشترک ہیں۔ یعنی راوی کا عاقل ہونا، حافظہ صحیح ہونا، دیانت دار ہونا۔ مگر بعض چیزوں میں روایتِ تاریخ، روایتِ حدیث سے الگ ہے۔

مثلاً روایتِ حدیث میں سند کی تحقیق کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ مگر روایتِ تاریخ میں چند خاص مباحث ہی میں سند کی تحقیق ضروری ہے۔ ان مخصوص مباحث کے سوا تاریخی جزئیات کی حیثیت ''معلوماتِ عامہ'' کی سی ہے اور ''معلوماتِ عامہ'' میں غیر مسلموں سے بھی بات نقل کی جاسکتی ہے (بشرطیکہ وہ کسی دینی حکم کے منافی نہ ہو۔) ارشادِ نبوی

---

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۳۵، ۱۳۶

ہے: حَدِّثُوا عَنْ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ وَلَا حَرَجَ. ''تم بنی اسرائیل سے روایت نقل کرلو۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔''[1]

پس شرعی اُمور کا مدار واقدی اور ابن اسحٰق جیسے تاریخی راویوں کی روایات پر نہیں رکھا گیا۔ ہاں انہیں کبھی توابع کے طور پر لیا گیا ہے یا سیر ومغازی کی جزئیات میں ان سے استفادہ کیا گیا ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ابن اسحاق سے تعلیقاً روایت لی ہے اور امام طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الآثار میں ضمناً واقدی سے روایت لی ہے۔

سند کی تحقیق کب لازمی ہے؟

جن مواقع پر سند کی تحقیق لازمی ہے وہ درج ذیل ہیں:

1. ایسی روایات میں جو اسلامی عقائد اور اصولِ دین سے متعلق ہوں۔
2. ایسی روایات میں جن سے انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام، سلف صالحین یا مشاہیر اسلام پر اعتراض کا پہلو نکل سکتا ہو۔
3. ایسی روایات میں جن کی وجہ سے عقیدے اور حلال وحرام کے مسائل پر زد پڑ سکتی ہو۔
4. ایسی روایات میں جو صحیح روایات سے حاصل شدہ معلومات کے خلاف ہوں۔

مندرجہ بالا مواقع کے سوا تاریخی روایات جمع کرنے میں وسعت سے کام لیا جاسکتا ہے اور ضعیف روایات بھی قبول کی جاسکتی ہیں تاکہ واقعات کی زیادہ سے زیادہ جزئیات محفوظ رہ سکیں۔ مؤرخ لوگوں کو خیر کی طرف راغب کرنے اور شر سے خبردار کرنے کے لیے بھی کمزور روایات نقل کرسکتا ہے، ہاں دورِ حاضر میں علمی انحطاط کے پیشِ نظر مؤرخ کو چاہیے کہ وہ ایسی روایات کے ضعف کی وضاحت کردے۔[2]

❁❁❁

مشہور تاریخی راویوں کا تعارف

کتبِ تاریخ تاریخی راویوں کی روایات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ تاریخی روایات کی حیثیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مشہور تاریخی راویوں کے حالات اور کوائف سے آگاہی ہو، پس اصحابِ جرح وتعدیل کی آراء کی روشنی میں یہاں پہلی تین صدیوں کے چند مشہور تاریخی راویوں کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔ یاد رہے کہ ان میں سے بعض حضرات تاریخ کے ساتھ ساتھ حدیث کے بھی راوی ہیں اور ابتدائی صدیوں کے متعدد محدثین نے تاریخ پر بھی کام کیا تھا۔

1. محمد بن اسحاق
2. عمر بن شبہ
3. ابو مخنف
4. محمد بن سائب کلبی
5. ہشام بن محمد کلبی
6. محمد بن عمر الواقدی
7. ابن شہاب الزہری
8. ابو الحسن المدائنی
9. محمد بن سعد
10. خلیفہ بن خیاط
11. سیف بن عمر

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۴۶۱، کتاب احادیث الانبیاء

② الاعلان بالتوبیخ، ص ۱۳۰؛ قاعدة فی المؤرخین للعلامة تاج الدین السبکی، ص ۲، ۷، ط دار البشائر بیروت؛ المختصر فی علم التاریخ، علامہ کافیجی، ص ۷۱؛ دراسات تاریخیة للدکتور اکرم ضیاء العمری، ص ۲۷

① محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ: (م ۱۵۱ھ)

محمد بن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ صحیح مسلم کے راوی ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان پر سخت جرح کی ہے مگر جمہور محدثین نے انہیں سیرت وتاریخ میں قابلِ اعتماد مانا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''صدوق'' اور حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''صالح الحدیث'' قرار دیا ہے۔[①]

② عمر بن شَبّہ البصری رحمۃ اللہ علیہ: (م ۲۶۲ھ)

ان کے متعلق امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''ثقة'' یہی ابنِ حبان رحمۃ اللہ علیہ اور خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''صدوق''۔[②]

③ ابو مخنف، لوط بن یحییٰ: (م ۱۵۷ھ)

اس کے متعلق یحییٰ بن مَعین رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے: ''اس کی کوئی حیثیت نہیں۔'' ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے متروک قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔''[③] اسے ''ہالک'' اور ''تالف'' قرار دیا گیا ہے۔[④]

④ محمد بن سائب کلبی: (م ۱۴۶ھ)

اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس پر کذب اور رافضیت کا الزام ہے۔''[⑤]

⑤ ہشام بن محمد کلبی: (م ۲۰۴ھ)

اس کے بارے میں ابن عساکر فرماتے ہیں: ''رافضی ہے، ناقابلِ اعتماد ہے۔''

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس پر اعتبار نہ کیا جائے۔''[⑥]

⑥ محمد بن عمر الواقدی: (م ۲۰۷ھ)

واقدی کے متعلق ائمہ جرح وتعدیل کی آراء درجِ ذیل ہیں:

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''وہ بہت بڑا جھوٹا ہے، احادیث کو ادلتا بدلتا ہے۔'' امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اس کی روایات قابلِ ترک ہیں۔'' امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''روایات خود گھڑتا تھا۔''

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''واقدی کے ضعف پر سب کا اتفاق ہے۔''[⑦]

---

① تقریب التہذیب، تر: ۵۷۲۵؛ میزان الاعتدال: ۳/۴۶۹

② تہذیب الکمال: ۲۱/۳۸۹،۳۹۰

③ میزان الاعتدال للذہبی: ۳/۴۱۹،۴۲۰

④ میزان الاعتدال للذہبی: ۳/۴۱۹؛ المغنی فی الضعفاء، تر: ۵۱۷۷
ملحوظہ: ''ہالک'' اور ''تالف'' کا لغوی معنیٰ ہلاک اور بےکار ہے۔ اصطلاح میں یہ ''متھم بالکذب'' اور ''متھم بالوضع'' کے برابر جرح ہے۔

⑤ تقریب التہذیب، ابن حجر عسقلانی، تر: ۵۹۰۱

⑥ میزان الاعتدال: ۴/۳۰۴؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۱۰۱، ط الرسالۃ

⑦ میزان الاعتدال: ۳/۶۶۳، ۶۶۴

تاہم متعدد علمائے سلف نے واقدی کی توثیق بھی ہے۔اس لیے عموماً اسلاف نے واقدی کی ان روایات کو جو طعنِ صحابہ سے پاک ہوں اور کسی صحیح روایت سے متصادم نہ ہوں، قبول کیا ہے۔

⑦ ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ: (م ۱۲۴ھ)

امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ سنت اور تاریخ کے حفاظ میں سے ہیں، بخاری ومسلم کے راوی اور بالاتفاق ثقہ ہیں۔[1] تاہم وہ اپنی پیدائش (۵۸ھ) سے بھی پہلے رونما ہونے والے بہت سے واقعات نقل کرتے ہیں مثلاً خلفائے راشدین کے حالات۔امام زہری بعض اوقات ان حالات کو بیان کرتے ہوئے اس راوی کا ذکر نہیں کرتے جس سے انہوں نے وہ بات سنی ہو۔محدثین کے ہاں ایسی روایت کو مرسل یا منقطع کہا جاتا ہے۔زہری سے منقول ایسی بعض منقطع روایات میں صحابہ کی کردار کشی کا پہلو نکلتا ہے۔پس اصولاً ایسی روایات قابلِ استدلال نہیں ہوسکتیں۔[2]

⑧ ابوالحسن المدائنی علی بن محمد رحمہ اللہ: (م ۲۲۵ھ)

ان کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حافظ، سچے، سچ نقل کرنے والے۔''[3]

⑨ محمد بن سعد رحمہ اللہ: (م ۲۳۰ھ)

انہیں سچا راوی مانا گیا ہے۔ان کی کتاب ''الطبقات الکبریٰ'' سیرتِ نبویہ اور حالاتِ صحابہ وتابعین کا مقبول ماخذ ہے جو طبقاتِ ابن سعد کے نام سے مشہور ہے۔[4]

⑩ خلیفہ بن خیاط رحمہ اللہ: (م ۲۴۰ھ)

یہ امام بخاری رحمہ اللہ کے شیوخ میں سے ہیں۔ثقہ محدث اور صحیح بخاری کے راوی ہیں۔چھان بین کر کے صحیح یا حسن سند سے روایات لانے کی کوشش کرتے ہیں۔سیرت، تاریخ اور رجال کے امام ہیں۔[5]

⑪ سیف بن عمر: (م ۱۸۰ھ)

ضعیف راوی ہیں۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حدیث میں ضعیف اور تاریخ میں قابلِ اعتماد ہیں۔''[6]

⑫ زبیر بن بکار: (۱۷۲ھ تا ۲۵۶ھ)

ثقہ راوی مانے جاتے ہیں۔تاریخ اور انساب کے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔[7]

❁❁❁

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳۲۶/۵

② الجرح والتعدیل: ۲۴۶/۱............ ملحوظہ: مرسل ہمیشہ غیر معتبر نہیں ہوتی بلکہ بعض ائمہ نے بعض شرائط کے تحت اسے قابلِ استدلال مانا ہے، تاہم طعنِ صحابی پر مشتمل مرسل روایت صحابی کے خلاف استدلال کے طور پر قابلِ قبول نہ ہوگی۔

③ سیر اعلام النبلاء: ۴۰۱/۱۰

④ سیر اعلام النبلاء: ۶۶۵/۱۰، ط الرسالۃ ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۴۷۳/۱۱، ط الرسالۃ

⑥ تقریب التہذیب، تر: ۲۷۲۴ ⑦ سیر اعلام النبلاء: ۳۱۲/۱۲، ط الرسالۃ

علمِ سیرتِ نبویہ کا تعارف

''سیرت'' (السیرة) عربی کا لفظ ہے جس کا مصدر ''السَّیر'' ہے، جس کا لغوی معنیٰ ہے: ''چلنا''۔

اُردو میں تفریح کی خاطر چلنے پھرنے کو ''سَیر'' کہا جاتا ہے مگر عربی میں کسی بھی قسم کا چلنا ''سیر'' کہلاتا ہے۔ اسی سے ''السیرة'' مشتق ہوا جس کا لغوی معنیٰ ہے: ''وہ راستہ جس پر چلا جائے۔'' یہی لغوی معنیٰ ''الطریقة'' اور ''السنة'' کا ہے۔ سیرة کی جمع ''سِیَر'' ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں ''سِیَر'' کا استعمال بنیادی طور پر جہاد کے احکام کے لیے ہوتا ہے کیوں کہ جہاد میں عام طور پر بہت چلنا پڑتا ہے، اس لیے اس پورے عمل کو ''السیرة'' اور اس کے احکام کے مجموعے کو ''کتاب السیر'' یا ''ابواب السیر'' کہا جانے لگا۔ پھر چونکہ جہاد کا تعلق اسلامی سیاست اور ریاستی امور سے ہے، اس لیے بہت سے امورِ سیاست مثلاً باغیوں کی سرکوبی، ذمیوں کے حقوق، غیر مسلم ممالک سے معاہدے اور سفارتی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات کے مسائل کو بھی ''السیر'' کے تحت ذکر کیا جاتا ہے۔ امام محمد بن حسن الشیبانی رحمہ اللہ کی ''السیر الکبیر'' کا موضوع یہی تھا۔

دوسری طرف محدثین جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو بیان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد سے متعلقہ احادیث پر پہنچتے ہیں تو وہاں عموماً ''المغازی'' کا عنوان لگاتے ہیں جو کہ ''غزوہ'' کی جمع ہے۔ لغوی لحاظ سے ہر جنگ کو غزوہ کہا جاتا ہے مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال میں ''غزوہ'' سے مراد وہ سفر ہوتا ہے جو سیاسی مقاصد کے لیے ہو، پس اس میں جنگ کے علاوہ، دشمن کی خبر لینے یا دیگر قوموں سے معاہدوں کی خاطر کیے جانے والے اسفار بھی شامل ہیں۔

ابتداء میں علمائے سیرت زیادہ تر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی یعنی غزوات کے حالات کو جمع کیا کرتے تھے۔ اس دور میں کتبِ سیرت کو یا کتبِ حدیث کے ان ابواب کو جن میں غزوات کا ذکر ہوتا تھا، ''مغازی'' کہا جاتا تھا مگر بعد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ سے متعلق ہر چیز کو مغازی یا سیرت کے عنوان کے تحت جمع کیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اہلِ علم نے ''السیرة'' کے عنوان کی جامعیت کے باعث اسی کو اختیار کر لیا۔ پھر ''سیرت'' کی لغوی وسعت کے پیشِ نظر صحابہ، تابعین، فقہاء، مشائخ اور فاتحین کے احوال کی کتب کو بھی سیرت کہا جانے لگا مثلاً سیرة عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ، سیرة احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ۔ تاہم جہاں بھی ''السیرة'' معرفہ اور مفرد آتا ہے تو مراد ''السیرة النبویہ'' ہوتی ہے۔ علماء نے علمِ سیرتِ نبویہ کی تعریف یوں کی ہے: ''هي الترجمة المأثورة لحياة النبي ﷺ''

یعنی مرتب انداز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کو ''سیرت'' کہا جاتا ہے۔

جبکہ بعض حضرات نے یوں کہا ہے:

''هي: ما أثر عن النبي ﷺ من قول أو فعل أو تقرير أو صفة خَلقية أو خُلقية أو سيرة، سواء كان قبل البعثة أو بعدها.''

(نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب قول، فعل، تائید اور آپ کی خلقت، اخلاق یا شخصیت سے متعلق مواد، چاہے اس کا تعلق بعثت سے قبل کی زندگی سے ہو یا بعد کی زندگی سے۔'' ان تمام چیزوں کا مجموعہ ''سیرت'' ہے۔) ①

علمِ سیرت اور علمِ سنت میں واضح فرق یہ ہے کہ ''علمِ سیرت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال زمانے کی ترتیب کے ساتھ مرتب اور پیش کیے جاتے ہیں جبکہ علمِ سنت میں اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا'' بلکہ شرعی احکام و آداب سے متعلقہ روایات کو بہتر سے بہتر انداز میں مرتب کرنے پر توجہ دی جاتی ہے۔

علمِ سیرت کے فوائد:

علمِ سیرت کے فوائد بے بہا ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

❶ صحیح عقیدہ سمجھنے، توحیدِ خالص سے آشنا ہونے، اللہ کی معرفت حاصل کرنے اور اس کی عظمت و کبریائی کے آگے کائنات کی بے وقعتی کا اندازہ کے لیے ہمیں اسی ذاتِ والا صفات کی زندگی سے بہترین رہنمائی مل سکتی ہے جسے اللہ نے اپنی معرفت سب سے زیادہ بخش کر سب کا ہادی و رہنما بنایا۔ وہ ہستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں۔

❷ منصبِ رسالت کی عظمت شناسی، ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، ذوقِ نبوت سے آشنائی، اور کارِ نبوت سے سچی لگن سیرتِ نبویہ کے مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

❸ سیرتِ نبویہ انسانی اخلاق و اعلیٰ اقدار کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس میں گھر کی زندگی سے بین الاقوامی سیاست تک ہر شعبے میں رہنمائی ملتی ہے۔ فاتح اور مفتوح، غالب اور مغلوب، حاکم اور محکوم، استاذ اور تلمیذ، داعی اور سپاہی غرض حیاتِ انسانی کے ہر رُوپ کے لیے یہاں قدم قدم پر ہدایت کے موتی بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔

❹ قرآن مجید کے فہم کے لیے سیرتِ نبویہ سے بڑی مدد ملتی ہے۔ بہت سی آیات کی تفسیر سیرت پر موقوف ہے۔

❺ فنِ حدیث اور فقہ کو سمجھنے میں بھی علمِ سیرت کارآمد ہے کیوں کہ متعدد اہم معاملات میں سیرت میں منقول توقیت سے آگاہ ہوئے بغیر صحیح مطلب سمجھ نہیں آتا، مثلاً ناسخ و منسوخ کی بحث میں سیرت کو دیکھنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

سیرتِ نبویہ کی تدوین۔ علمِ سیرت اور علمِ تاریخ میں تعلق:

اسلامی تاریخ نگاری کی بنیاد سیرت نگاری ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اقوال کو بڑی محبت، عظمت اور احتیاط سے جمع کیا جس سے ذخیرۂ حدیث وجود میں آیا۔ حدیث کے اسی ذخیرے میں ایک حصہ سیر و مغازی کے عنوان سے رکھا گیا جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و سرایا اور جنگی، دعوتی اور سیاسی اسفار کا ذکر تھا۔ اسے ضمنی حیثیت اس لیے دی گئی کہ محدثین کا اصل مقصد اُن احادیث کو جمع اور مرتب کرنا تھا جن سے اعتقادی و عملی مسائل حل ہوں مگر کچھ عشاق ایسے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو سوانحی ترتیب سے جاننا، بتانا اور محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ذخیرۂ حدیث میں حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کے متعلق بڑی تفاصیل موجود ہیں مگر ان میں تاریخی ترتیب

---

① اھمیۃ دراسۃ سیرۃ النبویۃ، محمد بن محمد العواجی: ص ٦

ملحوظ نہیں، پس کچھ علماء نے سیرت پر مستقل توجہ کی ضرورت محسوس کر کے نبی ﷺ کے حالات زندگی کو ولادت تا وفات تاریخی ترتیب پر مدون کرنا شروع کیا۔ یہ حضرات اصحاب سیر کہلائے۔ یہی سیرت نگاری کے بانی تھے۔

سیرت نگاری کے مواد کے ذرائع:

سیرت نگاری کے لیے درج ذیل ذرائع سے مواد لیا جاتا تھا:

❁ سب سے اہم ذریعہ حافظہ تھا۔ صحابہ کرام اور تابعین کے حافظے میں ہزاروں احادیث نقش تھیں۔ سیرت نگاروں نے سب سے زیادہ مدد اسی علمی ذخیرے سے لی۔

❁ حضور اکرم ﷺ نے بعض مواقع پر کچھ چیزیں لکھوائی بھی تھیں، مثلاً آپ ﷺ کے بعض مراسلات، احکام پر مشتمل تحریریں، بعض معاہدے اور امان نامے وغیرہ محفوظ تھے۔ سیرت نبویہ کی تدوین میں ان سے بھی کام لیا گیا۔

❁ بعض صحابہ اور تابعین اپنے حافظے میں موجود روایات کو لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ پہلی صدی ہجری کے یہ نوشتے بھی تدوینِ سیرت میں کام آئے۔ ①

سیرت نگار

علمِ سیرت کی تدوین واشاعت میں جن حضرات کا اہم حصہ رہا ہے، ان کا تعارف درجِ ذیل ہے:

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ (م ۹۴ھ):

یہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ وہ محدث اور فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ سیرتِ نبویہ اور خلفائے راشدین کے حالات سے متعلقہ روایات بھی بیان کرتے تھے۔ ان سے قیمتی روایات کا ایک بڑا ذخیرہ اُمت تک پہنچا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سیرتِ نبویہ پر پہلی تصنیف انہی کی تھی مگر وہ بالکل نایاب ہے۔ ②

ابان بن عثمان بن عفان رحمہ اللہ (م ۱۰۵ھ):

یہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے اور فقہ وحدیث سے شغف رکھنے والے تھے۔ انہوں نے مغازی پر ایک نوشتہ تیار کر رکھا تھا جس میں صحابہ کے حالات بھی تھے۔ سلیمان بن عبدالملک نے اپنے باپ کے دورِ حکومت میں ان سے مغازی پر کام کرنے کی فرمائش کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں پہلے ہی ایک تصحیح شدہ مسودہ تیار کر چکا ہوں۔ سلیمان نے اس کی نقلیں تیار کرائیں مگر عبدالملک بن مروان نے یہ دیکھ کر کہ اس میں انصار کے فضائل بنواُمیہ سے زیادہ درج ہیں، تمام نسخے تلف کرادیے۔ یوں اس کتاب کی اشاعت اور روایت نہ ہوسکی۔ ③

وہب بن منبہ رحمہ اللہ: (م بعد ۱۱۰ھ)

یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مشہور شاگرد ہمام بن منبہ رحمہ اللہ کے بھائی تھے۔ تاریخ وسیرت کی روایات کے بہت

---

① الحدیث والمحدثون، محمد ابو زہو: ص ۳۵ تا ۹۸، ط دار الفکر العربی

② کشف الظنون: ۲ ص ۱۷۴۶ ③ اخبار الموفقیات للزبیر بن بکار المتوفی سنۃ ۲۵۶ھ، ص ۱۲۳، ۱۲۵

بڑے عالم تھے۔ ① انہوں نے بھی سیرت سے متعلقہ روایات پر ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ ②

عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری رحمہ اللہ (م ۱۲۱ھ):

سیرت کے بڑے حافظ تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حکم پر جامع دمشق میں سیرت، مغازی اور مناقب کا درس شروع کیا جس کے ذریعے علمِ سیرت کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہو گیا۔ ③

ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ (م ۱۲۴ھ):

نامور محدث ابن شہاب الزہری (م ۱۲۴ھ) نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حکم پر احادیث کے ذخائر کو جمع کیا تھا۔ انہوں نے ''مغازی'' پر بھی ایک کتاب لکھی جسے اس موضوع کی پہلی تصنیف کہا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ نایاب ہے مگر اس کا بڑا حصہ ان کے تلامذہ: موسیٰ بن عُقبہ، محمد بن اسحاق اور معمر بن راشد کی تالیفات میں آ کر محفوظ ہو گیا ہے۔ ④

موسیٰ بن عُقبہ رحمہ اللہ (م ۱۴۱ھ):

امام زہری کے شاگردوں میں سے موسیٰ بن عُقبہ نے فنِ سیرت کو مزید آگے بڑھایا۔ وہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی اولاد کے موالی میں سے تھے۔ بڑے عالم فاضل تھے، روایت میں احتیاط سے کام لیتے تھے اس لیے ان کی روایات کا مجموعہ مختصر ہے۔ یہ کتاب بھی نایاب ہے مگر کتبِ حدیث اور کتبِ سیرت میں اس کے حوالے کثرت سے آتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح البخاری میں موسیٰ بن عُقبہ رحمہ اللہ کی مغازی سے متعلق متعدد روایات نقل کی ہیں۔

امام یحییٰ بن مُعین رحمہ اللہ فرماتے تھے: كِتَابُ مُوسَى بنِ عُقْبَةَ عَنِ الزُّهْرِيِّ: مِنْ أَصَحِّ هٰذِهِ الْكُتُبِ۔

''موسیٰ بن عُقبہ کی امام زہری سے مرویات کی کتاب ان کتبِ سیرت میں صحیح ترین ہے۔'' ⑤

محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ (م ۱۵۱ھ):

امام زہری رحمہ اللہ کے تلامذہ میں محمد بن اسحٰق رحمہ اللہ بہت مشہور ہوئے۔ انہوں نے سیرت کی جزئیات کو بڑی تگ و دو کے ساتھ تلاش کر کے محفوظ کیا اور سیرت تبویبہ پر پہلی ضخیم اور جامع کتاب تصنیف کی جو ''سیرۃ ابن اسحاق'' کہلاتی ہے۔ وہ عاصم بن عمر بن قتادہ رحمہ اللہ کے بھی شاگرد تھے، یوں سیرۃ ابن اسحاق میں عاصم بن عمر رحمہ اللہ کی روایات کا خاصا حصہ محفوظ ہو گیا۔ ⑥ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے روایت میں سند کی صحت کا خیال نہیں کیا اور ہر طرح کی روایات جمع کیں، اس طرح روایات تو بکثرت ہو گئیں اور بے شمار مفید جزئیات کا احاطہ ہو گیا مگر کتاب کی اسنادی حیثیت کمزور ہو گئی۔

معمر بن راشد رحمہ اللہ (م ۱۵۴ھ):

معمر بن راشد رحمہ اللہ اپنے زمانے کے عظیم محدثین میں سے ایک تھے اور سیرت و تاریخ کا ذوق بھی رکھتے تھے۔

---

① النبلاء: ۴ص ۵۴۶ ② کشف الظنون: ۲ص ۱۷۴۶ ③ سیر اعلام النبلاء: ۵ص ۲۴۱

④ سیر اعلام النبلاء: ۵ص ۳۲۶ ⑤ سیر اعلام النبلاء: ۶ص ۱۱۴ تا ۱۱۶

⑥ سیر اعلام النبلاء: ۷ص ۳۴ تا ۳۶

انہوں نے سیرتِ نبویہ اور سیرتِ صحابہ پر بکثرت روایات نقل کیں جو ان کے تلمیذ امام عبدالرزاق صنعانی رحمہ اللہ نے اپنی "مُصَنَّف" میں محفوظ کر لیں۔①

محمد بن عمر الواقدی (م ۲۰۷ھ):

محمد بن عمر الواقدی نے سیرتِ طیبہ اور احوالِ صحابہ سے متعلق روایات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا۔ سیرت پر ان کا کام "المغازی" کے عنوان سے ہے جس سے کوئی سیرت نگار بے نیاز نہیں رہ سکتا۔②

عبدالملک بن ہشام رحمہ اللہ: (م ۲۱۳ھ)

یمنی مؤرخ اور سیرت نگار عبدالملک ابن ہشام اُموی رحمہ اللہ (م ۲۱۳ھ) نے ابن اسحٰق کی سیرت کو مزید خوبیوں سے آراستہ کیا، اس کے مشکل الفاظ کی تشریح بھی کی۔ اس طرح سیرت ابن ہشام وجود میں آئی جو سیرت کا سب سے مقبول مأخذ ہے۔، انہوں نی سلاطین حمیر کی تاریخ بھی مرتب کی۔③

ابن حِبّان رحمہ اللہ: (م ۳۵۴ھ):

عظیم محدث امام ابن حِبّان (م ۳۵۴ھ) کی "السیرة النبویة و اخبار الخلفاء" بھی سیرت کا اہم مأخذ ہے۔④

محمد بن سعد رحمہ اللہ (م ۲۳۰ھ):

ان کی "الطبقات الکبریٰ" میں سیرت سے متعلقہ روایات کا ایک بڑا ذخیرہ مل جاتا ہے۔⑤

امام محمد بن عیسیٰ الترمذی رحمہ اللہ (م ۲۷۹ھ):

امام ترمذی رحمہ اللہ کی "شمائل ترمذی" ہمیشہ سے مسلمانوں میں نہایت مقبول ہے۔ اگرچہ اسے مستقل طور پر سیرت کی کتاب نہیں کہا جاتا مگر یہ سیرت نگاری کا ایک اہم مأخذ ہے۔ "شمائلِ نبویہ" کا تعلق علمِ سنت اور علمِ سیرت دونوں سے بنتا ہے۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات و عادات اور حیاتِ مطہرہ کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔⑥

محمد بن جریر الطبری رحمہ اللہ (م ۳۱۰ھ):

ان کی تاریخ میں سیرتِ طیبہ کی بہت سی روایات سنِ ہجری کی ترتیب کے ساتھ محفوظ ہیں۔⑦

الغرض تیسری صدی اور چوتھی ہجری تک سیرت نگاری پر متعدد بنیادی مآخذ سامنے آ چکے تھے جن میں سینکڑوں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے علوم اور روایات کے مجموعے جمع ہو گئے تھے۔

❁❁❁

---

① مشاہیر علماء الامصار: ص ۳۰۵، ط دار الوفاء

② تاریخ بغداد: ۳ص ۲۱۲، ط العلمیة... واقدی کے ضعف کا ذکر پیچھے آ چکا ہے مگر اس کے باوجود سیرت پر ان کے کام کو مفید مانا گیا ہے۔

③ الاعلام للزرکلی: ۴ص ۱۱۶

④ سیر اعلام النبلاء: ۱۶ص ۹۲

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۱۰ص ۶۶۴

⑥ میزان الاعتدال: ۳ص ۶۷۸

⑦ لسان المیزان: ۷ص ۲۵

مشق

❶ تاریخ کی لغوی واصطلاحی تعریف کر کے اس کے موضوع اور غرض وغایت سے آگاہ کیجئے۔
❷ تاریخ کا مطالعہ کرنے کے کیا فوائد ہیں؟
❸ تقویم سے کیا مراد ہے؟ اور سنِ ہجری کا آغاز کیسے ہوا؟
❹ تاریخ نگاری کے بنیادی مآخذ کون کون سے ہیں؟
❺ تاریخ بالروایۃ اور تاریخ بالدرایۃ سے کیا مراد ہے؟ کیا ان دونوں کے علاوہ تاریخ نگاری کی کوئی اور قسم بھی ہے؟
❻ واقعات کی منطقی ترتیب کا کیا مطلب ہے؟ اور خبریت کے چھ بنیادی سوالات کون سے ہیں؟
❼ عصمتِ انبیاء سے کیا مراد ہے؟ اور عدالتِ صحابہ کا مفہوم کیا ہے؟
❽ صحابہ کے ''محفوظ'' ہونے کا مطلب واضح کرتے ہوئے، ''محفوظ'' اور ''معصوم'' میں فرق کی نشاندہی کیجئے؟
❾ صحیح اور ضعیف کا فرق رکھتے ہوئے طعنِ صحابہ پر مشتمل روایات کی تحقیق کس طرح کی جائے گی؟
❿ علمِ سیرت سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعریف عربی اور اُردو میں کیجئے۔
⓫ سیرتِ نبویہ پڑھنے پڑھانے کے کیا فوائد ہیں؟
⓬ علمِ سیرت کی تدوین کس طرح ہوئی اور اس کا علمِ تاریخ سے کیا تعلق ہے؟
⓭ تین مشہور سیرت نگاروں اور ان کی کتب کا مختصر تعارف کرائیے؟

کتب برائے مطالعہ:

❁ مقدمۂ ابن خلدون (اردو ترجمہ): ابتدائیہ، علمِ تاریخ کی فضیلت
❁ اسلامی اصولِ تاریخ، از محمد اسماعیل ریحان، ناشر: المنہل کراچی
یا...... ❁ تاریخ اُمتِ مُسلمہ، حصہ اوّل، مبادیاتِ تاریخ
❁ تاریخ اُمتِ مُسلمہ، حصہ دوئم، تحقیق وتنقیح کے اصول

عملی کام:

❁ ایک چارٹ پر سیرتِ نبویہ کی چند کتب کے نام لکھئے جو آپ نے پڑھی ہوں یا پڑھنا چاہتے ہوں۔
❁ پانچ ثقہ اور پانچ غیر ثقہ راویوں کے نام، ولدیت، شہر، سنِ ولادت اور سنِ وفات پر مشتمل چارٹ بنائیے۔
❁ کسی قدیم شہر کے آثار، تاریخی عمارات یا کھنڈرات کا مشاہدہ کیجئے اور اس موضوع پر ایک مضمون لکھئے۔

حصہ اول

سیرتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تبویب

پہلا باب:

انبیائے سابقین اور گزشتہ اُمتیں

دوسرا باب:

اسلام سے قبل دنیا کی حالت

تیسرا باب:

سیرتِ ختم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پہلا باب

انبیائے سابقین اور گزشتہ اُمتیں

اہداف و مقاصد:

یہ باب پڑھ کر ان شاء اللہ آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1. انسان کے مقصدِ تخلیق اور انسان و شیطان کے مابین کش مکش کو سمجھ سکیں۔
2. جلیل القدر انبیائے کرام کی جد و جہد سے واقف ہو سکیں۔
3. گزشتہ قوموں کے حالات کو مختصر جان سکیں۔
4. قدیم سلطنتوں کا ضروری تعارف حاصل کر سکیں۔

(یونٹ:1.2)

ابتدائے کائنات اور تخلیق آدم

یہ قضیہ شروع سے متنازعہ چلا آرہا ہے کہ دنیا کب بنی اور نسل انسانی کا وجود کب سے ہوا؟۔ دورِ حاضر کے ماہرین ارضیات تو زمین کے وجود کو کروڑوں سال اور انسانی وجود کو لاکھوں سال پہلے قرار دیتے ہیں مگر یہ صرف ایک قیاس ہے جس کی کوئی تاریخی روایت تائید نہیں کرتی۔ برصغیر کے نامور مؤرخ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ نے دنیا کی ابتدا کے متعلق اہل علم کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کو راجح قرار دیا ہے کہ ابتدائے آفرینش چھ ہزار سال پہلے ہوئی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ لکھتے ہیں:

"اس مسئلے کا آخری فیصلہ مشکل ہے، اس لیے کہ ہمارے پاس علم کے وسائل بہت کم ہیں اور اس حقیقت کے آخری فیصلے کے لیے ناکافی۔ نیز آثار قدیمہ سے بھی اس کا کوئی یقینی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اقوام عالم میں چینی، ہندی اور مصری سب سے قدیم قومیں ہیں اور مؤرخین فرنگی کا یہ دعویٰ ہے کہ سطح زمین پر ان اقوام کا وجود تقریباً چھ اور دس ہزار سال کے درمیان ثابت ہے۔ نیز یہ امر بھی مُسلّم (تسلیم شدہ) ہے کہ باوجود زبردست تحقیقات کے کسی قوم کے حالات وواقعات کی تاریخ کا پتا سات ہزار سال سے پہلے نہیں ملتا۔"[1]

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے اس بارے میں متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ انہوں نے اپنی سند کے ساتھ محمد بن اسحٰق سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک ایک ہزار دو سو برس، حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک ایک ہزار ایک سو بیالیس برس، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پانچ سو پینسٹھ برس، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت داؤد علیہ السلام تک پانچ سو انہتر برس، حضرت داؤد علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تیرہ سو چھپن برس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم تک چھ سو برس گزرے ہیں۔

اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پانچ ہزار چار سو بتیس سال بنتے ہیں۔[2]

---

① مقدمہ نور البصر فی سیرۃ خیر البشر، ص ۱۸

② عن محمد بن إسحاق بن يسار قال: كان من آدم إلى نوح ألف ومائتا سنة ومن نوح إلى إبراهيم ألف ومائة واثنان وأربعون سنة ومن إبراهيم إلى موسى خمسمائة وخمس وستون سنة ومن موسى إلى داود خمسمائة سنة وتسعة وستون سنة ومن داود إلى عيسى ألف وثلاثمائة سنة وست وخمسون سنة ومن عيسى إلى محمد عليه الصلاة والسلام ستمائة سنة فذلك خمسة آلاف وأربعمئة واثنان وثلاثون سنة هذا الإجمال صحيح۔ (تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱/ ۳۱، ط دار الفکر)

حضرت آدم علیہ السلام کی کُل عمر ایک ہزار برس تھی، ① جن میں سے تینتالیس برس جنت میں گزرے تھے۔ ②

یعنی انہوں نے دنیا میں نو سو ستاون سال گزارے تھے۔ انہیں شمار کیا جائے تو حضرت آدم علیہ السلام کی دنیا میں آمد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت تک چھ ہزار تین سو نو اسی سال بنتے ہیں۔ ③

انسان کی دنیا میں آمد:

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا۔ اس نئے وجود میں سوچنے، سمجھنے، جذبات کا اظہار کرنے، مسائل کو سمجھنے اور گرد و پیش کے وسائل کو کام میں لانے کی صلاحیتیں باقی تمام مخلوقات سے زیادہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے نہ فرشتوں کی طرح اطاعت پر مجبور بنایا تھا، نہ جنات کی طرح شر سے مغلوب؛ بلکہ اسے خیر اور شر دونوں کی قوت دی تھی۔ فرشتوں نے انسان کی ساخت سے اس کی کارکردگی کی صلاحیتوں کا اندازہ لگالیا اور اللہ کی بارگاہ میں نیاز مندانہ عرض کیا کہ اس کی جگہ حمد و ثنا اور عبادت کے لیے ہم حاضر ہیں۔ اللہ نے فرمایا:

اِنِّیٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ

''میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔'' ④

حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے انہیں تعظیمی سجدہ کرایا تاکہ ساری دنیا پر انسان کی عظمت کا سکہ بیٹھ جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی رفاقت کے لیے انسان کی صنفِ نازک کو بھی پیدا کیا گیا، اس کی ابتدا حضرت حوا رضی اللہ عنہا سے ہوئی۔ دونوں کو مہمانی کے لیے جنت میں بھیج دیا گیا۔

شیطان کی انسان سے عداوت:

تخلیق آدم علیہ السلام سے اب تک انسانوں کو گمراہ کرنے میں سب سے بڑا دخل شیطان کا رہا ہے۔ شیطانوں کا سردار ابلیس جنات کی نسل سے ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے یہ فرشتوں کا ہم نشین اور بارگاہِ الٰہی کا مقرب رکن تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا مرتبہ اپنے سے بلند ہوتے دیکھ کر وہ نفرت اور حسد کی آگ میں بُری طرح جلنے لگا۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا؛ کیوں کہ وہ خود کو حضرت آدم علیہ السلام سے بہتر سمجھتا تھا، وہ بھی صرف اس لیے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے۔ اس گستاخی پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی بارگاہ سے دھتکار دیا۔ شیطان ڈھیٹ تھا، معافی بھی نہ مانگی۔ ہاں اللہ تعالیٰ سے مہلت طلب کر لی کہ میں قیامت تک آدم اور اس کی اولاد کو گمراہ کر سکوں۔ اللہ نے اجازت دے دی۔ اب شیطان نے پہلے حضرت حوا اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کو ایک ایسے درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا جس کا استعمال ان کے لیے ممنوع تھا۔ اس پر اللہ کی طرف سے انہیں جنت سے نکال کر زمین پر اُتار دیا گیا۔

---

① مگر یہ اعداد و شمار حتمی نہیں کیوں کہ ان کا دارومدار ضعیف اور منقطع روایات پر ہے۔

② مسند احمد، ح: ۲۲۷۰، ۲۷۱۳، قال المحشی، حسن لغیرہ

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱ ص ۲۰۸ ④ سورۃ البقرۃ، آیت: ۳۰

انہوں نے گڑگڑا کر توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور انہیں متنبہ کیا کہ اب شیطان ہمیشہ تمہاری اولاد کا دشمن رہے گا، اس سے ہوشیار رہنا۔ یہ بھی بتایا کہ نسلِ انسانی کی رہنمائی اور اسے شیطان کے اثرات سے بچانے کے لیے آسمانی ہدایت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جو اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ آخرت میں بے خوف وخطر ہوگا۔ جو اسے ٹھکرائے گا وہ سخت عذاب کا حق دار ٹھہرے گا۔ ①

نسلِ انسانی کی افزائش:

حضرت آدم علیہ السلام وحوا کی اولاد ہوئی تو ان میں نکاح کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں اولادِ آدم کی افزائش ہوئی۔ ②

حضرت آدم علیہ السلام کی وفات تک ان کی نسل کے افراد کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ ③

بھٹکی ہوئی انسانیت اور بعثتِ انبیائے کرام

صدیوں بعد اولادِ آدم نے خالقِ کائنات کے بنیادی سبق کو بھلا دیا اور شیطان کے بہکاوے میں آ کر بداعتقادی کی کھائیوں میں گرنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے انبیاء ورسل کا سلسلہ شروع فرما دیا۔ ④

حضرت نوح علیہ السلام:

ایک ہزار برس تک لوگ اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کے دین ومذہب پر تھے مگر پھر شیطان کے ورغلانے سے انہوں نے چند مرحوم بزرگوں کے مجسمے بنا کر انہیں پوجنا شروع کر دیا۔ یہ بزرگ وَدّ، سُواع، یَغوث، یَعوق اور نَسر تھے۔ قوم نے اندھی عقیدت کا شکار ہو کر انہیں حاجت روا اور مشکل کشا مانا اور ان کے بتوں کی پرستش شروع کر دی۔ یوں پہلی بار بندوں کا اپنے رب سے رشتہ منقطع ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام اس رشتے کو جوڑنے کے لیے مبعوث ہوئے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بے پناہ اذیتیں برداشت کیں، آخر ساڑھے نو سو برس کی مسلسل تبلیغ کے بعد بھی جب قوم کی اکثریت اپنی ضد، سرکشی اور گمراہی پر اَڑی رہی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا طوفان آیا جو سب کچھ بہا کر لے گیا۔ صرف حضرت نوح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے کشتی میں سوار کرا کے محفوظ رکھا۔

طوفان سے بچ جانے والے اہلِ ایمان صرف اسّی مرد وزن تھے۔ انہی سے دنیا کی آبادی کا از سرِ نو آغاز ہوا۔ ان کے بیٹوں: سام، حام اور یافث کی اولاد ساری دنیا میں پھیل گئی۔ سام کی نسل سے عرب، فارس اور روم (یورپ) آباد ہوئے۔ یافث کی اولاد سے ترکوں، (چینیوں) اور یاجوج ماجوج نے جنم لیا۔ حام کی نسل نے افریقہ کو آباد کیا، حبشی، سوڈانی، قبطی اور بربر، اسی کی اولاد سے ہیں۔ ⑤

---

① سورۃ البقرۃ، آیت: ۳۰ تا ۳۹؛ سورۃ الاعراف، آیت: ۱۱ تا ۲۵؛ سورۃ الحجر، آیت: ۲۶ تا ۴۲

② البدایۃ والنہایۃ: ۱/۱۰۳ ③ المختصر فی اخبار البشر لابی الفداء: ۱/۹، ط الحسینیۃ المصریۃ

④ البدایۃ والنہایۃ: ۱/۱۱۳ تا ۲۰۱؛ الکامل فی التاریخ ج اوّل

⑤ الکامل فی التاریخ، جلد اوّل؛ المختصر فی اخبار البشر لابی الفداء

حضرت ہود علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام کے چند سو برس بعد انسانیت پھر گمراہی کے راستے پر چل پڑی تھی۔ چنانچہ ایک بار پھر انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ شروع ہوا اور پے در پے رسول بھیجے گئے۔ جزیرۃ العرب میں آباد قوم "عاد" کی طرف حضرت ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ یہ قوم طاقت، قد و قامت اور جنگجوئی میں بے مثال تھی اور اسی گھمنڈ میں اس نے حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب کی، تب اللہ کی طرف سے تیز آندھی کا عذاب آیا، جس نے ان کا استیصال کر دیا۔ ①

حضرت صالح علیہ السلام:

حجاز سے شام جانے والی شاہراہ پر وادیٔ حجر میں آباد قوم "ثمود" فن تعمیر میں اپنی نظیر آپ تھی۔ پہاڑوں کو تراش کر مضبوط مکانات بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا۔ ان کی اصلاح کے لیے حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ قوم نے انہیں جھٹلایا اور اپنی بدعقیدگی ترک نہ کی۔ آخر ایک زوردار کڑک اور زلزلے نے انہیں ہلاک کر دیا۔ ②

قوم عاد اور ثمود سمیت عرب کی کئی قومیں ایسی تھیں جن کا نام و نشان بالکل مٹ گیا۔ انہیں عرب بائدہ کہا جاتا ہے، ان کا ذکر صرف آسمانی کتب، لوک داستانوں اور قدیم شاعری میں باقی رہ گیا۔ ③

بعثتِ ابراہیمی

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے شہر بابل کے نواحی قصبے "کوثیٰ" میں پیدا ہوئے تھے، طوفانِ نوح کو اس وقت ایک ہزار اکیاسی برس گزر چکے تھے، اس زمانے میں عراق اور اس کے گرد و نواح میں نمرود نامی ظالم و جابر بادشاہ کی حکومت تھی جو خدائی کا دعوے دار تھا۔ "بابل" اس کا پایہ تخت تھا۔ عراق کے لوگ ایک طرف اسے خدا مانتے تھے تو دوسری طرف وہ سورج، چاند، ستاروں اور مظاہر قدرت کی خدائی کے بھی قائل تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بت پرست بھی تھے، خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ آزر بت تراش تھا۔ گویا شرک اور بداعتقادی کے سارے روگ اس قوم میں جمع ہو گئے تھے۔ ④

دعوتِ ابراہیم علیہ السلام:

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبوت کا منصب عطا کر کے قوم کی اصلاح کا حکم دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان لوگوں کو سمجھایا اور ان کے سامنے ستاروں، چاند اور سورج کی بے ثباتی ظاہر کی کہ یہ اپنی مرضی سے طلوع ہوتے ہیں نہ غروب۔ یہ رب کیسے ہو سکتے ہیں۔ جب لوگ نہ مانے تو ایک دن ان کے بت خانے میں جا کر بتوں کو توڑ ڈالا اور ان کے پوچھ گچھ کرنے پر فرمایا: "اگر یہ بول سکتے ہیں تو انہی سے پوچھ لو۔"

---

① تفسیر ابن کثیر: سورۃ ھود

② تفسیر ابن کثیر: سورۃ ھود ③ البدایۃ والنہایۃ: ۱/ ۱۲۱ تا ۱۲۹؛ الکامل فی التاریخ ج اوّل

④ سورۃ ھود، آیت: ۲۵ تا ۶۸؛ المختصر فی اخبار البشر: ۱/ ۱۰ تا ۱۵؛ الکامل فی التاریخ: ۱/ ۸۲ تا ۸۵

قوم ششدر رہ گئی اور جب کوئی جواب نہ پایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہت بڑے الاؤ میں پھینک دیا۔ مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں گرے تو فوراً اللہ تعالیٰ کا حکم آیا:

يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝

''اے آگ ٹھنڈی ہوجا اور ابراہیم کے لیے سلامتی والی بن جا!''①

اسی لمحے وہ آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ایک گلستان بن گئی۔

آخر کار قوم اور خاندان کو گمراہی پر ڈٹا دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وطن چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چچازاد ''سارہ'' ایمان لے آئی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے نکاح کرلیا اور انہیں ساتھ لے کر شام روانہ ہوگئے۔ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھتیجے لُوط بھی تھے، وہ بھی ایمان لے آئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے نصیب میں بھی نبوت کا شرف لکھ دیا تھا۔ وہ کچھ مدت شام میں رہے اور پھر اپنی بیوی سارہ کے ساتھ مصر چلے گئے، جہاں کے حکمران نے ان کی بزرگی کے اعتراف میں ایک دوشیزہ اُن کے نکاح میں دے دی۔ پردیس میں آکر وہ ''ھا غار'' یعنی اجنبی عورت کہلائی، یہ لفظ عربی میں ''ھَاجَرْ'' بن گیا۔②

حضرت اسماعیل علیہ السلام اور تعمیر کعبہ:

حضرت ہاجرہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں ایک لڑکا اسماعیل پیدا ہوا۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اللہ نے انہیں حکم دیا کہ اپنی بیوی ہاجرہ اور شیر خوار بچے اسماعیل کو مکہ کی ایک وادی میں چھوڑ آؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک طویل سفر کر کے شام سے جزیرۃ العرب پہنچے اور بیوی بچے کو مکہ کے تپتے ہوئے چٹیل میدان میں اللہ کے سہارے پر چھوڑ کر واپس ہوگئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جانے کے بعد جب حضرت ہاجرہ کے مشکیزے میں پانی ختم ہوگیا تو ننھا بچہ بھوک اور پیاس سے بلبلانے لگا۔ حضرت ہاجرہ کسی مدد کی تلاش میں بار بار وادی کی دونوں پہاڑیوں: صفا اور مروہ پر چڑھ کر نہایت بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ آخر حضرت جبرئیل علیہ السلام نمودار ہوئے۔ انہوں نے فوراً وادی کے ایک گوشے پر اپنا پَر مارا جس سے زم زم کا چشمہ جاری ہوگیا۔

یمن کا ایک خانہ بدوش قبیلہ بنوجُرہُم یہاں سے گزرا تو چشمہ دیکھ کر حضرت ہاجرہ کی اجازت سے یہیں آباد ہوگیا۔ ان کا نسلی تعلق بنوقحطان سے تھا جنہیں ''عرب عاربہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ اصل اور خالص عرب تھے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زبان سُریانی تھی مگر بنوجُرہُم کے ساتھ پل بڑھ کر انہوں نے بھی عربی زبان سیکھ لی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے جو نسل چلی اسے ''عربِ مُستَعرِبَہ'' کہا جاتا ہے، یعنی یہ دوسری نسل کے ساتھ مخلوط عرب تھے۔③

---

① سورۃ الانبیاء، آیت: ۶۹

② الکامل فی التاریخ: ۱/۸۵ تا ۸۸؛ البدایۃ النھایۃ: ۱/۱۶۸، ۱۶۹؛ المختصر فی اخبار البشر: ۱/۱۳

③ صحیح البخاری، ح: ۳۳۶۴، کتاب احادیث الانبیاء؛ الکامل فی التاریخ: ۱/۹۰

چند برس بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں اللہ کا حکم آیا ''اے ابراہیم! اپنے بیٹے کو قربان کردو۔''

شیطان نے اس موقع پر پوری کوشش کی کہ کسی طرح ان پاکیزہ ترین بندوں کے عزائم میں رخنہ ڈال دے۔ مگر ماں، باپ اور بیٹا تینوں اپنی اپنی جگہ اللہ کے شیدائی تھے۔ انہوں نے شیطان کو کنکریاں مار کر بھگا دیا۔ اور پھر آخر منیٰ کی وادی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے اُن کی گردن پر چھری چلا دی۔

تب اللہ کی طرف سے ندا آئی ''ابراہیم! تم سچائی کے امتحان میں کامیاب رہے۔''

دیکھا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ ایک دنبہ ذبح ہو چکا تھا۔ ①

جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا تھا تب انہوں نے اللہ کے حکم سے فرشتوں کی رہنمائی میں بیت اللہ کی بنیاد رکھی تھی، اس کا طواف کیا تھا اور میدانِ عرفات جا کر حج کے دوسرے مناسک ادا کیے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں طوفان آیا تو بیت اللہ کی عمارت اُٹھا لی گئی، صرف بنیادیں باقی رہ گئیں۔

زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں ریت کے تودے کھڑے ہوگئے اور کعبہ بالکل اوجھل ہوگیا۔ ②

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی قدیم حدود سے آگاہ فرما کر حکم دیا کہ اسے از سرِ نو تعمیر کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس عظیم مقصد کے لیے ایک بار پھر فلسطین سے ہو کر مکہ معظمہ پہنچے اور اپنے نوجوان بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ ملا کر بیت اللہ کی تعمیر کی۔ ③

یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر آزمائش پر خوب پورے اترے جس کی وجہ سے اللہ نے انہیں اس قدر برگزیدہ کیا کہ آسمانی کتابوں پر یقین رکھنے کی مدعی ہر قوم ان کی عزت کرتی ہے۔ نیز اللہ نے ان کی نسل میں بکثرت انبیائے کرام کو مبعوث کیا اور ان کے ساتھ قربانیوں میں شریک حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہ شرف بخشا کہ پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انہی کی نسل سے ہوئی اور باپ بیٹے کا مشترکہ تعمیر کردہ اللہ کا گھر قیامت تک کے لیے رشد و ہدایت کا عالمی مرکز قرار پایا۔

انبیائے بنی اسرائیل

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بیوی حضرت سارہ سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ پھر ان کی اولاد میں حضرت یعقوب علیہ السلام ہوئے جن کا اصل نام ''اسرائیل'' (اللہ کا بندہ) تھا، اس لیے ان کی اولاد ''بنی اسرائیل'' کہلائی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جن سے بارہ قبیلے ظہور پذیر ہوئے۔ ان قبائل میں مبعوث ہونے والے

---

① تفسیر ابن کثیر، سورۃ الصافات، آیت: ۱۰۳ تا ۱۰۷

② الکامل فی التاریخ: ۱/۵۰، ۵۱

③ سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۲۷؛ صحیح البخاری، ح: ۳۳۶۵، کتاب احادیث الأنبیاء؛ سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۲۹

پیغمبر ”انبیائے بنی اسرائیل“ کہلاتے ہیں جن میں حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت یوشع، حضرت ایوب، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت عُزیر، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام مشہور ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام:

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں میں سے حضرت یوسف سب سے چہیتے اور باصلاحیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے مثال حسن بھی عطا فرمایا تھا۔ دوسرے بھائیوں نے حسد کی وجہ سے انہیں قتل کر دینا چاہا اور ایک کنویں میں پھینک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی۔ قریب سے گزرنے والے ایک قافلے نے انہیں کنویں سے نکال لیا اور مصر کے بازار میں غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ مصر کے وزیر نے جسے ”عزیز“ کہا جاتا تھا، انہیں خرید کر گھر کا منتظم بنا دیا۔ عزیز کی بیوی ان پر فریفتہ ہوئی اور انہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام اس کے جال میں نہ آئے تو اس نے ساز باز کر کے انہیں جیل جانے پر مجبور کر دیا، جہاں چودہ سال گزارنے کے بعد آخر وہ اس وقت رہا ہوئے جب بادشاہِ مصر رَیّان بن ولید ایک عجیب خواب کی تعبیر جاننے سے عاجز آ گیا۔ یہ تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے بتائی اور بادشاہ نے ان کے علم سے متاثر ہو کر انہیں نہ صرف رہا کرنے کا حکم دیا بلکہ اپنا وزیرِ خزانہ بنا دیا۔ اقتدار ملنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں اور والد کو بھی اپنے پاس مصر بلا لیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا انتقال ایک سو دس سال کی عمر میں ہوا۔ اس کے چونسٹھ سال بعد بنی اسرائیل کے سب سے بڑے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ ①

حضرت موسیٰ علیہ السلام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے کچھ مدت پہلے مصر کے قبطیوں کے ایک فرد ولید بن مُصعَب نے جو ابتداء میں معمولی سرکاری افسر تھا، سلطنت پر قبضہ کر کے خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا اور لوگوں کو کفر و شرک پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کے باوجود بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے دین پر قائم تھے جس کی پاداش میں انہیں غلامی کی سی حیثیت دے دی گئی تھی۔

اس موقع پر بنی اسرائیل کے ایک نیک گھرانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ ان کی ولادت سے قبل فرعون نے ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر نجومیوں نے یہ دی کہ بنی اسرائیل کی نسل کا ایک بچہ فرعونی سلطنت کو ختم کر دے گا۔ فرعون نے اس بچے کے خاتمے کے لیے بہت انتظامات کیے اور بنی اسرائیل میں ان گنت نومولود بچوں کو قتل کرتا چلا گیا مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کے لیے والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ انہیں صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیں۔ یہ صندوق بہتے بہتے دریائے نیل کی اس نہر میں چلا گیا جو فرعون کے محل میں جاتی تھی۔ فرعون کی بیوی آسیہ نے صندوق کھولا اور اس بچے کو گود لے لیا۔ اس طرح فرعونی سلطنت کے خاتمے کی علامت بن کر آنے والا یہ عظیم پیغمبر فرعون ہی کے محل میں پلا بڑھا۔

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱/۲۳۵ تا ۲۳۹؛ الکامل فی التاریخ: ۱/۱۲۳ تا ۱۲۷؛ المختصر فی اخبار البشر: ۱/۱۷،۱

جوانی کے ایام میں ان سے ایک مقامی شخص کا نادانستہ قتل ہو گیا جس کی بناء پر انہیں ملک چھوڑ کر "مَدْیَن" جانا پڑا، وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت اور تربیت میں رہے اور آخر ان کے داماد بنے۔ آخر وہ وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے انہیں کوہ طور پر ہم کلامی کا شرف بخشا اور نبوت عطا کر کے فرعون کے ہاں جانے کا حکم دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے فرمان کے مطابق فرعون کے دربار میں توحید کا پیغام سنایا اور مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کیا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو کھلے معجزات بھی دکھائے مگر وہ اپنی ضد اور عناد پر ڈٹا رہا۔

آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے شام کی طرف روانہ ہوئے۔ مصر اور وادیٔ سینا کے درمیان واقع چند میل چوڑی سمندری پٹی سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ساتھ ایک معجزے کے طور پر سمندر کو عبور کیا۔ فرعون ان کا تعاقب کرتے ہوئے اسی سمندر میں غرق ہو گیا۔

مگر فرعون سے نجات پاتے ہی بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانیاں شروع کر دیں۔ سمندر کے پار آ کر انہوں نے ایک قوم کو دیکھا جو بتوں کو پوجتی تھی، فوراً موسیٰ علیہ السلام سے تقاضا کیا کہ ہمارے لیے بھی ایک ایسا خدا بنا دیں، جو نظر آئے، ہم اُس کے سامنے سر جھکائیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے غضب ناک ہو کر فرمایا: "تم بہت جاہل لوگ ہو۔"

موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کوہ طور پر گئے تو ان کی عدم موجودگی میں ان کی قوم کے ایک عیار شخص سامری نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کے طلائی مجسمے کی عبادت کی طرف راغب کرنا شروع کیا۔ ہزاروں بنی اسرائیلی اس فریب میں آ کر مرتد ہو گئے اور پھر اس جرم کی پاداش میں قتل ہوئے۔

جب موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر آئے تو بنی اسرائیل کے عمائد نے ایک بار پھر شک کیا کہ ان دیکھے خدا کے نوشتے پر کیوں کر ایمان لائیں۔ چنانچہ ایک بار پھر مطالبہ کیا کہ ہمیں اللہ کی کھلم کھلا زیارت کرائی جائے۔ اس پر آسمانی بجلی کڑکی اور وہ ہلاک ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کی بے تابانہ دعا پر اللہ نے انہیں دوبارہ زندہ کیا مگر بنی اسرائیل کی حالت نہ سُدھری۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بقیہ زندگی بنی اسرائیل کی نظریاتی و اخلاقی تربیت میں گزری۔ اس کام میں ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام ان کے معاون تھے۔ دونوں کو قوم کی طرف سے بار بار ناقدری اور کج فہمی کا سامنا کرنا پڑا۔ بنی اسرائیل نے تورات کے بہت سے احکام کو سخت تصور کر کے ان کا انکار بھی کیا۔ ایسی حرکات کی وجہ سے بنی اسرائیل کو کئی بار آسمانی تنبیہات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ان کے آبائی وطن فلسطین لے جا کر آباد کرنا چاہتے تھے، مگر وہاں ایک مشرک قوم عمالقہ قابض ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان مشرکوں سے جہاد کا حکم دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم سنایا تو بنی اسرائیلی بولے: "آپ اور آپ کا خدا جا کر جہاد کریں، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔"

اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مدتِ دراز تک وطن کی نعمت سے محروم رکھا اور وہ مصر اور شام کے درمیان ''تیہ'' کے بیابانوں کی خاک چھانتے رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی اصلاح میں مسلسل مصروف رہے۔ ابھی قوم کی تربیت کا کام باقی تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے۔ ①

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے نسل نو کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ بنی اسرائیل اپنی ماضی کی کوتاہیوں کی تلافی کرنے کے لیے ان کے پرچم تلے جمع ہوئے اور قوم عمالقہ سے جہاد کر کے ان کا مرکزی شہر ''اریحا'' فتح کر لیا۔ عمالقہ شکست کھا کر بکھر گئے۔ ان کے بہت سے افراد افریقہ میں جا بسے اور ''بربر'' کہلائے۔ ②

عہدِ قضاۃ اور عہدِ ملوک:

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی وفات کے بعد چار سو برس تک بنی اسرائیل کی سیاست ان کے علماء کے ہاتھوں میں رہی۔ یہ دور ''عہد قضاۃ'' کہلاتا ہے۔ اس کے بعد کی تاریخ کا دور ''عہد ملوک'' کہلاتا ہے جس میں حضرت شموئیل، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام جیسے برگزیدہ پیغمبران کے بادشاہ بنے۔ طالوت کی قیادت میں بنی اسرائیل نے جالوت جیسے دشمن کو شکست دے کر دریائے اُردن کے پار کا علاقہ بھی فتح کر لیا۔

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا دورِ حکومت بنی اسرائیل کی تاریخ کا سنہرا دور تھا جس میں اسرائیلی دنیا کی سب سے طاقتور قوم شمار ہوتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت جنات، پرندوں اور ہوا پر بھی تھی۔ تختِ سلیمانی جس پر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے درباریوں سمیت تشریف فرما ہوا کرتے تھے، آن کی آن میں سینکڑوں میل طے کر جاتا تھا۔ آخری عمر میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس میں ایک عبادت گاہ کی تعمیر شروع کرائی جس میں جنات بھی مزدوروں کے طور پر کام کر رہے تھے، اس تعمیر کے دوران حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا۔ ③

بنی اسرائیل کی گمراہی، زوال اور غلامی:

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیلی ایک بار پھر نظریاتی و اخلاقی کج روی کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے زبور کے مندرجات میں تحریف کر دی۔ ان کے بدطینت افراد شیطانی علوم، جادو اور کہانت کو بڑے فخر سے سیکھنے لگے اور یہ دعوے کرنے لگے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی جادو کے ذریعے جنات کو قابو کر رکھا تھا۔ ④ (نعوذ باللہ)

عقائد و نظریات میں آمیزش نے قوم کو منتشر کر دیا اور ان کی نظریاتی یکجہتی کے خاتمے کے ساتھ ہی سیاسی وحدت بھی بکھر کر رہ گئی۔ عقائد کے اختلاف کی وجہ سے نہ صرف ان میں مستقل فرقے بن گئے بلکہ وہ دو مستقل حکومتوں میں تقسیم ہو گئے: ایک فرقہ بیت المقدس کو قبلہ مانتا تھا، اس نے فلسطین کے جنوب میں ''یہودا'' کے نام سے حکومت بنالی۔

---

① الکامل فی التاریخ: ۱/۶۹ تا ۷۲ ؛ تفسیر ابن کثیر، البقرۃ، آیت: ۳۹ تا ۶۰ ؛ المختصر فی اخبار البشر: ۱/۵۷ تا ۵۹
② الکامل فی التاریخ: ۱/۳۷ تا ۷۶ ③ الکامل فی التاریخ: ۱/۲۰۰ تا ۲۱۰ ④ سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۰۲

دوسرا فرقہ ''کوہ سامرا'' کو قبلہ کہتا تھا۔ اس نے فلسطین کے شمال میں ''اسرائیل'' کے نام سے الگ ریاست قائم کرلی۔ یہ زمانہ جسے ''عہدِ انقسام'' کہا جاتا ہے، بنی اسرائیل کے لیے اغیار کی غلامی کی تمہید تھا۔ اس دور میں حضرت اِرْمیا علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے متحرک رہے اور انہیں آنے والی تباہی سے خبردار کرتے رہے، مگر یہ لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر ان کے انتشار سے موقع پا کر فارس کے بادشاہ ''لُہْراسپ'' کے نائب بُخْتِ نَصَّر نے جو عراق کا حاکم تھا، فلسطین پر حملہ آور ہو کر بیت المقدس کو اُجاڑ دیا، تورات کے نسخے جلا دیے، معبدِ سلیمانی کو مسمار کر دیا، ہزاروں بنی اسرائیلیوں کو قتل کر دیا اور لگ بھگ ستر ہزار افراد کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے نو سو ننانوے سال بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو پچاسی سال قبل کا واقعہ ہے۔①

ستر برس تک بیت المقدس ویران رہا۔ آخر فارس میں جب بَہْمَن (کورش) نے حکومت سنبھالی تو اس نے جلاوطن بنی اسرائیلیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے بیت المقدس کو بھی از سرِ نو تعمیر کرا دیا۔ بابل سے واپس آنے والے لوگوں میں حضرت عُزَیر علیہ السلام بھی تھے، جنہوں نے اپنے حافظے کی مدد سے تورات کو دوبارہ لکھوا دیا۔ اس طرح یہودیوں کو ایک مدت بعد شریعت کا مأخذ دوبارہ میسر آیا۔

یہودی طویل مدت تک فارس کے بادشاہوں کے ماتحتی میں زندگی بسر کرتے رہے یہاں تک کہ یونانی فاتح سکندرِ اعظم نے ایشیا کا رخ کیا اور بختِ نَصَّر کے حملے کے چار سو پینتیس سال بعد شام، عراق اور ایران پر قابض ہو کر کیانی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ اس طرح یہودی یورپی بادشاہوں کے ان نائبین کی غلامی میں چلے گئے جن کو فلسطین میں ''ہیروڈوس'' (Herods) کہا جاتا تھا۔

اس پستی اور ذلت کے دور میں بھی بنی اسرائیل میں انبیاء کرام کا سلسلہ جاری تھا مگر ان کی کوششیں بار آور نہیں ہورہی تھیں۔ علمائے یہود نے تورات کو اپنی خواہشات کے مطابق مُحرَّف کر کے انبیاء کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں کی سختی سے مخالفت شروع کردی تھی، اس کے علاوہ ان انبیائے کرام کو یورپی حکام کی روک ٹوک اور سختیوں کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے چونسٹھ سال قبل رومی حاکم پومپئی نے یونانیوں کو شکست دے کر فلسطین پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح یہودی یونانیوں سے رومیوں کی غلامی میں آگئے۔ رومیوں کے دور میں حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جیسے مشفق پیغمبروں نے قوم کی اصلاح کے لیے تمام توانائیاں صرف کردیں مگر حضرت زکریا علیہ السلام کو یہودیوں نے جھوٹی تہمتیں لگا کر آرے سے چیر ڈالا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو رومی حاکم ہیرڈوس نے اس وجہ سے قتل کر دیا کہ وہ اپنی بھتیجی سے نکاح کرنا چاہتا تھا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اسے اس گناہ سے منع کیا تھا۔②

---

① المختصر فی اخبار البشر: ۱/ ۳۱ تا ۳۲، ۴۷، ۵۶

② المختصر فی اخبار البشر: ۱/ ۳۳، ۳۴

حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے چھ ماہ بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کنواری حضرت مریم سے بغیر باپ کے پیدا کیا۔ انہیں تیس سال کی عمر میں نبوت ملی۔ وہ فلسطین کے شہروں میں گھوم پھر کر بنی اسرائیل کو دین کی دعوت دینے لگے۔ اللہ نے انہیں ''انجیل'' عطا کی تھی جو حکمت ونصائح سے بھرپور آسمانی کتاب تھی مگر یہود کی اکثریت نے نہ صرف یہ کہ انجیل کا انکار کردیا بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی جادوگر قرار دیا اور مقامی رومی حاکم کے ساتھ مل کر بنی اسرائیل کے اس آخری نبی کو قتل کرنے کی سازش تیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عین وقت پر اُن کے نرغے سے بچا کر آسمان پر اٹھا لیا اور یہودیوں نے اپنے مخبر ''یہوذا'' کو، جس کی شکل اللہ کے حکم سے اسی وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ کردی گئی تھی، گرفتار کرلیا۔ عدالت میں باقاعدہ مقدمہ چلا کر اس شخص کو سولی دے دی گئی۔[1]

یہود تب سے اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کردیا ہے، حالانکہ قرآنِ مجید واضح طور پر اعلان کرتا ہے:

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ

''انہوں نے نہ ان (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہوگیا۔''[2]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی حالت:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی سرکشی اور ڈھٹائی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ وہ دوسری اقوام کے تسلط سے نکلنے اور انہیں زیر کرنے کے لیے طرح طرح کی سازشوں میں مصروف ہوگئے۔

ان کی حرکات سے تنگ آکر ۷۰ عیسوی میں رومی حاکم طیطوس (Titus) نے ان کا قتل عام کیا اور معبدِ سلیمانی کو منہدم کرادیا۔ ۱۳۵ عیسوی میں ایک اور حکمران اڈریان نے مزید ستم ڈھائے اور انہیں بیت المقدس سے نکال دیا۔ یہود منتشر ہوکر مختلف خطوں میں جا بسے۔ ان میں سے کچھ جزیرۃ العرب آکر حجاز کے شہر ''یثرب'' میں آباد ہوگئے۔

اس دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زیادہ تر پیروکار جو پہلے ہی مٹھی بھر تھے، دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ جو باقی رہ گئے تھے، وہ رومی حکام کی دارو گیر کی وجہ سے دینِ عیسوی کی زیادہ اشاعت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے بہت سے معتقدین اپنے مذہب کو چھپا کر جنگلوں میں بس گئے تھے اور راہب کہلانے لگے تھے۔ اسی زمانے میں ایک شخص ظاہر ہوا جس کا اصل نام ساؤل تھا مگر وہ پولُس کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کٹر یہودی تھا۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ان کی بھرپور مخالفت کی تھی، مگر ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کے کچھ عرصے بعد وہ ان پر ایمان لانے کا دعویٰ

---

① الکامل فی التاریخ: ۱/۲۴۷ تا ۲۸۶

② سورۃ المائدۃ، آیت: ۱۵۷

کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے مسیحی مذہب کے ایسے اصول وقواعد وضع کیے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے بالکل جدا تھے۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت جبرئیل علیہ السلام اور خدا پر مشتمل تین خداؤں کا نظریہ پیش کیا، خدا کو باپ اور عیسیٰ کو بیٹا قرار دیا۔ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سُولی چڑھنے کا عقیدہ پھیلایا جیسا کہ یہود کا خیال تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصل ساتھی اس پر یقین نہیں کرتے تھے کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی نگاہوں کے سامنے آسمان پر اٹھایا گیا تھا، مگر پولس نے نہ صرف یہ عقیدہ مشہور کیا بلکہ اس بات کا بھی پرچار کیا کہ خدا کا بیٹا سولی چڑھ کر اپنے ماننے والوں کے سابقہ گناہوں کا کفارہ ادا کر گیا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے سچے حواریوں نے پولس کے نظریات کی سخت مخالفت کی۔ اس طرح عیسائیوں میں کئی فرقے بن گئے۔ پولس کے مذہب کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔ اس نے خود یورپ جا کر اپنے عقائد کی تبلیغ کی۔ اس کے نظریات چونکہ رومی اور یونانی دیومالائی تصورات کے قریب تر تھے، اس لیے لوگ خفیہ طور پر اس کا مذہب قبول کرتے چلے گئے۔ پولس کے بعد اس کے مریدوں نے تبلیغ کا کام جاری رکھا اور یوں رفتہ رفتہ اصل دینِ عیسوی کی جگہ پولس کے نظریات نے لے لی۔ یہ دین "عیسائیت" کے نام سے شام، مصر، ایشیائے کوچک، قُسطَنطِینِیَّہ اور روم میں پھیل گیا۔

چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں اس بدلی ہوئی مسیحیت کو روم کے بادشاہ قُسطَنطِین بن قُسطَنطِس کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ یہ بادشاہ بوڑھا ہوگیا تھا اور عمائد سلطنت اس سے بے زار ہو کر متبادل حکمران لانے کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ بادشاہ نے سیاسی چال چلتے ہوئے عیسائی مذہب قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح وہ لاکھوں لوگ جو خفیہ طور پر عیسائی بن چکے تھے، اس کی حمایت میں کھڑے ہوگئے جن کو ساتھ لے کر اس نے اپنے سیاسی مخالفین کا جو قدیم یونانی دیومالائی مذہب پر قائم تھے، مقابلہ کیا اور انہیں شکست دے کر اپنے نئے مذہب کا پلہ بھاری کر دیا۔

۳۲۵ء میں "نِیقِیَہ" (موجودہ ترکی کے ایک شہر) میں اس نئے مذہب کے علماء کی کانفرنس ہوئی، جس میں تثلیث، عقیدۂ کفارہ اور خدا کے باپ اور عیسیٰ کے بیٹے ہونے کے عقائد کو عیسائیت کا لازمی اصول مان لیا گیا، اس طرح انجیل کے ان تحریف شدہ نسخوں کو آسمانی نوشتہ قرار دے دیا گیا جس کے اصل ہونے کی کوئی سند موجود نہیں تھی۔

اس طرح عیسائیت اللہ کی توحید سے ہٹ کر مشرکانہ عقائد کا مجموعہ بن گئی۔ صرف ناصریہ (Nazarenes) ایک چھوٹا سا گروہ ایسا رہ گیا تھا جو رومی حکومت کے جبر، پادریوں کی ضلالت اور یہودیوں کی ملمع سازیوں کے باوجود توحید پر جما رہا۔ ان کے علاوہ کچھ راہب اور بزرگ ایسے تھے جو صحیح العقیدہ تھے مگر اپنے افکار کو یہودیوں کے خوف کے باعث دنیا سے مخفی رکھتے تھے۔ انہی میں سے ایک صاحب، نجران کے وہ بزرگ تھے جو عبداللہ بن تامر نامی نوجوان کی ہدایت کا ذریعہ بنے۔ عبداللہ بن تامر کی کوششوں سے پوری قوم نے کلمہ توحید پڑھ لیا، مگر مقامی یہودی حاکم یوسف ذونُواس نے ان تمام مومنوں کو آگ کی خندقوں میں گرا کر شہید کر دیا۔ یہ بعثتِ نبوی سے ستر سال قبل کا واقعہ ہے۔[1]

[1] الکامل فی التاریخ: ۲۹۸/۱، ۲۹۹؛ التحفۃ المقدسیۃ فی مختصر تاریخ النصرانیۃ للعاصم المقدسی، ص ۹۶ تا ۱۱۱

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ حضرت نوح، حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کی بعثت کن قوموں میں ہوئی تھی؟ ان قوموں کا انجام کیا ہوا؟

❷ بنی اسرائیل کون تھے؟ انہوں نے اپنے انبیاء کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

❸ "عربِ عاربہ" اور "عربِ مستعربہ" میں کیا فرق ہے؟

❹ حضرت ابراہیم کی آزمائشوں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

❺ بنی اسرائیل کی تاریخ میں عہدِ قضاۃ اور عہدِ ملوک سے کیا مراد ہے؟

❻ بنی اسرائیل میں فرقہ بندی کیسے ہوئی اور وہ رومیوں کی غلامی کے چنگل میں کیسے پھنسے؟

❼ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفعِ آسمانی کے بعد موجودہ عیسائیت کیسے پھیلی؟

عملی کام:

❁ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کا نقشہ دیکھ کر سمجھیے کہ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت صالح اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی بعثت کن علاقوں میں ہوئی؟

کتب برائے مطالعہ:

❁ تاریخ ارض القرآن، از مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

❁ قصص الانبیاء از حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ، مترجم مولانا عبدالرشید

❁ تاریخ اُمتِ مسلمہ، حصہ اوّل

❁❁❁

دوسرا باب

اسلام سے قبل دنیا کی حالت

اہداف و مقاصد:

یہ باب پڑھ کر ان شاء اللہ آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1. حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا کی حالت کا اندازہ لگا سکیں۔
2. زمانہ جاہلیت کے مختلف ممالک، معاشروں اور قوموں کے عقائد، اخلاق اور معاشرت کو جان سکیں۔
3. یہ سمجھ سکیں اور دوسروں کو سمجھا سکیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر بگڑے ہوئے ماحول کو سلجھانے اور سنوارنے کی بے مثال جدوجہد کی تھی۔
4. موجودہ دور میں رائج ضلالت کی مختلف شکلوں کا زمانہ قدیم کی فکری گمراہیوں سے موازنہ کر سکیں۔
5. زمانہ جاہلیت کے ساتھ زمانۂ اسلام کا موازنہ کر کے دنیا پر اسلام کے احسانات ثابت کر سکیں۔

(یونٹ:1.3)

اسلام سے قبل دنیا کی حالت

چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں دنیا جہالت کی تاریکیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہندومت ہو یا بدھ مت، عیسائیت ہو یا یہودیت، ہر مذہب چند مخصوص افراد کی محدود سوچ کا مرقع نظر آتا تھا۔ دینی پیشوا ہدایت کی طلب، خدا خوفی اور آخرت میں جوابدہی سے غافل تھے۔ جو مذاہب کبھی سابقہ انبیائے کرام کی تعلیمات کے نقیب تھے، اب تحریف در تحریف کا شکار ہو کر متاعِ بازار ہو چکے تھے۔ انبیائے کرام کی کتب اور صحیفے اپنی اصل شکل میں محفوظ نہ تھے۔

ہندومت:

اس دور میں رائج مذاہب میں سے سب سے قدیم شاید ہندومت تھا جو مشرق میں تقریباً پورے جنوبی ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ یہ ایک ایسا گورکھ دھندا تھا جسے اس مذہب کے پیشوا بھی سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر تھے۔ ہمالیہ سے لے کر بحرِ ہند کے ساحل تک ۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جارہی تھی، گائے، بندر اور سانپ سے لے کر چوہے تک کی عبادت ہو رہی تھی۔ ہر محلے بلکہ ہر گلی کوچے میں الگ الگ معبود تھے۔

ایک ہندو مورخ کے بقول خداؤں کی تعداد ہندوستان کی آبادی سے بھی بڑھ گئی تھی۔ ایک دیوی کا پجاری دوسرے کے معبودوں کو ماننا اپنی توہین سمجھتا تھا، چنانچہ ہندو مذہب کی وضاحت ہی تقریباً ناممکن ہو گئی تھی، اگر کوئی پوچھتا کہ ہندو کسے کہتے ہیں؟ تو شاید جواب میں یہ کہا جاتا کہ ہر بت پرست ہندو ہے مگر یہ جواب بھی اس وقت غلط محسوس ہوتا جب لوگ دیکھتے تھے کہ ہندو رہنماؤں نے خدا کے وجود کا انکار کرنے والوں کو بھی "ناستک" کا نام دے کر ہندو دھرم میں شامل رکھا ہے اور شودروں کو بھی ہندو شمار کیا ہے، حالانکہ انہیں مندروں میں آنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔

بدترین اعتقادی گمراہیوں کے بعد ذات پات کی تفریق ہندو سماج کا دوسرا روح فرسا المیہ تھا۔ ہندوؤں کے ہاں برہمن خدا کی اولاد، ہر گناہ سے پاک اور ہر چیز کے مالک سمجھے جاتے تھے، کیوں کہ وہ مذہبی پیشوا تھے۔ کھتری سیاسی و عسکری امور کے مالک تھے۔ انہوں نے برہمنوں کو فکرِ معاش سے آزاد کر دیا تھا اور باقی قوم کو ظلم و استحصال کی چکی میں پیسنا اپنا مشغلہ بنا لیا تھا۔ ویش جو تیسرے درجے کی ذات تھے، تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کے ذریعے دونوں بالا دست طبقوں کے لیے سرمایہ پیدا کرنے میں جتے رہتے تھے جبکہ چوتھے درجے میں آنے والی ذات شودروں کا حال جانوروں سے بھی بدتر تھا۔ وہ اونچی ذات والے کے ساتھ بیٹھنا تو درکنار اُن کی کسی چیز کو چھو بھی نہیں سکتے تھے۔ انہیں پیدائشی گناہ گار، ازلی مجرم اور دیوتاؤں کا دھتکارا ہوا قرار دے دیا گیا تھا۔ ان کا ہر فرد پیدا ہوتے ہی اونچی ذات والوں کا غلام تھا۔ ان پر ہر ظلم و ستم ڈھانا روا تھا اور ان کا صدائے احتجاج بلند کرنا بدترین جرم۔ ①

---

① ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لابی الحسن علی الندوی، ص ۴۸ تا ۵۳

شاہ معین الدین ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''برہمن کے لیے کسی بھی حالت میں کوئی بھی سزا نہ تھی، اگر اچھوت اونچی ذات والے کو چھو لیتے تو ان کی سزا موت تھی۔ نیچے طبقے مذہبی تعلیم سے قانوناً محروم کر دیے گئے تھے۔ اخلاقی حالت انتہائی شرمناک تھی۔ ایک ایک عورت کئی کئی شوہر کر سکتی تھی، شراب گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، بدمستی میں ہر گناہ ثواب بن جاتا تھا...... مندر کے پجاری بداخلاقیوں کا پیکر تھے۔ دیوداسیوں کی اخلاقی حالت شرمناک حد تک گری ہوئی تھی۔ عورتوں کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی...... بعض طبقوں میں لڑکیاں قتل کر دی جاتی تھیں...... عورت شوہر کی موت کے بعد تمام دنیاوی فوائد سے محروم کر دی جاتی تھی، اس لیے وہ شوہر کے ساتھ جل کر مرجانے کو زندگی پر ترجیح دیتی تھی۔''[1]

بدھ مت:

جنوبی ایشیا کا دوسرا بڑا مذہب ''بدھ مت'' تھا جس کا بانی شہزادہ سدارتھ تھا جسے گوتم بدھ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندو مذہب میں ذات پات کی انسانیت سوز حد بندیوں سے تنگ آ کر اُس نے تنہائی میں مراقبے اور ذاتی غور و فکر کے بعد ایک نیا اخلاقی نظام پیش کیا جس میں سب انسان برابر تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کے ردِّ عمل میں اس نے کروڑوں دیوی، دیوتاؤں کا اس طرح انکار کیا کہ ایک خدا کا قائل ہونا بھی ضروری نہ سمجھا۔ بدھ نے ذات پات کی قید سے آزادی دلانے کا نعرہ لگا کر کروڑوں انسانوں کو چونکا دیا مگر خدا کے تصور کا خانہ خالی ہونے کی وجہ سے یہ مذہب ایک زمانے تک لوگوں کو متاثر نہ کر سکا۔ گوتم بدھ کے بعد بدھ مت کے پیشواؤں نے اشاعتِ مذہب کی کوشش کی تو ایک محسوس خدا کو پوجنے کی عوامی خواہش کو پیش نظر رکھتے ہوئے گوتم بدھ ہی کو خدا قرار دے دیا اور اس کی مورتی کی پوجا کو اتنا رواج دیا کہ ہندوؤں کی بت سازی اور صنم پرستی بھی پیچھے رہ گئی۔ بدھ کے مجسمے وسطِ ایشیا سے مشرقِ بعید اور بحر الکاہل کے جزائر تک نصب ہو گئے۔ یوں وحی کی رہنمائی سے محروم ہونے کے سبب ایک نئی اصلاحی تحریک مستقل گمراہی کا جال بن گئی۔[2]

ایران کی مذہبی اُفتاد:

مشرق کی سب سے بڑی طاقت ایران و خراسان اور وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی ساسانی سلطنت تھی۔ شاہانِ ایران مجوسی تھے اور صدیوں سے آتش پرستی کو فروغ دے رہے تھے۔ مجوسی مذہب کا بانی زَرْتُشت (زَرُدَشت) تھا جو ساتویں صدی قبل اَز مسیح میں نمودار ہوا۔ اسی نے روشنی اور اندھیرے، نیکی اور برائی اور خدائے خیر و خدائے شر کے درمیان جنگ کا تصور پیش کر کے لوگوں کو آتش پرستی کا خوگر بنایا۔ مجوسی سورج اور چاند کو بھی پوجتے تھے۔ اس کے علاوہ خود ایرانی بادشاہ کسریٰ بھی اپنے آپ کو خدا کہلواتا تھا۔ خسرو پرویز کے نام کے ساتھ یہ القاب لگائے جاتے تھے:

---

[1] تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی: ۱/۲۴، ط دار الاشاعت

[2] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لابی الحسن علی الندوی، ص ۳۶ تا ۳۸

"خداؤں میں انسان غیر فانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی۔"①

ان سب خداؤں کے اوپر وہ نیکی اور بدی کے دو الگ الگ خداؤں کو سب سے بالاتر مانتے تھے، نیکی کو فروغ دینے والا خدا "یزداں" اور برائی کا مالک خدا "اہرمن" کہلاتا تھا جو شیطان کا بگڑا ہوا تصور تھا۔ ان کے خیال میں روزِ ازل سے یزداں اور اہرمن میں کش مکش جاری چلی آرہی تھی اور اسی وجہ سے کائنات میں خیر و شر، تعمیر و تخریب اور فتح و شکست کی مختلف شکلیں سامنے آتی رہتی تھیں۔ یہ ایرانیوں کے عقیدے کی بنیاد تھی جس پر عجیب و غریب اعتقادات قائم تھے جو گاہے گاہے رنگ بدلتے رہتے تھے۔

مجوسیت چند مخصوص عبادتوں کا نام تھا جو خاص اوقات میں آتش کدے میں ادا کی جاتی تھیں۔ آتش کدے سے باہر ہر مجوسی شرعی و اخلاقی حدود سے بالکل آزاد تھا۔ سود خوری، شراب نوشی اور زنا کاری جیسے گناہ جو اکثر معاشروں میں برے سمجھے جاتے تھے، ان کے نزدیک بالکل جائز تھے، یہاں تک کہ محارم سے جنسی تعلقات قائم کرنا بھی ان کے ہاں درست تھا۔

چونکہ یہ مذہب اخلاقی تعلیمات سے یکسر خالی تھا، اس لیے اس کے ایک ہزار سال بعد (تیسری صدی عیسوی میں) "مانی" نے "مجوسیت" میں اصلاحات کا بیڑا اُٹھایا اور دنیا سے برائیوں کے خاتمے کے لیے لوگوں کو دنیا ترک کرنے، جنگلوں میں جا بسنے اور نکاح و اولاد کی ذمہ داریوں سے دور بھاگنے کی ترغیب دی۔ یہ ایک دوسری انتہا تھی جو انسانی معاشرت کے تقاضوں کے بالکل خلاف تھی، اس لیے پانچویں صدی عیسوی میں جبکہ آلِ ساسان کی حکومت کا سورج نصف النہار پر تھا "مزدک" نے نئی اصلاحات پیش کیں، جن کے تحت انسان کو ہر طرح کی عیاشی کی اجازت دے دی گئی، نہ صرف کھانے پینے، جائیداد اور مال و دولت میں بلکہ عورتوں سے جنسی تعلقات میں بھی تمام مردوں کو برابر کا حق دے دیا گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ایک دوسرے کے گھروں کو لوٹنے لگے، کھیتوں اور املاک پر قابض ہونے لگے، جو شخص جہاں چاہتا، جس عورت کو چاہتا اپنی جنسی تسکین کے لیے پکڑ لیتا۔

غرض ایرانی سلطنت اور معاشرت جو بلوچستان سے سمرقند و بخارا تک اور خراسان سے ایشیائے کوچک کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی، کبھی اس توازن اور اعتدال سے ہم آہنگ نہ ہو سکی جو ایک کامیاب اور پر امن معاشرے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے برعکس وہاں بدامنی، تشدد، ظلم اور استحصال کا دور دورہ تھا، عوام انتہائی غربت اور بدحالی کی تصویر تھے، جبکہ حکمران اس کے برعکس دنیا کو جنت بنانے میں مصروف تھے۔

ایرانی شہنشاہیت کے زیر نگین دو درجن کے لگ بھگ سلطنتوں کی آمدن کا اکثر حصہ بادشاہ اور شاہی اعیان کی تفریحات اور عیاشیوں میں خرچ ہو رہا تھا۔ پایۂ تخت مدائن میں کسریٰ کے شاہی باورچیوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی، جبکہ گلوکاراؤں، رقاصاؤں، سازندوں، موسیقاروں، شکاری چیتوں، کتوں اور ان کو سدھانے والوں کی تعداد اس

---

① نبی رحمت ﷺ، ص ۷۴

سے بھی زیادہ تھی۔ موسم گرما کو موسم بہار بنانے کے لیے کسریٰ نے مشہور زمانہ ''قالینِ بہار'' تیار کرایا تھا جس کے ایک ایک مربع فٹ پر ہزاروں اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں۔ ①

چین کی اعتقادی حالت:

مشرق کا آخری بڑا ملک چین اپنی تمام تر سرحدی وسعتوں، معدنی دولتوں، غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں اور تہذیب و تمدن کی نفاستوں کے باوجود ''کنفیوشس'' کے فلسفے سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو پچپن سال پہلے چین کے علاقے شانتونگ میں پیدا ہوا تھا اور پھر ایک فلسفی کی حیثیت سے متعارف ہو کر تین ہزار سے زائد شاگرد پیدا کر گیا تھا۔ اس مشرقی مفکر نے چند اخلاقی تعلیمات کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کر کے انسانی ذہن کو ایک محدود دائرے میں سوچ بچار کی راہ پر ضرور لگایا تھا مگر انسانی روح اور انسانی معاشرے کو درپیش ان عالمگیر مسائل کا حل پیش کرنے سے وہ بالکل قاصر رہا جو انسانیت کے اجتماعی ضمیر کے لیے المیہ بن چکے تھے۔ ②

یورپ کی اخلاقی وروحانی ابتری:

مشرق میں تہذیب وتمدن کی ایک گہما گہمی ضرور تھی مگر مغرب کا حال اس سے کہیں زیادہ برا تھا۔ مشرقی یورپ سے لے کر وسطی اور مغربی یورپ تک سوائے جہالت، افلاس، آلودگی اور جمود کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یورپی باشندے علوم وفنون سے بالکل بے بہرہ تھے۔ باقی دنیا سے انہیں کچھ سروکار نہیں تھا۔ سیاست ہو یا معاشرت، تعلیم ہو یا صنعت و تجارت ہر چیز پر بد عقیدہ اور متعصب پادریوں کی اجارہ داری تھی جن کی انتہا پسندی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ایک طرف تو جدید علوم وفنون کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے کائنات میں غور وفکر اور تحقیق وایجادات کی ہر کوشش کو ممنوع قرار دے دیا تھا جس کی وجہ سے ذہین لوگوں کی فکری ونظری صلاحیتیں معطل ہو کر رہ گئی تھیں۔ دوسری طرف انہوں نے رومی سلطنت کی تقسیم کے ساتھ ساتھ کلیسا کو بھی دو حصوں: مشرقی کلیسا اور مغربی کلیسا میں بانٹ لیا تھا۔

مشرقی کلیسا کا مرکز قُسطنطینیہ تھا، جسے آرتھوڈکس چرچ کہا جاتا تھا، اس کا سربراہ ''بطریق'' (Patrick) کہلاتا تھا۔ مغربی کلیسا کیتھولک چرچ کے نام سے موسوم ہو چکا تھا، جس کا پیشوا پوپ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ قُسطنطینیہ اور روم کی سیاسی عداوت کے ساتھ دونوں چرچوں میں بھی دشمنی بڑھتی جاتی تھی۔ دونوں اپنے اپنے عقائد ایک دوسرے پر ٹھونسنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ مشرقی کلیسا کہتا تھا کہ باپ (خدا) کا رتبہ بیٹے (یسوع مسیح) سے بڑا ہے، جبکہ مغربی کلیسا دونوں کو بہر حال برابر قرار دیتا تھا۔ ایسے کئی تنازعے تھے جن کی وجہ سے باہم لعنت اور تکفیر کی نوبت بھی آجایا کرتی تھی۔ اس صورتِ حال سے متنفر ہو کر ہزاروں لوگ اپنا دین وایمان بچانے کے لیے جنگلوں میں جا بسے اور راہب کہلائے مگر کسی نوشتۂ ہدایت سے محرومی کی وجہ سے وہ خود نت نئی گمراہیوں کا شکار بن گئے۔ ③

---

① السیرۃ النبویۃ لابی الحسن علی الندوی، ص ۳۳ تا ۳۶ ② ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ص ۳۶
③ تفسیر ابن کثیر، سورۃ الحدید، آیت: ۲۷؛ التحفۃ المقدسیۃ فی مختصر تاریخ النصرانیۃ للعاصم المقدسی، ص ۹۶ تا ۱۱۱

ان مذہبی لوگوں کو عام زندگی کے مسائل پر غور کرنے کی قطعاً فرصت نہیں تھی۔ پادریوں اور راہبوں کی بڑی تعداد تشدد پسند، مردم بیزار اور قنوطی تھی۔ وہ خود کو اذیت پہنچا کر خدا کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انسانی معاشرے سے وہ بالکل کٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں اب تک یہ طے نہیں ہوا تھا کہ عورت کو کسی چیز کے خریدنے بیچنے یا اس کا مالک بننے کا حق حاصل ہے۔ وہ اس پر بھی پورا یقین نہیں رکھتے تھے کہ عورت انسان ہے۔ ان کے بعض حلقوں میں صنفِ نازک کو کتے، بلی جیسا حیوان مانا جاتا تھا۔ انہیں اس میں بھی شک تھا کہ عورت میں روح ہے یا نہیں۔ بعض لوگ اسے ایک بے جان مشین ہی تصور کرتے تھے۔ ① رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

''اس دور کی وحشت و بہیمیت قدیم زمانے کی وحشت اور درندگی سے کئی گنا زیادہ تھی کیوں کہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش جیسی تھی جو گل سڑ گئی ہو۔'' ②

یورپ میں یہ دور افراتفری اور انتشار کا تھا، اٹلی اور فرانس سے مشرقی یورپ اور قُسطَنطِینِیّہ تک سیاسی رسہ کشیوں اور طوائف الملوکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی مصلح یا مجدد نہیں تھا جو جہالت کی ان تاریکیوں میں راہِ راست کی طرف ہلکا سا اشارہ دیتا۔ ان کے پاس اصل انجیل کا کوئی مستند نسخہ باقی نہیں بچا تھا بلکہ وہ مدتِ دراز بعد دریافت ہونے والے ان نسخوں کو انجیل کا متبادل مان چکے تھے جو حواریوں کی یادداشتیں تھیں اور ان میں بھی بے پناہ تحریف ہو چکی تھی۔

دینِ عیسوی کے اصل داعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا:

(اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ) ''بے شک اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے، پس تم اس کی عبادت کرو۔'' ③

مگر مسیحی پیشوا کا روپ دھارنے والے عیار یہودی ''پولس'' نے مسیحیت کی توحید کو تثلیث سے بدل ڈالا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیوا صلیب کے پیروکار بن گئے تھے۔ یونانی فلسفے کے اثرات میں بہہ کر انہوں نے سیدھی سادی توحید کی دعوت کو چھوڑ دیا تھا اور رومی بت پرستوں کو جلد متاثر کرنے کی غرض سے باپ، بیٹے اور روح القدس کا عجیب و غریب فلسفہ مان لیا، جس نے باقاعدہ عقیدۂ تثلیث (تین خداؤں پر یقین) کی شکل اختیار کر لی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں انہوں نے یہودیوں کی باتوں پر یقین کر لیا تھا جو کہتے تھے کہ ہم نے عیسیٰ کو قتل کر دیا ہے، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا تھا۔ ④

اس میں شک نہیں کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں بھی کہیں کہیں ایسے عیسائی مل جاتے تھے جو توحید کے قائل اور مروجہ عیسائیت سے بے زار تھے، مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم تھی اور جو تھے وہ کسی اصلاحی کوشش کی کامیابی سے مایوس تھے اور گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔

---

① السیرۃ النبویۃ لابی الحسن علی الندوی، ص ۴۰ تا ۴۲

② ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لابی الحسن علی الندوی، ص ۳۸، نقلاً عن (The Making of humanity. P:164)

3 سورۃ آل عمران، آیت: ۵۱ ④ التحفۃ المقدسیۃ فی مختصر تاریخ النصرانیۃ للعاصم المقدسی، ص ۷۰ تا ۹۳

فلاسفۂ یونان:

اس دور میں تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کا ایک قدیم مرکز یونان تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں بازارِ فلسفہ کی رونق ماند پڑ چکی تھی، مگر اب بھی اسے سُقراط، افلاطون اور اَرسطو جیسے دانشوروں کی سرزمین کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ یہ سب کے سب اپنے دور کے نامور فلسفی تھے۔ سُقراط حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً چار سوسال پہلے گزرا تھا۔ اس کے نامور شاگرد افلاطون کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ساڑھے تین سوسال پہلے کا ہے۔ پھر اَرسطو آیا جو نامور یونانی فاتح سکندرِ اعظم کا استاد اور مشیر تھا۔ یونان کے شاہی خاندان کی سرپرستی میں ان فلسفیوں کی دکانیں خوب چمکیں۔ سکندرِ اعظم نے مشرق کو افکارِ فلاسفہ سے آشنا کرنے کی خاطر مصر میں اِسکندریہ کا شہر بسایا اور وہاں فلسطینیوں کو آباد کیا، اس طرح مشرق میں بھی فلسفیانہ علوم کی اشاعت شروع ہوگئی۔ یہ فلسفی ہر چیز اور ہر معاملے کو عقل کے ترازو میں تولنے کے عادی تھے، وہ کسی بھی مسئلے میں صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنے کے لیے انسانی عقل کو کافی قرار دیتے تھے اور وحی کی ضرورت کا انکار کرتے تھے۔

ان فلسفیوں نے نہ صرف طب، فلکیات، ریاضی اور سیاست کے معاملات پر بحث کی بلکہ خدا، کائنات، خیر وشر اور مخلوق کے آغاز وانتہا کے مسائل کو بھی صرف اپنی سوچ سے حل کرنے کی کوشش کی۔ یہاں ان کا قدم ایسا پھسلا کہ وہ دور دراز کی گمراہیوں میں جا گرے۔ وہ عقل پر اکتفا کرنے کی وجہ سے خالق کی معرفت سے بالکل جاہل رہے۔ آخرت اور حشر ونشر کے بارے میں ان کا ذہن کبھی صاف نہ ہو سکا۔ اپنے علم کو حتمی اور کامل تصور کرنے کی وجہ سے انہوں نے کبھی رسولوں کی تعلیمات پر غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس طرزِ فکر نے فلاسفہ اور ان کے پیروکاروں کو ایک طرح سے خدا اور آخرت کا منکر ہی بنا دیا۔ اس طرح شریعت اور وحی، حلال وحرام کے الفاظ ان کے لیے بے معنی ہوگئے۔

اس کے نتیجے میں یونان سمیت فلسفے سے متاثرہ ہر علاقے میں ایک مادر پدر آزاد تہذیب وجود میں آئی جس میں شکوک وشبہات میں سرگرداں رہنے کو "علم" کا نام دیا گیا، عریانی اور فحاشی کو تہذیب وثقافت مان لیا گیا۔ فلاسفہ کی دی ہوئی تہذیب نے یونان کا یہ حال کردیا کہ "ایتھنز" (Athens) کے چوکوں اور بازاروں میں فاحشہ عورتیں برعام دعوتِ گناہ دیا کرتی تھیں۔ فلسفیوں کے دورِ عروج میں برہنگی یونانی تہذیب کا ایسا لازمی حصہ بن گئی کہ فنونِ لطیفہ کی ہر صنف چاہے مصوری ہو یا مجسمہ سازی، اس کی عکاسی کرتی تھی۔ تھیٹروں میں عورتوں کا عریاں رقص کرنا عام بات تھی۔ کھیل کے میدانوں میں لوگ بالکل عریاں ہو کر کھیلتے اور تماشائی داد دیتے۔ بدکاری، فحاشی، کھیل کود، ناچ گانا اور عیش وتفریح ہی زندگی کا مقصد ٹھہری۔

نئے نئے نظاروں سے عیش اور تفریح کا ذوق اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ امراء اور شہزادے قیدیوں کو بھوکے درندوں سے لڑاتے اور اس تماشے سے محظوظ ہوتے، جنسی تسکین کے نت نئے طریقوں کی تلاش نے لوگوں کو فطری انداز سے اتنا منحرف کردیا تھا کہ بڑے بڑے شرفاء ہم جنس پرستی کی لت میں پڑے ہوئے تھے۔

چھٹی صدی عیسوی کے اس دور میں جس کی ہم بات کر رہے ہیں، یونان کی جگہ روم کا طوطی بول رہا تھا اور عروج فلاسفہ کے سنہرے ایام بیت چکے تھے، تاہم رومی تہذیب کے انگ انگ میں فلسفیانہ خیالات رچے بسے تھے اور تقریباً وہ تمام برائیاں موجود تھیں جن کا بیج فلسفے نے بویا تھا۔①

لفاظی ہی لفاظی:

سب سے زیادہ مایوس کن بات یہ تھی کہ مشرق و مغرب کے ان فلسفیوں، انقلاب کے ان داعیوں اور انسانیت کے ان رہنماؤں کی تعلیمات صرف کتابی اور نظری تھیں۔ عملی طور پر ان تعلیمات کا کوئی نمونہ دیکھنے کی کوشش کرنے والے کو سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آتا۔

ان میں کسی فلسفی یا داعی کی عملی زندگی اس بارے میں کوئی رہنمائی فراہم نہیں کرتی کہ انسان کس طرح روح و جسم کی پاکیزگی حاصل کرے، اس کی جلوت اور خلوت کیسی ہو، گفتار و کردار میں کیا جوہر ہوں، اس کا خالق سے تعلق کیسا ہو اور مخلوق سے کیسا۔ وہ خوشی میں کن جذبات سے آراستہ ہو اور رنج و صدمے میں اس کا رویہ کیا ہو۔ فتح اور کامیابی کے موقع پر اس کا برتاؤ کیا ہو اور شکست، مصیبت اور ناکامی سے دوچار ہو کر اس کے تاثرات کیسے ہوں، بڑوں اور بزرگوں سے اُس کا سلوک کیسا ہو اور چھوٹوں سے کس طرح پیش آئے، گھریلو زندگی کن خوبیوں کا مرقع ہو اور معاشرتی مصروفیات میں طور طریقے کیا ہوں؟ دنیا کو اِن سوالات کے عملی جوابات کی ضرورت تھی مگر لگتا تھا کہ عمل کی نعمتِ عظمیٰ انبیائے سابقین کے ساتھ ہی دنیا سے معدوم ہو چکی۔

یہود گمراہی میں غلطاں:

اگر سرسری نظر سے دیکھیے تو اس دور میں دوسروں کی بہ نسبت "یہودیوں" سے یہ توقع زیادہ کی جاسکتی تھی کہ ان میں کوئی نیا مصلح پیدا ہو جو انتہائی بگڑے ہوئے معاشرے میں کوئی تبدیلی لاسکے کیوں کہ ہزاروں برس سے بنی اسرائیل میں انبیائے کرام کا سلسلہ چلا آرہا تھا، پھر ان کے پاس تورات کی شکل میں ایک ہدایت نامہ موجود تھا، جس میں جا بجا تحریف کے باوجود ایک آخری پیغمبر کی نشانیاں بہرحال اب تک درج تھیں۔ خود یہود کو بھی یقین تھا کہ وہ آخری پیغمبر آنے والا ہے اور انہی میں سے ہوگا کیوں کہ صدیوں سے ان میں جلیل القدر انبیائے کرام کا ظہور ہوتا آرہا تھا۔ یہود نے خود کو باقی معاشروں میں گھلنے ملنے سے بھی محفوظ رکھا تھا اور وہ اپنے آباء کے طور طریقوں کی حفاظت کرتے رہے تھے، ان کی علمی صلاحیتوں اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے بھی ان میں کسی قائد اور مصلح کے ظہور کی اُمید کی جاسکتی تھی۔

مگر یہ صرف ظاہری جائزہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قوم جو صدیوں تک خدا کے انعامات و اعزازات کی مستحق رہی، اندرونی طور پر اتنی گر چکی تھی کہ اس سے کسی خیر کی توقع عبث تھی۔ یہودیوں کی ساری خرابیوں کی جڑ اُن کا غرور و تکبر تھا۔

---

① السیرۃ النبویۃ، لابی الحسن علی الندوی، ص ۳۰ تا ۳۲؛ قضایا المرأۃ فی المؤتمرات الدولیۃ، لدکتور فؤاد بن عبدالکریم، ص ۲۴۳

ماضی میں بار بار اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم سے بہرہ ور ہونے کے بعد انہوں نے تصور کر لیا تھا کہ وہ خدا کے لاڈلے اور برگزیدہ ہیں۔ اس تصور نے انہیں مغرور کر دیا جس کے نتیجے میں وہ خود رائی اور من مانی کے مریض بن گئے، جب یہ مرض حد سے بڑھا تو انہوں نے آسمانی شریعت کو بھی اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش شروع کر دی۔ تورات میں جابجا لفظی تبدیلیاں کر دیں اور جو آیات اصل حالت میں باقی تھیں ان کے معانی ومطالب اپنی طرف سے ایسے طے کر دیے جو ان کی خواہشات کے خلاف نہ ہوں۔

یہ نئے معانی ومطالب یہود کے اس زعم کی عکاسی کرتے تھے کہ وہ کائنات کی بہترین مخلوق ہیں اور باقی سب انسان ان کے غلام ہیں۔ انہی من پسند تشریحات کو انہوں نے سینہ بسینہ ہدایات کا نام دیا تھا اور صدیوں سے انہی پر عمل کرتے آرہے تھے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار اور ان کی تعلیمات کی مخالفت بھی اس لیے کی تھی کہ ان کی تعلیمات سینہ بسینہ چلی آنے والی یہودی روایات کے خلاف تھیں اور یہودی ان روایات سے دستبردار ہونے پر تیار نہ تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اُٹھائے جانے کے ڈیڑھ سو سال بعد یہودی علماء نے تورات کی ان من پسند خفیہ تشریحات کو پہلی بار قلم بند کیا اور ان کی تشریح کا کام شروع کیا۔ اس مجموعے کو ''مشنا'' کا نام دیا گیا اور یہودی علماء نے متفقہ طور پر فیصلہ سنا دیا کہ اب تورات کی بجائے ''مشنا'' پر عمل ہوگا اور تورات پر عمل کرنے والے خدا کے غضب کا شکار ہوں گے۔ بعد میں ''مشنا'' پر اضافے کر کے اسے ''تلمود'' کا نام دیا گیا۔ یہودیوں کے ہاں اسی پر عمل کیا جاتا ہے۔

نفس کی خواہشات کی خاطر شریعت میں تحریف اور تاویل کے اس سلسلے نے یہود کو آسمانی ہدایت سے اس قدر دور کر دیا تھا کہ اب ان کے اندرونی حالات سے واقف کوئی بھی شخص ان سے کسی خیر کی اُمید نہیں کر سکتا تھا۔ یہودیوں کے علماء کی دین فروشی، حق فراموشی اور اغراض پسندی ضرب المثل بن چکی تھی۔ ان کے سرمایہ داروں کی حرص وہوس اور زر پرستی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ ان میں ایسے لوگ بھی پیشوا اور رہنما تھے جو شیطانی طاقتوں سے کام لیتے تھے، جادو ٹونا کرتے تھے، ان کالے علوم کو وہ اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کرتے تھے اور ذکرِ الٰہی کی بجائے جادوئی وشیطانی ریاضتوں کو اپنے مَن کی تسکین کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے۔ یہود کے بڑے بڑے احبار اور قائد ان کی ہدایات بے چوں وچرا مان لیا کرتے تھے۔

ان سب باتوں سے بڑھ کر یہود کی بدکرداری یہ تھی کہ صدیوں کی ذلت وخواری اور احساس محرومی نے ان میں ساری دنیا کے خلاف نفرت، حسد اور انتقام کے جذبات بھر دیے تھے اور اب وہ تمام انسانیت کو اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔ کئی علاقوں میں انہوں نے اس قسم کے تجربات شروع کیے تھے اور ان کوششوں میں مصروف رہ کر وہ حد درجہ چالاک، مکار اور دغا باز بن چکے تھے۔ چنانچہ ان میں خفیہ تنظیمیں بنانے، جاسوسیاں کرنے، سازشیں کر کے حکومتوں کے تختے الٹنے، ایک ملک کو دوسرے کے خلاف بھڑکانے اور ایک قوم کو دوسری کے خلاف استعمال کر کے اپنے مفادات حاصل کرنے کی روش پختہ ہو چکی تھی۔ اس تنگ نظری، خود پسندی اور بے رحمی کے ہوتے ہوئے اُن سے یہ

توقع عبث تھی کہ وہ دنیا میں کسی مثبت تبدیلی کا ذریعہ بن پائیں گے۔ ①

اہل عرب کی دینی حالت:

چھ سو برس قبل از مسیح تک اہل عرب بت پرستی کی لعنت سے پاک اور دین ابراہیمی کے پیروکار تھے مگر رفتہ رفتہ جزیرۃ العرب سے متصل بت پرست اقوام کے اثرات ان میں سرایت کرنے لگے۔ وحی کی رہنمائی سے محرومی اور عمرو بن لُحی جیسے کج فکر لوگوں کی سربراہی نے نہ صرف قریش بلکہ جزیرۃ العرب کے تمام قبائل کو دین ابراہیمی سے بہت دور لا پھینکا اور دیکھتے ہی دیکھتے بتوں کی عبادت پورے عرب میں عام ہوگئی۔ پتھر کے مجسموں کو حاجت روا اور مشکل کشا مانا جانے لگا۔ لوگوں کا یہ عقیدہ بن گیا کہ ان مجسموں میں ایسی ارواح ہیں جو نفع وضرر کی مالک ہیں اور امور کائنات کے مختلف شعبوں پر قدرت رکھتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ یہ معبود اللہ کے قرب کا وسیلہ اور اس کی بارگاہ میں سفارشی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کے اختیارات عطا کر دیے ہیں۔ مشرکین کا خیال تھا کہ خالق کائنات تو اللہ ہے مگر اب وہ فارغ ہے اور اس کی نیابت میں دوسرے معبود تمام امور کو چلا رہے ہیں جن میں سے کوئی فتح وشکست کا مالک ہے، کوئی زندگی اور موت کا۔ کوئی روزی دیتا ہے اور کوئی صحت۔ کوئی بیماریاں دور کرتا ہے اور کوئی قحط سالی۔

حرم کے تبرکات کے ساتھ حد سے زیادہ عقیدت بھی بدعقیدگی کا سبب بنی۔ بعض عرب قبائل مکہ سے واپسی پر یہاں کے پتھر اُٹھا کر لے جاتے، کعبہ کی طرح ان کا طواف کرتے، بعد میں ان پتھروں کی باقاعدہ پوجا ہونے لگتی۔ ②

عرب میں ہر قسم کے بت تھے۔ بعض بڑے بھاری بھرکم اور اپنی جگہ گڑے ہوئے تھے۔ مکہ کے اکثر مشہور بت ایسے ہی تھے، جبکہ ایسے ہلکے پھلکے مجسمے بھی تھے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیے جاسکتے تھے۔ عرب ان بتوں کو ''اَصنام'' کہتے تھے جو ''صنم'' کی جمع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی اصل صلم (Solm) ہے جو آرامی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں آکر یہ لفظ ''صنم'' بن گیا۔ بتوں کے پجاریوں کو ''کاہن'' کہا جاتا تھا اور انہیں اللہ کے تقرب اور اس سے تعلق کا واسطہ مانا جاتا تھا۔ قریش سمیت تمام عرب قبائل کاہنوں کے پیروکار تھے۔ وہ کاہنوں، پجاریوں اور بت خانے کے خصوصی خادموں کو ہمراہ لیے بغیر کبھی جنگ کے لیے نہیں نکلتے تھے۔ یہی کاہن لشکر کے لیے نیک فالی یا بدفالی کے اشارے اخذ کرتے تھے۔ اہم فیصلوں میں ان کی رائے معتبر مانی جاتی تھی۔ ان کاہنوں میں قبیلہ کلب کا زُہیر بن حباب اور قبیلہ بنوعبس کا زُہیر بن جَذِیمہ مشہور ہیں۔ ③

''مَناۃ'' وہ پہلا بت تھا جس کی عرب میں پرستش کی گئی، اسے قسمت کا مالک مانا جاتا تھا۔ اسے بنوخزاعہ کا رئیس عمرو بن لُحَی شام سے لایا تھا۔ قریش کے علاوہ بنوہذیل اور یثرب میں آباد اَوس اور خزرج بھی اس کے خاص پجاری تھے۔ ④

---

① الیہود فی العالم القدیم لدکتور مصطفی کمال عبدالعلیم، ص ۱۱ تا ۲۰؛ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، ص ۳۸ تا ۴۰

② سیرۃ ابن ہشام: ۱/۷۷

③ التاریخ الاسلامی العام، ص ۱۲۸، ۱۲۹ ④ التاریخ الاسلامی العام، ص ۱۴۳

ہُبل قریش کا سب سے بڑا بت تھا جسے عَمرو بن لُحَی نے کعبہ میں نصب کیا تھا۔ یہ سرخ عقیق سے تراشا ہوا انسانی شکل کا مجسمہ تھا۔ اس پر سو اونٹوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ کعبہ کے طواف کے بعد لوگ اس کے پاس سر منڈواتے تھے۔ اس کے چڑھاووں کا مستقل خزانہ تھا، جس کے لیے ایک نگراں مقرر تھا۔ ①

ایک اور مشہور بت "لات" تھا جو طائف کے بت خانے میں نصب تھا۔ یہ ایک سفید چوکور مجسمہ تھا۔ عرب اس کے نام کی قسمیں کھایا کرتے۔ ② اسے بنوثقیف (جو طائف اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھے) کے ایک سخی انسان کے نام پر بنایا گیا تھا جو حاجیوں کو ستو گھی میں تر کر کے دیتا تھا۔ اس کی موت کے بعد عَمرو بن لُحَی کے بہکاوے میں آکر طائف کے لوگوں نے اس کا بت بنا ڈالا۔ ③

اہل عرب درختوں کی عبادت بھی کرتے تھے، جیسے عُزّیٰ نامی مشہور مؤنث بت بنوغطفان کے ایک ببول کے درخت کے نام پر بنایا گیا تھا، جسے دیوی کی حیثیت دی گئی تھی۔ قریش کے لوگ "عبد العُزّیٰ" نام بڑے فخر سے رکھا کرتے تھے۔ عُزّیٰ کی الگ قربان گاہ تھی جہاں جانور قربان کیے جاتے تھے۔ ④

"ذاتِ اَنواط" بھی قریش کا مشہور مقدس درخت تھا جس کی عبادت کے لیے ایک دن کا اعتکاف کیا جاتا تھا۔ ⑤

جنگ کے دوران ہُبل، لات اور عُزّیٰ کے نعرے لگا کر قوم کا حوصلہ بڑھایا جاتا تھا۔ بت پرستی کی ریل پیل کا یہ عالم تھا کہ تین سو ساٹھ بت کعبہ کے صحن میں تھے، جن میں اساف اور نائلہ نامی بت بڑے مشہور تھے، لوگ طواف کا آغاز اساف سے کرتے اور اختتام نائلہ پر کرتے۔ ان میں سے پہلا بت مذکر تھا اور دوسرا مؤنث۔ ان کے علاوہ دُومۃ الجندل میں "وَدّ" کی پرستش ہوتی تھی جس کی نگرانی قریش کے پاس تھی۔ "سُواع" بنوہذیل کا بت تھا۔ اہل جُرش کے ہاں "یَغُوث" نامی بت کی پوجا ہوتی تھی جو شیر کی شکل کا تھا۔ اہل خیوان نے "یَعُوق" کی عبادت اختیار کر رکھی تھی جو گھوڑے کی صورت جیسا تھا، یمن کا قبیلہ حِمیَر "نَسر" کا پجاری تھا جو گدھ کا مجسمہ تھا، یہ پانچوں نام (وَدّ، سُواع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسر) اصل میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بتوں کے تھے جو ہزاروں سال قبل بابل (عراق) میں غرق ہو چکی تھی مگر ایک زمانے کے بعد بت پرستوں نے انہی ناموں کو نئی شکلوں میں زندہ کر لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب بعض جانوروں کے تقدس کے اس حد تک قائل تھے کہ اُن کے مجسمے بنا کر انہیں پوجتے تھے۔ ⑥

مؤرخ ابن کلبی کا کہنا ہے: "مکہ کے ہر گھر میں ایک بت تھا جس کی لوگ عبادت کرتے تھے، جب کوئی سفر پر جاتا تو بت کو چھو کر نکلتا، واپس آتا تو سب سے پہلے بت کو چھوتا۔" ⑦

---

① اخبار مکۃ لابی الولید الازرقی: ۱/۱۱۷ تا ۱۱۹ ط دار الاندلس
② الاصنام، ابن کلبی، ص ۵، قلمی نسخہ
③ التاریخ الاسلامی العام، ص ۱۵۴، ۱۵۵
④ اخبار مکۃ، الازرقی: ۱/۱۲۶ ⑤ اخبار مکۃ، الازرقی: ۱/۱۲، ۱/۱۲۹
⑥ التاریخ الاسلامی العام، ص ۱۴۳، ۱۴۴ ⑦ الاصنام، ابن کلبی، ص ۳۳

کچھ لوگ بت پرستی کی جگہ ستاروں کو مقدس، نظامِ دنیا کا مختار اور دعا کے لیے قبلہ وکعبہ سمجھتے تھے۔ یہ صابئین کہلاتے تھے۔ مکہ والوں کی زبان میں ہر ایسے شخص کو بھی ''صابی'' کہا جاتا تھا جو بت پرستی کا منکر ہو۔ ①

عربوں کی اخلاقی حالت:

جہاں تک عربوں کی اخلاقی حالت کا تعلق ہے وہ بعض فطری اوصاف برقرار رہنے کے باوجود بہت بگڑ چکی تھی۔ بات بات پر لڑنا جھگڑنا اور تلواریں سونت کر ایک دوسرے پر پل پڑنا، ان کی عادت تھی۔ ذرا سے اختلاف پر بڑی بڑی جنگیں شروع ہو جاتیں، جو نسل در نسل چلتی رہتیں۔

شراب نوشی اتنی عام تھی کہ ہر گھر مے کدہ معلوم ہوتا تھا، جوے کی لت ایسی پڑی تھی کہ لوگ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے اور اسے فخر کا باعث قرار دیتے۔ چوری، ڈاکا عام تھا۔ بعض قبیلوں کا مستقل پیشہ لوٹ مار تھا۔ شرم وحیا اس طرح رخصت ہوئی تھی کہ لوگ سرِعام عورتوں سے آنکھیں لڑاتے، محفلوں میں اپنی محبوباؤں کا ذکر کرتے اور اُن کی یاد میں اشعار سناتے پھرتے۔ ان کے ہاں نکاح کی اہمیت ضرور تھی مگر زنا بھی کوئی بری شے نہ تھی۔ پیشہ ور عصمت فروش عورتیں آبادیوں میں رہتیں اور ان کے گھر مخصوص جھنڈوں کی وجہ سے دور سے پہچانے جاتے تھے۔

اس معاشرے میں عورت کی کوئی قدر وقیمت نہیں تھی۔ ایک ایک آدمی بھیڑ بکریوں کی طرح جتنی عورتیں چاہتا اپنے پاس رکھتا، عورتیں میراث میں تقسیم ہو کر ایک سے دوسرے کی ملکیت میں چلی جاتی تھیں۔ لوگ اپنے ہاں لڑکا پیدا ہونے پر فخر کرتے اور لڑکیوں کی پیدائش پر منہ چھپاتے پھرتے۔ بہت سے لوگ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تاکہ قبیلے میں ان کی رسوائی نہ ہو۔ اس حالت کی تصویر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یوں کھینچی تھی:

''ہم ایک جاہلیت والی قوم تھے، بتوں کی عبادت کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، ہر قسم کی بے حیائیوں اور گناہوں میں آلودہ تھے، ہم میں سے جو طاقتور ہوتا تھا وہ کمزور کو چیر پھاڑ دیتا تھا۔'' ②

عربوں کی شاعری:

اس دور میں عربوں کی کوئی چیز معیار کے لحاظ سے قابلِ رشک تھی، تو وہ ان کی شاعری تھی جس میں زبان وبیان کی پاکیزگی، خیالات کی بلندی اور جذبات کی فراوانی جیسی خوبیاں بہت نمایاں تھیں۔ مرد تو کیا عورتیں بھی شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں۔ شاعری کی باقاعدہ محفلیں لگتی تھیں اور مقابلے ہوتے تھے۔ بعثتِ نبویہ سے قبل امرؤ القیس، نابغہ ذبیانی، طرفہ بن عبد اور عنترہ بن شداد وغیرہ کے کلام کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان میں سے سات بلند پایہ شعراء کے کلام کو بطورِ اعزاز کعبہ میں آویزاں کیا گیا تھا جنہیں ''سبع مُعلّقات'' کہا جاتا تھا۔ ③

---

① تاریخ الفکر الدینی الجاهلی، ابراهیم الفیومی، ص ۲۷۹ ② سیرة ابن هشام: ۱/۳۳۶

③ سات شعراء یہ تھے: امرؤ القیس، طرفة بن العبد، زهیر بن ابی سلمی، لَبید بن ربیعه، عنترة بن الشداد، الحارث بن حلزة، عمرو بن کلثوم۔

جزیرۃ العرب پر عنایتِ آسمانی کیوں؟

ساری دنیا پر چھائی ظلمت و گمراہی کی اس تاریک شب کا اگر کوئی سرا نظر آتا تھا تو وہ اس آخری نبی کا ظہور تھا، جس کی پیش گوئیاں گزشتہ رسولوں اور ان کے سچے پیروکاروں کی زبانی دنیا کی مختلف قوموں اور خطوں میں پھیل چکی تھیں۔ تاہم کسی کو یہ توقع نہیں ہوسکتی تھی کہ اس آخری نجات دہندہ کا ظہور عرب کے بے آب و گیاہ صحرا سے ہوگا۔ خود عربوں کو بھی اپنے اندر ایسے کسی انقلاب کی اُمید نہیں تھی مگر ان کے تمام تر عیوب اور خرابیوں کے باوجود حق تعالیٰ نے آخری عالمگیر نبی کی بعثت اور اُن کی مدد و نصرت کے لیے اسی قوم کا انتخاب کیا۔ اس میں بے شمار حکمتیں تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ گمراہی اور تاریکی کے اس دور میں بھی عربوں میں اعلیٰ اوصاف اور شریفانہ خصوصیات کے بہت سے جوہر باقی تھے۔ ہندوؤں اور یہودیوں کے برعکس وہ دھوکے اور فریب کے عادی نہیں تھے۔ اپنی جاہلیت کے باوجود وہ سچے اور کھرے تھے، اس کے ساتھ ساتھ زیرک اور ہوشیار بھی تھے، دھوکا کھاتے تھے نہ دینا پسند کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے شہروں اور قدیم تہذیبوں کے اُن قدرتی اثرات سے پاک تھے جو انسان کو بزدل، آرام پسند اور سست بنادیتے ہیں۔ ان کی رگوں میں گرم خون دوڑتا تھا اور طبیعتیں کسی بھی خطرے کا سامنا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔

یہودی صدیوں کی غلامی کی وجہ سے پست طبیعت ہو چکے تھے اور چوروں کی طرح خفیہ سازشوں میں مصروف تھے۔ اُدھر رومی اور فارسی طویل مدت سے بادشاہت کرتے کرتے انا پسند اور مغرور ہو گئے تھے۔ عرب نہ تو کسی کے غلام رہے تھے نہ حاکم۔ وہ اپنی مختصر سی دنیا کے آزاد پنچھی تھے۔ نہ تو کسی پر حملہ کرتے تھے نہ کسی کے دام میں آتے ہے۔

دنیا کی تمام قدیم تہذیبوں کے باسی اپنی گمراہی کو علوم و فنون کی ملمع سازیوں میں اس طرح چھپا چکے تھے کہ کسی بھی معاملے میں اپنی جہالت اور کم علمی کا یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس کے برعکس عرب سادہ طبیعت اور حق شناس تھے، ان کے دل و دماغ کسی گمراہ کن فلسفے کی پیچیدگیوں میں نہیں الجھے تھے۔ انہیں بس یہ احساس دلانے کی ضرورت تھی کہ وہ صحیح راستے پر نہیں، پھر ان کی سمت بدلنے میں کوئی دیر نہ لگ سکتی تھی۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی عالمگیر دین کے آغاز اور عالمگیر امت کے مرکز کے انتخاب میں سرزمین عرب کو فوقیت حاصل تھی، اس لیے کہ یہ آباد زمین کے عین درمیان خطِ استوا پر تینوں بڑے براعظموں: ایشیا، یورپ اور افریقہ کے سنگم کے قریب واقع ہے۔ اکثر مشرقی اور مغربی ممالک اس سے یکساں فاصلے پر ہیں۔ اس لیے یہاں سے جاری ہونے والے کسی پیغام، کسی دعوت یا کسی تحریک کے لیے پوری دنیا پر جلد اثر انداز ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ اگر عرب کی جگہ ہندوستان یا یونان جیسے قدیم تہذیبی مراکز کو ایک نئے دین کا مرکز بنایا جاتا تو یہ اثرات دنیا کے مشرق یا مغرب تک ہی محدود رہ جاتے۔

ایک نئے دین کے لیے عرب کا انتخاب دفاعی لحاظ سے بھی بڑی حکمت پر مبنی تھا، کیوں کہ یہ خطہ تینوں اطراف سے سمندر کی لہروں میں اور شمال کی جانب صحرا کی وسعتوں سے گھرا ہوا تھا، اسی لیے اس علاقے میں فوج کشی کرنا

نہایت دشوار شمار ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہزار ہا برس گزرنے کے باوجود عرب کبھی کسی کے غلام نہیں رہے تھے۔ یونان کے سکندرِ اعظم، بابل کے بُختِ نصّر اور ایران کے کورش جیسے فاتحین اس کے قریب سے گزر گئے مگر اس کی ریگستانی بھول بھلیوں میں داخل ہونے سے گریزاں رہے۔

آخری رسول کے لیے سادہ منش غریب اور جفاکش عربوں کے چناؤ میں یہ حکمت بھی کارفرما تھی کہ اس طرح خدا تعالیٰ دنیا کو اپنی قدرت، طاقت اور غلبے کا نظارہ کرانا چاہتا تھا۔ اگر آخری نبی روم یا فارس جیسی کسی بڑی مملکت سے تعلق رکھتے تو اس دین کی دعوت پھیلنے پر دنیا کو یہ کہنے کا موقع مل سکتا تھا کہ ان بڑی قوموں کی دولت وثروت اور قوت کے بل بوتے پر یہ دین پھیل گیا ہے ورنہ بذاتِ خود اس دین میں کوئی انوکھی بات نہیں۔

خالقِ دوجہاں نے آخری پیغمبر کو ایک کمزور اور مفلس معاشرے میں پیدا فرما کر اس شبہے کا امکان ہی ختم کر دیا اور عملی طور پر یہ حقیقت ذہن نشین کرادی کہ وہ اپنے فیصلے کو نافذ کرنے، اپنے دین کو پھیلانے اور اپنے رسولِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی دونوں جہاں میں بلند کرنے کے لیے مال و دولت اور بڑے بڑے لشکروں اور حکومتوں کا محتاج نہیں۔ وہ چاہے تو کمزوروں سے بھی کام لے سکتا ہے اور انہیں زمین کی خلافت جب چاہے عطا کر سکتا ہے۔

اس طرح آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر یونان، اسکندریہ یا قُسطَنطِینِیّہ سے کسی قدیم علمی مرکز میں نمودار ہوتے تو لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اس نبی نے قدیم علوم اور فلسفوں سے استفادہ کر کے ایک دین ایجاد کر لیا ہے اور انہی فلسفوں کو نئے رنگ میں پیش کر دیا ہے۔ اللہ نے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عربوں کے اَن پڑھ معاشرے کا انتخاب کر کے یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ دین کسی سابقہ علم وفن یا فلسفے کا چربہ نہیں بلکہ یہ ایک سچے نبی پر نازل ہونے والا خالص آسمانی دین ہے جسے خود اللہ نے اپنی مخلوق کے لیے پسند کیا ہے۔

❁❁❁

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ اسلام سے قبل ہندوستان کی دینی ومعاشرتی حالت کیسی تھی؟
❷ بدھ مت کا آغاز کیسے ہوا؟ اس کے بانی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
❸ قدیم شاہانِ ایران کی عیش وعشرت اور استحصال کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
❹ یورپ اور یونان کے دانشور عقل وذہانت کے باوجود گمراہی کا شکار کیوں تھے؟
❺ یہود اپنے علم وفضل کے باوجود انسانیت کی رہنمائی سے کیوں قاصر تھے؟
❻ عربوں میں بت پرستی کا آغاز کیسے ہوا؟ وہاں کن مشہور بُتوں کی پوجا کی جاتی تھی؟
❼ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے لیے اللہ نے جزیرۃ العرب جیسے پس ماندہ خطے کا انتخاب کیوں کیا؟
❽ ابرہہ کون تھا؟ اور اس نے مکہ پر حملہ کیوں کیا؟ اس کا انجام کیا ہوا؟

عملی کام:

❁ دُنیا کا نقشہ دیکھ کر سمجھیے کہ اسلام سے قبل قیصر وکسریٰ کی سلطنتیں کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔
❁ زمانۂ جاہلیت کی عربی شاعری میں سے چند اشعار منتخب کریں اور اپنی بیاض میں درج کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ قصص القرآن از مولانا حفظ الرحمان سیوہاری رحمہ اللہ
❁ سیرت انبیائے کرام، از مولانا محمد عبدالرحمن، ناظم مجلسِ علمیہ حیدر آباد دکن، مطبوعہ ادارہ اسلامیات، لاہور
❁ اطلس تاریخ الاسلام، از دکتور حسین مؤنس
❁ اطلس تاریخ العربي الاسلام، از دکتور شوقي ابو خلیل

تیسرا باب

سیرتِ ختم الرسل ﷺ

اغراض ومقاصد:

یہ باب پڑھ کر ان شاء اللہ آپ اس قابل ہوسکیں گے کہ:

١ حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل کی پاکیزہ زندگی سے آگاہ ہوسکیں۔

٢ حضور اکرم ﷺ کی بعثت بعثت کے بعد کی مکی زندگی سے روشناس ہوسکیں۔

٣ حضور اکرم ﷺ کی بعثت مدنی زندگی سے واقف ہوسکیں۔

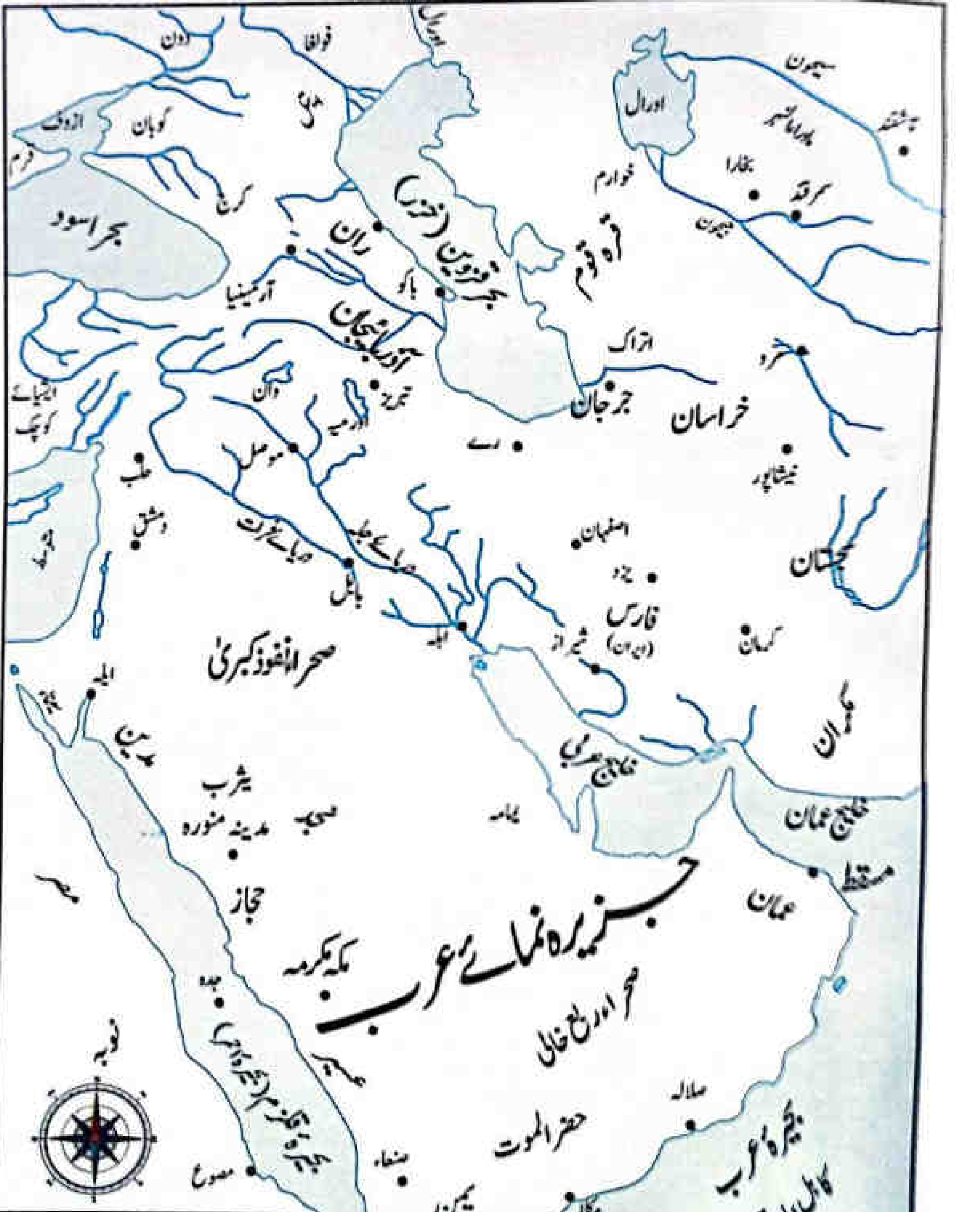
٤ سیرت کا ایک اجمالی خاکہ ذہن نشین کرسکیں۔

٥ دعوتِ اسلام، اصلاحِ معاشرہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سیرتِ مطہرہ سے استفادہ کرسکیں۔

٦ اسلام کے لیے صحابہ کرام کی قربانیوں سے آشنا ہوسکیں۔

٧ اہل بیت نبوی (امہات المومنین وآل اطہار) کے مقام ومرتبے سے آشنا ہوسکیں۔

نقشہ نمبر 1


بحر اسود
بحر قزوین (خزر)
خراسان
جرجان
آذربائیجان
آرمینیا
موصل
حلب
دمشق
بابل
فارس
صحرائے نفوذ کبریٰ
مدین
یثرب
مدینہ منورہ
حجاز
مکہ مکرمہ
جزیرہ نمائے عرب
صحرائے ربع خالی
حضر الموت
یمن
عدن
خلیج عدن
خلیج عمان
مسقط
عمان
مکران
صلالہ
جزیرۃ العرب
اور
اس کا محل وقوع

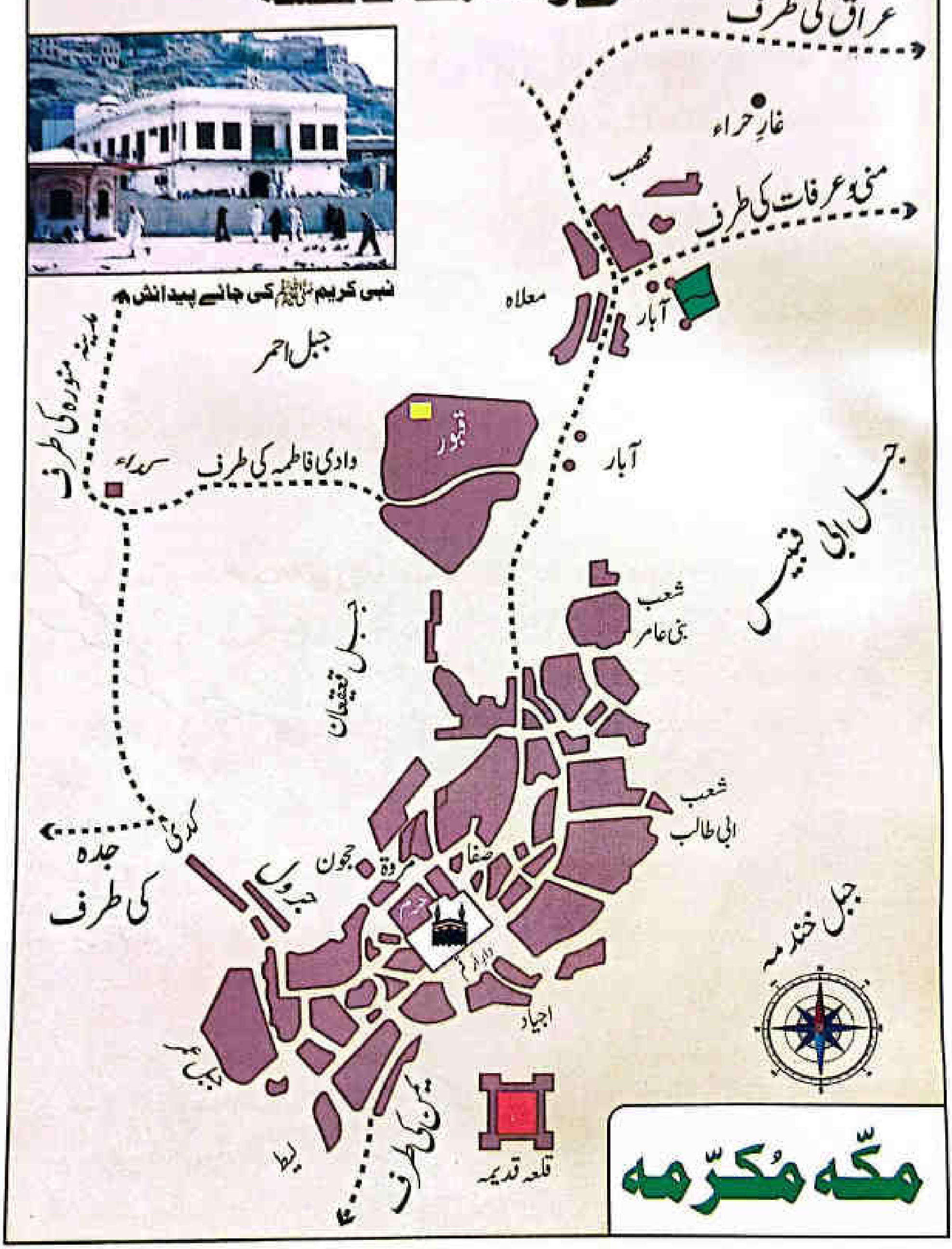


طاق کسریٰ (ساسانیوں کے شاہی محل) کے کھنڈرات

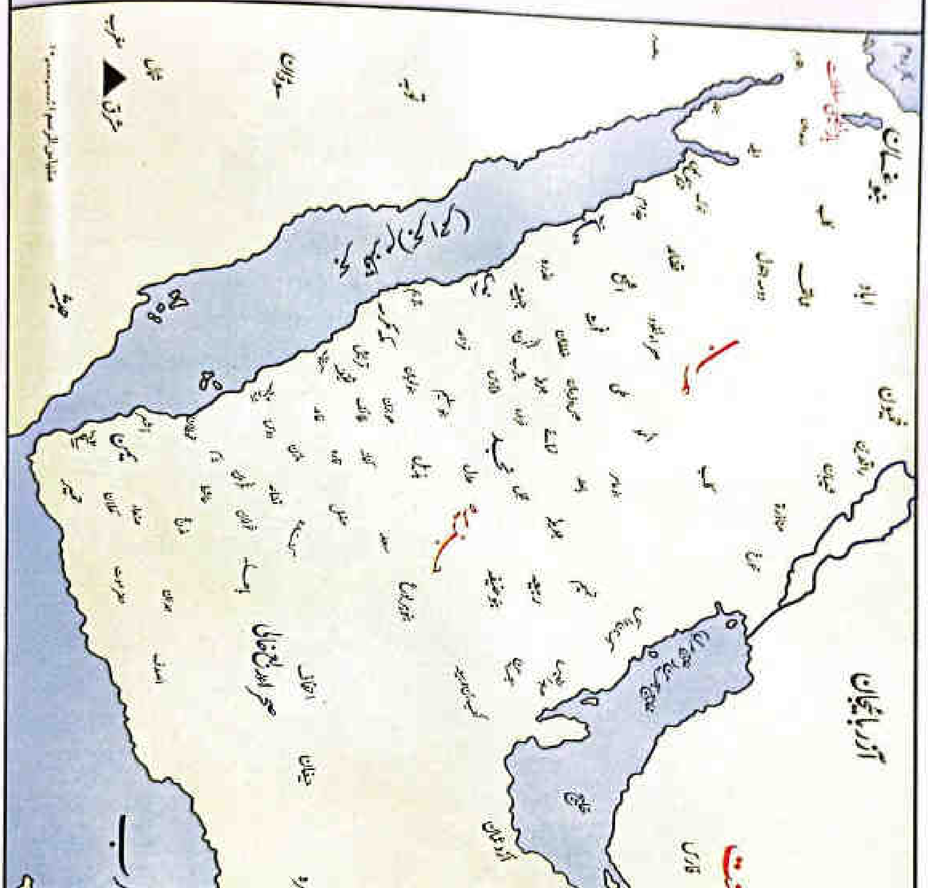
بعثِ نبویہ کے وقت
جزیرۃ العرب کے آس پاس بڑی طاقتیں



بعثِ نبویہ
کے وقت مکّہ کا نقشہ



جزیرۃ العرب
کے مشہور قبائل اوران کے مساکن



(یونٹ:1.4)

سیرتِ ختم الرسل ﷺ (مکی دور)

حضور اکرم ﷺ کا خاندان تمام بنی نوع انسان میں سب سے افضل اور اشرف تھا۔

خود رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَى كِنَانَةَ مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيلَ، وَاصْطَفَى قُرَيْشًا مِنْ كِنَانَةَ، وَاصْطَفَى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ، وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ

(بے شک اللہ نے اولادِ اسماعیل سے کنانہ کو اور کنانہ سے قریش کو اور قریش سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم سے مجھ کو منتخب فرمایا۔)①

حضور اکرم ﷺ کا شجرۂ مبارکہ یہ ہے:

"محمد بن عبداللہ بن عبدالمُطَّلِب بن ہاشم بن عبد مناف بن قُصَیّ بن کِلاب بن مُرّہ بن کعب بن لُؤَیّ بن غالب بن فِہر بن مالک بن نَضر بن کِنانہ بن خُزَیمہ بن مُدرِکہ بن الیاس بن مُضَر بن نِزار بن مُعَدّ بن عدنان۔"

عدنان کے بعد کئی واسطوں سے آپ ﷺ کا سلسلہ نسب حضرت اسماعیل علیہ السلام سے جا ملتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے اور برگزیدہ نبی تھے۔②

ولادت باسعادت

حضور اکرم ﷺ کی ولادت عام الفیل کے سال پیر ۸ یا ۹ ربیع الاوّل کو قریش کے سردار عبدالمطلب بن ہاشم کے خاندان میں ہوئی۔ آپ کے والد حضرت عبداللہ تھے اور والدہ حضرت آمنہ بنت وہب۔ والد گرامی آپ ﷺ کی ولادت سے کچھ دن قبل مدینہ منورہ میں وفات پا چکے تھے اور وہیں ان کی تدفین ہوئی تھی۔③

رضاعت:

رسول اللہ ﷺ کو شروع شروع میں چند دن آپ کے چچا ابولہب کی باندی ثُوَیبہ نے دودھ پلایا۔ اس کے بعد آپ کو قبیلہ بنو سعد کی دائی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا جنہوں نے مدتِ رضاعت کی تکمیل تک آپ کو دودھ پلایا۔

---

① صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی ﷺ

② سیرۃ ابن ہشام: ۱/۳،۲،۱ ③ سیرۃ ابن ہشام: ۱/۳،۲،۱

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشوونما عام بچوں سے مختلف ہوئی، جب عمر مبارک دو برس ہوئی تو حلیمہ سعدیہ نے آپ کا دودھ چھڑادیا۔ آپ اپنے رضاعی بہن بھائیوں کے ساتھ بکریاں چرانے جنگل میں جانے لگے۔ ایک دن اس دوران اچانک دو فرشتے نازل ہوئے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک چیرا اور آپ کے دل سے سیاہ لوتھڑے جیسی کوئی چیز نکال کر پھینک دی اور دل کو ایمان وحکمت سے بھر کر واپس رکھ دیا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر سینہ چیرے جانے کا کوئی نشان تک نہ رہا۔ ①

کفالت:

دائی حلیمہ کے ہاں سے مکہ واپس آنے کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک چھ سال ہوئی تو آپ کی والدہ محترمہ آپ کو لے کر یثرب روانہ ہوئیں تاکہ اپنے شوہر کی قبر پر جائیں اور بچے کو ان کے ننھیال والوں سے ملائیں۔ واپسی کے سفر میں ''اَبواء'' کے مقام پر حضرت آمنہ کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد حضرت عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری طرح اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ سال کے تھے کہ حضرت عبدالمطلب بھی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے سگے چچا ابوطالب نے اپنی کفالت میں لے لیا۔ ②

پاکیزہ بچپن:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم شروع سے باوقار، حیادار اور شریف ثابت ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرب کی معاشرتی برائیوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے۔ آپ شرکیہ رسومات، شراب نوشی اور گانے بجانے سے کوسوں دور رہے۔ سچائی، امانت داری، ہمدردی، تواضع، مروت اور رحم دلی کی صفات آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ ③

حربِ فجار:

عمر چودہ، پندرہ سال کی تھی جب قریش اور قبیلہ بنوقیس کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑکے اور ''حربِ فجارِ ثالث'' نامی لڑائی شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں قریش حق پر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جنگ میں اپنے چچاؤں کے مددگار کے طور پر شریک تھے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کسی جنگ میں شرکت کا پہلا تجربہ تھا۔ ④

حِلف الفُضول:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بیس برس تھی جب مکہ کے کئی شرفاء کی طرف سے مشہور زمانہ ''حِلف الفُضول'' کا معاہدہ ہوا جس کی اصل وجہ تو یہ تھی کہ قریش بلاوجہ کی خونریزیوں سے اُکتا گئے تھے جبکہ فوری سبب یہ ہوا کہ ''بنوزُبید'' کا ایک تاجر مکہ میں سامانِ تجارت لے کر آیا۔ یہاں ایک قریشی سردار عاص بن وائل نے اس کا تمام سامان خرید لیا مگر اسے قیمت

---

① سیرۃ ابن ہشام: ۱/۱۶۲ تا ۱۶۳

② سیرۃ ابن ہشام: ۱/۱۶۷ تا ۱۷۹

③ السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۱۷۸ ④ سیرۃ ابن ہشام: ۱/۱۷۳؛ السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۱۸۵ تا ۱۸۷، ط العلمیۃ

نہیں دی۔ زُبیدی تاجر نے تنگ آکر مکہ والوں سے فریاد کی تو کئی رئیسوں کو رحم آ گیا، نبی کریم ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطّلب کی تجویز پر یہ لوگ عبداللہ بن جدعان نامی سردار کے مکان پر جمع ہو گئے اور معاہدہ کیا کہ وہ سب ظالم سے مقابلے اور مظلوم کی مدد کے لیے یک جا رہیں گے۔ معاہدے میں شریک تین نمایاں افراد کے نام: فَضل، فَضالہ اور مُفَضَّل تھے، لہٰذا اسے "حِلف الفُضول" کہا گیا۔ حضور ﷺ بھی اس معاہدے میں شریک تھے اور اس منصفانہ قول و اقرار پر بہت خوش تھے۔ حضور ﷺ بعد میں فرمایا کرتے تھے: "اس معاہدے کے بدلے مجھے سرخ اونٹ بھی دیے جاتے تو میں قبول نہ کرتا۔ آج بھی کوئی ایسے معاہدے کی دعوت دے تو میں تیار ہوں۔" ①

کسبِ معاش:

جوان ہوئے تو روزگار تلاش کرنے کی فکر کی۔ بنو ہاشم تاجر پیشہ تھے مگر نبی اکرم ﷺ کے پاس سرمایہ نہیں تھا، اس لیے آپ نے اجرت کے بدلے لوگوں کی بکریاں چرانے کا کام شروع کیا۔ بنو سعد میں بچپن گزارنے کی وجہ سے آپ ﷺ کو پہلے سے اس کام کا تجربہ تھا۔ ② بعد میں آپ نے تجارت کا تجربہ بھی حاصل کیا، ذاتی سرمایہ کی کمی کی وجہ سے آپ دوسروں کا سرمایہ تجارت میں لگا کر منافع میں شریک ہونے لگے۔ ③

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح:

آنحضرت ﷺ کی عمر مبارک پچیس سال کی تھی جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مال و دولت کے لحاظ سے غنی کر دینے کا انتظام فرمایا۔ قریش کی ایک مالدار اور شریف بیوہ خدیجہ بنت خویلد قابل اعتماد افراد کو سرمایہ دے کر تجارت میں لگواتیں اور حاصل ہونے والے نفع سے انہیں معقول معاوضہ دیتیں۔ انہیں آپ ﷺ کی شرافت، دیانت اور دوسری خوبیوں کا علم ہوا تو بڑے اصرار سے آپ کو اپنا سرمایہ دے کر تجارت کے لیے شام بھیج دیا۔ آپ ﷺ کی دیانت داری اور خوش اسلوبی کی وجہ سے اس تجارت میں بے حد نفع ہوا۔ خدیجہ بنت خویلد آپ ﷺ کے کردار سے اتنی متاثر ہوئیں کہ انہوں نے آپ کو نکاح کا پیغام بھیج دیا، اس سے پہلے وہ بڑے بڑے شریف اور رئیس لوگوں کی طرف سے رشتے کے پیغام مسترد کر چکی تھیں۔ آپ ﷺ نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ آپ ﷺ کے چچا ابو طالب نے نکاح پڑھایا۔ اس وقت آپ کی عمر پچیس برس کی تھی، جبکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا چالیس سال کی تھیں۔ ④

تعمیر کعبہ اور حجرِ اسود کی تنصیب:

نبی اکرم ﷺ کی عمر پینتیس برس کی تھی جب قریش نے کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تعمیر شروع ہونے کے بعد جب دیواروں کی چنائی حجرِ اسود کی بلندی تک پہنچی اور یہ مقدس پتھر نصب کرنے کا وقت آیا تو کام میں شریک تمام

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۳/۵۵ تا ۴۵۹

② صحیح البخاری، ح ۲۲۶۲، کتاب الاجارۃ، باب رعی الغنم علی قراریط

③ سبل الہدی والرشاد: ۲/۱۵۸ ④ سیرت ابن ہشام: ا ص ۱۸۷ تا ۱۹۲

قبیلوں میں سخت جھگڑا ہونے لگا کیوں کہ ہر قبیلہ اسے نصب کرنے کا اعزاز خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بنوعدی اور بنی عبدالدار کے غیظ وغضب کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے عرب کے جنگی معاہدوں کے دستور کے مطابق خون سے بھرے بڑے برتن میں اپنے اپنے ہاتھ ڈبوئے اور قسمیں کھائیں کہ اگر انہیں حجر اسود نصب کرنے کا موقع نہ دیا گیا تو وہ مل کر دوسروں پر ٹوٹ پڑیں گے اور لڑتے لڑتے مرجائیں گے۔ اِدھر ان کے مخالفین کا غصہ بھی کم نہ تھا۔ قریب تھا کہ جنگ شروع ہوجاتی مگر بعض دور اندیش لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر اس تنازعے کا آخری حل یہ نکالا گیا کہ اب جو آدمی مسجد الحرام میں سب سے پہلے داخل ہوگا وہی اس مسئلے کو سلجھائے گا۔ تب لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو سب سے پہلے مسجد الحرام میں داخل ہوتے دیکھا اور پکار اُٹھے ''محمد الامین آگئے، ہم ان کی بات پر راضی ہیں۔''

آپ ﷺ نے اس قضیے کو یوں طے کیا کہ ایک چادر منگوا کر حجر اسود کو اس کے درمیان رکھا۔ پھر ہر قبیلے کے ایک ایک نمائندے کو چادر کا ایک ایک گوشہ پکڑایا۔ سب لوگ اس طرح حجر اسود کو اپنے مقام تک لے گئے، جہاں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے اسے کعبہ کے کونے میں نصب کردیا۔ اس طرح آپ ﷺ کی بیدار مغزی اور منصفانہ حکمت عملی سے ایک بہت خون ریز جنگ ہوتے ہوئے ٹل گئی۔ ①

پہلی وحی:

عمر کے چالیس ویں سال کے قریب پہنچ کر آپ ﷺ کی سوچ اور فکر گہری ہوتی چلی گئی۔ آپ ﷺ نے آبادی سے دور غارِ حرا کو اپنی گوشہ نشینی کے لیے پسند کرلیا۔

آپ ﷺ کی پیدائش کے اکتالیس ویں سال ۱۷ رمضان المبارک کو یکایک ایک فرشتہ آپ کے سامنے ظاہر ہوا۔ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے جو اللہ کے حکم سے آخری رسالت اور ساری دنیا کی امامت کا فریضہ آپ ﷺ کو سونپنے آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی اپنا تعارف کرایا اور کہا: ''اے محمد! میں جبرائیل ہوں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔''

پھر فرشتے نے آپ کے سامنے سورۃ العلق کی ابتدائی آیات تلاوت کیں:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ○

''پڑھیے اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے سب کچھ بنایا، جس نے انسان کو بنایا خون کے لوتھڑے سے، پڑھیے اور آپ کا پروردگار بڑا مہربان ہے...... جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا...... اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔'' ②

جب فرشتے سے یہ پیغام سن کر آپ ﷺ گھر پہنچے تو بدن مبارک کانپ رہا تھا۔ آپ کو لگتا تھا کہ کہیں اس کام کی فکر

---

① سیرت ابن ھشام: ۱ ص: ۱۹۰ تا ۱۹۹

② سورۃ العلق، آیات: ۱ تا ۵

اور بوجھ سے جان ہی نہ نکل جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے کہا:

"مجھے کمبل اوڑھا دو، مجھے کمبل اوڑھا دو! مجھے اپنی جان جاتی محسوس ہو رہی ہے۔"

• حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو تسلی دی اور کہا:

"ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم! اللہ آپ کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں، امانت دار ہیں، دوسروں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں، سچائی کے راستے میں آنے والی مصیبتوں میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔"①

دعوت کا آغاز:

اس واقعے کے بعد ایک مدت تک فرشتہ دوبارہ وحی لے کر نہیں آیا۔ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم پریشانی اور اضطراب کے عالم میں مکہ کی وادیوں اور پہاڑیوں میں گھومتے رہتے۔ آخرکار یہ آیت نازل ہوئی:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

"اے چادر اوڑھنے والے! اٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔"②

خفیہ دعوت:

اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا تاخیر دعوت کا عظیم فریضہ انجام دینے کا آغاز کر دیا اور ابتداء اپنے گھر اور اپنی اہلیہ سے کی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے سب سے پہلے اس سچے دین کو قبول کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی جو اس وقت دس سال کے تھے، فوراً اسلام لے آئے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی بلا تردد مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ یہ تینوں تو گھر کے افراد تھے۔ باہر ملنے جلنے والوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست سیدنا ابوبکر بن ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے آپ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہا۔ بالغ مردوں میں وہ پہلے مسلمان تھے۔ ان کی دعوت سے عثمان بن عفان، زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہم نے اسلام قبول کیا۔③

خاندان کو دعوتِ اسلام کا حکم:

تین سال بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ اب اسلام کی دعوت اعلانیہ طور پر کی جائے۔ اس مقصد کے لیے پہلے مرحلے میں آپ کو حکم دیا گیا:

"وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ" "اپنے قریبی رشتہ داروں کو (شرک کے انجام سے) ڈرائیے۔"④

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ہاشم کے تمام افراد کو مدعو کیا اور گوشت، دودھ اور روٹی سے اُن کی ضیافت کی، جب سب سیر ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی توحید کی دعوت دی۔ یہ سن کر ابولہب نے اس پیغام کی بڑی شدت سے مخالفت کی۔⑤

① صحیح البخاری، ح:۳، باب کیف کان بدء الوحی؛ سیرۃ ابن اسحاق: ۱/۱۲۱ ② سورۃ المدثر، آیات: ۱ تا ۳
③ سیرۃ ابن ہشام: ۱ ص ۲۳۹ تا ۲۵۲ ④ سورۃ الشعراء، آیت ۲۱۴ ⑤ البدایۃ والنہایۃ: ۳/۹۷ تا ۱۰۱، دار ہجر

قبیلے کو دعوتِ اسلام:

کچھ دنوں بعد وحی نازل ہوئی:

"فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ o"

''پس آپ (لوگوں کو) کھل کر سنا دیں وہ پیغام جو آپ کو پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے اور مشرکین (کی مخالفت) کا ذرا بھی خیال نہ کریں۔''①

تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا کی چوٹی پر چڑھ کر قریش کو جمع کیا اور فرمایا:

''اے بنی عبد المطلب!، اے بنی فہر!، اے بنی کعب! اگر میں تمہیں خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑی ہے تو کیا تم میری بات پر یقین کر لو گے۔'' لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر اتنا یقین تھا کہ سب نے بے ساختہ کہا: ''ہاں ہم یقین کریں گے۔'' تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہیں ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے بالکل سامنے ہے۔'' مگر قریش نے اس دعوت پر کان نہ دھرا بلکہ آپ کی مخالفت شروع کر دی۔②

اب عام مسلمان جن میں زیادہ تر غریب لوگ تھے، اب ان کے طیش اور انتقام کا نشانہ بننے لگے۔ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کو انگاروں پر لٹایا گیا، جس سے اُن کی کمر بالکل جھلس گئی۔ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ اُمَیَّہ بن خلف کے غلام تھے، وہ انہیں تپتے صحرا میں لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتا۔ کہتا کہ محمد کا انکار کرو اور لات وعزّیٰ کی پرستش کرو، ورنہ اسی حالت میں تمہارا دم نکل جائے گا۔ کبھی لوہے کی زرہ پہنا کر تیز دھوپ میں بٹھا دیتا۔ وہ اس تکلیف میں بھی کہتے: ''احد! احد!'' (وہ ایک، ایک ہے) کبھی ان کے گلے میں رسی ڈال کر شریر لڑکوں کو حکم دیتا کہ پورے شہر میں گھسیٹتے پھریں۔③

قریش کے سردار حضرت عمار بن یاسر، ان کی والدہ حضرت سُمَیَّہ اور اُن کے والد حضرت یاسر رضی اللہ عنہم کو پکڑ کر صحرا میں لاتے اور بدترین تشدد کا نشانہ بناتے۔

حضرت یاسر رضی اللہ عنہ جو معمر اور کمزور تھے، اس ظلم کی تاب نہ لا کر ایک دن فوت ہو گئے۔ حضرت سُمَیَّہ رضی اللہ عنہا کو ابو جہل ملعون نے بدترین اذّیت دیتے ہوئے برچھی کا وار کر کے شہید کر ڈالا۔ یہ اسلام کی پہلی شہید خاتون کہلائیں۔④

عراقی نژاد حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ جو بچپن میں رومیوں کے ہاتھوں غلام بنے اور پھر بکتے بکاتے مکہ پہنچے تھے، وہ بھی اسلام لے آئے، اس بناء پر انہیں اتنا مارا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔⑤

---

① سورۃ الحجر، آیت ۹۴

② صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر آیت تبت یدا ابی لہب

③ سیرۃ ابن ہشام: ۱/۳۱۸، ۱/۳۱۷؛ طبقات ابن سعد: ۳/۲۶

④ طبقات ابن سعد: ۳/۱۳۶، ۸/۲۶۴

⑤ طبقات ابن سعد: ۳/۲۲۷

انتہائی تلخ جواب دیے۔ ان سرداروں نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ آپ وہاں قیام فرمالیں۔ ناامید ہو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے لوگوں سے بات چیت کرنے کا ارادہ فرمایا مگر کسی نے بھی آپ کی طرف دھیان نہ دیا بلکہ بڑی بدتمیزی سے کہا کہ ہمارے شہر سے فوراً نکلو اور جہاں مرضی ہو چلے جاؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب جانے لگے تو ان بدبختوں نے شہر کے اوباش لڑکوں کو مذاق اُڑانے اور پتھر مارنے کے لیے آپ کے پیچھے دوڑایا، پتھروں کی بارش سے آپ زخمی ہوگئے، تکلیف کی شدت سے آپ بار بار بیٹھ جاتے، لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازوؤں سے پکڑ پکڑ کر اُٹھاتے اور آپ جونہی چلنے کے لیے قدم اٹھاتے، وہ پھر سنگ باری کرتے۔ طائف کی سرزمین پر کائنات کے مقدس ترین انسان کا خون اتنا بہا کہ دونوں جوتے خون سے رنگین ہوگئے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جو آپ کے ساتھ تھے، انہیں اتنے پتھر لگے کہ ان کا سر پھٹ گیا۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح مار کھاتے، شہر کی حدود سے نکل آئے۔ ایک باغ نظر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں داخل ہوگئے۔ تب ان لوگوں نے پیچھا چھوڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک کھجور کے سائے میں جا بیٹھے اور انتہائی بے بسی کے عالم میں دکھے ہوئے دل کے ساتھ اپنے مولا سے یہ دعا مانگی:

"الٰہی! تجھی سے اپنی کمزوری اور بے کسی اور لوگوں سے ذلت اور رسوائی کی فریاد کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو ہی کمزوروں کا رب ہے، تو ہی میرا پروردگار ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے، کسی اجنبی پرائے کے جو مجھے دیکھ کر منہ بناتا اور تیوری چڑھاتا ہے یا کسی دشمن کے حوالے کرتا ہے جس کو تو نے مجھ پر مسلط کر دیا۔ اے اللہ! اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی چیز کی پروا نہیں۔ مجھے بس تیری حفاظت کافی ہے، میں تیرے چہرے کے اس نور کے طفیل جس سے تمام تاریکیاں روشن ہوجاتی ہیں اور جس سے دنیا اور آخرت کے سارے کام سنور جاتے ہیں، اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو یا تو مجھ سے ناراض ہو۔ تیری ناراضی اس وقت تک دور کرنا ضروری ہے جب تک تو راضی نہ ہوجائے۔ نہ تیرے سوا کوئی طاقت ہے نہ قوت۔"

ایسی مضطرب دُعا پر اللہ تعالیٰ کی غیرت کو جوش کیوں نہ آتا۔ فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا گیا۔ انہوں نے آکر عرض کیا: "اللہ نے آپ کی قوم کی وہ گفتگو سنی ہے جو انہوں نے آپ سے کی۔ اب وہ فرشتہ جو پہاڑوں کے انتظامات پر مامور ہے حاضر خدمت ہے، آپ اسے جو چاہیں حکم دیں۔"

اب پہاڑوں کے فرشتے نے سلام کر کے عرض کیا: "ارشاد ہو تو دونوں جانب کے پہاڑوں کو ملادوں، جس سے یہ قوم درمیان میں کچلی جائے۔" مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحم و کرم کا پیکر تھے، جواب میں فرمایا: "میں توقع رکھتا ہوں کہ اگر یہ لوگ مسلمان نہ ہوئے تو ان کی اولاد میں سے ایسے انسان پیدا ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔"[1]

❀❀❀

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۳/۳۳۷ تا ۳۴۳، سیرۃ ابن ہشام: ا ص ۴۱۹ تا ۴۲۱

سفر معراج:

طائف کے سفر میں آپ ﷺ کو جو جسمانی اور جذباتی زخم لگے تھے انہیں مندمل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسا اعزاز عطا فرمایا جس سے کبھی کسی انسان کو نہیں نوازا گیا۔ یہ ''سفر معراج'' کا شرف تھا جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ پر انعامات واکرامات کی بارش کردی گئی۔

آپ ﷺ سو رہے تھے کہ فرشتوں کے سردار حضرت جبرئیل امین علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے ساتھ گھوڑے سے ملتا جلتا ایک پر دار جانور تھا جسے ''براق'' کہا جاتا تھا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو اس پر سوار کرایا اور ہم رکاب ہو کر مسجد الحرام سے شام کی طرف سفر شروع کیا۔ براق کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ جہاں نگاہ پہنچتی وہیں قدم جا پڑتا۔ سفر کا یہ پہلا مرحلہ جسے ''اسراء'' کہا جاتا ہے، بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ پر ختم ہوا جہاں حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیائے کرام علیہم السلام آپ ﷺ کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان سب نے صف باندھ کر آپ ﷺ کے پیچھے نماز ادا کی اور یوں آپ ﷺ کے ''امام الانبیاء'' ہونے کا عملی مظاہرہ ہوا۔

یہاں سے آپ ﷺ کے سفر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا، جسے ''معراج'' کہا جاتا ہے۔ آپ ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ آسمان کی بلندیوں پر پہنچے اور یکے بعد دیگرے ساتوں آسمانوں کی سیر کی۔ ہر آسمان کے دروازے پر فرشتوں نے استقبال کیا۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام، دوسرے پر حضرت عیسیٰ و حضرت یحییٰ علیہما السلام، تیسرے پر حضرت یوسف علیہ السلام، چوتھے پر حضرت ادریس علیہ السلام، پانچویں پر حضرت ہارون علیہ السلام، چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقاتیں ہوئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المعمور کے دروازے کے سامنے بیٹھے تھے جو کعبۃ اللہ کے عین اوپر واقع ہے اور روزانہ ستر ہزار نئے فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔

آپ ﷺ کو دوزخ اور اس میں نافرمانوں کو دیے جانے والے مختلف عذابوں کا مشاہدہ کرایا گیا، اسی طرح جنت اور اس کی نعمتیں بھی دکھائی گئیں۔ آپ ﷺ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے جو عرشِ الٰہی کے نیچے بیری کا ایک مقدس درخت ہے جس پر فرشتوں کا ہجوم رہتا ہے۔ آخر میں آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی خاص بارگاہ میں پہنچے اور اللہ تعالیٰ کا ویسا دیدار کیا جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پچاس فرض نمازوں کا تحفہ دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورے پر آپ نے کمی کی درخواست پیش کی، آخر کم کرتے کرتے اللہ تعالیٰ نے صرف پانچ نمازیں فرض باقی رہنے دیں اور ثواب پچاس ہی کا عطا فرمانے کا اعلان کیا۔ آپ ﷺ کو اس واقعے کے بعد پورے احترام کے ساتھ آپ کے بستر پر پہنچایا گیا۔ اس دنیا میں تب تک تھوڑا سا وقت گزرا تھا کہ آپ ﷺ کا بستر ابھی تک گرم تھا۔

صبح آپ ﷺ نے اس واقعے کا ذکر کیا تو مشرکین نے حسب عادت مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ ابوجہل نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو طعنہ دیتے ہوئے کہا: ''تمہارا ساتھی کہتا ہے کہ وہ راتوں رات بیت المقدس اور آسمانوں کی سیر کر آیا ہے، کیا تم اسے بھی سچ مانتے ہو؟''

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلا تامل کہا کہ ہاں! میں ان کی بات کو بہر حال سچ مانتا ہوں۔

غرض مسلمانوں نے اس واقعے کی تصدیق کی اور اللہ پر اُن کا ایمان مزید مضبوط ہو گیا۔ پانچ نمازوں کے اہتمام نے اللہ سے ان کے تعلق اور قرب میں اضافہ کر دیا۔ معراج کا یہ واقعہ حالت بیداری اور ہوش کا ہے، خواب نہیں۔ اگر خواب ہوتا تو اسے ایک معجزہ اور عجیب واقعے کے طور پر بیان نہ کیا جاتا، نہ مشرکین اس کا مذاق اڑاتے، کیوں کہ خواب میں تو آدمی کچھ بھی دیکھ سکتا ہے۔ ①

اوس اور خزرج میں اسلام کی اشاعت

مکہ سے دو سو نو میل (۳۳۶ کلومیٹر) دور "مدینہ منورہ" ہے۔ اسلام سے پہلے مدینہ منورہ کا نام "یثرب" تھا، یہ شہر شمالی سمت میں پہاڑوں، جنوبی سمت میں کھجور کے گھنے باغوں میں اور مشرق و مغرب میں آتش فشانی لاوے کے ٹیلوں میں گھرا ہونے کے باعث بہت محفوظ تھا۔ وہاں دو قبائل آباد تھے: اوس اور خزرج، جو باہم لڑتے رہتے تھے، ان کے پڑوس میں یہودیوں کے قلعے تھے جو ان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر مسلط رہتے تھے۔ یثرب کے یہ لوگ زمانہ جاہلیت کی رسموں کے مطابق حج ادا کرنے ہر سال مکہ آتے تھے۔ سن ۱۰ نبوی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موسم میں حسب معمول قبائل کو اسلام کی دعوت دینے نکلے تو منیٰ میں سب سے بڑے جمرے کے قریب پہاڑ کی ایک گھاٹی میں آپ کو قبیلہ خزرج کے کچھ لوگ مل گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں توحید کی دعوت دی اور قرآن مجید پڑھ کر سنایا۔

یثرب کے لوگ اپنے پڑوسی یہودیوں سے اکثر یہ سنتے رہتے تھے کہ عنقریب ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانی صورت، اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ دعوت نے انہیں بہت متاثر کیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ وہی نبی ہیں جو انسانیت کے نجات دہندہ ہوں گے، پھر انہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ اپنے وطن سے خانہ جنگی کے خاتمے اور یہودیوں کے تسلط سے نجات کی صورت بھی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ سب اس نبی پر ایمان لے آئیں۔ وہ کہنے لگے: "ہم اپنی قوم کو اس حال میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ جتنا شر اور فساد ان میں ہے اتنا دنیا میں کہیں اور نہیں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے ہمیں متحد کر دے۔" یثرب کے یہ چھ افراد جو سب سے پہلے ایمان لائے: اسعد بن زرارہ، عوف بن عفراء، رافع بن مالک، جابر بن عبداللہ، قطبہ بن عامر اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم تھے۔

انہوں نے وطن جا کر اسلام کی دعوت دینا شروع کی اور چند دنوں میں ہر طرف یہ نیا پیغام پھیل گیا، اسی وقت بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ یثرب کے گھر گھر میں چرچا ہونے لگا کہ مکہ میں ایک سچے نبی کا ظہور ہوا ہے، جنہیں اپنی قوم کی طرف سے سخت تکالیف کا سامنا ہے، وہ قریشی اور ہاشمی ہیں، عبدالمطلب کے پوتے اور عبداللہ کے بیٹے ہیں۔

① البدایہ والنہایہ: ۳/۶۷ تا ۲۸۵، ط دار ھجر۔ الکامل فی التاریخ: ۱/۶۵، ۱/۶۵۰، ط دار الکتاب العربی

اگلے سال سن ۱۱ نبوی میں اوس اور خزرج کے بارہ افراد حج کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ لوگ ایمان لا چکے تھے اور اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت، آپ سے مدد و نصرت کے وعدے کرنے اور دین کی تعلیمات لینے حاضر ہوئے تھے۔ ان بارہ افراد میں حضرت اسعد بن زرارہ اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہما کے علاوہ حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت مالک بن تیہان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے باقاعدہ بیعت لی، جس میں کفر و شرک، چوری، بدکاری، اولاد کے قتل سے احتراز اور نیکی کے ہر کام میں اطاعت کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا۔ اسے ''بیعت عقبہ اولیٰ'' کہا جاتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو معلم بنا کر روانہ کیا۔ وہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے مکان میں ٹھہرے اور اسلام کے نئے مرکز میں توحید کی دعوت، نمازوں کی امامت اور تدریس قرآنِ مجید کے فرائض انجام دینے لگے۔

اگلے برس سن ۱۲ نبوی میں حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ یثرب سے حاجیوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ مکہ آئے۔ منیٰ کی اس گھاٹی میں ایک شب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہوئے۔ یہ تہتر مرد اور دو خواتین تھیں۔ انہوں نے تن، من، دھن نچھاور کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن تشریف آوری کی دعوت دی۔ اسے ''بیعت عقبہ ثانیہ'' کہا جاتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بیعت لی اور ان میں سے بارہ نقیب (ذمہ دار افراد) مقرر کر دیے، یہ اسعد بن زرارہ، سعد بن ربیع، سعد بن عبادہ، اسید بن حضیر، عبداللہ بن رواحہ، براء بن معرور، عبادہ بن صامت، رافع بن مالک، عبداللہ بن عمرو، منذر بن عمرو، سعد بن خیثمہ اور ابوالہیثم مالک بن تیہان رضی اللہ عنہم تھے۔ ①

❀❀❀

مشق

❶ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور پاکیزہ بچپن کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
❷ کعبہ کی تعمیرِ نو اور حجرِ اسود کی تنصیب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت وتدبیر کیا تھی۔ پورا واقعہ نقل فرمائیے۔
❸ اسلام کی دعوت کا آغاز کیسے ہوا؟ کفارِ مکہ نے مسلمانوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟
❹ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کے اسلام لانے کا واقعہ قلم بند کیجیے۔
❺ ہجرتِ حبشہ کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوا؟
❻ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا سفر کیوں کیا اور وہاں کیا حالات پیش آئے؟
❼ معراج کا واقعہ مختصر طور پر اپنے الفاظ میں لکھیے۔
❽ انصار میں اسلام کی اشاعت کس طرح ہوئی؟ بیعتِ عقبہ اولیٰ اور بیعتِ عقبہ ثانیہ سے کیا مراد ہے؟

عملی کام:

- سب سے پہلے اسلام لانے والے دس صحابہ کرام وصحابیات کے نام اپنی بیاض میں خوش خط لکھیے۔
- مکہ معظمہ اور مسجد الحرام کی چند تصاویر اپنی بیاض میں چسپاں کیجیے۔
- نقشہ دیکھیے اور مکہ سے طائف جانے والے راستے کی نشاندہی کیجیے۔

کتب برائے مطالعہ:

- رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم، از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم
- حیاۃ الصحابہ، از رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمہ اللہ
- اطلس السیرۃ النبویۃ، از دکتور شوقی ابو خلیل

(یونٹ:1.5)

سیرت ختم الرسل ﷺ ۔ مدنی دور

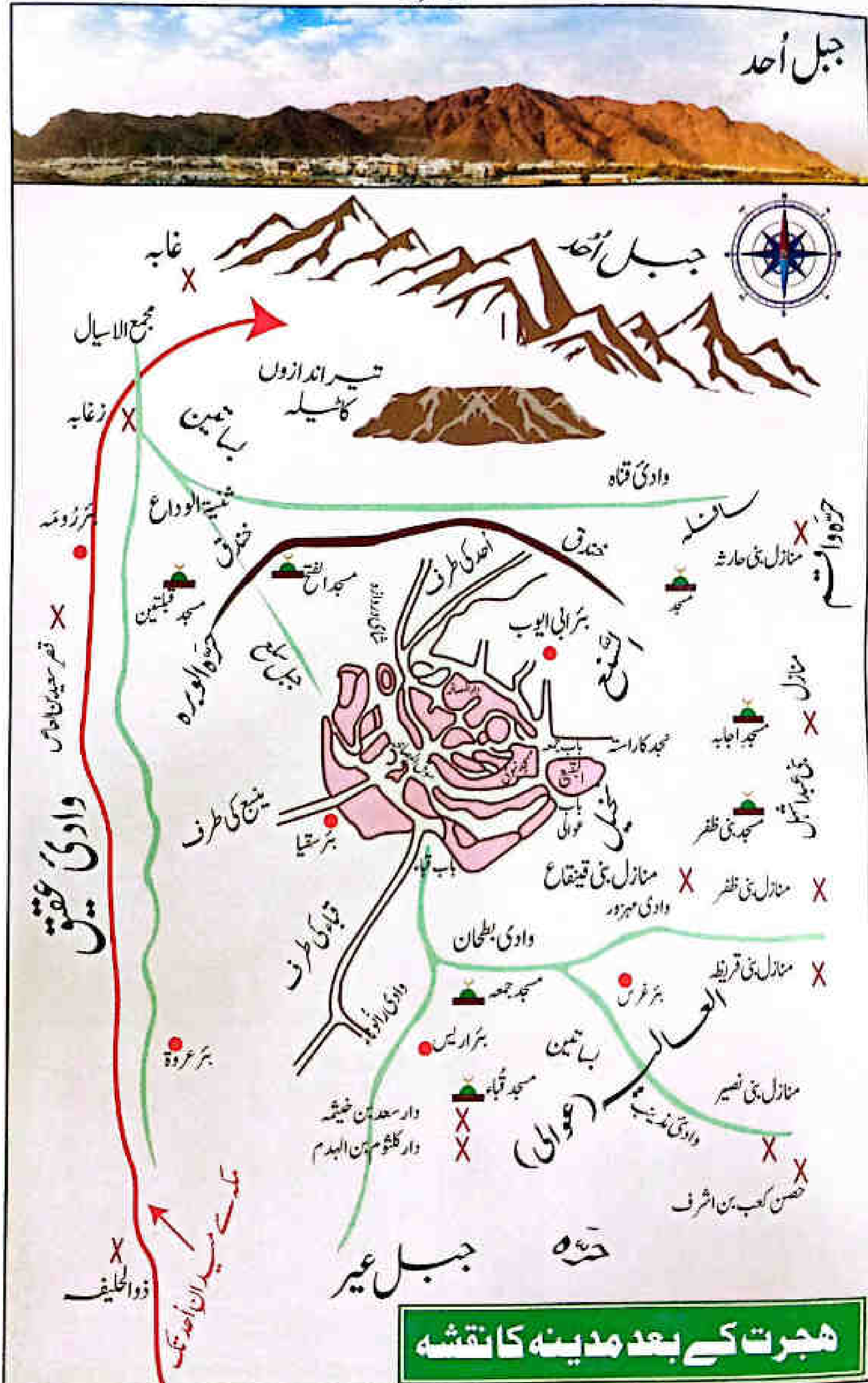
ہجرت مدینہ

سن ۱۳ نبوی کا آغاز ہوا تو آپ ﷺ نے مکہ کے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر اپنے گھر بار اور وطن کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے اور یثرب چلے جانے کا حکم دیا۔ یہ عمل ''ہجرت'' کہلایا۔ مسلمان یکے بعد دیگر چپکے چپکے مکہ سے نکل کر یثرب جانے لگے۔

قریش کو اس بات کی اطلاع مل چکی تھی کہ اوس اور خزرج نے حضور ﷺ اور مسلمانوں کو پناہ دینے کا عہد کرلیا ہے اس لیے وہ ہجرت کرنے والوں کی راہ میں ہر ممکنہ رکاوٹیں ڈالنے لگے۔ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ ہجرت کرنے لگے تو قریش نے تعاقب کر کے انہیں روک لیا، آخر کار انہوں نے اپنے سارے مال اور خفیہ دولت کا پتا بتا کر خلاصی پائی۔ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ اپنی بیوی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ایک شیر خوار بچے کے ساتھ روانہ ہوئے تو انہیں بھی راستے میں گھیر لیا گیا۔ کہا گیا اگر جاتے ہو تو جاؤ مگر بیوی اور بچہ ہمارے حوالے کر کے جانا ہوگا۔ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ انہیں اللہ کے سپرد کر کے نکل گئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ایک سال تک اپنے میکے میں محصور رہیں اور بچہ ددھیال میں ماں باپ سے دور بلکتا رہا۔ آخر کچھ لوگوں کو رحم آگیا، انہیں ہجرت کی اجازت دی اور وہ تنہا اپنے بچے کو لے کر مکہ سے مدینہ روانہ ہوئیں۔ صرف ایک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے با قاعدہ اعلان کر کے ہجرت کی اور ان کی ہیبت کی وجہ سے کوئی ان کو روکنے کی جرأت نہ کرسکا۔

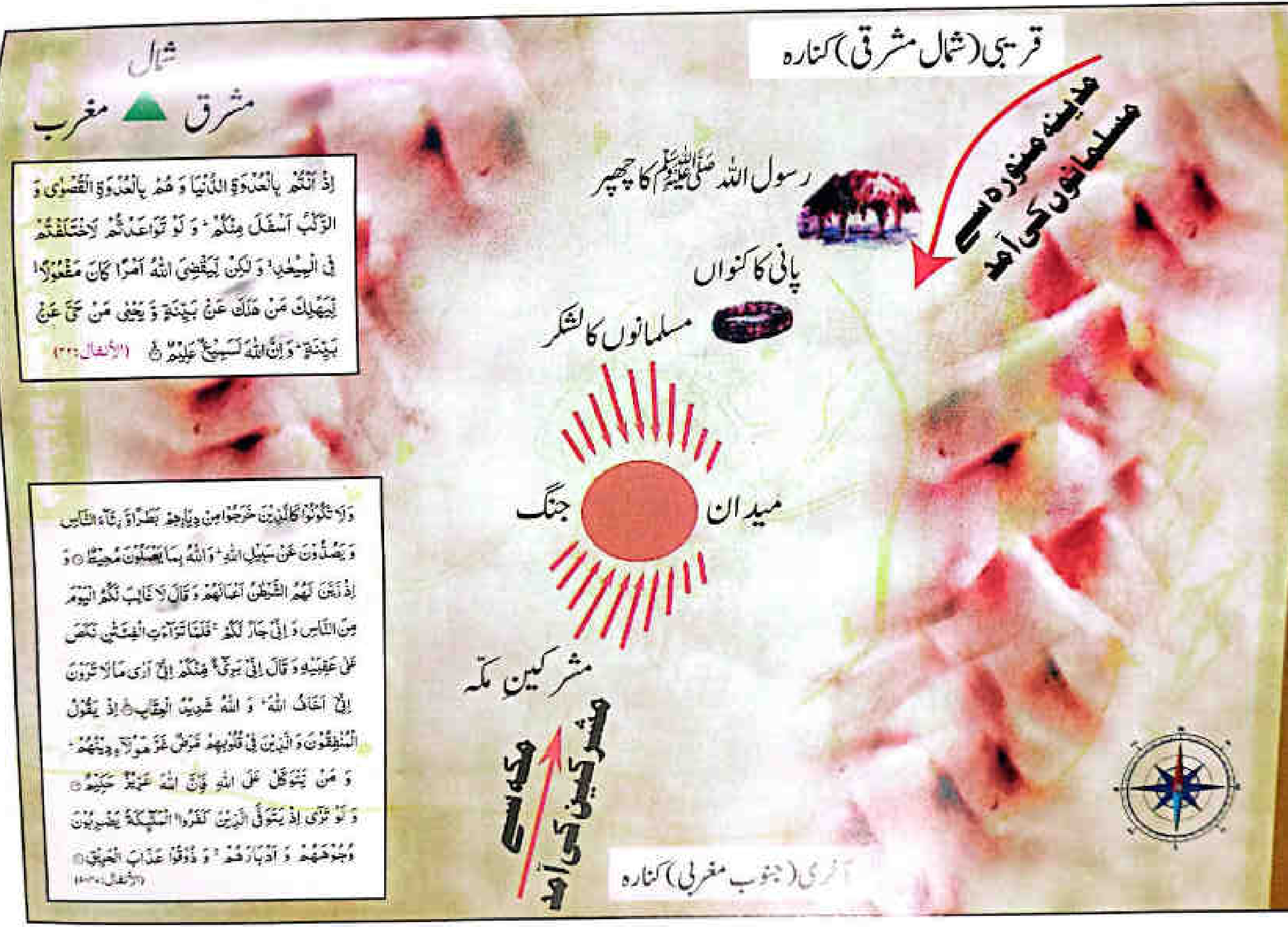
دو ماہ بعد آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے ہجرت کا حکم ملا۔ آپ ﷺ سیدھے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاں گئے۔ انہیں بتایا کہ اللہ کی طرف سے ہجرت کا حکم آگیا ہے۔ وہ بولے: ''میں ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔'' فرمایا: ''تم ہی میرے رفیق سفر ہوگے۔ وہ خوشی سے رونے لگے اور بتایا کہ اس مقصد کے لیے دو تیز رفتار اونٹنیاں تیار کر رکھی ہیں۔

آپ ﷺ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر نکلے اور غار ثور میں جا کر روپوش ہو گئے۔ قریش نے آپ کو گھر میں نہ پایا تو مکہ سے جانے والے ہر راستے پر آپ کی تلاش شروع کر دی اور آپ ﷺ کو پکڑ کر لانے والے کے لیے سو اونٹوں کے انعام کا اعلان کر دیا۔ آپ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تین دن تک غار میں روپوش رہے۔ اس دوران ایک موقع پر کفار کے کچھ لوگ تلاش کرتے کرتے غار کے دھانے تک آگئے، تب سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بے چینی ناقابل بیان تھی۔ اپنے سے زیادہ آپ ﷺ کی جان کا خوف انہیں لرزائے دے رہا تھا۔ دو سرگوشی میں بولے: ''یا رسول اللہ! اگر یہ لوگ اپنے پیروں کی طرف جھانک کر دیکھ لیں، تو ہم نظر آ جائیں گے۔''



ہجرت کے بعد مدینہ کا نقشہ

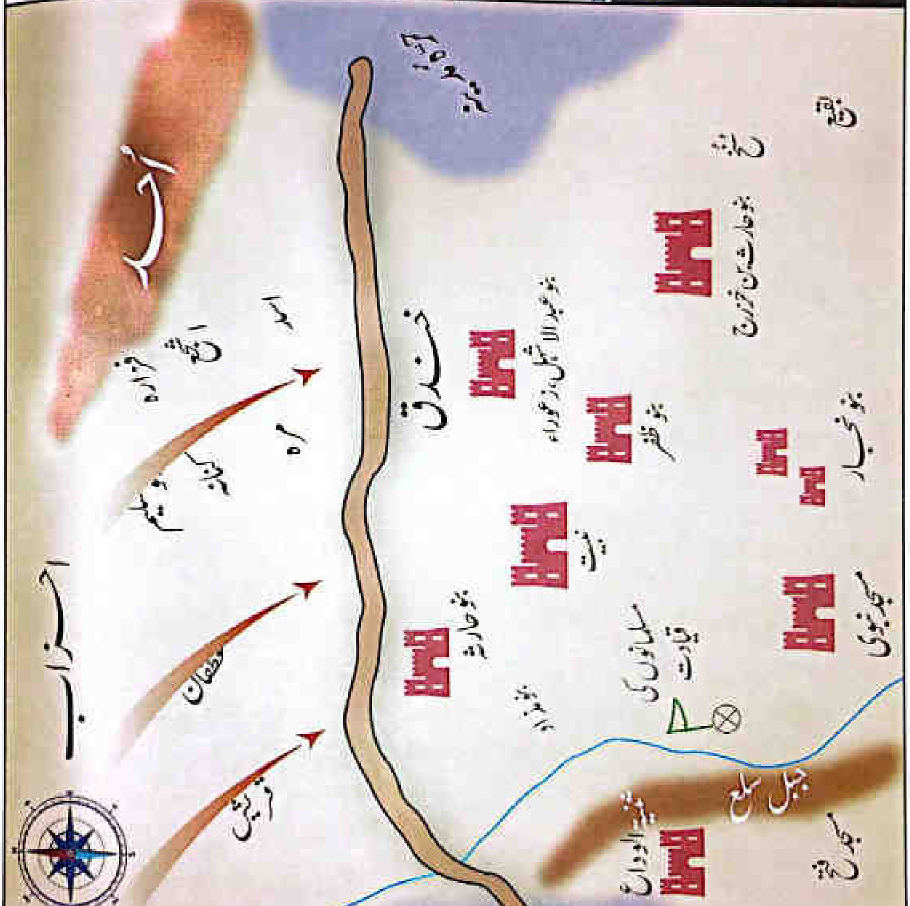
غزوۂ بدر۔ حق وباطل کا پہلا معرکہ




غزوہ احد۔ میدان جنگ کا نقشہ
جبل أحد
اسلامی کیمپ
خالد بن ولید
کا حملہ
مسلمان
مشرکین
قریش کا کیمپ
تیر اندازوں
کا ٹیلہ
واپسی کا راستہ
مشرکین کی آمد
بنو حارثہ
جبل سلع
کھجور
کے باغات
مدینہ منورہ
مسجد نبوی
مسلمانوں
کی پیش قدمی

غزوہ خندق کے مقام پر
مسجد فتح (اوپر) اور
مسجد سلمان فارسی (نیچے)



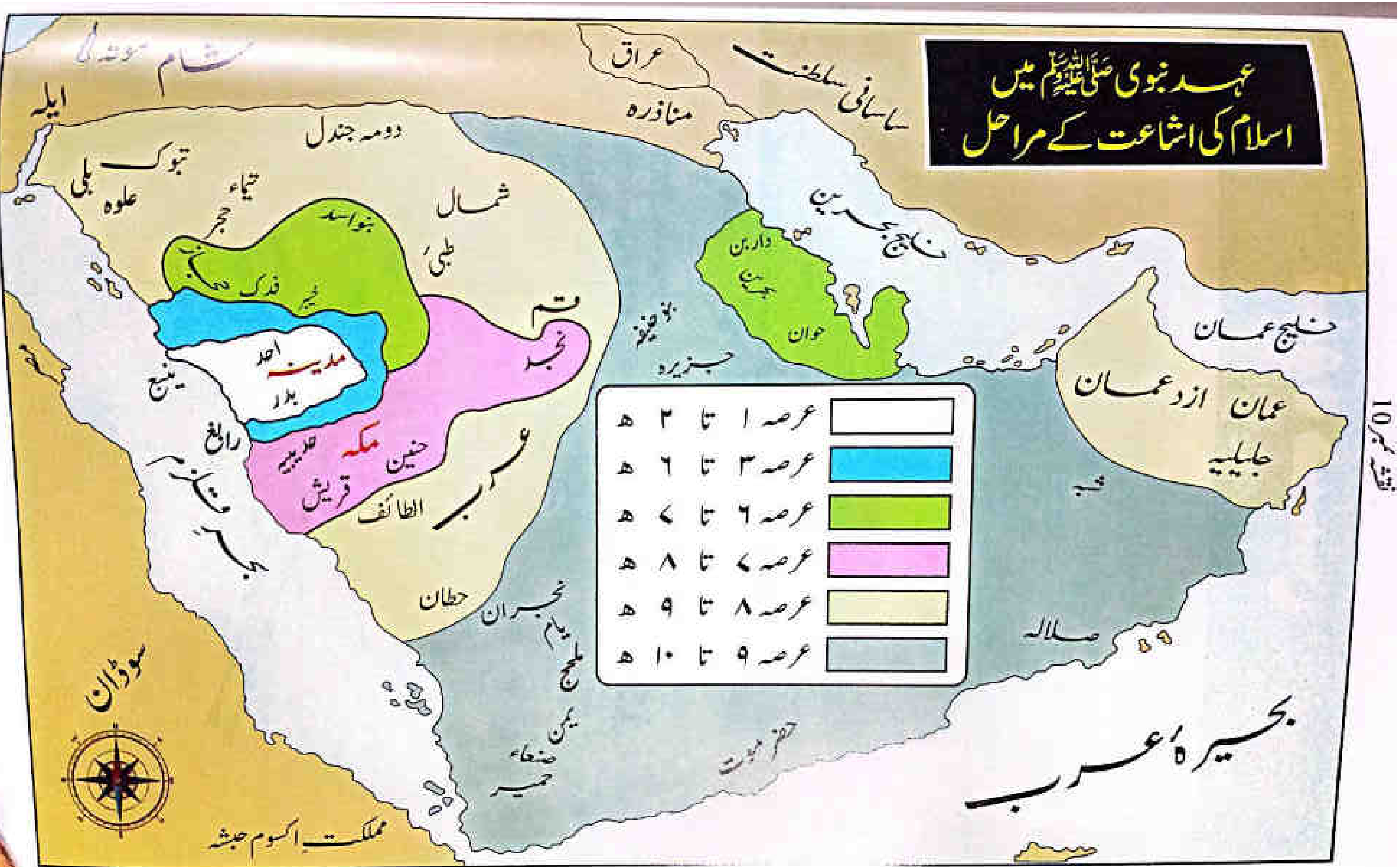


غزوہ حنین

(شوال سن ۸ ہجری)






عہد نبوی ﷺ میں
اسلام کی اشاعت کے مراحل
عرصہ ۱ تا ۲ ھ
عرصہ ۳ تا ٦ ھ
عرصہ ٦ تا ۷ ھ
عرصہ ۷ تا ۸ ھ
عرصہ ۸ تا ۹ ھ
عرصہ ۹ تا ۱۰ ھ
شام
ایلہ
عراق
ساسانی سلطنت
مناذرہ
دومہ جندل
تبوک
بلی
علوہ
تیماء
حجر
بنو اسد
شمال
طئی
خیبر
فدک
تمیم
نجد
مدینہ
احد
بدر
ینبع
رابغ
مکہ
حدیبیہ
حنین
قریش
الطائف
عرب
حطان
نجران
یمام
یمن
صنعاء
حمیر
حضر موت
جزیرہ
خلیج بحرین
دارین
حوان
خلیج عمان
عمان
ازد عمان
جلیلیہ
صلالہ
بحیرہ عرب
سوڈان
مملکت اکسوم حبشہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورے اطمینان سے بولے: ”اے ابوبکر! گھبراؤ نہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔“

قریش اتنے قریب پہنچ کر بھی ناکام واپس لوٹ گئے۔ چوتھے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غار سے نکل کر اپنی منزل کو روانہ ہوئے۔ راستے میں سراقہ بن مالک نامی ایک گھڑسوار نے قریش سے انعام پانے کے لالچ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کیا اور قریب پہنچ گیا مگر آپ کی دعا سے اس کی سواری زمین میں دھنس گئی۔ اس نے معافی طلب کی اور تعاقب سے باز آ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں جبکہ مسلمان کس مپرسی کے باعث اپنے گھروں سے نکالے جارہے تھے، سراقہ بن مالک کو خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا:

”سراقہ! تمہاری کیا کیفیت ہوگی جب کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں پہنائے جائیں گے۔“

سراقہ فتحِ مکہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے اور مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں جب ساسانیوں کا پایۂ تخت مدائن فتح ہوا تو ”نوشیروان“ کے کنگن سراقہ بن مالک کو پہنائے گئے۔ ①

یثرب میں استقبال:

پیر ۸ ربیع الاوّل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یثرب کی نواحی بستی ”قبا“ پہنچے۔ شہر کے لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے روانگی کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس لیے وہ روزانہ آپ کے انتظار میں شہر کے باہر آتے اور دور دور تک نظریں دوڑاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب قبا پہنچے تو ایک ہجوم آپ کے استقبال کے لیے اُمنڈ پڑا۔ یہاں چار دن قیام کے بعد ۱۲ ربیع الاوّل کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہر میں داخل ہوئے تو لوگ راستوں، گلیوں اور مکانات کی چھتوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کرنے کے لیے جمع تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی برکت سے یثرب کا نام بدل کر مدینۃ الرسول اور مدینۃ النبی ہو گیا۔ ②

تعمیر مسجد نبوی اور تحویلِ قبلہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مدت محلہ بنو نجار میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر پر قیام فرمایا اور اسی محلے میں زمین کے خالی قطعہ پر ایک مسجد تعمیر کی جو مسجد نبوی کہلائی۔ مسجد کا قبلہ بیت المقدس کے رخ پر تھا۔ اس کی دیواریں کچی اینٹوں سے، ستون کھجور کے تنوں سے اور چھت کھجور کی شاخوں سے بنائی گئی۔ ③ سولہ ماہ بعد تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا، کعبہ قبلہ قرار پایا اور مسلمان مسجد الحرام کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھنے لگے۔ ④

مہاجرین و انصار میں عقدِ مواخاۃ (بھائی چارہ):

دنیا کے اس پہلے اسلامی معاشرے میں قبائلی امتیازات کی جگہ اسلام کے لیے قربانیوں کے حوالے اہم ہو گئے اور انہی سے لوگوں کا تعارف ہونے لگا۔ اسلام کے لیے گھر بار چھوڑنے والے ”مہاجرین“ کہلائے اور ”مہاجرین“ کی مدد کرنے والوں کو ”انصار“ کہا جانے لگا۔

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۳/ ۳۲۰ تا ۳۲۱؛ اسد الغابۃ، تر: سراقۃ بن مالک ② سیرت ابن ہشام: ۱/ ۴۹۳
③ سبل الہدیٰ والرشاد: ۳/ ۳۳۸ ④ صحیح البخاری، ح: ۴۰، کتاب الایمان

آپ ﷺ نے ''مواخاۃ'' کا معاہدہ کرا کے ہر مہاجر کو کسی نہ کسی انصاری کا بھائی بنا دیا تاکہ اسے تکلیف اور پریشانی کے وقت یہاں رشتہ داروں کی کمی محسوس نہ ہو۔ انصار نے اس موقع پر بے مثال ایثار کا ثبوت دیا۔ اپنے مہاجر بھائیوں کو مکانات، باغات اور دولت میں سے آدھوں آدھ کی پیش کش کر دی۔ مہاجرین نے جواب میں قناعت اور شکر گزاری کا مظاہرہ کیا اور بقدرِ ضرورت مدد لینے پر ہی اکتفا کیا۔ ①

میثاقِ مدینہ:

آپ ﷺ نے ریاستِ مدینہ کو محفوظ اور مضبوط بنانے کے لیے آس پاس بسنے والے عرب قبائل اور یہود سے ایک معاہدہ بھی کیا جسے ''میثاقِ مدینہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ دنیا کی پہلی اسلامی ریاست کا شہری دستور تھا۔ اس معاہدے کی اہم شقیں یہ تھیں:

① ہم سب غیروں کے مقابلے میں متحد ہیں۔
② خون بہا اور قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیے کا سابقہ رواج برقرار رہے گا۔
③ مجرم کو سب پکڑ کر سزا دیں گے، چاہے وہ ہم میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔
④ مسلمان، کافروں کے مقابلے میں باہم تعاون کریں گے۔
⑤ معاہدے میں شریک غیر مسلم قریش کے کسی شخص کو پناہ نہیں دیں گے۔
⑥ یہودی اپنے مذہبی معاملات میں آزاد ہوں گے۔ مسلمان اپنے دین پر اور یہود اپنے دین پر چلیں گے۔
⑦ یہودی اپنے مصارف الگ برداشت کریں گے اور مسلمان الگ۔ لڑائی میں یہودی مسلمانوں کے ساتھ مالی تعاون کریں گے۔
⑧ مدینہ پر حملہ آور لشکر کے مقابلے میں، اس معاہدے میں شریک تمام فریق متحد ہو کر لڑیں گے۔
⑨ معاہدے میں شریک فریقوں کا ہر اختلاف اور تنازع رسول اللہ ﷺ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ ②

غزوۂ بدر

قریش اسلام کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے وہ مدینہ منورہ پر ایک بڑے حملے کی تیاریاں کرتے رہے اور اس سے پہلے چھاپہ مار کارروائیوں سے مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کو ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا اور وہ ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔ ③

---

① صحیح البخاری، ح: ۳۷۸۲، ۳۷۸۱، ۳۷۸۰، کتاب المناقب، باب اخاء النبی ﷺ، سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۴۹۹، ۵۰۴، ۵۰۵
② سیرۃ ابن ہشام: ۱/ ۵۰۱ تا ۵۰۳
③ لباب فی اسباب النزول للسیوطی، سورۃ النور، آیت: ۵۵ (وعد اللہ الذین امنوا)

آنحضرت ﷺ کو قریش کے ناپاک عزائم کی خبروں سے اس قدر تشویش تھی کہ راتوں کو چوکنا اور بیدار رہا کرتے تھے۔ ① انہی دنوں قریش کے حامی رئیس کرز بن جابر فہری نے مدینہ کی چراگاہوں پر حملہ کیا اور آپ ﷺ کے مویشی لوٹ لیے۔ اس قسم کے حملے کسی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے تھے۔ ②

جہاد کی مشروعیت:

مکہ میں مسلمانوں کو جہاد کی اجازت نہیں دی گئی تھی بلکہ وہاں حکم تھا ''کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ'' (اپنے ہاتھ تھام کر رکھو) مگر اب اللہ تعالیٰ کی جانب سے جہاد کی اجازت پر مشتمل سورۂ حج کی آیات نازل ہو گئیں:

(ترجمہ:) ''وہ لوگ جن سے لڑائی کی جا رہی ہے، انہیں (جہاد کی) اجازت ہی کیوں کہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ ان کی مدد پر بلاشبہ قدرت رکھتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے گھروں سے ناحق نکالا گیا ہے، صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے۔'' ③

ابتدائی سرایا اور پہلا غزوہ:

قریش کے قافلے مدینہ کے قریب سے گزر کر شام جایا کرتے تھے مگر اب مدینہ اور اس کے قرب و جوار میں قائم ہونے والی اسلامی ریاست کے ساتھ قریش کا کوئی معاہدہ نہ تھا۔ نئے حالات میں قریش پر لازم تھا کہ وہ ریاستِ مدینہ سے معاہدہ کر کے اس کی منظوری سے یہ شاہراہ استعمال کرتے مگر قریش نے اپنے گھمنڈ کے باعث مسلمانوں سے سفارتی تعلقات قائم کرنے اور راہداری کی اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ زبردستی اس شاہراہ پر آمد و رفت برقرار رکھ کر اپنی دھاک بٹھانا چاہتے تھے۔

آخر نبی اکرم ﷺ نے قریش کو ان کی اوقات یاد دلانے کا فیصلہ کیا اور جہاد کی اجازت ملنے کے فوراً بعد قریش اور ان کے حلیف قبائل کے خلاف کارروائیوں یا ان کی جاسوسی کے لیے صحابہ کرام کی مسلح ٹولیاں بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا جنہیں سیرت نگار ''سرایا'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سرایا، ''سریہ'' کی جمع ہے، یہ اس مہم کو کہا جاتا تھا جس کی ترتیب آپ ﷺ نے مقرر کی ہو مگر خود عملی طور پر اس میں شرکت نہ کی ہو جبکہ ''غزوہ'' اس سیاسی یا عسکری مہم کو کہا جاتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی ہو۔ سنہ ۲ھ میں غزوات اور سرایا کا آغاز ہوا۔ کئی مہمات بھیجی گئیں مثلاً سریہ حمزہ، سریہ عبیدہ بن حارث اور سریہ سعد بن ابی وقاص ۔ غزوۂ ابواء (ودّان) پہلی مہم تھی جس میں رسول اللہ ﷺ خود شریک ہوئے اور جہینہ کے کچھ قبائل سے حلیفانہ معاہدے کر کے واپس لوٹے۔ اس سلسلے کی ایک مہم جمادی الآخرہ سن ۲ ہجری میں حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بھیجی گئی جس کا مقصد قریش کے ایک قافلے کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنا تھا مگر وہاں جھڑپ ہو گئی جس میں قریش کا نامور سردار عمرو ابن الحضرمی مارا گیا۔ ④

---

① السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۸۱۶۰ ② الاصابۃ، ترجمۃ: کرز بن جابر، الاستیعاب: ۳/۱۳۱۰
③ سورۃ الحج، آیت: ۳۹، ۴۰ ④ سیرۃ ابن ھشام: ۱/۵۹۱ تا ۶۰۳

قریشی قافلے کی آمد:

اس واقعے سے قریشی سرداروں کو قوم میں اشتعال پھیلانے کا موقع مل گیا اور انہوں نے بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاری شروع کر دی اور خطیر سرمایہ لگا کر ابوسفیان کی قیادت میں ایک بڑا قافلہ شام کی طرف روانہ کیا تا کہ اس کے نفعے سے سامانِ جنگ فراہم کیا جائے۔①

یہ قافلہ جاتے ہوئے مسلمانوں کی دسترس سے بچ کر نکل گیا تھا۔ واپسی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخبر اس کی گھات میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بروقت اطلاع مل گئی اور آپ ۱۲ر رمضان المبارک سن ۲ ہجری کو تین سو تیرہ مہاجرین وانصار کو ساتھ لے کر اس قافلے کو روکنے کے لیے بذاتِ خود روانہ ہو گئے۔②

مسلمانوں کی روانگی:

مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی، لشکر میں گھوڑے صرف دو اور اونٹ ستر تھے۔ ایک، ایک اونٹ پر تین، تین افراد باری باری سوار ہوتے۔ اُدھر قریشی قافلے کے سردار ابوسفیان بن حرب نے مسلمانوں کی نقل وحرکت سے بروقت باخبر ہو کر ایک سوار کو مکہ کی طرف دوڑایا تھا تا کہ قریش مدد کو پہنچیں اور اپنے تجارتی قافلے کی حفاظت کریں۔ قریش پہلے ہی مدینہ پر حملے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے، اس خبر کا مکہ میں پہنچنا تھا کہ فوراً نو سو پچاس مسلح افراد کا ایک لشکر جن میں سو گھڑ سوار اور سات سو اونٹ سوار تھے مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ لشکر میں قریش کے بڑے بڑے سردار شریک تھے۔③

صحابہ کرام سے مشورہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع پہنچی کہ تجارتی قافلہ بچ کر نکل گیا ہے اور قریش کا مسلح لشکر مقابلے کے لیے آیا چاہتا ہے تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے مہاجرین نے اپنی جان نچھاور کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! ہم بنی اسرائیل نہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو کہہ دیا تھا کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا لڑو۔ نہیں، ہم تو آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے لڑیں گے۔''

مگر آپ انصار کا جذبہ دیکھنا چاہتے تھے۔ انصار آپ کو اس وعدے پر لائے تھے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کریں گے جس کا مفہوم مدینہ کی حدود میں تحفظ فراہم کرنا تھا۔ کھلے لفظوں میں یہ معاہدہ نہیں تھا کہ اگر مدینہ سے باہر قریش سے جنگ ہوئی تو انصار اس وقت بھی مدد کے پابند ہوں گے، اس لیے آپ انصار کی رائے کے منتظر رہے۔ قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ آپ کی منشا سمجھ گئے اور اُٹھ کر کہنے لگے:

''آپ شاید ہماری رائے جاننا چاہتے ہیں۔ اللہ کے رسول! آپ جس سے چاہیں صلح کر لیں اور جس سے چاہیں لڑیں۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ اللہ کی قسم! آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔''④

---

① الکامل فی التاریخ: ۱۲/۲ ② سیرۃ ابن ہشام: ۶۱۲/۱

③ سیرۃ ابن ہشام: ۶۱۳/۱ ، البدایۃ والنہایۃ: ۲۳/۵، ۲۵، ۲۶ ④ سیرۃ ابن ہشام: ۶۱۵/۱

میدانِ بدر میں:

قریش کا لشکر بدر کی طرف بڑھ رہا تھا، مسلمان بھی اسی طرف روانہ ہو گئے۔ آخر قریش کا لشکر پیش قدمی کرتا ہوا میدانِ بدر کے دوسرے سرے تک پہنچ گیا۔ مسلمانوں نے پہلے میدان کے شمالی کنارے پر ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا تھا جہاں سے پانی دور تھا مگر پھر ایک صحابی حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کے مشورے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے ایک کنوئیں کی طرف بڑھ کر اس کے قریب خیمے لگائے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمادی جس سے مسلمان خوب سیراب ہو گئے یہاں کی ریتیلی زمین پختہ ہو گئی۔ یہی بارش قریش کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی کیوں کہ ان کے پڑاؤ میں کیچڑ اور پھسلن پیدا ہو گئی۔ ۱۷ رمضان المبارک سن ۲ ہجری کا سورج طلوع ہوا تو قریش اپنی جنگی تیاری مکمل کر چکے تھے۔ ادھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی صفیں درست کر رہے تھے۔ ①

صبح سویرے قریش کا لشکر سامنے آ گیا اور کچھ فاصلہ چھوڑ کر صف آرا ہوا۔ یہ اسلام اور کفر کا پہلا اور فیصلہ کن معرکہ تھا، ایک طرف تین سو تیرہ مسلمان تھے اور جن کا سامانِ جنگ بھی کم تھا۔ دوسری طرف تین گنا کفار بہترین اسلحے کے ساتھ موجود تھے۔ اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں کر رہے تھے، آپ فرما رہے تھے:

”اے اللہ! اگر آج مومنوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر تا قیامت روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔“ ②

حق و باطل کی لڑائی، ابو جہل کا قتل:

جنگ کی ابتداء انفرادی مقابلوں سے ہوئی جس میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے عتبہ بن ربیعہ کو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ولید بن عتبہ کو مار گرایا جبکہ حضرت عُبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ شیبہ بن ربیعہ کو سخت مجروح کر کے خود بھی شدید زخمی ہو گئے اور انہی زخموں کے باعث شہید ہو گئے۔ انفرادی مقابلوں کے بعد گھمسان کی جنگ شروع ہوئی۔ ③

اس وقت انصاری نوجوانوں کا جوش و خروش قابل دید تھا، دو بھائیوں: معاذ بن عفراء اور معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہما نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے پاس آ کر پوچھا: ”چچا جان! کیا آپ ابو جہل کو پہچانتے ہیں؟“ انہوں نے جواب میں کہا: ”ہاں! خوب پہچانتا ہوں، تمہیں اس سے کیا کام؟“ بولے: ”سنا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر وہ نظر آ گیا تو بچ کر نہیں جا سکتا۔“ اسی وقت ابو جہل گھوڑے پر سوار اپنے ساتھیوں کو جوش دلاتا اُدھر سے گزرا، انہوں نے فوراً کہا: ”وہ دیکھو، وہ رہا ابو جہل۔“

یہ سنتے ہی دونوں پیدل ابو جہل کی طرف لپکے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ اتنے میں ایک اور انصاری حضرت معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ان کی مدد کے لیے پہنچ گئے اور ابو جہل کی پنڈلی پر تلوار کا وار کیا جس سے پنڈلی کٹ کر گر گئی۔ ابو جہل کے بیٹے

---

① البدایة والنهایة: ۵/ ۷۹ تا ۸۲، سیرة ابن هشام: ۱ ص ۶۱۹، ۶۲۰

② سیرة ابن هشام: ۱/ ۶۲۷ ③ البدایه والنهایه، ج: ۵، ص: ۹۵، ۹۶، دار هجر

عکرمہ نے باپ کو زخمی ہوتے دیکھا تو معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے کندھے پر تلوار کا وار کیا جس سے ان کا بازو کٹ گیا، لیکن تھوڑی سی کھال اس سے جڑی رہ گئی جس سے بازو لٹکنے لگا۔ انہیں اس بازو کی وجہ سے لڑنے میں مشکل ہوئی تو اس پر اپنا پاؤں رکھ کر جھٹکا دیا اور اسے الگ کر کے پھینک دیا۔ ادھر معوذ رضی اللہ عنہ نے ابوجہل پر دوسرا حملہ کر کے اسے شدید زخمی کر دیا اور پھر خود دوسرے کفار سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ ابوجہل بھی خون میں لت پت ہو کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ لیا اور اس کا سر قلم کر دیا۔

اُدھر دونوں نوجوان دوڑے دوڑے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور ماجرا سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: ''تم میں سے کس نے اسے مارا ہے؟'' دونوں نے بیک آواز کہا: ''میں نے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی تلواروں پر لگا خون دیکھ کر فرمایا: ''تم دونوں نے اسے مارا ہے۔''①

کفار کی شکست:

جب جنگ کے شعلے اپنی انتہائی حدت کو پہنچے تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی میں کچھ مٹی اٹھائی اور دشمن کی طرف پھینکتے ہوئے کہا: ''یہ چہرے خوار ہو جائیں، اے اللہ! ان کے دلوں کو خوف سے بھر دے، ان کے قدم اُکھاڑ دے۔''

اس کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو فیصلہ کن حملے کا حکم دیا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ''اور آپ نے (خاک کی جو مٹھی) پھینکی تھی، وہ آپ نے نہیں اللہ نے پھینکی تھی۔''②

معجزانہ طور پر ہر کافر کی آنکھ میں یہ مٹی جا پڑی، ان میں کھلبلی مچ گئی۔ اِدھر صحابہ کرام نے زوردار حملہ کر دیا، مشرکین شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے پیچھا کرتے ہوئے بھی بہت سوں کو قتل اور گرفتار کیا۔③

غزوۂ بدر میں صرف چودہ مسلمان شہید ہوئے، ان میں سے چھ مہاجر اور آٹھ انصاری تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے کم سن بھائی، عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی اسی لڑائی میں شہید ہوئے۔ عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ نے جو شیبہ سے لڑتے ہوئے شدید زخمی ہوئے تھے، جنگ سے واپسی کے سفر میں جام شہادت نوش کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا۔ قریش کے ستر افراد مارے گئے جن میں ان کے نامور سردار اور سپہ سالار شامل تھے۔ اتنے ہی کفار گرفتار ہوئے جنہیں قیدی بنا کر مدینہ لایا گیا۔ ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس، آپ کے داماد ابوالعاص اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی عُقیل بھی شامل تھے۔ یہ سب بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔④

❁❁❁

① البدایہ والنہایہ، ج:۵، ص:۱۳۵ تا ۱۳۰، دار ھجر۔۔۔ شارحین حدیث نے ابوجہل کے قتل میں شریک صحابہ کے ناموں پر خاصی بحث کی ہے۔ خلاصہ کے لیے تاریخ اُمت مسلمہ حصہ اوّل (غزوہ بدر) کا حاشیہ اور تفصیل کے لیے فتح الباری، شرح مسلم للنووی، اور عمدۃ القاری دیکھیے۔

② سورۃ الانفال، آیت:۱۷　③ سیرۃ ابن ہشام: ۱/ص ۶۲۸

④ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲ھ، سیرۃ ابن ہشام: ۱/ص ۷۱۳

غزوۂ اُحد

قریش نے بدر کے مقتولین کا انتقام لینے، عرب میں اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینے اور شام کی تجارتی شاہراہ کو کھلوانے کے لیے مدینہ منورہ کو فتح کرنا ضروری سمجھا اور سارا تجارتی نفع خرچ کر کے تین ہزار جنگجوؤں کا لشکر تیار کیا جس میں دو سو گھڑ سوار اور سات سو زرہ پوش سپاہی تھے۔ پندرہ مرثیہ خواں عورتیں بھی تھیں جو بدر کے مقتولین کے نوحے پڑھ پڑھ کر فوج کو جوش دلاتی تھیں۔

اُدھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لشکر کی آمد کی اطلاع ملی تو صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے یہ تھی کہ شہر میں رہ کر محصورانہ جنگ کی جائے۔ مگر نوجوانوں نے جو تیغ زنی کے جوہر دکھانے کے لیے بے چین تھے، باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ ان کا جوش و خروش دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے اور ہتھیار باندھ کر تشریف لائے جو کہ کھلے میدان میں جا کر لڑنے کا اشارہ تھا۔ صحابہ فکر مند ہو گئے اور عرض کیا: ''آپ پسند فرمائیں تو اندر ہی رہ کر لڑائی کی جائے۔'' مگر آپ نے فرمایا: ''جب نبی ہتھیار پہن لے تو اسے زیب نہیں دیتا کہ لڑے بغیر انہیں اُتار دے۔''①

لشکرِ اسلام کی روانگی:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کی نماز پڑھا کر لشکر مرتب کیا اور سہ پہر کے وقت شہر کے اندرونی محلوں اور کوچوں سے گزرتے ہوئے شمالی سمت کو روانہ ہوئے جدھر قریش پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔②

میدانِ اُحد میں:

۱۵ شوال سن ۳ ہجری کو علی الصباح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صف بندی اور مورچہ بندی اس طرح مکمل کر لی تھی کہ احد پہاڑ پشت پر تھا اور مدینہ منورہ بائیں ہاتھ پر۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ٹیلے پر تیر اندازوں کا دستہ متعین فرمایا تاکہ دشمن پشت سے حملہ نہ کر سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر اندازوں کو حکم دیا کہ کسی بھی حالت میں یہ جگہ نہ چھوڑیں۔

دن کا اُجالا پھیلتے ہی لشکرِ قریش مسلمانوں کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کے دو ماہر جرنیل خالد بن ولید دائیں بازو کے اور عکرمہ بن ابوجہل بائیں بازو کے سو سو گھڑ سواروں کی قیادت کر رہے تھے۔ اب دونوں طرف سے نعرے بلند ہوئے اور دونوں لشکر باہم ٹکرا گئے۔

ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شمشیر اس طرح چلائی کہ پرے کے پرے صاف کر دیے اور دشمن کی صفیں اُلٹتے ہوئے ان کی عورتوں تک جا پہنچے یہاں تک کہ ہند بنت عتبہ ان کی شمشیر کی زد میں آ گئی، انہوں نے عورت ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے چھوڑ دیا۔ اس جنگ میں مہاجرین و انصار نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر شمشیر زنی کے جوہر دکھائے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جو مشرک آتا، تلوار کا لقمہ بن جاتا۔ ارطاۃ بن شرحبیل اور سباع بن عبدالعزیٰ جیسے

---

① سیرۃ ابن ہشام: ۲/ص ۱۲۶ تا ۱۳۲ ② البدایہ والنہایہ: ۵/ص ۳۵۵، دار ھجر؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳ھ

سور ما آناً فاناً ان کے آگے ڈھیر ہو گئے۔ اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وار سے مشرکین کا علمبردار طلحہ بن عثمان زخمی ہو کر پرچم سمیت گر پڑا۔ قریش کے گھڑ سوار اور پیادے مسلمانوں کی ایمانی طاقت کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور بھاگ نکلے۔ مسلمان تعاقب کرتے ہوئے ان کی خیمہ گاہ تک پہنچ گئے اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگے۔

ٹیلے پر تعینات تیراندازوں نے یہ منظر دیکھا تو وہ یہی سمجھے کہ جنگ کا فیصلہ ہو گیا ہے، اس لیے وہ بھی مالِ غنیمت لینے نیچے اُترنے لگے، ان کے امیر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکنے کی کوشش کی اور یاد دلایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں یہاں پہرہ دینے کی تاکید فرمائی ہے مگر جانے والے یہ سوچ کر نہ رکے کہ یہ حکم جنگ کی حالت میں تھا اور اب جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اس طرح تیراندازوں کے ٹیلے پر صرف چودہ، پندرہ افراد باقی رہ گئے۔ مشرکین کے گھڑ سوار دستے کے سالار خالد بن ولید نے پسپائی کی حالت میں بھی ٹیلے کو خالی ہوتا دیکھ لیا اور اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہ لگائی، وہ گھڑ سواروں کو لے کر پورے پہاڑ کے گرد چکر کاٹ کر مسلمانوں کے عقب میں آگئے۔ ٹیلے پر رہ جانے والے باقی ماندہ پہرے دار انہیں روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ اب خالد بن ولید نے مالِ غنیمت جمع کرتے ہوئے بے خبر مسلمانوں پر دھاوا بول دیا اور بہت سوں کو شہید کر دیا۔ اُدھر سے بھاگتے ہوئے مشرکین بھی پلٹ آئے اور مسلمان دونوں طرف سے سخت نرغے کی کیفیت میں آنے لگے۔ وحشی نے موقع پا کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر بھالا پھینکا جو ان کی ناف کے پار ہو گیا۔ ادھر لشکرِ اسلام کے پرچم بردار مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی شہید ہو گئے، پرچم کے زمین بوس ہو جانے سے مسلمانوں کی شیرازہ بندی مزید مشکل ہو گئی۔ ساتھ ہی یہ افواہ پھیل گئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں، جسے سن کر مسلمانوں پر بجلی گر پڑی۔ رنج و اضطراب، بے چینی، بدنظمی اور افراتفری کی اس کیفیت میں درجنوں مسلمان شہید ہو گئے اور بہت سے ادھر اُدھر نکل گئے۔ ①

انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو بکھرتا دیکھ کر کہا: ''بھائیو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے، آگے بڑھو اور جس مقصد کے لیے ہمارے آقا نے جان دی ہے، اس پر جان دے دو۔'' یہ کہہ کر وہ کفار کی بھیڑ میں گھس گئے اور آخر دم تک تلوار چلاتے رہے۔ ②

صحابہ کی بے مثال جاںنثاری:

اس نازک ترین صورتِ حال میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ جنگ میں موجود تھے۔ قریش کے کئی جنگجو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کر رہے تھے۔ ان کے ناپاک عزائم سے بچانے کے لیے چند صحابہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حصار میں لے لیا تھا اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر آپ کے گرد کھڑے تھے، ان میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت حارث بن صمہ اور چند انصاری رضی اللہ عنہم پیش پیش تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے پہلے حفاظتی تدبیر کے طور پر اپنی

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳ ھ، البدایۃ والنہایۃ: ۵ ص ۳۳۷ تا ۳۷۶
② سیرۃ ابن ہشام: ۸۲/۳

زرہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے بدل لی تھی، لہٰذا آپ کی پہچان مشکل ہوگئی تھی، پھر بھی مشرکین میں سے عتبہ بن ابی وقاص اس طرف آیا اور یکے بعد دیگرے کئی پتھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پھینکے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نچلے دانت (رباعی) کی نوک ٹوٹ گئی۔ ابن شہاب اور ابن قمئہ تلواریں لے کر حملہ آور ہوئے مگر وہ صحابہ کا گھیرا نہ توڑ سکے۔ پھر بھی ابن شہاب کے وار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر زخم آ گیا اور ابن قمئہ کی تلوار آپ کے فولادی خود پر اس طرح پڑی کہ سر مبارک تو محفوظ رہا مگر خود کی آہنی کڑیاں رخساروں میں کھب گئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرنے والوں میں اُم عمارہ نسیبہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، وہ آپ کے دائیں بائیں تلوار چلا رہی تھیں۔ اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ تک پہنچ گئے۔ مشرکین کے دو جتھے یکے بعد دیگرے آئے، دونوں مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انہیں روکنے کا حکم دیا۔ انہوں نے نہایت زور وشور سے تلوار چلا کر تن تنہا ان کے رخ پھیر دیے۔ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے احد پہاڑ کی طرف بڑھتے جا رہے تھے، کچھ مشرکین تیزی سے پیچھے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہے کوئی جوان مرد جو انہیں بھگا دے، وہ جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''میں حاضر ہوں۔'' آپ نے فرمایا: ''تم نہیں'' اب ایک انصاری آگے بڑھے اور مشرکین سے بھڑ گئے اور لڑتے لڑتے جان دے دی۔ مشرکین نے اب دوبارہ تعاقب شروع کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح جنت کی بشارت دیتے رہے اور ایک ایک انصاری مشرکین کو روکنے کی کوشش میں شہید ہوتے رہے۔ آخر میں صرف حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ رہ گئے، تب انہیں خود مقابلے میں آ کر مشرکین سے لڑنا پڑا جس میں ان کے دونوں ہاتھ لہولہان ہو گئے۔ ①

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جانثاروں کے ساتھ احد پہاڑ کی بلندی پر چڑھنے لگے۔ قریش جو برابر آپ کی تاک میں تھے، پیچھے لپکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابودجانہ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت حارث بن صمہ وغیرہ رضی اللہ عنہم تھے۔ ②

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دیکھو یہ لوگ ہمارے پیچھے اوپر نہ چڑھنے پائیں۔'' یہ سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور چند مہاجرین پلٹے اور ہلہ بول کر کفار کو مار بھگایا۔ اب پہاڑ کی دشوار گزار چڑھائی شروع ہو چکی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی تھے اور دو زرہیں پہنے ہوئے تھے لہٰذا ایک چٹان پر آپ خود نہ چڑھ سکے تو حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ فوراً جھک کر بیٹھ گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پشت پر پاؤں رکھ کر چٹان پر چڑھ گئے اور فرمایا: ''طلحہ نے اپنے لیے جنت واجب کر لی۔'' ③

بلندی پر آ کر قریش کے حملے کا خطرہ نہیں رہا تھا، تاہم یہاں جمع ہونے والے مسلمان سب ہی بری طرح تھکے ماندے اور پیاسے تھے مگر ان کی خدمت کے لیے مسلمان خواتین اور بچے پہنچ چکے تھے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی بیوی اُم سلیم اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مشکیزے بھر بھر کر پانی لا رہی تھیں اور مجاہدین اسلام کو پلا رہی تھیں۔ ④

---

① سیرۃ ابن ہشام: ۲/۸۳؛ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۳ھ ② البدایہ والنہایہ: ۵ص ۳۱۱
③ البدایہ والنہایہ: ۵ص ۳۱۴ ④ صحیح البخاری، ح: ۳۸۱۱، کتاب المناقب، مناقب ابی طلحۃ

ابوسفیان سے مکالمہ:

جنگ کا ہنگامہ تھم چکا تھا۔ جاتے جاتے قریش کے سپہ سالار ابوسفیان نے پہاڑ کے پاس آ کر فتح کے نعرے لگائے اور کہا: ”لڑائی کا ڈول اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے...... آج کے دن ہم نے یوم بدر کا بدلہ لے لیا...... جیے ہبل۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر جواب دیا: ”اللہ غالب و بالاتر......“

ابوسفیان نے کہا: ”ہماری عزیٰ ہے، تمہاری کوئی عزیٰ نہیں۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تلقین فرمانے پر جواب میں کہا: ”ہمارا مولیٰ ہے اللہ، تمہارا کوئی مولا نہیں۔“

ابوسفیان نے پوچھا: ”قسم دیتا ہوں، سچ سچ بتاؤ ہم نے محمد کو قتل کر دیا ہے یا نہیں۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سختی سے جواب دیا: ”بالکل نہیں، اللہ کی قسم! وہ تو تمہاری آواز سن رہے ہیں۔“

ابوسفیان نے جانے سے پہلے کہا: ”اگلے سال پھر بدر میں مقابلہ ہوگا۔“

جواب ملا: ”ٹھیک ہے...... اگلے سال وہاں مقابلے کا وعدہ رہا۔“ ①

شہدائے اُحد:

قریش کے کئی منتقم مزاج لوگوں نے لاشوں کے ناک، کان اور دوسرے اعضاء کاٹے تھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چیر کر کلیجہ نکال لیا گیا تھا۔ چہرے کو مسخ کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے غیر معمولی محبت تھی۔ ان کی لاش کی یہ حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد دکھ ہوا۔ فرمایا: ”اس جیسا صدمہ پھر کبھی نہ پہنچے گا۔“ ②

شہداء میں حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ بھی تھے جو ایک پاؤں سے معذور تھے۔ ان کے چار کڑیل جوان بیٹے اس جنگ میں شریک ہونے جا رہے تھے، تب انہوں نے بھی ساتھ نکلنے کی آرزو ظاہر کی تھی۔ لڑکوں نے بڑھاپے اور معذوری کا کہہ کر منع کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر عرض کرنے لگے: ”میرے لڑکے مجھے آپ کے ساتھ جہاد پر جانے سے روک رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ اپنے لنگڑے پاؤں سے جنت میں چلوں پھروں۔“

یہ جذبہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت کی اجازت دے دی تھی۔ اب ان کی لاش بھی میدانِ جنگ میں پڑی تھی۔ ③

ان میں مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی تھے جو مکہ کے سب سے خوبصورت اور خوش لباس نوجوان تھے، مگر آج ان کی تدفین اس حال میں ہو رہی تھی کہ جسم ڈھانپنے کے لیے صرف ایک چھوٹی سی چادر ہی مل سکی تھی جس سے سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے۔ پاؤں ڈھانپے جاتے تو سر کھل جاتا۔ ④

---

① البدایہ والنہایہ: ۵ ص ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۹، ۳۔ دار ھجر
② البدایہ والنہایہ: ۵ ص ۳۲۶۔ دار ھجر
③ البدایہ والنہایہ: ۵ ص: ۳۱۸۔ دار ھجر
④ صحیح البخاری، ح: ۴۰۳۵، کتاب المغازی، باب غزوۃ احد

جنگ کا نتیجہ:

اس جنگ میں جانی نقصان مسلمانوں ہی کا زیادہ ہوا تھا، اس لحاظ سے قریش کو فتح ہوئی تھی مگر یہ فتح ادھوری تھی، کیوں کہ مسلمانوں کی ریاست اور قیادت محفوظ تھی۔ مسلمانوں نے جان پر کھیل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی تھی اور قریش ایڑی چوٹی کا زور لگا کر بھی ان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ یوں قریش بدر کی شکست کا پوری طرح بدلہ نہ لے سکے۔

سانحہ رجیع

صفر ۴ ہجری میں دو بدوی قبائل: عَضَل اور قارہ کے نمائندے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے لیے چند معلم طلب کیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کر کے دس صحابہ کی جماعت کو اس علاقے کی طرف روانہ کر دیا۔ ان کے ذمے علاقے پر نظر رکھنا بھی تھا۔ یہ مہم ''واقعہ رجیع'' کہلاتی ہے۔

جب یہ حضرات اس علاقے میں ''رجیع'' نامی چشمے پر پہنچے تو بنولحیان نے عَضَل اور قارہ کے تقریباً ایک سو تیر اندازوں سمیت ان حضرات کو گھیر لیا اور کہا: ''اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہمارا وعدہ ہے کہ تم میں سے کسی کو قتل نہیں کریں گے۔''

عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر ساتھیوں سے کہا: ''بھائیو! میں کسی کافر کی ضمانت پر یقین نہیں کرتا۔ الٰہی! ہمارے حال کی خبر اپنے نبی کو پہنچا دے۔'' یہ کہہ کر وہ سات صحابہ سمیت لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ کفار نے لاش کی بے حرمتی کرنا چاہی مگر اللہ نے شہد کی مکھیوں کا ایک غول بھیج دیا جس نے ان کی نعش کو گھیر لیا اور کفار اسے چھو نہ سکے۔ ①

خُبَیب، عبداللہ بن طارق اور زید بن دَثِنہ رضی اللہ عنہم نے امان کی شرط پر خود کو کفار کے سپرد کر دیا۔ مگر کفار نے عہد شکنی کی اور قیدی بنا کر مکہ میں بیچ دیا۔ قریشی رؤساء نے انہیں خرید لیا اور اپنے ان رشتہ داروں کے انتقام میں جو بدر میں مارے گئے تھے، شہید کر دیا۔ خبیب رضی اللہ عنہ نے قتل ہونے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کی اور پھر یہ تاریخی اشعار پڑھے:

وَلَسْتُ أُبَالِيْ حِيْنَ أُقْتَلُ مُسْلِمًا عَلٰى أَيِّ شِقٍّ كَانَ لِلّٰهِ مَصْرَعِي

''جب میں مسلمان ہو کر قتل ہو رہا ہوں تو مجھے پروا نہیں کہ اللہ کی خاطر میں کس کروٹ پر گرتا ہوں۔''

وَذَالِكَ فِيْ ذَاتِ الْإِلٰهِ وَإِنْ يَّشَأْ يُبَارِكْ عَلٰى أَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعِ

''یہ اللہ کی ذات کے لیے ہے اور وہ چاہے تو ایک پارہ پارہ کی گئی لاش کے ٹکڑوں پر برکت نازل فرما دے۔'' ②

زید بن دَثِنہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے سے پہلے ابوسفیان نے آزمائش کے لیے پوچھا:

''زید! کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ محمد یہاں ہوتے اور تمہاری جگہ وہ قتل کر دیے جاتے؟''

زید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''واللہ! ہمیں تو یہ بھی گوارا نہیں کہ انہیں اپنے گھر میں کانٹا بھی چبھے اور ہم اپنے گھر میں

---

① سیرۃ ابن ہشام: ۱۶۹/۲، ۱۷۰؛ صحیح البخاری، باب غزوۃ الرجیع؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۷۴

② صحیح البخاری، ح: ۳۰۴۵، ۳۰۸۶، ۷۴۰۲؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۵۶/۲۰، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ

آرام سے بیٹھیں۔'' ابوسفیان نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں نے ایسی محبت کسی کی نہیں دیکھی جیسی محمد سے ان کے ساتھیوں کو ہے۔'' اس کے بعد زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔①

سانحہ بئرِ معونہ:

اسی زمانے میں نجد کے ایک غیر مسلم رئیس ابوبراء (عامر بن مالک) نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ مددگار طلب کیے جو اس کے مخالف قبائل کو رام کریں اور ان کو ریاستِ مدینہ کا پیغام سنا کر حلیف بنائیں۔ حضور ﷺ نے اہلِ نجد کی بدعہدی کا خدشہ ظاہر کیا مگر ابوبراء نے ہر طرح اطمینان دلایا اور مکمل تحفظ کی ذمہ داری لی۔

آخر جمادی الاولیٰ ۴ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے ستر حافظ اور قاری صحابہ کو اس سمت بھیج دیا جو عبادت و ریاضت میں ممتاز تھے۔ ان میں منذر بن عَمرو، حرام بن ملحان، حارث بن الصِمّہ اور عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ شامل تھے مگر بئرِ معونہ کے مقام پر ابوبراء کے بھتیجے عامر بن طفیل نے عُصَیَّہ، رِعل اور ذکوان قبائل کے حمایتی جمع کر کے ان صحابہ کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ سانحہ بئرِ معونہ کے نام سے مشہور ہے۔ شہدائے بیر معونہ نے دم توڑنے سے قبل یہ دعا کی تھی:

''أَلَا بَلِّغُوْا عَنَّا قَوْمَنَا...بِأَنَّا قَدْ لَقِيْنَا رَبَّنَا...فَرَضِيَ عَنَّا وَ أَرْضَانَا۔''

(ہماری جانب سے ہماری قوم کو بتادو! کہ ہم اپنے رب سے جاملے۔ وہ ہم سے خوش ہوا، اور اس نے ہمیں خوش کردیا۔)

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان کے یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دیے۔ حضور ﷺ اس سانحے پر نہایت غمگین ہوئے اور ایک ماہ تک قنوتِ نازلہ پڑھ کر ان ظالموں کے لیے بددعا فرماتے رہے۔②

غزوۂ بنی لحیان:

اس کے ساتھ ہی حضور ﷺ نے سرکش عناصر کو لگام دینے کے لیے نئی مہمات شروع کیں تاکہ بنولحیان اور اس کے حلیف قبائل (عَضل اور قارہ) کے علاوہ اُن رؤسائے مکہ کو بھی مرعوب کیا جائے جنہوں نے عَضل اور قارہ سے خرید کر تین صحابہ کو قتل کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے دو سو مجاہدین کو لے کر تیزی سے مشرق کی طرف کوچ کیا اور نجد کے علاقے تک جا پہنچے۔ عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کے خون سے ہاتھ رنگنے والے بنولحیان کو اس پیش قدمی کی اطلاع ملی تو وہ نہایت سراسیمہ ہو کر اپنی بستیوں سے نکل بھاگے اور پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ اس مہم کو غزوۂ بنی لحیان کہا جاتا ہے۔ اسی دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مکہ کے نواح پر یلغار کر کے قریش کو مرعوب کیا۔③

ان مہمات میں حضور ﷺ کی خوش اخلاقی اور رحم و کرم نے ہر جگہ اَن مٹ نقوش چھوڑے۔ نجد سے واپسی کے

① سیرۃ ابن ہشام: ۲/۱۷۲

② صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب العون بالمدد، کتاب المغازی، باب غزوة الرجیع ورعل وذکوان وبئر معونة؛ سیرۃ ابن ہشام: ۲/۱۸۳ تا ۱۸۷

③ المغازی للواقدی: ۲/۵۳۶؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۷۷ مع حاشیہ

سفر میں ایک دوپہر کو قافلے نے پڑاؤ ڈالا۔ صحابہ کرام سایہ تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی تلوار ایک جھاڑی کی شاخ پر لٹکا کر خود اس کے نیچے آرام فرما ہوئے۔ اچانک ایک بدو وہاں آن پہنچا اور حضور ﷺ کی تلوار لے لی۔ آہٹ سے حضور ﷺ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک بدو تلوار سونتے کھڑا ہے۔

بدو نے للکار کر کہا: ''تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟'' آپ ﷺ نے بڑے اطمینان سے فرمایا: ''اللہ!''

بدو نے دوبارہ سہ بارہ یہ سوال دہرایا اور آپ ﷺ نے ہر بار یہی جواب دیا۔ بدو پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔ حضور ﷺ نے تلوار اٹھالی اور فرمایا: ''اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟''

وہ نادم ہو کر کہنے لگا: ''آپ اچھا مواخذہ کرنے والے بن جائیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

کہنے لگا: ''نہیں، مگر میرا وعدہ ہے کہ نہ آپ سے لڑوں گا اور نہ ہی اس قوم کا ساتھ دوں گا جو آپ سے لڑے۔''

اتنے میں صحابہ کرام نیند سے بیدار ہو کر وہاں آ گئے، دیکھا کہ حضور ﷺ نے ایک اجنبی بدو کو پاس بٹھایا ہوا ہے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کو پورا قصہ سنایا۔ قدرت کے باوجود آپ ﷺ نے اسے سزا نہیں دی اور معاف کر دیا۔ اس نے اپنی قوم میں جا کر آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کا تذکرہ کیا اور کہا: ''میں بہترین انسان سے مل کر آ رہا ہوں۔''[1]

غزوۂ بدر الموعد (ذوالقعدہ ۴ھ):

ذوالقعدہ ۴ھ میں نبیٔ اکرم ﷺ قریش کے اس چیلنج کے جواب میں جو انہوں نے اُحُد کی لڑائی کے اختتام پر دیا تھا، ڈیڑھ ہزار صحابہ کے ساتھ میدانِ بدر میں پہنچے، مگر قریش میدان میں اترنے کی جسارت نہ کر سکے اور ان کا لشکر مَرّ الظّہران تک آ کر واپس ہو گیا۔ مسلمان آٹھ دن تک ان کا انتظار کرتے رہے مگر قریش کو مقابلے پر آنا تھا نہ آئے۔ مسلمان اپنے ساتھ تجارتی سامان بھی لائے تھے۔ وہ بدر کے بازار سے خوب نفع کما کر واپس ہوئے۔[2]

غزوۂ بنو مُصطَلِق: (شعبان ۵ھ)

شعبان ۵ھ میں رسول اللہ ﷺ جنوب میں ''مُرَیْسِیع'' کے چشمے کی طرف روانہ ہوئے جہاں بنو مُصطلِق کا سردار حارث بن ابی ضِرار خُزاعی مسلمانوں کے خلاف جتھہ بندی کر رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ حریف کے تیار ہونے سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ ایک تند و تیز جھڑپ کے بعد بنو مصطلق نے ہتھیار ڈال دیے، اس موقع پر بنو مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی بیٹی جُویریہ نے اسلام قبول کر لیا۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے اعزاز کے طور پر ان سے نکاح کر لیا اور مسلمانوں نے اس رشتے کے احترام میں بنو مصطلق کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا اور مالِ غنیمت واپس دے دیا۔[3]

---

① مسند احمد، ح: ۱۴۹۲۹؛ صحیح البخاری، ح: ۲۹۱۰، کتاب الجهاد، ح: ۱۳۳۶؛ صحیح مسلم، ح: ۲۰۹۰

② سیرۃ ابن هشام: ۲۰۹/۲؛ طبقات ابن سعد: ۵۹/۲، ۶۰

③ سبل الهدیٰ والرشاد: ۲۷/۱۲؛ سیرت ابن هشام: ۲۸۹/۲؛ البدایة والنهایة: ۱۸۱/۶

غزوۂ خندق

کفار سمجھ گئے تھے کہ کوئی قوت تنہا اسلام کا راستہ نہیں روک سکتی چنانچہ اسلام دشمن طاقتیں اب مسلمانوں کے خلاف متحدہ اقدامات پر غور کرنے لگیں۔ بنونضیر کے یہودی مکہ گئے اور قریش کے سرداروں سے مل کر ریاستِ مدینہ کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کا معاہدہ کیا۔ پھر وہ مدینہ کے جنوب مشرق میں نجد کی حدود میں آباد غطفان کے جنگجو قبائل سے ملے اور انہیں بھی اس اتحاد میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ①

آخر شوال سن ۵ ہجری میں اتحادیوں کا سیلاب مدینہ منورہ کی طرف امنڈ پڑا۔ قریش نے اپنے جوانوں، حلیف قبائل اور احابیش سے چار ہزار جوانوں کی نفری فراہم کی تھی جن میں تین سو گھڑ سوار تھے، بنوغطفان نے سات سو جنگجو پیش کیے تھے جن کی قیادت عیینہ بن حصن کر رہا تھا۔ بنومرہ کے چار سو سپاہیوں کا سالار حارث بن عوف تھا، مسعر بن رخیلہ بنواشجع کے چار سو جنگجوؤں کو ساتھ لایا تھا، راستے میں بنواسد اور بنوسلیم کی فوجیں بھی ہم رکاب ہوگئیں۔ بنوکنانہ، اہل نجد اور تہامہ کے مشرکین بھی ساتھ تھے۔ اس طرح حملہ آوروں کی تعداد دس ہزار تک جا پہنچی۔ ②

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتحادیوں کی روانگی کی اطلاعات پاتے ہی شہر کے حفاظتی انتظامات کا جائزہ لیا۔ جنوب میں باغات کی دیواروں اور مشرق و مغرب میں ''حرہ'' کے دشوار گزار ٹیلوں نے حملہ آوروں کی راہیں مسدود کر رکھی تھیں، اسی لیے اصل خطرہ شمال کی طرف تھا۔ عام حالات میں یہاں صرف مورچے بنا کر بھی دفاع کیا جا سکتا تھا اور اگر دشمن شہر میں گھس آتا تو شہر کی گلیوں میں جا بجا واقع انصار کی قلعہ نما حویلیوں سے ان پر پتھراؤ اور تیر اندازی کر کے انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلایا جا سکتا تھا، جیسا کہ غزوۂ احد میں ابتداءً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منصوبہ یہی تھا۔ ③

خندق کی کھدائی:

لیکن اب دشمن کی افرادی طاقت اتنی زیادہ اور انتظامات اتنے مکمل تھے کہ یہ معمولی دفاعی حربے کارآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ کھلے میدان میں لڑنے کے نقصانات جنگ اُحد میں سامنے آچکے تھے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی طور پر شہر کے دفاع کے بارے میں مشورہ کیا جس میں اکابر ہی نہیں، عام صحابہ کو بھی رائے پیش کرنے کا پورا موقع دیا گیا تھا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی تجویز سب سے الگ تھی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے آبائی وطن فارس میں ایسے مواقع پر خندقیں کھود کر حملہ آور کی پیش قدمی روک دی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورے کو پورے غور سے سنا اور پھر بلا تاخیر اس پر عمل کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اس زمانے کی ترقی یافتہ جنگی تکنیک تھی جس سے عرب نا آشنا تھے۔ ④

① الکامل فی التاریخ، سنۃ ۵ھ ② الکامل فی التاریخ، سنۃ ۵ھ
③ البدایہ والنہایہ: ۵ ص: ۳۳۶۔ دار ھجر ④ البدایہ والنہایہ: ۶ ص: ۱۳، ۱۴۔ دار ھجر

آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار ہوکر چند مہاجرین وانصار کے ساتھ نکلے اور مدینہ کے آس پاس گشت کرتے ہوئے دفاع کے لیے نقشہ تیار کیا اور مجاہدین کو جن کی تعداد تین ہزار تھی، حکم دیا کہ وہ جبل سَلع کے دامن میں پڑاؤ ڈالیں اور مدینہ کے مشرقی ٹیلے "حرہ واقم" سے مغربی ٹیلوں "حرۃ وبرہ" تک کمان کی شکل میں ایک لمبی خندق کھودیں۔ ①

کھدائی کے دوران ایک جگہ سخت چٹان آگئی، صحابہ کرام اسے توڑنے سے عاجز آگئے تو آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی، آپ خود تشریف لائے اور کدال سے اس سخت چٹان پر تین وار کیے، وہ ریزہ ریزہ ہوگئی۔ ②

چٹان پر وار کرتے وقت ہر بار کچھ شعاعیں سی چمکیں، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: "یہ چمک کیسی تھی؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ نے مجھے پہلی ضرب پر یمن کی، دوسری پر شام اور مغرب کی اور تیسری پر مشرق کی فتح کی خوشخبری دی۔" صحابہ کرام نے یہ سن کر خوشی سے تکبیر کا نعرہ بلند کیا۔ ③ پندرہ دن کی شبانہ روز مشقت کے بعد آخر خندق مکمل ہوگئی۔ ④ جلد ہی کفار کا لشکر نمودار ہوگیا اور احد پہاڑ کو پشت پر رکھ کر مدینہ کے شمال میں پھیل گیا۔ اپنے سامنے ایک گہری اور وسیع خندق کھودی دیکھ کر وہ حیران رہ گئے اور بولے:

"بخدا یہ تو ایسا حربہ ہے جو اس سے پہلے عربوں نے کبھی نہیں آزمایا۔" ⑤

مورچہ بند لڑائی:

خندق کے کنارے محصورانہ جنگ شروع ہوگئی، تیروں اور پتھروں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ایک دن مشرکین کی تیر اندازی سے اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ شدید زخمی ہوگئے۔ پھر ایک دن حریف کے چند نامور شہ سواروں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور ایک نسبتاً کم چوڑی جگہ سے جست کر کے خندق کے پار آگئے، ان میں عرب کا مانا ہوا شمشیر زن عَمرو بن عبدوُدّ بھی تھا، اس نے للکار کر کہا: "ہے کوئی جو مقابلے پر آئے؟"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: "میں اس سے لڑوں گا۔"

مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا اور فرمایا: "علی! یہ عمرو بن عبدوُدّ ہے۔"

عَمرو بن عبدوُدّ نے دوبارہ سہ بارہ آواز لگائی اور جواب میں خاموشی پا کر کہنے لگا:

"کہاں ہے تمہاری وہ جنت جس میں تم مر کر جانے کا یقین رکھتے ہو۔"

اب حضرت علی رضی اللہ عنہ بے قرار ہو کر اٹھنے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: "علی! بیٹھ جاؤ۔ یہ عَمرو بن عبدوُدّ ہے۔"

وہ بولے: "چاہے وہی ہو۔"

---

① السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۳۱۸، ط العلمیۃ

② صحیح البخاری، ح: ۴۱۰۱، ۴۱۰۴، کتاب المغازی، باب غزوۃ خندق

③ البدایہ والنہایہ: ۶ ص: ۲۶ ۔ دار ھجر

④ السیرۃ الحلبیۃ: ۲/۳۲۲، ط العلمیۃ

⑤ سیرۃ ابن ھشام: ۲/۲۲۴

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی، یہ تلوار سونت کر پیدل نکلے۔ عمرو بن عبدود انہیں آتا دیکھ کر گھوڑے سے اتر پڑا اور شعلے کی طرح چمکتی شمشیر لے کر ان پر حملہ آور ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وار ڈھال پر روکا مگر عمرو کا ہاتھ اتنا زور دار تھا کہ تلوار ڈھال کو کاٹتی ہوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیشانی تک پہنچ گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے مگر زخم کاری نہ تھا۔ انہوں نے فوراً سنبھل کر حریف کے کاندھے اور گردن کے بیچ ایسی ضرب لگائی کہ خون کا فوارہ ابل پڑا۔ عمرو بن عبدود کے ڈھیر ہوتے ہی مسلمانوں نے خوشی سے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ باقی مشرک جو خندق کے پار آگئے تھے، فرار ہو گئے۔ ①

کفار کی ناکام واپسی:

محاصرے کو تین ہفتے گزر گئے تھے، موسم سرد تر ہوتا جا رہا تھا۔ محصورین اور حملہ آور دونوں خستہ حال تھے، ساتھ ہی طوفانی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ یہ اللہ کی غیبی مدد تھی جس نے اتحادیوں کے حوصلے پست کر دیے۔ ایک طوفانی اور اندھیری شب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو دشمنوں کی جاسوسی کے لیے روانہ کیا۔ انہوں نے جا کر دیکھا کہ طوفانی ہوا سے اتحادیوں کے خیمے اکھڑ رہے ہیں، جانور ہلاک ہو رہے ہیں، ہانڈیاں الٹ الٹ کر گر رہی ہیں، مشرکین کے رؤسا جو ایک الاؤ کے گرد ہاتھ تاپ رہے تھے، زور و شور سے واپس چلنے پر بحث کر رہے تھے، آخر امیرِ لشکر ابوسفیان نے واپسی کا فیصلہ سنا دیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے واپس آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری سنائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتحادیوں کی واپسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اب حملہ ہماری طرف سے ہوگا...... وہ ہم پر چڑھائی نہیں کر سکیں گے۔'' یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ قریش پھر کبھی مدینہ پر لشکر کشی نہ کر سکے۔ ②

صلح حدیبیہ

مسلمان مکہ چھوڑنے کے بعد مسجد الحرام اور بیت اللہ کی زیارت کو ترس گئے تھے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید اشتیاق تھا کہ اللہ کے گھر کا طواف کیا جائے اور مناسک ادا کیے جائیں۔

انہی دنوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں خود کو صحابہ کرام کے ہمراہ مسجد الحرام میں داخل ہوتے اور مناسک کی تکمیل کرتے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی محسوس کر چکے تھے کہ قریش مسلسل جنگوں کی وجہ سے کمزور پڑ چکے تھے، اسی لیے یہ امید کرنا بے محل نہیں تھا کہ وہ آپ کو عمرے کی اجازت دے دیں گے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذیقعدہ سن ٦ ہجری میں چودہ سو صحابہ کرام کے ساتھ احرام باندھ کر عمرے کے ارادے سے مکہ روانہ ہو گئے۔

قربانی کے جانور بھی ساتھ تھے۔ عرب کے لوگ کسی ایسے قافلے پر حملہ نہیں کرتے تھے جس کے ساتھ قربانی کے جانور ہوں۔ پھر ان مہینوں میں ③ قریش سمیت تمام اہل عرب کے نزدیک جنگ حرام تھی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم

① دلائل النبوۃ للبیہقی: ۴۰۱/۳، ۴۰۵ عن موسی بن عقبۃ

② الکامل فی التاریخ سنۃ ۵ ھ ③ عربوں کے ہاں رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم کو قابل احترام مہینے شمار کیا جاتا تھا۔

کو اطمینان تھا کہ جنگ کی نوبت نہیں آئے گی۔ لیکن قریش کو آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی تو وہ بھڑک اٹھے، انہوں نے آپ ﷺ کو روکنے کے لیے اپنے دستور سے ہٹ کر جنگ کی تیاری شروع کر دی اور راستے میں فوج کا ایک دستہ تعینات کر دیا۔ ①

قریش سے مذاکرات، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سفارت، بیعتِ رضوان:

اب آپ ﷺ عام شاہراہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے راستے سے آگے بڑھے اور مکہ کے مضافات میں "حدیبیہ" پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں آپ ﷺ نے ایک مقامی باشندے بُدَیل بن ورقہ کو یہ پیغام دے کر قریش کی طرف بھیجا کہ "ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے، ہمارا مقصد صرف عمرہ کرنا ہے۔"

قریش نے آپ ﷺ کے اس پیغام پر ذرا بھی سنجیدگی سے غور نہ کیا۔ اس دوران نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کر کے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر قریش کی طرف بھیج دیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کا موقف دوبارہ بڑی وضاحت کے ساتھ قریش کے رئیسوں کے سامنے پیش کر دیا۔ واپسی کے موقع پر قریش نے انہیں پیش کش کی کہ وہ چاہیں تو طواف کر لیں۔ وہ بولے: "جب تک رسول اللہ ﷺ کو طواف کی اجازت نہ ملے گی میں بھی طواف نہیں کروں گا۔" اس پر قریش کے سردار بگڑ گئے اور انہیں نظر بند کر دیا۔

اُدھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی واپسی میں تاخیر سے مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انہیں شہید کر دیا گیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ یہ سن کر بہت غم زدہ ہوئے۔ آپ ﷺ اب تک صلح وصفائی کی راہ تلاش کر رہے تھے مگر آپ ﷺ کے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون اتنا قیمتی تھا کہ اسے معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔

آپ ﷺ ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور صحابہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے بدلے موت کی بیعت لی۔ سب نے دل وجان سے آمادگی ظاہر کی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کے لیے ہم آخری سانس تک لڑیں گے۔ جرأت اور جانثاری کی یہ ادا اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آئی کہ قرآنی آیات نازل فرما دیں جن میں اس بیعت میں شریک تمام صحابہ کرام کو اللہ کی رضامندی کی بشارت دی گئی، اس لیے اس بیعت کو "بیعتِ رضوان" کہا جاتا ہے۔ ②

صلح نامہ:

مسلمانوں کے اس ولولے کا قریش پر ایسا اثر پڑا کہ وہ مرعوب ہو گئے۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو آزاد کر دیا۔ وہ سمجھ گئے کہ جزیرۃ العرب میں اب مسلمان ایک ایسی طاقت ہیں جس سے ٹکرانا، دیوار سے سر پھوڑنے کے مترادف ہے۔ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر ایک صلح نامہ مرتب کیا اور سُہیل بن عمرو کے ہاتھ آپ ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا۔ آپ ﷺ نے اسے بغور دیکھا اور بات چیت کے بعد قبول فرما لیا۔ اس صلح نامے کی شقیں یہ تھیں:

① پہلی شق یہ تھی کہ "دس سال تک جنگ بندی رہے گی"۔ اس شق کے ذریعے قریش، مکہ پر مسلمانوں کے

① [illegible] التاریخ [illegible] ② [illegible] التاریخ [illegible]

مکہ حملے کے خطرے کو دور کرنا چاہتے تھے۔ وہ خائف تھے کہ اگر حملہ ہوا تو کوئی بعید نہیں مسلمان غالب آجائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرمالیا، کیوں کہ سرزمین عرب میں امن وامان کی فضا قائم ہونے سے اسلام کی تبلیغ کی راہیں کھل جاتیں اور لوگوں کو مدینے کا اسلامی معاشرہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا۔

② قریش نے دوسری شرط یہ رکھی کہ ”مسلمان اس سال یونہی واپس چلے جائیں، اگلے سال آکر عمرہ کریں۔“ اس طرح سے قریش یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اب بھی وہ غالب اور مسلمان مغلوب ہیں۔ یہ شرط مسلمانوں کے لیے بڑی سخت تھی کیوں کہ اسے ماننا اعترافِ شکست کے مترادف تھا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتی طور پر قریش کو برتری کا جھوٹا بھرم قائم رکھنے دیا، کیوں کہ آپ جانتے تھے کہ قریش حقیقت میں اس طرح کوئی غلبہ حاصل نہیں کریں گے۔

③ تیسری شرط یہ تھی کہ ”اگر مکہ والوں کا کوئی فرد اپنے سرپرستوں کی اجازت کے بغیر مسلمانوں سے جاملا تو اسے واپس بھیج دیا جائے گا۔“ اس طرح قریش اپنے نوجوانوں کے اسلام میں داخل ہونے کا راستہ بند کرنا چاہتے تھے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حامیوں میں اضافہ نہ ہو۔ یہ شرط مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت تھی کہ وہ اپنے کسی ایسے مسلمان بھائی کو جو ہجرت کرکے مدینہ آئے، واپس قریش کے چنگل میں دے دیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طبعی طور پر سخت گراں محسوس کرتے ہوئے بھی یہ بات مان لی۔ صحابہ کرام کو اس پر غمزدہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تسلی دی کہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ جلد ہی کوئی راستہ نکالے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس شرط کی وجہ سے اگر کچھ لوگوں کے اسلام ظاہر کرنے میں رکاوٹ پیدا ہوگی تو اس کے بدلے امن وامان کی وجہ سے درجنوں دیگر قبائل میں اسلام کی روشنی پھیلانے کے مواقع ملیں گے، آپ کی نگاہ اس پہلو پر بھی تھی کہ جو لوگ دل سے ایمان لے آئیں گے قریش کی پکڑ دھکڑ ان کے ایمان کو بدل نہیں سکے گی۔ ہاں ان کو ذاتی طور پر اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا مگر وہ ان آزمائشوں سے سرخرو ہوکر نکلیں گے۔

④ چوتھی شرط یہ تھی کہ ”اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر مکہ والوں سے آملا تو اسے واپس نہیں بھیجا جائے گا۔“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوچ کر اسے منظور فرمالیا کہ اگر کوئی خود اسلام کا ساتھ چھوڑنا چاہے تو اس کا چلے جانا ہی بہتر ہوگا۔

⑤ پانچویں شق یہ تھی کہ ”دیگر قبائل میں سے جو چاہے قریش کا حلیف بن کر اور جو چاہے مسلمانوں کا حلیف بن کر اس معاہدے میں شامل ہوسکتا ہے۔“ یہ ایک منصفانہ بات تھی جو مسلمانوں کے لیے بہرحال مفید تھی۔ کیوں کہ اس طرح انہیں نئے اتحادی میسر آسکتے تھے اور پورے عرب میں امن وامان کی فضا قائم ہوسکتی تھی۔ اس شق کے تحت اس موقع پر بنوخزاعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف بن کر اور بنوبکر قریش کے حلیف بن کر اس معاہدے میں شامل ہوگئے۔ [1]

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶ھ

ابوجندل رضی اللہ عنہ کی واپسی:

ابھی صلح نامے پر دستخط نہیں ہوئے تھے کہ مسلمانوں پر ایفائے عہد اور ہمت وحوصلے کا ایک عجیب امتحان آن پڑا۔ ہوا یہ کہ قریش کے سفیر سہیل بن عمرو کے نوجوان بیٹے ابوجندل نے مکہ میں اسلام قبول کر لیا تھا، انہیں اس کی پاداش میں زنجیروں میں جکڑ کر رکھا گیا تھا مگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ کے قریب تشریف آوری کا سن کر کسی طرح بھاگ نکلے اور اس حال میں آپ کی خدمت میں پہنچے کہ پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ سہیل بن عمرو نے دیکھا تو کہا کہ معاہدے کے مطابق اسے واپس کیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابھی صلح نامہ پر دستخط نہیں ہوئے۔'' مگر سہیل بن عمرو نے بیٹے کی واپسی پر اصرار کیا۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں واپس جانے کا حکم دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو بے چین ہو کر بولے: ''یارسول اللہ! کیا ہم حق پر اور ہمارا دشمن باطل پر نہیں۔ پھر کیوں ہم اپنے دین کے معاملے میں سر نیچا کریں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمر! اللہ میرا مددگار ہے۔'' آخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندل رضی اللہ عنہ کو تسلی دے کر رخصت کیا۔

اب صلح نامہ پر دستخط ہو گئے اور آپ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ اپنے جانوروں کو قربان کر کے اور سر منڈوا کر احرام کھول دیں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ ①

کچھ مدت بعد ایک صحابی ابوبصیر رضی اللہ عنہ قریش کے چنگل سے فرار ہو گئے۔ ابوجندل رضی اللہ عنہ اور اسی طرح مکہ کے کچھ دیگر مظلوم بھی ان سے جا ملے۔ انہوں نے مدینہ اور مکہ کے مابین معاہدے کے باعث مدینہ کو محفوظ نہ سمجھا اور سمندر کے کنارے تجارتی راستے پر قبضہ کر کے قریش کی ناک میں دم کر دیا۔ آخر خود قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کر کے یہ شق ختم کرائی جس کے بعد ابوجندل رضی اللہ عنہ اور ان کے تمام ساتھی ساحلی مورچہ چھوڑ کر مدینہ منورہ آگئے۔ ②

عمرۂ قضا:

سن ۷ ہجری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش سے گزشتہ سال کیے گئے معاہدے کے مطابق عمرہ قضا کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ قریش نے کوئی رکاوٹ نہ ڈالی اور خود اپنے گھروں کو تالے لگا کر کوہِ قُعَیقِعان پر چلے گئے، وہاں سے وہ مسجد الحرام میں مسلمانوں کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھ رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی چستی اور تندرستی کا اظہار کرنے کے لیے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ وہ طواف کے ابتدائی تین چکروں میں تیزی سے چلیں۔ قریش جو گمان کر رہے تھے کہ مسلمان مدینہ جا کر بیمار رہنے لگے ہیں، یہ دیکھ کر بولے: ''یہ لوگ تو زیادہ چاق و چوبند ہو گئے ہیں۔'' عمرے کے مناسک ادا کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن مکہ میں قیام فرمایا اور پھر مدینہ واپس تشریف لے آئے۔ ③

❀❀❀

---

① الکامل فی التاریخ سنۃ ٦ھ

② البدایہ والنہایہ: ٥ ص ٢٣٣۔ دار ہجر؛ الکامل فی التاریخ: ٢/٨٦۔ البتہ ابوبصیر رضی اللہ عنہ اس سے قبل وفات پا گئے تھے۔

③ صحیح البخاری، ح: ٤٢٥٥، باب عمرۃ القضاء، کتاب المغازی

یہود سے جنگیں

یہود صدیوں سے جزیرۃ العرب خصوصاً مدینہ منورہ اور اس کے آس پاس آباد تھے۔ وہ معیشت میں عربوں پر غالب تھے۔ اگرچہ وہ عقیدۂ توحید و رسالت اور آسمانی کتب پر ایمان کے ساتھ ساتھ کئی شرعی احکام میں بھی مشرکین کی بہ نسبت مسلمانوں سے قریب تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے اُن کا کردار مسلمانوں اور قریش مکہ کے معاملے میں غیر جانب دارانہ رہا تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے ان کے مفادات کو سخت زک پہنچی تھی کیوں کہ وہ اس سے پہلے اَوس اور خزرج کے مقابلے میں ایک مضبوط قوت مانے جاتے رہے مگر جب یہ دونوں قبائل مشرف بہ اسلام ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پرچم تلے یکجا ہو گئے تو یہود خائف ہوئے کہ اب ہمیں دب کر رہنا پڑے گا چنانچہ وہ مسلمانوں کے مخالف ہو گئے۔

جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے علم کا تعلق ہے، یہودیوں سے زیادہ آپ کی صفات اور علامات سے کوئی اور قوم واقف نہیں تھی مگر ان کا خاندانی گھمنڈ اور نسلی غرور انہیں اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ نسلِ اسرائیلی کے سوا کسی اور قوم کے نبی پر ایمان لائیں۔ ان کے اسی حسد اور تکبر نے انہیں اسلام دشمنی پر ابھارا اور اسی بناء پر ان سے چار جنگیں ہوئیں:

❶ غزوہ بنوقینقاع ❷ غزوہ بنونضیر ❸ غزوہ بنوقریظہ ❹ غزوہ خیبر

غزوہ بنوقینقاع

یہ شوال سنہ ۲ ہجری میں بدر کی فتح کے فوراً بعد پیش آیا تھا۔ بدر میں مسلمانوں کی فتح نے مدینہ کے یہودیوں کو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتحاد کا معاہدہ کر چکے تھے، حسد میں مبتلا کر دیا۔ سب سے پہلے ''بنوقینقاع'' کے یہودیوں نے جو سنار اور صنعتکار ہونے کی وجہ سے بڑے دولت مند تھے، غزوۂ بدر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد شکنی کرتے ہوئے قریش مکہ سے ساز باز کرنے اور ان کا اتحادی بننے میں بھی کوئی باک محسوس نہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی غداری کا پتا چلا تو بذاتِ خود اُن کے محلے میں تشریف لے گئے جو مدینہ کے محلوں سے ملا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جمع کر کے اسلام کے خلاف گٹھ جوڑ سے باز رہنے کی تلقین کی اور اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دی، جس کا انہوں نے اہانت آمیز جواب دیا، وہ بولے: ''ابھی آپ کا واسطہ مکہ کی اناڑی فوج سے پڑا ہے، ہم سے نہیں۔''

اُن کا رویہ اعلانِ جنگ کے مترادف تھا۔ چند دنوں بعد بنوقینقاع کے یہودیوں نے اپنے صرافہ بازار میں زیور بنوانے کے لیے آنے والی ایک مسلمان خاتون کو بے لباس کرنے کی کوشش کی، کسی مسلمان نے یہ منظر دیکھ لیا اور ایک بدمعاش یہودی کو موقع پر قتل کر دیا، باقی یہودی قلعہ بند ہو گئے۔ مسلمان عورت کی عزت پر ہاتھ ڈال کر وہ کسی رعایت کے حق دار نہیں رہے، لہٰذا جنگ ناگزیر تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ناپاک حرکت کی خبر سنتے ہی فوج مرتب کی اور ان کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ اسلام کی تاریخ کی پہلی جنگ تھی، جس میں قلعہ بند دشمن کا سامنا تھا۔ پندرہ دن تک

محصور رہنے کے بعد بنوقینقاع نے ہار مان لی۔ انہیں سزا کے طور پر جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ شوال سن ۲ ہجری کا واقعہ ہے۔ یہ لوگ مدینہ سے نکل کر شام کے سرحدی علاقے ''اَذْرُعات'' میں جا بسے۔ ①

غزوۂ بنونضیر

یہ غزوہ جنگِ اُحد کے چند ماہ بعد ربیع الاوّل ۴ ہجری میں پیش آیا۔ میثاقِ مدینہ کی رو سے یہودیوں کو اُحد کی لڑائی میں مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیے تھا مگر انہوں نے غیر جانب دار رہ کر معاہدے کی کھلی خلاف ورزی کی تھی۔ بنونضیر کا رئیس سُلَّام بن مِشکَم قریش مکہ سے ساز باز کرتا رہا تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تحمل سے کام لیتے رہے، تاہم یہودی باز نہ آئے۔ انہوں نے ایک بار حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی مقدمے کے سلسلے میں اپنے ہاں بلایا اور گفتگو کے دوران آپ کو قتل کردینے کی سازش کی۔ راز فاش ہوجانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آناً فاناً صحابہ کرام کو طلب کیا اور بنونضیر کے قلعوں کا محاصرہ کرلیا۔ آخر بنونضیر نے ہتھیار ڈال دیے۔ انہیں جلاوطنی کی سزا دی گئی، ان میں سے کچھ نے مدینہ کے شمال مشرق میں نوّے میل دور واقع ''خیبر'' کا رخ کیا اور کچھ شام کی سرحدوں کی طرف چلے گئے۔ ②

غزوۂ بنوقریظہ:

یہ غزوہ جنگِ خندق کے فوراً بعد ذوالقعدہ ۵ ہجری میں پیش آیا تھا۔ بنوقریظہ کے یہودیوں کے قلعے مدینہ منورہ سے متصل تھے۔ ان لوگوں نے جنگِ خندق کے دوران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے غداری کی اور میثاقِ مدینہ کی دھجیاں اڑاتے ہوئے حملہ آور لشکر سے ساز باز کرلی۔ یوں ریاستِ مدینہ کی سلامتی داؤ پر لگ گئی۔

جنگِ خندق سے فارغ ہوتے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوقریظہ کے قلعوں کا محاصرہ کرلیا۔ جب یہودی دفاع سے عاجز آگئے تو انہوں نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنے بارے میں ہر فیصلے کا اختیار دیتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔ حضرت سعد بن معاذ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ سنایا کہ ان کے تمام جنگجوؤں کو قتل کردیا جائے۔ چنانچہ زمین بنوقریظہ کے غدار یہودیوں کے وجود سے پاک ہوگئی۔ ③

غزوۂ خیبر:

خیبر مدینہ کے شمال میں نوّے میل (۱۶۵ کلومیٹر) دور یہودیوں کے درجنوں قلعوں پر مشتمل ایک وسیع آبادی تھی جہاں کے یہودی زراعت پیشہ تھے۔ وہ مال دار اور لڑنے بھڑنے میں طاق تھے اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ مدینہ سے جلاوطن ہونے والے بنونضیر اور بنوقینقاع کے بہت سے فسادی لوگ بھی یہاں آکر ان سازشوں میں شریک ہوگئے تھے۔ اس طرح خیبر جزیرۃ العرب میں یہودیوں کی طاقت کا سب سے بڑا مرکز بن گیا،

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲ھ

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴ھ

③ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۵ھ

جس کے قلعوں میں بیس ہزار مسلح افراد موجود تھے۔ غزوۂ خندق میں اتحادیوں کو مدینہ پر حملے کے لیے ابھارنے والے یہی یہودی تھے۔ ① آخر کار ان کی گوشمالی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محرم سن ۷ ہجری کے اواخر میں چودہ سو صحابہ کرام کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ کر دیا۔ اس غزوہ میں وہی صحابہ آپ کے ہم رکاب تھے جو صلح حدیبیہ کے سفر میں ساتھ تھے۔ ②

یہودی اگرچہ گرد و پیش سے بہت چوکنا رہتے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم راتوں رات سفر کرتے ہوئے اتنی خاموشی سے وہاں جا پہنچے کہ انہیں کچھ پتا نہ چلا۔ یہ صبح صادق کا وقت تھا، جب آپ نے خیبر کے قلعوں کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ بے خبر یہودی معمول کے مطابق کھیتی باڑی کے اوزار تھامے اپنے باغوں کی طرف نکلے مگر جب لشکر پر نظر پڑی تو ٹھٹک گئے اور آناً فاناً سارا معاملہ سمجھ کر الٹے قدموں اپنے قلعے میں گھس گئے۔ بستی میں شور مچ گیا ''محمد لشکر لے کر آ گئے''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری کی مہلت دیے بغیر قلعوں کا محاصرہ شروع کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے قلعے آسانی سے فتح ہو گئے، البتہ ''قموص'' نامی قلعہ دو دن متواتر لڑائی کے باوجود سرنگوں نہ ہو سکا۔ آخر کار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو فرمایا:

''کل میں پرچم اسے دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کا محبوب ہوگا۔''

اگلی صبح سب منتظر تھے کہ یہ سعادت کسے نصیب ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا ان کی آنکھیں دکھ رہی تھیں، آپ نے لعاب دہن لگایا تو آنکھیں بالکل ٹھیک ہو گئیں۔ آپ نے پرچم ان کے حوالے کر کے خصوصی ہدایات دیں اور حملے کا حکم دیا۔ اس دن زبردست جنگ ہوئی۔ قموص کا نامور یہودی پہلوان مَرْحَب کسی سے زیر نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عامر بن اکوع رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے کے لیے نکلے مگر شہید ہو گئے۔ مَرْحَب مسلسل مسلمانوں کو للکار رہا تھا، آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ خود اس کی طرف لپکے۔ اور اس زور کا وار کیا کہ اس کا سر دو ٹکڑے ہو گیا۔

''قموص'' کے بعد صعب اور قلہ جیسے قلعے بھی مسخر ہو گئے۔ آخر میں یہودی ہر طرف سے سمٹ کر ''وَطیح'' اور ''سلالم'' نامی دو قلعوں میں محصور ہو گئے۔ چودہ دن کے محاصرے کے بعد انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کی جان بخشی کر دی جائے، وہ خیبر چھوڑ جائیں گے۔ آپ نے یہ درخواست منظور فرمالی اور یوں پورا خیبر اپنی زرخیز زمینوں، کھیتوں اور باغات سمیت مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ ③

وادی القریٰ کی فتح:

خیبر کے جنوب مشرق میں، مدینہ سے دو تین منازل دور ''فدک'' ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا، یہاں کے یہودیوں نے لڑے بغیر جاں بخشی کی شرط پر ہتھیار ڈال دیے اور جلاوطنی قبول کر لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شمال کی طرف مزید پیش قدمی کی اور یہود کی ایک اور آبادی وادی القریٰ تک پہنچے جو عرب کی آخری بستی شمار ہوتی تھی اور اس سے آگے شام کا علاقہ مانا جاتا تھا۔ یہاں بھی یہودیوں کو شکست ہوئی اور یہ تمام علاقہ مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ ④

---

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۹۰ تا ۹۴ ② السیرة الحلبیة: ۳/۴۵
③ البدایہ والنہایة: سنہ ۷ھ ④ البدایہ والنہایة: سنہ ۷ھ

فتح مکہ

خیبر کی فتح کے بعد قریش اپنے حلیف یہودیوں کی مدد سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے تھے جبکہ مسلمان جزیرۃ العرب کی سب سے بڑی طاقت بن کر نمایاں ہو گئے تھے۔ تاہم حدیبیہ کا معاہدہ مکہ پر مسلمانوں کے حملے کے راستے میں رکاوٹ تھا۔ مگر کچھ دنوں بعد قریش کی اپنی ایک غلطی سے یہ معاہدہ بھی سبوتاژ ہو گیا۔

قریش کی عہد شکنی:

ہوا یہ کہ صلح حدیبیہ میں شامل قریش کے اتحادی قبیلے بنوبکر نے ریاست مدینہ کے اتحادی قبیلے بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا، حالانکہ صلح نامے میں دس سالہ جنگ بندی کی شرط طے تھی، لہٰذا ایسی کسی کارروائی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ طرہ یہ کہ قریش نے اس ناروا کارروائی میں نہ صرف بنوبکر کو ہتھیار مہیا کیے بلکہ کئی قریشی رئیس اپنے آدمیوں سمیت اس حملے میں شریک ہوئے اور بنوخزاعہ کا بیہمانہ قتل عام کیا، جب وہ پناہ لینے کے لیے حرم میں داخل ہوئے تو وہاں بھی ان کی جان بخشی نہ کی گئی۔ بنوخزاعہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ظلم وستم کی داستان سنائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تمہاری مدد ضرور کی جائے گی۔''

کسی حتمی کارروائی سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے پاس قاصد بھیج کر مطالبہ کیا کہ بنوخزاعہ کے مقتولین کا خون بہا ادا کریں یا ان پر حملہ کرنے والوں سے لاتعلقی کا اعلان کریں۔ اگر ان میں سے کوئی بات بھی منظور نہ ہو تو پھر حدیبیہ کا معاہدہ ختم کرنے کا اعلان کریں۔ قریش نے غرور میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو جواب دیا کہ انہیں معاہدہ ختم کر دینا منظور ہے۔ جب قاصد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا تب قریش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے فوراً معاہدے کی تجدید کرانے کی کوشش کی مگر اب مسلمان اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ ①

لشکرِ اسلام کی مکہ روانگی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سرعت سے جنگ کی تیاری شروع کر دی اور دس ہزار سرفروشوں کے لشکر جرار کے ساتھ ۱۰ رمضان المبارک سن ۸ ہجری کو مدینے سے کوچ کیا اور دو ہفتوں کی مسافت صرف ایک ہفتے میں طے کر لی، لشکر کی نقل وحرکت اتنی خاموش اور تیز تھی کہ قریش کو آخر تک پتا نہ چلا۔ ②

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے قریب ''مرالظہران'' پہنچ کر پڑاؤ ڈالا، تب قریش کو ہوش آیا اور وہ مکہ کے دروازے پر اتنی بڑی فوج کا اجتماع دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے۔ ابوسفیان بن حرب جو قریش کے سب سے جری اور نامور سردار تھے، دو ساتھیوں کے ہمراہ لشکرِ اسلام کا جائزہ لینے کے لیے نکلے اور گرفتار ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعوتِ اسلام دی اور

① سیرت ابن ھشام: ۲ ص: ۳۹۶ تا ۳۹۷

② البدایہ والنہایہ: ۶ ص: ۵۲۷

اور فرمایا: ''ابوسفیان! کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

ابوسفیان بولے: ''میں سمجھ گیا ہوں کہ اگر اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو آج میرے کام ضرور آتا۔''

یہ کہہ کر وہ اسلام لے آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اعزاز دینے کے لیے فرمایا:

''جو شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے وہ مامون ہے، جو حرم شریف میں پناہ لے وہ بھی مامون ہے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ بھی مامون ہے۔''①

مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخلہ:

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو دنیا کے دوسرے کسی فاتح کی طرح سرشاری اور فخر کی کیفیت کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک اللہ کے حضور میں عجز ونیاز اور تشکر کے باعث اونٹنی کے پالان سے لگا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے حرم میں تشریف لائے اور سواری پر ہی اس کا طواف کیا۔ آپ کے ہاتھ مبارک میں ایک چھڑی تھی، طواف کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے صحن میں نصب بتوں کی طرف چھڑی سے اشارہ کرتے گئے اور بت زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ آپ کی زبانِ مبارک پر یہ آیات تھیں:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

(حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹنے کے لیے ہی ہے)②

اس کے بعد کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے چابیاں لے کر کعبہ کا دروازہ کھلوایا۔ اندر دیواروں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور فرشتوں کی تصاویر نظر آئیں جو مشرکین نے بنا رکھی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صحابہ نے تصاویر کو مٹا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کے اندر نماز ادا فرمائی۔ قریش کے لوگ کعبہ کے صحن میں جمع ہو چکے تھے۔ آپ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ان سے مخاطب ہوئے:

''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی اور تمام لشکروں کو تنہا شکست دے دی۔ آج زمانہ جاہلیت کا ہر فخر اور خونریزی میرے قدموں تلے ہے۔ قریش کے لوگو! اللہ نے تمہارے جاہلیت پر مبنی غرور کو توڑ دیا۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔''

مختصر سے خطبے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے سرداروں سے دریافت کیا: ''بتاؤ، آج میں تم سے کیا سلوک کروں؟'' سردارانِ قریش کو اپنا ایک ایک جرم یاد تھا مگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رحم کی اُمید کر سکتے تھے، وہ التجا کے انداز میں بولے: ''بھلائی کا سلوک فرمائیے۔ آپ ایک مہربان بھائی اور مہربان بھائی کے فرزند ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی کشادہ دلی سے فرمایا: ''جاؤ! تم سب آزاد ہو۔''③

① تاریخ الاسلام للذهبی: ۱ ص ۵۴۲ تا ۵۴۱ ۔ دار الکتاب

② سورۂ بنی اسرائیل: آیت: ۸۱

③ سیرۃ ابن ہشام: ۲/ ۴۰۹ تا ۴۱۲

مکہ کے نواحی بُت کدوں کا انہدام:

مکہ کی فتح کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گردونواح کی تسخیر پر توجہ دی۔ خصوصاً کفر و شرک کے قدیم مراکز کو منہدم کرنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرا بھی تاخیر نہ کی۔ آپ کے حکم سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ''نخلہ'' کے مقام پر واقع عزیٰ کے بت کدے کو تہہ و بالا کر آئے۔ ①

غزوۂ حنین

فتح مکہ کی خبر آناً فاناً پورے عرب میں پھیل گئی۔ طائف کے قریب آباد ''ہوازن'' کے لوگ جو شجاعت اور سپہ گری میں بڑے نامور تھے، دیگر قبائل کو ساتھ ملا کر مسلمانوں سے جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں اٹھارہ دن قیام فرمایا، اس دوران بنو ہوازن اور ان کے اتحادیوں کی جنگی تیاریوں کی خبریں ملنے لگی تھیں۔ مدینہ کا فتح مند لشکر اگر اس مہم سے کتراتا تو اس کے واپس جاتے ہی پانسا پلٹ جاتا۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیزی سے فوج کشی کے انتظامات مکمل کیے۔ ②

۵ شوال سن ۸ ہجری کو بارہ ہزار سپاہیوں کا لشکر جرار مکہ مکرمہ سے جنوب مشرق کی طرف روانہ ہوا۔ دس ہزار سپاہی وہی تھے جو فتح مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، جبکہ دو ہزار جنگجو اہل مکہ کے تھے۔ لشکر غیر معمولی آن بان کے ساتھ دن بھر آگے بڑھتا رہا۔ بعض مسلمانوں کو توقع تھی کہ کسی دشواری کے بغیر فتح نصیب ہو جائے گی کیوں کہ برسوں سے مسلمان کم ہوتے ہوئے بھی کئی گنا بڑے لشکروں کو شکستیں دیتے آ رہے تھے جبکہ آج تو وہ عرب کی سب سے بڑی فوج تھے۔ مگر جب دشمن سے آمنا سامنا ہوا تو مسلمان ان کے تیروں سے زخمی ہو کر تتر بتر ہونے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے خچر پر سوار برابر آگے بڑھتے رہے۔ حضرت ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ آپ کے خچر کی لگام تھامے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر یہ رجز تھا:

أنا النَّبِيُّ لَا كَذِب... أنا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِب ''میں جھوٹا نبی نہیں، میں عبدالمطلب کی اولاد ہوں۔'' ③

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انصار کو پکارا: ''اے انصاریو! اے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو!'' وہ بلند آواز اور دراز قامت تھے، ان کی آواز دور دور تک گونج گئی اور جواب میں مسلمان ''لبیک، لبیک'' کہہ کر واپس پلٹنے لگے۔ آپ نے انہیں لے کر دشمن پر جوابی حملہ کر دیا۔ مسلمان اور کفار آپس میں گڈمڈ ہو گئے، زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بنو ہوازن کی ہمت پست ہو گئی۔ ان میں سے بہت سے مارے گئے اور زیادہ تر فرار ہو گئے۔ ان کی بکریوں اور اونٹوں کے ریوڑ مسلمانوں کو مالِ غنیمت کے طور پر مل گئے۔ ④

---

① الکامل فی التاریخ: ۲ ص ۱۳۲ ② البدایہ والنہایہ: ۷ ص: ۱۱۰۱۔ دار ہجر
③ صحیح البخاری، ح: ۴۳۱۷، کتاب المغازی، باب قول اللہ: ویوم حنین اذ اعجبتکم ④ البدایہ والنہایہ: ۷ ص ۲۰ تا ۲۸

غزوہ طائف

اس کے بعد اسلامی لشکر نے پیش قدمی کر کے طائف کا محاصرہ کرلیا جو ایک فصیل بند شہر تھا۔ محاصرہ تقریباً تین ہفتوں تک جاری رہا۔ اس جنگ میں مسلمانوں نے پہلی بار منجنیق استعمال کی اور شہر پر سنگ باری کی۔ بہرکیف دشمن کی شدید مزاحمت کے باعث مسلمان فصیل کو سَر نہ کرسکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر صحابہ کرام کو واپسی کا مشورہ دیا تھا مگر وہ شہر فتح کیے بغیر لوٹنے پر تیار نہ ہوئے۔ تاہم جب جانی نقصانات بڑھ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کل ان شاء اللہ تعالیٰ واپسی ہوگی۔'' اب سب نے بخوشی تائید کی؛ کیوں کہ وہ محاصرے سے اُکتا چکے تھے۔ ①

مکہ اور اس کے گرد و نواح کی مہمات مکمل ہوئیں۔ یہ سارا علاقہ توحید کے زمزموں سے گونجنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ سے مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ ادا کیا اور پھر کسی تاخیر کے بغیر مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ مدینہ سے نکلنے سے واپس پہنچنے تک پورے سفر میں دو ماہ سولہ دن خرچ ہوئے۔ ②

اسلام کی عالمی دعوت

صلح حدیبیہ کے بعد وہ وقت آچکا تھا کہ اسلام ایک عالمگیر دین کے طور پر دنیا کے درباروں میں متعارف ہو۔ لہٰذا سنہ ۶ ھ کے اواخر اور سنہ ۷ ھ کے اوائل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف توجہ فرمائی۔ اس وقت ''صلح حدیبیہ'' کی بدولت جزیرۃ العرب کے تمام راستے مامون ہوگئے تھے اور اسلام کے قاصد اب ہر طرف جاسکتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں جزیرۃ العرب سے باہر چار بڑی سلطنتوں کے تاجداروں کو اپنے پیغام کا اوّلین مخاطب بنایا:

① روم کا قیصر ② مصر کا مقوقس ③ ایران کا کسریٰ ④ حبشہ کا نجاشی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حکمران کو اس کے مذہب و علاقائی پس منظر کے لحاظ سے الگ الگ انداز میں مخاطب کیا۔ آپ کے خطوط مختصر اور موثر تھے جن میں عجز و انکسار تھا نہ کسی قسم کا غرور و تکبر، ان میں مخاطب کے لیے خیر خواہی اور ہمدردی جھلکتی تھی۔ پتہ چلتا تھا کہ پیغام دینے والا اپنی دعوت پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہے۔ ان بڑے بڑے درباروں کی سطوت و شوکت اور عسکری و اقتصادی برتری اس کے نزدیک پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی اور وہ ان سے سب سے بلند و بالا مقام پر کھڑا ہو کر انہیں ان خطرات سے خبردار کر رہا ہے جو ان کے پست نگاہوں سے اوجھل ہیں۔

اس مراسلت کے نتائج درج ذیل ہیں:

① قیصرِ روم ہرقل نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب کو غور سے پڑھا اور دینِ اسلام کی صداقت کو اچھی طرح سمجھ لیا مگر

① جوامع السیرۃ لابن حزم، ص ۱۹۳ ؛ طبقات ابن سعد: ۲/ ۱۵۷ تا ۱۵۹
② جوامع السیرۃ لابن حزم ص: ۱۹۷، ط العلمیۃ

اپنے امراء کی بغاوت اور حکومت چھن جانے کے خوف سے مشرف بہ اسلام نہ ہوا۔

❷ شاہِ مصر مقوقس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر کی تعظیم کی اور تحائف بھیجے مگر اس نے بھی اسلام قبول نہ کیا۔

❸ ایران کے بادشاہ کسریٰ پرویز نے نامہ گرامی کی توہین کی جس کے باعث وہ اللہ کے عذاب کی زد میں آ گیا اور اس کے اپنے بیٹے شیرویہ نے اقتدار کی خاطر اسے قتل کر دیا۔

❹ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا۔ ①

❺ ان چار بڑے بادشاہوں کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۃ العرب کے کئی خود مختار حکمرانوں کے نام بھی خطوط روانہ کیے جن میں سے بحرین کے حاکم منذر بن ساویٰ، یمامہ کے حاکم ہوذۃ بن علی، عمان کے امراء عبد بن جلنداء اور جیفر بن جلنداء قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے منذر بن ساویٰ اور عمان کے دونوں امراء نے اسلام قبول کر لیا۔ ②

رومیوں سے کش مکش

بازنطینی رومی اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت سمجھے جاتے تھے۔ اسلام سے پہلے بھی وہ جزیرۃ العرب کو زیرِ نگین کرنے کی کوششیں کر چکے تھے اور اب بھی اپنے عزائم سے دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی رومیوں سے پہلی جھڑپ سنہ پانچ ہجری میں ہوئی تھی۔ ان دِنوں رومی اپنی فوجیں سرحدوں پر لا کر لوگوں کو تجارت سے روک رہے تھے جس کا مدینہ کی معیشت پر منفی اثر پڑ رہا تھا۔ لہٰذا ربیع الاول ۵ ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شمال میں دُومۃ الجَندَل کے مضافات تک یلغار کی جو شام کی سرحد پر تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار صحابہ کے ہمراہ اچانک دشمن کے سر پر جا پہنچے۔ رومی اس حملے کی خبر سنتے ہی بھاگ نکلے اور ۲۰ ربیع الآخر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ③

صلح حُدَیبیہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمانرواؤں کو دعوتِ اسلام کا سلسلہ شروع کیا تو حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شام کے سرحدی شہر بصریٰ کے حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی کے پاس بھیجا۔ شرحبیل نے تمام سفارتی اور اخلاقی ضابطوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دربارِ رسالت کے سفیر کو شہید کر دیا۔ اگر اس معاملے کو سرسری لیا جاتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ رومی مدینہ کی طرف بڑھنے میں بھی دیر نہ لگاتے۔ پس دینی حمیت اور حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ آگے بڑھ کر دشمن پر ضرب لگائی جائے۔

---

① حبشہ کے ہر بادشاہ کو نجاشی کہا جاتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پہلے نجاشی اصحمہ رحمہ اللہ تھے جنہوں نے مہاجرینِ حبشہ کو پناہ دی تھی اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے قرآن مجید کی آیات سن کر اسلام قبول کر لیا تھا اور جب ان کی وفات ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی تھی۔ اس کے بعد جو دوسرا نجاشی آیا، اسے مکتوب کے ذریعے اسلام کی دعوت دی گئی اور اس نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

② الکامل فی التاریخ: ۲ ص: ۹۱ تا ۹۵

③ المغازی للواقدی: ۱/ ۴۰۲، ۴۰۳؛ البدایۃ والنہایۃ: ۶/۲

جنگِ موتہ

آخرکار رسول اللہ ﷺ نے جمادی الاولیٰ سن ۸ ہجری میں تین ہزار مہاجرین وانصار کا لشکر مرتب فرما کر اسے شام کی سرحدوں کی طرف روانہ کر دیا۔ آپ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو لشکر کا امیر مقرر کیا جو آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام، آپ کے گھر کے ایک فرد اور آپ کے منہ بولے بیٹے رہے۔ اس وقت ان کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب قیادت سنبھالیں، وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ کو امیر بنایا جائے، وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان جسے چاہیں امیر بنالیں۔

نبی اکرم ﷺ نے لشکر کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ مجاہدین تقریباً گیارہ سو کلومیٹر کا دشوار گزار سفر کر کے رومیوں کی سرحدوں میں داخل ہوئے۔ یہاں انہیں معلوم ہوا کہ ایک لاکھ رومی ان کے مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں اور لخم، جذام اور دوسرے عیسائی عربوں کی فوجیں بھی ان سے جاملی ہیں اور ان کی تعداد بھی لگ بھگ ایک لاکھ ہے۔ اس موقع پر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی ایمانی قوت کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

> ”مسلمانو! تمہیں کیا ہوگیا، آج تم اسی چیز سے ڈر رہے ہو جس کے شوق میں گھروں سے نکلے تھے۔ تم شہادت کی تلاش میں نکلے تھے، ہم کبھی بھی تعداد، کثرت اور طاقت کی بنیاد پر نہیں لڑے۔ ہم اس دین کے بل بوتے پر لڑتے آئے ہیں جس کی وجہ سے اللہ نے ہمیں عزت بخشی۔ بس اب دو ہی باتیں ہیں اور دونوں ہی بہترین ہیں یا تو فتح ملے گی یا شہادت۔“

یہ سن کر سب کے حوصلے بلند ہوگئے۔ مسلمانوں نے اب لڑائی کے ارادے سے کوچ کیا اور جنگ کے لیے مناسب میدان تلاش کرتے ہوئے ایک گاؤں ”موتہ“ کے قریب جا کر صف بندی کی۔ یہاں دونوں لشکروں میں گھمسان کا رن پڑا، مسلمانوں کے امیر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مرکزی پرچم اٹھائے قلب لشکر میں اپنی فوج کو لڑا رہے تھے، رومیوں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا اور ان کے بہت سے سپاہی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئے۔ زید رضی اللہ عنہ آخر دم تک لڑتے رہے اور آخرکار نیزوں سے چھلنی ہو کر شہید ہو گئے۔

اسی لمحے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے پرچم سنبھال لیا اور اپنی فوج کو ہمت دلا کر نئے زور وشور سے دشمن کا مقابلہ شروع کیا، آخر دست بدست جنگ میں رومیوں نے انہیں بھی گھیر لیا۔ وہ فرار کے وسوسے سے بچنے کے لیے اپنے سرخ گھوڑے سے نیچے کود گئے۔ ساتھ ہی گھوڑے کی اگلی ٹانگیں کاٹ دیں تاکہ کوئی رومی اس پر سواری نہ کر سکے۔ وہ دائیں ہاتھ سے پرچم تھامے بائیں ہاتھ سے لڑتے رہے، دایاں بازو کٹ گیا تو انہوں نے جلدی سے پرچم بائیں ہاتھ میں اُٹھا لیا، بایاں بازو بھی کٹ گیا تو انہوں نے پرچم کو دونوں کٹے ہوئے بازوؤں کے ساتھ سینے سے چمٹا لیا اور ایک لمحے کے لئے بھی نیچے نہ گرنے دیا۔ دشمن ان پر پے در پے حملے کرتا رہا آخر تلواروں اور نیزوں کے ۹۰

زخم کھا کر وہ گر پڑے۔ یہ سب زخم سینے اور بازوؤں پر تھے۔ ایک زخم بھی پشت پر نہیں تھا۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھال لی اور فوج کو لڑانے لگے۔ ان کے چچازاد بھائی نے تھوڑا سا گوشت پیش کیا اور بولے: ''کچھ کھالو کہ کچھ توانائی آجائے۔''

انہوں نے ابھی ایک لقمہ لیا تھا کہ ایک طرف سے رومیوں کے آگے بڑھنے اور مسلمانوں کے جوابی حملے کا شور گونجا۔ انہوں نے گوشت پھینک دیا اور اپنے آپ سے بولے: ''تو دنیا میں لگا ہوا ہے اور لوگ جان کی بازی لگا رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر شمشیر بکف آگے بڑھے۔ ایک دشمن نے نیزے کا ایسا وار کیا جو سینے سے پار ہوگیا۔

اس وقت کسی غیر معمولی قائد کی ضرورت تھی جو اپنی شجاعت، تدبیر اور حکمت عملی سے پوری اسلامی فوج کو دشمن کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا سکے، اس لیے صحابہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پرچم دے دیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ صلح حدیبیہ کے بعد مکہ سے مدینہ حاضر ہو کر اسلام لائے تھے۔ وہ عرب کے مانے ہوئے سپہ سالار تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی اگلی صفوں کو پیچھے بھیج دیا اور پچھلی صفوں کو آگے لے آئے۔ دائیں بازو کو بائیں طرف اور بائیں کو دائیں جانب تعینات کر دیا۔ اس نقل و حرکت سے رومیوں پر ایک نفسیاتی رعب طاری ہوگیا۔

اب جو جنگ چھڑی تو مسلمانوں نے دشمنوں کو غیر معمولی جانی نقصان پہنچایا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بذاتِ خود اس جوش و خروش سے تلوار چلائی کہ یکے بعد دیگرے ان کی نو تلواریں ضرب کی شدت کے باعث ٹوٹ گئیں۔ آخر میں انہوں نے چوڑے پھل والی یمنی تلوار استعمال کی جو ناکارہ ہونے سے محفوظ رہی۔

رات کی تاریکی چھانے پر دونوں فوجوں نے لڑائی روک دی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس دوران مسلمانوں کی کچھ ٹولیوں کو لشکر سے دور بھیج دیا جو صبح کے وقت بہت بلند آواز سے تکبیر کے نعرے لگاتی ہوئیں لشکر میں شامل ہوئیں۔ اس سے رومیوں کو یہ محسوس ہوا کہ مسلمانوں کو کمک مل رہی ہے۔ اسی لیے وہ پیچھے ہٹ گئے اور انہوں نے جنگ جاری رکھنا نقصان دہ سمجھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھی مدینہ کی طرف کوچ کر دیا۔ پیچھے رومی اس خدشے میں مبتلا رہے کہ یہ مسلمانوں کی کوئی جنگی چال ہے۔ انہوں نے پیچھا کرنے کی ہمت نہ کی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لڑائی کی ساری اطلاعات دی جارہی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پرنم آنکھوں سے صحابہ کو حضرت زید، حضرت جعفر اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر دی اور پھر فرمایا:

''اب لشکر کا پرچم، اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے سنبھال لیا ہے جس کے ہاتھ پر اللہ نے فتح دی ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے۔ اس دن سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ''سیف اللہ'' (اللہ کی تلوار) کہا جانے لگا۔ ①

① صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ مؤتہ؛ السیرۃ الحلبیۃ: ۹۷/۳، ۹۸؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳۱۲/۶ تا ۳۲۰

غزوۂ تبوک

موتہ کی جنگ کے بعد رومی کسی بھی لمحہ چین سے نہیں بیٹھے اور جزیرۃ العرب پر حملے کی پیش بندیاں کرتے رہے تھے۔ سن ۹ ہجری کے وسط میں ان کی تیاری مکمل ہوگئی اور ان کا ہراول دستہ پیش قدمی کرکے "بلقاء" تک پہنچ گیا۔ ①

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں یہ ساری خبریں مل رہی تھیں۔ ہر آن حملے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ②

آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ مسلمان خود شام کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی کریں گے تاکہ دشمن پر نفسیاتی رعب طاری ہوجائے اور اپنا علاقہ جنگ کی زد میں نہ آئے۔ یہ انتہائی گرمی کے دن تھے، دوسرے کھجوروں کے پکنے کا زمانہ تھا۔ مدینہ میں اکثر صحابہ کی معاش اسی باغبانی پر منحصر تھی، ایسے وقت میں باغوں کو چھوڑ کر جانا فصل کو ضائع کرنے اور پورے سال کی آمدن سے محروم ہونے کے مترادف تھا۔ اس کے باوجود روانگی کا فیصلہ اٹل تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں صحابہ کرام کو جمع کرکے انہیں جہاد کے لیے صدقہ وخیرات کرنے کی ترغیب دی۔ شمع رسالت کے پروانوں نے بڑھ چڑھ کر چندہ دیا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ساز وسامان سمیت تین سو اونٹ اور ایک ہزار اشرفیاں پیش کیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے سو اوقیہ چاندی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو سو اوقیہ چاندی کے علاوہ گھر کا آدھا سامان حاضر کردیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو کمال ہی کردیا، گھر میں جو کچھ تھا، سب ہی اللہ کے نام پر نثار کرڈالا۔ فقراء ومساکین بھی پیچھے نہ رہے اور اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ وخیرات کرگزرے۔ ③

یہ رجب کا مہینہ تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عمومی نیابت کے ساتھ اپنے اہل وعیال کی خبر گیری کے لیے اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو شہر کے انتظامی امور سنبھالنے کے لیے مقرر کیا اور جمعرات کے روز مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ تیس ہزار افراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے۔ مدینہ منورہ تقریباً خالی ہوگیا تھا۔ مخلص مسلمانوں میں صرف خواتین اور بچے پیچھے رہ گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں کوئی سخت عذر تھا اور وہ چاہنے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں جاسکے تھے۔ البتہ منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی اور اس کے ہم جولی پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس موقع پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ صرف تین صحابہ: مرارہ بن ربیع، ہلال بن اُمیہ اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم ایسے تھے جو کسی عذر کے بغیر پیچھے رہ گئے۔ جب مسلمان شام کی سرحدوں پر پہنچے تو رومی مرعوب ہوکر مقابلے پر نہ آئے۔ اس سے عرب نصرانی سرداروں کا رومی بادشاہت پر اعتماد ختم ہوگیا چنانچہ "ایلہ" کے حاکم "یوحنا" نے حاضر ہوکر ریاست مدینہ کی تابعداری قبول کی۔ اس طرح "جرباء" اور "اذرح" کے عمائد نے بھی آکر سر تسلیم خم کردیا اور جزیہ دینے کا وعدہ کیا۔ یوں نہ صرف پورے جزیرۃ العرب بلکہ اس سے متصل علاقوں پر بھی اسلام کی قوت وشوکت کا سکہ بیٹھ گیا۔ ④

---

① شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیۃ: ۶۶/۴ تا ۶۸؛ المغازی للواقدی: ۹۹۰/۳ ② صحیح مسلم، ح: ۳۷۶۳، باب الایلاء
③ تاریخ الاسلام للذہبی: ۲۲۸/۲، ۲۲۹ ④ تاریخ ابن خلدون: ۲ ص: ۳۶۸۔ دار الفکر بیروت؛ ابن ہشام: ۵۲۱/۲، ۵۲۲

غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے منافقوں نے حضور ﷺ کے سامنے غیر حاضری کے جھوٹے بہانے پیش کر کے اپنی عزت بچانے کی کوشش کی۔ البتہ کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم جو مخلص مسلمان تھے اور بلا عذر شرکت سے رہ گئے تھے، دلی ندامت کے ساتھ اپنے قصور کا اعتراف کیا۔ آپ ﷺ نے اللہ کے حکم کے تحت مسلمانوں کو ان سے سلام وکلام کرنے سے روک دیا، ان کے معاشرتی مقاطعے کا سلسلہ پچاس دن تک جاری رہا۔ اس دوران یہ حضرات گریہ وزاری اور توبہ واستغفار میں مشغول رہے۔ آخر سورۃ التوبہ کی آیت نازل ہوئی جس میں ان کی توبہ قبول ہونے کی بشارت دے گئی۔ حضور ﷺ اور تمام صحابہ اس دن بے حد مسرور ہوئے۔ ①

منافقین کی ریشہ دوانیاں

منافقین قبیلہ اُوس وخزرج کے وہ بدقسمت لوگ تھے جو اسلام کی روشنی کو اتنے قریب سے دیکھ کر بھی محروم تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو نفاق کے مریض تھے۔ وہ بزدلی کی وجہ سے اسلام کی کھلی دشمنی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور چالاکی و چرب زبانی کے ذریعے خود کو سچا مسلمان، اسلام کا خیر خواہ اور مسلمانوں کا ہمدرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ خزرج کا ایک سردار عبداللہ بن اُبَی بن سلول سب سے بڑا منافق تھا۔ دراصل اسلام سے قبل اُوس اور خزرج اسے اپنا مشترکہ حکمران ماننے پر آمادہ تھے، فقط رسم تاج پوشی باقی تھی کہ اسلام کا نور چمکا اور اوس وخزرج حضور ﷺ کے جانثار بن گئے۔ پس عبداللہ بن اُبَی نبی اکرم ﷺ کو اپنی بادشاہت کا منصوبہ ملیامیٹ ہونے کا ذمہ دار سمجھ کر آپ ﷺ سے نفرت کرنے لگا مگر جب مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پھیل گیا تو اس نے بادلِ نخواستہ اسلام کا اظہار کر دیا اور پسِ پردہ اسلام کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کرتا رہا، اس کے کچھ ہم خیال لوگ اس کے ساتھ رہے۔ یہ گروہ ''منافقین'' کہلایا۔

جنگِ اُحد میں فتنہ انگیزی:

منافقین کی بدکرداری سب سے پہلے شوال ۳ھ میں جنگِ اُحد کے موقع پر سامنے آئی جب اس نازک موقع پر عبداللہ اُبَی منافق نے یہ کہہ کر جنگ میں شرکت سے انکار کر دیا کہ قریش سے کھلے میدان کی جنگ خودکشی کے مترادف ہے۔ وہ یہ کہہ کر اپنے تین سو ساتھیوں سمیت واپس چلا گیا کہ ہم کیوں بے فائدہ اپنی جانیں گنوائیں۔ ②

غزوۂ مُریسیع میں منافقوں کی شرانگیزی:

منافقین کی دوسری شرانگیزی شعبان ۵ھ میں غزوہ مُریسیع (غزوہ بنو مصطلق) کے موقع پر واضح ہوئی۔ فتح کے بعد مسلمان ''مُرَیسیع'' کے چشمے کے کنارے ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک دن چشمے سے پانی بھرنے کے دوران ایک مہاجر اور انصاری میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، بات بڑھنے لگی مگر حضور ﷺ نے تشریف لا کر انہیں ٹھنڈا کر دیا۔ مگر عبداللہ

---

① تاریخ ابن خلدون: ۲ ص ۴۶۹۔ دار الفکر ② البدایہ والنہایہ: ۵ ص ۳۵۵۔ دار ھجر

غزوۂ تبوک

موتہ کی جنگ کے بعد رومی کسی بھی لمحہ چین سے نہیں بیٹھے اور جزیرۃ العرب پر حملے کی پیش بندیاں کرتے رہے تھے۔ سن ۹ ہجری کے وسط میں ان کی تیاری مکمل ہوگئی اور ان کا ہراول دستہ پیش قدمی کرکے "بلقاء" تک پہنچ گیا۔ ①

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ میں یہ ساری خبریں مل رہی تھیں۔ ہر آن حملے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ②

آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ مسلمان خود شام کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی کریں گے تاکہ دشمن پر نفسیاتی رعب طاری ہوجائے اور اپنا علاقہ جنگ کی زد میں نہ آئے۔ یہ انتہائی گرمی کے دن تھے، دوسرے کھجوروں کے پکنے کا زمانہ تھا۔ مدینہ میں اکثر صحابہ کی معاش اسی باغبانی پر منحصر تھی، ایسے وقت میں باغوں کو چھوڑ کر جانا فصل کو ضائع کرنے اور پورے سال کی آمدن سے محروم ہونے کے مترادف تھا۔ اس کے باوجود روانگی کا فیصلہ اٹل تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں صحابہ کرام کو جمع کرکے انہیں جہاد کے لیے صدقہ وخیرات کرنے کی ترغیب دی۔ شمع رسالت کے پروانوں نے بڑھ چڑھ کر چندہ دیا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ساز وسامان سمیت تین سو اونٹ اور ایک ہزار اشرفیاں پیش کیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے سو اوقیہ چاندی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دو سو اوقیہ چاندی کے علاوہ گھر کا آدھا سامان حاضر کردیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو کمال ہی کردیا، گھر میں جو کچھ تھا، سب ہی اللہ کے نام پر نثار کر ڈالا۔ فقراء ومساکین بھی پیچھے نہ رہے اور اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ وخیرات کرگزرے۔ ③

یہ رجب کا مہینہ تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عمومی نیابت کے ساتھ اپنے اہل وعیال کی خبر گیری کے لیے اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو شہر کے انتظامی امور سنبھالنے کے لیے مقرر کیا اور جمعرات کے روز مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ تیس ہزار افراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے۔ مدینہ منورہ تقریباً خالی ہوگیا تھا۔ مخلص مسلمانوں میں صرف خواتین اور بچے پیچھے رہ گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں کوئی سخت عذر تھا اور وہ چاہنے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں جاسکے تھے۔ البتہ منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی اور اس کے ہم جولی پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس موقع پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ صرف تین صحابہ: مرارہ بن ربیع، ہلال بن اُمیہ اور کعب بن مالک رضی اللہ عنہم ایسے تھے جو کسی عذر کے بغیر پیچھے رہ گئے۔ جب مسلمان شام کی سرحدوں پر پہنچے تو رومی مرعوب ہوکر مقابلے پر نہ آئے۔ اس سے عرب نصرانی سرداروں کا رومی بادشاہت پر اعتماد ختم ہوگیا چنانچہ "ایلہ" کے حاکم "یوحنا" نے حاضر ہوکر ریاست مدینہ کی تابعداری قبول کی۔ اس طرح "جرباء" اور "اذرح" کے عمائد نے بھی آکر سر تسلیم خم کردیا اور جزیہ دینے کا وعدہ کیا۔ یوں نہ صرف پورے جزیرۃ العرب بلکہ اس سے متصل علاقوں پر بھی اسلام کی قوت وشوکت کا سکہ بیٹھ گیا۔ ④

---

① شرح الزرقانی علی المواهب اللدنیة: ۳/۶۶ تا ۶۸، المغازی للواقدی: ۳/۹۹۰ ② صحیح مسلم، ح: ۳۷۶۳، باب الایلاء
③ تاریخ الاسلام للذهبی: ۲/۶۲۸، ۶۲۹ ④ تاریخ ابن خلدون: ۲ص: ۳۶۸، دار الفکر، سیرۃ ابن هشام: ۲/۵۲۱، ۵۲۲

غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے منافقوں نے حضور ﷺ کے سامنے غیر حاضری کے جھوٹے بہانے پیش کر کے اپنی عزت بچانے کی کوشش کی۔ البتہ کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم جو مخلص مسلمان تھے اور بلا عذر شرکت سے رہ گئے تھے، دلی ندامت کے ساتھ اپنے قصور کا اعتراف کیا۔ آپ ﷺ نے اللہ کے حکم کے تحت مسلمانوں کو ان سے سلام وکلام کرنے سے روک دیا، ان کے معاشرتی مقاطعے کا سلسلہ پچاس دن تک جاری رہا۔ اس دوران یہ حضرات گریہ وزاری اور توبہ واستغفار میں مشغول رہے۔ آخر سورۃ التوبہ کی آیت نازل ہوئی جس میں ان کی توبہ قبول ہونے کی بشارت دے گئی۔ حضور ﷺ اور تمام صحابہ اس دن بے حد مسرور ہوئے۔ ①

منافقین کی ریشہ دوانیاں

منافقین قبیلہ اوس وخزرج کے وہ بد قسمت لوگ تھے جو اسلام کی روشنی کو اتنے قریب سے دیکھ کر بھی محروم تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو نفاق کے مریض تھے۔ وہ بزدلی کی وجہ سے اسلام کی کھلی دشمنی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور چالاکی و چرب زبانی کے ذریعے خود کو سچا مسلمان، اسلام کا خیر خواہ اور مسلمانوں کا ہمدرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ خزرج کا ایک سردار عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول سب سے بڑا منافق تھا۔ دراصل اسلام سے قبل اوس اور خزرج اسے اپنا مشترکہ حکمران ماننے پر آمادہ تھے، فقط رسم تاج پوشی باقی تھی کہ اسلام کا نور چمکا اور اوس وخزرج حضور ﷺ کے جانثار بن گئے۔ پس عبداللہ بن اُبی نبی اکرم ﷺ کو اپنی بادشاہت کا منصوبہ ملیامیٹ ہونے کا ذمہ دار سمجھ کر آپ ﷺ سے نفرت کرنے لگا مگر جب مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پھیل گیا تو اس نے بادلِ نخواستہ اسلام کا اظہار کر دیا اور پسِ پردہ اسلام کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کرتا رہا، اس کے کچھ ہم خیال لوگ اس کے ساتھ رہے۔ یہ گروہ "منافقین" کہلایا۔

جنگِ اُحد میں فتنہ انگیزی:

منافقین کی بدکرداری سب سے پہلے شوال ۳ھ میں جنگِ اُحد کے موقع پر سامنے آئی جب اس نازک موقع پر عبداللہ ابی منافق نے یہ کہہ کر جنگ میں شرکت سے انکار کر دیا کہ قریش سے کھلے میدان کی جنگ خودکشی کے مترادف ہے۔ وہ یہ کہہ کر اپنے تین سو ساتھیوں سمیت واپس چلا گیا کہ ہم کیوں بے فائدہ اپنی جانیں گنوائیں۔ ②

غزوۂ مُریسیع میں منافقوں کی شرانگیزی:

منافقین کی دوسری شرانگیزی شعبان ۵ھ میں غزوہ مُریسیع (غزوہ بنو مصطلق) کے موقع پر واضح ہوئی۔ فتح کے بعد مسلمان "مُرَیسیع" کے چشمے کے کنارے ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک دن چشمے سے پانی بھرنے کے دوران ایک مہاجر اور انصاری میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، بات بڑھنے لگی مگر حضور ﷺ نے تشریف لا کر انہیں ٹھنڈا کر دیا۔ مگر عبداللہ

① تاریخ ابن خلدون: ۲ ص ۳۶۹۔ دار الفکر ② البدایہ والنہایہ: ۵ ص ۳۵۵۔ دار ھجر

بن اُبی نے اس واقعے کو لے کر انصار کو مہاجرین کے خلاف بھڑکانے لگا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انصار مشتعل ہو کر مہاجرین کو مدینہ سے نکال دیں۔ ایک کم سن صحابی زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس کی باتیں سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتادیں۔

جب عبداللہ بن اُبی سے پوچھ گچھ ہوئی تو اس نے قسمیں کھا کر خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ''سورۃ المنافقون'' نازل فرما کر منافقین کی حقیقت واضح فرمادی۔ ①

واقعۂ افک:

اسی سفر میں ایک رات کو کہیں پڑاؤ کے دوران حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا قضائے حاجت کے لیے قافلے سے دور چلی گئیں، وہاں ان کا ہار جو گلے میں تھا، ٹوٹ کر گر پڑا۔ وہ اسے تلاش کررہی تھیں کہ قافلے کی روانگی کا وقت ہوگیا اور لوگوں نے ان کے ہودج کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیا۔ چونکہ وہ ہلکے پھلکے بدن کی تھیں، اس لیے یہ محسوس کیے بغیر کہ وہ اپنے ہودج میں نہیں ہیں، قافلہ روانہ ہوگیا۔ جب یہ پڑاؤ کی جگہ واپس پہنچیں تو قافلے کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ اُم المؤمنین وہیں ٹھہر گئیں، خوش قسمتی سے ایک صحابی صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ پیچھے آرہے تھے۔ انہوں نے اُم المؤمنین کو اپنے اونٹ پر بٹھالیا اور خود پیدل چلتے ہوئے آپ کو لشکر تک لے آئے۔

تب عبداللہ بن اُبی کو ایک شیطانی منصوبہ سوجھا اور اس بدبخت نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ایک رات لشکر سے پیچھے رہ جانے اور صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کے ساتھ واپس آنے کو خانۂ نبوت کی توہین کا بہانہ بنا کر الزام تراشی شروع کردی۔ یہ بات اہلِ مدینہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سخت غمگین ہوئے۔ صحابہ کرام بھی نہایت مضطرب رہے۔ آخر ایک ماہ بعد اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور کی سولہ آیات (۱۱ تا ۲۶) نازل فرما کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت صفوان رضی اللہ عنہ کی پاک دامنی کی گواہی دی اور آخر میں فرمایا:

أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ

''یہ اس تہمت سے پاک ہیں جو (ان کے بارے میں منافق) لوگ کہہ رہے ہیں۔'' ②

اس طرح منافقوں کی ناپاک سازش ناکام ہوگئی۔ ③

غزوۂ خندق میں منافقوں کا کردار:

غزوۂ خندق میں منافقین اپنی ساکھ بچانے کے لیے بادلِ نخواستہ ساتھ تھے مگر موقع ملتے ہی گھر محفوظ نہ ہونے کا بہانہ بنا کر کھسک جاتے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فتوحات کی بشارتیں سن کر پس پشت انہیں جھٹلاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہاں جان کے لالے پڑے ہیں مگر ہمیں مشرق ومغرب کی فتوحات کے مژدے سنائے جارہے تھے۔ ④

① سیرۃ ابن ہشام: ۲ص ۲۹۰ تا ۲۹۲ ② سورۃ النور، آیت: ۲۶

③ صحیح البخاری، ح: ۲۶۶۱، باب تعدیل النساء؛ سیرۃ ابن ہشام: ۲/۲۹۷ تا ۳۰۷؛ تفسیر ابن کثیر، سورۃ النور، آیت: ۲۶۳

غزوہ تبوک میں بھی منافقین غداری کے مرتکب ہوئے۔ وہ خود بھی اس شدت کی گرمی میں سفر کرنے سے جی چرا رہے تھے اور دوسروں کو بھی روک رہے تھے۔ ①

غزوہ تبوک کے موقع پر سورۃ التوبہ کی آیات نے منافقین کی رسوائی میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور ان کی مکاریوں، سازشوں اور شرانگیزیوں کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا۔ انہی دنوں منافقین نے مدینہ منورہ کے مضافات میں ایک مسجد تعمیر کی تھی جو دراصل مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے اور ان کی جڑیں کاٹنے کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتی۔ منافقین نے اس مرکز کو "سرکاری" حیثیت دینے کے لیے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ آپ یہاں تشریف لا کر نماز ادا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے وعدہ فرما لیا تھا کہ تبوک سے واپس آ کر وہاں نماز پڑھیں گے مگر سورۃ التوبہ کی آیت ۱۰۷ نے اس مسجد کی حقیقت بھی کھول دی اور اسے "مسجدِ ضرار" سے تعبیر کیا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے تبوک سے واپسی پر صحابہ کرام کو بھیج کر اس نام نہاد مسجد کو نذرِ آتش کرا دیا۔ عبداللہ بن اُبی بدبخت انہی دنوں مر گیا اور مسلمانوں کو اس کے شر سے نجات مل گئی۔ ②

❁❁❁

فریضۂ حج کی ادائیگی

۹ ہجری میں حج کی فرضیت کا حکم نازل ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے بڑے اہتمام سے ذوالقعدہ سن ۹ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر بنا کر تین سو حاجیوں کا قافلہ مکہ معظمہ روانہ فرمایا۔ اس سال مشرکین اپنے معمول کے مطابق مناسک حج میں شریک تھے۔ اس حج میں نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات کے مطابق، یہ اعلامیہ دے کر بھیجا:

"آج کے بعد کسی مشرک کو حج کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ کوئی شخص برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گا، جن قبائل کا رسول اللہ سے کسی مخصوص مدت تک کا معاہدہ تھا وہ اپنی مدت تک باقی ہے، باقی لوگوں کو صرف چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان سے کوئی معاہدہ نہیں رہے گا۔"

یہ اعلامیہ میدانِ عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو پورے عرب سے آئے ہوئے حاجیوں کو سنایا گیا جن مین مسلم بھی تھے اور مشرک بھی۔ اس ترتیب کے ذریعے بیت اللہ اور حرم پاک سے مشرکین اور شرکیہ رسومات کا تعلق جو زمانہ دراز سے چلا آ رہا تھا، ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ قرآنِ مجید نے اس حج کو "حجِ اکبر" کا نام اس لیے دیا کہ صدیوں بعد کعبہ، حرم اور مناسک حج کو اپنی اصل اور پاکیزہ شکل وصورت واپس مل گئی تھی۔ ③

---

① تفسیر ابن کثیر: سورۃ التوبۃ
② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۹ ھ ③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۹ ھ، البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۹ ھ

حجۃ الوداع: ذوالقعدہ سن ۱۰ ہجری میں حضورِ اکرم ﷺ نے حج کی تیاری فرمائی اور آپ ﷺ کے ساتھ یہ سعادت حاصل کرنے کے لیے مسلمان پروانہ وار اُمنڈ پڑے۔ ۴ ذی الحجہ کو رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ جمعہ، ۹ ذی الحجہ کو حضورِ اقدس ﷺ نے حج کا رکنِ اعظم وقوفِ عرفہ ادا فرمایا۔ اس دوران میدانِ عرفات میں لگ بھگ ایک لاکھ صحابہ کرام کے عظیم مجمعے کے سامنے ایک تاریخی خطبہ دیا، جس میں باہمی معاملات، اخلاقِ حسنہ، حقوق العباد اور سیاست اسلامی کے حوالے سے اُمتِ مسلمہ کے لیے نہایت اہم نصیحتیں تھیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول اور کائنات کے سب سے برگزیدہ رہنما کی طرف سے انسانوں کے لیے ایک وصیت نامہ تھا، جس کے ہر ہر فقرے میں دنیا و آخرت کی کامیابی کے اصول سمو دیے گئے تھے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! میری باتیں غور سے سنو! شاید اس کے بعد تم سے اس طرح ملاقات نہ ہو۔ لوگو! تمہاری جانیں، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں، ایک دوسرے کے لیے اسی طرح قابلِ احترام ہیں جیسے یہ دن اور یہ مہینہ محترم ہے۔ تم عنقریب اپنے رب کے سامنے پیش ہوگے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت پوچھ گچھ کرے گا۔

لوگو! شیطان اس بات سے تو مایوس ہوگیا کہ تمہاری سرزمین میں کبھی اس کی عبادت کی جائے گی مگر وہ اس پر بھی مطمئن ہے کہ تم چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اس کی پیروی کرتے رہو، پس اپنے دین کے معاملات میں شیطان کی پیروی سے بچو۔ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم انہیں مضبوطی سے تھامے رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے: ایک اللہ کی کتاب قرآن مجید اور دوسری میری سنت۔

لوگو! تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔ ان سے اچھا سلوک کیا کرو، بے شک وہ تمہارے ماتحت ہیں، تم نے انہیں اللہ کے نام پر اپنے لیے حلال کیا ہے۔

لوگو! یاد رکھو، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے مال میں سے کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے لے۔"

لوگوں کو اتحاد، یکجہتی اور اپنے سربراہ کی اطاعت کی تلقین کرتے ہوئے آپ ﷺ نے بڑی تاکید کے ساتھ فرمایا:

"اگر کسی نکٹے، سیاہ رنگ غلام کو بھی تمہارا حاکم مقرر کردیا جائے جو تمہیں کتاب اللہ اور سنت کے مطابق لے کر چلے تو تم اس کی بات سنتے اور مانتے رہنا۔"

آپ ﷺ نے اُمت کو انتشار اور خانہ جنگی کے خطرات سے خبردار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"دیکھو کہیں میرے بعد گمراہ مت ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔"①

---

① البدایہ والنہایہ: سنۃ ۱۰ ھ دار ہجر

خطبے کے اختتام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کو تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

''جو موجود ہیں، وہ ان لوگوں تک یہ باتیں پہنچا دیں جو یہاں نہیں۔ بعض اوقات براہ راست سننے والے کی بہ نسبت وہ آدمی بات کو زیادہ محفوظ رکھتا ہے جسے بات کسی ذریعے سے پہنچائی گئی ہو۔'' ①

اپنی بات مکمل کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری اُمت کے اس نمائندہ اجتماع سے دریافت فرمایا:

''تم سے قیامت کے دن میرے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟''

مجمعے نے بیک زبان کہا:

''ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے رب کا پیغام پہنچا دیا، اپنا فرض پورا کر دیا اور ہماری خیر خواہی کا حق ادا فرما دیا۔''

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشت مبارک آسمان کی طرف بلند کی اور عرض کیا: ''اے اللہ! تو گواہ رہنا۔'' ②

اس دوران قرآنِ مجید کی آخری آیت نازل ہوئی، جس میں شریعت کی تکمیل کی خوشخبری کے ساتھ قیامت تک اللہ کے نزدیک صرف اسلام کے پسندیدہ دین ہونے کے فیصلے پر مہر توثیق ثبت کر دی گئی۔ ارشاد ہوا:

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہاری شریعت کو کامل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی، اور اسلام کو تمہارے لیے دین کے طور پر پسند کر لیا۔'' ③

سفرِ آخرت

حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کا اشتیاق غالب محسوس ہونے لگا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم معمول سے زیادہ استغفار اور حمد و تسبیح میں مشغول رہنے لگے، گویا آپ سفرِ آخرت کی تیاری فرما رہے ہیں ماہِ صفر کے آخری ایام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سر میں شدید درد محسوس ہوا جو دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ ④

جیشِ اسامہ کی تیاری:

انہی ایام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اہتمام سے رومیوں کے خلاف ایک لشکر تیار کرانا شروع کیا اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کیا جن کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ⑤

انہی دنوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو تاکید فرمائی کہ جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہ رہنے پائیں، یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو جزیرۃ العرب کی حدود سے نکال باہر کیا جائے۔ ⑥

---

① صحیح البخاری، ح:۶۷، کتاب العلم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: رب مبلغ اوعی من سامع

② صحیح مسلم، ح:۳۰۰۹، کتاب الحج، باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم؛ سیرت ابن حبان: ۳۹۶/۱

③ تفسیر ابن کثیر، سورۃ المائدہ، آیت:۳

④ مسند احمد، ح:۲۵۹۰۸؛ السنن الکبریٰ للنسائی، ح:۷۰۳۲؛ سیرۃ ابن ہشام: ۲۴۳/۲

⑤ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۲۰۰/۷؛ طبقات ابن سعد: ۱۸۹/۲، ۱۹۰؛ سبل الہدیٰ والرشاد: ۲۴۸/۶

⑥ شرح مشکل الآثار للطحاوی: ۱۸۳/۷ تا ۱۹۲

آخری خطبہ:

حضور اکرم ﷺ نے وفات سے چند دن قبل مسجد نبوی میں صحابہ سے خطاب فرمایا جس میں یہ نصائح فرمائے:

① ''اللہ نے اپنے بندے کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہے تو دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے، چاہے تو اللہ کے پاس موجود انعامات کو اختیار کرلے، پس اس بندے نے اللہ کی نعمتوں کو پسند کرلیا ہے۔''

② ''مجھ پر سب سے زیادہ احسانات ابوبکر کے ہیں۔ اگر مجھے کسی انسان کو محبوب بنانا ہوتا تو ابوبکر ہی کو محبوب بناتا مگر ان سے رشتہ دینی بھائی بندی کا ہے۔ اچھا! مسجد میں کھلنے والے سب دروازے بند کردینا۔ صرف ابوبکر کے گھر کا دروازہ کھلا رہنے دینا۔''

③ ''گزشتہ قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا۔ خبردار! تم ایسا نہ کرنا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔''

④ انصار کے بارے میں تمہیں اچھا رویہ رکھنے کی تاکید کرتا ہوں۔ عام مسلمان بڑھتے جائیں گے اور انصار گھٹتے گھٹتے کھانے میں نمک کی مانند ہوجائیں گے۔ وہ اپنی ذمہ داری ادا کرچکے۔ اب ان کی ذمہ داری تمہیں ادا کرنی ہے۔ تمہارے ارباب حل وعقد کو چاہیے کہ انصار کے نیک وکار لوگوں کی قدردانی کرتے رہیں اور ان میں سے جو کسی خطا کے مرتکب ہوں، ان سے درگزر کریں۔''

⑤ تم میں سے ہر کسی کو مرتے وقت اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھنا چاہیے۔''[①]

واقعۂ قرطاس:

ایک طبقے کا کہنا ہے کہ حضور اکرم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنانا چاہتے تھے مگر صحابہ نے حضور اکرم ﷺ کو ایسا وصیت نامہ لکھوانے نہ دیا۔ یہ اعتراض بالکل بے جا ہے۔ اس واقعے کو (جسے حدیثِ قرطاس کہا جاتا ہے۔) ہم صحیح روایات سے آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں:

❶ وفات سے چار دن پہلے جمعرات کے دن آپ ﷺ کی بیماری نہایت شدت اختیار کرگئی۔ آپ ﷺ نے اسی حالت میں کچھ نصیحتیں لکھوانے کے لیے کاغذ طلب کیا۔[②]

❷ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر صحابہ میں اختلاف ہوگیا۔ کچھ حضرات نے حکم کی تعمیل کرنا چاہی مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر کہ آپ ﷺ پر بار بار غشی ہورہی تھی، آپ ﷺ کو زحمت سے بچانے کے لیے کچھ لکھنے لکھانے سے منع کیا اور کہا: ''رسول اللہ ﷺ شدید تکلیف میں ہیں۔ ہمارے پاس قرآن مجید موجود ہے۔ وہ ہمیں کافی ہے۔''[③]

---

① صحیح البخاری، ح: ۴۴۳۱؛ سیرت ابن ھشام: ۶۵۰/۲؛ البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ۱۱ ھ؛ طبقات ابن سعد: ۲۳۷/۲

② صحیح البخاری، ح: ۵۶۶۹، ۴۴۳۲، ۴۴۳۱، ۳۱۶۸، ۳۰۵۳، ۱۱۴، ۳۰۵۔ صحیح مسلم، ح: ۴۳۱۹، ۴۳۲۲، ۴۳۲۱

③ صحیح البخاری، ح: ۱۱۴

③ اس خیال میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکیلے نہیں تھے بلکہ بعض دیگر صحابہ بھی ان کے ساتھ یہی فرمارہے تھے۔[1]

④ بعض صحابہ کرام آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکتوب لکھوانے کا حکم بحالتِ ہوش وحواس دے رہے ہیں یا بخار کی شدت اور غشی کی حالت میں یہ الفاظ ادا ہو رہے ہیں؟ پھر انہوں نے آپس میں یہ کہا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے پوچھ لو کہ ان کی کیفیت کیا ہے؟''

صحابہ کرام کی اس گفتگو کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصائح لکھوانے پر اصرار نہ فرمایا اور مجلس برخاست کردی۔ اگر یہ وصیت کوئی رکنِ دین ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے ضرور بیان فرماتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو لکھوانا چاہتے تھے، وہ بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبانی ارشاد فرمادیا۔ چنانچہ انہی روایات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیتیں کرتے ہوئے فرمایا:

''مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا۔ اُسامہ کے لشکر کو اسی اہتمام سے روانہ کرنا جس طرح میں لشکروں کو رخصت کیا کرتا تھا۔ وفود کا ویسے ہی اعزاز و اکرام کرتے رہنا جیسا کہ میں کرتا تھا۔''[2]

⑤ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لکھوانا چاہتے تھے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی دیگر صحابہ کی طرح لکھنا مناسب نہ سمجھا تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زحمت نہ ہو۔ چنانچہ انہی ایام میں ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کاغذ قلم لانے کا حکم دیا۔

مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''آپ بیان فرمادیں۔ میں زبانی یاد کرلوں گا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں وصیت کرتا ہوں کہ نماز کا، زکوٰۃ کا اور ماتحتوں کا بہت خیال رکھنا۔''[3]

⑥ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری ایام میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت نامہ لکھوانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوبکر اور ان کے صاحبزادے کو بلالو! میں کچھ تحریر کروادوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ (ابوبکر کی موجودگی میں) اقتدار کا کوئی اور امیدوار اُٹھ کھڑا ہوجائے اور کہنے لگے: میں زیادہ حق دار ہوں۔''[4]

مگر بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں دیگر اُمور میں کتابت کی جگہ زُبانی رہنمائی پر اکتفا فرمالیا، یہاں بھی ایسا ہی کیا اور فرمایا: ''اللہ بھی اور مسلمان بھی ابوبکر کے سوا کسی کو خلیفہ نہیں بننے دیں گے۔''[5]

⑦ یہ خیال غلط ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے۔ مذکورہ واقعے کے بعد بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چار دن بقیدِ حیات رہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا فرمان لکھوانا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں ارشاد فرمادیتے۔ خاص کر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کاغذ قلم لانے کا حکم دیا تھا، تو انہی کو یہ بات لکھوا سکتے تھے۔

---

① صحیح البخاری: ۵۶۶۹، باب قول المریض: قوموا عنی؛ صحیح مسلم، ح: ۴۳۳۲

② صحیح البخاری، ح: ۳۰۵۳، ۳۱۶۸، ۴۴۳۱؛ صحیح مسلم، ح: ۴۳۱۹

③ مسند احمد، ح: ۲۶۷۲۷ باسناد صحیح لغیرہ

④ صحیح مسلم، ح: ۶۳۳۲، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ؛ مسند احمد، ح: ۲۵۱۱۳

⑤ صحیح البخاری، ح: ۷۲۱۷، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف؛ مسند ابی داود طیالسی، ح: ۱۶۱۱

سانحہ وفات:

ربیع الاوّل سنہ گیارہ ہجری بروز پیر کو حضور رحمت دو عالم ﷺ دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ مشہور قول کے مطابق یہ بارہ ربیع الاوّل کا واقعہ ہے۔ اس دن فجر کے وقت حضور ﷺ نے حجرے کا پردہ اُٹھایا، صحابہ کرام کو رب کے حضور صف بستہ کھڑے دیکھ کر تبسم فرمایا اور اپنے عشاق پر الوداعی نگاہ ڈال کر پردہ گرادیا۔

اسی دن دوپہر کو رسول اللہ ﷺ کی طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی اور غشی طاری ہونے لگی۔ سہ پہر کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کا سر مبارک گود میں رکھ کر آپ کو سہارا دیا ہوا تھا، آپ کے آس پاس اس وقت صرف اہل خانہ ہی تھے، اس دوران آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا:

-اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ

"ان لوگوں کے ساتھ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا: انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین۔"

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ سنا تو سمجھ گئیں کہ آپ ﷺ سے دنیا میں رہنے یا سفرِ آخرت اختیار کرنے کی بابت پوچھا جارہا ہے اور آپ ﷺ نے رحلت کو پسند کرلیا ہے۔ آخری لمحات میں آپ ﷺ آہستہ آہستہ یہ فرمارہے تھے:

"اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ۔" (نماز کا اہتمام کرنا..... ماتحتوں اور غلاموں کا خیال رکھنا)

اسی حالت میں آپ ﷺ پر ایک لمحے کے لیے غشی طاری ہوئی، دستِ مبارک پانی کے پیالے میں ایک طرف جھک گیا پھر ہوش آیا، آپ ﷺ نے دولت کدے کی چھت کی طرف نگاہ اُٹھائی اور فرمایا:

"اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی۔" (اے اللہ! اے سب سے عالی مرتبت رفیق!)

یہ آپ ﷺ کے آخری الفاظ تھے۔ اس کے ساتھ ہی روحِ مبارک عالم بالا کی طرف پرواز کرگئی۔ ①

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ

صحابہ کرام کی حالت:

حضورِ اکرم ﷺ کی رحلت کی خبر سن کر صحابہ کرام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مدینہ پر تاریکی کے پرت لپیٹ دیے گئے ہوں۔ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ ②

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار فرمارہی تھیں:

"یَا اَبَتَاهُ... اَجَابَ رَبًّا دَعَاهُ... یَا اَبَتَاهُ مِنْ جَنَّةِ الْفِرْدَوْسِ مَاْوَاهُ، یَا اَبَتَاهُ اِلٰی جِبْرِیْلَ نَنْعَاهُ"

(ہائے میرے ابا جی! آپ نے داعی اجل کی پکار پر لبیک کہہ دیا۔ ہائے میرے ابا۔ جنت الفردوس آپ کا ٹھکانہ ہو۔ ابا جی! ہم جبرئیل کو آپ کی وفات کا دکھڑا سناتے ہیں۔) ③

---

① السیرۃ النبویۃ لابن کثیر: ۴/۴۷۳ تا ۴۷۵

② مسند احمد، ح: ۱۲۲۳۴ ③ صحیح البخاری، ح: ۴۴۶۲، باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ گویا گویائی سلب ہوگئی ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے رہ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ہوش کھو بیٹھے اور ماننے سے انکار کردیا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت ہوگئی ہے، جسے ایسا کہتا سنتے اسے جان سے مارنے کی دھمکی دیتے۔

اس کٹھن وقت میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حوصلہ سب سے ممتاز تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سنتے ہی وہ حجرے میں داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک پر بوسہ دیا اور روتے ہوئے فرمایا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ نے بہترین زندگی گزاری اور بہترین طریقے سے رخصت ہوئے۔''①

پھر وہ مسجد میں آئے جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے درمیان کھڑے کہہ رہے تھے:

''کچھ منافق افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ اللہ کی قسم! وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب سے ملنے گئے ہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام گئے تھے...... بہت جلد وہ لوٹ آئیں گے اور اُن کے ہاتھ پاؤں کٹوادیں گے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبریں پھیلا رہے ہیں۔''②

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا خطبہ:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خاموش کرایا اور صحابہ کو مخاطب کرکے فرمایا:

''لوگو! جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو جان لے کہ وہ وفات پاگئے ہیں اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ تسلی رکھے کہ اللہ زندہ ہے، ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔''

پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۝ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝

ترجمہ: ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں) ان سے پہلے بھی تو کتنے رسول دنیا سے جا چکے ہیں، پس اگر وہ فوت ہوجائیں یا شہید کردیے جائیں، تو کیا تم دین سے منحرف ہوجاؤ گے؟ اور جو انحراف کرے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا، اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔''③

یہ آیات سن کر صحابہ کرام کو ایسا لگا کہ گویا کہ یہ آیات ابھی آسمان سے نازل ہورہی ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا جوشِ غم میں تبدیل ہوگیا، اُن کے قدم ان کا ساتھ نہ دے سکے، وہ اپنی جگہ پر گر گئے۔④

① صحیح البخاری، ح: ۳۴۵۲؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۰۲۱ باسناد صحیح
② صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۷، ۳۶۶۸
③ سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۴۴
④ صحیح البخاری، ح: ۴۴۵۴

مسئلہ خلافت کی اہمیت:

اسی شام انصار کے ڈیرے سقیفہ بنو ساعدہ میں مشاورت کے بعد صحابہ کرام نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب تسلیم کرلیا۔ (اس بیعت کی تفصیل آگے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حالات میں آئے گی۔)

خلیفہ کے تقرر کا مسئلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ جنازہ سے پہلے انجام پاجانا اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکمت کے مطابق تھا۔ ظاہر ہے کہ نمازِ جنازہ میں تاخیر ہونے سے یہ خدشہ تو ہر گز نہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر میں کوئی تغیر پیدا ہوجائے ، کیوں کہ انبیائے کرام کے جسم وفات کے بعد بھی محفوظ رہتے ہیں۔ ہاں اگر خلیفہ کا انتخاب فوراً نہ ہوتا تو کئی مسئلے کھڑے ہوجاتے۔ سب سے پہلے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی۔ اگر اس کام کو کسی قائد کی نگرانی کے بغیر انجام دیا جانے لگتا تو اوّل یہی بات تنازعے کا باعث بن جاتی کہ نمازِ جنازہ حجرے کے اندر ادا کی جائے یا کھلے میدان میں۔ اس بات پر بھی اختلاف ہوتا کہ نمازِ جنازہ کون پڑھائے؟ تدفین کہاں ہو؟ تجہیز و تکفین سے پہلے قیادت کا مسئلہ طے ہوجانے سے ہر کام امیر کے اختیار کے ساتھ خوش اسلوبی سے انجام پاگیا۔

امیر کا تقرر اس لیے بھی ضروری تھا کہ اسلام کے آغاز سے اب تک مسلمانوں پر کوئی وقت ایسا نہیں آیا تھا کہ وہ کسی امیر کے بغیر ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی رہنما اور امیر تھے۔ اب کسی امیر سے محرومی مسلمانوں کے لیے نہایت گراں تھی اور اُمت کے اکابر کو خطرہ تھا کہ اگر یہ صورتحال زیادہ دیر رہی تو اُمت کسی افتراق وانتشار کا شکار نہ ہوجائے۔ شرپسند عناصر جو منافقین کی شکل میں دورِ نبوت میں بھی سرگرم رہے، کوئی بات اُڑا کر اس مسئلے کو اختلاف بلکہ خانہ جنگی کی شکل دے سکتے تھے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کئی بار وہ ایسی مذموم کوششیں کر چکے تھے۔ ان وجوہ کی بناء پر صحابہ کرام کے پاکیزہ اذہان اس طرف متوجہ ہوئے کہ سب سے پہلے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین کا مسئلہ طے کرلیا جائے۔ یہ گمانِ ضلالت ہے کہ صحابہ کرام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اقتدار کی محبت تھی تبھی وہ تجہیز و تکفین کی بجائے خلافت کے استحقاق پر بحث کرنے لگے۔ حقیقت یہ تھی کہ انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی کی وجہ سے پیغمبر کی اُمت کو متحد رکھنے کی فکر لاحق تھی جس کے لیے ضروری تھا کہ خلافت کا منصب کسی ذمہ دار ترین شخص کو سونپ دیا جاتا۔

تجہیز و تکفین، نمازِ جنازہ اور تدفین:

مسئلہ خلافت کو حل کرنا یقیناً صحابہ کے نزدیک بہت اہمیت رکھتا تھا مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور نمازِ جنازہ میں تاخیر اس کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ دراصل سقیفہ بنو ساعدہ میں ہونے والی گفتگو یوم وفات یعنی پیر کو مغرب تا عشاء ہوئی تھی اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ میں ختم ہوگئی تھی۔ جبکہ نمازِ جنازہ اگلے دن منگل کو ادا کی گئی تھی۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور نمازِ جنازہ میں تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ پہلے دن صدمے کی انتہا کی وجہ سے شمع رسالت کے پروانے ایک سکتے کی سی کیفیت میں تھے اور اگلے دن جا کر ہوش وحواس بحال ہوئے تو حضرت عباس، حضرت علی اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم تجہیز و تکفین میں مشغول ہوگئے۔ یہ حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتے دار

تھے، اسی لیے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری خدمات انجام دینے کے زیادہ حق دار تھے۔ ①

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین ہو چکی تو نمازِ جنازہ ادا کرنے کا سوال آن کھڑا ہوا۔ چونکہ خلافت کا مسئلہ طے ہو چکا تھا، اس لیے اب ہر کام نہایت تنظیم کے ساتھ ہو رہا تھا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہر معاملے میں رہنمائی فرما رہے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا: ''نمازِ جنازہ کیسے پڑھیں؟'' تو فرمایا: ''ٹولیاں بنا کر اندر جاؤ، نماز پڑھتے رہو۔''

چنانچہ اس طرح نمازِ جنازہ ادا کی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ حجرۂ عائشہ میں ہی رہا، تھوڑے تھوڑے لوگ حجرے کے اندر جاتے اور اپنی نماز پڑھ کر باہر نکل آتے۔ نمازِ جنازہ کی امامت کوئی نہیں کرتا تھا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی وصیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے فرمایا تھا:

''پہلے میرے گھر والے میری نمازِ جنازہ ادا کریں۔ سب لوگ تنہا تنہا نمازِ جنازہ ادا کریں۔'' ②

اس حکم کے مطابق پہلے اہل بیت، پھر مردوں، پھر خواتین، پھر بچوں اور پھر غلاموں نے نمازِ جنازہ پڑھی۔ ③

چونکہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے، جبکہ حجرۂ عائشہ میں ایک وقت میں تھوڑے ہی افراد سما سکتے تھے۔ اس لیے نمازِ جنازہ کے عمل میں دوسرے دن (منگل) کا بڑا حصہ گزر گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ کہاں دفن کیا جائے؟ لوگوں نے الگ الگ تجاویز دیں اور اختلاف پیدا ہونے لگا۔ کسی نے کہا: حجرۂ شریفہ میں ہی دفن کیا جائے اور کسی نے کہا: عام مسلمانوں کے ساتھ۔ مگر سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ہر نبی کو اُسی جگہ دفن کیا جاتا ہے جہاں اس کی روح قبض کی گئی ہو۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہٹا کر، وہیں قبر کھودی گئی۔ ④

قبر تیار ہو چکی تو حضرت علی، حضرت عباس اور ان کے لڑکے قثم بن عباس رضی اللہ عنہم نے قبر میں داخل ہو کر جسدِ اطہر کو اندر اُتارا۔ ⑤ دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ اندوہ ناک دن کبھی نہیں گزرا تھا۔

❁❁❁

---

① سیرت ابن هشام: ۶۶۳/۲

② دلائل النبوة للبیهقي: ۲۳۲/۷

③ دلائل النبوة للبیهقي: ۲۵۰/۷

④ دلائل النبوة للبیهقي: ۲۶۰/۷، ط العلمیة

⑤ البدایة والنهایة، ج: ۸، ص: ۱۳۳، دار هجر

مشق

❶ ہجرتِ مدینہ کا مقصد کیا تھا؟ اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جانثاری کیسے ظاہر ہوئی؟
❷ میثاقِ مدینہ سے کیا مراد ہے؟ اس کی اہم شقیں بیان کیجئے۔
❸ جہاد کیوں شروع ہوا؟ اور کفارِ مکہ کے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے کی وجہ کیا تھی؟
❹ جنگِ بدر کو اسلام کی فتوحات کا پیش خیمہ کیوں کہا جاتا ہے؟
❺ ان تین عنوانات میں سے کسی ایک پر مفصل نوٹ لکھئے: (۱) غزوۂ اُحد (۲) غزوہ خندق (۳) صلحِ حدیبیہ
❻ غزوۂ خیبر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کیا خاص شرف حاصل ہوا؟ اپنے الفاظ میں لکھئے۔
❼ فتح مکہ کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جانی دشمنوں سے کیا سلوک کیا؟
❽ غزوۂ تبوک میں کون کون سے صحابہ پیچھے رہ گئے تھے؟ ان کی آزمائش اور توبہ کی قبولیت کا واقعہ لکھیں؟
❾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری ایام میں مسجد نبوی میں دیے گئے آخری خطبے میں کیا نصائح فرمائے؟
❿ کیا حدیثِ قرطاس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی نفی کرتی ہے؟ صحیح السند روایات سے جواب دیجئے۔

عملی کام:

❁ خطبۂ حجۃ الوداع کے تین جملے جو آپ کو بہت زیادہ پسند ہوں، خوش خط لکھ کر کسی مناسب جگہ پر آویزاں کریں۔
❁ ایسا نقشہ دیکھئے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم غزوات کے مقامات واضح ہوں۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم، از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم
❁ سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم، از حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ

❁❁❁

(یونٹ:1.6)

شمائل حمیدہ

حضور رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شمائل، خصائل اور کمالات کا احاطہ کرنا کسی بڑے سے بڑے سیرت نگار، سخن ور اور نکتہ دان کے لیے بھی ممکن نہیں۔ اس باب میں چودہ صدیوں سے لکھا جا رہا ہے اور تا قیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوبیوں کا شمار نہیں ہو سکے گا۔ یہاں ہم اس بارے میں اپنی عاجزی اور تہی دامنی کا اعتراف کرتے ہوئے، انتہائی اختصار کے ساتھ کتبِ حدیث و سیرت کی سیپیوں سے چند سچے موتی پیش کر رہے ہیں۔

حلیہ مبارکہ:

حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلیہ مبارکہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک ماہِ بدر کی طرح چمکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قد مبارک بالکل متوسط قد والے آدمی سے کسی قدر طویل تھا، لیکن زیادہ لمبے قد والے سے پست تھا، سر مبارک اعتدال کے ساتھ بڑا تھا، بال مبارک کسی قدر بل کھائے ہوئے تھے۔ اگر بسہولت مانگ نکل آتی تو نکال لیتے تھے اور اگر کسی وجہ سے بسہولت نہ نکلتی تو اس وقت نہ نکالتے (کسی دوسرے وقت جب کنگھی وغیرہ موجود ہوتی تو نکال لیتے۔) جس زمانے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بال مبارک زیادہ ہوتے تو کان کی لو سے متجاوز ہو جاتے تھے۔

رنگ مبارک چمک دار تھا اور پیشانی مبارک کشادہ تھی۔ ابرو خم دار باریک اور گنجان تھے، دونوں ابرو جدا جدا تھے۔ ملے ہوئے نہیں تھے، ان دونوں کے درمیان ایک رگ تھی جو غصہ کے وقت ابھر جاتی تھی۔

ناک مبارک بلندی مائل تھی اور اس پر ایک چمک اور نور تھا، ابتداء میں دیکھنے والا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بڑی ناک والا سمجھتا (لیکن غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا کہ حسن اور چمک کی وجہ سے بلند لگتی ہے ورنہ زیادہ بلند نہیں ہے۔)

داڑھی مبارک بھرپور اور گنجان بالوں کی تھی اور آنکھوں کی پتلی گہری سیاہ تھی۔ رخسار مبارک ہموار ہلکے تھے۔ دہن مبارک اعتدال کے ساتھ فراخ تھا (یعنی تنگ منہ نہ تھا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک باریک آبدار تھے اور ان میں سے سامنے کے دانتوں میں ذرا ذرا فصل بھی تھا۔ گردن مبارک ایسی خوبصورت اور باریک تھی، جیسا کہ مورتی کی گردن صاف اور تراشی ہوئی ہوتی ہے اور رنگ میں چاندی جیسی صاف اور خوبصورت تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب اعضاء نہایت معتدل اور پُر گوشت تھے اور بدن گٹھا ہوا تھا۔ پیٹ اور سینہ مبارک

ہموار تھا، لیکن سینہ فراخ اور چوڑا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں کاندھوں کے درمیان قدرے زیادہ فاصلہ تھا، جوڑوں کی ہڈیاں قوی اور کلاں تھیں (جو قوت کی دلیل ہوتی ہے)۔ کپڑا اتارنے کی حالت میں آپ کا بدن مبارک روشن چمک دار نظر آتا تھا، ناف اور سینہ کے درمیان ایک لکیر کی طرح سے بالوں کی باریک دھاری تھی۔ اس لکیر کے علاوہ دونوں چھاتیاں اور شکم مبارک بالوں سے خالی تھا، البتہ دونوں بازوؤں اور کندھوں اور سینہ مبارک کے بالائی حصہ پر بال تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کلائیاں دراز تھیں اور ہتھیلیاں فراخ، نیز ہتھیلیاں اور دونوں قدم گداز اور پر گوشت تھے۔ ہاتھ پاؤں کی انگلیاں تناسب کے ساتھ لمبی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلوے قدرے گہرے تھے اور قدم ہموار تھے کہ پانی ان کے صاف ستھرا ہونے اور ان کے ملائم ہونے کی وجہ سے ان پر ٹھہرتا نہیں تھا، فوراً ڈھلک جاتا تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے تو قوت سے قدم اٹھاتے اور آگے جھک کر تشریف لے جاتے، قدم زمین پر آہستہ پڑتا، زور سے نہیں پڑتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تیز رفتار تھے اور ذرا کشادہ قدم رکھتے تھے، چھوٹے چھوٹے قدم نہیں رکھتے تھے۔ جب چلتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا پستی میں اتر رہے ہیں۔ جب کسی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن سے پھر کر توجہ فرماتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر نیچی رہتی تھی۔ نگاہ بہ نسبت آسمان کے زمین کی طرف زیادہ رہتی تھی۔ عادتِ شریفہ عموماً گوشۂ چشم سے دیکھنے کی تھی (یعنی حیاء کی وجہ سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے تھے۔) چلنے میں صحابہ کو اپنے آگے کر دیتے تھے اور خود پیچھے رہ جاتے تھے، جس سے ملتے سلام کرنے میں خود ابتدا فرماتے۔''①

آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی نہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ فراخ دل، کشادہ قلب، راست گفتار، نرم طبیعت اور معاشرت و معاملات میں نہایت درجہ کریم تھے۔ جو پہلی بار آپ کو دیکھتا وہ مرعوب ہو جاتا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہتا اور جان پہچان حاصل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریفتہ اور دلدادہ ہو جاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ خیر کرنے والا کہتا ہے کہ نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی شخص دیکھا نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد۔''②

چودھویں کا چاند:

ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بہت باوقار اور شان و شوکت کے حامل تھے اور دوسروں کی نگاہ میں بھی نہایت پُرشکوہ۔ آپ کا روئے انور چودھویں رات کے چاند کی طرح دمکتا تھا۔''③

---

① شمائل الترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

② شمائل الترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

③ شمائل الترمذی، باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سب سے زیادہ حسین:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میانہ قامت تھے، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ سرخ قبا میں دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین کوئی شخصیت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔''①

بدنِ مبارک کی خوشبو:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں نے کوئی ایسا حریر یا ریشم نہیں چھوا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے زیادہ نرم ہو۔ میں نے عنبر اور مشک یا کوئی بھی ایسی چیز نہیں سونگھی جس کی خوشبو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے کی مہک سے بہتر ہو۔''②

انداز کلام:

ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت آخرت کی فکر میں اور امورِ آخرت کی سوچ میں رہتے، اس کا ایک تسلسل قائم تھا کہ کسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چین نہیں ہوتا تھا، اکثر طویل سکوت اختیار فرماتے، بلا ضرورت کلام نہ فرماتے، گفتگو کا آغاز فرماتے تو دہنِ مبارک سے اچھی طرح الفاظ ادا فرماتے، (یعنی متکبروں کی طرح بے توجہی و بے نیازی کے ساتھ ادھ کٹے الفاظ استعمال نہ فرماتے) اور اسی طرح اختتام فرماتے۔ آپ کی گفتگو اور بیان بہت صاف، واضح اور دوٹوک ہوتا، نہ اس میں غیر ضروری طوالت ہوتی نہ زیادہ اختصار۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ دُرشت خُو (بدمزاج) تھے اور نہ کسی کی اہانت پسند کرتے تھے، نعمت کی بڑی قدر کرتے اور اس کو بہت زیادہ جانتے، خواہ کتنی ہی قلیل ہو (کہ آسانی سے نظر بھی نہ آئے) اور اس کی برائی نہ فرماتے، کھانے پینے کی چیزوں کی برائی کرتے نہ تعریف۔ دنیا اور دنیا سے متعلق جو بھی چیز ہوتی اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی غصہ نہ آتا، لیکن جب اللہ کے کسی حق کو پامال کیا جاتا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلال کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہ سکتی تھی، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا بدلہ لے لیتے۔ آپ کو اپنی ذات کے لیے نہ غصہ آتا نہ اس کے لیے انتقام لیتے۔ جب اشارہ فرماتے تو پورے ہاتھ کے ساتھ اشارہ فرماتے، جب کسی امر پر تعجب فرماتے تو ہاتھ کو پلٹ دیتے، گفتگو کرتے وقت داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ملاتے، غصہ اور ناگواری کی بات ہوتی تو روئے انور اس طرف سے بالکل پھیر لیتے اور اعراض فرمالیتے، خوش ہوتے تو نظریں جھکا لیتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہنسنا زیادہ تر تبسم تھا۔

---

① شمائل الترمذی، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

② صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب طیب رائحۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جس سے صرف آپ ﷺ کے دندانِ مبارک جو بارش کے اولوں کی طرح پاک وشفاف تھے، ظاہر ہوتے۔"①

شرم وحیا اور ادب:

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"رسول اللہ ﷺ بدکلامی اور بے حیائی و بے شرمی سے دور تھے۔ بازاروں میں کبھی آواز بلند نہ فرماتے۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے، بلکہ عفو و درگزر کا معاملہ فرماتے۔"②

ہاتھ نہ اُٹھایا:

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کا بیان ہے:

"آپ ﷺ نے کسی پر کبھی دست درازی نہ فرمائی سوائے اس کے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا موقع ہو۔ کسی خادم یا عورت پر آپ ﷺ نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔"③

اللہ کی نافرمانی ناقابلِ برداشت:

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ بھی فرمایا کرتی تھیں:

"میں نے آپ ﷺ کو کسی ظلم وزیادتی کا انتقام لیتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی نہ ہو۔ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو پامال کیا جاتا تو آپ ﷺ اس کے لیے سب سے زیادہ غضب ناک ہوتے۔"④

خادم کو اُف نہ کہا:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"میں نے دس سال تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی۔ آپ نے مجھے کبھی "اُف" نہیں کہا۔ نہ کسی کام کے کرنے پر یہ کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ نہ ہی کسی کام کے چھوڑ دینے پر یہ فرمایا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا۔"⑤

اُمت کے لیے سہولت:

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"دو چیزیں سامنے ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ ہمیشہ آسان صورت کا انتخاب فرماتے، بشرطیکہ وہ ناجائز نہ ہو۔"⑥

آسانی کے انتخاب میں اُمت کی سہولت مدِنظر تھی یعنی اُمت پر کوئی مشکل چیز لازم نہ ہو جائے۔

---

① شمائل الترمذی، باب کیف کان کلام رسول اللہ ﷺ، ط احیاء التراث العربی

② شمائل الترمذی، ص ۱۹۷ ③ شمائل الترمذی، ص ۱۹۷، ط احیاء التراث العربی

④ شمائل الترمذی، ص ۱۹۸ ⑤ شمائل الترمذی، ص ۱۹۶، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ ﷺ

⑥ شمائل الترمذی، ص ۱۹۸

لوگوں سے معاملہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان کو محفوظ رکھتے اور صرف اسی چیز کے لیے کھولتے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ سروکار ہوتا۔ لوگوں کی دل داری فرماتے اور ان کو متنفر نہ کرتے، کسی قوم کا کوئی معزز شخص آتا تو اس کے ساتھ اعزاز و اکرام کا معاملہ فرماتے اور اسے اس کی قوم کا ذمہ دار بناتے۔ لوگوں کے بارے میں محتاط تبصرہ کرتے۔ انہیں اپنی بشاشت اور اخلاق سے محروم نہ فرماتے۔ اپنے اصحاب کے حالات کی برابر خبر رکھتے، لوگوں سے لوگوں کے معاملات کے بارے میں دریافت کرتے رہتے۔ اچھی بات کی اچھائی بیان کرتے اور اس کو قوت پہنچاتے، بری بات کی برائی کرتے اور اس کو کمزور کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ معتدل اور یکساں تھا، اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا تھا۔ ①''

حسنِ انتظام:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات سے غفلت نہ فرماتے تھے، اس خدشے سے کہ کہیں دوسرے لوگ بھی غافل ہونے لگیں اور اکتا جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہر حال کے مطابق ضروری بندوبست ہوتا تھا۔ نہ حق کے معاملہ میں کوتاہی فرماتے نہ حد سے آگے بڑھتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جو لوگ رہتے تھے وہ سب سے اچھے اور منتخب ہوتے تھے، آپ کی نگاہ میں سب سے زیادہ افضل وہ تھا جس کی خیر خواہی اور اخلاق عام ہو، سب سے زیادہ قدر و منزلت اس کی تھی جو غم خواری اور ہمدردی اور دوسروں کی مدد اور معاونت میں سب سے آگے ہو۔'' ②

مجلس کا حسن و جمال:

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا حسن و جمال اپنی فصیح و بلیغ عبارت میں یوں بیان فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا ذکر کرتے ہوئے کھڑے ہوتے اور اللہ کا ذکر کرتے ہوئے بیٹھتے۔ کہیں تشریف لے جاتے تو جہاں مجلس ختم ہوتی وہیں تشریف رکھتے اور اس کا حکم بھی فرماتے۔ اپنے حاضرینِ مجلس اور ہم نشینوں میں ہر شخص کو (اپنی توجہ اور التفات میں) پورا حصہ دیتے۔ آپ کا ہر شریکِ مجلس یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں کوئی اور نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی غرض سے بٹھا لیتا یا کسی ضرورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتا تو نہایت صبر و سکون سے اس کی پوری بات سنتے یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنی بات پوری کر کے رخصت ہوتا۔ اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوال کرتا اور کچھ مدد چاہتا تو بلا اس کی ضرورت پوری کیے واپس نہ فرماتے، یا کم از کم نرم و شیریں لہجہ میں جواب دیتے۔

---

① شمائل الترمذی، ص ۱۹۳، باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ط احیاء التراث العربی

② شمائل الترمذی، ص ۱۹۳، باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ط احیاء التراث العربی

آپ ﷺ کا حسنِ اخلاق تمام لوگوں کے لیے وسیع اور عام تھا اور آپ ﷺ ان کے حق میں باپ ہو گئے تھے۔ تمام لوگ حق کے معاملہ میں آپ ﷺ کی نظر میں برابر تھے۔ آپ کی مجلس علم و معرفت، حیا و شرم اور صبر و امانت داری کی مجلس تھی، نہ اس میں آوازیں بلند ہوتی تھیں، نہ کسی کے عیوب بیان کیے جاتے تھے، نہ کسی کی عزت و ناموس پر حملہ ہوتا، نہ کمزوریوں کی تشہیر کی جاتی تھی، سب ایک دوسرے کے مساوی تھے اور صرف تقویٰ کے لحاظ سے ان کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی تھی، اس میں لوگ انکساری کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کے ساتھ رحم دلی اور شفقت کا معاملہ کرتے تھے، حاجت مند کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، مسافر اور نو وارد کا خیال رکھتے تھے۔"①

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"آپ ﷺ جب گفتگو کرتے تھے تو شرکاءِ مجلس ادب سے اس طرح سر جھکا لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان سب کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں (یعنی بے حس و حرکت کہ کہیں جنبش سے چڑیاں اڑ نہ جائیں) جب آپ ﷺ خاموش ہوتے تب یہ لوگ بات کرتے، آپ ﷺ کے سامنے کبھی نزاع نہ کرتے۔ اگر آپ ﷺ کی مجلس میں کوئی شخص گفتگو کرتا تو بقیہ سب لوگ خاموشی سے سنتے یہاں تک کہ وہ اپنی بات ختم کر لیتا۔ آپ ﷺ کے سامنے ہر شخص کی گفتگو کا وہی درجہ ہوتا جو ان کے پہلے آدمی کا ہوتا۔ (کہ پورے اطمینان کے ساتھ اپنی بات کہنے کا موقع ملتا اور اسی قدردانی اور اطمینان کے ساتھ اسے سنا جاتا) جس بات سے سب لوگ ہنستے اس پر آپ بھی ہنستے، جس سے سب تعجب کا اظہار کرتے آپ بھی تعجب فرماتے، مسافر اور پردیسی کی بے تمیزی اور ہر طرح کے سوال کو صبر و تحمل کے ساتھ سنتے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے اصحاب کرام ایسے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔ (تاکہ آپ ﷺ پر کوئی بار نہ ہو) آپ ﷺ فرماتے تھے کہ "تم کسی حاجت مند کو پاؤ تو اس کی مدد کرو۔"②

انبساط اور کشادہ روئی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ ہمہ وقت کشادہ اور انبساط و بشاشت کے ساتھ رہتے تھے۔ بہت نرم اَخلاق اور نرم پہلو تھے (یعنی جلد مہربان ہو جانے والے اور بہت آسانی سے درگزر کرنے والے تھے) نہ سخت طبیعت کے مالک تھے، نہ سخت بات کہنے کے عادی، نہ چلا کر بولنے والے، نہ عامیانہ اور متبذل (گھٹیا) بات کرنے والے، نہ کسی کو عیب لگانے والے، نہ تنگ دل بخیل۔ جو چیز آپ ﷺ کو پسند نہ ہوتی اس سے تغافل فرماتے (یعنی اس کو نظر انداز کر دیتے اور گرفت نہ فرماتے) اور صاف صاف اس چیز سے مایوس بھی نہ فرماتے اور اس کا جواب بھی نہ دیتے۔"③

① شمائل الترمذی، ص ۱۹۳، باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ ﷺ، ط احیاء التراث العربی
② شمائل الترمذی، ص ۱۹۹، باب ما جاء فی خلق رسول اللہ ﷺ ③ شمائل الترمذی، ص ۱۰۹

تین چیزوں سے احتراز:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”تین باتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو بالکل بچا رکھا تھا: ایک جھگڑا، دوسرے تکبر اور تیسرے غیر ضروری اور لایعنی کام۔ لوگوں کو بھی تین باتوں سے آپ نے بچا رکھا تھا: نہ کسی کی برائی کرتے، نہ کسی کو عیب لگاتے اور نہ کسی کی کمزوریوں اور پوشیدہ باتوں کے پیچھے پڑتے۔ صرف وہ کلام فرماتے تھے جس پر ثواب کی امید ہوتی۔“①

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدح و تعریف اسی شخص کی قبول فرماتے جو حدِ اعتدال میں رہتا۔ کسی کی گفتگو کے دوران کلام نہ فرماتے اور اس کی بات کبھی نہ کاٹتے، ہاں اگر وہ حد سے بڑھنے لگتا تو اس کو منع فرما دیتے یا مجلس سے اٹھ کر اس کی بات قطع فرما دیتے۔“②

اللہ کا ذکر اور خشیت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ کرتے تھے بلکہ آپ کا ہر کلام اللہ کے ذکر اور اس کی فکر میں ہوتا تھا۔ آپ کا اُمت کو حکم کرنا، روکنا اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور اس کے احکام اور وعدہ وعید کی تفصیلات سب کی سب ذکرِ الٰہی کے قبیل سے ہیں۔ اسی طرح اُس کی بے حساب نعمتوں پر حمد و ثناء اور تسبیح و تمجید بھی ذکر اللہ تھا۔

اللہ تعالیٰ سے سوال و دعا اور خوف و خشیت بھی ذکر ہی تھا بلکہ آپ کی خاموشی تک بھی قلبی طور پر ذکرِ الٰہی پر مشتمل تھی۔ جس طرح ذکر اللہ سے رطب اللسان تھے، اسی طرح قلب و جگر بھی اس سے سرشار تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ آپ ہر آن، ہر حالت میں ذاکر و شاغل رہتے تھے اور ذکر اللہ آپ کی سانس کے ساتھ جاری و ساری رہتا۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوار ہوتے اترتے، سفر و حضر ہر وقت اور ہر حال میں آپ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے اور اس کے ذکر و فکر میں رہتے تھے۔③

حرفِ آخر:

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل کا یہ مختصر سا تذکرہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر سنت کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اسی میں دونوں جہان کی کامیابی ہے اور اس کے خلاف چلنے میں دنیا و عقبیٰ کی بربادی ہے۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید..... کہ ہر گز بمنزل نخواہد رسید

(جو بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے خلاف چلا، وہ ہر گز منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکا)

❁❁❁

---

① شمائل الترمذی، ص ۱۹۹، ۲۰۰، باب ماجاء فی خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ط احیاء التراث العربی

② شمائل الترمذی، ص ۱۹۹، ۲۰۰ ③ زاد المعاد: ۱/ ۳۶۳ تا ۳۶۵، فصل فی ھدیہ صلی اللہ علیہ وسلم فی قرأۃ القرآن، ط الرسالۃ

کیا اسلام جبراً پھیلایا گیا تھا؟

مستشرقین ایک زمانے سے یہ مکروہ پروپیگنڈہ کرتے آئے ہیں کہ اسلام جبراً پھیلایا گیا تھا۔ اس کی تردید کے متعلق ہم مفتی اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف "سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" سے دو اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔ حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ پہلی وحی سے ہجرتِ مدینہ تک حالات بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"اس وقت تک جو ہزارہا انسان اسلام کے حلقہ بگوش بن کر ہر قسم کے مصائب کا نشانہ بننے پر راضی ہوئے ظاہر ہے کہ وہ کسی دنیوی طمع یا حکومت کے جبر یا تلوار کے ذریعہ سے مجبور نہیں ہو سکتے۔ اس کھلی ہوئی ہدایت کو دیکھتے ہوئے بھی کیا وہ لوگ خدا سے نہ شرمائیں گے جو اسلام کی حقانیت پر پردہ ڈالنے کے لئے کہا کرتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا۔ کیا وہ اس کا کوئی جواب دے سکتے ہیں کہ ان تلوار چلانے والوں پر کس نے تلوار چلائی تھی جو نہ صرف مسلمان بنے بلکہ اسلام کی حمایت پر تلوار اٹھانے اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالنے پر راضی ہوگئے؟ کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ ابوبکر صدیق، فارق اعظم، عثمان غنی، علی المرتضی رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کس نے تلوار چلا کر ان کو مسلمان بنایا تھا؟ اور ابوذر رضی اللہ عنہ و انیس رضی اللہ عنہ اور ان کے قبیلہ کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے؟ ضماد اژدی کو کس نے مجبور کیا تھا؟ اور طفیل بن عمر ودوسی اور ان کے قبیلہ پر کس نے تلوار چلائی؟ اور قبیلہ بنی عبد الاشہل کو کس نے دبایا تھا؟ اور تمام انصار مدینہ پر کس نے زور دیا تھا؟ جنہوں نے فقط اسلام قبول نہیں کیا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے یہاں بلا کر تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی؛ اور اپنے جان و مال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان کیے۔ بُریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کو کس نے مجبور کیا کہ ستر آدمیوں کی جماعت لے کر مدینہ کے راستے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور برضا و رغبت مسلمان ہو گئے۔ نجاشی بادشاہ حبشہ پر کونسی تلوار چلی تھی کہ باوجود اپنی سلطنت و شوکت کے قبل از ہجرت مسلمان ہو گئے۔ ابو ہند اور تمیم اور نعیم وغیرہ وغیرہ پر کس نے زور دیا تھا کہ ملک شام سے سفر کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی اختیار کریں۔ اور اسی قسم کے صدہا واقعات ہیں جن سے کتب تاریخ بھری ہوئی ہیں۔

یہ ناقابلِ انکار مشاہدات ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان یہ یقین رکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلام اپنی اشاعت میں تلوار کا محتاج نہیں۔ اور نہ فرضیت جہاد کا یہ مقصد ہو سکتا ہے کہ لوگوں پر تلوار رکھ کر کہا جائے کہ مسلمان ہو جاؤ یا ان کو کسی جبر و اکراہ سے اسلام میں داخل کیا جائے، جہاد کے ساتھ ہی جزیہ کے احکام اور کفار کو اہل ذمہ بنا کر ان کے جان و مال کی حفاظت بالکل مسلمان کی طرح کرنے کے متعلق اسلامی قواعد خود اس کی شہادت ہیں کہ اسلام نے کبھی کفار کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔

اس لئے ایک منصف مزاج انسان کا فرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرے کہ اسلام میں فرضیت

جہاد کس غرض اور کن فوائد کے لئے ہوئی اور اسے اس وقت یہ یقین کرنا پڑے گا کہ جس طرح وہ مذہب کامل نہیں سمجھا جاسکتا جس نے لوگوں کا گلا گھونٹ کر بجبر واکراہ ان کو اپنے سلسلے میں داخل کیا ہو، اسی طرح وہ مذہب مکمل نہیں جس میں سیاست نہ ہو۔ وہ سیاست نہیں جس کے ساتھ تلوار نہ ہو۔ وہ ڈاکٹر اپنے فن کا ماہر نہیں ہوسکتا جو صرف مرہم لگانا جانتا ہے مگر سڑے ہوئے فاسد شدہ اعضاء کا آپریشن کرنا نہیں جانتا۔

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ
کچھ بھی نہیں ہے، تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

سمجھو اور خوب سمجھو کہ جب عالم کے جسم میں شرک کے زہریلے جراثیم پیدا ہو گئے اور وہ ایک مریض جسم کی طرح ہو گیا تو رحمتِ خداوندی نے اس کے لئے ایک مصلح اور مشفق طبیب (آپ) کو بھیجا جس نے ترپین سال تک متواتر اس کے ہر عضو اور ہر رگ وریشہ کی اصلاح کی فکر کی جس سے قابل اصلاح اعضاء تندرست ہو گئے مگر بعض اعضاء جو بالکل سڑ چکے تھے ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہ رہی، بلکہ خطرہ ہو گیا کہ ان کی سُمّیت تمام بدن میں سرایت کر جائے اس لئے حکیمانہ اصول کے موافق عین رحمت وحکمت کا اقتضاء یہی تھا کہ آپریشن کر کے ان اعضاء کو کاٹ دیا جائے، یہی جہاد کی حقیقت ہے اور یہی تمام جارحانہ اور مدافعانہ غزوات کا مقصد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عین میدان کارزار گرم ہونے کے وقت بھی اسلام نے اپنے مقابل جماعت میں سے صرف انہی لوگوں کو قتل کی اجازت دی ہے جن کا مرض متعدی تھا، یعنی جو اسلام کے مٹانے کے منصوبے گانٹھتے اور برسر جنگ آتے تھے۔ اور ان کے متعلقین، عورتیں، بچے اور بوڑھے اور مذہبی علماء جو لڑائی میں حصہ نہیں لیتے، اس وقت بھی مسلمانوں کی تلواروں سے مامون تھے، بلکہ وہ لوگ جو کسی دباؤ سے مجبور ہو کر مقابلے پر آئے ہوں وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ تھے۔"

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ اس بارے میں چند روایات پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"الغرض مدافعانہ اور جارحانہ جہاد کا مقصد صرف مکارم اخلاق کی اشاعت اور اسلام کا تحفظ وتبلیغ، اسلام کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں ان کا ہٹانا تھا۔ ان تمام واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد جس طرح عام یورپین مورخین اور مارگولیس وغیرہ کا یہ خیال بالکل غلط اور افتراء رہ جاتا ہے کہ اسلامی جہاد کا مقصد لوگوں کو بجبر مسلمان کرنا اور لوٹ مار کر کے اپنا معاش مہیا کرنا تھا۔ اسی طرح اسلامی روایات اور تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کرنے کے بعد اس میں بھی شک نہیں رہتا کہ اسلام میں جس طرح بغرضِ تحفظ مدافعانہ جہاد کو فرض کیا گیا ہے، اسی طرح حفظِ ماتقدم اور موانعِ تبلیغ کو راستے سے ہٹانے کے لئے جارحانہ جہاد بھی قیامت تک کے لئے ضروری کیا گیا ہے اور جس طرح مدافعانہ جہاد کی غرض لوگوں کو بجبر مسلمان بنانا نہیں ہے اسی طرح جارحانہ جہاد کا مقصد بھی کسی طرح یہ نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً جب کہ اسلام کا وسیع دامن عین وقتِ جہاد میں بھی کفار کو اپنی پناہ میں لینے اور کفر پر قائم

رہتے ہوئے ان کی جان ومال، عزت وآبرو کی اسی طرح حفاظت کی جاتی ہے جس میں مدافعانہ انداز اور جارحانہ جہاد دونوں برابر ہیں، نیز دنیا میں حقیقی امن وامان قائم کرنا، ضعیفوں کو ظلم سے چھڑانا وغیرہ جو جہاد کے مقاصد ہیں ان میں بھی دونوں قسمیں یکساں ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسلامی روایات کو مسخ کر کے جارحانہ جہاد کا انکار کیا جائے جیسا کہ ہمارے بعض آزاد خیال مؤرخین نے کہا ہے۔"①

غزوات میں جانی نقصان کتنا ہوا؟

سیرتِ طیبہ کے غزوات اور سرایا کو خونریزی اور نسل کشی سے تعبیر کرنے والوں کو اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی تمام لڑائیوں میں جانی نقصانات کا تخمینہ کیا تھا اور اس کے ثمرات کیا تھے؟

محققین کے مطابق ان تمام جنگوں میں ۲۵۹ مسلمان شہید اور مخالفین کے ۷۵۹ افراد قتل ہوئے۔ یوں فریقین کے مقتولین کی مجموعی تعداد صرف "۱۰۱۸" بنتی ہے۔②

اب ایک نظر جزیرۃ العرب کی وسعتوں کو دیکھیے اور دوسری طرف عرب قبیلوں کی جنگجوئی اور سخت مزاجی پر غور کیجیے تو ہرگز باور نہیں کیا جاسکتا کہ اتنا معمولی جانی نقصان اتنے وسیع رقبے پر آباد سینکڑوں بت پرست قبیلوں کو اپنا آبائی مذہب چھوڑنے پر آمادہ کرسکتا تھا؟ اس کے ساتھ اگر اس ایمانی واخلاقی انقلاب کا تصور کیا جائے جس نے چند سالوں کی اس کش مکش کے بعد عرب کے بکھرے ہوئے قبائل کو متحد کر دیا اور ایک جہالت زدہ معاشرے کو دنیا کی قیادت وسیادت کے مقام پر لا کھڑا کیا، تو اس عظیم الشان فائدے کے مقابلے میں بھلا ایک ہزار نفوس کے ضیاع کی کوئی حیثیت رہ جاتی ہے؟ تاریخ اور حالاتِ حاضرہ سے آگاہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اکثر جنگوں میں ہزاروں لاکھوں لوگ مارے جاتے ہیں، پھر ستم یہ کہ مقتولین میں سپاہیوں یا عام شہریوں کی بھی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ ان جنگوں کا دنیا کی تاریخ پر کوئی مثبت اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ان جنگی نقصانات کو دنیا کے انقلابات کا ایک لازمی حصہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

یورپ اور امریکا میں جمہوریت کی خاطر جو کشت وخوں ہوا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ پھر پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں بلا مبالغہ کروڑوں انسان، چند خود غرض سیاست دانوں کی ہوسِ ملک گیری کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس قدر نقصانات کے باوجود دنیا میں کوئی صالح انقلاب نہیں آیا بلکہ سرمایہ داروں کی عالمگیریت مستحکم ہوئی اور غریب اقوام کا استحصال کئی گنا بڑھ گیا۔ اہلِ مغرب اپنے اس ماضی کے ساتھ کس منہ سے سیرتِ طیبہ پر انگشت نمائی کی جرأت کرتے ہیں!!

---

① سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم، ص ۶۱ تا ۶۷

② رحمۃ للعالمین از قاضی سلیمان منصور پوری: ۱/ ۳۶۳

اُمّہاتُ المؤمنین

حضور اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کو قرآن کریم نے اُمّہاتُ المؤمنین (مسلمانوں کی مائیں) قرار دیا ہے۔ جن خوش قسمت ہستیوں کو یہ مقام ملا ان کے نام یہ ہیں:

1. اُمّ المؤمنین سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا
2. اُمّ المؤمنین سیّدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا
3. اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا
4. اُمّ المؤمنین سیّدہ حفصہ رضی اللہ عنہا
5. اُمّ المؤمنین سیّدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا
6. اُمّ المؤمنین سیّدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا
7. اُمّ المؤمنین سیّدہ جویریہ رضی اللہ عنہا
8. اُمّ المؤمنین سیّدہ اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا
9. اُمّ المؤمنین سیّدہ صفیہ رضی اللہ عنہا
10. اُمّ المؤمنین سیّدہ میمونہ رضی اللہ عنہا
11. اُمّ المؤمنین سیّدہ زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا

اس طرح امہات المؤمنین کی تعداد گیارہ ہے جن میں دو حضور اقدس ﷺ کی حیات میں وفات پا گئیں یعنی: سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور سیّدہ زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا۔ باقی نو آپ ﷺ کی وفات کے وقت تک زندہ تھیں۔

اُمّتِ مُسلمہ کا اجماع ہے کہ یہ صرف آنحضرت ﷺ کی خصوصیت تھی کہ آپ کے نکاح میں بیک وقت چار سے زائد خواتین آسکتی تھیں۔ کسی امتی کے لئے بیک وقت چار سے زائد بیویاں رکھنا جائز نہیں۔

ذیل میں امہات المؤمنین کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں۔

اُمّ المؤمنین سیّدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا:

سیّدہ خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا حضور اقدس ﷺ کی پہلی اہلیہ اور اُمّت کی سب سے برگزیدہ خاتون ہیں۔ قریش کے ایک تاجر گھرانے سے تعلق تھا۔ ان کی نیکی اور پاکیزگی کی وجہ سے لوگ انہیں طاہرہ کہا کرتے تھے۔

ان کا پہلا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا تھا۔ اس کی وفات کے بعد ابو ہالہ بن زُرارہ تمیمی کے نکاح میں آئیں۔ جب عرب کی مشہور لڑائی حرب فجار چھڑی تو اس میں ان کے والد اور شوہر دونوں شریک ہوئے اور دونوں مارے گئے۔ دونوں تجارت پیشہ تھے اور گھر کی گزر بسر کا دارومدار اسی پر تھا۔ باپ اور شوہر کی موت کے بعد سیّدہ

کسی کا انتخاب کر کے اس کے ہاتھ مال تجارت بھجواتیں۔
خدیجہ کو سخت دِقت ہوئی چناں چہ اپنے عزیزوں میں سے
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت و دیانت اور صداقت شعاری کے چرچے ان دنوں مکہ میں عام تھے، آپ صادق اور امین کے لقب سے پکارے جاتے، سیّدہ خدیجہ نے اسی شہرت کو مدِنظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام بھجوایا کہ ان کا مال تجارت شام لے جائیں، آپ کو دوسروں کی بہ نسبت دگنا معاوضہ دیا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرمالیا اور مال تجارت لے کر سیّدہ خدیجہ کے غلام مَیْسَرہ کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ اس سال کا نفع بھی گزشتہ سالوں کی بہ نسبت دوگنا ہوا۔ سیّدہ خدیجہ کے بیوہ ہونے کے بعد بہت سے لوگ ان سے نکاح کرنے کے خواہش مند تھے، لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شام کے سفرِ تجارت سے واپس لوٹے تو سیّدہ خدیجہ نے پیغامِ نکاح بھیجا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا اور یوں نکاح انجام پایا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۵ برس کے تھے جبکہ سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر مشہور قول کے مطابق چالیس سال تھی۔ ①

سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی اور اسلام کی خاطر اپنی دولت وقف کر دی۔ وہ مکی دور کی ان تمام صعوبتوں میں آپ کے ساتھ شریک رہیں جنہیں جھیلنے کے لیے پہاڑ کا جگر درکار تھا۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اُمّت کی سب سے افضل خاتون فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ②

”خَیْرُ نِسَائِهَا خَدِیْجَةُ بِنْتُ خُوَیْلِدٍ“ (امت کی بہترین عورت خدیجہ ہیں۔)

ایک بار جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھانا لے جارہی تھیں، جبرئیل علیہ السلام انہیں انسانی شکل میں ملے تھے۔ بعد میں جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ انہیں جنت میں ایک محل کی بشارت دیجیے۔ ③

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بیٹے ابراہیم کے سوا باقی سب اولاد سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہوتے ہوئے کسی اور عورت سے نکاح نہیں کیا۔ رمضان ۱۰ نبوی میں سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوگئی۔ عمر ۶۰ یا ۶۵ برس تھی جبکہ اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ۴۹ برس کے ہو چکے تھے۔ اس سانحے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر غمگین ہوئے کہ صحت گرنے لگی۔ ④ بعد میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس غم گسار اہلیہ کو زیادہ یاد کیا کرتے تھے۔ کسی دن گھر میں کھانے پینے میں وسعت نصیب ہوجاتی تو سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کے گھر کھانا بھیجتے۔ ⑤ ام المؤمنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں: ”مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں کسی پر اتنا رشک نہیں آتا جس قدر سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا پر، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بہت یاد کرتے تھے۔“ ⑥

---

① طبقات ابن سعد: ۱/۱۳۲ ط صادر، اسد الغابة: ۷/۸۰ ط العلمیة ② الاصابة: ۸/۱۰۰

③ صحیح مسلم، ح: ۶۴۲۶، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خدیجة، ط دار الجیل

④ الاصابة: ۸/۱۰۳، دلائل النبوة للبیهقی: ۲/۳۵۳، ۳۵۴، ط العلمیة

⑤ صحیح مسلم، ح: ۶۴۳۰، ۶۴۳۱، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل خدیجة، ط دار الجیل

⑥ صحیح البخاری، ح: ۳۸۱۷، باب تزویج النبی صلی اللہ علیہ وسلم خدیجة

اُم المؤمنین سیّدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا:

سیّدہ سودہ رضی اللہ عنہا کا تعلق قریش کی شاخ بنو عامر سے تھا۔ ① وہ پہلے سکران بن عمر و رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی کے نکاح میں تھیں۔ ان کی وفات ہوگئی۔ ادھر سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رحلت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایک رفیقہ حیات کی ضرورت تھی۔ آخر عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی اہلیہ خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا آپ کی منشاء جان کر سودہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گئیں اور ان کے والدین سے رشتے کی بات کرلی۔ ہجرت سے تین سال قبل ان سے نکاح ہوا اور مکہ ہی میں رخصتی ہوئی۔ یہ رمضان ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی بڑی تعریف کرتی تھیں اور فرماتی تھیں:

"مجھے ان کے سوا کسی کے بارے میں یہ پسند نہیں کہ اس کے قالب میں میری جان ہوتی۔"

وہ بھی سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑی محبت کرتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سالوں میں انہوں نے اپنی باری کا دن عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات المؤمنین کو حجۃ الوداع میں نصیحت فرمائی تھی کہ میرے بعد گھروں میں بیٹھنا۔ سیّدہ سودہ رضی اللہ عنہا نے اس ارشاد پر اتنی سختی سے عمل کیا کہ عمر بھر پھر حج یا عمرے کے لیے بھی نہیں نکلیں۔ گھر ہی میں بیٹھی رہتیں تھیں۔ فرماتی تھیں: "حج و عمرہ کرچکی ہوں۔ اب اللہ کے حکم کے مطابق گھر ہی میں رہوں گی۔"

خودداری کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھ کی کمائی استعمال کرتیں۔ طائف سے دباغت کے لیے کھالیں آتیں، انہیں دباغت دے کر فروخت کر دیتیں اور آمدن کا بڑا حصہ صدقہ کر دیتیں۔ کوئی ہدیہ ملتا تو وہ بھی راہِ خدا میں دے دیتیں۔ ②

وفات دورِ خلافتِ فاروقی کے اواخر میں ۲۳ ہجری میں ہوئی۔ ③

اُم المؤمنین سیّدہ عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا:

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں۔ والدہ کا نام اُمّ رومان بنت عامر تھا۔ آپ نے اس گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جہاں بیت نبوت کے بعد اسلام کی کرنیں سب سے پہلے پہنچیں۔ اس لیے آپ کا بچپن اسلامی تعلیمات کے ماحول میں گزرا جبکہ اس زمانے میں کفارِ مکہ کی اسلام دشمنی عروج پر تھی اور کلمۂ توحید کا اقرار کرنا سخت آزمائش کا باعث تھا۔

سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا آپ مزید نکاح نہیں کریں گے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا "کس سے؟"

خولہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "کنواریوں میں عائشہ ہیں اور بیوگان میں سودہ بنت زمعہ۔"

---

① اسد الغابۃ، تر: سودۃ بنت زمعۃ رضی اللہ عنہا

② الاصابۃ: ۸/۱۹۷، ۱۹۸

③ اسد الغابۃ: ۷/۱۵۷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے رشتے کی بات کرنے کی اجازت دی، چنانچہ خولہ رضی اللہ عنہا کی وساطت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے نکاح فرمایا۔ ①

اس نکاح کا حکم اللہ کی طرف سے ملا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے بعد اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''تم مجھے تین رات تک خواب میں دکھائی جاتی رہیں، ایک فرشتہ سفید ریشمی کپڑے پر تمہاری تصویر لاتا تھا اور کہتا تھا: یہ آپ کی اہلیہ ہیں۔'' ②

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہجرت سے تین برس قبل ہوا اور رخصتی غزوہ بدر کے فوراً بعد شوال ۲ھ میں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی کنیت آپ کے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نام پر اُمّ عبداللہ تجویز فرمائی۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نو سالوں میں اس قدر فیض حاصل کیا کہ علم وفقاہت کا پیکر بن گئیں۔ صحابہ کرام فرمایا کرتے تھے: ''ہمیں کسی مسئلے میں شک ہوتا تھا تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس کا علم پاتے تھے۔'' یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے تابعین آپ رضی اللہ عنہا کے شاگرد تھے۔ ③

آپ رضی اللہ عنہا کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

''عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام خواتین پر ایسی ہے جیسے ثرید کی تمام کھانوں پر۔'' ④

حضرت جبرئیل امین علیہ السلام وحی لے کر نازل ہوتے تو انہیں سلام عرض کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

''اے عائشہ! یہ جبرئیل ہیں، آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔''

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتیں:

''وَعَلَيْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ'' (ان پر بھی سلام اور اللہ کی رحمت ہو۔) ⑤

خلفائے راشدین کے دور میں اُمّ المومنین رضی اللہ عنہا پورے عالم اسلام کی ماں اور علمی وروحانی سرپرست تھیں۔ پوری اُمّتِ مُسلمہ میں آپ سے بڑھ کر عالمہ فاضلہ خاتون کوئی نہ تھی۔ ریاضی اور علم میراث میں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ صحابہ اور تابعین میراث کے مسائل پوچھنے آپ کے پاس آتے تھے۔ عروہ بن زبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے فقہ، طب اور شعر میں اُمّ المومنین سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ ⑥

---

① اسد الغابة: ۷/۱۷۶ ط العلمية

② "اُرِيتُكِ فِي الْمَنَامِ ثَلَاثَ لَيَالٍ جَاءَنِي بِكِ الْمَلَكُ فِي سَرَقَةٍ مِنْ حَرِيرٍ يَقُولُ هٰذِهِ امْرَأَتُكَ۔" (صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة۔ باب فی فضل عائشة رضی اللہ عنہا)

③ صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة۔ باب فی فضل عائشة

④ "فَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيدِ عَلَى سَائِرِ الطَّعَامِ۔" (صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة۔ باب فی فضل عائشة)

⑤ صحیح مسلم، ح: ۶۳۵۳، ط دار الجیل؛ سنن ابی داود، ح: ۵۲۳۲؛ سنن الترمذی، ح: ۳۸۷۶

⑥ الاصابة: ۸/۲۳۳

آپ رضی اللہ عنہا نے تفسیر وحدیث کی تعلیم براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی۔ شعر اور نسب کا علم اپنے والد بزرگوار سے سیکھا تھا۔ ① آپ رضی اللہ عنہا سے کم وبیش اڑھائی ہزار احادیث منقول ہیں۔ ②

۵۸ھ میں ام المؤمنین رضی اللہ عنہا بیمار ہوئیں اور آخر ۱۷ رمضان کی شب دنیائے فانی سے رحلت فرما گئیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نمازِ تراویح کے بعد نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ③

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی کئی ایسی خصوصیات ہیں جو کسی اور صحابیہ کو حاصل نہیں مثلاً:

① وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چہیتی بیوی اور سب سے محبوب رفیق کی صاحبزادی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا برملا اظہار فرماتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کو سب سے زیادہ پیارا کون ہے؟ تو فرمایا: ''عائشہ۔'' انہوں نے پوچھا: ''اور مردوں میں؟'' فرمایا: ''اس کے والد۔'' ④

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہا کے سوا کسی کنواری لڑکی سے شادی نہیں کی۔

③ وفات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک آپ رضی اللہ عنہا کی آغوش میں تھا۔

④ حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کیا گیا۔

⑤ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت بھی وحی نازل ہوتی تھی جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لحاف میں ہوتے تھے۔ باقی ازواج کو یہ اعزاز حاصل نہیں تھا۔

⑥ آپ رضی اللہ عنہا کی عفت کے بارے میں سورۃ النور کی ۱۵ آیات نازل ہوئیں جن کی تلاوت تا قیامت کی جاتی رہے گی۔ سلف صالحین کا کہنا ہے کہ اگر سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اور کوئی فضیلت نہ بھی ہوتی جب بھی واقعۂ اِفک میں جس طرح قرآن حکیم نے ان کی برأت بیان فرمائی وہ ان کی فضیلت اور علو مرتبہ کی ناقابلِ تردید دلیل ہے۔

⑦ ایک سفر میں آپ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہوا تو اس کی تلاش کے دوران صبح کی نماز کا وقت ہوگیا۔ وہاں پانی نہیں تھا، اللہ نے وحی بھیج کر تیمم کا طریقہ بتادیا۔ اُمّت کے لیے تیمم کی آسانی اُمّ المؤمنین کی تا قیامت باقی رہنے والی برکت ہے۔

⑧ آپ رضی اللہ عنہا ان چھ، سات صحابہ میں سے ایک ہیں جن سے بکثرت احادیث منقول ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ احادیث دو ہزار چار سو تین (۲۴۰۳) ہیں۔

⑨ آپ رضی اللہ عنہا کے علمی کمالات تمام صحابیات اور بیشتر صحابہ سے بڑھ کر ہیں۔ بڑے بڑے صحابہ اختلافی مسائل میں آپ سے استفادہ کرتے تھے۔ ⑤

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۹۷/۲

② مسند احمد، ح: ۲۶۳۱۳، ۲۴۳۰۱۰ (?)

③ سیر اعلام النبلاء: ۱۹۲/۲

④ صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۲، کتاب المناقب، باب لو کنت متخذا خلیلا

⑤ اسد الغابۃ: ۱۸۶/۷ ط العلمیۃ

اُم المومنین سَیِّدَہ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا:

اُمّ المومنین سَیِّدَہ حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حقیقی بڑی بہن تھیں۔ ① سَیِّدَہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے پانچ سال پہلے اس وقت ہوئی جب قریش خانہ کعبہ کی ازسرِنو تعمیر میں مشغول تھے۔ سَیِّدَہ حفصہ رضی اللہ عنہا سنِ شعور کو پہنچیں تو ان کے والدِ ماجد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے۔ اس طرح سَیِّدَہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے نہایت پاکیزہ ماحول میں تربیت پائی۔ ②

آپ بڑی فصیح و بلیغ، ادبی ذوق کی حامل اور نہایت عالمہ فاضلہ اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ قرآن مجید کی حافظہ تھیں۔ پہلے خُنَیس بن حُذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی ساتھیوں میں سے تھے۔ خُنَیس بن حُذافہ رضی اللہ عنہ نے پہلے حبشہ ہجرت فرمائی پھر مکہ لوٹ آئے۔ پھر سَیِّدَہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہمراہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا شرف پایا۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور زخمی ہو کر کچھ عرصہ بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انہیں جنت البقیع میں حضرت عثمان بن مَظعُون رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اس طرح سَیِّدَہ حفصہ رضی اللہ عنہا نوجوانی میں بیوہ ہو گئیں، انہیں شوہر سے جدائی کا بے حد قلق تھا، مگر صبر کا دامن نہ چھوڑا۔ ③ کچھ دنوں بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سَیِّدَہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا ارادہ ظاہر کیا اور یہ مبارک نکاح عمل میں آیا۔ یہ ہجرت کے تیسرے سال کا واقعہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا مہر چار سو درہم مقرر فرمایا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس تھی۔ ④

سَیِّدَہ حفصہ رضی اللہ عنہا ان چھ امہات المومنین میں سے ایک تھیں جنہیں قریشی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یعنی: سیدہ خدیجہ، سَیِّدَہ سودہ، سَیِّدَہ عائشہ، سَیِّدَہ حفصہ، سَیِّدَہ اُمّ حبیبہ، سَیِّدَہ اُمّ سَلمہ، رضی اللہ عنہن۔

سَیِّدَہ حفصہ رضی اللہ عنہا ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضامندی اور قرب کے لیے کوشاں رہتی تھیں، خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں، اپنے والد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی راحت رسانی کا بھی پورا خیال کرتی تھیں۔ ⑤

لکھنے پڑھنے کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں۔ علومِ قرآن و سنت سے وافر حصہ ملا تھا، تقریباً ساٹھ روایاتِ حدیث آپ سے منقول ہیں جو آپ کے علمی ذوق کی دلیل ہیں۔ ⑥

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ کسی وجہ سے سَیِّدَہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو ایک رجعی طلاق دے دی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بے حد دکھ ہوا کہ وہ ایک عظیم سعادت سے محروم ہو گئے۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا:

---

① الاستیعاب: ۱۸۱۱/۴
② سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۲۷، ط الرسالۃ۔ الاعلام للزرکلی: ۲/۲۶۴
③ الاستیعاب: ۱۸۱۱/۴ ط دار الجیل
④ صحیح البخاری، ح: ۴۰۰۵، کتاب المغازی، باب شھود الملائکۃ بدرا، اسد الغابۃ: ترجمۃ حفصۃ بنت عمر
⑤ اسد الغابۃ: ۶۷/۷ ط العلمیۃ
⑥ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۳۰، ط الرسالۃ

”مجھے جبرئیل امین نے کہا ہے: حفصہ کی طلاق سے رجوع فرمالیجیے کیونکہ وہ بہت روزے رکھنے والی، عبادت گزار اور پرہیزگار خاتون ہیں اور جنت میں بھی آپ کی بیوی ہوں گی۔“①

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشورے پر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید جمع کرنے کا فیصلہ کیا تو امہات المومنین میں سے حفاظتِ قرآن کے لیے سیّدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کا انتخاب فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کا صحیفہ تیار کیا۔ یہ صحیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔ پھر ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آگیا۔ انہوں نے اس کی حفاظت سیّدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کی۔ یہ نسخہ تقریباً پندرہ سال تک انہی کے پاس محفوظ رہا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس کی عام اشاعت کی ضرورت پیش آئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سیّدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے وہی صحیفہ قرآنی طلب فرمایا، اس کی نقول تیار کرا کے پھر انہی کو واپس کر دیا۔ سیّدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد یہ قرآن مجید میرے بھائی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حفاظت میں دے دیا جائے۔ اس طرح حفاظتِ قرآن مجید میں آپ کا بہت بڑا کردار ہے۔②

اپنے والد کی طرح طبیعت میں دلیری اور جرأت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لیے کسی سے دبتی نہ تھیں۔ عمر بھر نفلی روزوں کا اہتمام کرتی رہیں۔ اپنی وفات تک روزوں کا سلسلہ جاری رکھا۔③

سخاوت کا یہ حال تھا کہ والد سے انہیں میراث میں غابہ کی کچھ زمین ملی تھی، وفات سے پہلے وہ بھی صدقہ کر دی۔

وفات صحیح قول کے مطابق ۴۵ ہجری میں ہوئی۔ اگرچہ ایک قول ۲۷ھ میں وفات کا ہے مگر وہ خلافِ تحقیق ہے۔ آپ کی تدفین جنت البقیع میں ہوئی۔④

ہند بنت ابی اُمَیّہ، اُم المومنین سیّدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا:

سیّدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا اصل نام ہند تھا۔ ان کے والد ابواُمیّہ مکہ کے مشہور رئیس اور سخی تھے۔ سفر میں جاتے تو تمام قافلے کی کفالت خود کرتے۔ ان کی آغوشِ محبت میں سیّدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے نہایت ناز و نعمت کے ساتھ پرورش پائی۔ مشہور صحابی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ان کے رضاعی بھائی تھے۔⑤

اپنے شوہر کے ساتھ بالکل ابتدائی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ ان کے شوہر عبداللہ بن عبدالاسد تھے جو اپنی کنیت ابوسلمہ سے مشہور تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی اور زبردست شہسوار تھے۔ قریش کی ستم رانیوں

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۳۰، ط الرسالة
② الکامل فی التاریخ: ۲/۴۸۲
③ الاصابة: ۸/۸۶ ط دار صادر
④ طبقات ابن سعد: ۸/۸۶ ط صادر؛ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۲۹ ط الرسالة
⑤ اسد الغابة، ترجمة ام سلمة رضی اللہ عنہا

سے تنگ آ کر میاں بیوی نے دیگر بہت سے مسلمانوں کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ کچھ مدت بعد مہاجرین حبشہ واپس مکہ آ گئے۔ پھر حالات ناسازگار دیکھ کر حبشہ کی طرف دوسری ہجرت ہوئی۔ یہ زوجین اس میں بھی شامل ہوئے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوری بڑی شاق گزرتی رہی۔ آخر ہجرتِ مدینہ سے کچھ عرصہ قبل واپس مکہ آ گئے۔ ①

جب مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا بھی اپنے شوہر اور شیر خوار بیٹے سَلَمہ کے ساتھ مکہ سے نکلیں۔ ان کے گھر والوں نے تعاقب کر کے روک لیا۔ ان کے شوہر مجبوراً انہیں اور بچے کو چھوڑ کر تنہا مدینہ چلے گئے۔ ادھر ان کے سسرال والے آ گئے اور بچے کو ان سے چھین کر لے گئے۔ ایک سال تک یہ شوہر اور بچے کے لیے تڑپتی رہیں۔ آخر برادری والوں کو رحم آ گیا اور بچہ ان کے حوالے کر کے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ ان کی ہمت کا یہ عالم تھا کہ اونٹ پر سوار ہو کر اس طویل راستے پر تنہا ہی نکل کھڑی ہوئیں۔ خوش قسمتی سے راستے میں کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ مل گئے جو ابھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے مگر نہایت غیرت مند انسان تھے۔ انہوں نے منزل بمنزل ساتھ چل کر انہیں مدینہ کے سامنے چھوڑ دیا۔ چونکہ ان کے گھرانے کی دولت و ثروت مشہور تھی اس لیے اہلِ مدینہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ واقعی ابواُمَیَّہ کی بیٹی ہیں جو اتنا تکلیف دہ سفر طے کر کے آئی ہیں۔ ②

مدینہ منورہ میں کچھ مدت شوہر کا ساتھ نصیب رہا۔ زوجین میں مثالی محبت تھی۔ ابوسَلَمہ رضی اللہ عنہ بدر اور احد کی جنگوں میں شریک رہے۔ اس دوران انہیں ایک زخم لگا تھا جو رفتہ رفتہ بگڑ گیا اور آخر وہی موت کا سبب بن گیا۔ ③

کچھ مدت بعد جمادی الآخرہ ۴ ہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّ سلمہ سے نکاح فرما لیا، یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے تینوں بچوں کے سوتیلے والد بھی ہو گئے۔ ان تین بچوں میں سے دو لڑکے تھے یعنی سلمہ اور عمر۔ ایک لڑکی تھی: زینب۔ ان تینوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت کا شرف حاصل رہا۔ ④

اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کو صلحِ حدیبیہ کے سفر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل رہا۔ نہایت ذہین اور قوی الحافظہ تھیں۔ عملی ذوق و شوق بھی کمال کا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اکثر مسائل پوچھا کرتی تھیں اور احادیث کو یاد کر لیتی تھیں۔ اس بناء پر امہات المؤمنین میں علم و فضل کے لحاظ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بعد انہی کا درجہ تھا۔ ان سے ۳۷۸ اَحادیث مروی ہیں۔ ⑤

سَیِّدہ اُمّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا نے تمام ازواجِ مطہرات کے بعد ۶۲ ھجری میں انتقال فرمایا۔ ⑥

رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاھا

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۰۲، ط الرسالة

② سیرۃ ابن ھشام: ۱ ص ۴۶۸ تا ۴۷۰

③ طبقات ابن سعد: ۸/۹۱، ط صادر

④ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۰۲، ط الرسالة

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۱۰، ط الرسالة ⑥ الاصابة: ۸/۴۱۲

اُم المؤمنین سیّدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا:

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی بیٹی تھیں۔ [1] حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کرنا چاہتے تھے۔ سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کو یہ رشتہ پسند نہ تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل میں اس وقت راضی ہوگئیں۔ نکاح ہوگیا مگر طبیعتوں میں میل نہ ہوا۔ آخر زید رضی اللہ عنہ نے انہیں طلاق دے دی۔

چونکہ انہوں نے زید رضی اللہ عنہ سے نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر کیا تھا، اس لیے جب انہیں طلاق ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجا طور پر یہ سمجھا کہ ان کی جتنی دل شکنی ہوئی ہے، اس کا ازالہ تبھی ہوسکتا ہے کہ خود ان سے نکاح کرلیا جائے۔ مگر رکاوٹ یہ تھی کہ اہلِ عرب منہ بولے بیٹے کو اصلی بیٹے کے برابر سمجھتے تھے۔ اس لئے خدشہ تھا کہ لوگ کہیں گے کہ بہو سے نکاح کرلیا۔ چونکہ یہ دورِ جاہلیت کی رسم تھی جس کا مٹانا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضِ منصبی بھی تھا اس لئے درج ذیل آیتیں نازل ہوئیں:

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَاۗىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝

”یاد کیجئے جب آپ کہہ رہے تھے اس شخص کو جس پر اللہ کا احسان تھا اور آپ کا بھی احسان تھا، کہ روکے رکھو اپنے پاس اپنی بیوی کو اور اللہ سے ڈرو۔ اور آپ اپنے جی میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔ اور آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔ تو جب زید نے اس خاتون سے پوری کرلی اپنی غرض۔ تو ہم نے اس کا نکاح کرادیا آپ کے ساتھ، تاکہ مومنوں پر کوئی تنگی نہ رہے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے حوالے سے اور جو اللہ کا فیصلہ ہے وہ پورا ہونے والا ہے۔“ [2]

چونکہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کا حکم خود اللہ نے دیا تھا، اس لیے اس نکاح میں ان کی طرف سے کوئی سرپرست تھا اور نہ ہی الگ سے نکاح کی رسم انجام پائی تھی بلکہ اللہ کے ارشاد "زَوَّجْنٰكَهَا" (ہم نے آپ کا نکاح کرادیا ان سے) کے ساتھ عقدِ نکاح ہوگیا۔ یہ واقعہ ۵ھ کا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۵ برس تھی۔ [3]

اس طرح لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ منہ بولا بیٹا اصلی اولاد کا حکم نہیں رکھتا، اس کی بیوی طلاق ہوجانے کے بعد حرام نہیں ہوتی، جن لوگوں نے اس شرعاً حلال تعلق کو حرام مان رکھا تھا وہ حقیقت جان گئے اور جاہلیت کی یہ رسم ٹوٹ گئی۔

اس قدیم رسم کا ٹوٹنا تب ہی ممکن تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ایسا کرکے دکھاتے، اس لیے یہ نکاح اُمّت کے حق میں نہایت رحمت و برکت کا باعث بنا اور صدیوں کی ایک رسمِ بد سے انسانیت کو نجات ملی۔ [4]

---

① اسد الغابۃ، ترجمۃ: زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا ② سورۃ الاحزاب، آیت: ۳۷

③ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۱۱ تا ۲۱۷ ④ تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورۃ الاحزاب، آیت: ۳۷

اس نکاح کے بارے میں بعض نامناسب روایات بھی مشہور ہیں جو نہایت ضعیف ہیں، بعض مؤرخین اور مفسرین نے انہیں بلا تنقید نقل کر دیا ہے مگر محققین نے ان کی مدلل تردید کی ہے۔

سیّدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا میں کئی ایسی خوبیاں تھیں جو انہیں دیگر امہات المؤمنین سے ممتاز بناتی تھیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی اُمَیمہ کی بیٹی تھیں، امہات المؤمنین میں سے کوئی اور اتنی قریبی رشتہ دار نہ تھی۔ ان کے نکاح کا حکم خود اللہ نے دیا تھا۔ ازواجِ مطہرات میں سے ہر ایک بارگاہِ رسالت کے زیادہ سے زیادہ قرب کی امیدوار رہتی تھی مگر سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بعد یہ دولت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو سب سے بڑھ کر نصیب تھی اسی لیے سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ وہ میری ہم پلہ تھیں۔

زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بہت نیک و صالح، روزہ دار اور صابرہ شاکرہ خاتون تھیں۔ راتوں کو بیدار رہ کر تہجد پڑھا کرتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ''اِنَّھَا اَوَّاھَۃ'' (بلاشبہ یہ آہ و بکا کی دولت سے مالا مال ہیں۔)

فیاضی اور سخاوت میں سب سے بڑھ کر تھیں۔ خود اپنے ہاتھ کی محنت سے کماتیں اور اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا: ''تم میں سے جس کے ہاتھ زیادہ لمبے ہیں وہ سب سے پہلے مجھ سے آ ملے گی۔'' اُمہات المؤمنین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ایک دوسرے کے ہاتھ ناپ کر دیکھا کرتی تھیں۔ سیّدہ سودہ رضی اللہ عنہا قد و قامت میں طویل تھیں اس لیے انہی کے ہاتھ زیادہ لمبے تھے۔ خیال تھا کہ ان کا انتقال سب سے پہلے ہوگا۔ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا قد نسبتاً کم تھا اس لیے ان کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امہات المؤمنین میں سب سے پہلے انہی کا انتقال ہوا۔ یہ ۲۰ ہجری کا واقعہ ہے۔ تب سب کو معلوم ہوا کہ ارشادِ نبوی میں ہاتھوں کی طوالت سے ''سخاوت'' مراد تھی اور اس صفت میں بلاشبہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سب پر فوقیت رکھتی تھیں۔ ①

اُمّ المؤمنین رملہ بنت ابی سفیان، سیّدہ اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا:

سیّدہ اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا قریش کے سردار حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی سگی بہن تھیں۔ اصل نام رملہ تھا مگر کنیت اُمّ حبیبہ کے ساتھ مشہور ہوئیں۔ رشتے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد لگتی تھیں۔ ابتدائے اسلام میں ایمان لائیں اور اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبشہ ہجرت کی۔ وہاں شوہر کی وفات ہو گئی اور یہ تنہا رہ گئیں۔ ②

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیارِ غیر میں ان کی بے کسی اور اسلام پر استقامت کا علم ہوا تو شاہِ حبشہ نجاشی کو پیغام بھیجا کہ ان سے رشتے کی بات کی جائے، اگر وہ راضی ہوں تو ان کا نکاح مجھ سے کرا دیا جائے۔ سیّدہ اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اس سعادت کو بسر و چشم قبول کیا اور نجاشی نے وکیلِ بارگاہِ رسالت بن کر چار ہزار درہم مہر پر یہ نکاح کرا دیا۔

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۱۱ تا ۲۱۸

② طبقات ابن سعد: ۸/۹۶، ط صادر... عبید اللہ بن جحش کی وفات اسلام پر ہوئی تھی۔ مرتد ہونے کی روایت درست نہیں۔

نکاح کے کچھ دنوں بعد نجاشی رحمہ اللہ نے اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کو شُرَحبیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ بھیج دیا۔ ①

اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کی ایمانی غیرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے والد ابوسفیان اسلام لانے سے پہلے ایک بار قریش کی طرف سے صلح کے سفیر بن کر مدینہ آئے۔ اس دوران بیٹی کے گھر بھی آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر بیٹھنے لگے تو اُمّ المؤمنین نے جلدی سے بستر لپیٹ دیا تاکہ والد اس پر نہ بیٹھ سکیں۔ ابوسفیان نے حیران ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو بولیں:

"یہ بستر اللہ کے رسول کا ہے اور آپ ناپاک مشرک ہیں۔" ②

اُمّ المؤمنین رضی اللہ عنہا کا مقام پانے کے علاوہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن ہونے کے باعث عالم اسلام میں ان کا غیر معمولی اثر ورسوخ تھا۔ تاہم انہوں نے نہایت سادہ اور منکسرانہ زندگی گزاری۔ ۴۴ھ میں وفات پائی۔ ③

اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا علم وفضل میں بہت بلند مقام رکھتی تھیں۔ ان سے "۶۵" احادیث مروی ہیں جو ان کی علمی صلاحیت کی دلیل ہیں۔ ④

اُمّ المؤمنین جُوَیرِیَہ بنت حارث رضی اللہ عنہا:

سَیّدہ جُوَیرِیَہ رضی اللہ عنہا بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضِرار کی بیٹی تھیں۔ ⑤ ۵ھ میں غزوۂ مُرَیسیع میں گرفتار ہوئیں، اسی لڑائی میں ان کا شوہر مُسافِع بن صفوان مارا گیا تھا۔ لڑائی سے پہلے انہوں نے خواب دیکھا تھا کہ یثرب سے ایک چاند نکل کر ان کی گود میں آ گیا ہے۔ لڑائی میں گرفتاری کے بعد یہ قیدی بن کر دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے حصے میں آ گئیں۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ چوں کہ یہ سردار کی بیٹی تھیں، اس لیے بعض صحابہ کرام کو مناسب نہ لگا کہ وہ کسی عام شخص کی باندی بنیں۔ پس ان کے مشورے پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ سے جُوَیرِیَہ رضی اللہ عنہا کو خرید لیا۔ اُدھر جُوَیرِیَہ کے باپ حارث نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے التماس کر دی کہ میری بیٹی کو آزاد کر دیا جائے۔ آپ نے جُوَیرِیَہ رضی اللہ عنہا کو اختیار دے دیا کہ چاہیں تو چلی جائیں، چاہیں تو امہات المؤمنین میں شامل ہو جائیں۔

ان کے لیے اس سے بڑھ کر شرف کیا ہو سکتا تھا۔ بولیں: "میں اللہ اور اس کے رسول کو ترجیح دیتی ہوں۔"

یوں وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں آئیں اور ان کا خواب سچا ہو گیا۔ اس نکاح کی خوشی میں مسلمانوں نے ان کے قبیلے کے گرفتار شدگان رہا کر دیے۔ بعد میں ان کے والدین اور قبیلے والے مسلمان ہو گئے۔ ⑥

سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا بہت عبادت گزار تھیں۔ نمازِ فجر کے بعد مصلّے پر بیٹھے بیٹھے سورج بلند ہونے تک ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتی تھیں۔ ⑦ وفات ۵۶ ہجری میں ہوئی۔ ⑧

---

① مسند احمد، ح: ۲۷۴۰۸ ② طبقات ابن سعد: ۸ ص ۹۹
③ طبقات ابن سعد: ۸ ص ۱۰۰ ④ سیر اعلام النبلاء: ۲ ص ۱۱۹
⑤ اسد الغابۃ، ترجمۃ جویریۃ رضی اللہ عنہا ⑥ سیر اعلام النبلاء: ۲ ص ۱۶۱، ۱۶۲
⑦ سنن الترمذی، ح: ۳۵۵۵، ابواب الدعوات ⑧ تاریخ الاسلام للذہبی: ۳ ص ۱۹۰، ت تدمری

اُمّ المومنین سَیِّدَہ صَفِیَّہ بنت حُیَیّ رضی اللہ عنہا:

سَیِّدَہ صَفِیَّہ رضی اللہ عنہا کا تعلق ایک اسرائیلی خاندان سے تھا جس کا سلسلۂ نسب حضرت ہارون علیہ السلام سے جاملتا تھا۔ ان کا باپ حُیَیّ بن اخطب بنونضیر کے یہودیوں کا سردار تھا جو غزوۂ بنونضیر میں قتل ہوا۔ اسی طرح ان کا شوہر کنانہ ابن ابی الحُقَیق بھی سخت اسلام دشمن یہودی تھا۔ سیدہ نے ایک شب خواب دیکھا تھا کہ چاندان کی جھولی میں آگرا ہے۔ یہ خواب شوہر کو سنایا تو اس نے ایسا طمانچہ مارا کہ رخسار پر نیل پڑ گیا۔ انہی دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر لشکر کشی کی اور ان کا شوہر قتل ہو گیا۔ یہ گرفتار ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ یہ ۷ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر سترہ برس تھی۔ نہایت عاقل، بُردبار اور عالمہ فاضلہ تھیں۔ ۵۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ①

اُمّ المومنین سَیِّدَہ زینب بنت خزیمہ ہلالیہ رضی اللہ عنہا:

سَیِّدَہ زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا اپنی سخاوت کی وجہ سے اُمّ المساکین کے لقب سے مشہور تھیں۔ پہلے طفیل بن حارث کے نکاح میں تھیں، اس نے طلاق دے دی، پھر اس کے بھائی عبیدہ رضی اللہ عنہ سے نکاح ہو گیا۔ یہ بھی غزوہ بدر میں شہید ہو گئے۔ ② عام سیرت نگاروں اور مؤرخین نے ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کی تاریخ رمضان ۳ھ بتائی ہے۔ ③ مگر انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت کم وقت ملا۔ رخصتی کے چند ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ مدت بعض مؤرخین نے دو ماہ، بعض نے تین ماہ اور بعض نے آٹھ ماہ بتائی ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد یہ دوسری زوجہ ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں فوت ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر ۳۰ سال تھی۔ ④

اُمّ المومنین سَیِّدَہ میمونہ بنت حارث ہلالیہ رضی اللہ عنہا:

سَیِّدَہ میمونہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی اُمّ فضل رضی اللہ عنہا کی ہمشیرہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی سگی خالہ تھیں۔ پہلے یہ مسعود بن عمر نامی شخص کے نکاح میں تھیں اس نے طلاق دے دی تو ابورہم سے نکاح ہوا۔ ان کی وفات ہو گئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالقعدہ ۷ھ میں عمرۂ قضا کے لیے جاتے ہوئے ''سرف'' کے قصبے میں ان سے وکلاء کی معرفت نکاح کر لیا۔ واپسی پر وہیں رخصتی ہوئی۔ ۵۱ھ میں حج کے سفر میں اسی مقام پر ان کا انتقال ہوا اور اسی سائبان میں دفن ہوئیں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا تھا۔ ⑤ یہ آخری زوجہ ہیں۔ ان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نکاح نہیں کیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہن وارضاھن اجمعین

❁❁❁

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۳۳، ط الرسالۃ؛ اسد الغابۃ: ۷/۱۶۸

② الاصابۃ: ۸/۹۱، ۹۲؛ الاستیعاب: ۴/۱۸۵۳

③ طبقات ابن سعد: ۸/۱۱۵ ط صادر

④ طبقات ابن سعد: ۸/۱۱۵، ط صادر؛ الاصابۃ: ۸/۹۱، ۹۲؛ الاستیعاب: ۴/۱۸۵۳

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۲/۲۴۵، ط الرسالۃ

ذُریتِ طیبہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام نرینہ اولاد بچپن میں ہی داغِ مفارقت دے گئی، اس وقت روایات محفوظ کرنے والی جماعتِ صحابہ تیار نہیں ہوئی تھی، اس لیے اولادِ نرینہ کی تعداد میں اختلاف ہے۔

فرزندانِ گرامی:

معتبر اور مستند قول یہ ہے کہ تین صاحبزادے تھے:

1. قاسم
2. عبداللہ (جن کو طیب اور طاہر کے لقب سے بھی پکارا جاتا تھا۔)
3. ابراہیم

قاسم اور عبداللہ سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ انہی عبداللہ کا دوسرا نام طیب و طاہر بھی تھا۔ (1)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد میں سب سے پہلے حضرت قاسم پیدا ہوئے اور بعثت سے پہلے انتقال کر گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم ان ہی کی نسبت سے تھی۔

حضرت ابراہیم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّ ولد ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے، یہ آخری اولاد تھے۔ حضرت ابراہیم کے سوا تمام اولاد سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی کے بطن سے ہے اور کسی بیوی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ (2)

ابراہیم کی ولادت ذوالحجہ ۸ھ (مئی) میں ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساتویں دن دو دنبے قربان کر کے عقیقہ کیا۔ (3) بچے کا نام اپنے جدِّ امجد کے نام پر "ابراہیم" رکھا۔ مدینہ کے مضافات میں رہائش پذیر ایک لوہار ابوسیف رضی اللہ عنہ کی اہلیہ اُمّ سیف بچے کی دائی مقرر ہوئیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بیٹے سے بہت محبت تھی۔ گاہے گاہے اسے دیکھنے ابوسیف رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے جاتے۔ بچے کو گود میں لیتے، سونگھتے اور چومتے۔ (4)

ابراہیم ابھی دودھ پیتے بچے تھے کہ سخت بیمار ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوسیف رضی اللہ عنہ کے گھر گئے، بچے کو گود میں لیا جس کی حالت نازک تھی، کچھ ہی دیر میں معصوم جان دارِ فانی سے رخصت ہو گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے آنسوؤں کی

---

(1) بعض سیرت نگار کہتے ہیں کہ طیب اور طاہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو صاحبزادے تھے جو حضرت قاسم اور حضرت عبداللہ کے علاوہ تھے۔

(2) عیون الاثر، ابن سید الناس: ۲/۳۵۶، ۳۵۷ ط دار القلم

(3) سبل الهدى والرشاد: ۱۱/۲۱ (4) صحیح مسلم، ح: ۲۱۶۷؛ صحیح البخاری، ح: ۱۳۰۳

لڑیاں بہہ پڑیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہمراہ تھے، کہنے لگے: "اللہ کے رسول! آپ بھی رو رہے ہیں؟"

فرمایا: "یہ تو رحمت کی علامت ہے۔" پھر لختِ جگر کی نعش کی طرف متوجہ ہو کر گویا ہوئے:

إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ، وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ، وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يَرْضَىٰ رَبُّنَا، وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ۔

(آنکھ سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ دل غمزدہ ہے۔ مگر ہم وہی کہیں گے جس سے اللہ عزوجل راضی ہو۔ اے ابراہیم! ہم تیری جدائی پر بہت رنجیدہ ہیں۔) ①

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: "ابراہیم کی موت شیر خوارگی کے دوران ہوئی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جنت میں اس کے لیے دو دائیاں مقرر کر دی ہیں جو اس کی شیر خوارگی کی تکمیل کریں گی۔" ②

یہ واقعہ دس ربیع الاوّل (مکی) سنہ ۱۰ ہجری کا ہے۔ ابراہیم کی عمر سترہ مہینے تھی۔ ③

ابراہیم کی وفات کے دن سورج گرہن ہو گیا۔ عربوں میں پہلے ہی مشہور تھا کہ سورج گرہن یا چاند گرہن کسی عظیم شخصیت کی وفات کی علامت ہوتے ہیں۔ چنانچہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ ابراہیم کی موت کے باعث سورج گرہن ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان توہمات کی تردید کے لیے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا:

"سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ انہیں کسی کی موت کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا۔ جب تم انہیں گرہن لگتے دیکھو تو اس وقت تک نماز پڑھا کرو جب تک یہ گرہن سے نکل نہ آئیں۔" ④

دخترانِ ذی شان:

صاحبزادیاں بالاتفاق چار تھیں:

1. سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا
2. سیّدہ رُقیّہ رضی اللہ عنہا
3. سیّدہ اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا
4. سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

چاروں صاحبزادیاں بڑی ہوئیں، بیاہی گئیں، اسلام لائیں اور ہجرت کی۔ اگلے صفحات میں ان کے حالات مختصراً پیش خدمت ہیں۔

---

① صحیح البخاری، ح: ۱۳۰۳، کتاب الجنائز؛ صحیح مسلم، ح: ۶۱۶۷
② صحیح مسلم، ح: ۶۱۶۸
③ سبل الهدیٰ والرشاد: ۲۱/۱۱
④ صحیح البخاری، ح: ۱۰۶۰، باب الدعاء فی الخسوف

سَیِّدہ زینب رضی اللہ عنہا:

سَیِّدہ زینب رضی اللہ عنہا صاحب زادیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ بعثت سے دس سال پہلے پیدا ہوئیں، اسلام لائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ابتدائی سخت ترین آزمائش کے ایام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ①

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بازاروں میں دین کی دعوت دیتے تو لوگ آپ پر مٹی پھینکتے، طرح طرح کی ایذائیں دیتے۔ سَیِّدہ زینب رضی اللہ عنہا وہاں پہنچ جاتیں اور اپنے پیارے والد کو سہارا دیتیں۔ ②

ان کا نکاح اپنے خالہ زاد ابوالعاص بن ربیع سے ہوا تھا جن کا تعلق قریش کے خاندان بنوعبدِ شمس سے تھا۔ (بعض لوگ انہیں اُموی بتاتے ہیں جو غلط ہے۔) ابوالعاص کا اصل نام لَقِیط تھا۔ یہ سَیِّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سگی بہن ہالہ کے صاحبزادے تھے۔ ان کا شمار مکہ کے شریف ترین نوجوانوں میں ہوتا تھا۔ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر انہوں نے سَیِّدہ زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ تاہم سَیِّدہ زینب رضی اللہ عنہا ہجرت نہ کر سکیں۔

ابوالعاص غزوۂ بدر میں گرفتار ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وعدے پر رہا کیا کہ واپس جا کر زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ بھیج دیں گے۔ ابوالعاص نے وعدہ نبھانے کا وعدہ کیا۔ ③ کچھ دنوں بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کو لینے خفیہ طور پر مکہ کے قریب پہنچ گئے۔ اُدھر ابوالعاص نے سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کو اپنے بھائی کنانہ کے ساتھ اونٹ پر بٹھا کر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی طرف روانہ کر دیا مگر مشرکین نے مطلع ہو کر ان کا راستہ روک لیا۔ اس موقع پر ہبّار بن اسود کی دست درازی سے سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کا حمل ضائع ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد ابوالعاص نے زینب رضی اللہ عنہا اور اپنے دونوں بچوں: علی اور اُمامہ کو رات کی تاریکی میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیا اور وہ انہیں مدینہ لے آئے۔ ④

جمادی الاولیٰ سن چھ ہجری میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے شام سے واپس آنے والے ایک مکی قافلے پر چھاپہ مارا جس میں ابوالعاص بھی گرفتار ہو گئے۔ مدینہ پہنچ کر انہوں نے اپنی زوجہ سَیِّدہ زینب رضی اللہ عنہا کی پناہ لی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امان کو باقی رکھا اور سَیِّدہ زینب رضی اللہ عنہا کی درخواست پر ابوالعاص کو ان کا سامان بھی لوٹا دیا۔ ابوالعاص مکہ چلے گئے اور صلح حدیبیہ سے پانچ ماہ پہلے مدینہ واپس آ کر اسلام کا اعلان کیا۔ ⑤

الغرض یوں میاں بیوی کے فراق کا زمانہ ختم ہوا اور دونوں نے اس کے بعد تقریباً اٹھارہ مہینے ساتھ گزارے مگر سَیِّدہ زینب رضی اللہ عنہا کی مدتِ حیات زیادہ نہ ہوئی اور وہ ۸ ہجری میں وفات پا گئیں۔ ⑥

---

① سیر اعلام النبلاء: ۲۴۶/۲ ط الرسالۃ

② مجمع الزوائد للهیثمی، ح: ۹۸۲۸، ۹۸۲۷

③ سیر اعلام النبلاء: ۲۴۷/۲، ط الرسالۃ

④ تاریخ دمشق: ۶۷/۵، ۴

⑤ الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۳۳/۸ ط صادر

⑥ سیر اعلام النبلاء: ۲۵۰/۲

سَیّدَہ رُقَیّہ رضی اللہ عنہا:

سَیّدَہ رُقَیّہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بیٹی تھیں۔ بعثت سے سات سال پہلے ولادت ہوئی۔ ابولہب کے بیٹے عُتبہ سے منسوب تھیں۔ فقط نکاح ہوا تھا، رخصتی نہیں ہوئی۔ جب سورۂ لہب نازل ہوئی تو ابولہب کے بہکانے پر عتبہ نے انہیں طلاق دے دی۔ ① اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سَیّدَہ رُقَیّہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے جب حبشہ کی طرف ہجرت کی تو سَیّدَہ رُقَیّہ رضی اللہ عنہا بھی ہمراہ تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

''حضرت لوط علیہ السلام کے بعد یہ دونوں پہلا کنبہ تھا جس نے اللہ کی خاطر ہجرت کی۔'' ②

سَیّدَہ رُقَیّہ رضی اللہ عنہا کچھ مدت بعد اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ سے واپس مکہ آ گئیں اور پھر مدینہ ہجرت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو سَیّدَہ رُقَیّہ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں۔ ان کی تیمارداری کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رُقَیّہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لیے مدینہ میں چھوڑا تھا۔ جس دن بدر کی فتح کی خبر مدینہ پہنچی اسی دن سَیّدَہ رُقَیّہ رضی اللہ عنہا نے انتقال فرمایا۔ ③

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدر سے واپسی ہوئی تو گھر میں خواتین کو سَیّدَہ رُقَیّہ رضی اللہ عنہا کی موت پر روتے پایا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انہیں سختی سے چپ کرانے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روک دیا، پھر خواتین کو مخاطب کر کے کہا:

''شیطانی نوحے سے بچتی رہنا۔ جہاں تک دل (کے غم) اور آنکھ (کے آنسوؤں) کی بات ہے تو یہ اللہ کی طرف سے ہے اور رحم دلی کی علامت ہے۔ جو زبان سے (شکوہ شکایت یا نوحہ) ہو یا ہاتھ سے (سینہ کوبی وغیرہ) ہو، وہ شیطان کی طرف سے ہے۔'' ④

سَیّدَہ اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہا:

اُمِّ کلثوم رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری صاحبزادی ہیں۔ ان کا کوئی اصل نام منقول نہیں۔ بظاہر یہ کنیت ہی ان کا نام تھا۔ ان کا نکاح ابولہب کے بیٹے عُتَیبہ سے ہوا تھا۔ باپ کے کہنے پر اس نے بھی انہیں رخصتی سے قبل طلاق دے دی۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ طلاق دے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بولا: ''میں آپ کے دین کا منکر ہوں۔ میں نے آپ کی بیٹی کو طلاق دے دی۔ نہ وہ مجھے پسند کرتی ہے نہ میں اسے۔'' اس کے بعد وہ بدبخت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھپٹا اور آپ کا کرتا چاک کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بددعا نکل گئی کہ ''اے اللہ! اس پر کوئی درندہ مسلط فرما۔''

کچھ دنوں بعد قریش کا تجارتی قافلہ شام روانہ ہوا۔ ابولہب اور عُتَیبہ بھی اس قافلے میں تھے۔ زرقاء نامی علاقے

---

① طبقات ابن سعد: ۳۶/۸، صادر

② سیر اعلام النبلاء: ۲۵۱/۲، الرسالۃ

③ التاریخ الاوسط للبخاری: ۱۹/۱، ط دار الوعی

④ طبقات ابن سعد: ۳۷/۸، ط صادر

میں پڑاؤ کے دوران میں رات کے وقت ایک شیر آ گیا۔ وہ قافلہ والوں کے چہروں کو دیکھتا اور سونگھتا ہوا عُتَیبہ تک پہنچا تو فوراً اس کا سر چبا لیا۔ عُتَیبہ کا اسی وقت دم نکل گیا اور شیر ایسا غائب ہوا کہ کہیں اس کا پتہ نہ چلا۔ ①

اُم کُلثوم رضی اللہ عنہا اپنی بہن سَیِّدَہ رُقَیَّہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ربیع الاوّل ۳ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ ② حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نکاح کے بارے میں فرمایا:

''میں نے اُم کُلثوم کا نکاح، عثمان سے وحیِ آسمانی ہی کے سبب کرایا ہے۔'' ③

اُم کُلثوم رضی اللہ عنہا چھ سال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہیں۔ شعبان ۹ھ میں انتقال ہوا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے نعش کو قبر میں اتارا۔ ④

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اس وقت فرمایا:

''اگر میری کوئی تیسری لڑکی ہوتی تو اسے بھی عثمان کے نکاح میں دے دیتا۔'' ⑤

کتبِ سیر و تواریخ میں سَیِّدَہ رُقَیَّہ رضی اللہ عنہا کی طرح سَیِّدَہ اُمّ کُلثوم رضی اللہ عنہا کے حالات بھی بہت مختصر ملتے ہیں تاہم نصیحت والوں کے لیے ان چند جھلکیوں میں بھی بہت کچھ سامانِ نصیحت ہے۔

سَیِّدَہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا:

آپ رضی اللہ عنہا کا نام فاطمہ تھا۔ زہراء اور بتول آپ کے لقب تھے۔ بتول اس لیے کہا جاتا ہے کہ اپنے فضل و کمال کی وجہ سے دنیا کی عورتوں سے ممتاز تھیں، یا اس لیے کہ ماسوا اللہ سے لاتعلق تھیں۔ سیرت کی نورانیت کے باعث زہراء کہلاتی تھیں۔ بعثت سے پانچ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ تمام صاحبزادیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ ⑥ کم عمری کے باوجود نہایت باادب اور دلیر تھیں، اپنے والد ماجد کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ⑦

ہجرتِ مدینہ کے بعد ۲ ہجری میں آپ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ہو گیا۔ رخصتی کچھ عرصے بعد شوال ۲ھ کے اوائل میں ہوئی۔ بعض صحابیات نے رخصتی سے پہلے کچھ ضروری سامان مہیا کیا جو یہ تھا: کھجور کی چھال سے بھرے ہوئے دو بچھونے، دو تکیے، پانی پینے کا پیالہ، ایک مشک، ایک تخت، دو چکیاں، دو مٹکے۔ اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا نے دلہن کو گھر پہنچایا۔

---

① دلائل النبوۃ للبیہقی: ۲/۳۳۸، ۳۳۹، ط العلمیۃ

② طبقات ابن سعد: ۸/۳۷ ط صادر

③ التاریخ الکبیر للبخاری: ۳/۳۰۸، ط حیدر آباد دکن

④ صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب من یدخل قبر المرأۃ

⑤ البدایۃ و النہایۃ: ۸/۲۳۳

⑥ طبقات ابن سعد: ۸/۱۹، ط صادر؛ سیر اعلام النبلاء: ۳/۲۱۵، ط الرسالۃ

⑦ صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب اذا القی علی ظہر المصلی قذراً

کمرے میں ایک مٹی کا چبوترا تھا جس پر دنبے کی ایک کھال بچھا کر میاں بیوی رات کو سو جاتے۔ دن کو اسی کھال میں بھوسہ ڈال کر اس اونٹنی کو کھلاتے جس پر گھر کے لیے پانی لاد کر لایا جاتا تھا۔ ①

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی صاحبزادی ہونے کے باوجود سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی بڑی سادہ اور پُرمشقت تھی۔ گھر میں خود صفائی کرتیں، خود لکڑیاں جلا کر کھانا پکاتیں، کنوئیں سے پانی کی مشک بھر کر لاتیں جس سے بدن پر نشان پڑ گئے تھے۔ خود چکی چلا کر آٹا پیستیں جس سے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ مفلسی کی وجہ سے گھر کے کاموں میں کوئی معاون رکھنے کی بھی استطاعت نہ تھی۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ غلام آئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خیال ہوا کہ گھر کے کاموں میں معاونت کے لیے ایک غلام لے لیا جائے۔ ان کے کہنے پر سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں مگر شرم کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکیں اور چپ چاپ لوٹ آئیں۔ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ فاطمہ آئی تھیں۔

بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جا کر مدعا عرض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا؛ کیوں کہ اہلِ صفہ بھوکے ہیں، میرے پاس کچھ نہیں کہ میں ان پر خرچ کروں، میں ان غلاموں کو بیچ کر ان کی قیمت ان پر خرچ کروں گا۔''

رات کو آپ بیٹی کے گھر تشریف لائے اور فرمایا:

''جو تم نے مانگا، کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ بتاؤں۔ جب تم سونے لگو تو ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ یہ تمہارے لیے خادم سے بہتر ہے۔''

سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''میں اللہ اور اس کے رسول سے راضی ہوں۔'' ②

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں: ''میں نے گفتگو میں فاطمہ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ کسی کو نہیں دیکھا۔ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو جاتے، انہیں چومتے اور خوش آمدید کہتے۔ ③

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی اس بیٹی سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے منبر پر ارشاد فرمایا:

''فاطمہ میرے جسد کا ٹکڑا ہے۔ جس نے اسے پریشان کیا، اس نے مجھے پریشان کیا۔ جس نے اسے ایذاء دی، اس نے مجھے ایذاء دی۔'' ④

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر آپ رضی اللہ عنہا کو اتنا غم ہوا کہ بیمار پڑ گئیں۔ اس کے بعد آپ کو کبھی ہنستے نہیں دیکھا گیا۔ چھ مہینے

---

① طبقات ابن سعد: ۸/۲۲، ۲۳، ط صادر

② مسند احمد، ح: ۱۱۴۱، ۱۳۱۳؛ فضائل الصحابہ للامام احمد بن حنبل، ح: ۱۲۰۷

③ سنن ابی داؤد، ح: ۵۲۱۷، کتاب الادب، ما جاء فی القیام

④ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل فاطمۃ بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

بعد ماہ رمضان ۱۱ھ میں انتقال فرمایا۔ عمر ۲۸ یا ۲۹ سال تھی۔ ①

ایک قول کے مطابق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، دوسرے قول کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تیسرے قول کے مطابق حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ رات کے وقت بقیع میں تدفین ہوئی۔ حضرت علی، حضرت عباس اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہم نے قبر میں اتارا۔ ②

نواسے اور نواسیاں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب اپنی بیٹیوں کی اولاد یعنی نواسوں اور نواسیوں ہی سے چلا ہے۔ ذیل میں بناتِ طیبات کی اولاد کا مختصر حال پیش کیا جارہا ہے۔

سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کی اولاد:

سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کا ایک بیٹا تھا جس کا نام علی تھا۔ ایک بیٹی تھی جس کا نام اُمامہ تھا۔

❁ اُمامہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت محبت فرماتے تھے۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی مانوس تھیں کہ بعض اوقات نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھے پر چڑھ جاتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ سے ان کو اتار دیتے تھے۔ ان کی والدہ سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا ۸ھ میں انتقال کر گئی تھیں، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بن ماں کی بچی پر زیادہ شفقت فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہدیہ میں سونے کا ہار آیا۔ تمام ازواج مطہرات جمع تھیں اور اُمامہ رضی اللہ عنہا گھر کے ایک گوشے میں مٹی سے کھیل رہی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں یہ ہار اہلِ خانہ میں اپنی سب سے پیاری کو دوں گا۔“ سب کا گمان یہ تھا کہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو عطا فرمائیں گے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امامہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور وہ ہار ان کے گلے میں ڈال دیا۔ ③

سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُمامہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی تو مُغیرہ بن نوفل سے نکاح ہوا۔ مُغیرہ سے حضرت اُمامہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک لڑکا ہوا جس کا نام یحییٰ تھا۔ ④

❁ سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کے بیٹے علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے نواسے تھے۔ ہجرتِ مدینہ سے سات آٹھ سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔

عرب کے دستور کے مطابق انہوں نے شیر خوارگی کا زمانہ ایک دیہی آبادی بنو غاضر میں گزارا۔ چونکہ اس وقت تک ان کے والد نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا تھا اور فرمایا:

---

① المعجم الکبیر للطبرانی، ح: ۳۹۸/۲۲، ۳۹۹، ط مکتبۃ ابن تیمیہ قاہرہ

② معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم: ۱۸۵/۶ ح ۳۱۹۲، ط دار الوطن؛ الاستیعاب: ۱۸۹۳/۴؛ الاصابۃ: ۲۳/۸، ۲۵

③ طبقات ابن سعد: ۳۰/۸، ط صادر؛ اسد الغابۃ: ۲۰/۷ ط العلمیۃ ④ اسد الغابۃ: ۲۰/۷

’’میں اس کی کفالت کا زیادہ حق دار ہوں۔‘‘ ①

علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبت تھی۔ فتح مکہ کے دن وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اونٹنی پر سوار تھے۔ ② ایک قول کے مطابق ان کی وفات لڑکپن میں ہوئی۔ دوسرے قول کے مطابق جوان ہو کر جنگِ یرموک میں شہید ہوئے۔ ③

سیّدہ رُقَیَّہ رضی اللہ عنہا کی اولاد:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور سیّدہ رُقَیَّہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نواسا ہوا جس کا نام عبد اللہ رکھا گیا۔ مشہور روایات کے مطابق عبد اللہ کا انتقال اپنی والدہ کی وفات سے ایک سال قبل یعنی سن ایک ہجری میں ہو گیا تھا۔ ان کی عمر چھ سال تھی۔ ④

سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد:

سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں تین لڑکے: حسن، حسین اور محسن اور دو لڑکیاں: اُمِّ کلثوم اور زینب تھیں۔ محسن کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔ باقی اولاد جوان ہوئی اور ان سے نسب چلا۔ ⑤ اُمِّ کلثوم کا نکاح ۱۷ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ ان سے ایک لڑکی رُقَیَّہ اور ایک لڑکا زید پیدا ہوئے۔ ⑥

حضراتِ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد محبت تھی۔ ان کے فضائل بکثرت ہیں۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں یہ عظیم بشارت دی ہے: ’’حسن و حسین جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔‘‘ ⑦

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اپنی خصوصی محبت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے تھے:

’’حسن و حسین دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔‘‘ ⑧

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو دیکھتے تو زبان سے دعائیں نکلتیں۔ عموماً یہ دعا فرماتے:

’’اے اللہ مجھے ان سے محبت ہے۔ تو بھی ان سے محبت فرما۔‘‘ ⑨

---

① اسد الغابۃ: ۱۱۸/۳؛ الاصابۃ: ۳۶۹/۳، ترجمۃ: علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہ
② المعجم الکبیر للطبرانی: ۴۲۳/۲۲، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ قاہرۃ
③ الاصابۃ: ۳۶۹/۴، ط العلمیۃ
④ الاصابۃ: ۱۶/۵، ۱۷، ط العلمیۃ
⑤ التبیین فی انساب قریش لابن قدامۃ، ص ۱۳۳
⑥ سیر اعلام النبلاء: ۵۰۲/۳، ط الرسالۃ؛ اسد الغابۃ: ۳۷۷/۷
⑦ سنن الترمذی، ح: ۳۷۶۸، قال الترمذی: حسن صحیح
⑧ سنن الترمذی، ح: ۳۷۷۰، قال الترمذی: ھذا حدیث صحیح؛ صحیح البخاری، ح: ۵۹۹۴، باب مناقب الحسن والحسین
⑨ سنن الترمذی، ح: ۳۷۸۲، قال الترمذی: ھذا حدیث حسن صحیح

رسول اللہ ﷺ کی اس خاص توجہ اور شفقت کو دیکھ کر تمام صحابہ کرام حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ ①

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی ولادت رمضان ۳ھ میں ہوئی۔ ② وہ تمام لوگوں میں حضور ﷺ سے سب زیادہ مشابہ تھے۔ ③ آپ رضی اللہ عنہ کی تربیت میں رحمتِ عالم ﷺ کی بھرپور توجہ شامل تھی۔ آپ کو اپنے نانا جان ﷺ کی کئی احادیث یاد تھیں۔ اس کے علاوہ آپ اپنے والد گرامی رضی اللہ عنہ اور والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا سے بھی احادیث روایت کیا کرتے تھے۔ ④ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ مجھے اپنی ایک ران پر اور حضرت حسن کو دوسری ران پر بٹھاتے۔ پھر ہمیں دعائیں دیتے تھے۔ ⑤

حضور ﷺ کی وفات کے وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر ساڑھے سات سال تھی۔ اس کے چھ ماہ بعد جب آپ کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی، والدہ ماجدہ سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ تاہم آپ کو والدِ ماجد اور خلفائے ثلاثہ نے اپنی آغوشِ شفقت میں رکھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب اپنے زمانے میں سرکاری وظائف کا نظام قائم کیا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لیے اکابر صحابہ کے برابر وظیفہ مقرر کیا۔ ⑦

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳/ص ۲۴۸ تا ۲۵۰

② الذریۃ الطاهرۃ للدولابی، ح: ۱۰۱ ③ سنن الترمذی، ح: ۳۷۷۶، قال الترمذی ہٰذا حدیث حسن صحیح

④ صحیح ابن حبان، ح: ۹۴۵؛ مسند احمد، ح: ۱۷۲۷، اسنادہ صحیح؛ صحیح ابن خزیمہ، ح: ۲۳۳۸، اسنادہ صحیح؛ شرح معانی الآثار، ح: ۲۹۹۶؛ الآحاد والمثانی، ح: ۴۱۶؛ سنن الترمذی، ح: ۳۷۸۴

⑤ صحیح البخاری، ح: ۶۰۰۳، باب وضع الصبی علی الفخذ

بعض لوگ یہ کہہ کر حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو زمرۂ صحابیت سے خارج قرار دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ تقریباً اڑھائی برس کے تھے اور حسین رضی اللہ عنہ ایک ڈیڑھ سال کے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اپنے کندھے پر اٹھا لیتے تھے (صحیح البخاری، ح: ۳۷۵۰) ان حضرات کے بقول سات آٹھ سال کے بچے کو اس طرح کاندھے پر نہیں اٹھایا جاتا، خصوصاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بوڑھے اور کمزور ہونے کے باوجود ایسا تبھی کر سکتے تھے جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ بہت چھوٹے ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اتنے بوڑھے نہ تھے کہ سات سال کے بچے کو اٹھانے سے بھی عاجز ہوتے۔ اس وقت ان کی عمر اکسٹھ برس تھی اور صحت اتنی اچھی تھی کہ زمانہ خلافت کے آغاز میں بعض مہمات پر خود لشکر لے کر گئے تھے۔ (البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۱۱ھ) نیز صحیح بخاری کی مذکورہ روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ایک ران پر اور دوسری ران پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھا لیتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کی عمروں میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ اگر مان لیا جائے کہ حضرت حسن رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت دو اڑھائی سال کے تھے تو ان کی اور اسامہ رضی اللہ عنہ کی عمر میں کم از کم سولہ سال کا فرق ہوتا۔ ایسے میں یہ نوبت کہاں آسکتی تھی کہ دونوں بیک وقت ایسی عمر میں ہوتے کہ دونوں کو گود میں بٹھایا جاتا۔ پس حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے وفاتِ نبوی کے وقت اتنا چھوٹا ہونے کی کہانی من گھڑت ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ان کی ولادت تین ہجری میں ہوئی تھی جیسا کہ تمام مورخین نے لکھا ہے اور اس وقت اسامہ رضی اللہ عنہ لگ بھگ دس سال کے تھے اور یہی وہ زمانہ تھا جب نبی اکرم ﷺ دونوں کو گود میں لے لیتے تھے۔ الغرض دونوں رسول اللہ ﷺ کی حیات میں لڑکے تھے۔ ایک بڑا تھا ایک چھوٹا۔ جب ایک کی صحابیت ثابت ہے تو دوسرے کی بھی ثابت ہو جاتی ہے۔

⑥ صحیح البخاری، ح: ۳۷۵۰؛ المستدرک علی الصحیحین، ح: ۴۷۸۳ علی شرط الصحیحین؛ فضائل الخلفاء الراشدین لابی نعیم الاصبہانی، ح: ۱۲۶

⑦ سیر اعلام النبلاء: ۳/ص ۲۵۹ ...... یہ سالانہ وظیفہ پندرہ ہزار درہم یعنی چالیس ہزار آٹھ سو ڈالر کے لگ بھگ تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جب شورش پسندوں نے فتنہ برپا کیا اور مدینہ منورہ میں آکر ان کے گھر کا محاصرہ کیا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان کے دفاع اور حفاظت میں پیش پیش رہے۔ اپنے والد گرامی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کے دستِ راست اور مشیر رہے۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے والد ماجد رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمانوں کے پانچویں خلیفہ بنے۔ آپ کا دارالخلافہ کوفہ تھا۔ چھ ماہ بعد آپ رضی اللہ عنہ اس منصب سے دست بردار ہو گئے اور حکومت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو سونپ کر خود مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور باقی زندگی وہیں گزاری۔ ۵۰ھ میں آپ رضی اللہ عنہ کو زہر دیا گیا جو آپ رضی اللہ عنہ کی وفات کا سبب بن گیا۔ ① (حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی سیاسی زندگی کے یہ نشیب و فراز تفصیل کے ساتھ آگے آرہے ہیں۔)

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی ولادت شعبان ۴ھ میں ہوئی۔ ② حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے نانا جان کی آغوشِ محبت میں تقریباً ساڑھے چھ سال گزارے۔ خلفائے ثلاثہ کے دور میں نہایت مکرم و محترم رہے۔ پھر اپنے والد کے دورِ خلافت میں ان کے ساتھ مدینہ سے عراق گئے اور ان کے معاون کی حیثیت سے سیاسی تجربہ حاصل کیا۔ والد محترم کی شہادت کے بعد اپنے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دستِ راست رہے۔ یزید کے دور میں آپ نے سیاسی نظام کو سنتِ خلفائے راشدین پر واپس لانے کی کوشش شروع کی اور اس دوران یکم محرم ۶۱ھ کو میدانِ کربلا میں شہید کر دیے گئے۔ ③ (سانحۂ کربلا کی تفصیل آگے بنو اُمیہ کے دورِ حکومت کے ذیل میں آئے گی۔)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ’’حسین میرا ہے اور میں حسین کا۔ جو حسین سے محبت کرے، اللہ اس سے محبت کرے۔ حسین قبائل میں سے ایک قبیلہ ہے۔‘‘ ④

چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کی نسل بہت پھیلی اور اس میں بڑے بڑے علماء، اولیاء اور اشراف پیدا ہوئے۔

خلاصہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور نواسیاں کل آٹھ تھے:

① علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہ
② اُمامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہا
③ عبداللہ بن عثمان
④ حسن بن علی رضی اللہ عنہ
⑤ حسین بن علی رضی اللہ عنہ
⑥ محسن بن علی
⑦ اُمِ کلثوم بنتِ علی
⑧ زینب بنت علی

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳ص ۲۵۵ تا ۲۷۸ ② الذریة الطاہرة للدولابی، ح: ۱۰۱

③ سیر اعلام النبلاء: ۳ص ۲۸۰ تا ۳۲۲

④ "حُسَيْنٌ مِنِّي وَأَنَا مِنْ حُسَيْنٍ، أَحَبَّ اللهُ مَنْ أَحَبَّ حُسَيْنًا، حُسَيْنٌ سِبْطٌ مِنَ الأَسْبَاطِ" (سنن الترمذی، ح: ۳۷۷۵، قال الترمذی: هٰذا حدیث حسن) یہاں "سبط من الاسباط" سے بعض علماء نے یہ مراد لیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نسل بہت پھیلے گی اور گویا وہ ایک الگ قبیلہ بن جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (مرقاة المفاتیح: ۹ص ۳۹۸۱) چنانچہ ترجمہ اس کے مطابق کیا گیا ہے۔

مشق

❶ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حُسن و جمال پر ایک مختصر نوٹ تحریر فرمائیے۔

❷ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسی تین چیزوں سے خود کو اور کونسی تین چیزوں سے دوسروں کو بالکل بچا رکھا تھا؟

❸ اُمّ المؤمنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اسلام کے لیے قربانیوں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

❹ اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ممتاز خصوصیات بیان کیجیے۔

❺ اُمّ المؤمنین سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا واقعہ مستند روایات کے مطابق تحریر فرمائیے۔

❻ درج ذیل میں سے کسی ایک شخصیت پر مختصر نوٹ لکھیے:

- اُمّ المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا
- اُمّ المؤمنین سیدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا
- اُمّ المؤمنین سیدہ اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا
- اُمّ المؤمنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا

❼ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی زندگی اور صفات پر روشنی ڈالیے۔

❽ درج ذیل میں سے دو عنوانات پر مختصر نوٹ لکھیے:

- سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
- سیدہ رُقیہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
- سیدہ اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
- علی بن ابی العاص
- امامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہا
- حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما

عملی کام:

- حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندانِ مبارک اور آلِ اطہار کو ایک شجرے کی شکل میں واضح کیجیے۔
- ''اسلام جبراً نہیں پھیلایا گیا؟'' اس عنوان پر طلبہ پانچ پانچ منٹ کی تقریر تیار کر کے ساتھیوں کو سنائیں۔

کتب برائے مطالعہ:

- سیرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، از حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ
- رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم از علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری مرحوم
- تذکرہ اہلِ بیت اطہار، از حضرت مولانا محمد عبد المعبود مدظلہ العالی
- نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، شیخ خضری الباجوری۔ (عربی یا اردو)

جدول: اہم واقعاتِ سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نمبر	اہم واقعات	قمری تاریخ	شمسی تاریخ	وضاحت
۱	ولادتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۸ یا ۹ ربیع الاوّل	۱۳ مئی ۵۶۹ء	۵۵ سال قبل از ہجرت
۲	بعثت۔ پہلی وحی	۹ رمضان	۱۹ مئی ۶۰۹ء	۱۳ سال ۶ ماہ قبل از ہجرت
۳	ہجرتِ حبشہ اولیٰ	رجب ۵ نبوی	مارچ ۶۱۴ء	۸ سال ۷ ماہ قبل از ہجرت
۴	ہجرتِ حبشہ ثانیہ	۷ نبوی	موسم خزاں ۶۱۵ء	افریقہ میں اشاعتِ اسلام کی جڑ
۵	سفرِ طائف	شوال ۱۱ نبوی	جولائی ۶۱۹ء	تکالیف کی انتہاء
۶	بیعتِ عقبہ اولیٰ	ذوالحجہ ۱۱ نبوی	اگست ۶۲۰ء	اسلام کو مددگار مل گئے
۷	سفرِ معراج	رجب ۱۲ نبوی	اپریل ۶۲۱ء	اسلام کی عالمگیریت کا اعلان
۸	بیعتِ عقبہ ثانیہ	ذوالحجہ ۱۲ نبوی	ستمبر ۶۲۱ء	اسلام کے عروج کی ابتداء
۹	ہجرتِ مدینہ	۱۲ ربیع الاوّل ۱ھ	۲۴ ستمبر ۶۲۲ء	تاسیسِ ریاستِ مدینہ
۱۰	غزوۂ بدر	۱۷ رمضان ۲ھ	۷ جون ۶۲۴ء	اسلام کی پہلی فتح
۱۱	غزوۂ احد	۱۵ شوال ۳ھ	۳۰ مارچ ۶۲۵ء	شکست کھا کر بھی استقلال
۱۲	غزوۂ خندق	شوال، ذوالقعدہ ۵ھ	۵ تا ۲۵ مارچ ۶۲۷ء	کفار کا مدینہ پر آخری حملہ
۱۳	صلحِ حدیبیہ	ذوالقعدہ ۶ھ	مارچ ۶۲۸ء	قرآن کے الفاظ میں فتحِ مبین
۱۴	غزوۂ خیبر	صفر ۷ھ	جون ۶۲۸ء	یہود کا آخری مرکز مغلوب
۱۵	سلاطین کو دعوتِ اسلام	محرم تا ربیع الاوّل ۷ھ	مئی تا جولائی ۶۲۸ء	اسلام کی دعوت عالمگیر ہوئی
۱۶	عمرۂ قضا	ذوالقعدہ ۷ھ	مارچ ۶۲۹ء	بعد از ہجرت کعبہ کی پہلی زیارت
۱۷	جنگِ موتہ	جمادی الاولیٰ ۸ھ	اگست ۶۲۹ء	رومیوں سے پہلی ٹکر
۱۸	فتح مکہ	۱۷ رمضان ۸ھ	۵ جون ۶۳۰ء	غلبۂ اسلام اور عفو و کرم کا نمونہ
۱۹	غزوۂ تبوک	جمادی الآخرہ، رجب ۹ھ	ستمبر، اکتوبر ۶۳۰ء	رومیوں کی پسپائی
۲۰	حجۃ الوداع، یوم عرفہ	۹ ذوالحجہ ۱۰ھ	۷ مارچ ۶۳۲ء	اسلام کی تکمیل
۲۱	وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ	۹ جون ۶۳۲ء	تاریخ کا الم ناک ترین دن

حصہ دوم

خلافتِ راشدہ

۱۱ھ تا ۴۱ھ (۶۳۲ء تا ۶۶۱ء)

کل مدت تیس سال

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:
"اَلْخِلَافَۃُ ثَلَاثُوْنَ سَنَۃً."

تبویب

پہلا باب:

خلفائے راشدین

دوسرا باب:

خلافتِ راشدہ میں نظم ونسق اور
تہذیب وتمدن

پہلا باب

خلفائے راشدین

تعارف:

خلفائے راشدین چار ہیں اور ان کی خلافت کا اعتقاد ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے:

❁ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ۱۱ھ تا ۱۳ھ (۶۳۲ء تا ۶۳۴ء) مدتِ خلافت: ۲ سال ۳ ماہ	❁ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ۱۳ھ تا ۲۳ھ (۶۳۴ء تا ۶۴۴ء) مدتِ خلافت: ۱۰ سال ۶ ماہ
❁ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۲۴ھ تا ۳۵ھ (۶۴۴ء تا ۶۵۶ء) مدتِ خلافت: تقریباً ۱۲ سال	❁ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ۳۵ھ تا ۴۰ھ (۶۵۶ء تا ۶۶۱ء) مدتِ خلافت: ۴ سال ۹ ماہ

❁ تتمہ: خلافتِ حضرت حسن رضی اللہ عنہ، ۶ ماہ

اہداف ومقاصد:

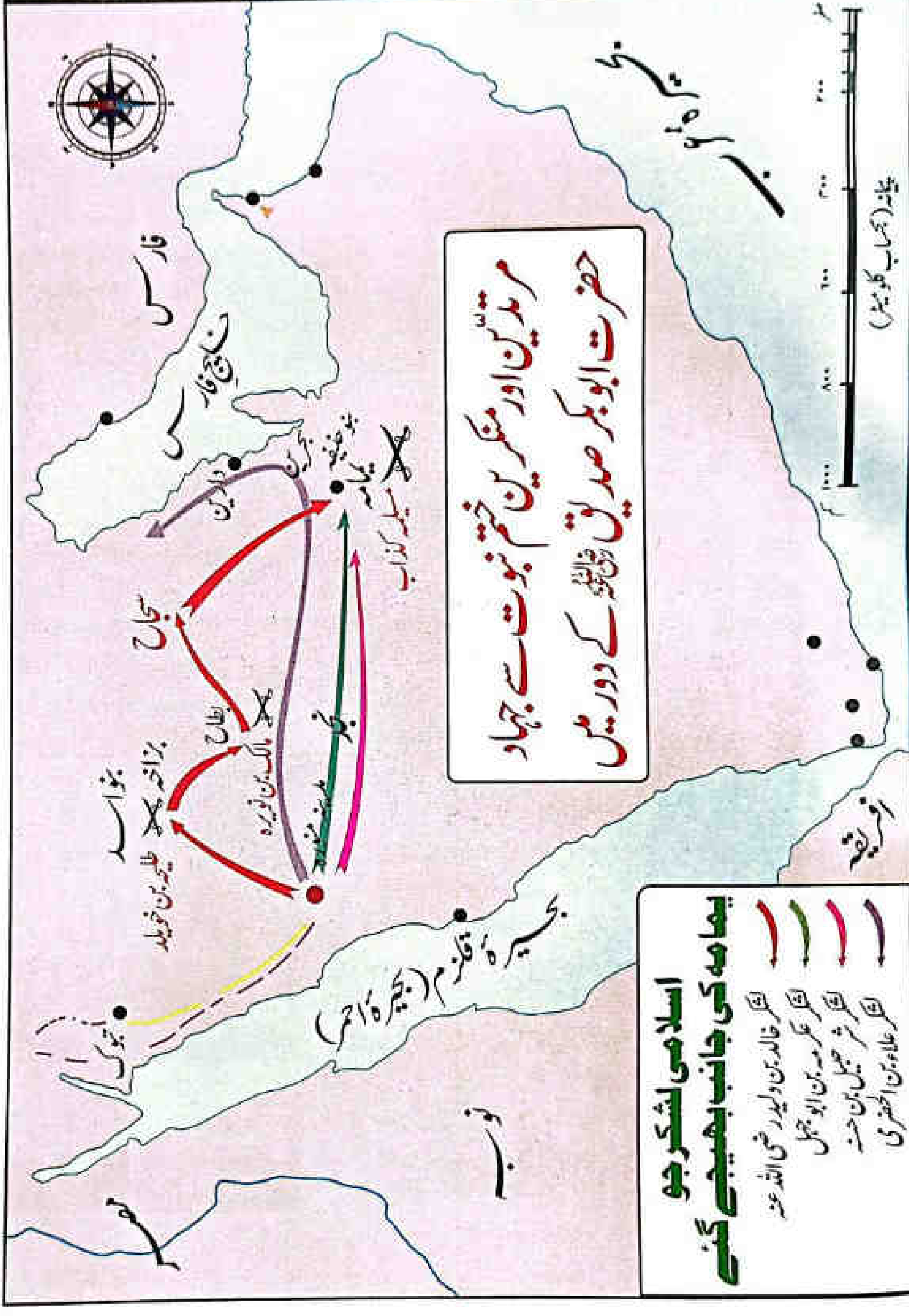
اس باب کو پڑھ کر آپ ان شاء اللہ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

❶ خلافت راشدہ کے اصطلاحی مفہوم، دورِ خلافتِ راشدہ کی خصوصیات اور خلفائے راشدین کے مقام کو سمجھ سکیں۔ ❷ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ابھرنے والے فتنوں کی سرکوبی میں صحابہ کرام کی قربانیوں سے آگاہ ہو سکیں۔

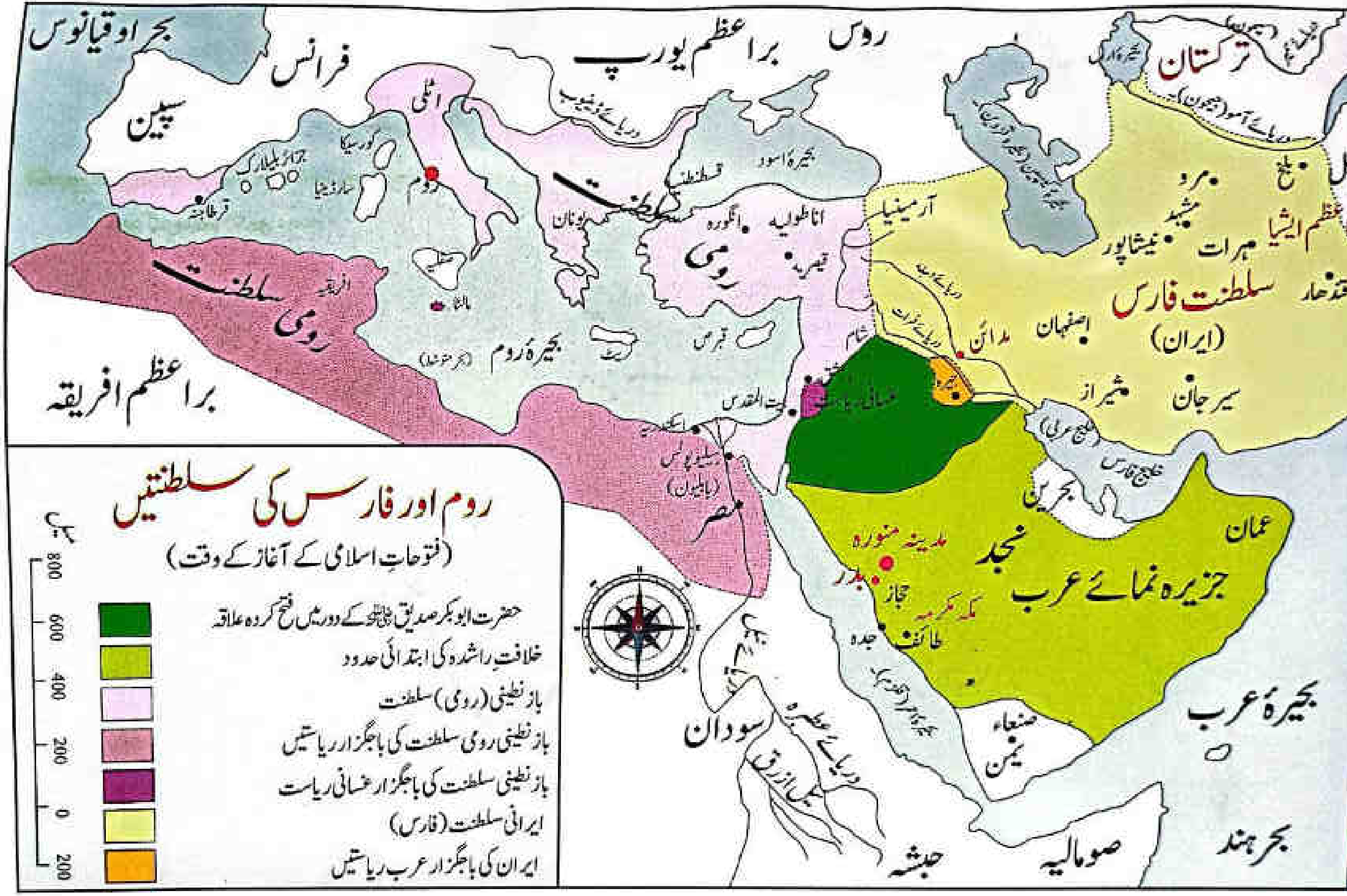
❸ دورِ صدیقی، دورِ فاروقی اور دورِ عثمانی کی فتوحات سے واقف ہو سکیں۔

❹ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کی جانے والی سازش اور بغاوت کو گہرائی کے ساتھ جان سکیں۔ ❺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں صحابہ کرام کے باہمی اختلافات کو اہلِ سنت والجماعت کے مذہب کے مطابق سمجھ سکیں اور مشاجرات کے بارے میں صحیح اسلامی نظریے سے واقف ہو سکیں۔

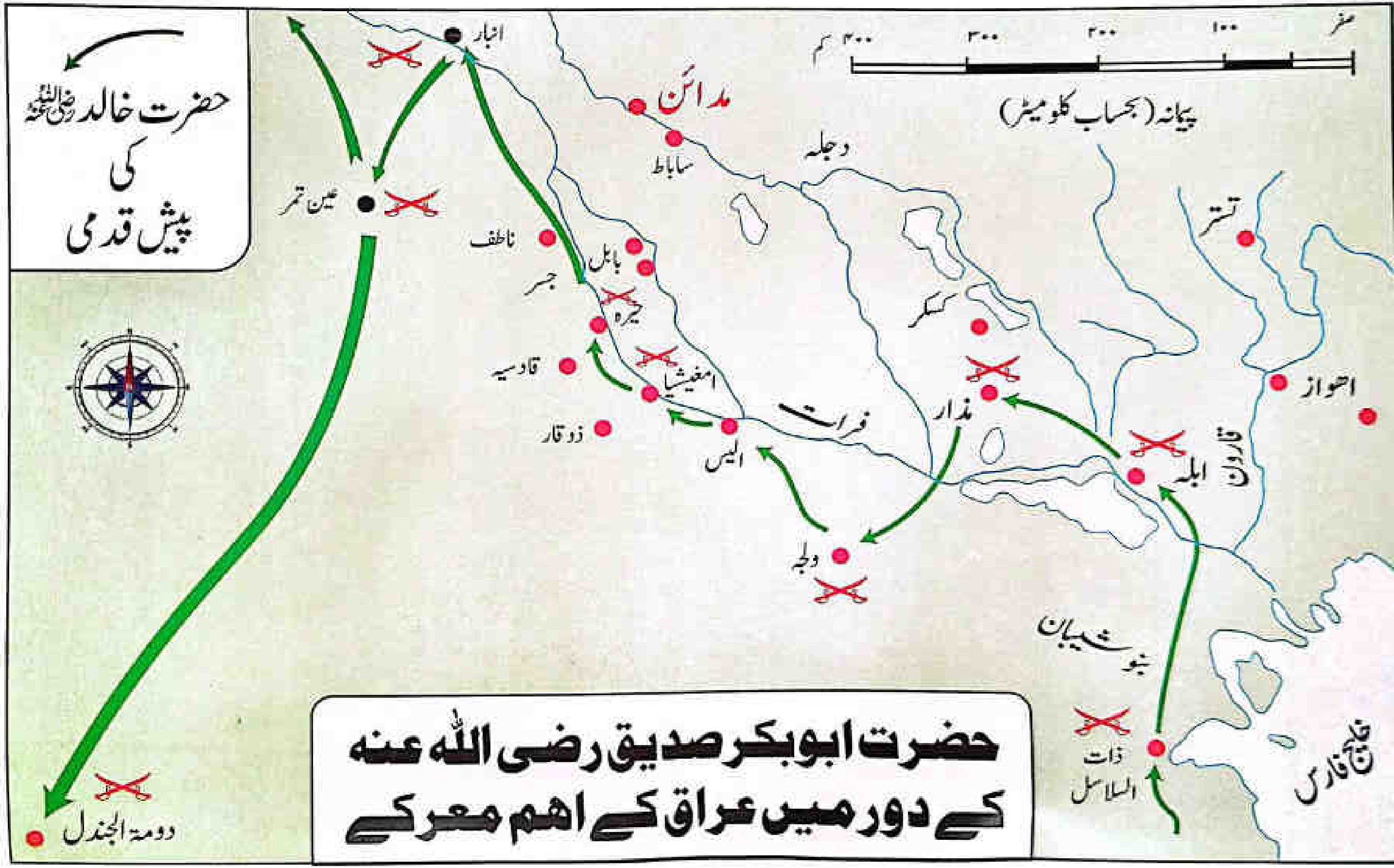
مرتدین سے جہاد



خلافتِ راشدہ کے آغاز میں روم اور فارس کی سلطنتیں

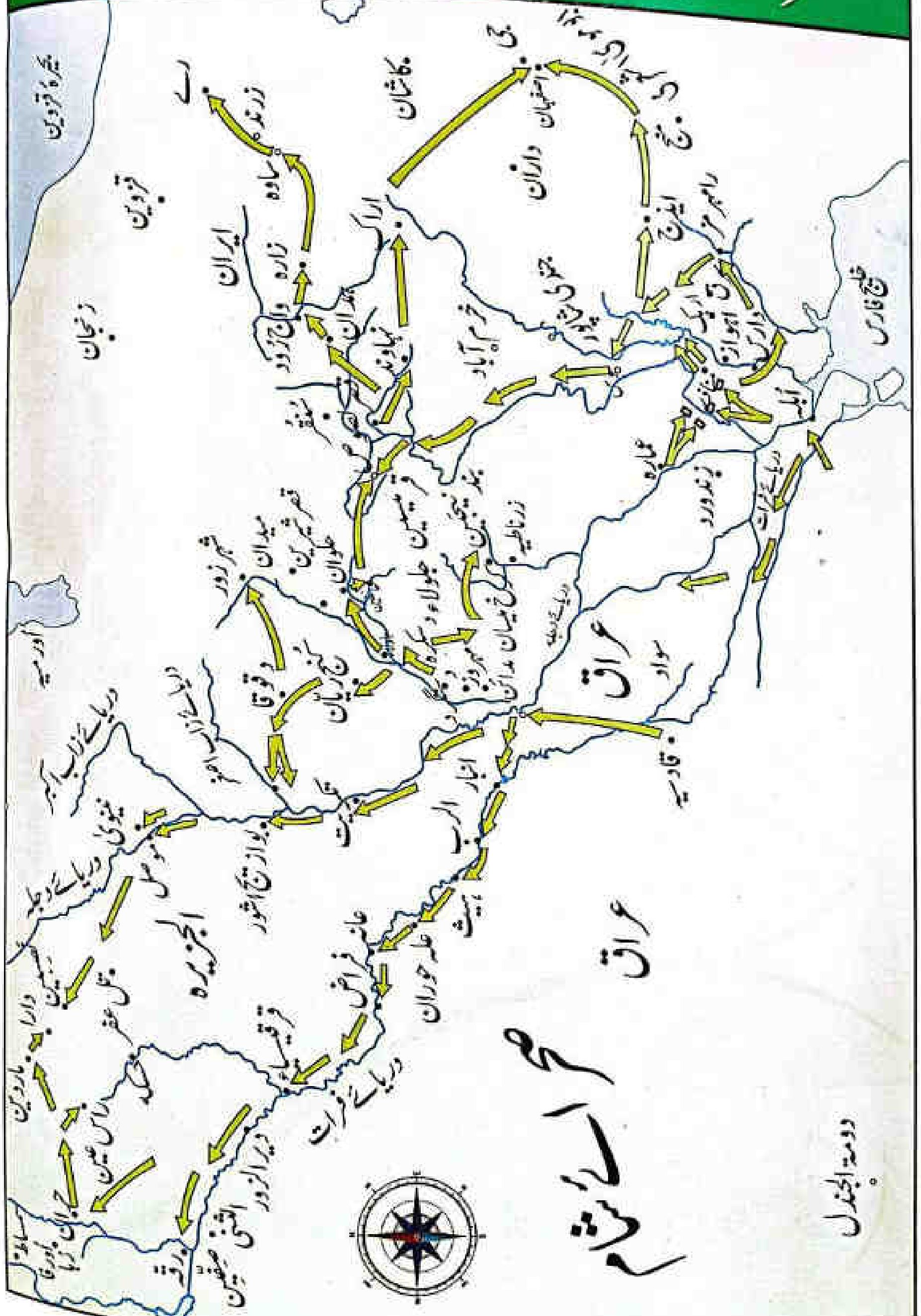


نقشہ نمبر 13


حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
کے دور میں عراق کے اہم معرکے
حضرت خالد رضی اللہ عنہ
کی
پیش قدمی
پیمانہ (بحساب کلومیٹر)
صفر
١٠٠
٢٠٠
٣٠٠
٤٠٠
انبار
مدائن
ساباط
دجلہ
عین تمر
ناطف
بابل
جسر
حیرہ
قادسیہ
امغیشیا
زوقار
فرات
الیس
ولجہ
مذار
کسکر
تستر
اهواز
ابلہ
قارون
بنو شیبان
ذات السلاسل
خلیج فارس
دومۃ الجندل

نقشہ نمبر 14

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کی فتوحات ایک نگاہ میں



(یونٹ: 1.7)

خلافتِ راشدہ سے کیا مراد ہے؟

خلافتِ راشدہ سے مراد، وہ مثالی دورِ حکومت ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مسند نشینی سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کے اختتام تک رہا۔ نیز حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی حکومت کے چھ ماہ ایک ''تتمہ'' کے طور پر خلافتِ علویہ کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ ربیع الاوّل ۱۱ھ سے لے کر ربیع الاوّل ۴۱ھ تک یہ پورے تیس سال بنتے ہیں۔ اسی کو خلافتِ راشدہ کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں ایک صحیح حدیث موجود ہے:

''اَلْخِلَافَةُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُونَ سَنَةً، ثُمَّ مُلْكٌ بَعْدَ ذَالِكَ''

(میرے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی، اس کے بعد بادشاہت ہوگی۔) ①

جمہور مسلمین کا عقیدہ ہے کہ یہی تیس سال خلافتِ راشدہ کے ہیں۔ ''العقیدۃ الطحاویۃ'' میں ہے:

''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو افضل اور ساری اُمت پر فائق مانتے ہوئے، خلافت کو سب سے پہلے انہی کے لیے ثابت کہتے ہیں۔ پھر عمر بن الخطاب، پھر عثمان، پھر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کے لیے مانتے ہیں۔ یہی خلفائے راشدین اور ائمہ ہدایت ہیں۔'' ②

اس دور کو خلافتِ راشدہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ مکمل طور پر اسلامی سیاست اور نبوی طرزِ حکومت کا نمونہ ہے۔ اس دور میں اُمت کی قیادت ان افضل ترین صحابہ کرام کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا طویل زمانہ پایا۔ یہ حضرات اس ابتدائی زمانے میں اسلام لائے جب سخت ترین قربانیاں اور آزمائشیں ہر پل درپیش تھیں۔ انہوں نے اسلام کی خاطر ہجرت کی اور ہر قدم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جیے۔ اسلام کی تاسیس، تبلیغ واشاعت اور استحکام میں ان حضرات کا بنیادی حصہ ہے۔ یہی چاروں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے مقرب ومحبوب اور تمام صحابہ سے افضل ہیں۔ اسی لیے نطقِ رسالت سے ان کی پیروی کا تاکیدی حکم جاری ہوا۔ فرمانِ نبوی ہے:

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ. ③

''میری سنت پر چلو اور خلفائے راشدین کی جو ہدایت یافتہ ہیں اور ان کے طریقے کو دانتوں سے مضبوط پکڑلو۔''

---

① سنن الترمذی، ح: ۲۲۲۶، باب ماجاء فی الخلافۃ۔ اسنادہ صحیح

② العقیدۃ الطحاویۃ، ص ۸۱، ط المکتب الاسلامی، بیروت

③ سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۰۷، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ، سنن الترمذی ح: ۲۶۷۶، قال الترمذی: حسن صحیح

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کے اس حصے کو بعد کے دور سے ممتاز رکھا جاتا ہے، اگرچہ بعد میں بھی عادل خلفاء اور نیک سلاطین آتے رہے۔

خلافتِ راشدہ کے لیے ایک غلط کسوٹی:

بعض حضرات خلافتِ راشدہ اور بعد کی حکومتوں کا موازنہ اس اعتبار سے کرتے ہیں کہ تعمیری اور ترقیاتی کام کس دور میں زیادہ ہوئے، زیادہ ممالک کس خلیفہ یا بادشاہ نے فتح کیے اور کونسی حکومت زیادہ طاقتور اور وسیع تھی۔ حالاں کہ مثالی حکمرانی کے لیے ان چیزوں کو اولین معیار بنانا درست نہیں ہے۔ یہ ایک غلط کسوٹی ہے۔ اگر کوئی اس نقطۂ نگاہ سے دیکھے تو سلطان محمود غزنوی کا دور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور سے بہتر قرار پائے گا کیوں کہ مملکت کی حدود اربعہ اور زمینی فتوحات کی پیمائش میں سلطان محمود غزنوی کی فوقیت بالکل ظاہر ہے۔ اسلامی تعلیمات پر نگاہ رکھنے والا اور فرقِ مراتب کے اسلامی معیار سے واقف کوئی بھی شخص ایسا کبھی نہیں سوچ سکتا۔

خلافتِ راشدہ کی وجوہِ فضیلت:

خلافتِ راشدہ کی اصل وجوہِ فضیلت پانچ چیزیں تھیں:

① خلفائے راشدین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوق ومزاج سے پوری طرح ہم آہنگ تھے اور انہوں نے ذاتی زندگی سے لے کر اجتماعی معاملات تک ہر جگہ عہدِ رسالت کے معیارات کو پوری طرح قائم رکھا اور اس میں سرِ مو کمی نہ کی۔

② فرامینِ نبویہ میں خلفائے راشدین کے جس قدر فضائل ومناقب بیان کیے گئے ہیں، وہ انہی کا خاصہ ہیں۔

③ خلفائے راشدین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب، سبقت فی الاسلام، ہجرت اور دین کی خاطر قربانیوں کے لحاظ سے سب پر فضیلت حاصل تھی۔

④ فقہ واجتہاد میں بھی یہ خلفاء باقی اُمت سے فائق تھے۔

⑤ ان کے دورِ اقتدار میں نظامِ سیاست اسلامی رُوح کے عین مطابق پوری طرح معیارِ نبوت پر استوار تھا، اسلامی شورائیت سمیت وہ تمام خصوصیات اعلیٰ ترین پیمانے پر موجود تھیں جو ایک بہترین اور قابلِ رشک اسلامی حکومت میں مطلوب ہیں۔

یہی مطلب قرآن مجید کی اس آیت کا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا.

(تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، ان سے اللہ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی، اور جس دین (یعنی اسلام) کو اللہ نے ان کے لیے پسند کیا ہے،

اس کو ان کے لیے قوت دے گا۔)①

مفسرین کے مطابق اس کا مصداق دورِ خلافت راشدہ ہے۔② حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس اختصاص سے خلفائے راشدین کی مدح اور صحتِ خلافت بھی صاف ظاہر ہے کیوں کہ ان کے وقت میں دین کی تمکین کا کمال اظہر من الشمس ہے۔''③

بلاشبہ خلفائے راشدین کی صفاتِ حسنہ کا عکس بعض اموی وعباسی خلفاء میں بھی تھا مگر بعد کی اسلامی خلافتیں اس لحاظ سے خلافتِ راشدہ سے مختلف تھیں کہ ان میں شخصی اور خاندانی نظام ایک امر لازم تھا اور حکومت طاقت کے بَل پر ایک سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتی تھی۔ اس طرزِ عمل نے خلافتِ راشدہ کو خلافتِ عامہ اور ملوکیت سے الگ کر کے ایک حدِ فاصل قائم کر دی اور صحیح حدیث ''اَلْخِلَافَةُ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً۔'' نے اس پر مہرِ توثیق ثبت کر دی۔④

خلافتِ راشدہ خلفائے اربعہ میں محدود ہے:

اس پر اُمتِ مسلمہ کا اجماع ہے کہ خلافتِ راشدہ خلفائے اربعہ میں محدود ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام شافعی، امام طحاوی اور امام ابوالحسن الاشعری رحمہم اللہ سمیت درجنوں جلیل القدر علماء نے اس عقیدے کو بخوبی واضح کیا ہے۔⑤

---

① بیان القرآن، تفسیر سورۃ النور، آیت:۵۵

② احکام القرآن للجصاص الرازی، تفسیر رازی، تفسیر ثعلبی، تفسیر بغوی، تفسیر ابن کثیر ③ بیان القرآن، تفسیر سورۃ النور، آیت:۵۵

④ اَلْخِلَافَةُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُوْنَ سَنَةً ثُمَّ مُلْكٌ بَعْدَ ذٰلِكَ۔ رواہ الترمذی، ح:۲۲۲۶، باب ما جاء فی الخلافۃ۔

فائدہ: چوں کہ اس حدیث سے بدعقیدہ لوگوں کے نظریات پر شدید ضرب لگتی ہے، اس لیے وہ اسے جھٹلاتے ہیں جبکہ علمائے اسلام نے اسے اہمیت سے کتبِ عقائد میں جگہ دی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اس حدیث کو ثابت اور صحیح قرار دیتے تھے اور اسے ضعیف کہنے والوں کو بدعتی شمار کر کے اپنی مجلس سے اُٹھا دیتے تھے۔ آپ کا فتویٰ تھا کہ ایسے لوگوں سے میل جول اور ہم نشینی جائز نہیں۔ (السنۃ للخلال:۲ ص ۴۲۳،۴۲۱، ط دار الرأیۃ)

⑤ قال الامام سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ (م ۱۶۱ھ): "اَلْخُلَفَاءُ خَمْسَةٌ: اَلْأَرْبَعَةُ الرَّاشِدُوْنَ، وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ۔ (شرح اصول اعتقاد اھل السنۃ للالکائی: م ۴۱۸ھ:۸ ص ۱۴۷۳، ط دار طیبۃ السعودیۃ)

قال الامام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ): اَلْخِلَافَةُ عَلٰى مَا رَوٰى سَفِيْنَةُ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: اَلْخِلَافَةُ فِي أُمَّتِي ثَلَاثُوْنَ سَنَةً۔ (السنۃ لابی بکر الخلال، ح:۶۳۰) وَقَالَ أَحْمَدُ: كُلُّ بَيْعَةٍ كَانَتْ فِي الْمَدِيْنَةِ فَهِيَ خِلَافَةُ نُبُوَّةٍ، وَمَعْلُوْمٌ أَنَّ بَيْعَةَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ كَانَتْ بِالْمَدِيْنَةِ وَكَذٰلِكَ بَيْعَةُ عَلِيٍّ كَانَتْ بِالْمَدِيْنَةِ ثُمَّ خَرَجَ مِنْهَا وَبَعْدَ ذٰلِكَ لَمْ تُعْقَدْ بِالْمَدِيْنَةِ بَيْعَةٌ۔ (مجموع الفتاوی لابن تیمیۃ:۳۵ ص ۲۱) واخرج الامام فی مسندہ مرویات الخلفاء الاربعۃ تحت عنوان: "مُسْنَدُ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ۔" ولم یخرج فیہ الا عن الخلفاء الاربعۃ۔

وقال الامام الشافعی (م ۲۰۴ھ): اقدم ابابکر، ثم عمر، ثم عثمان، ثم علیا، فھم الخلفاء الراشدون۔ (نقلہ الامام السیوطی فی حقیقۃ السنۃ والبدعۃ تحت عنوان "وصیۃ الامام الشافعی" واسندہ: ص ۲۰۹)

وقال الامام ابوجعفر الطحاوی (م ۳۲۱ھ): "ونثبت الخلافۃ بعد رسول اللہ ﷺ اولا لابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ تفضیلا لہ وتقدیما علی جمیع الامۃ ثم لعمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ثم لعثمان رضی اللہ عنہ، ثم لعلی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، وھم الخلفاء الراشدون والائمۃ المھدیون۔" (العقیدۃ الطحاویۃ، ص ۸۱) وحدیث سفینۃ الذی ذکرنا حصر خلافۃ النبوۃ بمدۃ عقلنا بھا أن لھا أھلا إلی انقضائھا، وھم ھؤلاء الأربعۃ رضوان اللہ علیھم۔ (شرح مشکل الآثار:۸ ص ۴۱۳)

قال الامام ابوالحسن الاشعری: وندین بأن الأئمۃ الأربعۃ خلفاء راشدون۔" (الابانۃ عن اصول الدیانۃ: ص ۲۹، ط دار الانصار) وقال بعد ذکر الخلفاء الاربعۃ: فھؤلاء الأئمۃ بعد رسول اللہ ﷺ، وخلافتھم خلافۃ النبوۃ۔ ((الابانۃ عن اصول الدیانۃ: ص ۲۸) وقال بعد ذکر الخلفاء الاربعۃ: "أنھم الخلفاء الراشدون المھدیون۔" (مقالات الاسلامیین: ص ۲۲۸)

صفِ اوّل کے محدثین مثلاً امام ابوزرعہ الرازی، امام دارمی، امام بغوی، امام ابوبکر آجری اور علامہ ابن عبدالبر رحمہم اللہ اسی کو اپنا عقیدہ بتاتے تھے۔ ① امام ابوبکر ابن الباقلانی رحمہ اللہ اور متعدد جلیل القدر مفسرین نے سورۃ النور کی آیت استخلاف سے استدلال کرتے ہوئے خلفائے اربعہ ہی کو خلفائے راشدین قرار دیا ہے۔ ② یہی امام الحرمین الجوینی، امام نسفی اور علامہ تفتازانی رحمہم اللہ نے لکھا ہے۔ ③ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ ④

---

① الامام ابوزرعۃ الرازی: (۲۸۱ھ): تقول: أبو بکر وعمر وعثمان وعلی فی الخلافۃ والتفضیل جمیعا۔ هذا دینی الذی أدین الله به وأرجو أن یقبله الله عز وجل۔ (جامع بیان العلم: ۲ ص ۱۱۷۲)

الامام ابوسعید الدارمی (م ۲۸۰ھ): وَالْخُلَفَاءُ الرَّاشِدُونَ بَعْدَهُ: أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ، وَعُثْمَانُ، وَعَلِيٌّ رضی اللہ عنہم۔ (النقض علی المریسی: ۲ ص ۶۱۶، ط الرشد)

الامام البغوی (۵۱۶ھ): وَالْحَدِيثُ يَدُلُّ عَلَى تَفْضِيلِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ عَلَى مَنْ سِوَاهُمْ مِنَ الصَّحَابَةِ، وَهُمْ: أَبُو بَكْرٍ، وَعُمَرُ، وَعُثْمَانُ، وَعَلِيٌّ، فَهَؤُلَاءِ أَفْضَلُ النَّاسِ بَعْدَ النَّبِيِّينَ وَالْمُرْسَلِينَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِمْ، وَتَرْتِيبُهُمْ فِي الْفَضْلِ، كَتَرْتِيبِهِمْ فِي الْخِلَافَةِ۔ (شرح السنۃ: ۱ ص ۲۰۸)

الامام ابوبکر الآجری (م ۳۶۰ھ): وَالْخُلَفَاءُ الرَّاشِدُونَ فَهُمْ: أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ رضی اللہ عنہم۔ (الشریعۃ: ۵ ص ۲۲۲۱)

العلامۃ ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ): الْخُلَفَاءُ الرَّاشِدُونَ الْمَهْدِيُّونَ أَبُو بَكْرٍ، وَعُمَرُ، وَعُثْمَانُ، وَعَلِيٌّ وَهُمْ أَفْضَلُ النَّاسِ بَعْدَ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (جامع بیان العلم وفضلہ: ۲ ص ۱۱۶۸)

② الامام ابوبکر الباقلانی (م ۴۰۳ھ): قال فی قولہ تعالی: وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (سورۃ النور: ۵۵) وکان من ذالک ما وعدهم الله تعالی واستخلف الاربعۃ الائمۃ الخلفاء الراشدین۔ (تمهید الاوائل، ص ۱۸۵)

وقال السمعانی: وَاسْتَدَلَّ أهل الْعلم بِهَذِهِ الْآيَة على صِحَة خلَافَة الْخُلَفَاء الرَّاشِدين وهم: أَبُو بكر، وَعمر، وَعُثْمَان، وَعلي رضی اللہ عنہم وَمن الْمَشْهُور الْمَعْرُوف بِرِوَايَة حَمَّاد بن سَلمَة، عَن سعيد بن جُمْهَان، عَن سفينة أَن النَّبِي قَالَ: الْخلَافَة بعدِي ثَلَاثُونَ سنة۔ (تفسیر السمعانی: ۳ ص ۵۴۳)

وقال الامام الرازی: دَلَّتِ الْآيَةُ عَلَى إِمَامَةِ الْأَئِمَّةِ الْأَرْبَعَةِ۔ (تفسیر الرازی: ۲۴ ص ۴۱۳) وقال البیضاوی: فیه دلیل علی صحة النبوة للإخبار عن الغیب علی ما هو به وخلافة الخلفاء الراشدین إذ لم یجتمع الموعود والموعود علیه لغیرهم بالإجماع۔ (تفسیر البیضاوی: ۴ ص ۱۱۳)

وقال النسفی: والآیة أوضح دلیل علی صحة خلافة الخلفاء الراشدین رضی اللہ عنہم أجمعین لأن المستخلفین الذین آمنوا وعملوا الصالحات هم هم۔ (تفسیر النسفی: ۲ ص ۵۱۷)

③ امام الحرمین الجوینی (م ۴۷۸ھ): قال: الخلفاء الراشدون لما ترتبوا فی الامامة فالظاهر ترتیبهم فی الفضیلة فخیر الناس بعد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر، ثم عمر، ثم عثمان، ثم علی رضی الله عنهم اجمعین... وقد قال علیه السلام: سنة الخلافة بعد ثلاثون سنة ثم تصیر ملکا عضوضا، وکانت ایام الخلفاء هذا القدر۔ (لمع الادلة فی قواعد اعتقاد اهل السنة، ص ۱۳۰، ط عالم الکتب)

الامام ابوحفص النسفی (م ۵۳۷ھ): وافضل البشر بعد نبینا ابوبکر الصدیق، ثم عمر الفاروق، ثم عثمان ذو النورین، ثم علی رضی اللہ عنہم، وخلافتهم علی هذا الترتیب ایضا۔ (متن عقائد النسفی، ص ۴)

العلامۃ التفتازانی (م ۷۹۳ھ): خلافتهم ای نیابتهم عن الرسول فی اقامة الدین بحیث یجب علی کافة الامم الاتباع علی هذا الترتیب ایضا یعنی ان الخلافة بعد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم لابی بکر ثم لعمر، ثم لعثمان، ثم لعلی رضی اللہ عنہ۔ (شرح العقائد النسفیة، ص ۳۴۸)

④ الامام ابن تیمیة (م ۷۲۸ھ): انهم یؤمنون ان الخلیفة بعد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر، وعمر ثم عثمان ثم علی، ومن طعن فی خلافة احد من هؤلاء فهو اضل من حمار ه۔ (العقیدة الواسطیة، ص ۱۱۸، ط اضواء السلف)

بل اهل السنة یقولون بالحدیث الذی فی السنن "خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم تصیر ملکا۔" (منهاج السنة: ۴/۵۲۲)

قال الذهبی بعد ذکر خلافة علی: " فَكَانَ آخر الْخُلَفَاء الرَّاشِدين الَّذين وليتهم خلَافَة النُّبُوَّة ثمَّ آل الْأَمر إِلَى مُعَاوِيَة أول الْمُلُوك كَمَا قَالَ صلی اللہ علیہ وسلم: الْخلَافَة بعدِي ثَلَاثُونَ سنة ثمَّ تكون ملكا وسيرة مُعَاوِيَة من أَجود سير الْمُلُوك بالنسبة۔" (المنتقی: ۱ ص ۳۸۴)

ایک شبہے کا ازالہ:

بعض حضرات کو یہ شبہ پیش آتا ہے کہ بعض اسلاف کی عبارات میں خلفائے اربعہ کے علاوہ بھی چند شخصیات پر خلیفہ راشد کا اطلاق کیا گیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، ① ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، ② اور متعدد حضرات نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو خلیفہ راشد کہا ہے۔ ③

اس بارے میں یاد رہنا چاہیے کہ اگر جمہور سے ہٹ کر کسی عالم نے کچھ کہا ہو تو اُس کی پیروی نہیں کی جائے گی۔ ممکن ہو تو اس عبارت کی مناسب تاویل کی جائے گی، ورنہ اُسے ''تفرد'' یا ''غلطی'' قرار دے کر چھوڑ دیا جائے گا۔

یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ دیگر صالح خلفاء پر ''راشدین'' کا اطلاق کرنے والے اکثر علماء کی دیگر عبارتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ شرعی اصطلاح میں ''خلفائے راشدین'' کا مصداق ''خلفائے اربعہ'' پر ہی کرتے تھے اور مدتِ خلافتِ راشدہ کو ۳۰ سال مانتے تھے۔ ④ مطلب یہ کہ انہوں نے دیگر صالح خلفاء کو لغوی طور پر یا مجازاً ''راشد'' کہا تھا۔

آج کل کچھ حضرات اصطلاحی خلافتِ راشدہ کے مفہوم میں توسیع کے قائل ہیں اور اس بناء پر وہ خلفائے راشدین کی تعداد چار قرار دینے کو بدعقیدگی تصور کرتے ہیں۔ یہ ان حضرات کا تشدد اور غلو ہے۔ یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ خلافتِ راشدہ کو خلفائے اربعہ میں محصور کرنا اُمتِ مسلمہ کا چودہ سو سالہ اجماعی موقف ہے، جس کے سامنے چند حضرات کی شاذ رائے کا کچھ وزن نہیں ہو سکتا۔

دیکھیے! ''عشرہ مبشرہ'' کی اصطلاح شروع سے دس صحابہ کے لیے مخصوص ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ نصِ قرآنی ''رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ'' کے تحت تو ہر صحابی جنتی ہے لہٰذا ''عشرہ مبشرہ'' کی اصطلاح قرآن کے منافی اور توہینِ صحابہ پر مشتمل ہونے کے باعث قابلِ ترک ہے اور اس کی جگہ ''الصحابۃ کُلّھم المبشرون بالجنّۃ'' کی اصطلاح رائج ہونی چاہیے، تو ایسا قول یقیناً اجماعِ اُمت کی مخالفت اور مبنی بر تشدد ہونے کے باعث ناقابلِ قبول ہوگا۔

❀❀❀

---

① تاریخ ابن خلدون: ۲/۶۵۰ ② الصواعق المحرقۃ لابن حجر الھیثمی: ۲/۶۲۹

③ صحیح ابن حبان: ۱۵/ص۳۷؛ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ للالکائی: ۸/ص ۱۴۷۵؛ عمدۃ القاری: ۱/۱۳۱؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/ص ۱۹۶، ط دار ھجر

④ مثلاً ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ نے ایک جگہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ پر خلفائے راشدین کا اطلاق کر دیا۔ الا عمر بن عبدالعزیز فانہ ملحق بالخلفاء الراشدین وکذلک ابن الزبیر۔ (الصواعق المحرقۃ لابن حجر الھیثمی: ۲/۶۲۹) مگر دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں: المنزادھنا الخلافۃ الکاملۃ ثلاثون سنۃ وھی منحصرۃ فی الخلفاء الأربعۃ۔ (الصواعق المحرقۃ لابن حجر الھیثمی: ۱/ص ۲۶)

اسی طرح علامہ ابن خلدونؒ نے ایک جگہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا ہے: ''فھو من الخلفاء الراشدین'' (تاریخ ابن خلدون: ۲/۶۵۰) مگر دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں: اذ العدل المحض ھو فی الخلافۃ الشرعیۃ وھو قلیلۃ اللبث، قال ﷺ: الخلافۃ بعد ثلاثون سنۃ ثم تعود ملکا عضوضا۔'' ''اس لیے کہ کامل عدل تو خلافتِ شرعیہ میں تھا جس کی مدت کم تھی۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''میرے بعد خلافت تیس سال ہے۔ پھر کاٹنے والی بادشاہت آجائے گی۔'' (تاریخ ابن خلدون: ۱/۳۶۱)

خلفائے راشدین کی خصوصیات

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ''ازالۃ الخفاء'' میں خلافتِ راشدہ کے بارے میں مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

❶ خلیفۂ راشد میں خلافت کی عام شرطوں کے علاوہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ اسے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ خصائل اور افعال میں خاص مشابہت ہو یعنی وہ نبی ﷺ کی صفات کا نمونہ اور عکس ہو۔ فقط بعض صفات میں مشابہ ہونا کافی نہیں کیوں کہ کچھ نہ کچھ مشابہت تو ہر مسلمان کو ہوتی ہے مثلاً پنج وقتہ نماز پڑھنا، تلاوتِ قرآن کرنا۔ خاص مشابہت انہی حضرات کو حاصل ہو سکتی ہے جو اُمت کے اعلیٰ ترین طبقے سے ہو، نہ کہ درمیانے یا ادنیٰ طبقے سے۔

❷ نبی کا خلیفہ، نبی یا رسول نہیں ہوتا مگر نبی کی صفات کا نمونہ اور عکس ضرور ہوتا ہے، پس خلیفۂ راشد وہ ہے جو عقلی اور عملی قوتوں میں پیغمبر کی عقلی اور عملی قوت کے مشابہ اور ہم رنگ ہو۔ جن مقاصد کے لیے پیغمبر کی بعثت ہوئی ہے، ان کی تکمیل اس خلیفہ کے ہاتھ پر ہو۔ یعنی نبی اور رسول جس کام کی بنیاد رکھ گئے ہوں، اللہ تعالیٰ اپنی خاص تائید کے ذریعے ان کاموں کو اس نبی کے خلیفۂ خاص کے ہاتھ پر پورا فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا جو خلیفہ، پیغمبر کے باقی ماندہ امور کو علمی اور عملی طور پر تکمیل تک پہنچاتا ہے، وہ اس کا خاص خلیفہ اور خلیفۂ راشد ہے۔

❸ تعلیم کتاب وحکمت کے اصولی مراحل تو حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں طے ہو گئے تھے۔ مگر کچھ کام ابھی باقی تھے۔ مشیتِ الٰہیہ یہ تھی کہ ان کی تکمیل خلفائے راشدین کے ہاتھوں ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس کے لیے درج ذیل مثالیں دی ہیں:

❁ دورِ صدیقی میں قرآنِ مجید کا مصحف کی شکل میں جمع کیا جانا ❁ احکام کی احادیث کی تحقیق واشاعت

❁ روایتِ حدیث میں حزم واحتیاط کی پابندی کرانا ❁ غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کا طریقہ جاری کرنا

❁ بہت سے مختلف فیہ فقہی مسائل کو مشورے اور اتفاقِ رائے سے طے کر کے اجماع کی بنیاد رکھنا

❁ ان فتوحات کی تکمیل جن کی بشارت لسانِ نبوت سے دی گئی تھی

❹ خلیفۂ راشد کو پیغمبر سے وہی نسبت ہے جو اعضاء کو دل ودماغ سے۔ حکم دل ودماغ سے جاری ہوتا ہے اور اعضاء اسے بجا لاتے ہیں۔ اسی طرح خلافتِ راشدہ میں بھی فرمانروائی، پیغمبر کی ہوتی ہے۔ دورِ نبوت اور دورِ خلافتِ راشدہ میں بس اتنا فرق ہے کہ پہلے پیغمبر اپنی زبانِ مبارک سے حکم دیا کرتے تھے۔ اب لسانِ نبوت خاموش ہے مگر خلفائے راشدین منشاءِ نبوت کو سمجھ کر پیغمبر کے اعضاء کی مانند متحرک ہیں۔ جس نے اعضاء وجوارح (یعنی خلفائے راشدین) کی حرکات وسکنات کو سمجھنے میں غلطی کی، وہ اس کی سمجھ کا قصور ہے۔

❺ خلفائے راشدین کے افعال واقوال باجماعِ اُمت حجتِ شرعیہ ہیں اور ان کا اتباع لازم ہے۔ ائمہ مجتہدین کے

نزدیک خلفائے راشدین کے اقوال اور افعال ادلہ شرعیہ میں شمار ہوتے ہیں اور ان کو قیاس پر مقدم رکھا جاتا ہے۔ ①

خلافتِ راشدہ کا تعارف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے قلم سے:

عظیم مؤرخ و مفکر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ خلافتِ راشدہ کی حقیقت اور اس کی ایک جامع تصویر پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''راقم الحروف کے نزدیک خلافتِ راشدہ اور اس کے ارکانِ اربعہ کی یہ تعبیر صحیح نہیں کہ وہ چند مختلف المزاج و مختلف الأغراض، متباین الأسالیب اشخاص کے اتفاقی مجموعہ کا نام ہے اور یہ چاروں حضرات چار مختلف سیاستوں اور رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں، بخت اور اتفاق نے ان کو ایک زنجیر (خلافت و قیادت اسلامی) میں جوڑ دیا ان میں سوائے ایمان و اخلاص اور صداقت اور حقانیت کے کوئی مشترک عنصر نہیں۔

جو لوگ زیادہ تاریخی بصیرت اور وقتِ نظر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں وہ خلافتِ راشدہ کو دو حصوں اور خلفاء راشدین کو دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے پہلے حصے یا دور کو اسلام کی ترقی و پیش قدمی اور دوسرے دور کو اسلام کے تنزل اور توقف سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے دور کا امام صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کو مانتے ہیں۔ اور دوسرے دور کا امام عثمان غنی اور علی المرتضی رضی اللہ عنہما کو کہتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ تقسیم جسارت سے خالی نہیں۔ میرے نزدیک یہ چاروں حضرات فرداً فرداً خلافتِ نبوی کا مظہرِ اتم اور مصداقِ کامل تھے۔ ذاتی فضائل اور مناقب اور ان کی بنا پر تفاوتِ درجات کو الگ کر کے خلافتِ راشدہ کا مزاج اور اس کی روح ان میں سے ہر ایک میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔

خلافتِ راشدہ کیا ہے؟ خلافتِ راشدہ نہ اسلامی مملکت کی وسعت کا نام ہے نہ کثرتِ فتوحات کا نہ کامیابیوں کے تسلسل کا۔ اگر معیار یہی ہو تو پھر ولید بن عبدالملک اور ہارون الرشید کو سب سے بڑا خلیفہ راشد ماننا پڑے گا۔

خلافتِ راشدہ نام ہے نبی کے مزاج اور طرزِ زندگی میں نیابت کاملہ کا۔ نبوت کا امتیازی مزاج کیا ہے؟ ایمان بالغیب کی قوت، اطاعتِ الٰہی کا جذبۂ صادق و کامل، غیب پر شہود، احکام پر مصالح و فوائد کو قربان کرنا، دنیا پر آخرت اور غنا پر فقر و زہد کو ترجیح دینا، اسبابِ دنیا سے کم سے کم متمتع ہونا اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ متمتع کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ وہ اجمال ہے جس کی تفصیل پوری سیرتِ محمدی ہے اور جس کے مظاہر بدر و خندق کے معرکے، تبوک کا سفر، حدیبیہ کی صلح، مکہ کی فتح اور ۲۳ برس کی وہ زاہدانہ زندگی ہے جس کا اول شعب ابی طالب کی اسیری اور جس کا اخیر زندگی کی وہ آخری شب ہے جس میں گھر میں چراغ بھی نہ تھا۔ اور زرہ نبوی تیس صاع جو کے عوض ایک یہودی کے ہاں رہن تھی۔ اس معیار سے ان خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم و ارضاہم) کی زندگی اور دورِ خلافت، خلافتِ راشدہ کا مکمل نمونہ تھی جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج اور طرزِ زندگی کی پوری نمائندگی تھی۔''

① خلافتِ راشدہ، از حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی: ص ۲۹، ۳۰۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''ازالۃ الخفاء'' از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ حوالوں سے خلفائے راشدین کی سیرت کی متعدد مثالیں بیان کر کے آخر میں فرماتے ہیں:

''درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام میں جو ایمان بالغیب اور ایمان بالآخرۃ پیدا کیا ہے۔ اس نے ان کے ذہن و دل، سیرت و اخلاق، زندگی اور کردار اور معیشت و سیاست کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ عسر ویسر، کامیابی و ناکامی، فقر و فاقہ، اور امارت و حکومت میں اسی کا بے تکلف اظہار ہوتا تھا۔ اس ایمان کے سلسلہ معجزات کی سب سے طاقتور اور سب سے نمایاں و ممتاز کڑیاں خلفاء راشدین ہیں۔ وہ اسی معنی میں خلفائے راشدین ہیں کہ نبوت کا یہ مزاج اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ میراث ان کی طرف منتقل ہوئی۔ اور انہوں نے اس مزاج و منہاج میں نبی کی کامل نیابت کی۔

نافہم یہ سمجھے کہ یہ بھی کسی بادشاہ وقت یا حاکم شہر کی نیابت کا مسئلہ ہے۔ اور سوال ان فوائد سے کسی شخص اور اس کے خاندان و متعلقین کے متمتع و منتفع ہونے کا ہے جو کہ اس کی مسند پر بیٹھے گا اور ساری کشمکش اسی بات کی تھی۔ حالانکہ سوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض انجام دینے اور اس کی سی زہد و تقشف اور ایثار و قربانی کی زندگی گزارنے خلق خدا کو زیادہ سے زیادہ دینے اور حظوظ دنیا اور سامان معیشت میں سے کم سے کم لینے۔ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے اور کم سے کم راحت و فراغت حاصل کرنے کا سوال تھا۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ خلفائے راشدین نے یکے بعد دیگرے اس حق کو ادا کر کے دکھایا۔ نبوت خلافتِ الٰہی ہے اور خلافتِ راشدہ خلافتِ نبوی ہے۔ اخلاق وصفات الٰہی میں بڑا درجہ ''صمدیت'' کا ہے۔ اور خدا کی شان هُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ کی ہے۔ انسان اس مقام تک تو کیا پہنچ سکتا ہے اس کی معراج یہی ہے کہ وہ دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فیض پہنچائے اور ان سے کم سے کم فیض اٹھائے۔ جہاں تک ''يُطْعِمُ'' (دوسروں کو کھلانے) کا تعلق ہے۔ اس کا ہاتھ کشادہ، اس کی ہمت بلند، اور جہاں تک ''يُطْعَمُ'' (دوسروں کا کھانے) کا تعلق ہے اس کا ہاتھ کشیدہ اور اس کی نظر بلند رہے۔

عدیل ہمتِ ساقیست فطرت عرفی
کہ حاتمِ دگراں وگدائے خویشتن است

میرے نزدیک اسلام کی زندگی میں پیش آنے والے تمام ادوار و مراحل کی نمائندگی خلافت راشدہ کے اس مختصر سے دور میں (جو ۳۰ سال سے متجاوز نہیں) کر دی گئی ہے۔ اور ہر آنے والے ناگزیر دور کے لیے اس میں رہنمائی کا سامان ہے۔ آغاز کار اور اقبال و ترقی کے زمانے میں کس استقامت اور ایمان و یقین کا مظاہرہ کرنا چاہئے اس کی رہنمائی ہمیں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے ملتی ہے۔ مخالفتوں، شورشوں اور فتنوں اور بے نظمی اور انتشار کے وقت کس ثبات و استقامت، کس پامردی اور دلیری اور کس ایمان و یقین کی ضرورت ہے اس کا نمونہ ہم کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ملتا ہے۔ اگر اسلامی تاریخ کے ذخیرہ میں صرف خلافت راشدہ کے دو باب (جو دراصل ایک ہی باب کی دو فصلیں ہیں) اور صرف خلافت صدیقی اور خلافتِ فاروقی کا نمونہ

ہوتو یہ رہنمائی ناتمام ہوتی اور دورِ انتشار اور دورِ فتن کے لیے مسلمانوں کے پاس تقلید واتباع کے لیے کوئی امام و پیشوا نہ ہوتا۔ جس اُمت کے لیے قیامت تک باقی رہنے اور تمام انسانی ادوار اور تاریخ کے نشیب وفراز سے گزرنا مقدر تھا اس کے لیے دونوں طرح کے نمونوں کی ضرورت تھی۔ اور خلافت راشدہ نے اپنے پورے اجزاء کے ساتھ ان نمونوں کو فراہم کیا اور اس رہنمائی کو مکمل کردیا۔ رضی اللہ عن ابی بکر و عمر و عثمان و علی و ارضاھم و اکرمھم و جزاھم عن الإسلام و عن ھذہ الأمۃ خیر الجزاء۔"[1]

❁❁❁

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

1. خلافتِ راشدہ سے کیا مراد ہے اور خلفائے راشدین کی ممتاز صفات کیا تھیں؟
2. خلافتِ راشدہ کی مدت کتنی تھی؟ اس بارے میں کون سی آیت اور کون سی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے؟
3. خلفائے راشدین کی پیروی کا حکم کس حدیث سے ثابت ہوتا ہے؟
4. خلفائے راشدین کے ہاتھوں جن اُمورِ شرعیہ کی تکمیل ہوئی ان میں سے تین چیزیں بطورِ مثال ذکر کریں۔
5. خلفائے راشدین چار تھے یا زیادہ؟ عباراتِ اسلاف کی روشنی میں بیان کیجیے۔

عملی کام:

❁ "خلفائے راشدین" کے اسمائے گرامی اور مختصر کوائف خوش خط لکھ کر کلاس میں آویزاں کریں۔

❁ کسی علمی شخصیت کو دعوت دیں کہ وہ آکر خلافت راشدہ کے حوالے سے تقریباً ۴۰ منٹ گفتگو کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ خلافتِ راشدہ، از مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ

❁ خلفائے راشدین، از علامہ ڈاکٹر خالد محمود رحمہ اللہ

❁ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ

---

[1] المرتضیٰ: ص ۳۳۳ تا ۳۴۱

(یونٹ:1.8)

خلافتِ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

۱۳ ربیع الاول ۱۱ ھ......تا......۲۲ جمادی الآخرۃ ۱۳ ہجری

(۹ جون ۶۳۲ء......تا......۵ ستمبر ۶۳۴ء)

فضائل ومناقب:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ اور لقب صدیق اور عتیق تھا۔ ابوبکر آپ کی کنیت تھی۔ والد کا نام عثمان بن عامر تھا جو ابوقحافہ کی کنیت سے مشہور تھے۔ والدہ کا نام سلمیٰ بنت صخر تھا مگر وہ بھی اپنی کنیت اُم الخیر سے جانی پہچانی جاتی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کا تعلق قریش کی شاخ بنوتیم سے تھا۔[①]

آپ رضی اللہ عنہ شروع ہی سے نہایت شریف، پاکباز، منصف مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ مکہ مکرمہ میں آپ کو ایک معزز فرد کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کا ذریعہ معاش تجارت تھا، جس کی وجہ سے آپ کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ آپ اسی وجہ سے عربوں کے حسب ونسب کے بڑے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کو مردوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہے اسلام لانے کے بعد آپ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور دین کی خدمت کے لیے وقف ہوگئے۔ آپ کو تمام صحابہ کرام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ قرب حاصل تھا۔ آپ نے سترہ ایسے افراد کو کفار کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے انہیں خرید کر آزاد کیا جنہیں اسلام لانے کی وجہ سے شدید اذیتیں دی جاتی تھیں۔[②] ہجرت کی مشکل ترین مہم میں آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے، غارِ ثور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہرے داری کی، غزوۂ بدر میں شمع رسالت کے محافظ بنے، اپنی لختِ جگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آفتابِ رسالت کے عقد میں دی۔ تمام غزوات اور مہمات میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے۔

وفات سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خلافت کی طرف واضح اشارے فرمائے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

① الاصابۃ: ۳/۱۳۴، ۱۳۵، ط العلمیۃ، الکامل فی التاریخ: ۲/۲۶۳، سنۃ ۱۳ ھجری

② الکامل فی التاریخ: ۲/۲۶۳، ۲۶۵، ذکر بعض اخبارہ ومناقبہ

اِقْتَدُوْا بِالَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِي أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ

”میرے بعد ان دونوں کی یعنی: ابوبکر و عمر کی پیروی کرنا“①

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اخلاق و کردار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے قریب تھے کہ کوئی اور اُمتی اس بارے میں اُن کا ہم سر نہ تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نرم دل، مہربان، سخی اور سادہ مزاج تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر ایک نظر:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اخلاق و کردار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے قریب تھے کہ اُمتِ مُسلمہ کا کوئی فرد اس بارے میں اُن کی ہم سری نہیں کرسکتا۔ آپ رضی اللہ عنہ نرم دل، مہربان، سخی اور سادہ مزاج تھے۔ نرمی و رحم دلی کی بناء پر انہیں ”اَوَّاہ“ (بہت آہ وزاری کرنے والا) کہا جاتا تھا۔② فطرتِ سلیمہ کا یہ عالم تھا کہ زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی بتوں کی عبادت کی نہ کبھی شراب کو ہاتھ لگایا۔③ گرمی میں کثرت سے روزے رکھتے تھے۔④ جسم پر چربی کا نام ونشان تک نہ تھا، بالکل نحیف ہوگئے تھے۔⑤ آپ تاجر پیشہ تھے۔ اسلام کے لیے خوب خرچ کرتے رہے۔⑥ خلیفہ بنے تو تمام پیسہ بیت المال میں جمع کردیا۔⑦

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کچھ مناقب:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

”ہم نے ہر شخص کی بھلائیوں کا بدلہ ادا کردیا ہے، سوائے ابوبکر کے، ان کے ہم پر اتنے احسانات ہیں کہ ان کا بدلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی عطا کرے گا۔“⑧

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ نے پوچھا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین شخص کون ہے؟“ انہوں نے بلاتردد فرمایا: ”حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔“⑨

خلیفہ بننے کے بعد بھی آپ رضی اللہ عنہ کی تواضع اور سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بذاتِ خود غریبوں، بیواؤں اور محتاجوں کی خدمت کرکے خوشی محسوس کرتے۔ کسی کی بکریوں کا دودھ دوہ دیتے، کسی کے اونٹ چرانے لے جاتے، کسی کے گھر میں جاکر صفائی کرآتے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف ہمیشہ طاری رہتا، دنیا سے ذرا بھی دل نہ لگاتے، ہر وقت آخرت کی فکر دل ودماغ پر حاوی رہتی۔ کبھی کسی پرندے کو اُڑتا اور دانا چگتا دیکھتے تو فرماتے:

---

① سنن الترمذی، ح: ۳۶۶۲، ابواب المناقب؛ صحیح ابن حبان، ح: ۶۹۰۲

② طبقات ابن سعد: ۱۷۱/۳، ط صادر ③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۹، ط نزار

④ الزھد لاحمد بن حنبل، ح: ۵۸۵، ط العلمیۃ ⑤ تاریخ الطبری: ۴۲۳/۳

⑥ طبقات ابن سعد: ۱۷۱/۳، ط صادر ⑦ تاریخ الاسلام للذھبی: ۱۱۳/۳، ت تدمری

⑧ سنن الترمذی، ح: ۳۶۶۱، ابواب المناقب، باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ، باسناد صحیح

⑨ صحیح البخاری، ح: ۳۶۷۱، کتاب المناقب، باب فضل ابی بکر رضی اللہ عنہ

"تو کتنا خوش قسمت ہے۔ تجھ پر قیامت میں کوئی حساب کتاب نہیں، کاش! ابوبکر بھی تجھ جیسا ہوتا۔"

کبھی فرماتے: "کاش! میں کوئی گھاس کا تنکا ہوتا جسے جانور چر جاتے۔"①

حضور اکرم ﷺ کا سانحۂ وفات اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قائدانہ کردار:

حضور اکرم ﷺ کی رحلت کے سانحے نے صحابہ کرام جیسی ہستیوں کے اعصاب کو شل کر دیا تھا اور رنج و غم سے ان کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے استقلال کے پہاڑ بھی گم صم تھے۔ ایسے شدید وقت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ تنہا فرد تھے جن کی مستقل مزاجی میں فرق نہ آیا۔ ان کی تسلی، معاملہ فہمی اور رہبری سے صحابہ کرام بھی مواقع کی نزاکت اور زمینی حقائق کو سمجھنے کو قابل ہوئے۔②

سقیفہ بنو ساعدہ میں صحابہ کرام کی مشاورت:

اس وقت قدرتی طور پر یہ سوال ذہنوں پر دستک دے رہا تھا کہ اب اُمت کی کشتی کا ملاح کون ہوگا؟ ماضی میں عربوں کے ہاں قیادت کا انحصار قبیلے کے افراد کی تعداد پر ہوتا تھا اور مدینہ میں خزرج کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔

چنانچہ بعض لوگ کہنے لگے: "اب خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو امیر بننا چاہیے۔"

اور کسی نے کہا: "اگر مہاجرین نے اس سے اتفاق نہ کیا تو ہم کہیں گے: ایک ہمارا امیر ہونا چاہیے اور ایک تمہارا۔"③

یہ گفتگو انصار کی ایک نشست گاہ "سقیفہ بنو ساعدہ" میں شروع ہوئی تھی جس سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس نازک وقت میں کہیں مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق میں دراڑ نہ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر اس جگہ پہنچے۔④ وہاں انصار کی قومی و دینی خدمات کو سراہا اور یہ ارشادِ نبوی دہرایا:

"اگر لوگ ایک راستے پر چلیں اور انصار دوسرے راستے پر تو میں انصار کی راہ پر چلوں گا۔"⑤

لیکن ساتھ ہی انہوں نے حاضرین کو یاد دلایا کہ رسول اللہ ﷺ قیادت کا بوجھ قریش پر ڈال کر گئے ہیں۔

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "دیکھو، قیادت ہمارے پاس ہونی چاہیے، وزارت تمہارے پاس۔"

انصار کے ایک سردار حباب بن منذر رضی اللہ عنہ بولے: "یوں کیوں نہ کر لیا جائے کہ ایک امیر ہمارا ہو اور ایک تمہارا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "نہیں، دو امیر نہیں ہوں گے، ہاں، وزارت تمہاری قیادت ہماری کیوں کہ قریش سب سے معزز سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں اور حسب و نسب میں بھی سب سے اعلیٰ ہیں۔"⑥

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی نہایت اٹل لہجے میں دو حکمرانوں کی تجویز کو مسترد کر دیا اور بولے:

"ایک نیام میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔"⑦

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۶۳، ۶۵، ۸۲، طلزار ② صحیح البخاری، ح: ۳۳۵۲، ح: ۳۶۶۸، ۳۶۶۷، بمسند احمد، ح: ۱۲۲۳۳

③ تاریخ الطبری: ۲/ ۲۵۵ ④ صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۸، کتاب المناقب، باب قول النبی ﷺ، لو کنت متخذا خلیلا

⑤ مسند احمد، ح: ۱۸ ⑥ صحیح البخاری ح: ۳۶۶۸ ⑦ مصنف عبد الرزاق، ح: ۹۷۵۸ ۸۲، ۶۵، ۶۳

اس دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''اے سعد! تم جانتے ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہاری موجودگی میں فرمایا تھا: اس منصب کے حق دار قریش ہیں۔''

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو یاد آ گیا۔ بولے: ''آپ درست کہتے ہیں۔ ہم وزیر اور آپ حضرات امیر۔''①

انصار نے ان کی پکار پر لبیک کہا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تو بہتر ہے کہ تم لوگ حضرت عمر یا حضرت ابوعبیدہ کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔'' مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: ''ہم سب آپ ہی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، آپ ہمارے بزرگ، بہترین انسان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے دوست ہیں۔''② سب سے پہلے حضرت بشیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ لپک کر آئے اور سب سے پہلے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی اور وفاداری کا عہد کیا۔ اس کے بعد سب ہی ٹوٹ پڑے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس اجلاس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بیعت ہوگئی۔③

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خود حکومت کے طلب گار نہیں تھے مگر انہیں خطرہ محسوس ہوا تھا کہ اگر وہ یہ ذمہ داری خود نہیں سنبھالیں گے تو لوگوں میں انتشار پھیل جائے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

''وَتَخَوَّفْتُ اَنْ تَكُوْنَ فِتْنَةٌ بَعْدَهَا رِدَّةٌ۔''

(مجھے خوف محسوس ہوا کہ کوئی ایسا فتنہ رونما ہو جائے کہ لوگ بکھر جائیں۔)④

ابومخنف نے اس مجلس میں صحابہ کرام کی باہم تلخ کلامی اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی بیعت سے روگردانی کا طویل افسانہ پیش کیا ہے مگر یہ ضعیف روایت ان صحیح روایات کے مقابلے میں کالعدم ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کا مشورہ اور فیصلہ خوش گوار ماحول میں ہوا تھا اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے خلافت کا حق قریش کے لیے تسلیم کرلیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیعت کرنا:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی تو انہوں نے حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو بھی بلوایا اور دونوں نے یکے بعد دیگر بیعت کی۔⑤ ایک روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب بتایا گیا کہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں تو وہ فوراً اتنی تیزی سے گھر سے نکل کر آئے کہ چادر تک ساتھ نہ لی اور آ کر بیعت کی۔⑥ ایک روایت کے مطابق دونوں نے کہا: ''ہمیں قلق تو ہوا کہ انتخاب کی کارروائی میں ہمیں شریک نہیں کیا گیا مگر ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ ہی سب سے افضل ہیں۔''⑦

---

① مسند احمد، ح: ۱۸ ② صحیح البخاری، ح: ۳۶۶۸ ③ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۰۴۳، ط الرشد؛ تاریخ الطبری: ۲۲۱/۳

④ مسند احمد، ح: ۴۲ بسند صحیح ⑤ السنۃ لعبداللہ بن احمد، ح: ۱۲۹۲؛ السنن الکبریٰ للبیہقی، ح: ۱۶۵۳۸

⑥ تاریخ الطبری: ۳ ص ۲۰۷ ⑦ البدایہ والنہایہ: ۹ ص ۳۱۶

ملحوظہ: اگرچہ امام زہری رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت چھ مہینے بعد کی تھی۔ (صحیح البخاری، ح: ۴۲۴۰؛ صحیح مسلم، ح: ۴۶۷۹) مگر امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت منقطع ہے، اس کے مقابلے میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت اصح ہے جس کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعتِ سقیفہ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عام بیعت کی تھی۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی، ح: ۱۲۷۳۲)

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ بطورِ خلیفہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بننے کے بعد بھی تین دن تک روزانہ اعلان فرماتے رہے:

''میں نے تمہاری بیعت معاف کردی۔ تم جس سے چاہو، بیعت ہوجاؤ۔''

مگر ہر بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوجاتے اور فرماتے: ''ہم نہ بیعت توڑیں گے نہ آپ کو مستعفی ہونے دیں گے۔ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے کیا تھا۔ کون ہے جو آپ کو پیچھے کرسکے۔''[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پہلا خطاب:

بحیثیت سربراہِ مملکت آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطاب میں فرمایا:

''لوگو! خدا کی قسم، مجھے عمر بھر کبھی سرداری کی آرزو نہیں رہی۔ میں نے کبھی اللہ سے حکومت کی دعائیں مانگیں نہ کھلم کھلا نہ چھپ کر مگر میں فتنے پھیل جانے کے خوف سے یہ ذمہ داری اُٹھانے پر مجبور ہوا، مجھے اس عہدے میں کوئی آرام نہیں مل رہا مجھے تو ایسی ذمہ داری کا طوق پہنا دیا گیا ہے کہ اللہ کی توفیق کے بغیر مجھ میں اس کی سکت نہیں ہے۔''[2]

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''لوگو! مجھے تمہارا حاکم بنایا گیا ہے، اگرچہ میں تم سے افضل نہیں ہوں، اگر میں بھلائی کروں تو مجھ سے تعاون کرنا، اگر برائی کروں تو میری اصلاح کردینا۔ سچائی، امانت ہے اور جھوٹ، خیانت۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے حکومت کی بنیادی ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''قوم کا معمولی آدمی میرے نزدیک اُس وقت تک سب سے اہم ہے جب تک میں اسے اُس کا حق نہ دِلوادوں۔ قوم کا طاقتور فرد میرے نزدیک معمولی ہے، جب تک میں اُس سے مظلوم کا حق وصول نہ کرلوں۔''

اس ارشاد میں یہ پیغام مضمر تھا کہ حکومت کی ضرورت درحقیقت عام لوگوں اور کمزوروں کی دیکھ بھال کے لیے ہوتی ہے، ورنہ امراء اور رُوساء کو تو اپنی وجاہت اور رعب داب کی وجہ سے گھر بیٹھے حقوق ملتے رہتے ہیں، حکومتی خدمات کی اصل ضرورت عوام کو ہے اس لیے اسلامی حکومت انہی کو ترجیح دے گی۔

آپ رضی اللہ عنہ نے جہاد کی اہمیت اور گناہوں کی نحوست کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''یاد رکھو! جب کبھی کسی قوم نے جہاد ترک کیا تو اللہ نے اس پر ذلت و رسوائی ضرور مسلط کی ہے۔ جب بھی کسی قوم میں بدکاری بڑھتی ہے تو اللہ اسے ہمہ گیر آفات میں مبتلا کردیتا ہے۔''

① صحیح البخاری، ح: ۷۲۱۷، مسند احمد، ح: ۲۴۷۵۱، مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۱۶۱۱

② فضائل الصحابۃ للامام احمد بن حنبل، ح: ۱۰۲، ط مؤسسۃ الرسالۃ

آخر میں اسلامی حکومت میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کے سپرد ہونے کا نظریہ یاد دلاتے ہوئے فرمایا:

''جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تب تک میری پیروی کرنا۔ اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کرنے لگوں تو تم پر میری پیروی لازم نہیں۔''①

مسئلہ فدک:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اکثر امہات المؤمنین اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو قدرتی طور پر یہ خیال ہوا کہ عام شرعی دستور کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث میں ہمارا حق ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خانۂ اقدس میں کوئی درہم و دینار تو تھا ہی نہیں۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کی گزر بسر کے لیے تین قسم کے اموال تھے:

① مدینہ میں یہودِ بنونضیر سے جہاد میں حاصل ہونے والے مالِ فئے کی پیداوار کا پانچواں حصہ

(دشمنوں سے لڑے بغیر جو مال حاصل ہو، وہ مالِ فئے کہلاتا ہے۔ اس کا پانچواں حصہ مسلم سربراہ اپنی صوابدید پر خرچ کرسکتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مال کو اپنے گھر اور جہاں ضرورت ہوتی، خرچ فرماتے تھے۔)

② خیبر کے جہاد سے حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کا حصہ

③ خیبر کے شمال مشرق میں فدک نامی زرخیز علاقے کے باغات کی پیداوار

خیبر کی غنیمت اور فدک کی زرعی اراضی ان فتوحات میں شامل چودہ سو صحابہ میں تقسیم کی گئی تھیں اور ان میں سے ایک حصہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ملا تھا۔ آمدن کے ان ذرائع کا بیشتر حصہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی ضروریات میں صرف فرمادیتے تھے، تاہم کچھ اپنے اہل وعیال پر بھی خرچ فرماتے تھے۔ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور امہات المؤمنین ان ذرائع آمدن کو میراث نبوی سمجھ کر توقع کرنے لگیں کہ ان میں سے ایک حصہ ان کی ملکیت میں دے دیا جائے گا۔ مگر یہاں شرعی مسئلہ کچھ اور تھا۔ بنونضیر والی زمین تو مالِ فئے کی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت نہیں تھی بلکہ ان کی تولیت میں تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ خود بخود مسلمانوں کے شرعی خلیفہ کی تولیت میں آگئی تھی، وہ اپنی صوابدید کے مطابق اس کی آمدن اہل بیت پر خرچ ضرور کرسکتے تھے مگر اسے کسی کی ملکیت نہیں بنا سکتے تھے۔ جہاں تک خیبر اور فدک کے حصے کا تعلق ہے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں ضرور تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم واضح طور پر فرما گئے تھے:

''ہم انبیاء کی جماعت کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔''②

اس شرعی ضابطے میں بڑی حکمت یہ تھی کہ رسولوں کے منکرین کو کہیں یہ کہنے کا بہانہ نہ مل جائے کہ منصب رسالت بھی اہل وعیال کو پالنے اور اپنے خاندان کو مالامال کرنے کا ایک ڈھونگ ہوا کرتا ہے۔

مگر سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور اکثر امہات المؤمنین کو علم نہ تھا کہ انبیائے کرام کی وراثت جاری نہیں ہوتی۔ بہرحال

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۲۲۰

② صحیح البخاری، ح: ۶۷۲۶

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس شرعی مسئلے کی اسی طرح پاسداری کی جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں اس طرزِ عمل کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔'' ①

چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے خیبر کے اموال اور فدک کے باغات کو میراث کے طور پر اہل بیت میں تقسیم کرنے کی بجائے مسلمانوں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا اور یوں اس جائیداد کو ''صدقہ جاریہ'' میں تبدیل کر دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اہل بیت کو بے سہارا چھوڑ دیا۔ بلکہ آپ رضی اللہ عنہ تو فرماتے تھے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت میرے نزدیک اپنی قرابت داری سے زیادہ پسندیدہ ہے۔'' ②

آپ رضی اللہ عنہ نے مناسب ترین فیصلہ فرمایا کہ کسی کو مالکانہ حقوق دیے بغیر، ان جائیدادوں کے متولی کی حیثیت سے ان کی آمدن اہل بیت پر خرچ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی میں اہل بیت اور سادات کرام کی مصلحت بھی تھی، کیوں کہ چند افراد کو مالکانہ حقوق مل جاتے تو ممکن تھا چند پشتوں بعد یہ زمین فروخت کر دی جاتی اور بعد والے سادات کو اس سے حصہ نہ ملتا۔ اب اس جائیداد کے سرکاری سرپرستی میں محفوظ ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً دو صدیوں تک اہل بیت کی آل اولاد کو ان اموال سے حصہ پہنچتا رہا اور وہ معاشی طور پر فارغ البال رہے۔ ③

بہرکیف جب ان اموال کو اہل بیت میں تقسیم نہ کیا گیا تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور اکثر امہات المؤمنین کو شکایت ہوئی تاہم ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا شرعی مسئلے سے آگاہ تھیں، چنانچہ انہوں نے فوراً دیگر ازواج مطہرات کو یاد دلاتے ہوئے کہا: ''کیا رسول اللہ نے فرمایا نہیں تھا، جو ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔'' ④

چنانچہ امہات المؤمنین نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا۔ مگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اس مطالبے پر قائم رہیں، غالباً ان کے سامنے یہ حدیث تھی: ''میرے ورثاء میں کوئی دینار تقسیم ہوگا نہ درہم۔'' ⑤

اس بناء پر ان کا خیال غالباً یہ تھا کہ انبیائے کرام کے ترکے سے درہم و دینار جیسی چیزوں میں وراثت جاری نہیں ہوگی۔ کھیت، زمین اور باغ جیسی غیر منقولہ چیزوں کے بارے میں یہ حکم نہیں ہوگا۔ اس لیے ان کا اشکال باقی رہا۔

اپنی تسلی کے لیے وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک بار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں یہی حدیث سنائی کہ انبیاء جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ ⑥

اس موقع پر جگر گوشۂ رسول نے اپنے علمی ذوق کی بناء پر سوال اٹھایا کہ آخر آپ کی اولاد آپ کی وارث ہوگی تو میں

---

① صحیح البخاری، ح: ٦٧٢٦
② صحیح بخاری، ح: ٣٠٣٦
③ السنن الکبری للبیہقی، ح: ١٢٧٣٣، ط العلمیۃ
④ صحیح البخاری، ح: ٦٧٣٠
⑤ صحیح البخاری، ح: ٢٧٧٦
⑥ صحیح البخاری، ح: ٦٧٢٦

اپنے باپ کی وارث کیوں نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے رسول اللہ کی لختِ جگر! آپ کے والد ماجد نے کوئی گھر، کوئی غلام، کوئی مال، کوئی چاندی یا سونا وراثت میں چھوڑا ہی نہیں۔''

سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا: ''اور فدک کی اس زمین کی حیثیت کیا ہے جو اللہ نے ہمارے لیے مقرر کی اور صافیہ (مال فئے کے پانچویں حصے) کا کیا مصرف ہے جو ہمارے لیے آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

خلیفۂ رسول نے فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ یہ ایک لقمۂ رزق ہے جو اللہ مجھے کھلا رہا ہے، میں فوت ہو جاؤں تو یہ مسلمانوں کے لیے وقف ہے۔''①

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے درست ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں اس حکم کو اسی طرح باقی رکھا۔② پس یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ساتھ مل کر اہلِ بیت کو میراث سے محروم کرنے کی سازش کی تھی۔''

پھر یہ تاثر سراسر مغالطے پر مبنی ہے کہ صرف سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو محروم کیا گیا۔ درحقیقت امہات المؤمنین میں سے بھی کسی کو میراث نہیں ملی۔ اگر حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما میراث تقسیم کروا دیتے تو ان کی بیٹیاں: سیدہ عائشہ صدیقہ اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہما بھی حصہ پاتیں۔ مگر انہوں نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر فرمانِ نبوی کی تعمیل کی۔

بخاری شریف کی ایک روایت کو لے کر شبہ پیدا کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اتنی ناراض ہوئیں کہ دوبارہ ان سے بات چیت نہ کی مگر اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ مسئلۂ میراث میں دوبارہ بات نہیں کی۔ سکوت الگ چیز ہے اور سلام و کلام بند کر دینا الگ بات۔ سلام و کلام بند کرنا تب ثابت ہوتا جب ان کا پہلے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اکثر ملنا جلنا ہوتا اور اس مسئلے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جاتا۔ ظاہر بات ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے لیے غیر محرم تھے۔ پہلے بھی وہ ان سے شدید ضرورت کے بغیر نہیں ملتی تھیں تو اب کیوں ملتیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نہ ملنے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے والد کی وفات کے بعد غم و اندوہ میں ڈوبی رہتی تھیں۔ اسی دوران وہ بیمار پڑیں اور چھ ماہ بعد دنیا سے چل بسیں۔ ادھر ابوبکر رضی اللہ عنہ اس وقت مرتدین اور منکرینِ ختم نبوت سے جنگوں اور ایران و شام کے لیے لشکر کشی جیسے اہم ترین امور میں مصروف تھے۔ اس لیے رسمی ملاقاتوں کا وقت کہاں نکل سکتا تھا۔

سیّدہ فاطمہ، حضرت علی اور خانوادۂ صدیقی کے تعلقات:

یہ ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بیمار پرسی کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی گھر تشریف آوری اور خبر گیری سے سیّدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو تسلی ہوئی۔ بعد میں بھی وہ ان سے راضی

---

① شرح معانی الآثار، ح: ۵۳۴۷
② الکامل فی التاریخ: ۲/ص ۱۰۳؛ فتوح البلدان: ۱/ص ۴۱، ۴۲

رہیں۔ ① اگر سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہوتیں تو انہیں اپنے گھر کیوں آنے دیتیں؟

سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آخر دم تک گہرے راز و نیاز کا تعلق تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے سرگوشی میں کچھ کہا تھا جسے سن کر وہ روئیں اور پھر ہنس دیں۔ بعد میں اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یہ راز دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنی وفات کی خبر دی جس سے مجھے رونا آ گیا۔ پھر بتایا کہ میرے گھرانے میں سے سب سے پہلے تم مجھ سے آملوگی۔ اس پر میں ہنس دی۔ ②

اگر سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خانوادۂ صدیقی سے کوئی خلش ہوتی تو سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو راز کی باتیں کیوں بتاتیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ہمیشہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مداح اور عقیدت مند رہے۔ اسی عقیدت کے باعث انہوں نے اپنی دوسری بیوی لیلیٰ بنت مسعود سے تولد ہونے والے ایک بیٹے کا نام ابوبکر رکھا۔ ③ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو ان کے بیٹے محمد بن ابی بکر اڑھائی سال کے تھے۔ ④ انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا کر پالا۔ ⑤ کیا یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت کا واضح ثبوت نہیں؟

❀❀❀

فتنوں کا انسداد

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی تین بڑے فتنوں سے سابقہ پڑا۔ یہ ایسے فتنے تھے کہ اگر آپ کی بے مثال استقامت اور محیّر العقول قوتِ ایمانی آڑے نہ آتی تو اُمت کے تار و پود اس ابتدائی دور ہی میں بکھر جاتے۔ پہلا فتنہ اقتدار کے اُن بھوکوں کا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے سرزمین عرب کے مختلف گوشوں میں کھڑے ہو گئے تھے اور ہزاروں نومسلم اور ناسمجھ لوگ ان کے پیروکار بن گئے تھے۔ ان جھوٹے مدعیانِ نبوت میں اَسوَد عنسی، طُلَیْحہ بن خُوَیْلِد، مُسَیْلِمہ کذاب اور بنو تمیم کی ایک عورت سَجاح شامل تھی۔ دوسرا فتنہ ارتداد کا تھا۔ نجد، یمن اور دوسرے علاقوں میں ہزاروں لوگ یہ تصور کر کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ اسلام کی شمع بھی گل ہو چکی، مرتد ہو گئے تھے، انہوں نے دوبارہ اپنا آبائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ تیسرا فتنہ ان لوگوں کا تھا جو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ ⑥

---

① الاعتقاد للبیہقی، ص ۳۵۳

② صحیح مسلم، ح: ۶۳۶۶، باب فضائل فاطمہ رضی اللہ عنہا

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۲۵

④ طبقات ابن سعد، ترجمۃ: محمد بن ابی بکر

⑤ طبقات ابن سعد: ۲۹/۸، ط صادر ⑥ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۱۱ھ

منکرین زکوۃ سے معاملہ:

زکوۃ کے منکرین نے دربارِ خلافت میں اپنے نمائندے بھیج کر مطالبہ کیا کہ وہ توحید و رسالت اور اسلام کے تمام ارکان کو مانتے ہیں مگر انہیں زکوۃ معاف کر دی جائے۔ صحابہ کرام نے حالات کی نزاکت اور وقتی مصلحت کو دیکھتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رائے دی کہ فی الحال ان لوگوں کا یہ مطالبہ منظور کر لیا جائے اور زکوۃ ادا نہ کرنے کی چھوٹ دے دی جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے دلیر اور بلند حوصلہ انسان کا مشورہ بھی یہی تھا کہ بغاوت کے فتنے سے بچنے کے لیے ان کی شرط مان لی جائے۔ انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا:

''یہ لوگ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تو پڑھ رہے ہیں، آپ ان سے کیوں جنگ کرنا چاہتے ہیں؟''

لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سیاسی مصلحتوں اور وقتی ضرورتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلام کو اصلی شکل میں باقی رکھنے کا عزم کیے ہوئے تھے، اس لیے آپ نے فرمایا: ''واللہ! جو زکوۃ کو نماز کے برابر اہمیت نہیں دے گا، میں اس سے ضرور لڑوں گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو لوگ زکوۃ میں بکری کا ایک بچہ بھی دیتے تھے، اگر آج وہ اس کی ادائیگی روکیں گے تو میں ان سے بزورِ شمشیر لے کر رہوں گا۔''①

لشکرِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس کام کو سب سے زیادہ اہمیت دی وہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے اس لشکر کی روانگی تھی جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری ایام میں ترتیب دیا تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری اور پھر وفات کے سبب اب تک یہ لشکر مدینہ منورہ کے باہر رکا ہوا تھا اور اب صحابہ کرام کی اکثریت کا خیال یہ تھا کہ اس لشکر کو روک کر پہلے جزیرۃ العرب میں برپا ہونے والی بغاوتوں کی سرکوبی کی جائے تاکہ اپنی طاقت منتشر نہ ہونے پائے۔ اس چوطرفہ آزمائش میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کا حوصلہ تھا جو نبوت کے معیارِ سیاست کو باقی رکھ سکے۔ انہوں نے توکل اور تدبیر کا ایسا امتزاج پیش کیا کہ مسلمان حالات کے ان سخت ترین طوفانوں سے بخیریت گزر گئے اور دین و شریعت کے کسی رکن میں معمولی رخنہ آنے کی نوبت بھی نہ آئی۔ حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی کا معاملہ سامنے آیا تو حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم جیسے اکابر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی روانگی مؤخر کرنے کا مشورہ دیا مگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر درندے مدینہ میں گھس کر مجھے کھا جائیں، تب بھی میں اس لشکر کو ضرور بھیجوں گا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اسے روک لوں، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی، فرما گئے ہیں کہ اس لشکر کو روانہ کر دو۔''②

چنانچہ یہ لشکر جس میں دو ہزار پیادے اور ایک ہزار گھڑ سوار تھے، اس طرح روانہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو

---

① صحیح البخاری، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۰۱؛ کنز العمال، ح: ۳۰۲۶۶، ۳۰۲۶۷

افراد اس میں شامل ہوئے تھے اُن میں سے کوئی کم نہ ہوا۔ ①

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی کے بعد مدینہ منورہ میں عسکری طاقت بہت کم رہ گئی تھی، اس لیے مرتد قبائل نے مدینہ منورہ کے اِرد گرد جمع ہونا شروع کر دیا، مدینہ کے شمال سے عَبس اور ذُبیان، شمال مشرق سے بنوفَزارہ اور جنوب مشرق سے بنوغَطفان کے مرتدین امنڈ پڑے۔ شہر کو خطرے میں دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بڑی مستعدی سے حفاظتی انتظامات کیے۔ تمام شاہراہوں اور راستوں کی ناکہ بندی کرائی اور اہل مدینہ کو ہر وقت تیار اور چوکس رہنے کی تاکید کی۔ ②

اُدھر حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر شام کی سرحدوں کی جانب نکلا تو راستے میں کئی ایسے قبائل کے پاس سے اس کا گزر ہوا جو ارتداد اور بغاوت کے لیے پر تول رہے تھے مگر جب انہوں نے اسلامی لشکر کو اس آن بان اور بے خوفی سے گزرتے دیکھا تو مرعوب ہوگئے اور بغاوت کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر نے شام کی سرحد عبور کر کے ''بَلقَاء'' اور ''دَارُوم'' کے علاقوں میں رومیوں سے ٹکر لی اور انہیں شکست دے دی۔ ③

لشکر اسامہ کی کامیابی کی خبریں سن کر وہ باغی قبائل جو مدینہ کے شمال اور مشرق میں صرف چند میل دور پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے، سہم گئے۔ وہ کہہ رہے تھے: ''اگر مدینہ والوں میں غیر معمولی طاقت نہ ہوتی تو اس حالت میں وہ یہ لشکر روانہ نہیں کر سکتے تھے۔'' ④ چنانچہ انہیں مدینہ پر حملے کی جرأت نہ ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی لشکر اسامہ کی واپسی تک احتیاط سے کام لیا اور مدینہ کے دفاع پر توجہ دیتے ہوئے باغیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔

منکرین ختم نبوت سے جہاد۔ طُلَیحہ بن خُوَیلِد کے خلاف یلغار:

اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ سے بارہ میل دور ذو القَصّہ کے مقام کو چھاؤنی بنا کر فوج کو گیارہ حصوں میں تقسیم کیا۔ ہر حصے پر تجربہ کار صحابہ کرام کو امیر مقرر کیا اور ایک مربوط نقشۂ جنگ کے مطابق ان لشکروں کو پورے جزیرۃ العرب میں پھیلا کر جھوٹے نبیوں کی سرکوبی شروع کی۔ اس سے قبل آپ رضی اللہ عنہ تمام مرتد سرداروں، نبوت کے جھوٹے دعوے داروں اور اُن کے پیروکاروں کی طرف اپنے قاصد بھیج کر انہیں دوبارہ اسلام کی دعوت دے چکے تھے اور آپ کے نائبین سر توڑ کوششیں کر چکے تھے کہ یہ گمراہ لوگ دوبارہ ہدایت پر آجائیں مگر بہت کم لوگوں پر اس دعوت کا اثر ہوا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی پوری قوت، ہمت اور ایمانی جوش کے ساتھ ان کے مقابلے پر آگئے۔

بنواسد کے سردار طُلَیحہ بن خُوَیلِد نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے اپنے گرد ایک بھاری جمعیت اکٹھی کر لی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ جبرئیل علیہ السلام اس کے پاس بھی آیات لاتے ہیں۔ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے وہ طرح طرح کی شعبدہ بازیاں دکھاتا تھا۔ یہ ایک زبردست فتنہ تھا جس نے مدینہ منورہ کے مشرق کو گرد آلود کر دیا تھا۔

---

① المغازی للواقدی: ۱ ص ۳۷۰ ② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۱ھ

③ البدایۃ والنہایۃ: ۹ ص: ۴۲۳، دار ہجر ④ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۱ھ

طُلَیحَہ کی سرکوبی کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام کے بہترین سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے طلیحہ کے خلاف کارروائی شروع کی۔ ''بزاخہ'' کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ طُلَیحَہ خود ایک چادر اوڑھ کر مراقبے کی حالت میں اس طرح بیٹھ گیا جیسے اس پر وحی نازل ہونے والی ہو۔ اس کی فوج کا سپہ سالار عُیَینَہ بن حصن جس کے پاس بنوفزارہ کے سات سو جنگجو تھے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی فوج پر حملہ آور ہوا۔ گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ جلد ہی عُیَینَہ نے محسوس کرلیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو شکست دینا مشکل ہے۔ اس نے طُلَیحَہ کے پاس آکر پوچھا: ''کیا جبرئیل کوئی پیغام لائے ہیں؟'' جواب ملا: ''ابھی نہیں۔'' لڑائی نے طول کھینچا اور عُیَینَہ کو کامیابی دور معلوم ہونے لگی تو پھر طُلَیحَہ کے پاس گھبرایا ہوا آیا اور چلایا: ''تیرا باپ مرے، جبرئیل کچھ حکم لائے کہ نہیں؟'' جواب ملا: ''ابھی تک تو نہیں آئے۔'' عُیَینَہ پھر جاکر فوج کو لڑانے میں مصروف ہوگیا مگر جب ساتھیوں کے قدم ڈگمگاتے دیکھے تو پھر دوڑا ہوا آیا اور بولا: ''جبرئیل آئے کہ نہیں؟'' طُلَیحَہ بولا: ''ہاں آئے تھے۔'' عُیَینَہ نے پوچھا: ''کیا حکم لائے؟'' طُلَیحَہ نے کہا: ''اِنَّ لَکَ رِحاً کَرِحاہُ ... وَحَدِیثًا لا تَنْسَاہُ۔''

(تیری قسمت میں ایک چکی ہے جیسے اس کی چکی ہے اور تیری حالت ایسی ہونے کو ہے کہ تو اسے کبھی نہ بھولے گا)

یہ اُوٹ پٹانگ جملے سن کر عُیَینَہ سمجھ گیا کہ طُلَیحَہ نے نبوت کا ڈھونگ رچایا ہے۔ اس نے لشکر میں جاکر آواز لگائی: ''لوگو! جان بچاکر بھاگو، یہ شخص تو جھوٹا اور مکار ہے۔'' عُیَینَہ اور اس کے قبیلے کے بھاگتے ہی مرتدین کے قدم اکھڑ گئے، عُیَینَہ تو پکڑا گیا مگر طُلَیحَہ نے ایسے موقع کے لیے پہلے سے ایک نہایت تیز رفتار گھوڑے کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر اس پر سوار ہوا اور یہ کہتے کہتے فرار ہوگیا ''لوگو! جو اپنی بیوی کو لے کر بھاگ سکتا ہے، بھاگ جائے۔''

طُلَیحَہ جان بچاکر شام پہنچ گیا، پھر مدتوں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا، آخر کچھ عرصے بعد وہ دوبارہ مسلمان ہوگیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دربار میں معافی کی درخواست بھیج دی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارتداد سے توبہ تائب ہونے والوں کے لیے نرم رویہ اپنایا تھا، چنانچہ اس کی معذرت قبول کرلی گئی۔ بعد میں طُلَیحَہ نے عراق کے جہاد میں اسلام کے بہترین سپاہی کا کردار ادا کیا۔ عُیَینَہ نے اسلام قبول کرلیا تو اسے بھی رہا کردیا گیا۔ ①

مالک بن نُوَیرہ کا قتل:

بِطاح میں بنوتمیم کا رئیس مالک بن نُوَیرہ بھی سرکشی ظاہر کر رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری ایام میں اپنے عاملین کو زکوٰۃ وصول کرنے اُس کے پاس بھیجا تھا، اس دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی خبر آئی تو مالک بن نُوَیرہ اَڑ گیا کہ یہ زکوٰۃ اب مدینہ نہیں بھیجی جائے گی بلکہ یہیں کے مستحقین میں خرچ کی جائے گی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عاملین نے زکوٰۃ کی رقم مدینہ منورہ بھیجنے پر اصرار کیا تو مالک بن نُوَیرہ لڑائی پر آمادہ ہوگیا۔ انہی دنوں عراق کے سرحدی علاقے ''الجزیرہ'' سے نبوت کا دعویٰ کرنے والی عورت سَجاح بنت حارث وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ اچھا خاصا جتھا تھا جن

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۱ ھ

میں بنو تغلب کے نصرانی بھی شامل تھے جو مسلمانوں کی خانہ جنگی میں ایندھن ڈالنے کے لیے تیار تھے۔

سجاح اس لشکر کو لے کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتی تھی، راستے میں اس نے بنو تمیم کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے مالک بن نُوَیرہ سے مذاکرات کیے۔ مالک نے اُسے سمجھایا کہ ابھی مدینہ پر حملہ کی بجائے اپنی طاقت بڑھانا بہتر ہے۔ سجاح کو یہ مشورہ پسند آیا چونکہ اُن دنوں یمامہ کے مُسَیلِمہ کذاب کی قوت کا بڑا چرچا ہو رہا تھا، اس لیے سجاح اس سمت روانہ ہوگئی۔ مالک بن نُوَیرہ یہ مشورہ دے کر پیچھے تنہا رہ گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان حالات سے خوب واقف تھے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مدینہ سے روانہ کرتے وقت بطاح والوں کی بھی خبر لینے کی ہدایت دے چکے تھے۔ چنانچہ طُلَیحہ سے نمٹتے ہی انہوں نے بطاح پر یلغار کر دی۔ مالک بن نُوَیرہ ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گیا۔ اس نے زکوٰۃ یا کسی اور رکنِ اسلام کا انکار نہیں کیا تھا مگر بہر حال وہ خلافت اسلامیہ کا باغی ضرور تھا، اس کے باوجود حضرت خالد رضی اللہ عنہ اُسے قتل نہیں کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ وہ ایک شریف، سخی اور بہادر انسان کے طور پر مشہور تھا مگر قسمت کا ہونا ہو کر رہتا ہے۔ مالک بن نُوَیرہ گرفتاری کے بعد غلط فہمی میں ایک سپاہی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ [1] مالک بن نُوَیرہ کے قتل میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ہرگز کوئی کردار نہیں تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک رات شدید سردی کے پیشِ نظر قیدیوں کے بارے میں سپاہیوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا تھا:

اَدْفِئُوْا اَسْرَاکُمْ ''اپنے قیدیوں کو حرارت پہنچاؤ۔'' (یعنی ان کو گرم کپڑے، لحاف وغیرہ فراہم کرو۔)

اس علاقے کی زبان لغت بنی کنانہ میں یہ لفظ قتل کے لیے استعمال ہوتا تھا، اس لیے بعض سپاہیوں نے غلط فہمی میں قیدیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اس سے پہلے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ موقع پر پہنچ کر منع کرتے، مالک بن نُوَیرہ بھی ان سپاہیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس واقعے پر رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''جب اللہ کسی سانحے کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ ہو کر رہتا ہے۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے مالک بن نُوَیرہ کی بیوہ اُمِ تمیم کی اشک شوئی اور کفالت کی خاطر اس کی عدت گزرنے کے بعد اس سے نکاح کر لیا۔ [2]

اگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ مالک بن نُوَیرہ کے قتل کے قصداً مرتکب ہوتے تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اُمِ تمیم اُن سے نکاح کرتی بلکہ وہ مقتول شوہر کا بدلہ لینے اٹھ کھڑی ہوتی۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی، یہاں تک کہ دیت کا بوجھ بھی ان پر نہیں ڈالا، اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک بھی بے قصور تھے۔ اگر واقعہ ویسے ہوتا جیسے غیر محتاط مؤرخین بیان کرتے ہیں، یعنی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالک بن نُوَیرہ کو قتل کیا ہوتا اور پھر اس کی بیوی کو جبراً منکوحہ بنایا ہوتا، تو

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۰۵، ۱۰۶؛ المختصر فی اخبار البشر: ۱/۱۵۸

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۱ھ

ممکن نہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس ظلم کو برداشت کر جاتے۔

اسود عنسی کا فتنہ:

جھوٹے مدعیانِ نبوت میں سے اسود عنسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں فتنہ برپا کر دیا تھا۔ ہزاروں دیہاتی اس کے پیروکار بن گئے تھے۔ اس کی قوت سے سارے یمن والے خائف تھے۔ اسود عنسی کی ستم رانیوں کا یہ عالم تھا کہ اس نے یمن کے مشہور تابعی حضرت ابومسلم خولانی رحمہ اللہ کو (جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا مگر زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے تھے) اپنی جھوٹی نبوت کا کھلم کھلا انکار کرنے کی پاداش میں گرفتار کر کے بے دریغ بھڑکتے الاؤ کے شعلوں میں پھینک دیا، تاہم ابومسلم خولانی بالکل محفوظ رہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کا بال بھی بیکا نہ ہونے دیا، یہ حیرت انگیز منظر دیکھ کر اسود عنسی کے حاشیہ برداروں نے کہا "اس آدمی کو فوراً یہاں سے چلتا کیجئے، ورنہ سب لوگ آپ سے برگشتہ ہو جائیں گے۔" اسود نے انہیں یمن سے چلے جانے کا حکم دیا۔ وہ خود ان بدبختوں سے دور رہنا چاہتے تھے، چنانچہ یمن چھوڑ دیا۔ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسود عنسی کی شورش کا حال سن کر بعض عرب رئیسوں کو مکتوب بھیجا تھا کہ وہ اسود کے فتنے کی سرکوبی کریں، چنانچہ وہاں کے ایک صحابی فیروز رضی اللہ عنہ نے خفیہ طور پر ایک شب اسود عنسی کی رہائش گاہ میں گھس کر اسے قتل کر دیا، اس طرح عارضی طور پر یہ فتنہ دب گیا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں اس کے پیروکاروں نے یمن میں پھر سے شورش برپا کر دی تھی، آخر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت مہاجر بن امیہ رضی اللہ عنہ کو فوج دے کر یمن بھیجا۔ انہوں نے شرپسندوں کو شکست فاش دی اور یمن میں امن وامان بحال کر دیا۔ ①

مسیلمہ کذاب کا فتنہ:

نبوت کے جھوٹے دعوے داروں میں مسیلمہ کذاب کی طاقت سب سے زیادہ تھی جو جزیرۃ العرب کے مشرقی علاقے نجد سے نمودار ہوا تھا۔ وہ نہایت مکار انسان اور شاطر سیاست دان تھا۔ میٹھی میٹھی باتوں اور خوبصورت وعدوں سے لوگوں کا دل جیت لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ بنوحنیفہ کا سارا قبیلہ اس کے گرد جمع ہو گیا تھا، وہ اپنے ہاں مسلمانوں کی طرح اذان اور نماز کا اہتمام کراتا تھا۔ "یمامہ" کو اپنا مرکز بنا کر اس نے اسے مکہ مکرمہ کی طرح "حرم" قرار دے دیا تھا۔ قرآنِ مجید کے اسلوب سے ملتی جلتی آیات بنانے کی بھی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس شاطر دشمن کے خلاف حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا مگر انہیں شکست ہوئی۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو کمان سونپی۔ جب وہ یمامہ کے نواح میں پہنچے تو مسیلمہ کذاب بنی حنیفہ کے چالیس ہزار مسلح افراد کے ساتھ سامنے آ گیا۔ شدت کی جنگ چھڑ گئی جس میں کئی نامور صحابہ کرام یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ حضرت ثابت بن قیس، حضرت سالم، حضرت ابوحذیفہ اور حضرت زید

① الکامل فی التاریخ: سنۃ 11ھ

بن خطاب رضی اللہ عنہم نے اپنی جانیں قربان کردیں۔

آخرکار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو منظم کر کے ایک زوردار حملہ کیا اور دشمن کی صفیں اُلٹ دیں۔ منکرینِ ختم نبوت سر پر پاؤں رکھ کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ میدانِ جنگ سے کچھ دور بلند و بالا دیواروں میں گھرا ہوا ایک باغ تھا جسے "حدیقۃ الرحمٰن" کہا جاتا تھا۔ منکرینِ ختم نبوت فرار ہو کر اس باغ میں مورچہ بند ہو گئے۔ مسلمان وہاں تک پہنچے تو وہ دروازہ بند کر چکے تھے۔ براء بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھ کر اصرار کیا کہ انہیں اُچھال کر باغ میں ڈال دیا جائے تاکہ وہ اندر سے دروازہ کھول دیں۔ اُن کے اصرار پر انہیں اندر پھینک دیا گیا۔ وہ لڑتے بھڑتے دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب مسلمان ایک ریلے کی طرح اندر گھس گئے۔ مسیلمہ کذاب بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ گھات میں تھے جو غزوۂ اُحد میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل کے بدلے کوئی بڑی نیکی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے روایتی انداز میں ایسا برچھا مارا کہ بدبخت وہیں ڈھیر ہو گیا، اسی لمحے ایک انصاری نے تلوار کا وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔

اس ہولناک جنگ میں لگ بھگ ۷۰۰ صحابہ کرام نے جام شہادت نوش کیا، جن میں سے بہت سے نامور قاری اور حافظِ قرآن تھے۔ دشمن کے سات ہزار افراد میدان میں، سات ہزار باغ میں اور تقریباً اتنے ہی فرار ہوتے ہوتے مارے گئے۔[1] اس کے بعد فتنوں کا زور بالکل ٹوٹ گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تدبر، استقامت اور منصوبہ بندی کی بدولت ایک سال کے اندر اندر ہر طرف مکمل امن و امان قائم ہو گیا۔[2]

❁❁❁

ایران اور شام کی مہمات

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے وقت جزیرۃ العرب دنیا کی دو عظیم ترین طاقتوں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ مشرق میں ساسانی ایرانی سلطنت تھی اور مغرب میں بازنطینی روم۔

اسلام سے پہلے چونکہ عربوں کی کوئی مضبوط مرکزی حکومت نہیں تھی لہٰذا ان کے انتشار سے فائدہ اُٹھا کر ایرانی حکام سرزمین عرب میں مداخلت کرتے رہتے تھے اور بعض اوقات ان کے سرداروں کو اپنا ماتحت بنا کر ان سے لگان بھی وصول کیا کرتے۔ اسلام کے بعد عرب قبائل ایک پرچم تلے جمع ہو کر ایک مستحکم طاقت بن گئے تھے، اسی لیے ایرانی سلطنت کو مسلمانوں سے تشویش لاحق ہو گئی۔ مگر ان دنوں ایران خود شدید ترین داخلی بحران کا سامنا کر رہا تھا، اس لیے دربارِ ایران کو کسی بیرونی محاذ پر توجہ دینے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۱ھ، فتح الباری: ۲/ص ۹۱ ② العبر للذھبی: سنۃ ۱۲ ہجری

اس سیاسی بحران کا آغاز کسریٰ پرویز کی موت سے ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتی مکتوب چاک کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنے بیٹے شیرَوَیہ کے ہاتھوں قتل ہوگیا تھا۔ پھر جب شیرَوَیہ نے بغاوتوں کے امکانات سے نجات پانے کے لیے اپنے تمام بھائیوں کو قتل کر ڈالا تو ساسانی سلطنت کے لیے مناسب ولی عہد ملنا مشکل ہوگیا۔ یہ سب کرکے بھی بدقسمت شیرَوَیہ صرف آٹھ ماہ حکومت کرکے اس حالت میں مرگیا کہ پیچھے اس کے سات سالہ لڑکے اَردشیر کے سوا کوئی جانشین نہ تھا۔ اسے تخت پر بٹھا دیا گیا مگر کم سنی کی وجہ سے وہ اس قابل نہ تھا کہ حکومتی ذمہ داریاں انجام دے سکتا۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حکومتی معاملات عورتوں کو سنبھالنے پڑے اور "بوران دُخت" اور "آرزمی دُخت" نامی دو شہزادیاں امورِ سلطنت پر حاوی ہوگئیں اور ایرانی سلطنت سیاسی بحران میں مبتلا ہوگئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت تک وہاں یہی حال تھا۔ ①

عراق پر فوج کشی:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ ایرانیوں کی حالت جوں ہی سنبھلے گی وہ سرزمین عرب پر یلغار کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے، اس لیے آپ رضی اللہ عنہ مشرقی سرحدوں کی طرف سے پوری طرح چوکنا تھے۔

اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ انہی دنوں عراق کی سرحدوں پر آباد بعض عرب قبائل جو صدیوں سے ایرانیوں کے مظالم برداشت کررہے تھے، اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایران کے سرحدی صوبے "سواد" (عراق) میں گھس کر کارروائیاں کررہے تھے۔ ان قبائلیوں میں مزاحمت کا جذبہ پیدا کرنے میں قبیلہ وائل کے ایک رئیس مُثنّیٰ بن حارثہ الشیبانی رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے۔ وہ اپنی قوم کو لے کر ایرانیوں کی چوکیوں پر چھاپہ مار حملے کرتے رہتے تھے۔ ②

جلد ہی حضرت مُثنّیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہوگیا کہ کسریٰ کی افواج میں اَب پہلے جیسا دم خم نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے مدینہ منورہ آکر دربارِ خلافت سے عراق پر حملے کی اجازت لی اور امدادی افواج کا مطالبہ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منظوری دے دی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس محاذ پر روانہ کردیا۔ اسلامی فوجیں خلیج فارس کے قریب ساحلی مقام "اُبُلّہ" کے قریب جمع ہوگئیں۔ یہاں ایرانیوں کے حاکم "ھُرمُز" کی حکومت تھی، جس کے ظلم وستم سے رعایا اتنی پریشان تھی کہ اسے برملا بددعائیں دیتی۔ ③

ایرانیوں سے پہلی جنگ۔ ذات السلاسل:

ہُرمُز اپنی تمام فوج کو لے کر مسلمانوں سے ٹکر لینے نکل کھڑا ہوا۔ ایرانی سورماؤں نے اپنی صفوں کو زنجیروں سے باندھ رکھا تھا تاکہ شکست کھا کر بھاگنے کا خیال بھی نہ آئے اس لیے اس جنگ کو "ذات السلاسل" یعنی زنجیروں والی

---

① الاخبار الطوال لابی حنیفة الدینوری، ص ۱۱۱، ط دار احیاء الکتب العربی

② فتوح البلدان للبلاذری: ص ۲۳۸، ط مکتبة الهلال؛ الاستیعاب: ۱۳۵۶/۳، ۱۳۵۷

③ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲ ھ

جنگ کہا جاتا ہے۔ جنگ شروع ہوتے ہی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ہُرمُز کو قتل کر کے ایرانیوں کو مرعوب کر دیا اور ان کے پہلوان اپنی زنجیریں توڑ کر بھاگ نکلے۔ تاہم مسلمانوں نے بے شمار مفرورین کاٹ ڈالے۔ یہ سن ۱۲ ہجری کے آغاز کا واقعہ ہے، سرحداتِ عجم کی اس پہلی فتح کی خوشخبری مالِ غنیمت کے پانچویں حصے کے ساتھ دربارِ خلافت بھیج دی گئی۔ ①

ثِنِیٰ اور وَلَجہ کے معرکے:

اس کے بعد ایرانی جرنیل قارن ایک بڑا لشکر لے کر ''ثنی'' کے مقام پر مقابلے میں آیا مگر اسے بھی شکست ہوئی، وہ خود مارا گیا اور اس کے تیس ہزار سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ② صفر سن ۱۲ ہجری میں ''وَلَجہ'' کے مقام پر مسلمانوں اور مجوسیوں میں بڑی خون ریز جنگ ہوئی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کمان میں مسلمان یہاں بھی غالب رہے۔ ③

اَمْغِیْشِیَا کا مالِ غنیمت:

سرحداتِ عراق پر نصرانی عرب قبائل آباد تھے جو ایرانی سلطنت کے حامی تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ انہیں سبق سکھانے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس جنگ میں ستر ہزار ایرانی اور نصرانی عرب قتل ہوئے۔ ان کی خیمہ گاہ، ''اَمْغِیْشِیَا'' میں تھی جہاں ساز وسامان، اسلحے اور جانوروں کا عظیم ذخیرہ جمع تھا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ مدینہ منورہ بھیجا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بے ساختہ کہہ اُٹھے: ''کسی ماں کا بیٹا خالد جیسا نہیں ہوسکتا۔'' ④

فتحِ حِیرہ:

دریائے فُرات کے قریب ''حِیرہ'' نصرانی عربوں کا قدیم مرکز تھا۔ لشکرِ اسلام نے آگے بڑھ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ شہر کے لوگ مقابلے سے عاجز آ گئے تو اپنے ایک رئیس عَمرو بن عبدالمسیح کی قیادت میں ایک سفارتی وفد بات چیت کے لئے بھیج دیا۔ عَمرو بن عبدالمسیح کا خادم اپنے ساتھ زہر کی تھیلی لیے ہوئے تھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''یہ ساتھ کیوں لائے ہو؟'' بولا: ''ڈرتا ہوں کہ اگر صلح کے مذاکرات میں ناکام ہوگیا تو اپنی قوم کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اس سے بہتر ہوگا کہ زہر کھا کے مرجاؤں۔'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تھیلی لے کر زہر اپنی ہتھیلی پر اُلٹ دیا اور بولے: ''جب تک وقت پورا نہ ہوجائے، موت نہیں آسکتی۔'' آپ نے ''بِسْمِ اللّٰهِ خَيْرِ الْاَسْمَآءِ، رَبِّ الْاَرْضِ وَالسَّمَآءِ، الَّذِيْ لَيْسَ يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ دَآءٌ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' پڑھتے ہوئے زہر پھانک لیا اور آپ کو کوئی گزند نہ پہنچی۔

عَمرو بن عبدالمسیح نے یہ دیکھ کر ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ پر صلح کر لی۔ مسلمانوں نے مقامی باشندوں کے ساتھ بڑی کشادہ دلی کا معاملہ کیا، یہ سلوک دیکھ کر گردونواح کے زمینداروں اور رئیسوں نے بھی جزیہ دینا قبول کر کے مسلمانوں کی ماتحتی اختیار کر لی۔ یہ ربیع الاوّل سن ۱۲ ہجری کا واقعہ ہے۔ ⑤

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲ هجری

② الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲ هجری؛ تاریخ ابن خلدون: ۵۱۰/۲ ③ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲ هجری

④ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۲ هجری؛ البدایة والنهایة: ۵۲۲/۹ ⑤ البدایة والنهایة: ۵۲۲/۹، ۵۲۳

معرکۂ عَینُ التمر:

اُدھر ایرانی سردار مہران مسلمانوں کو روکنے کے لیے شمالی عراق کے علاقے عین التمر تک آ گیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی تیزی سے وہاں پہنچے اور ایرانیوں کو مار بھگایا۔ مفرورین ایک قلعے میں جا چھپے مگر مسلمانوں نے اسے بھی فتح کر لیا۔ ①

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ دَوْمۃ الجَنْدَل میں:

جزیرۃ العرب کے شمال میں دَوْمۃ الجَنْدَل کے علاقے میں بھی آباد عرب نصرانی قبائل مسلمانوں کے خلاف جتھہ بندی کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھیجے گئے امیر حضرت عِیاض بن غَنْم رضی اللہ عنہ اُن پر قابو نہ پا سکے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے مدد طلب کی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بلا پس و پیش وہاں پہنچ گئے۔ اب نصرانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور عِیاض بن غَنْم رضی اللہ عنہ کی فوجوں سے الگ الگ سمتوں میں لڑنے کے لیے نکلے۔ گھمسان کی جنگ کے بعد نصرانیوں کو دونوں جگہ شکست ہوئی۔ اس طرح عرب نصرانیوں کی طاقت پارہ پارہ ہو گئی۔ ②

فِراض کی جنگ:

اب حضرت خالد ولید رضی اللہ عنہ واپس ''حِیرَہ'' کی طرف پلٹے جہاں عجمی جاگیردار اور عرب نصرانی سردار از سرِ نو طاقت اکٹھی کر کے جنگ کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یکے بعد دیگرے مُصَیَّخ، ثَنِیّ اور زُمَیل کے میدانوں میں ان سے جنگیں کیں اور ان کا شیرازہ بکھیر دیا۔

شام، عراق اور ریاست حِیرَہ کی سرحدات کے سنگم پر ''فِراض'' نہایت اہم مقام تھا۔ جب اسلامی لشکر یہاں پہنچا تو ایرانیوں اور نصرانی عربوں کے ساتھ ساتھ رومی افواج بھی مسلمانوں کے مقابلے کے لیے شانہ بشانہ کھڑی تھیں، کیوں کہ ان میں سے کوئی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اتنا اہم علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔ یہاں دریائے فرات کے کنارے ایک نہایت خون ریز جنگ ہوئی۔ آخر اتحادی شکست کھا کر بھاگ نکلے مگر دریائے فُرات کی موجوں کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چنانچہ اتحادیوں کے کم و بیش ایک لاکھ افراد قتل ہو گئے۔ یہ ذوالقعدہ ۱۲ ہجری کا واقعہ ہے۔ ③ کچھ دنوں بعد دربارِ خلافت سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حکم پہنچا کہ وہ عراق چھوڑ کر شام کی سرحدوں پر پہنچ جائیں کیوں کہ ان کی وہاں زیادہ ضرورت تھی۔ ④

شام کی فتوحات:

شام قیصرِ روم کی بادشاہت کا نہایت اہم صوبہ تھا جس میں نصرانیوں کے مقدس مقامات واقع تھے۔ شام کے نصرانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور ہی سے مسلمانوں کے خلاف کمربستہ تھے۔ اسی حکومت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا جن کے انتقام کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر بھیجا تھا جو موتہ کے مقام پر رومیوں سے لڑا تھا۔

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۲ ہجری ② تاریخ ابن خلدون: ۵۱۲/۲، ط دار الفکر

③ تاریخ ابن خلدون: ۵۱۳/۲، ۵۱۴ ④ المنتظم لابن جوزی: ۱۱۱/۳

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سن ۹ ہجری میں اپنا آخری جہادی سفر بھی رومیوں کی متوقع یلغار کی روک تھام کے لیے کیا تھا اور تبوک تک اسلام کے جھنڈے گاڑے تھے۔ اسی مہم کی تکمیل کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے آخری لمحات میں جیش اسامہ بن زید کو روانہ کیا تھا۔ رومی اسلام کو اپنے لیے سخت ترین خطرہ تصور کر کے نہ صرف جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے بلکہ عراق کی سرحد پر مسلمانوں کے خلاف لڑنے والے عرب نصرانیوں کو بھی ان کی پشت پناہی حاصل تھی۔①

لشکروں کی شام روانگی اور خلیفہ کی تاریخی وصیت:

ان حالات کے پیش نظر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام پر باقاعدہ یلغار کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے ایک جامع نقشۂ جنگ مرتب کیا۔ پہلے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو شام کی سرحدوں پر تعینات کر کے ہدایت کی کہ وہ آگے بڑھیں مگر رومیوں سے جنگ میں پہل نہ کریں اور زیادہ پیش قدمی مت کریں۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ ان ہدایات کے تحت محتاط انداز میں رومیوں کے مقابل آئے جو پوری طرح تیار ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے بڑی پامردی سے مقابلہ کر کے اس لشکر کو پسپا کر دیا مگر رومیوں کی فوجی طاقت کا کوئی حد و شمار نہ تھا اس لیے حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے دربارِ خلافت میں مزید افواج کی درخواست بھیجی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یمن، تہامہ، عمان اور بحرین سے جمع ہونے والے رضا کاروں کو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل کی قیادت میں جمع کر کے فوراً شام روانہ کر دیا۔ پھر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو ایک نئی فوج کے لیے رضا کار بھرتی کرنے کا کام سونپ دیا۔ جب ایک بڑا مجمع تیار ہو گیا تو آپ نے تین لشکر تشکیل دیے: ایک کا سالار حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو بنا کر اسے فلسطین کے رخ پر روانہ کیا، دوسرے کی قیادت حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو سونپی اور اسے اُرْدُن کی سمت بھیج دیا۔ تیسرا لشکر جو سب سے بڑا تھا، حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی کمان میں دیا۔ اس لشکر کو آپ نے خود بڑے اہتمام سے روانہ کیا اور مدینہ کے باہر تک اسے رخصت کرنے کے لیے پیدل ساتھ چلے۔ امیر لشکر کو یہ تاریخی ہدایات دیں:

''تمہیں قیادت اس لیے سونپی ہے تاکہ تمہاری آزمائش ہو اور تمہاری صلاحیتیں ظاہر ہوں۔ تم نے اچھی کارکردگی دکھائی تو تمہارا رتبہ بڑھا دیا جائے گا۔ اگر ذمہ داری اچھی طرح انجام نہ دی تو معزول کر دیے جاؤ گے۔

تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ وہ تمہاری چھپی ہوئی باتوں کو اسی طرح جانتا ہے جیسے تمہارے ظاہر کو۔ لوگوں میں سے اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ نزدیک وہی ہے جو سب سے زیادہ اُس سے لو لگائے رکھے۔ اللہ کے ہاں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اعمال کے ذریعے اس کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ خبردار! جاہلی تعصب سے بچ کر رہنا، اللہ تعالیٰ تعصب کو اور تعصب برتنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اپنے سپاہیوں سے اچھا سلوک کرنا، ان کو اچھی اُمید دلاتے رہنا۔ جب انہیں نصیحت کرو تو مختصر بات کرنا کہ طویل تقریر کا

① تاریخ الطبری، البدایۃ والنہایۃ، الکامل فی التاریخ: سنۃ ۷ھ، ۸ھ، ۹ھ، ۱۰ھ، ۱۱ھ

کچھ حصہ یاد رہتا ہے، کچھ بھول جاتا ہے۔ اپنے نفس کو ٹھیک بنالو، لوگ بھی تمہارے ساتھ نیکی کریں گے۔ نمازوں کو اپنے اوقات میں رکوع وسجود کے پورے آداب کے ساتھ اور خشوع وخضوع سے ادا کرنا۔

دشمن کے سفیروں کا اعزاز واکرام کرنا مگر زیادہ دیر انہیں اپنے ہاں مت ٹھہرنے دینا، کہیں وہ تمہارے راز نہ جان لیں۔ اپنے رازوں کو کبھی ظاہر نہ ہونے دینا ورنہ سارا نظام گڑبڑ ہوجائے گا۔ جب مشورہ کرنا ہو تو سچ بولنا اور مشیروں سے صورتحال کا کوئی پہلو مت چھپانا۔ پہرے کا بہت اہتمام کرنا۔

سپاہیوں کی حالت سے غافل نہ ہونا، نگران کے پوشیدہ معاملات کی ٹوہ میں بھی مت رہنا۔ اپنا اُٹھنا بیٹھنا سچے، خیر خواہ اور وفادار افراد کے ساتھ رکھنا۔ بزدلی مت دکھانا، ورنہ سپاہی بھی بزدل بن جائیں گے۔ دشمنوں کے جو لوگ اپنی عبادت گاہوں تک محدود ہوں، انہیں مت چھیڑنا۔" [1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ وصیتیں ہر رہنما کے لیے ایک منشور کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شکست اور نئی حکمت عملی:

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ شام کی سرحدوں پر کمک کا انتظار کر رہے تھے، جوں ہی انہیں اسلامی افواج کی روانگی کی اطلاع ملی، انہوں نے شام کی سرحدوں میں پیش قدمی شروع کردی مگر فلسطین میں مَرجُ الصُّفَّر کے مقام پر رومی جرنیل باہان نے ناکہ بندی کر کے اتنا سخت حملہ کیا کہ اکثر مسلمان شہید ہوگئے۔ حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ بمشکل کچھ افراد کے ساتھ زندہ سلامت بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے اور سیدھے مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں مدینہ میں ٹھہرا کر حضرت شُرَحْبِیل بن حَسَنہ، حضرت معاویہ بن ابی سفیان اور حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہم جیسے آزمودہ کار صحابہ کرام کو شام کے محاذ پر روانہ کردیا۔ ان سے پہلے کچھ امدادی فوجیں حضرت عِکرِمہ بن ابی جَہل اور حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی قیادت میں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ تازہ دم افواج شام کی سرحد عبور کر کے الگ الگ مقامات پر ٹھہر گئیں۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے جابیہ میں، حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے بلقاء میں اور حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے اردن کے میدانوں میں خیمے گاڑ دیے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس سات، سات ہزار سپاہی تھے۔ یعنی اسلامی لشکر کی مجموعی تعداد اکیس ہزار تھی۔

رومی بادشاہ ہرقل کو مسلمانوں کی اس منظم یلغار کی اطلاع ہوئی تو تیزی سے کوچ وقیام کرتا ہوا، اپنے صوبائی دارالحکومت حمص پہنچا اور یہاں سے ہر مسلمان امیر کے مقابلے میں الگ الگ فوجیں روانہ کردیں تاکہ مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر لڑنے نہ پائیں۔ ان میں سے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں جانے والا لشکر ساٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا جس کی قیادت فیقار نامی افسر کے ہاتھ میں تھی۔ اُدھر ہرقل کا سگا بھائی تذارق ۹۰ ہزار کا لشکر لے کر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی طرف چل پڑا تھا۔ مسلمان سپہ سالاروں نے یہ صورتحال دیکھ کر خط وکتابت کے ذریعے

[1] الکامل فی التاریخ: تحت ۱۳ ھجری

باہم مشورہ کیا اور متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ سب کے سب ایک جگہ جمع ہو جائیں اور دربارِ خلافت سے مزید کمک کی درخواست کریں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے انہیں حکم دیا کہ پیچھے ہٹ کر دریائے یرموک کے کنارے کسی موزوں علاقے میں کیمپ لگائیں۔ ①

اُدھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ وہ عراق کے محاذ کی قیادت مُثنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر کے جلد از جلد اپنی نصف سپاہ کے ساتھ شام کے محاذ پر پہنچ جائیں۔ ② حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مشکل ترین صحرائی راستے کو نہایت تیزی سے عبور کر کے شام پہنچے اور راستے میں آنے والے سب سے پہلے شہر "بصریٰ" کو فتح کر لیا۔ ③ اَب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور دیگر امرائے اسلام نے اَجنادَین کا رخ کیا، جہاں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں ہرقل کا بھائی نوے ہزار سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔ آخر ۲۷ جمادی الاولیٰ سن ۱۳ ہجری کو اَجنادَین کے میدان میں نہایت گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کے تمام امرائے فوج نے متفقہ طور پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو سپہ سالارِ اعلیٰ بنالیا تھا، چنانچہ حضرت عمرو بن العاص، حضرت یزید بن ابی سفیان، حضرت شُرَحْبِیْل بن حسنہ اور حضرت عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم سمیت تمام اکابر انہی کی کمان میں لڑ رہے تھے۔ ④ آخر کار رومیوں کو شکست فاش ہوئی، ہرقل کا بھائی تذارق مارا گیا اور میدانِ جنگ مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ ⑤ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے رومیوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور بڑی تیزی سے پوری فوج کو لے کر شمال کی طرف بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ یرموک تک جا پہنچے جہاں ہرقل کی بہت بڑی فوج سے مقابلہ ناگزیر تھا۔ ⑥

خلیفہ اوّل کی وفات:

مگر یرموک کی جنگ سے چند دن پہلے منگل، ۲۲ جمادی الآخرہ سنہ ۱۳ ہجری کو اُمت کے اس غم خوار نے جس کے دل کی ہر دھڑکن اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی سربلندی کے لیے وقف تھی، داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ وفات سے پہلے آپ نے کئی نصیحتیں اور وصیتیں کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہی آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کی وصیت تھی کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ اپنے محبوب سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی لحد کا سرہانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شانۂ مبارک کے برابر رکھا گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ۶۳ سال عمر پائی تھی۔ مدتِ خلافت ۲ سال تین ماہ دس دن تھی۔ ⑦

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۳ ہجری؛ تاریخ الطبری، ج: ۳، ص: ۳۹۲

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۳ ھ

③ تاریخ الطبری: ۲ ص ۴۱۷، دار المعارف

④ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۳ ھ ⑤ تاریخ ابن خلدون: ۲ ص ۵۱۷

⑥ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۳ ھ ⑦ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۳ ھ؛ تاریخ الخلفاء: ص ۶۵ تا ۶۸

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

1. حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کس طرح منعقد ہوئی؟ واقعات بیان کیجیے۔
2. حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب اور صفات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
3. مسئلہ فدک پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موقف بیان کیجیے؟
4. منکرینِ ختم نبوت کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کارروائیوں پر جامع نوٹ تحریر کیجیے؟
5. حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی پر کیوں اصرار فرمایا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟
6. ساسانی سلطنت کے خلاف جہاد کا آغاز کیسے ہوا اور اس میں حضرت مثنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا کیا کردار تھا؟
7. ساسانی سلطنت کے خلاف فوج کشی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے کارناموں کو مختصراً بیان کیجیے۔
8. حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شام پر لشکر کشی سے قبل امیر لشکر کو کیا ہدایات دیں؟

عملی کام:

- جزیرۃ العرب اور شام کا نقشہ دیکھ کر جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی کے راستے کی نشاندہی کیجیے۔
- طلبہ دو گروپوں میں تقسیم ہو کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سیرت پر سوال وجواب کا مقابلہ کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

- صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، از علامہ سعید احمد اکبر آبادی رحمہ اللہ
- سیرۃ الصدیق رضی اللہ عنہ، از حضرت مفتی محمد صابر (خلیفہ مجاز حضرت حکیم الامت تھانوی) ناشر: السعادۃ، کراچی
- الانشراح و رفع الضیق فی سیرۃ ابی بکر الصدیق از شیخ علی محمد الصلابی

(یونٹ:1.9)

خلافتِ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

۲۳ جمادی الآخرۃ، ۱۳ھ......تا......اواخر ذوالحجہ ۲۳ھ
(۵ ستمبر ۶۳۴ء تا وسطِ نومبر ۶۴۴ء)

فضائل و مناقب:

خلیفۂ دوئم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قریش کی شاخ بنو عدی سے تعلق رکھتے تھے، اگرچہ آپ رضی اللہ عنہ کے والد خطاب نے آپ کو لڑکپن میں اونٹ چرانے پر لگائے رکھا، مگر اس کے باوجود آپ نے پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا جو پورے مکہ مکرمہ میں گنے چنے لوگ ہی جانتے تھے۔ آپ نے نوجوانی میں تجارت کا پیشہ اپنایا تھا اور عرب سے باہر کے سفر بھی کیے تھے، اسی لیے آپ کو دنیا کے جغرافیائی، سیاسی، تمدنی اور معاشی واقتصادی معاملات کا اچھا خاصا علم تھا۔

قریش کے لوگ شروع سے آپ کی جرأت، جنگجوئی، معاملہ فہمی اور عقل وفراست کے معترف تھے۔ آپ انتہائی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ طبیعت میں غیرت اور جوش کا مادہ بہت تھا۔ جسم نہایت توانا اور قد دراز تھا۔ نوجوانی میں آپ اسلام کے سخت مخالف تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی قابلیت اور خوبیوں کے پیش نظر اللہ سے آپ کی ہدایت کی دعا کی تھی جو قبول ہوئی۔ اس وقت تک مسلمان کھلم کھلا نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، مگر آپ نے اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کو ساتھ لے کر علانیہ طور پر مسجد الحرام میں نماز ادا کی اور کسی کو منع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔[①]

ہجرت کے موقع پر جب قریش کے ڈر سے سب مسلمان چھپ چھپا کر مدینہ جارہے تھے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ باقاعدہ کفار کے جم غفیر کو للکار کر مکہ سے نکلے اور اعلان کیا کہ کسی میں جرأت ہے تو میرا راستہ روک کر دکھائے۔[②]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے تھے: ''عمر سے شیطان بھی ڈرتا ہے۔''[③]

اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ میں قیادت کے ایسے جوہر پیدا کیے تھے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لَمْ أَرَ عَبْقَرِيًّا مِنَ النَّاسِ يَفْرِيْ فَرِيَّهُ۔

(میں نے خوبیوں سے مالا مال ایسا کوئی انسان نہیں دیکھا جو کہ ان جیسے کارنامے کر دکھائے۔)[④]

---

① تاریخ الاسلام للذھبی: ۲۵۳/۳ الاستیعاب: ۱۱۴۵/۳ ② تاریخ الخلفاء: ص ۹۴
③ مسند احمد، ح: ۲۲۹۸۹ ④ صحیح مسلم، ح: ۲۳۴۳، ۲۳۴۷، فضائل الصحابۃ، ط دار الجیل

مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں آپ کو قاضی کی حیثیت حاصل تھی اور آپ اپنے گہرے علم، بصیرت اور فقاہت کے ساتھ نہایت عدل وانصاف کے فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ وہ واحد صحابی تھے جن کی تجاویز اور مشوروں کو کئی بار اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سراہا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جو آپ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں آیا، اسی کے مطابق وحی نازل ہوئی، ① اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کو اپنی اُمت کا ''مُحَدَّث'' قرار دیا یعنی وہ خاص اُمتی جس کے دل میں من جانب اللہ حق بات ڈالی جاتی ہے۔ ② آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کافی ہے: ''لَوْ كَانَ نَبِيٌّ بَعْدِي لَكَانَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ۔'' (اگر میرے بعد کسی کو نبی بنایا جاتا تو عمر بن الخطاب کو بنایا جاتا۔) ③

ایران کی فتوحات

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بنتے وقت ایران میں ملکہ بوران دُخت کی حکومت تھی جس نے مسلمانوں سے مقابلے کی ذمہ داری اپنے سردار رستم کو سونپ دی تھی۔ رستم نے عرب کے سرحدی علاقوں میں زمینداروں اور کاشتکاروں کو ڈرا دھمکا کر انہیں مسلمانوں کے خلاف عام بغاوت پر ابھارا اور مسلمانوں سے عراق کے بیشتر اضلاع چھین لیے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں فتح ہوئے تھے۔ ان حالات میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت مُثَنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی طلب پر حضرت ابوعبید ثقفی رحمہ اللہ کو امیر مقرر کر کے ایران کی سرحدوں پر ایک لشکر بھیجا جس نے حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی فوج کے ساتھ مل کر ''نَمارِق'' کے مقام پر ایرانیوں کو شکست دی۔ ④

جنگِ جسر:

اب رستم نے عجم کے نہایت تجربہ کار سپہ سالار بَہْمَنْ جاذَوَیْہ کو لڑائی کے لیے منتخب کر کے اسے حوصلہ افزائی کے لیے ساسانی سلطنت کا خصوصی شاہی پرچم ''دِرَفْش کاویانی'' دیا۔ شعبان سنہ ۱۳ ہجری میں یہ فوج دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر اُتری۔ جنگ سے قبل ایرانی سالار بہمن نے حضرت ابوعبید رحمہ اللہ کو دعوت دی کہ تم دریا کے پار آجاؤ یا ہمیں دریا عبور کرنے کا موقع دو۔ حضرت ابوعبید رحمہ اللہ نے مسلمانوں کی جرأت ظاہر کرنے کے لیے دریا عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر دریا پر پل باندھا گیا اور نو ہزار مسلمان پار اتر کر دشمن سے نبرد آزما ہوئے۔ اس جنگ میں ایرانی ہاتھیوں نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ عربی گھوڑوں نے پہلے ہاتھی نہیں دیکھے تھے، اس لیے وہ بار بار بدک جاتے تھے۔ آخر حضرت ابوعبید رحمہ اللہ نے ہاتھیوں پر حملہ کیا اور اسی کوشش میں شہید ہوگئے۔ آخر مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اُدھر بنوثقیف کے ایک رضا کار نے دریا پر بندھا عارضی پل توڑ دیا تاکہ مسلمان فرار کا خیال دل سے نکال دیں۔ یوں مسلمانوں کے پاس پیچھے ہٹنے کی جگہ نہ بچی اور ہزاروں مسلمان دریا میں گر کر شہید ہوئے۔ حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ

---

① تاریخ الخلفاء، ص: ۹۹ تا ۱۰۲ ② صحیح البخاری، ح: ۳۶۸۹، باب مناقب عمر بن الخطاب
③ سنن الترمذی، کتاب المناقب، فضائل عمر رضی اللہ عنہ ④ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۳ھ

خود بھی سخت زخمی ہو چکے تھے مگر انہوں نے بڑی ہمت سے ایرانیوں کو روک کر دوبارہ پُل بندھوایا۔ ان کی ثابت قدمی سے باقی مسلمانوں کو سنبھلنے اور بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔ اس جنگ میں چھ ہزار ایرانی مارے گئے۔ جبکہ نو ہزار میں سے چار ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ مسلمانوں کو اتنی بڑی شکست کا کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ ①

جنگِ بُوَیب:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جنگ جسر کا بدلہ لینے کے لیے تازہ دم رضا کاروں کو محاذ پر بھیجنا شروع کیا۔ رمضان المبارک سنہ ۱۳ ہجری میں دریائے فرات کے کنارے بُوَیب کے مقام دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ حضرت مثنّیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے دریا عبور کرنے کی غلطی نہیں کی بلکہ مخالف فوج کو پار آجانے کی دعوت دی۔ یہاں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں ایرانیوں کے ایک لاکھ سپاہی مارے گئے اور مقتول ایرانیوں کی ہڈیاں ایک مدت تک نشانِ عبرت بنی رہیں۔ ② اس شکست نے ایرانیوں کو دہلا کر رکھ دیا اور انہوں نے ملکہ بوران دخت کو معزول کر کے ایک اکیس سالہ شہزادے یزدگرد کو اپنا بادشاہ بنالیا۔ یہی یَزْدَگِرْد آخری کسریٰ ثابت ہوا۔ ③

جنگِ قادسیہ:

رستم کو ایک بار پھر مسلمانوں کے آگے بند باندھنے کی مہم سونپی گئی اور ساتھ ہی دھمکی دی گئی کہ اگر ناکام رہے تو قتل کر دیے جاؤ گے۔ رستم نے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کیں اور دور دراز کے دیہاتوں اور بستیوں کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کر دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ تشویش ناک خبریں ملیں تو نئے سرے سے افواج کی تیاری شروع کی۔ تمام رئیسوں، سرداروں، بہادروں، بہترین شاعروں اور شعلہ نوا خطیبوں کو جہاد کے لیے اُبھارا۔ ④

عراق کے سپہ سالار حضرت مثنّیٰ رضی اللہ عنہ زخموں سے اب تک شفایاب نہیں ہوئے تھے۔ اُدھر اکثر تجربہ کار مسلم قائدین شام کے محاذ پر تھے۔ ان حالات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران کے محاذ کی قیادت خود کرنے کا فیصلہ کیا مگر پھر حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مشورے پر یہ ذمہ داری حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو سونپ دی اور انہیں رخصت کرتے ہوئے یہ نصیحتیں فرمائیں:

> ”اے سعد! تمہیں یہ بات خود پسندی میں مبتلا نہ کرے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں اور اُن کے صحابی کہلاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ذریعے نہیں، نیکی کے ذریعے معاف کرتا ہے۔ اللہ کا کسی سے کوئی رشتہ ناتا نہیں، اس سے تعلق صرف اطاعت اور فرمانبرداری سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر انسان چاہے اونچے مرتبے کا ہو یا عام طبقے کا، اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں۔ ہمیشہ اُس طرزِ حیات کو سامنے رکھنا جس پر تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا۔ یہی ہماری بنیاد ہے۔

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۳ھ ② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۳ھ
③ الاخبار الطوال: ص ۱۱۹ ④ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۴ھ

تم بڑے صبر آزما حالات سے گزرنے والے ہو، پس صبر کا دامن تھامے رکھنا۔ اس سے اللہ کا تعلق پیدا ہوگا۔ یاد رکھنا، اللہ کا تعلق دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے: ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے، دوسرا گناہوں سے بچنے سے۔ اللہ کی اطاعت، آخرت کی محبت اور دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے وجود میں آتی ہے اور گناہ دنیا کی حرص اور آخرت سے بے پروائی کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔

لوگوں میں پسندیدہ بننے کو مت ٹھکرانا۔ انبیائے کرام علیہم السلام نے بھی اسی کی دعائیں کی ہیں، کیوں کہ جب اللہ کسی بندے کو اپنا محبوب بناتا ہے تو لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیتا ہے اور جب کسی بندے سے نفرت کرتا ہے تو لوگوں کے نزدیک اسے قابل نفرت بنا دیتا ہے، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنا مقام جاننے کے لیے یہ دیکھتے رہو کہ لوگ تمہارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔"

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عراق کی سرحدوں پر پہنچے تھے کہ عراقی محاذ کے سپہ سالار حضرت مُثنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع ملی۔ ①

عراق کی سرحد قادسیہ پہنچ کر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت نعمان بن مقرن، حضرت عاصم بن عمرو اور مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہم کو عرب کے شرفاء کی ایک جماعت کے ساتھ ایرانیوں کے پایہ تخت مدائن روانہ کر دیا تاکہ کسریٰ یَزْدَگِرْد کو اسلام کی دعوت دے کر اس قوم پر اتمامِ حجت کر دیا جائے۔ ان حضرات نے ایرانی دربار میں اسلام کا پیغام اور مسلمانوں کا موقف صاف صاف پہنچا دیا۔ یزدگرد نے ان کی دعوت کو نظر انداز کر کے حکم دیا کہ وفد کے سربراہ کے سر پر مٹی کا ٹوکرا رکھ کر انہیں واپس کیا جائے۔ حضرت عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر کہا: "ان میں سے سب بڑا میں ہوں۔" اب مٹی کا ٹوکرا ان کے سر پر لادا گیا، وہ تیزی سے باہر نکلے اور ٹوکرا اپنے گھوڑے پر رکھ کر اسے ایڑ لگا دی۔

اُدھر رستم کو جب مسلمان سفیروں سے یَزْدَگِرْد کے اس سلوک کا علم ہوا تو وہ بڑا جھلایا اور بولا: "خدا کی قسم! وہ ہماری زمین کی چابیاں لے گئے۔" پھر اپنے ماتحتوں سے گویا ہوا: "اگر ہم یہ مٹی راستے میں روک سکے تو سمجھو ہمارا ملک بچ گیا۔ لیکن اگر ان کے سپہ سالار تک یہ مٹی پہنچ گئی تو پھر ہمارا ملک ان کے قبضے میں جا کر رہے گا۔"

رستم نے آدمی دوڑائے کہ کسی طرح مسلمانوں کے وفد کو قادسیہ پہنچنے سے پہلے روک لیا جائے اور مٹی کا ٹوکرا واپس لے لیا جائے مگر حضرت عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ تیزی سے قادسیہ پہنچ گئے اور مٹی کا ٹوکرا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھ کر سارا ماجرا سنایا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خوش ہو کر فرمایا:

"اللہ کی قسم! اللہ نے ہمیں اس مٹی کی شکل میں سلطنتِ ایران کی چابیاں دے دی ہیں۔"

رستم کو پتا چلا تو اسے یقین ہو گیا کہ اب ایران کا آفتاب زوال پذیر ہو کر رہے گا۔ ②

---

① البدایہ والنہایہ: ۹ ص: ۶۱۳، ۶۱۴ ② البدایہ والنہایہ: ۹ ص: ۶۲۵ تا ۶۲۹، دار ھجر

یزدگرد کے حکم پر رستم ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں، اسی ہزار قبائلی جنگجوؤں اور تینتیس جنگی ہاتھیوں کے ساتھ قادسیہ پہنچا۔ یہاں ایک بار پھر مذاکرات شروع ہوئے۔ پہلے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے رستم کے دربار میں جا کر گفتگو کی۔ پھر حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ گئے۔ جب رُستم نے پوچھا: ''تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟'' تو حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی آمد کا مقصد ان فصیح و بلیغ الفاظ میں بیان فرمایا:

''اَللّٰهُ اِبْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَاد اِلٰى عِبَادَةِ اللّٰهِ وَمِنْ ضِيْقِ الدُّنْيَا اِلٰى سَعَتِهَا وَمِنْ جُوْرِ الْاَدْيَانِ اِلٰى عَدْلِ الْاِسْلَام''

(ہمیں اللہ نے بھیجا ہے تاکہ وہ جن کو چاہے، بندوں کی غلامی سے نکال کر اپنی بندگی میں لے لے۔ دنیا کی تنگی سے نکال کر خوشحالی میں اور دیگر مذاہب کے جور و ستم سے نکال کر اسلامی عدل کے دائرے میں لے آئے۔)

بہر حال مذاکرات ناکام رہے اور آخر جنگ کا نقارہ بجنے لگا۔[1]

✿✿✿

قادسیہ تا خراسان

قادسیہ کے میدان میں تین دن تک نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ پہلے دن کی جنگ کو تاریخ میں ''یوم اَرماث'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیوں کہ اس دن ایرانیوں کے ہاتھیوں کے حملوں کے باعث مسلمانوں کے خاصے افراد شہید اور زخمی ہوئے مگر آخر میں مسلمانوں نے ہاتھیوں کے ہودجوں کو تیروں سے چھلنی کر کے اس مصیبت سے نجات پائی۔

دوسرے دن کی جنگ کو ''یوم اَغواث'' کہا جاتا ہے۔ اس دن حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت ہشام رضی اللہ عنہ پانچ ہزار کے امدادی دستے کے ساتھ آن پہنچے۔ فوج کے آنے کی ترتیب یہ رکھی گئی کہ دس دس سپاہی تکبیریں بلند کرتے تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ کر لشکر اسلام میں شامل ہوتے رہے۔ دن بھر یہ سلسلہ جاری رہا اور دشمن یہ سمجھا کہ مسلمانوں کی مدد کے لیے بہت بڑی فوج آئی ہے۔ اس دن ایرانی ہاتھیوں کو میدان میں نہیں لا سکے اور مسلمان گھڑ سوار جم کر لڑے۔ اِدھر حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ اونٹوں کو سیاہ چادریں پہنا کر ایرانی گھڑ سواروں کے سامنے لے آئے جس کے باعث ایرانی گھوڑے بدکنے لگے اور ان کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ اس دن کی لڑائی میں دو ہزار کے لگ بھگ مسلمان شہید اور زخمی ہوئے۔ جبکہ ایرانیوں کا نقصان دس ہزار افراد سے کم نہیں تھا۔[2]

تیسرے دن کی لڑائی ''یوم عِماس'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس دن ایرانیوں کے ہاتھی پھر میدان میں موجود تھے اور ان کی حفاظت کے لیے پیادوں اور گھڑ سواروں کا زبردست پہرہ لگا ہوا تھا لہٰذا مسلمانوں کو حملے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی، کیوں کہ عربی گھوڑے آج بھی ہاتھیوں کے سامنے آنے سے گھبرا رہے تھے۔ ایرانیوں کا ایک سفید اور

---

① البدایہ والنہایہ: ۹ ص: ۶۲۲۔ دار ھجر ② البدایہ والنہایہ: ۹ ص: ۶۳۰ تا ۶۳۴

ایک خارش زدہ ہاتھی دونوں مل کر سب سے زیادہ تباہی مچارہے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت قعقاع بن عمرو اور حضرت عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہما کو پیغام بھیجا: ''سفید ہاتھی کو نمٹا دو۔''

امیر کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے حضرت عاصم اور حضرت قعقاع رضی اللہ عنہما لمبے نیزے سنبھال کر سفید ہاتھی کی طرف بڑھے اور دونوں نے ایک ساتھ اس کی آنکھوں کو نشانہ بنایا۔ آنکھوں میں زخم کھاتے ہی سفید ہاتھی سر پٹخنے لگا، اس پر بیٹھے سائیس اور تیر انداز نیچے گر پڑے۔ ادھر حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے ہاتھی کی سونڈ پر وار کر کے اسے کاٹ ڈالا، خارش زدہ ہاتھی کو بھی اسی طرح آنکھیں پھوڑ کر ناکارہ کیا گیا۔ یہ ہاتھی زخمی ہو کر بھاگے تو دوسرے ہاتھیوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور میدان ان سے خالی ہوگیا۔ اب مسلمان گھڑسواروں اور پیادوں کو جم کر لڑنے کا موقع میسر آ گیا۔ شام تک جنگ جاری رہی اور سورج ڈوب جانے کے بعد بھی تلواروں کی بجلیاں کوندتی رہیں۔ لوگ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر لڑے جارہے تھے۔ پوری رات کسی کو کھانے پینے، آرام یا بات چیت کا موقع نہ ملا۔ اس شب کو ''لیلۃ الھریر'' (شب آہ وفغاں) کہا جاتا ہے جس میں بہادروں کی للکار اور زخمیوں کی چیخ وپکار سے قیامت کا سماں رہا۔

صبح کو دونوں فوجیں لڑ لڑ کے بے حال ہو چکی تھیں۔ یہ آخری دن کی لڑائی ''یوم قادسیہ'' کہلاتی ہے جو دوپہر تک برابر جاری رہی۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ سمجھ گئے تھے کہ اب دشمن کی قیادت کو ٹھکانے لگا کر ہی جنگ کو اختتام تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے عمرو بن معدی کرب اور طلحہ بن خویلد جیسے نامور شمشیر زنوں کے ساتھ ایرانیوں پر حملہ بول دیا اور ان کی صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے رستم کے قریب جا پہنچے جو فوج کے آخر میں اپنے شاندار تخت پر بیٹھا تھا۔ مسلمانوں کو آتا دیکھ کر رستم دریا میں کود گیا مگر ہلال بن علقمہ نامی ایک مجاہد نے اس کے پیچھے پانی میں اُتر کر اسے ٹانگوں سے پکڑ لیا اور کنارے پر لا کر تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ پھر اس کے تخت پر چڑھ کر آواز لگائی: ''میں نے رستم کو قتل کر دیا ہے۔''

یہ سن کر ایرانیوں کے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے اور وہ میدان سے فرار ہونے لگے۔ مسلمانوں نے تعاقب کرتے ہوئے دور تک ان کی لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ غرض ایرانی لشکر کا اکثر حصہ قادسیہ میں بے نام ونشان ہوگیا۔ مسلمانوں کے مجموعی طور پر ساڑھے چھ ہزار افراد نے جام شہادت نوش کیا۔ [1] جنگ قادسیہ ایک قول کے مطابق سنہ ۱۴ ہجری میں لڑی گئی مگر حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے مطابق یہ شوال ۱۵ھ میں لڑی گئی تھی اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ [2]

بابل، بَھُرَ شیر اور مدائن کی فتح:

ذوالحجہ سنہ ۱۵ ہجری میں مسلمانوں نے پیش قدمی کر کے تاریخی شہر ''بابل'' کو فتح کر لیا۔ ایرانی پایہ تخت مدائن اور مسلمانوں کے درمیان اب صرف ایک قلعہ باقی رہ گیا تھا جہاں کسریٰ کا پلا ہوا ایک شیر رکھا گیا تھا، اسی مناسبت سے اس مقام کو ''بَھُرَ شیر'' کہا جاتا تھا۔ یہاں جنگ شروع ہوئی تو ایرانیوں نے یہ شیر مسلمانوں پر چھوڑ دیا۔ ادھر سے حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور تلوار کا ایسا وار کیا کہ شیر نے وہیں دم توڑ دیا۔ اس بہادری پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۵۲۹ تا ۵۶۵، دار المعارف ② العبر للذھبی: سنۃ ۱۵ھ

کے بعد صفر سنہ ۱۶ ہجری نے حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ کی پیشانی چوم لی۔ ''بہرَ شیر'' کا قلعہ کچھ مدت کے محاصرے میں فتح ہوگیا اور مسلمان پایۂ تخت مدائن کی طرف بڑھے مگر راستے میں دریائے دجلہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایرانیوں نے تمام پل توڑ دیے تھے اور کشتیاں غائب کردی تھیں مگر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں سے کہا:

''بھائیو! دشمن نے ہر طرف سے بھاگ کر دریا کے پار پناہ لی ہے۔ مگر یہ ایک قطرہ تمہیں نہیں روک سکتا! میری رائے تو یہ ہے کہ دشمن کو سنبھلنے سے پہلے گھیر لو۔ پس اب میں تو گھوڑا دریا میں ڈالنے کا عزم کرچکا ہوں۔''

سب نے کہا: ''ہم آپ کے پیچھے ہیں، آپ قدم بڑھائیے۔''①

اسلامی لشکر دریائے دجلہ سے گزر گیا:

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ دُعا پڑھتے ہوئے گھوڑا دریا میں ڈالا۔ وہ اور تمام مسلمان اس وقت یہ دُعا پڑھ رہے تھے:

'' نَسْتَعِيْنُ بِاللّٰهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ وَلِيَّهٗ وَلَيُظْهِرَنَّ دِيْنَهٗ وَلَيَهْزِمَنَّ عَدُوَّهٗ، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔ ''

اب تمام مسلمان دریا میں اُتر گئے اور آپس میں یوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے جیسے شاہراہ پر جارہے ہوں۔ مسلمانوں کو اس طرح بے خوف وخطر پانی میں چلتا دیکھ کر ایرانیوں پر اتنا خوف طاری ہوا کہ ان کی بڑی تعداد ''دیواں آمدند، دیواں آمدند'' (جن بھوت آگئے) کہتے ہوئے بھاگ کھڑی ہوئی۔②

ایک مجاہد کی کرامت:

پوری اسلامی فوج جوں کی توں پار ہوگئی، البتہ حضرت مالک بن عامر رضی اللہ عنہ کا پیالہ دریا میں گرگیا تھا، کسی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا: ''تقدیر کی بات تھی کہ وہ ضائع ہوگیا۔'' وہ بولے: ''بخدا مجھے تو اس پیالے کی سخت ضرورت تھی۔'' پھر دعا کی: ''خدایا! پوری فوج میں سے صرف میری چیز ضائع ہو، مجھے ایسا محروم نہ بنا۔'' جب سب دریا کے پار اترے تو اچانک پانی کی ایک لہر نے وہ پیالہ کنارے پر لا ڈالا، کسی سپاہی نے پہچان کر عامر بن مالک رضی اللہ عنہ کو پہنچادیا۔③

مالِ غنیمت:

یَزْدَگِرْد مسلمانوں کے دریا پار کرنے کی اطلاع ملتے ہی خود بھی پایۂ تخت سے بھاگ کھڑا ہوا، اگرچہ وہ مال ودولت کا خاصا ذخیرہ ساتھ لے گیا تھا مگر بے پناہ ساز وسامان پیچھے رہ گیا تھا جو مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ اس کا پانچواں حصہ شرعی ضابطے کے مطابق بیت المال میں داخل کرنے کے لیے مدینہ منورہ بھیج دیا گیا۔

اس خزانے میں کسریٰ کا تاج، لباس اور کنگن بھی تھے جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے سفر کے دوران اپنے تعاقب میں آنے والے سراقہ بن مالک کو خوشخبری دیتے ہوئے فرمایا تھا:

---

① الکامل فی التاریخ: ۲، ص ۱۳۹

② تاریخ الطبری: ۳، ص ۱۴ ③ تاریخ الطبری: ۳، ص ۱۲

''تمہاری کیا کیفیت ہوگی جب کسریٰ کے کنگن، کمر بند اور تاج تمہیں پہنائے جائیں گے۔''

فتح مکہ کے بعد سراقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اب مدائن کی فتح کے بعد ایرانی خزانہ مدینہ پہنچا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سراقہ رضی اللہ عنہ کو بلوا کر مجمع عام میں انہیں وہ کنگن، تاج اور کمر بند پہنائے۔ حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور کہا: ''سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے یہ چیزیں خدائی کا دعوے کرنے والے کسریٰ سے چھین کر ایک عرب دیہاتی کو پہنا دیں۔ ①

جنگ جلولاء:

مدائن سے بھاگنے کے بعد یَزْدَ گِرْد حلوان میں ڈیرے ڈال کر ایک بار پھر افواج جمع کر رہا تھا۔ ادھر سے حضرت ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بارہ ہزار کا لشکر پیش قدمی کرتے ہوئے جلولاء پہنچا جہاں ایرانی سپہ سالار مہران مورچہ زن تھا جسے یزدگرد کی طرف سے مسلسل کمک پہنچ رہی تھی۔ مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ اسی دن تک ایرانی قلعہ بند ہوکر لڑتے رہے۔ آخر ایک دن وہ شہر سے باہر نکل کر صف آراء ہوئے، مسلمانوں کو زخمی کرنے کے لیے انہوں نے میدان کے خاص حصوں میں کانٹے دار گولے یعنی ''گوکرو'' بچھا دیے تھے۔ اپنے دفاع کے لیے انہوں نے خندقیں بھی کھودی ہوئی تھیں، بہرحال جب جنگ انتہا کو پہنچی تو اچانک سیاہ آندھی چل پڑی جس سے ایرانی حواس باختہ ہوکر شہر کی طرف پسپا ہونے لگے مگر اس بھگدڑ میں ہزاروں خندق میں گر کر مرے اور ''گوکرو'' ان کے لیے الگ مصیبت بن گئے، یوں ایک لاکھ کے لگ بھگ ایرانی ہلاک ہوئے۔ ان کا سالار مہران فرار ہوتے ہوئے مارا گیا اور یہ شہر مسلمانوں کے قبضے آگیا۔ یہ ذوالقعدہ سنہ ۱۶ ھ کا واقعہ ہے۔ یزدگرد اس شکست کی خبر سنتے ہی حلوان سے بھی نکل بھاگا اور مسلمانوں نے حلوان، موصل اور تکریت پر بھی فتح کے پرچم لہرا دیے، اس طرح پورا عراق اسلام کے سائے تلے آگیا۔ مسلم فاتحین نے مقامی عوام کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، سب کے لیے عام معافی کا اعلان کردیا، ایرانی رئیسوں اور زمینداروں نے کسریٰ کے جابرانہ نظام سے نجات پانے پر چین کا سانس لیا اور خود آکر اطاعت کا اظہار اور جزیہ دینے کا وعدہ کیا۔ یوں ہر طرف امن و امان قائم ہوگیا۔ اگلے سال اسلامی فوجوں نے شمال کی طرف بڑھتے ہوئے الجزیرہ، نَصِیْبِیْن، الرُّہا اور آرمینیا تک یلغار کی۔ حضرت عِیاض بن غَنْم، حضرت ولید بن عُقبہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہم ان مہمات میں پیش پیش تھے۔ ②

جنگِ نَہاوَند (۲۱ھ):

اس دوران یزدگرد خراسانی قبائل میں روپوش رہا اور مجوسیت کے نام پر لوگوں کو مشتعل کرتا رہا۔ آخر اس نے ڈیڑھ لاکھ کا لشکر تیار کرلیا جو ایرانی سردار مردان شاہ کی کمان میں نَہاوَند آکر خیمہ زن ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قیادت کے لیے حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا جو کوفہ میں تھے۔ وہ تیس ہزار مجاہدین کو لے کر نکلے۔ ایرانیوں نے اس

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۱۶ تا ۲۳؛ اسد الغابہ: ترجمۃ سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ ② تاریخ الطبری: ۳/ص ۲۳ تا ۵۰

بار جنگ کے لیے بڑی عجیب منصوبہ بندی کی تھی۔ وہ خندقیں کھود کر ان میں اُتر گئے تھے اور تیر و پیکان سنبھالے بیٹھے تھے۔ خندقوں کے سامنے انہوں نے دور دور تک ''گھوکرو'' (کانٹے دار گولے) بچھا دیے تھے جن کی وجہ سے مسلمانوں کا آگے بڑھ کر حملہ کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ایرانی جب چاہتے اپنی خندقوں سے سر اُبھار کر مسلمانوں پر تیروں کی بارش کرتے اور پھر خندقوں میں چھپ کر مسلمانوں کی جوابی تیر اندازی سے محفوظ ہو جاتے۔

کئی دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مسلمان انہیں کسی بھی طرح ان کی محفوظ پناہ گاہوں سے باہر نکالنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ آخر حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ گھڑ سواروں کو لے کر ایرانیوں کی خندقوں کے جس قدر قریب پہنچنا ممکن تھا، وہاں تک گئے اور ان پر زبردست تیر اندازی کی، جواب میں ایرانیوں نے تیر چلائے تو یہ یکدم میدان سے بھاگ نکلے۔ ایرانی یہ سمجھے کہ مسلمان شکست کھا گئے ہیں اور جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔ وہ خندقوں سے نکل کر ان کے پیچھے دوڑے۔ مردان شاہ نے سپاہیوں کو مزید جوش دلانے کے لیے ان کے پیچھے پورے میدان میں کانٹے دار گولے پھیلا دیے تاکہ ایرانی دشمن کو نمٹا کر ہی دم لیں اور فرار ہو کر خندقوں میں چھپنے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کے گھڑ سوار دور تک پسپا ہوتے چلے گئے اور ایرانی تیر برساتے ہوئے ان کا تعاقب کرتے رہے۔ میدان کے دوسرے سرے پر حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ باقی فوج کے ساتھ موجود تھے۔ جب ایرانی اپنی خندقوں سے خاصی دور نکل آئے تو مسلمانوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ شام تک فریقین جان توڑ لڑائی لڑتے رہے۔ رات کے وقت ایرانیوں کی ہمت جواب دے گئی اور وہ میدان سے پسپا ہونے لگے مگر خندقوں میں جانے کے راستے پر ''گھوکرو'' بچھے ہوئے تھے چنانچہ ایرانی اُن سے زخمی ہو کر گرتے رہے اور مسلمان انہیں ٹھکانے لگاتے رہے۔ یوں لگ بھگ ایک لاکھ ایرانی مارے گئے۔ حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کا دم لبوں پر تھا کہ انہیں فتح کی بشارت دی گئی۔ بولے: ''اللہ کا شکر و احسان ہے، حضرت عمر کو یہ اطلاع دے دینا۔'' یہ کہہ کر شہید ہو گئے۔

نہاوند میں شکست کے بعد آل ساسان کی طاقت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو گئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس معرکے کی اتنی فکر تھی کہ دن رات بے تابانہ دعائیں کر رہے تھے۔ جب انہیں فتح کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر دی گئی تو زار و قطار رو دیے۔ پھر قاصد سے پوچھا: ''اور کون کون حضرات شہید ہوئے ہیں؟'' قاصد نے چند مشہور افراد کے نام بتائے اور کہا: ''ان کے علاوہ بہت سے لوگ شہید ہوئے ہیں جن سے آپ واقف نہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہہ پڑے اور فرمایا: ''اگر عمر اُن لوگوں کو نہیں جانتا تو کیا ہوا، اللہ تو انہیں جانتا ہے، جس نے انہیں شہادت کا اعزاز بخشا ہے، پس عمر کے جاننے سے انہیں کیا مطلب۔''[1]

ایران اور خراسان میں عمومی فوج کشی:

جنگِ نہاوند کے اسباب پر غور کرنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ جب تک آلِ ساسان اور اُن

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۰ /ص ۱۷ ا تا ۱۲۴، العبر للذھبی: سنۃ ۲۱ھ

کے حکمران یَزْدَ گِرْد کو پورے فارس وخراسان سے بے دخل نہیں کر دیا جاتا تب تک ایرانیوں کی بغاوتیں ختم ہونے میں نہیں آئیں گی، اسی لیے سنہ ۲۱ ہجری میں آپ نے مشرق کی طرف عمومی یلغار کی منصوبہ بندی کی اور کئی افواج ترتیب دے کر انہیں مختلف خطوط پر روانہ کیا۔ اس ترتیب کے مطابق حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ نے خراسان، حضرت ساریہ بن زُنیم رحمہ اللہ نے کرمان، حضرت عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے سیستان (جنوبی افغانستان)، حضرت حکم بن عمیر تغلبی رحمہ اللہ نے مکران وبلوچستان کا رخ کیا، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت عقبہ بن فرقد رضی اللہ عنہما نے آذربائی جان کی طرف پیش قدمی کی اور مختصر مدت میں یہ تمام علاقے فتح کر لیے۔ ان کے علاوہ حضرت سوید بن مقرن رضی اللہ عنہ نے طبرستان اور حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ نے خلیج فارس کے ساحلی علاقوں پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔

یَزْدَ گِرْد سے آخری معرکہ خراسان میں مرو کے نزدیک دریائے مرغاب کے کنارے ہوا، مسلمانوں کے امیر حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ تھے، یہاں یزْد گِرْد کی مدد کے لیے خاقانِ چین خود فوج لے کر آیا تھا، مگر یَزْدَ گِرْد میدان میں موجود نہیں تھا۔ خاقان چین عام جنگ سے انفرادی مقابلوں میں مسلمانوں کی بہادری کا مظاہرہ دیکھ کر بددل ہو گیا اور فیصلہ کن لڑائی سے پہلے ہی میدان سے نکل بھاگا، تب یزْد گِرْد بھی انتہائی مایوسی کی حالت میں ساسانیوں کے خزانے کو لاد کر خاقان کی پناہ میں جانے کے لیے خراسان سے ترکستان روانہ ہوا، مگر راستے میں اس کے درباریوں نے یہ کہہ کر سارا خزانہ اس سے چھین لیا کہ ہم ایرانیوں کی دولت، ترکستان نہیں لے جانے دیں گے۔

یَزْدَ گِرْد بمشکل جان بچا کر خاقانِ چین کے دارالحکومت فرغانہ پہنچا اور ایک پناہ گزین کی طرح برسوں وہیں روپوش رہا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس کے انجام کی خبر ملی تو ایک تاریخی خطبہ دیا جس میں فرمایا:

"یاد رکھو! مجوسیوں کی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب وہ اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زمین، دولت اور شہروں کا مالک تمہیں بنا دیا ہے تا کہ وہ عمل میں تمہیں آزمائے، لیکن اگر تم نے اپنا کردار بدل دیا تو اللہ حکومت تم سے چھین کر دوسروں کو عطا کر دے گا۔"[1]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی اور اس کی اصل وجہ:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے آخری ایام میں شام کے محاذ پر لڑنے والے اسلامی جرنیلوں نے عارضی طور پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اپنا سپہ سالار بنا لیا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسندِ خلافت پر بیٹھنے کے بعد شام کی تمام اسلامی افواج کا مستقل سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو مقرر کر دیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے دربارِ خلافت کے حکم پر بلا تکلف حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی ماتحتی قبول کر لی تاہم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اُٹھایا اور انہیں اکثر معرکوں میں نمایاں عہدہ دیا۔ ان معرکوں کا ذکر ذرا آگے "شام کی فتوحات"

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۲۱ھ، ۲۲ھ
② تاریخ الطبری: ۳/ص ۲۳۴

کے عنوان کے تحت آرہا ہے۔ ان معرکوں میں سے بیت المقدس کی فتح کے کچھ عرصے بعد سنہ ۱۷ہجری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سالاری کے عہدے سے معزول کر دیا۔

بعض مؤرخین کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے شروع سے مخالف تھے یا انہیں ان کی عسکری قابلیت میں شبہ تھا۔ یہ باتیں سراسر غلط ہیں۔ ان کی عسکری قابلیت میں شبہ بھلا کیسے ہوسکتا تھا جبکہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ''سَیْفٌ مِنْ سُیُوْفِ اللہ'' (اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

انہیں معزول کرنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ جس بھی جنگ میں شرکت کرتے ہیں مسلمان فتح یاب ہوتے ہیں، چنانچہ عام ذہن یہ بن گیا تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کو شکست نہیں ہوسکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خطرہ محسوس ہوا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی یہ شہرت کہیں شخصیت پرستی اور بعد میں بدعقیدگی کا سبب نہ بن جائے تو آپ نے اُمت کو اس خیال سے بچانے کے لیے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا۔

بعض مؤرخین نے معزولی کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایک شاعر کا قصیدہ سن کر اسے انعام میں ایک ہزار درہم (دو ہزار سات سو بیس ڈالر) دے ڈالے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو ناراض ہو کر کہا:

''اگر انہوں نے بیت المال سے دیے ہیں تو بدعنوانی ہے، اپنی جیب سے دیے ہیں تو فضول خرچی ہے۔''①

مگر اسی روایت میں آگے یہ وضاحت بھی ہے کہ تحقیق سے معاملہ واضح ہوگیا تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہ رقم اپنی جیب سے دی ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی گناہ نہ تھا، ہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی محتاط طبیعت کے باعث اسے پسند نہیں فرمایا تھا۔ نیز حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تلافی کے لیے بیت المال میں اتنی ہی رقم جمع کرائی جس سے حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے۔ سب سے آخری بات جو تمام شکوک کا ازالہ کرتی ہے وہ معزولی کے فیصلے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ ہیں:

''اے خالد! تم میرے نزدیک بڑے معزز ہو۔ تم میرے پیارے دوست ہو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں شبہات سے بچانے کے لیے یہ اعلان بھی کرایا:

''میں نے خالد کو کسی ناراضگی یا بدعنوانی کی وجہ سے معزول نہیں کیا بلکہ لوگ ان کے گرویدہ اور ان پر فریفتہ ہو رہے تھے۔ مجھے خوف محسوس ہوا کہ لوگ انہی پر بھروسہ کرنے لگیں گے، پس میں نے چاہا کہ لوگ جان لیں کہ سب کچھ کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے اور میں نے یہ چاہا کہ لوگ کسی فتنے میں مبتلا ہونے سے بچ جائیں۔''②

❁❁❁

① الکامل فی التاریخ: ۳۵۹/۲، ۳۶۰

② بحوالہ بالا

شام کی فتوحات

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہدایات کے مطابق اسلامی لشکر کو لے کر آگے بڑھے اور شام کے اہم ترین شہر دمشق تک جا پہنچے۔ ایک طرف سے خود محاصرہ کیا، دوسری سمت کی ناکہ بندی پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور تیسری طرف حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔

ایک دن شہر والے کوئی جشن منانے میں منہمک تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ موقع پا کر چند جانثاروں کے ساتھ کمند کے ذریعے فصیل پر چڑھ گئے اور فصیل کا دروازہ کھول کر فوج کو اندر داخل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ شہر والوں نے یہ صورتحال دیکھی تو فوراً دوسری سمت کا دروازہ کھول کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے ملے اور صلح کی چند شرائط پیش کردیں، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی کارروائی سے لاعلم تھے، اسی لیے شرائط قبول کرلیں اور پرامن طور پر شہر میں داخل ہوگئے، چوک میں پہنچے تو دیکھا کہ دوسری طرف سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ مزاحمت کرنے والے رومیوں کو مارتے کاٹتے چلے آرہے ہیں۔ تب یہ ماجرا کھلا کہ شہر کی ایک سمت بزورِ شمشیر فتح ہوئی ہے اور دوسری مصالحت کے ساتھ۔ صحابہ کرام میں سے بعض نے کہا کہ پہلے حضرت خالد قوت کے بل بوتے پر لڑ بھڑ کر شہر میں داخل ہوئے ہیں، لہٰذا ہم شہر والوں کی کسی شرط کے پابند نہیں۔ دوسرے حضرات کا کہنا تھا کہ امیر ابوعبیدہ ہیں جنہوں نے شرائط منظور کر کے شہر میں قدم رکھا ہے، اس لیے مصالحتی شرائط ملحوظ رہیں گی۔ آخر طے یہ ہوا کہ آدھے شہر کا انتظام حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے طے کردہ شرائط کے مطابق ہوگا اور آدھے کو بزورِ شمشیر فتح کیا گیا تصور کیا جائے گا۔[2]

فِحل کی جنگ:

اس کے بعد فِحل کے میدان میں رومیوں سے ایک بڑی جنگ ہوئی۔ اس میں فتح کے بعد اردن کے تمام علاقے آسانی سے فتح ہوگئے۔ صلح کی شرائط میں یہ طے کردیا گیا کہ مقامی لوگوں کی جان ومال، گھر، جائیدادیں اور عبادت گاہیں سب محفوظ رہیں گی، صرف مساجد تعمیر کرنے کے لیے مسلمان ضرورت کے مطابق زمین لیا کریں گے۔[3]

حمص کی فتح:

شام میں اب صرف تین بڑے شہر رہ گئے تھے: سب سے پہلے حمص پڑتا تھا جو قیصر کا ایشیائی دارالسلطنت تھا، پھر بیت المقدس تھا جو مذہبی لحاظ سے سب سے باعظمت شہر تھا، شمال میں انطاکیہ تھا جہاں قیصر ان دنوں قیام پذیر تھا۔ اسلامی لشکر حمص کے سامنے جا رکا۔ یہ سخت سردیوں کے دن تھے مگر مسلمان محاصرے سے نہ اکتائے۔ محاصرہ بہت طویل ہوگیا تو ایک دن صحابہ کرام نے جمع ہوکر نعرۂ تکبیر بلند کیا، اللہ اکبر کی صدا سے فضا گونج اٹھی، ساتھ ہی حمص کی بلند

① تاریخ الطبری: ۳ص ۳۳۴
② البدایہ والنہایہ: ۹ص: ۵۷۸ تا ۵۸۶، دار ھجر
③ فتوح الشام للازدی: ص ۱۲۲، ۱۲۳

وبالا عمارتوں میں ایسا زلزلہ آیا کہ کئی دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں، شہر والے یہ دیکھ کر کانپ گئے اور فوراً شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ ①

جنگِ یرموک:

فِحل، دِمشق اور حمص سے شکست کھا کر بھاگنے والے رومی افسران قیصرِ رُوم ہرقل کے پاس انطاکیہ میں جمع ہو گئے تھے۔ اس نے حکم دے دیا تھا کہ قُسطنطینیہ، ایشیائے کوچک، الجزیرہ اور آرمینیا سمیت تمام علاقوں سے ہر بالغ شخص کو بھرتی کر کے تازہ افواج فراہم کی جائیں۔ جلد ہی بہت بڑے پیمانے پر رومی افواج انطاکیہ پہنچنے لگیں۔ رومیوں کی تعداد چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ ②

رومیوں کے اتنے بڑے اجتماع کی خبر سن کر اکابر صحابہ کرام سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ مسلمان خود حمص خالی کر کے دِمشق چلے جائیں۔ فیصلہ ہوتے ہی حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے سرکاری خزانے کے افسر حضرت حبیب بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ کو طلب کر کے حکم دیا کہ نصرانیوں سے جزیے کی مد میں لیا گیا ایک ایک درہم واپس کر دیا جائے، کیوں کہ یہ رقم اُن کی حفاظت کے بدلے لی جاتی ہے اور اب ہم ان کی حفاظت کی ذمہ داری ترک کر کے یہاں سے کوچ کر رہے ہیں۔ یہی حکم ان دیگر بستیوں اور شہروں میں بھیج دیا گیا، جنہیں فتح کرنے کے بعد اب مسلمان چھوڑنے پر مجبور تھے۔ شہر والوں کو یہ لاکھوں درہم واپس کرنے کے بعد مسلمانوں نے رختِ سفر باندھا۔

حالت یہ تھی کہ شہر کے لوگ غیر مسلم ہونے کے باوجود اس حسنِ سلوک اور دیانت داری سے متاثر ہو کر اشک بار تھے، نصرانی دعا کر رہے تھے: ''خداوند تم کو واپس لائے۔'' اور یہودی کہہ رہے تھے: ''جب تک ہم زندہ ہیں قیصر کو اس شہر میں قبضہ نہیں کرنے دیں گے۔''

حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے اُردن کی طرف کوچ کیا، جہاں یرموک کا میدان تھا۔ یہاں میدانی علاقہ تھا اور عرب کی سرحد قریب تھی، شکست کی صورت میں مسلمان پیچھے ہٹ کر محفوظ علاقے میں داخل ہو سکتے تھے۔ ③

مسلمانوں کی تعداد تیس، پینتیس ہزار سے زیادہ نہ تھی مگر ان میں ایک ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی تھے جن میں سے ایک سو بدری حضرات تھے۔ عرب کے قبیلہ ازد کے دس ہزار سے زائد بہادر مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھے، یمن سے قبیلہ حمیر کے سرفروش بھی بڑی تعداد میں آئے۔ ④

ابھی باقاعدہ جنگ شروع نہیں ہوئی تھی کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ چنیدہ گھڑسواروں کے دستے کے ساتھ یلغار کرتے ہوئے رومیوں کی خیمہ گاہ تک جا پہنچے، رومی جو یہ تصور کیے بیٹھے تھے کہ مسلمان ان کی ہیبت سے مرعوب ہو کر شاید خود پسپا ہو جائیں گے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو آتا دیکھ کر ششدر رہ گئے اور فوری طور پر آمادۂ پیکار ہوئے۔

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۹ص ۲۳۹، دار ہجر ② فتوح الشام للازدی: ص ۱۹۳
③ فتوح الشام للازدی: ص ۱۳۶ تا ۱۳۸ ④ تاریخ الطبری: ۳ص ۳۹۷، فتوح الشام للازدی: ص ۱۶۵ تا ۱۶۸، ۱۹۵

معرکہ انفرادی مقابلوں سے شروع ہوا۔ رومیوں کا ایک دیو پیکر گھڑسوار نکلا۔ ادھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اشارے پر حضرت قیس بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ماتحت افسر تھے، تلوار سونت کر سامنے آئے اور حریف کے سنبھلنے سے پہلے ہی ایسا وار کیا کہ تلوار اس کے سر کو خود سمیت کاٹتی ہوئی گردن تک اُتر گئی۔

اس کے بعد عام لڑائی شروع ہوئی، مگر ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔①

لڑائی کے دوسرے مرحلے سے ذرا پہلے ایک جوان امیر عساکر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور گویا ہوا: ''میں جان دینے کا تہیہ کر چکا ہوں، اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں تو فرمائیے۔'' حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بولے: ''ہاں! آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا اسلام عرض کرنا اور کہنا یا رسول اللہ! اللہ نے (آپ کی زبانی) ہم سے جو وعدے کیے تھے وہ سب پورے ہوئے۔'' یہی جوان جنگ کی آگ میں سب سے پہلے کودا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔②

آخر رومیوں کا باقاعدہ حملہ شروع ہوا۔ مسلمانوں کے دائیں بازو میں قبیلہ ازد بڑی پامردی سے ڈٹا رہا۔ البتہ دائیں بازو کے دیگر دستے جم نہ سکے اور بکھر گئے۔ رومی یلغار کرتے ہوئے مسلمانوں کو اُن کی خیمہ گاہوں تک دھکیل کر لے گئے۔ یہاں مسلم خواتین نے اپنے مردوں کو پسپا ہوتے دیکھا تو خیموں کے بانس اُٹھا کر دوڑیں اور آواز لگائی کہ اگر پیچھے ہٹے تو تمہارے سر توڑ دیں گی۔ مسلمانوں کو غیرت آئی اور وہ واپس لوٹ کر لڑنے لگے۔

اُدھر مسلمانوں کا بایاں بازو بھی رومیوں کا غیر معمولی دباؤ برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے پیچھے ہٹ کر اپنی خیمہ گاہ تک آ گیا۔ یہاں بھی مسلمان خواتین نے حیرت انگیز دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے رومیوں کے مقابلے میں اپنی فوج کے قدم جمائے۔ مسلم افسران میں سے حضرت یزید بن ابی سفیان، حضرت عمرو بن العاص اور حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام اس طرف تھے اور پہاڑ کی طرح جم کر لڑ رہے تھے۔ حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے چاروں طرف رومیوں کا مجمع تھا اور وہ یہ آیات پڑھتے ہوئے چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے تھے:

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

''بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی جانوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔''③

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ بلند آواز سے پکار رہے تھے: ''مسلمانو! حور عین کے لیے بن سنور کر آگے بڑھو۔ اپنے رب کی جنت کی طرف لپکو۔'' حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بھی مجاہدین کے حوصلے بلند کر رہے تھے۔④

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ رومیوں پر اس شدت سے حملہ آور تھے کہ دوبار ان کی صفوں کو چیرتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نکل گئے۔ دوسری بار واپسی میں ان کے کندھے پر دو بہت گہرے زخم بھی آئے۔⑤

① فتوح الشام للازدی: ص ۱۷۰ تا ۱۷۲ ② البدایہ والنہایہ: ۹ ص: ۵۶۱، دار هجر
③ سورۃ التوبۃ: آیت ۱۱۱ ④ فتوح الشام للازدی: ص ۱۰۰ تا ۱۱۷
⑤ صحیح البخاری، ح: ۳۷۲۱

لڑائی میں گرم جوشی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو سرو تن کا ہوش نہیں تھا۔ حُباس بن قیس قشیری اس قدر جوش وخروش سے لڑ رہے تھے کہ دشمن کی ضرب سے اُن کا پاؤں کٹ کر علیحدہ ہوگیا، مگر انہیں احساس تک نہ ہوا۔ کچھ دیر بعد تکلیف محسوس کی تو اپنا پاؤں ڈھونڈنے لگے۔ ①

اس دوران حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے گھڑسواروں کو لے کر دھاوا بولا اور دشمن کے دس ہزار سپاہیوں کو روند ڈالا۔ دن ڈھلنے تک لڑائی عروج پر تھی اور اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ کون جیتے گا کون ہارے گا۔ مگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سمجھ چکے تھے کہ رومیوں کا دم خم ٹوٹنے والا ہے۔ انہوں نے اپنے گھڑسواروں کو حوصلہ دلا کر کہا: ''مسلمانو! رومیوں میں جتنی طاقت تھی وہ دکھا چکے، پس اب ایک زوردار حملہ کرو، اللہ کی قسم! ہمیں ابھی فتح نصیب ہوجائے گی۔''

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے ایک ہزار بہترین شہ سواروں کو رکاب میں لیا اور رومیوں کی گھڑسوار فوج پر جو ایک لاکھ کی تعداد میں تھی، ایسا ہولناک حملہ کیا کہ ان کی صفیں الٹ پلٹ ہوگئیں۔ اِدھر سے حضرت قیس بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ جو تازہ دم سپاہیوں کے ساتھ بائیں بازو کی پشت پر کھڑے تھے، یکا یک نکلے اور رومیوں کی صفیں چیر کر رکھ دیں۔

اسلامی لشکر کے قلب سے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے بلہ بولا اور رومیوں کے قلب کو میدان کے آخری سرے تک دھکیلتے چلے گئے۔ رومیوں کے قدم اب ایسے اکھڑے کہ پھر جم نہ سکے، مسلمانوں نے تعاقب کرتے ہوئے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ شام تک یرموک کے میدان میں بازنطینی رومی سلطنت کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا، ایک لاکھ سے زائد رومی قتل ہوئے تھے۔ مسلمان شہداء کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی جن میں حضرت ضرار بن ازور، حضرت ہشام بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے گراں مایہ افراد بھی شامل تھے۔

ہرقل اس وقت انطاکیہ میں اپنی قوم کے بارے میں تقدیر کے فیصلے کا منتظر تھا، جونہی اسے شکست فاش کی خبر ملی۔ اس نے ایشیا کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ شام کی سرحد عبور کرتے وقت اس نے مُڑ کر بے ساختہ کہا: ''الوداع اے شام۔ تجھے آخری سلام......'' اور گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ وہ قُسطَنطِینیَہ چلا گیا اور باقی زندگی وہیں گزاری۔ ②

❁❁❁

فتح بیت المقدس

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ شام میں حِمص، دِمَشق، حلب، اَنطاکیہ اور قِنَّسرِین جیسے بڑے بڑے شہر فتح ہو چکے تھے۔ تاہم بیت المقدس کے محل وقوع اور اس کی مذہبی وتاریخی اہمیت کے پیش نظر اس کی فتح کو مؤخر کیا جاتا رہا تا کہ یہاں کشت وخون کے بغیر قبضہ کیا جاسکے۔

---

① فتوح البلدان: ص ۱۳۸

② فتوح الشام للازدی: ص ۲۰۶ تا ۲۱۳؛ البدایۃ والنہایۃ: ۹ ص ۵۳۸ تا ۵۵۳

آخر سنہ ۱۶ ہجری میں اس مقدس شہر کا محاصرہ کرلیا گیا، مقامی نصرانیوں نے مقابلہ بے سود سمجھتے ہوئے صلح کی شرائط پیش کردیں، ساتھ ہی یہ خواہش ظاہر کی کہ مسلمانوں کے سربراہ خود تشریف لا کر یہاں صلح کے معاہدے کی منظوری دیں تاکہ بعد میں مختلف اقوام کے درمیان کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے۔

مسلمان خود بھی اس بابرکت شہر میں خون ریزی نہیں چاہتے تھے، اس لیے فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف قاصد دوڑایا۔ رجب سنہ ۱۶ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر مدینہ طیبہ سے اس طرح بیت المقدس روانہ ہوئے کہ تنہا ایک اُونٹ پر سوار تھے۔ آرام کے وقت آپ اونٹ کی زین اتار کر اسے تکیہ بنا لیتے، اپنی اونی چادر بچھا کر اس پر سو جاتے۔ شام کی سرحدوں میں داخل ہونے تک آپ کی قمیص میلی ہو چکی تھی اور پھٹ بھی گئی تھی۔ ①

جب شام پہنچے تو مسلمان سپاہی آپ کے منتظر تھے، آپ صرف ایک چادر لپیٹے، عمامہ اور موزے پہنے اپنے اونٹ کی لگام تھامے تھے۔ کسی نے کہا: ''امیر المؤمنین! یہاں شام کی افواج اور نصرانی پادری آپ کے استقبال کے لیے کھڑے ہیں اور آپ کی یہ حالت؟'' فرمایا: ''ہم وہ قوم ہیں جسے اللہ نے عزت اسلام کی وجہ سے دی، پس ہم عزت کسی اور چیز میں تلاش نہیں کریں گے۔'' ②

بیت المقدس کے نصرانی عمائد بات چیت کے لیے آئے، چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لباس اور سواری بہت معمولی تھے، اس لیے سالارانِ فوج نے چاہا کہ آپ موقع کے مطابق گھوڑے پر سوار ہوں اور عمدہ پوشاک پہن کر ان لوگوں کے سامنے جائیں مگر آپ رضی اللہ عنہ نے سختی سے منع کر دیا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی بدولت جو عزت دی ہے ہمارے لیے وہی کافی ہے۔'' آخر صلح کے امور طے پا گئے اور بیت المقدس مسلمانوں کو مل گیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہاں محراب داؤد کے پاس دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کی۔ قبلہ اوّل یعنی صخرۂ مقدسہ کو رومیوں نے گندگی اور نجاست کا ڈھیر بنا رکھا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ یہ یہودیوں کا قبلہ تھا، نصرانی یہودیوں کو جلانے کے لیے یہ حرکت کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم پر اس جگہ کو پاک صاف کیا گیا اور سامنے سادہ سی مسجد تعمیر کی گئی جو مسجدِ قبلی یا ''مسجد عمر'' کہلاتی ہے جبکہ مسجد اقصیٰ کا اطلاق اس تمام احاطے پر ہوتا ہے جس میں صخرہ، مسجد اور دیگر عمارتیں ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کچھ دن شام ٹھہرے اور پھر سنہ ۱۷ ہجری کے آغاز میں واپس مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ③

نکتہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدم موجودگی کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے نائب تھے۔ ایک طبقے کا دعویٰ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خلافت غصب کی گئی تھی۔ مگر ذرا سوچیے! اگر واقعی ایسا ہوتا تو کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خطرہ محسوس نہ کرتے؟ کیا ایسی صورت میں وہ انہیں نائب مقرر کرتے؟ اور اگر وہ ایسی غلطی کر بیٹھے تھے تو کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس موقع نہ تھا کہ وہ دار الخلافہ سمیت پورے جزیرۃ العرب پر قابض ہو جاتے کیوں کہ اس وقت

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۹ ص ۶۵۵ تا ۶۵۹

② المستدرک للحاکم، ج: ۷، ۲۰۷ ③ البدایۃ والنہایۃ ج: ۹ ص: ۶۵۵ تا ۶۶۷، دار ہجر

تو وہاں سب ان کے ماتحت تھے مگر انہوں نے ایسا سوچا تک نہیں۔ پس یہ خلفائے اربعہ کے باہمی اعتماد کا ایک اور مضبوط ثبوت ہے۔

طاعون عمواس:

۱۸ ہجری میں شام میں طاعون پھیل گیا جسے طاعونِ عمواس کہتے ہیں جس سے پچیس ہزار کے لگ بھگ مسلمان جاں بحق ہوگئے۔ اس قدرتی آفت سے شام کے محاذ پر مسلمانوں کو زبردست دھچکا لگا۔ ان کی تسلی کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے غلام یرفاء کو ساتھ لیے ایک اُونٹنی پر شام روانہ ہوئے۔ راستے بھر کبھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سوار ہوتے کبھی غلام۔ شام کے شہر "اَیلہ" پہنچے تو لوگوں کو پوچھنا پڑا کہ امیر المؤمنین کون سے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت اونٹنی کی نکیل پکڑے ہوئے تھے۔ یرفاء سوار تھا، آپ نے تعارف کرایا تو لوگ حیران رہ گئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کچھ دنوں وہاں ٹھہرے۔ مرحومین کے ورثاء اور مریضوں کو تسلی دی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی اس لشکر میں تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے سے ایک دن انہوں نے اذان دی، لوگ ویسے ہی طاعون کے زخم کھا کر دل گرفتہ تھے، اس حالت میں یکدم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا سماں بندھا تو سب بے اختیار رو دیے۔ یہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شام کے عسکری و سیاسی انتظامات کی تنظیم نو کی۔ طاعون میں حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد دمشق کے لیے ایک موزوں آدمی درکار تھا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو یہ عہدہ سونپ دیا۔ ①

مصر کی مہم:

بیت المقدس کی فتح کے بعد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر کی طرف پیش قدمی کا خیال آیا اور انہوں نے اصرار کرکے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس مہم کی اجازت طلب کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس مہم کے بارے میں تردد تھا۔ تاہم حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے اصرار پر اجازت دے دی اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سنہ ۱۹ ہجری میں چار ہزار مجاہدین کو لے کر مصر میں داخل ہوگئے۔ عریش اور بِلْبِیس کے سرحدی قلعوں کو فتح کرتے ہوئے وہ دریائے نیل کے کنارے مصر کے پایہ تخت تک پہنچ گئے جسے "بابِلْیُون" کہا جاتا تھا۔ اس شہر کا محاصرہ سات ماہ تک جاری رہا۔ آخر ایک دن حضرت زبیر رضی اللہ عنہ چھ جانبازوں کے ساتھ سیڑھی لگا کر تنہا فصیل پر چڑھ گئے اور اندر اتر کر لڑتے بھڑتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ اس طرح ربیع الآخر ۲۰ ہجری میں "بابلیون" فتح ہوگیا۔ اس کے بعد اسلامی لشکر نے مصر کے دوسرے بڑے شہر اسکندریہ کا رُخ کیا اور اسے بھی مسخر کرلیا۔ ناروا ٹیکسوں اور بے انصافی کی وجہ سے مصر کے مقامی لوگ ایک عذاب میں گرفتار تھے۔ مسلمانوں نے انہیں نجات دلا کر عدل وانصاف کا بول بالا کردیا۔ ②

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۸ھ

② فتوح البلدان، بلاذری، ص ۲۱۰ تا ۲۱۳؛ تاریخ الطبری: ۱۰۳/۳ تا ۱۱۲، دار المعارف؛ البدایۃ والنھایۃ: ۱۰۰/۱۰

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا سانحہ شہادت:

سنہ ۲۳ ہجری میں حج سے واپسی پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی:

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ شَھَادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ وَمَوْتًا فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِكَ"

(یا اللہ! میں تیری راہ میں شہادت اور تیرے رسول کے شہر میں موت کی التجا کرتا ہوں) ①

اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں سعادتیں، ان کے لیے طے کر دیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب قیصر ایشیائی سلطنت کے اکثر حصے سے محروم ہو چکا تھا، ایران میں کسریٰ کی شوکت خاک میں مل چکی تھی، یہود جزیرۃ العرب سے جلا وطن کر دیے گئے تھے۔

مفتوحہ علاقوں کے بے شمار لوگ مسلمانوں کے اخلاق اور اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو چکے تھے جبکہ بہت سے لوگ سابقہ مذاہب پر قائم تھے اور ان میں ایک طبقہ مسلمانوں سے اس لیے نفرت کرتا تھا کہ انہوں نے ان کی آبائی سلطنتوں کو مٹا ڈالا تھا، پس ایسے لوگ اندرونی طور پر مسلمانوں سے بدلہ لینے کی تاک میں تھے۔

اس وقت مدینہ منورہ میں ایک مجوسی غلام فیروز ابولؤلؤ رہائش پذیر تھا۔ وہ سنہ ۲۱ ہجری کے دوران معرکہ نہاوند میں گرفتار ہوا تھا اور غلام بن کر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا تھا۔ یہ بیک وقت بڑھئی اور لوہار تھا۔ دستور تھا کہ ایسے ہنر مند غلاموں کو صنعت و حرفت کا موقع دیا جاتا تھا اور آمدن کا ایک طے شدہ حصہ آقا وصول کر لیتا جسے "خراج" کہا جاتا تھا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فیروز کی آمدن سے یومیہ دو درہم وصول کرتے تھے کیوں کہ اس کا کاروبار خوب چلتا تھا۔ فیروز کو اتنی رقم کی ادائیگی گراں تھی، پس اس نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہو کر شکایت کی کہ آقا مجھ سے بہت زیادہ خراج وصول کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے سمجھایا کہ اس کی کمائی کے لحاظ سے یہ خراج کچھ زیادہ نہیں۔ اس پر فیروز ناراضی ظاہر کرتا ہوا چل دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک سوالی مایوس ہو، اس لیے دل میں سوچ لیا تھا کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے خراج کم کرنے کی سفارش ضرور کریں گے۔ آپ نے دو چار دن بعد فیروز کو کہیں سے گزرتے دیکھا تو اس کی دل بستگی کے لیے فرمایا: "سنا ہے تم پَوَن چکی اچھی بنا سکتے ہو۔ مجھے بنا دو گے؟"

وہ عجیب سے لہجے میں بولا "ایسی بنا کر دوں گا کہ مشرق و مغرب والے دیکھتے رہ جائیں گے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس لہجے میں چھپی انتقام کی چنگاریاں محسوس کر لیں اور ساتھیوں سے فرمایا:

"یہ غلام مجھے دھمکی دے گیا ہے۔" اس کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے اسلامی روایت برقرار رکھتے ہوئے شک کو بنیاد بنا کر کوئی کارروائی نہ کی۔ ②

---

① البدایہ والنہایہ: ۱۰/ص ۱۷

② البدایہ والنہایہ: سنہ ۲۳ھ؛ اسد الغابہ، ترجمہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ؛ طبقات ابن سعد: ۳/۳۴۷ دار صادر

ذوالحجہ ۲۳ھ کے اواخر میں ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جونہی فجر کی نماز پڑھانے کے لیے تکبیر تحریمہ کہی، کونے میں چھپے ہوئے فیروز ابولؤلؤ نے ان پر خنجر سے پے در پے چھ وار کیے۔ لوگوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر اس نے تیرہ آدمیوں کو خون میں لت پت کر دیا جن میں سے نو آدمی زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔ آخر ایک شخص نے چادر پھینک کر اسے جکڑ لیا مگر فیروز نے فوراً اپنے گلے پر خنجر پھیر کر خودکشی کر لی۔ ① یوں تفتیش کا باب بند ہو گیا۔

آخری وصیتیں:

آخری ایام میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کو کئی اہم نصائح فرمائے جن کا خلاصہ یہ ہے:

- مہاجرینِ اوّلین کے حقوق کا خیال رکھا جائے اور ان کی حرمت کو ملحوظ رکھا جائے۔
- انصار سے بھلائی اور درگزر کا معاملہ کیا جائے۔
- رعایا سے ان کی رضامندی کے ساتھ کم سے کم محصول لیا جائے۔
- عرب دیہاتیوں کا خیال رکھا جائے یہ اصل عرب ہیں، اسلام کا خمیر ہیں۔
- اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری میں آنے والے غیر مسلم شہریوں کا خیال رکھا جائے، ان سے عہد کی پابندی کی جائے، ان کی حفاظت کے لیے جنگ کی جائے، ان پر برداشت سے زائد بوجھ نہ ڈالا جائے۔ ②

تاریخِ شہادت:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے یوم شہادت کے بارے میں ایک قول ۲۵ ذوالحجہ کا اور دوسرا قول ۲۶ ذوالحجہ کا ہے، اس کے علاوہ بھی کچھ اقوال ہیں۔ حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ بسندِ صحیح نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ذوالحجہ ختم ہونے سے قبل ہوئی تھی۔ ③ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے مطابق راجح قول یہ ہے کہ حملہ بدھ ۲۷ ذوالحجہ کو ہوا تھا اور آپ رضی اللہ عنہ نے تین دن زخمی حالت میں گزار کر شہادت پائی۔ ④ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے جو آپ کی جگہ تین دن تک مسجد نبوی کے امام رہے، نمازِ جنازہ پڑھائی اور خلیفہ دوئم اپنی آخری خواہش کے مطابق حجرۂ عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) میں حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ ⑤

❁❁❁

① صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۰؛ المنتظم لابن الجوزی: ۳۲۹/۳

② صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۰؛ المنتظم لابن الجوزی: ۳۲۹/۳

③ قال مالک: قال یحییٰ بن سعید: قال سعید بن المسیب: فما انسلخ ذو الحجۃ حتی قتل عمر ... (مؤطا امام مالک، باب ما جاء فی الرجم) اسنادہ صحیح وسعید بن المسیب (سید التابعین فی زمانہ) ولد لسنتین مضتا من ... عمر ... بالمدینۃ۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴ ص ۲۱۸) واخرجہ الحاکم باسناد صحیح عن سعید بن المسیب: فما انسلخت ذو الحجۃ حتی قتل عمر ...۔ (المستدرک علی الصحیحین۔ ح: ۴۵۱۳)

④ البدایہ والنہایہ سنۃ ۲۳ھ ... اس قول کا دارومدار جس سند پر ہے، وہ ضعیف ہے۔

⑤ الکامل سنۃ ۲۳ھ: تاریخ الخلفاء، ص: ۱۰۹ تا ۱۱۱، طلزار

مشق

سوالات کے جوابات دیجئے:

1. حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فضائل وکمالات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خلافت کے لیے تقرر کس طرح ہوا تھا؟
3. حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایران روانہ کرتے وقت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کیا نصائح فرمائے؟
4. قادسیہ کی جنگ نے ایرانی سلطنت پر کیا اثرات مرتب کیے؟
5. جنگِ یرموک کے اسباب کیا تھے؟ اور اس میں شکست سے بازنطینی سلطنت پر کیا اثر پڑا؟
6. قحط سالی اور طاعون کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا اقدامات کیے؟
7. بیت المقدس کی فتح پر مختصر نوٹ لکھیے؟
8. حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شہادت سے قبل کیا وصیتیں کی تھیں؟

عملی کام:

- شام اور ایران کے نقشے میں جنگِ یرموک، جنگِ قادسیہ اور جنگِ نہاوند کی نشاندہی کیجئے۔
- طلبہ باری باری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل اور کارناموں کے مختلف پہلوؤں پر پانچ پانچ منٹ کی تقریر کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

- البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۱۳ تا ۲۳ ھ
- عصر الخلافۃ الراشدۃ، از الشیخ اکرم ضیاء العمری
- الفاروق از علامہ شبلی نعمانی مرحوم
- تاریخ اُمتِ مسلمہ: حصہ اوّل

(یونٹ:1.10)

خلافتِ حضرت عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ

یکم محرم ۲۴ھ......تا......۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ
(۱۹ نومبر ۶۴۴ء......تا......۲۹ جون ۶۵۶ء)

فضائل ومناقب:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قریش کے خاندان بنواُمیہ کے معزز اور شریف ترین فرد تھے۔ عام الفیل کے چھ سال بعد طائف میں پیدا ہوئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چونتیس سال کے بھرپور جوان تھے۔ ان کے والد عفان کی وفات ہو چکی تھی اور ترکے میں انہیں خاصی دولت ملی تھی جسے اپنے آبائی پیشے تجارت میں لگا کر وہ ایک خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے مگر اسلام کی آواز کانوں میں پڑتے ہی انہوں نے اپنی دولت، مرتبے اور راحت وسکون سے بھرپور زندگی کو داؤ پر لگا کے کلمہ طیبہ پڑھ لیا۔ اس طرح وہ اسلام لانے والی اوّلین ہستیوں میں شامل ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ یعنی اُن دس خوش قسمت ترین افراد میں سے ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ہی جنت کی خوشخبری سنادی تھی۔ وہ ان چھ مخصوص رفقائے نبوت میں سے ہیں جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر دم تک رضامندی ثابت ہے۔[①]

آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی دولت کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو میٹھے پانی کی فراہمی میں بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو منہ مانگے دام دے کر اس سے میٹھے پانی کا کنواں بیر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ جنگِ تبوک کے موقع پر آپ رضی اللہ عنہ نے جہاد کے لیے تین سو اُونٹ سازوسامان سمیت پیش کیے، اس کے علاوہ ایک ہزار دینار بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جھولی میں لا ڈالے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر فرمایا: ''آج کے بعد عثمان کچھ بھی کریں، انہیں کچھ نقصان نہیں۔''[②]

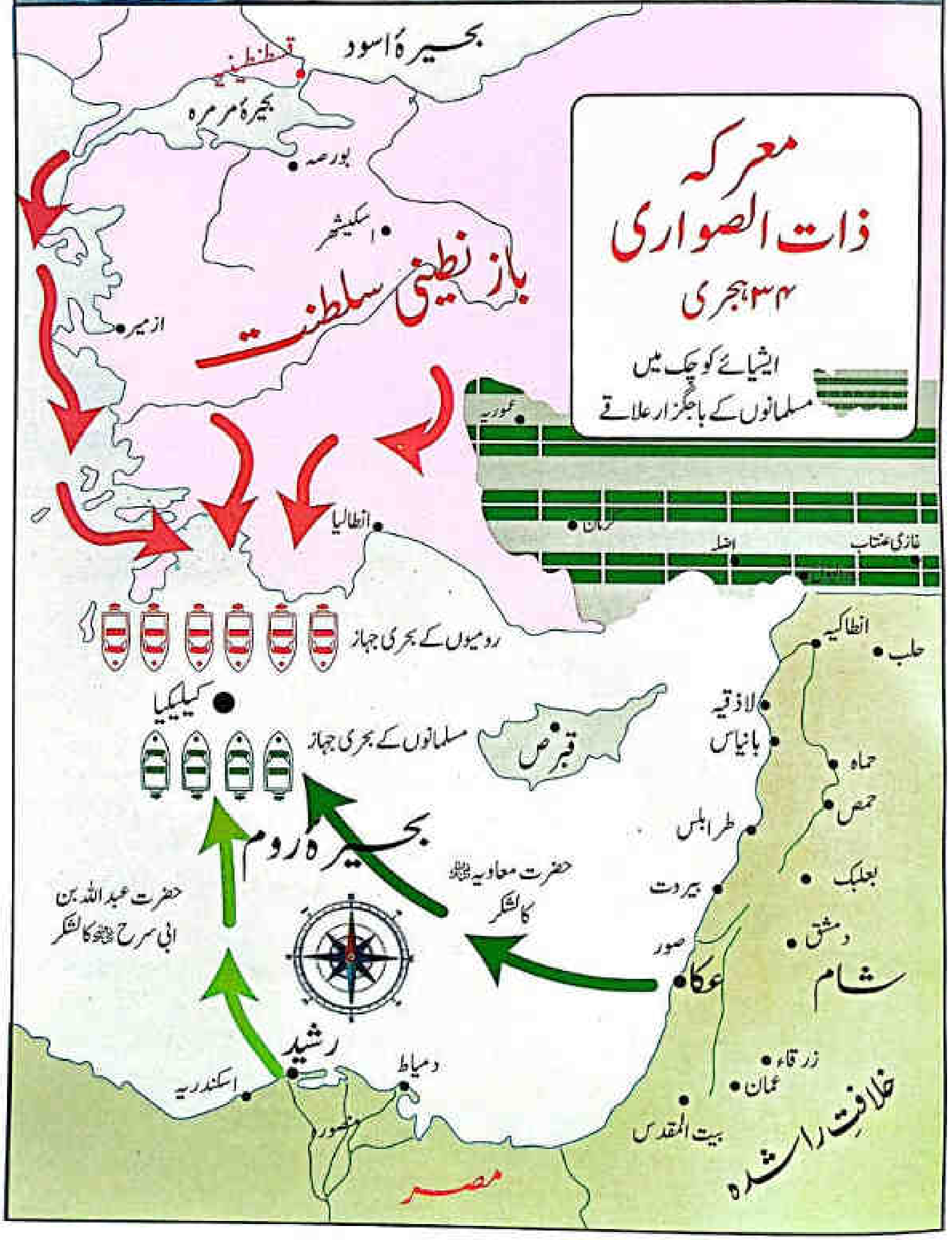
وہ دو صفات کے لحاظ سے انسانی تاریخ میں ممتاز تھے: ایک یہ کہ ان کے نکاح میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیاں: سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہما یکے بعد دیگرے آئیں۔ تاریخ میں کوئی شخص کسی نبی کا اس طرح دُہرا داماد نہیں بنا۔

---

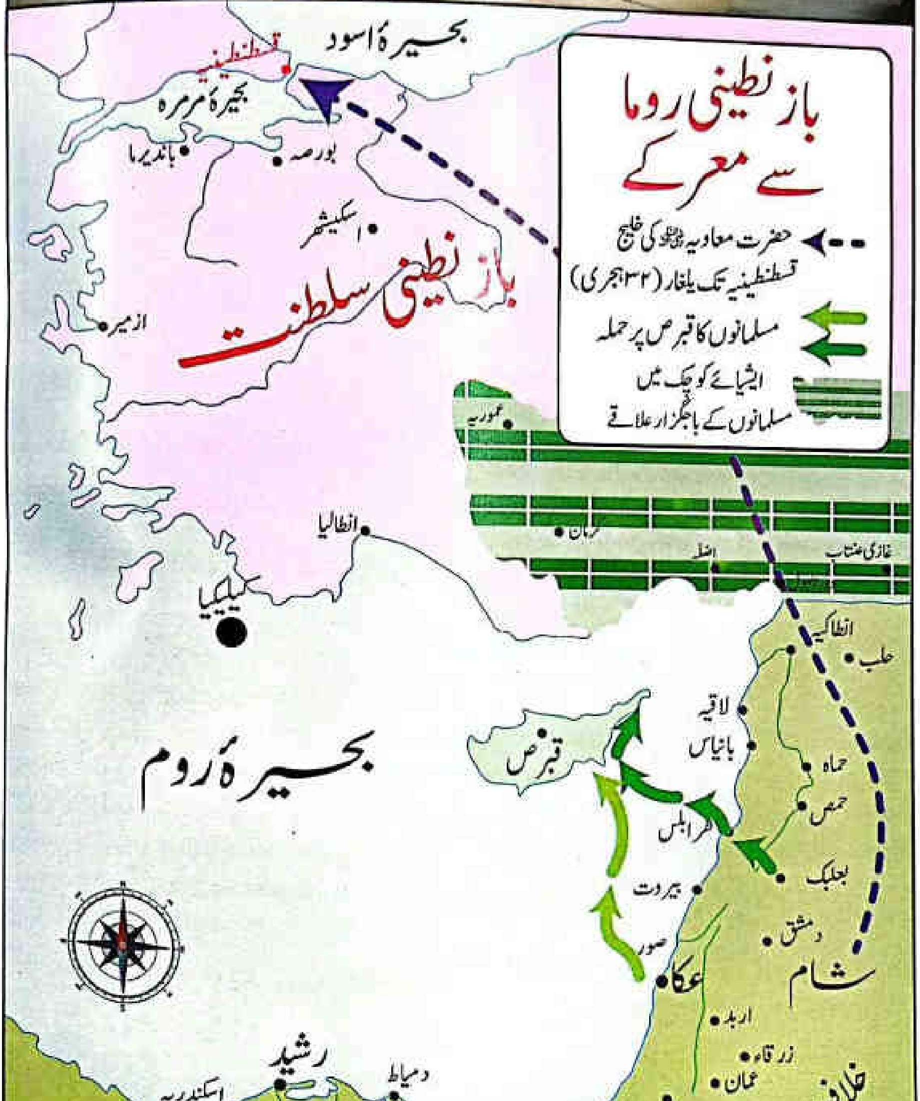
① البدایۃ والنہایۃ: ۱۹۱/۳
② سنن الترمذی، ح: ۳۷۰۱؛ الاصابۃ: ۳۷۷/۳؛ طبقات ابن سعد: ۵۵/۳، ط صادر

نقشہ نمبر15


بحیرۂ مرمرہ


معرکہ
ذات الصواری
۳۴ ہجری
ایشیائے کوچک میں
مسلمانوں کے باجگزار علاقے
بحیرۂ اسود
قسطنطنیہ
بحیرۂ مرمرہ
بورصہ
اسکیشہر
بازنطینی سلطنت
ازمیر
عموریہ
انطالیا
کرمان
اضنہ
غازی عنتاب
رومیوں کے بحری جہاز
کیلیکیا
مسلمانوں کے بحری جہاز
قبرص
انطاکیہ
حلب
لاذقیہ
بانیاس
حماہ
حمص
طرابلس
بعلبک
بیروت
دمشق
صور
عکا
شام
بحیرۂ روم
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر
حضرت عبد اللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا لشکر
رشید
دمیاط
اسکندریہ
زرقاء
عمان
بیت المقدس
خلافت راشدہ
مصر

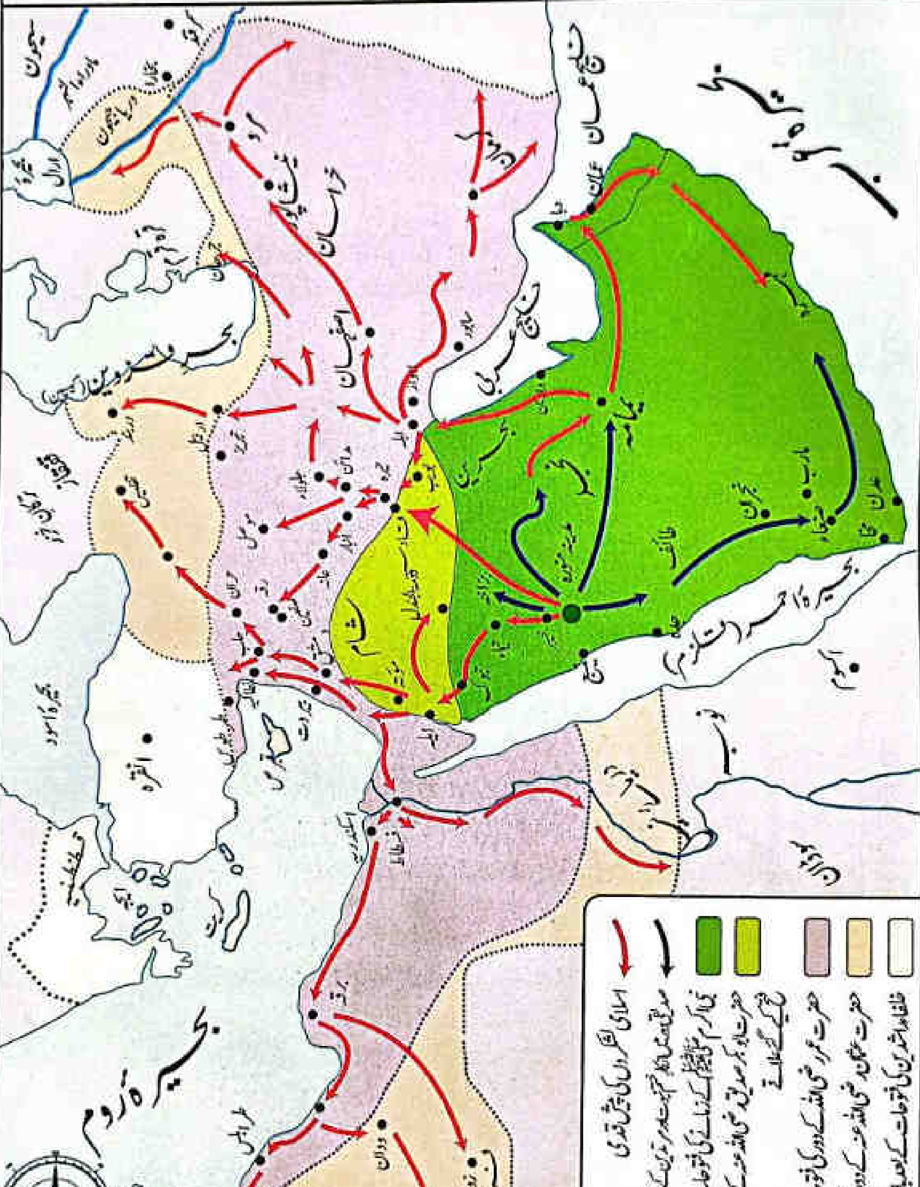

آبنائے باسفورس، ترکی


بازنطینی روما
سے معرکے
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلیج
قسطنطنیہ تک یلغار (۳۲ ہجری)
مسلمانوں کا قبرص پر حملہ
ایشیائے کوچک میں
مسلمانوں کے باجگزار علاقے
بحیرۂ اسود
قسطنطنیہ
بحیرۂ مرمرہ
باندیرما
بورصہ
اسکیشہر
بازنطینی سلطنت
ازمیر
عموریہ
انطالیا
کیلیکیا
غازی عنتاب
انطاکیہ
حلب
لاقیہ
بانیاس
حماہ
حمص
قبرص
بحیرۂ روم
طرابلس
بعلبک
بیروت
دمشق
صور
عکا
شام
اربد
زرقاء
عمان
خلافت راشدہ
بیت المقدس
رشید
دمیاط
اسکندریہ
منصورہ
مصر

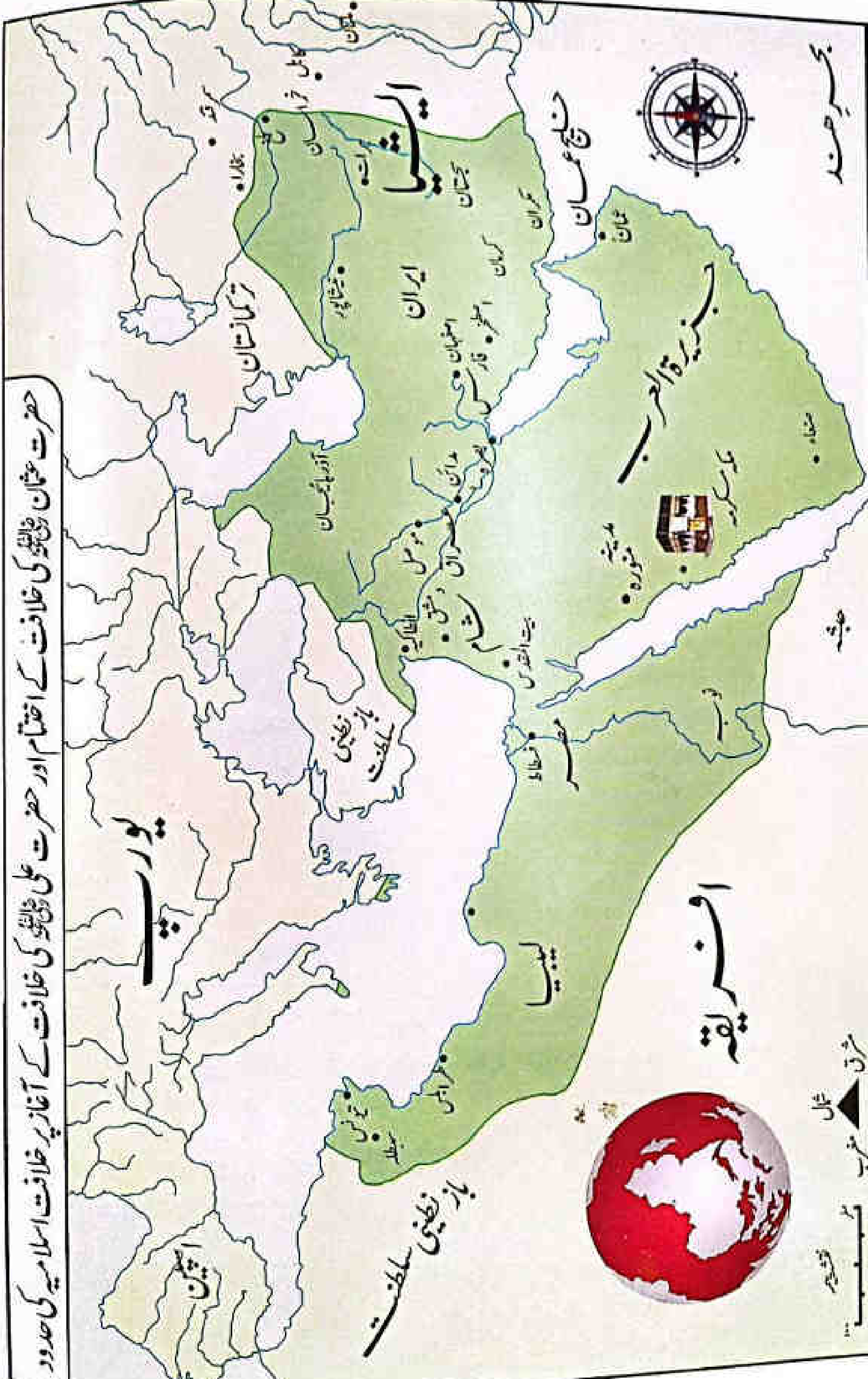
نقشہ نمبر 17

اسلامی فتوحات

حضور ﷺ کے دور سے خلفاء راشدین کے زمانے تک



نقشہ نمبر18



حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اختتام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آغاز پر خلافت اسلامیہ کی حدود
ایشیا
یورپ
افریقہ
جزیرۃ العرب
ایران
ترکستان
بازنطینی سلطنت
آذربائیجان
مکہ مکرمہ
مدینہ منورہ

اس لیے آپ رضی اللہ عنہ ذوالنورین کہلاتے ہیں۔①

دوسرے یہ کہ آپ رضی اللہ عنہ بہت زیادہ حیادار تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ عثمان سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔②

ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ کوہِ اُحد پر تشریف لے گئے، یکا یک پہاڑ لرزنے لگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ٹھہر جا، تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہیدوں کے سوا اور کوئی نہیں۔''③

خلافت کے لیے تقرر کس طرح ہوا:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وفات سے پہلے اپنے جانشین کے انتخاب کے لیے حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ بنائی تھی۔ اس کے ارکان میں مشورہ شروع ہوا۔ اس دوران حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہوگئے۔ پھر حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے درخواست کی کہ وہ فیصلے کا اختیار انہیں دے دیں۔ ان حضرات نے انہیں اختیار دے دیا کہ وہ جسے چاہیں خلیفہ مقرر کردیں۔④

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تین دن رات تک مسلسل استصوابِ رائے میں مشغول رہے۔ مہاجرین وانصار اور عوام وخواص سے گھر گھر جا کر الگ الگ ملاقاتیں کر کے پوچھا کہ حضرت عثمان یا حضرت علی میں سے کن کو منتخب کیا جائے۔ سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ اس منصب کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زیادہ بہتر ہیں۔⑤

ہر طرف سے اطمینان کر کے آخر عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ چوتھے دن نمازِ فجر کے بعد منبر پر چڑھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھام کر فرمایا: ''ہم آپ سے اللہ کے حکم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ان کے دو سابق خلفاء کی سنت پر بیعت کرتے ہیں۔'' اسی مجمع عام میں تمام مہاجرین وانصار نے بیعت کرلی۔⑥

پس یہ بالکل واضح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسے بخوشی قبول کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے تھے:

> ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسی مضبوط ومستحکم بیعت کسی کی نہیں ہوئی جس پر سب کا اتفاق تھا۔''⑦

دورِ فتنہ شروع ہونے کے خدشات:

اُمت کے حالات کو جس بلند نگاہی سے آپ دیکھ رہے تھے، اس سے دو خاص پہلو آپ کے سامنے آچکے تھے، جن

---

① الکامل فی التاریخ: ۳۵۹/۲

② صحیح مسلم، ح: ۶۳۶۲ ③ صحیح البخاری، ح: ۳۶۹۹

④ صحیح البخاری: ۳۷۰۰؛ صحیح البخاری، ح: ۷۲۰۷ ⑤ البدایہ والنہایہ: ۱۰ ص ۲۱۱

⑥ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۰۳/۳، بروایت حمید بن عبدالرحمن بن عوف عن مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ

⑦ السنۃ لابی بکر الخلال، ص: ۳۲۰، دار الرایۃ ریاض

لیے تدبیر وانتظام کرنا آپ کی ذمہ داری تھی۔ ایک پہلو یہ تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کسی بہت بڑے فتنے کا پیش خیمہ ہے جس سے یہ اُمت دوچار ہو کر رہے گی۔ ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ سے پوچھا کہ کسی کو اُس فتنے کے بارے میں ارشادِ نبوی کا علم ہے جو موجوں کی طرح اُمت کو بہالے جائے گا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''امیر المؤمنین! آپ کو اس سے کچھ خطرہ نہیں کیوں کہ آپ کے اور اس کے درمیان ایک مضبوط دروازہ حائل ہے جو آپ کی حیات تک بند رہے گا۔'' بعد میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے خود لوگوں کو بتایا کہ وہ دروازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود تھے، جن کی موت کے بعد فتنے سر اُٹھائیں گے۔ ①

دوسرا پہلو یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں جنت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا تھا:

''یہ خوشخبری ایسی آزمائش کے ساتھ ہے جو انہیں پہنچ کر رہے گی۔'' ②

ایک بار نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے ایک فتنے کا تذکرہ کیا، اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چادر اوڑھے ہوئے قریب سے گزرے، نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''یہ اس دن حق پر ہوں گے۔'' ③

اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے ایک بار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تنہائی میں بلا کر اُن سے کچھ راز کی باتیں کی تھیں جن سے ان کا رنگ اڑ گیا۔ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا تھا:

''اگر لوگ تم سے وہ کرتہ چھیننا چاہیں جو اللہ تعالیٰ تمہیں پہنائے گا تو تم ہرگز مت اُتارنا۔'' ④

پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد عن قریب فتنے پھوٹیں گے۔ خود خلیفہ دوئم کا محرابِ مسجد میں شہید ہونا، ور تفتیش کی راہوں کا بند ہو جانا ظاہر کر رہا تھا کہ اسلام دشمن طاقتیں میدانِ جنگ سے پسپا ہو کر اب خفیہ جنگ لڑنے پر تل گئی ہیں اور ان کی طرف سے فتنہ وفساد کو ہوا دینے کی سازشیں شروع ہو چکی ہیں۔ یہ وہ سب سے بڑا چیلنج تھا جس کا سامنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تھا۔ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ ہی وہ ذہنی طور پر ان فتنوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکمتِ عملی:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پیش آمدہ فتنوں کے مقابلے اور استحکام خلافت کے لیے جو حکمتِ عملی اپنائی، اس میں نرمی کا پہلو غالب نظر آتا ہے جسے مستشرقین اور سیکولر مؤرخین نے بلاوجہ ہدفِ تنقید بنایا ہے اور پرچار کیا ہے کہ خلیفہ سوئم کی حد سے زیادہ نرمی اور درگزر نے فتنوں کو ابھرنے کا موقع دیا۔ حالاں کہ یہ الزام درست نہیں۔

خلیفہ ثالث کی حکمتِ عملی کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس بنیادی بات پر غور کرنا ہوگا کہ کوئی بھی حکومت فتنوں کا سدباب دو طرح کرسکتی ہے: (الف) سخت گیری اور مفسدین کے قلع قمع پر اصرار کر کے (ب) نرمی، گفت وشنید اور کھلے احتساب

① صحیح البخاری، ح: ۷۰۹۶ ② صحیح البخاری، ح: ۳۶۹۵
③ مسند احمد، ح: ۱۸۱۱۸ ④ مسند احمد، ح: ۲۴۵۶۶ باسناد صحیح

کا انداز اختیار کر کے۔ سخت گیر حکمت عملی اپنانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مخالفین اور فتنہ پرور لوگوں کا جڑ سے صفایا کر دیا جائے۔ انہیں چن چن کر گرفتار، قید اور قتل کیا جائے تا کہ لوگ ان کے انجام سے ڈر کر قانون شکنی کی جرأت نہ کریں۔

یہ حکمتِ عملی بہت سے مواقع پر کامیاب ہو جاتی ہے۔ بہت سے حکمرانوں نے یہ انداز اپنا کر طویل عرصے تک اپنا تاج و تخت برقرار رکھا ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ دارو گیر، پکڑ دھکڑ اور عبرت ناک سزاؤں کی حکمتِ عملی عموماً حکومت اور مملکت کو پائیداری نہیں بخشتی، بلکہ بعض اوقات اس کے نتیجے میں حکومتیں زوال کی کھائی میں گرتی چلی جاتی ہیں، کیوں کہ فتنہ و فساد جب اپنے شہریوں کی طرف سے ظاہر ہو تو انہیں کچلنے اور روندنے کی حکمتِ عملی کے ردِ عمل میں بعض بے قصور لوگ بھی لپیٹ میں آجاتے ہیں، بہت سے افراد معمولی شرانگیزی کی بڑی سزا پا جاتے ہیں، اس طرح شہریوں کے حقوق کی پامالی عام بات بن جاتی ہے، ایسے لوگ حکومت کے پکے مخالف بن کر باغیانہ سرگرمیوں کو زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ پھر حکومت کی طرف سے جواب میں مزید تشدد ہوتا ہے اور ردِ عمل میں باغیانہ کارروائیوں کا دائرہ بھی پھیلتا ہے، جس کے نتیجے میں ملک تباہ ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس نرمی، گفت و شنید اور قانون کے مطابق احتساب کا انداز اپنانے سے وقتی طور پر تو فسادی لوگوں کو کچھ چھوٹ مل جاتی ہے مگر انہیں عوام کو مشتعل کرنے میں زیادہ کامیابی نہیں ہوتی کیوں کہ ہر شخص جب اپنے حقوق محفوظ دیکھتا ہے تو خواہ مخواہ کسی پر خطر سرگرمی میں کودنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ فسادی لوگوں میں سے بھی بہت سے افراد جو غلط فہمی کا شکار ہو کر حکومت سے ٹکرانے کی کوشش کرتے ہیں جواب میں حکام کو مخلص و ہمدرد، اپنے حقوق کو محفوظ، گفت و شنید کا دروازہ کھلا اور احتساب کو صاف و شفاف پا کر اپنی غلط روش سے باز آجاتے ہیں۔ جو لوگ عادی سرکش یا غیر ملکی ایجنٹ ہوتے ہیں وہ قانون کے مطابق سزا پاتے ہیں اور اگر بچ بھی جائیں تو معاشرے پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی معاملہ فہمی، تدبر اور فراست ایمانی کی بناء پر یہی طرز اختیار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چھپے ہوئے فسادی لوگ جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کے فوراً بعد فتنہ و فساد برپا کر سکتے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارہ برسوں میں سے دس سال تک ذرہ برابر بھی کامیاب نہ ہوئے۔ انہیں اس تمام عرصے میں ایسا کوئی موقع نہ مل سکا جس سے وہ فساد کی چنگاریاں بھڑکاتے اور مسلمانوں کو خلافت کا باغی بناتے۔

انتظامات میں کشادگی اور وسعت:

دورِ حاضر کے بعض صاحبان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے طرزِ سیاست کو یکسر ترک کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فاروقی نظم حکومت کو برقرار رکھتے ہوئے انہی کی طرزِ سیاست کی پیروی کی تھی۔ مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا، علم و معرفت کے مراکز آباد رہے، لوگ اسلام میں داخل ہوتے رہے، رعایا کو تمام حقوق برابر ملتے رہے، اُمراء اور افسران کی نگرانی ہوتی رہی، عہدے داروں کی کمی کوتاہی پر باز پرس جاری رہی، اپنے فرائض میں غفلت برتنے والوں کو برطرف کیا جاتا رہا۔ البتہ گزشتہ خلفاء کے

اور سہولیات میں اضافہ۔
زمانے سے جو چیز مختلف تھی، وہ تھی مال ودولت کی فراوانی
حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتوحات کی اتنی کثرت نہیں ہوئی تھی کہ دولت اور وسائل کی بہتات
ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں قیصر وکسریٰ کے خزانے قدموں میں آپڑے تھے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کو نمونہ قرار دیتے ہوئے اپنے اور اپنے افسران کے لیے سادگی کو پسند فرمایا اور کوشش کی کہ مسلمان
دولت کی کثرت کے باوجود عرب کے سادہ تمدن کو اپنائے رکھیں، جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُمت کو یہ گنجائش دی کہ
لوگ اللہ کے دیے ہوئے حلال مال میں سے مباح اور جائز سہولیات کو اختیار کر سکتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلیفہ
بننے کے بعد فی کس سالانہ وظیفے میں سو درہم (تقریباً 272 ڈالر) کا اضافہ بھی فرمایا۔①

آپ کی سخاوت وفیاضی نے لوگوں کے دل جیت لیے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے دیکھا، اس وقت میں بالغ ہونے کے قریب تھا، میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ حسین اور تروتازہ چہرہ کسی مرد کا دیکھا نہ کسی عورت کا۔ میں نے سنا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: "حضرات! آیئے اور اپنے وظائف لے جایئے۔" پس لوگ آکر بھرپور انداز میں مال وصول کرتے۔ ارشاد ہوتا: حضرات! آیئے، کپڑے اور ملبوسات لے جایئے، پس لوگ آتے اور ان میں ملبوسات بانٹ دیے جاتے۔ اللہ کی قسم! میرے کانوں نے یہاں تک سنا: "حضرات! آیئے، گھی اور شہد وصول کر لیجیے، لوگوں میں گھی اور شہد تقسیم کیا جاتا۔ لوگ آتے اور مشک وعنبر جیسی خوشبوئیں لے لے کر جاتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں لوگوں کے مابین دشمنیوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ عطیات اور انعامات کی بارش برستی تھی۔ روئے زمین پر کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جسے دوسرے مسلمان سے کوئی خدشہ ہو۔ جو کسی بھی شہر میں کسی بھی مسلمان سے ملتا اسے اپنا بھائی، دوست، مددگار اور خیر خواہ محسوس کرتا۔"②

❁❁❁

فتوحات

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد پرچم جہاد سرنگوں نہیں ہوا، فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ علامہ ابن جریر طبری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے تحت عسکری نظام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کوفہ کی چھاؤنی میں چالیس ہزار سپاہی موجود رہتے تھے جن میں سے ہر سال دس ہزار سپاہی سرحدوں پر اس طرح تعینات کیے جاتے تھے کہ چھ ہزار آذربائیجان میں ہوتے اور چار ہزار "رَے" میں۔③

---

① الکامل فی التاریخ: ۲/۴۵۳
② الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ: ص ۳۵، ۳۶
③ تاریخ الطبری: ۳/ص ۲۴۶

آرمیدیا کی فتح:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے ہی سال حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے الجزیرہ کے حاکم تھے، اپنے سالار سلمان بن ربیعہ رحمہ اللہ کو بارہ ہزار کا لشکر دے کر آرمیدیا بھیجا جو خاصا علاقہ فتح کر کے بکثرت مالِ غنیمت سمیت واپس آئے۔ ①

رومیوں کو شکستِ فاش:

اسی سال مسلمانوں نے شام کی سرحدوں پر رومیوں کو نہ بھولنے والا سبق سکھایا۔ رومی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے دل گرفتہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر شام کی سرحدوں پر دھاوا بولنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جیسے ہی اطلاع ہوئی آپ نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو تاکیدی خط بھیج کر حکم دیا کہ آٹھ، دس ہزار سپاہیوں کا لشکر شام والوں کی مدد کے لیے روانہ کریں۔“

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے فوراً سلمان بن ربیعہ رحمہ اللہ کی قیادت میں لشکر تیار کر کے شام کی سرحد پر بھیج دیا جہاں حضرت حبیب بن مَسلمہ فِہری رضی اللہ عنہ مقامی سپاہیوں کے ساتھ کمک کے منتظر تھے، اُدھر سرحدوں پر رومی سپہ سالار اسی ہزار رومیوں اور ترکوں کے ساتھ خیمہ زن ہو چکا تھا۔ حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ پینترے بدل کر لڑنے کے ماہر تھے، انہوں نے دشمن پر شب خون مارنے کا فیصلہ کیا، جب وہ اپنے خیمے سے نکلنے لگے تو اُن کی اہلیہ محترمہ اُم عبداللہ بنت یزید نے پکار کر کہا: ”پھر کہاں ملاقات ہوگی؟“ بولے: ”رومی سپہ سالار کی خیمہ گاہ میں یا جنت میں۔“

جب وہ رات کی تاریکی میں رومیوں کی طرف بڑھے تو اُن کی اہلیہ بھی بھیس بدل کر اُن کے جانبازوں میں شامل ہو گئیں، حضرت حبیب بن مَسلمہ رضی اللہ عنہ بجلی کی طرح دشمن پر حملہ آور ہوئے اور لڑتے لڑتے رومی سپہ سالار کے خیمے تک جا پہنچے تو دیکھا ان کی اہلیہ پہلے سے وہاں موجود ہیں اور دشمن سے بھڑی ہوئی ہیں، آخر رومیوں کو شکست فاش ہوئی اور مسلمان فتح کا پرچم لہراتے ہوئے واپس آئے۔ ②

اسکندریہ کا معرکہ:

اس شکست کے باوجود بازنطینی رومیوں کو یہ توقع تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد مسلمانوں کی قوت وشوکت میں کمی ضرور آئی ہوگی، اس لیے اب ان سے کچھ نہ کچھ سرحدی علاقے واپس لیے جا سکتے ہیں، شام کی سرحدوں پر شکست کھانے کے بعد انہوں نے مصر کے ساحلی شہر اسکندریہ پر قبضے کا منصوبہ بنایا تھا، ان کا سالار منوئیل وہاں ایک بھاری بحری بیڑا لے کر پہنچ گیا، مقامی رومی باشندوں نے اس سے پہلے ہی مسلمانوں کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا تھا لہٰذا رومی اسکندریہ پر قابض ہو گئے۔ مصر کے حاکم حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے انہیں زیادہ دنوں تک فتح کی

---

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۲۴۷

② تاریخ الطبری: ۳/ص ۲۴۸؛ البدایہ والنہایہ، ج: ۱۰، ص: ۲۲۰، ۲۲۱

خوشیاں منانے کا موقع نہیں دیا اور ربیع الاول سن ۲۵ ہجری میں جوابی حملہ کر کے رومی بیڑے کو شکست فاش سے دو چار کیا اور شہر پر دوبارہ اسلامی پرچم لہرا دیا۔ ①

اسکندریہ کے مقامی قبطی باشندے بغاوت میں رومیوں کے ساتھ شریک نہ تھے۔ اس لیے رومیوں نے فرار ہوتے ہوتے انہیں بڑا مالی نقصان پہنچایا تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حتی الامکان اس نقصان کی تلافی کر دی۔ ②

ان معرکوں کی حیثیت اور مقاصد:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی برسوں میں ہونے والے ان دو معرکوں میں مسلمانوں کی پوزیشن دفاعی تھی جبکہ جارحیت دشمن کی طرف سے تھی، تاہم ان کے علاوہ آپ کی خلافت کے دوران کئی مہمات سرحدوں کے پار بھیجی گئیں، مگر ان کی حیثیت چھاپہ مار کارروائیوں کی سی تھی۔ مسلمان سرحدوں پر خیمہ زن ہوتے اور تیز رفتار چھوٹے چھوٹے گھڑ سوار دستے دشمن کے علاقے میں پھیلا کر اُن کی خوراک ورسد لوٹتے اور حفاظتی چوکیوں پر حملے کرتے۔ اسی طرح حریف کو زک پہنچا کر کسی علاقے یا قلعے پر قبضہ کیے بغیر واپس آجاتے۔ ایسی مہمات کے چار مقاصد تھے:

① اپنی قوت کی دھاک بٹھائے رکھنا ② دشمن کی طاقت کا اندازہ لگاتے رہنا

③ دشمن کو اقتصادی طور پر کمزور کرنا ④ اپنی فوج کو متحرک رکھ کر سرحدوں کو محفوظ بنانا

مستشرقین مسلمانوں کی ایسی مہمات کو لوٹ مار اور ڈاکا زنی سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ ایسی کارروائیاں بازنطینیوں کی طرف سے بھی جاری تھیں۔ پس یہ کشمکش جو دو حکومتوں کے درمیان تھی "جنگ" ہی کہلائے گی جس کی نوعیت قدرے مختلف تھی۔ اسے لوٹ مار یا ڈاکا زنی سے تعبیر کرنے کا سبب مستشرقین کا بغض ہے یا اصولِ سیاست سے ناواقفیت۔

افریقہ کی فتوحات:

مصر کی سرحدوں سے متصل شمالی افریقہ کے وسیع علاقے ایک رومی حاکم جُرجیر (گریگوری) کے قبضے میں تھے۔ پہلے وہ قیصر روم کا ماتحت حاکم تھا مگر ایشیا سے رومیوں کی بے دخلی کے بعد حال ہی میں اس نے خود مختاری کا اعلان کیا تھا، اس کی مملکت کی حدود مصر کی سرحدوں سے مراکش تک پھیلی ہوئی تھیں۔

خلیفۂ ثالث کی اجازت ملنے پر شمالی مصر کے حاکم حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ دس ہزار کا لشکر لے کر صحرائے اعظم عبور کرتے ہوئے جُرجیر کی عملداری کے سرحدی علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں کئی مقامات پر جنگیں ہوئیں، دشمنوں کی بڑی تعداد گرفتار اور قتل ہوئی، مالِ غنیمت بھی بھاری مقدار میں حاصل ہوا۔ اکثر علاقوں میں لوگوں نے جو جُرجیر کے ظلم وستم اور رومیوں کے سخت قوانین سے تنگ آئے ہوئے تھے، جوق در جوق اسلام قبول کیا۔ بعض علاقوں میں لوگوں نے لڑے بغیر صلح کرلی۔ حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کا مقصد بھی اسلام کی اشاعت اور غلبہ تھا جو بڑی

---

① البدایہ والنہایہ، ج: ۱۰، ص: ۲۲۳

② الکامل فی التاریخ: ۳/ ص ۲۳۰

حد تک پورا ہو گیا تھا، اس لیے وہ واپس لوٹ آئے۔ [1]

اُدھر جُرجیر نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لیے بڑے پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کردیں۔ اِدھر حضرت عبداللہ بن سرح رضی اللہ عنہ بھی پورے افریقہ کو فتح کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ سن ۲۷ ھ میں انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس بارے میں اپنے عزائم سے آگاہ کر کے اجازت طلب کی۔ یہ ایک غیر معمولی مہم تھی جس میں کامیابی کے نتیجے میں مراکش تک اسلامی پرچم گڑ سکتے تھے اور ناکامی کی صورت میں مصر بھی ہاتھ سے نکل سکتا تھا۔

گزشتہ خلفاء کی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں مسلمانوں کے اہم امور کے لیے مسلسل مشوروں میں مصروف رہتے تھے، اس اہم معاملہ کو بھی مجلس شوریٰ میں پیش کیا گیا، اکثر ارکان نے اس مہم کے حق میں رائے دی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مہم کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سمیت کئی بڑے بڑے صحابہ کرام کو کمک کے لیے روانہ کیا۔ یہ حضرات مصر پہنچے تو مسلمان بے چینی سے ان کے منتظر تھے، لشکر نے کوچ کیا اور بُرقہ پہنچا جہاں حضرت عقبہ بن نافع رحمہ اللہ سرحدی افواج کے ساتھ موجود تھے۔ یہاں سے طرابلس تک کا علاقہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دورِ فاروقی میں فتح کر لیا تھا۔ مسلمان جو اب بیس ہزار ہو گئے تھے، ان حدود سے آگے نکل کر جُرجیر کے علاقے میں داخل ہو گئے، جو اپنے پایہ تخت سُبَیطِلَہ سے ایک منزل آگے ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی رکاب میں لیے مڈبھیڑ کے لیے تیار تھا۔ آخر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ جُرجیر کی فوج چھ گنا زائد تھی مگر مسلمان ذرا بھی ہراساں نہ تھے کیوں کہ وہ تعداد کی کمی یا کثرت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ ایمان اور جذبہ جہاد کی بنا پر لڑتے تھے۔

جنگ سے پہلے حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے جُرجیر کو اسلام قبول کرنے یا جزیہ ادا کرنے کی پیش کش کی، جو اس نے بڑی نخوت سے مسترد کر دی۔ آخر کار گھمسان کی جنگ چھڑی جو کئی دنوں تک جاری رہی، روزانہ صبح سے دوپہر تک لڑائی ہوتی اور اس کے بعد دونوں فریق اپنی خیمہ گاہوں میں لوٹ آتے۔

اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب سے جو اس محاذ کے بارے میں بڑے متفکر تھے، تازہ دم مجاہدین کا ایک دستہ آن پہنچا، جس کی قیادت پچیس سالہ نوجوان حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، چونکہ کم عمری ہی سے ان کی برکات مشہور تھیں اس لیے مسلمانوں نے ان کا پرجوش استقبال کرتے ہوئے اس زور شور سے تکبیر کے نعرے لگائے کہ جُرجیر سن کر اپنی جگہ چونک گیا۔ وجہ پوچھی تو بتایا گیا مسلمانوں کو کمک مل گئی ہے۔ جرجیر پریشان ہو گیا مگر اپنی فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس نے اعلان کرا دیا:

"جو شخص مسلمانوں کے امیر عبداللہ بن سعد ابن ابی سرح کو قتل کرے گا، اسے میں اپنی بیٹی کا رشتہ دوں گا اور ساتھ ہی ایک لاکھ اشرفیاں بھی۔"

---

[1] البدایہ والنہایہ: ۱۰ ص ۲۲۵

اس اعلان سے اس کی فوج میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہوگیا۔ اِدھر مسلمانوں کو معلوم ہوا تو انہیں اپنے امیر کے بارے میں خدشات لاحق ہوگئے، حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ بھی احتیاط کے طور پر ایک دن میدانِ جنگ سے غائب رہے۔ اس موقع پر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو حوصلہ دلانے کے لئے امیر لشکر کو مشورہ دیا: ''آپ بھی اعلان کرادیں کہ جو شخص جُرجیر کو قتل کرے گا، ہم جُرجیر کی بیٹی سے اس کا نکاح کرادیں گے، ایک لاکھ اشرفیاں بھی دیں گے اور جرجیر کے علاقے کا حاکم بھی اس کو مقرر کریں گے۔''

امیر لشکر کو یہ رائے پسند آئی، جب یہ اعلان کیا گیا تو مسلمانوں میں ایک نئی ہمت پیدا ہوگئی، جبکہ جُرجیر اور اس کی فوج خوفزدہ ہوگئی، چونکہ کئی دن سے جاری اس جنگ کا فیصلہ ہونے میں نہیں آرہا تھا، لہٰذا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جنگی حکمت عملی میں تبدیلی کی رائے دیتے ہوئے کہا: ''کل کی جنگ میں ہم کچھ فوج خیموں میں رہنے دیں گے، جب دونوں فریق لڑتے لڑتے بے حال ہوجائیں تو اس تازہ دم فوج کو بھیج کر تھکے ماندے دشمن کو مار بھگایا جائے گا۔''

سالارانِ فوج کے اتفاق رائے کے بعد حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ بھی قبول کرلیا۔

حسبِ معمول اگلے دن طلوعِ آفتاب کے ساتھ جنگ شروع ہوئی تو امیر لشکر نے منتخب شہ سواروں کو خیموں میں آرام کرنے کا حکم دیا۔ زوال کے وقت جب دونوں لشکر تھک کر واپسی کا ارادہ کرنے لگے، تب بھی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اصرار کرکے جنگ رکنے نہ دی۔ آخر سہ پہر کے وقت دونوں فریق بالکل بے حال ہوگئے۔ تب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کچھ تازہ دم بہادروں کو لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور ان کی صفوں کو اُلٹتے ہوئے عقب میں جا پہنچے جہاں جُرجیر اپنے گھوڑے پر سوار تھا اور دو باندیاں اسے مور پنکھ سے ہوا دے رہی تھیں۔ وہ اور اس کے محافظ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو چند سواروں کے ساتھ آتا دیکھ کر سمجھے کہ یہ دشمن کے سفیر وغیرہ آرہے ہیں، اس لیے بھاگنے یا مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ مگر جب ان کو ہتھیار سونتے دیکھا تو گھبرا گئے، جرجیر نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر بھاگنے کی کوشش کی مگر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس کے سر پر جا پہنچے اور تلوار سے اس کا سر قلم کردیا، پھر اسے نیزے میں پرو کر، تکبیر کا نعرہ لگاتے ہوئے اسی تیزی سے واپس آگئے۔

اپنے بادشاہ کے قتل سے کفار کے چھکے چھوٹ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا لشکر بھاگ نکلا، ان کی شہزادی گرفتار کرلی گئی، جو وعدے کے مطابق حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حوالے کردی گئی۔ اسلامی لشکر نے آگے بڑھ کر ان کے پایۂ تخت سبیطلہ پر قبضہ کرلیا اور گردونواح کے کئی قلعے بھی فتح کرلیے۔

ان فتوحات میں مقامی حکمرانوں کے جمع کردہ خزانوں سے جو ساز و سامان غنیمت کے طور پر حاصل ہوا، وہ اتنا تھا کہ فاتح لشکر کے بیس ہزار سپاہیوں میں سے ہر ایک کو کم از کم ایک ہزار دینار ملے۔ ①

---

① الکامل فی التاریخ: ۲/۳۶۲ تا ۳۶۴؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲/۲۲۶، ۲۲۷
ایک دینار 4.8 گرام سونے کا ہوتا تھا جس کی قیمت آج کل 310 ڈالر سے زائد ہے۔ یوں ہر مجاہد کو تین لاکھ ڈالر سے زائد رقم ملی۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے سے شام کے حاکم تھے۔ وہ ہر سال موسم گرما میں رومیوں سے جہاد کے لیے لشکر روانہ کرتے تھے اور انہیں جانی و مالی نقصانات پہنچا کر مسلمانوں کی ہیبت قائم رکھتے تھے۔ افریقا میں حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کی فتوحات کے بعد حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے بھی اس جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کی فتوحات کی تکمیل کے لیے حضرت معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا جنہوں نے مراکش کی سرحدوں میں قَمُوْنِیَه (سوس) سمیت کئی اہم مقامات فتح کیے۔[1]

فتحِ اِصْطَخْر:

دورِ عثمانی میں مغرب کے ساتھ مشرق میں بھی فتوحات کا دائرہ بڑھتا رہا۔ ۲۹ھ میں اہل فارس نے بغاوت کی تو خلیفہ ثالث کی طرف سے مقرر کردہ بصرہ کے نئے حاکم حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا اور انہوں نے بصرہ سے فارس کے مرکز اِصْطَخْر پر یلغار کر کے نہایت چابک دستی اور حوصلہ مندی سے مُفسدین کو شکست دی اور فارس پر اسلامی خلافت کی بالا دستی بحال کر دی۔[2]

طبرستان کی فتح:

سن ۳۰ ہجری میں بحیرہ خزر (کیسپین) کے قریب طبرستان کے خطے میں جہاد ہوا۔ کوفہ کے حاکم حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہاں فوج کشی کی تو حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام ہم رکاب تھے، جنہوں نے شدید معرکوں کے بعد طبرستان پر قبضہ کر لیا۔[3]

یَزْدَگِرْد کی موت:

ساسانی خانوادے کا آخری حکمران، سابق شاہِ ایران یَزْدَگِرْد پانچ برس سے سجستان (جنوبی افغانستان) میں چھپا ہوا تھا۔ دورِ فاروقی میں نہاوند میں ایرانیوں کی آخری شکست کے بعد وہ اصفہان میں پناہ گزین رہا تھا اور جب وہاں حالات ناسازگار ہوئے تو "رَے" میں جا پڑا تھا جہاں طبرستان کے والی نے حاضر ہو کر اپنے قلعوں میں آنے کی دعوت دی تھی مگر یَزْدَگِرْد نہ مانا اور سجستان چلا آیا۔ مسلمان سپاہی اب بھی اس کی کھوج میں تھے۔

اس وقت وہ اہلِ سجستان سے بھی مایوس ہو کر مَرْو کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ہزار افراد کی مختصر سی فوج اور چند امراء تھے۔ مَرْو پہنچ کر اس نے مقامی مجوسی حاکم مَاهُوْيَہ اور اس کے امیر سے مالی تعاون طلب کیا مگر یہ لوگ ساسانیوں کے سابقہ مظالم اور جھوٹی سیاست سے اس قدر تلملائے ہوئے تھے کہ انہوں نے نہ صرف کسی بھی قسم کی مدد

---

① الکامل فی التاریخ: ۳۶۵/۲

② الکامل فی التاریخ: ۳۷۳/۲، ۳۷۴

③ الکامل فی التاریخ: ۳۸۰/۲، ۳۸۱

سے انکار کر دیا بلکہ ترکمانوں کو بلوا کر یَزْدَ گِرْد کے قافلے پر دھاوا بول دیا۔ اس مڈبھیڑ میں یزدگرد کے سارے ساتھی مارے گئے اور وہ خود گھوڑے کو ایڑ لگا کر تن تنہا بیابانوں کی طرف بھاگ نکلا۔ یہ واقعہ سن ۳۱ ہجری کا ہے۔ زخمی گھوڑے نے راستے میں دم توڑ دیا تو وہ پیدل چلنے پر مجبور ہوگیا، اسی خستہ حالی میں وہ دریائے مُرغاب کے کنارے مرو سے دو فرسخ دور ایک پن چکی پر پہنچا، اس کا شاہی لباس اور تاج دیکھ کر پن چکی کا مالک حیران ہوگیا اور اسے اپنے ہاں پناہ دے دی۔ اس دوران مَرْو کے حاکم مَاھُوْیَہ کو یَزْدَ گِرْد کا سراغ مل گیا۔ اس نے کچھ سپاہی بھیج دیے کہ یَزْدَ گِرْد کا سر کاٹ کے لے آئیں، ان سپاہیوں نے پہلے چکی والے کو مار پیٹ کر یَزْدَ گِرْد کا پتا معلوم کیا، پھر اس کو ساتھ لے کر پن چکی کی اس کوٹھری کے پاس پہنچ گئے جس میں یَزْدَ گِرْد روپوش تھا، سپاہیوں نے چکی والے کو کہا ''تم ہی اندر جا کر اسے قتل کرو۔'' اس نے اندر جا کر یَزْدَ گِرْد کو جو گہری نیند سو رہا تھا، قابو کرنے کی کوشش کی، وہ ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا اور چکی والے کا ارادہ بھانپ کر بولا ''میری یہ انگوٹھی اور کنگن لے لو، مجھے کچھ نہ کہو۔'' چکی والے کو ان چیزوں کی قیمت معلوم نہ تھی۔ بولا ''چار درہم دے دو، چھوڑ دوں گا۔'' یَزْدَ گِرْد کے پاس دراہم نہیں تھے، اپنی ایک بالی اُتار کر اسے دے دی۔ اتنے میں باہر کھڑے سپاہی تلواریں سونتے اندر آگئے، یَزْدَ گِرْد نے گڑگڑا کر کہا ''مجھے قتل مت کرنا، چاہے اپنے حاکم کے حوالے کر دو یا عربوں کے سپرد کرو۔'' مگر سپاہیوں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے اسے وہیں قتل کر دیا اور لاش دریائے مرغاب کی لہروں کے حوالے کر دی۔ یہ لاش ایک مقامی پادری کو دریا کے کنارے جھاڑیوں میں پھنسی ملی جس نے اسے اپنی رسم کے مطابق دفنا دیا۔ اس طرح ساسانیوں کا آخری بادشاہ ایک عبرت ناک موت مرگیا اور کسریٰ کی داستان ختم ہوگئی جو دنیاوی شان و شوکت کے فانی ہونے کا یقین دلاتی ہے۔ ①

فتح نیشاپور:

یَزْدَ گِرْد کی موت کے بعد حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے پورے خراسان اور گرد و نواح کو فتح کر کے فارسیوں کی شرانگیزیوں کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا اور سن ۳۱ ہجری میں مختلف اضلاع فتح کرتے ہوئے نیشاپور کا محاصرہ کر لیا۔ آخر ایک ماہ بعد نیشاپور کے حاکم نے صلح کر لی۔ ②

خراسان کی فتوحات:

نیشاپور کے بعد حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے سرخس کو بزور شمشیر اور طوس کو صلح کے ساتھ فتح کیا۔ اس کے بعد ہرات اور بادغیس بھی ان کے آگے سرنگوں ہوگئے۔ مرو کے مجوسی حاکم نے بھی بائیس لاکھ درہم سالانہ جزیہ دینے کی شرط پر صلح کر لی۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے مایہ ناز جرنیل حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ کو آگے روانہ کیا، جنہوں نے بلخ، جوزجان، فاریاب، تخار اور طالقان جیسے دشوار گزار علاقوں میں جنگجو ترکوں اور مجوسیوں سے خون ریز معرکے لڑے اور ہر جگہ فتح یاب ہو کر ان تمام علاقوں میں اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے، ان میں سے کچھ

① الکامل فی التاریخ: ۲/۳۹۰ تا ۳۹۴ ② الکامل فی التاریخ: ۲/۳۹۰ تا ۳۹۴

علاقے جنگ کے بغیر صلح کے معاہدوں کے ساتھ بھی فتح ہوئے۔ اس طرح کرمان، سیستان، زَرَنج، قندھار، زابُل، غزنی اور کابل بھی یکے بعد دیگرے فتح ہوتے چلے گئے، ان فتوحات میں حضرت اُقرع بن حابس حضرت عبدالرحمن بن سمرۃ، حضرت مجاشع بن مسعود رضی اللہ عنہم اور حضرت عبداللہ بن خازم رحمۃ اللہ علیہ جیسے اولعزم اسلامی سپہ سالار پیش پیش تھے۔ غرض حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور ان کے امراء نے ایک ڈیڑھ سال کے اندر اندر مشرق میں اسلامی عمل داری کا دائرہ نہ صرف غزنی اور کابل تک پھیلا دیا بلکہ ہندوستان کی سرحدوں تک جا پہنچے۔ ①

اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بابرکت دور میں خلافتِ اسلامیہ کی حدود ہندوستان کی سرحدوں سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحلوں اور بحیرۂ روم میں مشرقی یورپ کی سرحدات تک وسیع ہو گئیں اور ایک وسیع وعریض علاقہ کفر وشرک کی بالادستی سے آزاد ہو کر قرآن وسنت کے انوارات سے جگمگانے لگا۔

❁❁❁

بحری جنگیں

ایشیائے کوچک اور افریقہ کے رومیوں سے ان بار بار کی جنگوں میں یورپ کسی نہ کسی طرح ضرور دخل انداز رہا۔ وہ ہر اسلام دشمن فوج کی پشت پر خفیہ یا کھلم کھلا موجود رہا۔ بحیرۂ روم میں بازنطینیوں کے جنگی بیڑے کی نقل وحرکت مسلمانوں کے لیے بہرحال ایک مستقل خطرہ تھی، اس لئے اب سمندر کو میدانِ جنگ بنا کر بحیرۂ روم میں یورپیوں سے مقابلہ کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس کے لیے بحری فوج کی ضرورت بھی اب ایک ناقابل انکار حقیقت بن گئی تھی۔

شام کے ساحلوں پر حضرت معاویہ اور مصر میں حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہما آئے دن اس ضرورت کو محسوس کرتے تھے اور خود خلیفہ ثالث بھی اس صورتحال سے آگاہ تھے، چنانچہ رجب سن ۲۸ ہجری میں جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے بحری جہاد کی اجازت طلب کی اور یقین دلایا کہ مہم مشکل ثابت نہیں ہوگی تو دربارِ خلافت سے اس مہم کی منظوری مل گئی، تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسلام کی اس پہلی بحری فوج کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے حکمت سے کام لیتے ہوئے یہ شرط عائد کی کہ امرائے لشکر اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے۔ آپ کو معلوم تھا کہ عورتوں کی موجودگی میں مردوں کو اپنی طبعی گھبراہٹ کا اظہار کرنا بھی باعثِ شرم لگے گا اور یوں ہمت وحوصلے کی فضا قائم رہے گی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اجازت ملتے ہی نئے بہترین بحری جہاز تیار کرائے، اجہاد کے لیے ایسے حوصلہ مند جوانوں کو بھرتی کیا جو اپنی خوشی سے آگے آئے۔ حضرت معاویہ اور حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہما بحیرۂ روم کے نقشے اور یورپی جہازرانوں کی آمد ورفت کے نقاط کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مصر اور شام کے ساحلی قلعوں کے علاوہ خود بحیرۂ روم کے درمیان مسلمانوں کا کوئی جنگی مرکز ہونا لازمی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے جزیرۂ قُبْرُص

---

① الکامل فی التاریخ: ۲/۴۹۳ تا ۴۹۶

کو منتخب کیا جو شمالی شام کے ساحلوں کے قریب بازنطینیوں کا اہم معسکر تھا۔ سن ۲۸ ہجری کے موسم بہار میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے سالار بحریہ عبداللہ بن قیس کے ساتھ شام کے ساحل عکا سے پہلا اسلامی بیڑہ لے کر سمندر کی موجوں میں اترے۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ حضرت فاختہ بنت قرظہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ اسی طرح حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ حضرت اُم حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس تاریخی مہم میں شامل تھے۔ ①

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے، ان دنوں تلاوت کرتے ہوئے اس آیت مبارکہ پر پہنچے:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝

"نکلو اللہ کی راہ میں خواہ ہلکے ہو خواہ بوجھل ہو۔ اور جہاد کرو اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔" ②

آیت پڑھتے ہی اس جہاد میں شرکت کے لیے بے چین ہوئے۔ گھر والوں سے کہنے لگے: "میرا خیال ہے میرا رب چاہتا ہے کہ ہم بوڑھے ہوں یا جوان، جہاد میں نکل کھڑے ہوں۔ بچو! میرا سامان تیار کرو، میں بھی جاؤں گا۔" ان کے جوان بیٹوں نے کہا: "ابا جان! اللہ آپ پر رحم فرمائے آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کیا، پھر حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی جہاد کیا۔ اب آپ تشریف رکھیے، ہم آپ کی جگہ جہاد کریں گے۔" مگر وہ نہ مانے اور اس مہم میں شریک ہو گئے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اس سفر کے دوران بحری جہاز میں وفات پا گئے۔ آس پاس کوئی جزیرہ نہ تھا جہاں انہیں دفن کیا جاتا۔ نو دن بعد ساحل دکھائی دیا، جہاں انہیں دفنایا گیا۔ تب تک ان کی نعش بالکل تر و تازہ تھی۔ ③

قُبرُص کی فتح:

اسلامی افواج قُبرُص کے ساحل پر اتریں تو مقامی لوگوں نے ہتھیار ڈال دیے اور ان شرائط پر صلح کا معاہدہ ہو گیا:

① اہل قُبرُص سالانہ ستر ہزار دینار جزیہ ادا کیا کریں گے۔ ② مسلمان ان کی پوری حفاظت کریں گے۔

③ اہل قُبرُص مسلمانوں کو رومیوں کے خلاف سمندری مہمات کے لیے آمد و رفت کا موقع فراہم کریں گے۔

④ مسلمانوں کو رومیوں کی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ ④

یہ صلح چار سال تک قائم رہی۔

قُسطَنطِینیَہ کا محاذ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم پر ۳۲ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایشیائے کوچک میں شمال کی طرف پیش قدمی کرتے

① فتوح البلدان، ص ۱۵۳، ۱۵۴، ط مکتبۃ الہلال

② سورۃ التوبۃ، آیت ۴۱

③ مستدرک حاکم، ج ۳: ۵۰۴ ؛ تفسیر ابن ابی حاتم: ۲۲۰/۲۵، سورۃ التوبۃ ④ الکامل فی التاریخ: ۳۶۹/۲

ہوئے آبنائے قُسطَنطِینِیّہ پر جا کر خیمہ زن ہوئے جہاں خلیج کے پار قیصر کے پایۂ تخت کی فصیل نظر آتی تھی۔ ①

قُبرُص کی ازسرِ نو فتح:

قیصر روم قُسطَنطِین ایشیائے کوچک میں اسلامی فتوحات سے سخت مضطرب تھا۔ اسلامی افواج کے خیمے اب وہ قُسطَنطِینِیّہ کے قلعے سے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے مسلمانوں سے بچنے کے لیے اہلِ قبرُص سے کمک مانگی، انہوں نے عہد شکنی کر کے قیصر کی مدد کی اور اسے جنگی کشتیاں فراہم کر دیں۔ یہ خبر ملنے پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قُسطَنطِینِیّہ کے محاذ سے قُبرُص روانہ ہو گئے اور ۵۰۰ کشتیوں کے ساتھ حملہ کر کے ۳۳ ہجری میں اسے فتح کر لیا۔ انہوں نے یہاں بارہ ہزار سپاہیوں کو ان کے اہل وعیال سمیت آباد کر دیا۔ یوں قُبرُص بحیرۂ روم کا مسلم خطہ اور عظیم بحری معسکر بن گیا۔ ②

غزوہ ذات الصَّواری:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا سب سے بڑا اور خطرناک بحری معرکہ "ذات الصَّواری" تھا، جو سن ۳۴ ہجری میں لڑا گیا۔ ہوا یہ کہ قیصر نے ایک عظیم الشان بحری بیڑہ ترتیب دیا، جس میں شامل جہازوں کی تعداد پانچ سو سے چھ سو تک بتائی جاتی ہے۔ قیصر چاہتا تھا کہ بحیرۂ روم میں مسلمانوں کی مداخلت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی جائے۔ آخر وہ اس بے پناہ بحری طاقت کے ساتھ بحیرۂ روم میں اترا اور ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ یہ خبر سنتے ہی شام سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور مصر سے حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے اپنی بحری طاقت یکجا کی اور اس سے پہلے کہ بازنطینی اسلامی ساحلوں پر اترتے، وہ سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے ان کے سامنے جا پہنچے، قبرُص اور جزیرہ روڈس کے درمیان موجودہ ترکی کے جنوب مشرقی ساحل "کِیلیکِیا" کے پاس رات کے وقت دونوں بحری فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ طے یہ ہوا کہ رات کو فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرے گا، چنانچہ رات بھر مسلمان نماز، دعا اور تلاوت میں مصروف رہے، جبکہ بازنطینی بحریہ نقارے اور باجے بجاتی رہی۔ صبح جنگ چھڑی تو عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نے لنگر اٹھانے اور بادبان کھولنے کا حکم دیا۔ اسلامی بحریہ رومیوں کی طرف بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے قرونِ اولیٰ کے ان ملاحوں نے اپنے جہازوں کو حریف کے جہازوں سے ٹکرا دیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں طرف کے سپاہی تلواروں اور خنجروں سے ایک دوسرے پر پل پڑے، مسلمانوں نے ایسی شدید بحری جنگ لڑی جس کی مثال نہیں ملتی۔ ہزاروں آدمی کٹ کٹ کر سمندر میں جا گرے اور سمندر خون سے سرخ ہو گیا، مسلمانوں کے بھی سینکڑوں افراد شہید ہوئے مگر رومیوں کے نقصانات کہیں زیادہ تھے، اس دوران سمندر میں طغیانی آ گئی اور دونوں طرف کے بحری جہاز تنکوں کی طرح اُچھلنے لگے، تب تک مسلمانوں نے رومیوں کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا

---

① تاریخ الطبری: ۴ص ۳۰۴؛ المنتظم: ۵ص ۱۹؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۲ھ؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳ص ۳۷۱، ت تدمری
البدایہ والنہایہ: ۱۰ص ۲۴۳؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۶۷؛ تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی: ص ۱۸۶

② فتوح البلدان، ص ۱۵۳

تھا، اسی اثناء میں خود قیصر قُسطَنطِین بھی زخمی ہوگیا، اس نے بقیہ سپاہیوں کو پسپائی کا حکم دے دیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو شاندار فتح عنایت کی۔ مسلمان قریبی ساحل پر اترے تو ہلاک شدہ رومیوں کی لاشیں بھی بہہ بہہ کر یہاں جمع ہو گئیں یہاں تک کہ جگہ جگہ ان کے ڈھیر لگ گئے۔ ①

قُسطَنطِینِیّہ کی فتح کا منصوبہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کئی برسوں سے قیصر کے پایۂ تخت قُسطَنطِینِیّہ پر کارگر حملے کی ممکنہ تدابیر پر غور کر رہے تھے۔ چونکہ اس محاذ پر جہاد کرنے والے لشکر کے لیے حدیث میں مغفرت اور جنت کی بشارت دی گئی تھی، اس لیے صحابہ کرام اس کی فتح کو بہت اہم سمجھتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قُسطَنطِینِیّہ کی خلیج تک یلغار کر چکے تھے مگر یہاں تینوں اطراف سمندر سے گھرے اس شہر کی جغرافیائی قلعہ بندی نے یہ ثابت کر دیا کہ اس سمت سے اس کی فتح تقریباً ناممکن ہے۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حوصلہ اتنا بلند تھا کہ انہوں نے یہ طے کیا کہ پہلے پورے یورپ کو فتح کیا جائے اور پھر خشکی کے راستے شمال سے آ کر قسطنطنیہ کو گھیرا جائے۔ اس کے لیے آپ نے یہ نقشہ مرتب کیا کہ پہلے مرحلے میں اسپین، پھر فرانس اور پھر مغربی یورپ پر حملہ کیا جائے۔ اس کے بعد مشرقی یورپ کو زیر نگیں کر کے قُسطَنطِینِیّہ تک پہنچا جائے۔

آپ رضی اللہ عنہ نے افریقا کے سپہ سالار حضرت عقبہ بن نافع رحمہ اللہ کو اپنے منصوبے کی خبر دیتے ہوئے مراسلہ لکھا:

''بلاشبہ قُسطَنطِینِیّہ اندلس کے راستے سے فتح ہو سکتا ہے۔'' ②

اَندَلُس پر حملہ:

اسلامی افواج اس وقت تک مراکش پر قابض ہو چکی تھیں۔ اسپین اور مراکش کے درمیان صرف سمندری پٹی حائل تھی۔ آپ کے حکم سے سن ۲۷ ہجری میں افریقہ کی اسلامی فوج نے خلیج عبور کر کے اَندَلُس پر ایک حملہ کیا اور کامیابی سے واپس لوٹ آئی۔ یہ حملہ چھاپہ مار کارروائی کی حیثیت رکھتا تھا تاکہ دشمن کی قوت کا اندازہ لگایا جائے۔ ③

یہ یورپ میں مسلمانوں کا پہلا قدم تھا، اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کے بعد داخلی فتنوں کا سامنا نہ ہوتا تو شاید قُسطَنطِینِیّہ اور اس سے پہلے پورا یورپ اسی زمانے میں فتح ہو جاتا۔ مگر افسوس کہ ۳۳ھ کے بعد داخلی فتنوں نے اس سلسلۂ جہاد کو ایسا روکا کہ پھر ایک عشرے تک اسلامی سرحدیں وسیع نہ ہونے پائیں۔

❁❁❁

---

① البدایہ والنہایہ: ۱۰ ص ۲۳۷ تا ۲۳۹

② الکامل فی التاریخ: ۲/۳۶۶

③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۷ ہجری

(یونٹ:1.11)

عبداللہ بن سبا کی سازشی تحریک

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے گیارہویں سال تک چوبیس برس اسلامی خلافت کا دورِ عروج تھے، ہر طرف امن و امان تھا اور فتوحات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ عوام خوشحال اور امراء امانت دار تھے۔ اُمت متحد تھی، کہیں کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بذاتِ خود آخر تک ایک نہایت مثالی حکمران کا کردار پیش کیا تھا۔ البتہ آخری برسوں میں کچھ شرپسندوں نے اُن کی حکومت گرانے کی سرتوڑ کوششیں شروع کیں جو آخر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے دردناک سانحے کا باعث بنیں۔ یہ وہ فتنہ تھا جس کی پیش گوئی احادیث میں کردی گئی تھی۔ فتنے کا آغاز اُن لوگوں کے ذریعے ہوا جو اسلامی خلافت کی رعایا تھے مگر قبائلی تعصب اور آبائی مذاہب سے ان کا دلی تعلق برقرار تھا۔ اسلام کی سطوت سے دب کر انہوں نے کلمہ پڑھ لیا تھا مگر اسلامی خلافت کو وہ خدا کے نظام کے طور پر نہیں قریش کی بادشاہت کی شکل میں دیکھتے تھے، ان کے لیے یہ بات زیادہ خوشی کا باعث ہوسکتی تھی کہ ایک بار پھر ان کے ہم قبیلہ حکمرانوں کا دور دورہ ہوتا۔ یہی لوگ تھے جو آیندہ اسلام کی جڑوں کو کاٹنے کے لیے شیطان کے گماشتوں کا کردار ادا کرنے پر آمادہ تھے۔ چونکہ یہ لوگ شروع میں زیرِ زمین کام کررہے تھے اس لیے اس پہلے مرحلے کے سرکردہ افراد کے نام مؤرخین کو معلوم نہ ہوسکے البتہ ایک فرد کا نام بہت وثوق سے لیا جاتا ہے۔ یہ یمن کے دارالحکومت صنعاء کا ایک سیاہ فام یہودی تھا جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے چند برس گزرنے پر اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور عبداللہ بن سبا کے نام سے اس کی پہچان ہوئی۔① اس نے یمن سے اپنی مہم کا آغاز کیا اور چند برسوں میں حجاز، کوفہ، بصرہ اور شام تک کے سفر کر ڈالے۔ وہ بزرگی کا لبادہ اوڑھ کر مشہور ہوا۔ اس لیے خود کو ایسے مصلح کے طور پر پیش کیا جو نیکی کا حکم دیتا اور گناہوں سے منع کرتا تھا۔② جس طرح پولس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مبالغہ آمیز محبت پر مبنی نئے عقائد کا اظہار کرکے نصرانیوں میں مقبولیت حاصل کی تھی اسی طرح ابن سبا بھی یہی داؤ آزما کر جاہلوں کا مذہبی پیشوا بن گیا اور سادہ لوح قسم کے بہت سے لوگ اسی کو اسلام کا سب سے بڑا معلّم و مرشد تصور کرنے لگے۔

یہودیوں کے اس گماشتے کو اندازہ ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کے عروج کا راز اُن کے اتحاد میں مضمر ہے اور یہ اتحاد صحابہ سے اُمت کی عقیدت، صحابہ کے باہمی تعلق اور خلفائے اسلام پر اُن کے غیر متزلزل اعتماد کی وجہ سے مستحکم ہے۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو صحابہ سے بداعتماد کرنے اور منصب خلافت ہی کو متنازعہ بنانے کی کوشش شروع کردی۔

نئے عقائد کی تدویج:

مسلمانوں کا مزاج اب تک ہنگاموں اور شورشوں سے بہت دور تھا اس لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ خلیفہ اور صحابہ کرام

① تاریخ دمشق: ۲۹/ ۵ و ۹ ② البدایۃ والنھایۃ: ۱۰/ ۲۶۳

کی کردار کشی پر مبنی اپنے منفی خیالات کو محبت اور عقیدت کا مثبت رنگ دے کر پیش کیا جائے۔ ابن سبا نے پہلا عقیدہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر معمولی اظہار محبت کی شکل میں پیش کرتے ہوئے پرچار کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً عیسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں۔ لہٰذا وہ دنیا میں ضرور واپس آئیں گے۔"① اس کی دلیل کے طور پر وہ یہ آیت پڑھتا:

"اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ"

"بے شک جس نے تم پر قرآن نازل کیا ہے وہ ضرور تمہیں تمہاری منزل پر لوٹائے گا۔"②

یہ آیت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے ہجرت کے وقت اتری تھی، یہ بتا رہی تھی کہ اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شہر میں عزت کے ساتھ واپس لے آئے گا۔ مگر تفسیر سے ناواقف لوگ آیت کا وہی مطلب مان لیتے جو ابن سبا انہیں بتاتا۔

ابن سبا اگلا سبق یہ پڑھاتا: "ہر نبی کا ایک وصی یعنی جانشین ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خاتم الاوصیاء۔" ہم خیال لوگوں کو وہ اگلے مرحلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے خلاف بغاوت پر اکساتے ہوئے کہتا "اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل نہ ہونے دے اور نبی کے وصیت کردہ فرد کا حق غصب کرلے اور خود اُمت کے معاملات کا مالک بن جائے۔"

جب یہ ناسمجھ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت کا غاصب ماننے لگتے تو ابن سبا انہیں بھڑکاتے ہوئے کہتا: "نبی کے وصی کی موجودگی میں عثمان نے خلافت پر ناحق قبضہ کیا ہوا ہے، اب اس تحریک کو لے کر اُٹھو اور حرکت میں آجاؤ۔"③

فتنے کے تین مراکز: کوفہ، بصرہ، مصر:

تاریخ بتاتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں جنم لینے والے اس پہلے سیاسی ونظریاتی فتنے کے مراکز تین شہر تھے: کوفہ، بصرہ اور مصر کا صدر مقام فسطاط۔ ان تینوں شہروں کو آباد ہوئے تقریباً بیس برس ہوگئے تھے۔ مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگ اپنے آبائی علاقوں سے نقل مکانی کر کے یہاں آگئے تھے اور ایک ملی جلی معاشرت وجود میں آگئی تھی۔ پھر یہ شہر تجارتی مراکز بھی تھے اس لیے ہر وقت ہر قسم کے لوگوں کی آمد ورفت ہوتی رہتی تھی۔ تجارت کی وجہ سے یہ تینوں شہر بہت جلد گنجان ہوگئے۔ یہ بات تاریخی تجربات سے ثابت ہے کہ نئے شہروں میں جہاں مخلوط اور گنجان آبادی ہو اور تجارتی نقل وحرکت جاری رہتی ہو، کئی پیچیدہ مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ وہاں جرائم پیشہ افراد یا کسی خفیہ تحریک کے کارکنوں کا آکر بسیرا کرنا اور اپنی سرگرمیاں انجام دینا بھی نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ کوفہ، بصرہ اور مصر کا صدر مقام فسطاط ایسے تین نئے شہر تھے، اس لیے یہاں شرپسندوں کو قدم جمانے کا مل گیا۔④

① البدایہ والنہایہ: ۱۰ ص ۲۶۳ ② سورۃ القصص، آیت: ۸۵ ③ تاریخ الطبری: ۳ ص ۳۳۰، ۳۳۱

④ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان شہروں میں اکثر منافقین اور شرپسند آباد تھے۔ بلکہ وہاں اکثریت صحیح العقیدہ لوگوں ہی کی تھی۔ پہلی صدی ہجری میں وہاں اکابر صحابہ اور جلیل القدر تابعین بکثرت تھے۔ انہی خوبیوں کے باعث حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو عالم اسلام کا سیاسی مرکز بنایا۔ بعد میں بھی وہاں علماء اور صالحین بے شمار تھے۔ کوفہ اور بصرہ تیسری صدی ہجری تک قرأت وحدیث کے عظیم ترین مراکز رہے اور عظیم محدثین کی تعداد کوفہ میں تمام عالم اسلام سے زیادہ رہی۔ نیز علمائے کوفہ فقہ میں تمام اسلامی دنیا میں ممتاز رہے اور فقہ حنفی وہیں سے چلی۔

اسلامی امراء کی کردار کشی کا منصوبہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران شورش پسند تحریک جڑیں پھیلا چکی تھی۔ اس کے لیے ابن سبا نے یہ لائحہ عمل پیش کیا: ”کام کا آغاز عثمان کے عاملین کی کردار کشی کے ذریعہ کرو۔ نیز لوگوں کو نیکی کی تلقین اور گناہوں سے پرہیز کی تاکید کرو تاکہ اُن کے دل جیت سکو۔ پھر انہیں اس تحریک میں شمولیت کی دعوت دو۔“①

اس مہم میں سب سے پہلے کوفہ کے حاکم حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو نشانہ بنایا گیا جنہوں نے حسن انتظام، عدل وانصاف اور عمدہ اخلاق سے سب کے دل جیت رکھے تھے۔ مگر کچھ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شکایت پہنچائی کہ وہ مے نوشی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ بلوالیا اور فریقین کو سامنے کھڑا کر معاملے کو سنا۔ گواہوں نے گواہی دے دی کہ انہوں نے ولید بن عقبہ کو شراب کی قے کرتے دیکھا ہے۔ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے گواہوں کو اوباش اور جھوٹا قرار دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی شرافت پر یقین تھا مگر عدالت میں فیصلہ کرتے وقت گواہی کو دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اس سزا میں آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، ہمیں تو اس کے مطابق عمل کرنا ہوگا، جیسے بات ہم تک لائی گئی ہے۔ اس کے بعد جو بھی حقیقت میں زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچ سکتا اور جس پر ظلم ہوگا، اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر محفوظ رہے گا۔“②

آپ رضی اللہ عنہ نے ولید رضی اللہ عنہ پر حد جاری فرمائی③ اور انہیں معزول کر کے سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا حاکم بنا دیا۔ یہ واقعہ سن ۳۰ ہجری کا ہے۔④ یوں آپ رضی اللہ عنہ نے انصاف کا سر اُونچا کر دیا اور مفسدین کے پاس کوئی بہانہ نہ رہنے دیا۔

براہِ راست خلیفہ پر الزام تراشی:

کچھ دنوں بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے مشورے سے اُمت کو قرآن مجید کے ایک رسم الخط پر متفق کرنے کی مہم شروع کی اور سرکاری نگرانی میں تیار کردہ تصدیق شدہ نسخے کے سوا کلام اللہ کے تمام نسخے ختم کرا دیے۔ اہل فکر ونظر نے اسے سراہا مگر سازشی عناصر نے اسے ایک گھناؤنے جرم کا رنگ دے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جی بھر کے کوسا۔ بہر کیف تمام صحابہ کرام اس مسئلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہم خیال تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود فرماتے تھے: ”عثمان نے یہ کام ہماری تائید کے ساتھ کیا تھا، اگر یہ معاملہ میرے سپرد ہوتا تو میں بھی حضرت عثمان ہی کی پیروی کرتا۔“⑤

عبداللہ بن سبا شام میں

اب تک ابن سبا کی مہم کو شام میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی، جس کی وجہ شام کے حاکم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مضبوط انتظامی گرفت تھی۔ ابن سبا نے خود وہاں پہنچ کر لوگوں کو بہکانے کی کوششیں کیں۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے اس کی بدنیتی کو بھانپ لیا اور بولے: ”تو ہے کون؟ بخدا میرا خیال ہے تو اب بھی یہودی ہی ہے۔“

---

① تاریخ الطبری: ۳۳۱/۴ ④ تاریخ الطبری: ۴/ص ۲۷۱ تا ۲۷۵

② صحیح البخاری، ح: ۳۸۷۲ ③ الکامل فی التاریخ: سنة ۳۰ھ ⑤ الکامل فی التاریخ: سنة ۳۰ ہجری

ابن سبا نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو بھی ورغلانے کی کوشش کی مگر وہ اسے پکڑ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے۔ انہوں نے تنبیہ کر کے اسے چھوڑ دیا کیوں کہ اس کے خلاف کوئی عدالتی ثبوت موجود نہ تھا۔ ①

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے معاملہ:

شام میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بھی تھے جو اپنے اجتہاد کی بناء پر لوگوں کو تاکید کر رہے تھے کہ وہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔ اس صورتحال میں ڈر تھا کہ کہیں امیر و غریب کے درمیان طبقاتی کشمکش کی نوبت نہ آجائے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس صورتِ حال کی اطلاع دی تو آپ رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا:

''فتنے کی جڑیں نمودار ہو چکی ہیں، وہ عن قریب پھیلنے والا ہے، تم اس زخم کو مت کریدنا۔ جہاں تک ہو سکے تم عوام کو سنبھالے رکھو اور اپنے آپ کو بھی۔ ہاں ابوذر رضی اللہ عنہ کو احترام کے ساتھ راہبر اور سامانِ سفر دے کر میرے پاس بھیج دو۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حکم کی تعمیل کی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ وہ مدینہ میں قیام کریں مگر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے دور ''ربذہ'' کے نخلستان میں رہنا پسند کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں اونٹوں کا ایک ریوڑ اور دو غلام دے دیے تا کہ اُن کی اچھی طرح گزر بسر ہوتی رہے۔

اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک مناسب اور متوازن فیصلے کے ذریعے ایک طرف شام میں طبقاتی کشمکش کے خطرے کو دور کر دیا، دوسری طرف ایک جلیل القدر صحابی کی عزت و احترام میں بھی کمی نہ آنے دی۔ ②

مگر سازشی گروہ نے اس بات کو بھی اُچھالنا شروع کر دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک عظیم صحابی سے بدسلوکی کی اور انہیں جلاوطن کرایا۔

ابن سبا کا اثر مصر میں:

اگلے سال سن ۳۱ ہجری میں سازشی عناصر مصر میں زیادہ متحرک رہے۔ یہاں مشہور کیا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ حاکم مصر حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ نااہل ہیں۔ کچھ لوگ حقائق سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان میں محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابی بکر جیسے قریشی نوجوان بھی تھے۔ سن ۳۲ ہجری میں بحیرۂ روم میں ''ذات الصواری'' کی خون ریز جنگ کے دوران مجاہدین نے محمد بن ابی حذیفہ اور محمد بن ابی بکر کو مسلمانوں سے الگ دیکھا، وجہ پوچھی تو پتا چلا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اتنے بدظن ہیں کہ ان کے مقرر کردہ امیر عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کے تحت لڑنا گوارا نہیں کرتے۔ ③

---

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۲۸۳، ۲۸۴

② تاریخ الطبری: ۳/ص: ۲۸۴، ۲۸۵

③ تاریخ الطبری: ۳/ص ۲۹۲

سازشی تحریک کا ڈھانچا:

سازشی تحریک کے اجزائے ترکیبی اس طرح تھے:

❶ کچھ لوگ تحریک کے اصل منصوبہ ساز تھے۔ یہ وہ یہودی تھے جو شروع سے اسلام کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں مصروف رہے تھے۔ ان میں سے صرف عبداللہ بن سبا کا نام ملتا ہے۔ (۱)

❷ دوسری قسم کے لوگ وہ تھے جن کی طبیعت باغیانہ تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر ان عرب قبائل کے تھے جو قریش کی سیادت سے جلنے لگے تھے۔ (۲)

❸ تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جو دین داری کے غرور وتکبر کا شکار تھے۔ ان میں تنقید کا مادہ بہت زیادہ تھا، اس لیے یہ لوگ بعد میں اس تحریک سے الگ ہو کر ''خوارج'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ (۳)

❹ چوتھی قسم کے لوگ وہ تھے جنھیں حکومت نے کسی جرم پر سزا دی تھی۔ وہ انتقام لینا چاہتے تھے۔ (۴)

❺ پانچویں قسم کے لوگ وہ تھے جو دولت کے بھوکے تھے۔ سرکاری خزانوں میں محصولات کی مد میں جمع ہونے والے پیسے کو اپنی مٹھی میں لینے کے لیے بے تاب تھے۔ (۵)

❻ کچھ وہ نوجوان تھے جو من پسند عہدے نہ ملنے کی وجہ سے اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔

❼ باقی سادہ لوح عوام تھے جن میں کسان، مزدور، غلام وغیرہ شامل تھے۔

تحریک میں شامل خاص ارکان کو ''سبائی'' یا ''سَبَئِیَّہ'' کہا جاتا تھا، یہ لفظ قدیم تواریخ میں جا بجا آتا ہے۔

۳۳ ہجری کا آغاز، نئے حوادث:

۳۳ ہجری اس حال میں شروع ہوا کہ سازشی گروہ خاموشی سے اپنا کام کر رہا تھا، خصوصاً کوفہ اور بصرہ میں ان کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ کوفہ کے حاکم حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ تھے اور بصرہ کے حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ۔ سن ۳۳ ہجری میں کوفہ اور بصرہ میں دو واقعات ایسے پیش آئے کہ حکام کو معمول سے ذرا ہٹ کر تادیبی اقدامات کرنا پڑے۔ پہلا واقعہ کوفہ میں پیش آیا، وہاں حاکم شہر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کی مجلس میں چند عرب شہریوں نے ایک نوجوان کو صرف اس لیے زدوکوب کیا کہ اس نے حکام کی تعریف میں کوئی بات کہہ دی تھی۔ یہ اشتعال انگیز حرکت ایسی نہ تھی کہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے ان لوگوں کو تادیب کے لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام بھیج دیا گیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کی معاشرتی حیثیت کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں مہمانوں کی طرح ٹھہرایا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے تھے کہ اصل میں یہ لوگ احساس کمتری اور جلن کے مریض ہیں، قریش کی

---

(۱) تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۴۰، ۳۴۱

(۲) تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۲۶، ۳۲۷ (۳) مصنف ابن ابی شیبہ، ما ذکر فی الخوارج

(۴) تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۱۸ (۵) تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۲۳

سیادت سے حسد کررہے ہیں۔ انہوں نے نرمی سے سمجھانے کے بعد ان سے فرمایا: ”اچھا جو چاہو کرو مگر اللہ کی شریعت کو ترک نہ کرنا۔ اللہ کی نافرمانی کے سوا تمہاری ہر بات قابل برداشت ہے۔“ ساتھ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے بارے میں لکھ بھیجا: ”یہ بے عقل لوگ ہیں، عدل وانصاف دیکھ دیکھ کر اکتا گئے ہیں۔“ ①

اس دوران حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے جو حمص کے والی تھے، ان کی حرکتوں سے آگاہ ہو کر انہیں اپنے ہاں طلب کرلیا اور ذرا سخت تنبیہ کی۔ ان لوگوں نے اپنی حرکتوں کی معافی مانگی تو حضرت عبدالرحمن بن خالد رضی اللہ عنہ نے انہیں آزاد کردیا۔ ②

ابن سبا عراق میں:

کوفی گروہ اپنی بدتمیزیوں سے توبہ تائب ہوا تو انصاف پسند حکام کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا ناکام ہوگیا۔ عبداللہ بن سبا اس پر بہت جھنجھلایا اور خود بصرہ پہنچ کر خفیہ ذہن سازی شروع کردی۔ حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو عبداللہ بن سبا کو پکڑ لیا اور علاقے سے بھگادیا۔ ابن سبا اب کوفہ پہنچا۔ یہاں نئے گماشتے تیار کررہا تھا کہ حاکم شہر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو اس کی موجودگی کا پتا چل گیا۔ انہوں نے بھی اسے شہر بدر کردیا۔

ابن سبا نے مصر واپس آکر کوفہ اور بصرہ میں اپنے حامیوں سے خفیہ خط وکتابت جاری رکھی۔ ان کا مقصد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمال کو بدنام کر کے معزول کرانا اور خلافت کو متنازعہ بنانا تھا۔ ③

۳۴ ہجری۔ جب سازشی عناصر منظر عام پر آئے:

سن ۳۴ ہجری کا آغاز ہوا تو کوفہ کی شر پسند جماعت اپنے حاکم حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے خلاف احتجاج کے لیے تیار تھی۔ حاکم شہر حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مشورے کے لیے مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے۔ اس دوران مقامی شورش پسند لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمال کو معزول کرنے کا مطالبہ لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا ایک ٹولہ اپنے مطالبات لے کر مدینہ منورہ روانہ ہوا، راستے میں حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ واپس آتے ہوئے ملے۔ کوفہ کے شرپسندوں نے کہا: ”اللہ کی قسم! ہماری ان تلواروں کے ہوتے ہوئے سعید کوفہ میں داخل نہیں ہونے پائے گا۔“ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نے کوفیوں کو راستہ روکنے پر مصر پایا تو بولے:

”اس کام کے لیے ایک نمایندے کو امیر المؤمنین کی طرف اور ایک کو میرے پاس بھیج دینا کافی تھا۔“

یہ کہہ کر وہ واپس مدینہ منورہ پہنچے اور امیر المؤمنین کو ساری صورتِ حال بتائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مفاہمت کا پہلو اختیار کیا اور احتجاج کرنے والوں کے مطالبے کے مطابق حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا حاکم مقرر فرمادیا۔ ④

---

① تاریخ الطبری: ۳ص: ۳۱۸ تا ۳۲۱، ۳۲۸ ② تاریخ الطبری: ۳ص ۳۲۱، ۳۲۲
③ تاریخ الطبری: ۳ص ۳۲۶، ۳۲۷ ④ تاریخ الطبری: ۳ص ۳۳۵، ۳۳۶

فتنے کا عروج اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محتاط اقدامات

ان ایام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال کو مدینہ منورہ طلب کر کے عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کے بارے میں مشورہ کیا۔ سب کا اتفاق تھا کہ ایک گروہ مذموم مقاصد لے کر بھولے بھالے عوام کو بھڑکا رہا ہے۔ مجلس مشاورت میں کسی حاکم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فیصلوں، اقدامات اور رویے کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا۔ صرف حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کچھ تنقید کی مگر پھر تنہائی میں خود ہی وضاحت کر دی کہ مقصد صرف یہ تھا کہ جو لوگ حکومت کے مخالف ہیں وہ میرے سامنے اپنے دل کی باتیں کھول دیں اور ان کی اصلاح کی جاسکے۔

بصرہ کے حاکم حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''لوگوں کو جہاد میں مشغول کر دیں تاکہ کسی اور طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ رہے۔'' شام کے والی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رائے دی: ''آپ افواج کے امراء سے کام لیں کہ ہر ایک اپنے علاقے کے لوگوں کو قابو میں رکھے۔ شام والوں کا ذمہ میں لیتا ہوں۔''

مصر کے حاکم حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا: ''لوگوں پر خوب خرچ کر کے ان کی ہمدردیاں جیت لیں۔''

حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا: ''مرض کی جڑ کاٹ ڈالی جائے، یعنی عوام کو مشتعل کرنے والے لوگوں کے خلاف سخت کارروائی کر کے انہیں نشانِ عبرت بنا دیا جائے، باقی لوگ خود تتر بتر ہو جائیں گے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو سن کر کہا: ''اگر کچھ اندیشے لاحق نہ ہوتے تو یہی کرنا چاہیے تھا۔''

دراصل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ اگر زیر زمین منفی سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے آہنی ہاتھ استعمال کیا جائے تو پکڑ دھکڑ میں ثبوت اور یقینی شہادتوں کا وہ معیار قائم نہیں رہ سکتا جو عدالت اور قانون سے مطابقت رکھتا ہے۔ ایسے میں مخبری اور خفیہ اطلاعات پر ہی کارروائیوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مجرموں کے ساتھ ساتھ بہت سے بے گناہ بھی لپیٹ میں آجاتے ہیں، اس طرح تشدد، تشدد کو اور قانون سے ماوراء اقدامات لاقانونیت کو جنم دیتے ہیں، ان پہلوؤں کے پیش نظر امیر المؤمنین نے کسی سخت اقدام کی اجازت نہ دی اور عمال کو اس تائید کے ساتھ رخصت کر دیا کہ لوگوں کو جہاد کے لیے بھیجنے کی تیاری کی جائے۔ اس حکمتِ عملی کے مطابق اس سال کوفہ سے سرکردہ امراء فوجیں لے کر ہر طرف نکلے، بہت کم صحابہ کوفہ میں باقی رہے۔ اس لیے شہر اکابر سے خالی لگتا تھا۔ [1]

پروپیگنڈا اور تین جھوٹے الزام:

منافقین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فضا عام کرنے کے لیے یہ تین الزامات بہت مشہور کر دیے تھے:

1. وہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوئے۔ 2. غزوۂ احد سے فرار ہوئے۔
3. بیعتِ رضوان میں شرکت نہ کی۔

[1] تاریخ الطبری: ۳/۳۳۱ ھ ۳۳۱

مگر صحابہ کرام نے ان اشکالات کی جا بجا تردید کی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے ایسی باتیں کی تھیں تو انہوں نے واضح فرمایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے حکم پر آپ ﷺ کی صاحبزادی (رضی اللہ عنہا) سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لیے رک گئے تھے۔ اس بنا پر غزوۂ بدر میں ساتھ نہیں تھے۔ تاہم حضور ﷺ نے انہیں جنگ میں شریک سمجھتے ہوئے مجاہدین کے برابر مال غنیمت سے حصہ بھی دیا تھا۔

غزوۂ اُحد سے فرار ہونے کے الزام کا جواب دیتے ہوئے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے وضاحت کی کہ اس خطا کی معافی کا اعلان خود قرآن مجید نے کر دیا تھا لہٰذا کسی کو اعتراض کا حق نہیں رہتا۔ رہی بات بیعت رضوان میں شرکت نہ کرنے کی، تو یہ بات جہالت کی بدترین مثال ہے کیوں کہ بیعت رضوان کا انعقاد ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خاطر ہوا تھا۔ انہیں قریش نے نظر بند کر رکھا تھا اور ان کی شہادت کی افواہ پھیل گئی تھی، جس پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کی بیعت لی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کی جگہ آپ ﷺ نے خود اپنا ہاتھ رکھا۔ ①

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اقربا نوازی کا الزام:

بعض لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اقربا پروری کا الزام لگاتے تھے۔ مفسدین کے الزامات میں سے بھی ایک بڑا الزام یہی تھا۔ درج ذیل حقائق اس الزام کی نفی کرتے ہیں:

(۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے عہدیداروں میں ان کا کوئی بیٹا یا داماد شامل نہ تھا، حالاں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عمر ستر اسی کے درمیان تھی اور آپ کے بیٹوں میں سے بعض جوان اور بعض ادھیڑ عمر ہو چکے تھے۔ سب کے سب نہایت لائق اور قابل تھے۔ آپ کے نو بیٹے تھے، دو بیٹوں: عبداللہ اور عبدالملک نے کم سنی میں وفات پائی تھی، باقی سات لڑکے: عبداللہ اصغر، عمرو، خالد، ابان، عمر، ولید اور سعید جوان ہوئے اور علم و فضل کی بلندیوں کو پہنچے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں کبھی ان کو آگے لانے کی کوشش نہیں کی۔

بعد میں حضرت سعید رحمہ اللہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابان رحمہ اللہ نے عبدالملک بن مروان کے دور میں حکومتی عہدوں پر فائز ہو کر شہرت پائی مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بقیہ پانچ بیٹوں کو دنیا جانتی تک نہیں اور جس کو جانتی ہے وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اتنے گم نام رہے کہ اس دور کی تاریخ میں ان کا نام کسی واقعے میں برسبیل تذکرہ بھی بمشکل ملے گا۔ کیا اپنی اولاد کو پیچھے رکھنے کی شعوری کوشش کے بغیر ایسا ہو سکتا ہے کہ لوگ اتنے بڑے حکمران کے صاحبزادوں کے ناموں تک سے واقف نہ ہوں؟ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سات بیٹیاں تھیں مگر اپنے کسی داماد کو آپ رضی اللہ عنہ نے کوئی حکومتی عہدہ نہیں دیا۔ عام لوگ آج تک آپ کے دامادوں کے ناموں سے انجان ہیں۔

① وبعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عثمان، وکانت بیعۃ الرضوان بعد ما ذھب عثمان الی مکۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ
الیمنی: ھذہ ید عثمان ...

② آپ رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ کے رشتہ داروں میں سے بعض حضرات ممتاز عہدوں پر تھے مثلاً حضرت معاویہ، حضرت ولید بن عقبہ، حضرت سعید بن العاص، حضرت عبداللہ بن عامر، حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہم۔ مگر یہ بات خلافِ شرع ہرگز نہ تھی۔ "سورۂ طٰہٰ" کی آیت ۲۹: وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ (اور میرے لیے بنا دے ایک مددگار میرے گھر والوں سے) بتاتی ہے کہ اگر کام کی صلاحیت دیکھ کر کسی رشتہ دار کو اہم ذمہ داری دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔[1]

③ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جن اقارب کو عہدے دیے یا ان کے اختیارات بڑھائے، تاریخ سے ثابت ہے کہ انہوں نے توقع سے بڑھ کر اچھی کارکردگی دکھائی۔[2] یوں یہ صورتحال قابلِ اعتراض نہیں بلکہ قابلِ تحسین تھی۔

ابن سبا کا نیا کھیل:

اگلے مرحلے میں عبداللہ بن سبا کے گروہ نے ایک شہر سے دوسرے شہر کے لوگوں کے نام جھوٹے خطوط لکھے جن میں حکومت کے جبر وتشدد اور عوام کی مظلومیت کے افسانے تھے۔ حکومت کی زیادتیوں کے یہ افسانے اس مہارت سے پھیلائے گئے کہ ہر شہر کے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ہمارے شہر کو چھوڑ کر باقی عالمِ اسلام میں ظلم وستم کا بازار گرم ہے۔ چونکہ یہ محض پروپیگنڈا تھا اسی لیے کسی صوبے یا شہر کے لوگوں کو خود حکومت کی جانب سے کسی زیادتی کا تجربہ[3] نہیں ہوا تھا مگر ہر کوئی یہ تصور کر رہا تھا کہ باقی ملک میں نظام بگڑ چکا ہے اور لوگ بڑی تکلیف میں ہیں۔

یاد رہے کہ بعض جھوٹی روایات میں ہے کہ سن ۳۴ ہجری میں مدینہ کے صحابۂ کرام نے اُمت کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت پر اُکسایا اور خطوط لکھ کر دعوت دی کہ جہاد کرنا ہے تو ہمارے ہاں آ کر کرو۔[4] لیکن یہ روایات محض سبائی پروپیگنڈے کی پیداوار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خود سبائیوں نے بعض جعلی خطوط مدینہ کے صحابۂ کرام کی طرف منسوب کر کے مشہور کر دیے تھے اور سبائی راویوں نے انہیں صحابۂ کرام کے اصل خطوط قرار دے دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تحقیقاتی وفد:

افواہوں کا زور دیکھ کر اہلِ مدینہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے وضاحت چاہی۔ آپ نے تردید کی اور فرمایا: "ہر جگہ امن وسلامتی ہے۔" مزید تسلی کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام کا ایک تحقیقاتی وفد تشکیل دے کر ہر صوبے کے حالات کی تفتیش کرائی۔ یہ حضرات ہر صوبے میں عوام وخواص سے مقامی حکام کے کردار اور رویے کے بارے میں پوچھ گچھ کر کے واپس آئے اور بتایا: "ہم نے کوئی گڑبڑ نہیں دیکھی۔ کسی کو کوئی شکایت نہیں۔"[5]

① معارف القرآن، از حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ: ۶/۱۰۷
② ان فتوحات اور کارناموں کی مختصر روداد گزر چکی ہے اور مزید تفصیل تاریخ خلیفہ اور تاریخ الطبری میں ۲۷ھ تا ۳۳ھ کے تحت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔
③ تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۳۱
④ تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۳۶

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نے اپنی زیادتیوں کا اعتراف تو کر لیا ہے مگر اپنی روش چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ اس طرح خلیفہ کے خلاف عوام کو مشتعل کیا جائے۔ رجب، سن ۳۵ ہجری میں سبائیوں کا یہ وفد مصر سے روانہ ہوا۔ مصر کے والی عبداللہ بن سعد ان کی حرکات سے باخبر تھے، اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا کہ یہ لوگ دراصل آپ کو معزول کرنے کے درپے ہیں۔ ①

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو مسجد نبوی میں سر عام بات چیت کا موقع دیا۔ صحابہ کرام نے اتفاق رائے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ وفد کے ارکان کو بغاوت کے ارتکاب میں قتل کر دیا جائے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شکایت کنندگان کو شک کا فائدہ دے کر ان کے خلاف کسی کارروائی کی اجازت نہ دی، بلکہ خود محاسبے کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پسند کیا۔ ② آپ نے قرآن مجید کا نسخہ منگوایا، کھول کر سامنے رکھا، وفد کے الزامات سنے اور ایک ایک بات کا واضح جواب دیا۔ آپ ہر سوال کا تسلی بخش جواب دے کر پوچھتے: ''اور کوئی بات ہو تو کہو۔'' ③

ان بے بنیاد الزامات سے اپنی برأت ظاہر کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان شرپسندوں کو اصلاحِ احوال کا موقع دے کر واپس جانے دیا۔ ④

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے نرم ترین سلوک اور باعزت آزادی کے بعد بھی یہ لوگ ذرا نہ شرمائے۔ واپس جا کر انہوں نے مشہور کر دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سب کے سامنے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کو قبول کر لیا ہے، جس کے بعد انہیں مستعفی ہو جانا چاہیے تھا مگر نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی عہدے سے مستعفی ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی گروہ کے لوگوں کے دلوں میں یہ بات بھی بٹھا دی گئی تھی کہ خلیفہ بڑھاپے میں حکومتی ذمہ داریاں انجام دینے کے قابل نہیں۔ ان سے حکومت لے کر کسی قابل ترین صحابی کے ہاتھ دے دی جائے تو اس میں مسلمانوں کا بھلا ہے۔

اس کے فوراً بعد مفسدین نے مدینہ منورہ کے اکابر صحابہ: حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے جعلی خطوط تیار کرا کے راتوں رات کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے بڑے شہروں میں پھیلا دیے جن میں اکابر صحابہ کی طرف سے عوام کو دعوت دی گئی تھی کہ اگر انہیں جہاد کرنا ہے تو وہ احتجاجی تحریک کا حصہ بن کر مدینہ طیبہ آجائیں اور حکومت کی تبدیلی کی کوششوں میں ان کا ساتھ دیں۔ ⑤

شورش پسندوں کی روانگی:

اب سبائی مدینہ جانے کے لیے تیار ہوئے۔ ایک قافلہ کوفہ میں، ایک بصرہ میں اور ایک مصر میں تشکیل دیا گیا۔ فسادی سرغنوں کے ذہنوں میں کارروائی کا مکمل خاکہ موجود تھا، جس کا اظہار انہوں نے یوں کیا: ''ہم حاجیوں کے بھیس میں نکل کر مدینہ پہنچیں گے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کر کے انہیں معزول کر دیں گے۔ وہ نہ مانے تو انہیں

---

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۵۷
② تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۴۷　③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۰۸، ۱۰۹
④ تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۴۸　⑤ البدایہ والنہایہ: ۱۰/ص ۲۷۷

قتل کر دیں گے۔"[1] مقصد یہ تھا کہ ایک متفقہ اور متحدہ خلافت سبوتاژ ہو جائے اور مسلمان سیاسی لحاظ سے مختلف ٹکڑوں میں بٹ جائیں، اس کے لیے بصرہ کے شورش پسندوں کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا جائے گا۔ کوفہ کے قافلے کو یہ ہدف دیا گیا تھا کہ وہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنوائیں۔ مصر والے شورش پسندوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔[2]

شوال ۳۵ھ میں کوفہ، بصرہ اور مصر سے یہ قافلے روانہ ہوئے۔ ہر قافلے میں ایک ہزار کے لگ بھگ افراد تھے۔[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکام اور دوسرے اکابر ان سرگرمیوں اور ان کے ممکنہ نتائج سے بے خبر نہ تھے۔ کوفہ میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف لوگ خروج کے لیے نکلے ہیں، اس کا کیا انجام ہوگا تو بلا تامل فرمایا: "بخدا! یہ لوگ انہیں قتل کر کے چھوڑیں گے، پھر ان کا مقام جنت میں ہوگا اور ان کے قاتل اللہ کی قسم! جہنمی ہوں گے۔"[4]

مفسدین مدینہ کے باہر:

مدینہ منورہ اسلامی شہروں کے درمیان واقع تھا۔ دور دور تک کسی کافر ملک کی کوئی سرحد نہیں تھی، اس لیے یہاں حفاظتی انتظامات کی کوئی ضرورت نہیں تھی، چنانچہ مدینہ میں فوج برائے نام ہی ہوا کرتی تھی۔ شوال کے آخر میں حاجیوں کا بھیس دھارے فسادیوں کے تینوں قافلے مدینہ منورہ سے اڑتالیس میل دور پہنچ گئے۔ عام کارکنوں کو یہاں ٹھہرا کر ان کے قائدین کچھ لوگوں کے ساتھ آگے روانہ ہو گئے۔ دراصل عام لوگوں کو یہی سمجھا کر لایا گیا تھا کہ مدینہ میں ایک ظالم حکومت مسلط ہے جس سے خود صحابہ بے زار ہیں۔ اس تاثر کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اپنے آدمیوں کو دیر تک مدینہ کے اصل حالات سے بے خبر رکھا جائے اور بعد میں بوقت ضرورت یکدم مشتعل کر کے آگے لایا جائے۔

قافلے کے قائدین اپنے ساتھیوں کے ساتھ محتاط انداز سے مدینہ میں داخل ہوئے۔ جب انہوں نے امہات المؤمنین، حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی تو ہر ایک کو اپنی تحریک سے نالاں پایا۔ شورش پسندوں نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معزولی کا مطالبہ کرنے کی بجائے صرف اتنا کہا:

"ہم تو کچھ حکام کو معزول کرانے کا مطالبہ لے کر آئے ہیں۔" مگر اکابر صحابہ میں کسی نے ان کو منہ نہیں لگایا۔[5]

حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فضا بنانے کے لیے ان کا نام استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ حضرات مدینہ کے باہر الگ الگ دستوں کے ساتھ کھڑے ہو گئے، کیوں کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لیے بہت فکر مند تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو اور اسی طرح حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں بیٹوں کو ذمہ داری سونپ دی تھی

---

[1] تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۴۶ [2] تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۵۰

[3] تاریخ الطبری: جلد ۳ ص ۳۴۸، ۳۴۹ [4] مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۶۶۷، ط الرشد

[5] تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۵۰

کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذاتی حفاظت کے لیے چوکس رہیں۔ ① حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود بھی مدینہ کی حفاظت کے لیے ضروری انتظامات سے غافل نہیں تھے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے محمد بن مَسلَمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پچاس گھڑسواروں کا دستہ ذوخشب کی طرف بھیج دیا تھا۔ اس لیے فسادی اس وقت مدینہ میں گھسنے کی جرأت نہ کرسکے۔ ②

مصری بلوائیوں کے سرکردہ لوگ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو مدینہ کے باہر فوجی دستے سمیت موجود تھے، بلوائیوں نے پیش کش کی کہ وہ انہیں خلیفہ ماننے کے لیے تیار ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور فرمایا: ''نیک لوگ جانتے ہیں کہ ذی مروہ اور ذی خشب میں ٹھہرنے والے قافلوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے لعنت کی گئی ہے۔'' بصرہ کے فسادی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس یہی پیش کش لے کر پہنچے، مگر انہیں بھی یہی جواب ملا۔ کوفہ کے بلوائی سرداروں کو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بالکل یہی جواب ملا۔ ③

غرض اکابر صحابہ سازش کے جال میں نہ آئے اور اُمت کو تین ٹکڑوں میں بانٹنے کی سبائی سازش کو ناکام بنا دیا۔

❁❁❁

مذاکرات اور مفسدین کی واپسی

اکابر صحابہ کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر یہ لوگ بظاہر نرم پڑ گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کی مکمل تسلی کے لیے بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا: ''تمہیں قرآن کے مطابق حقوق ملیں گے۔''

ان میں سے کچھ لوگ آپس میں کہنے لگے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد اور امیر المؤمنین کے نمائندے اللہ کی کتاب کے مطابق بات کررہے ہیں، اسے قبول کرلینا چاہیے۔'' ④

قضیے کو حتمی طور پر نمٹانے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے باہر ایک بستی میں آکر عام کچہری لگائی۔ ⑤ (اس مجلس میں اکثر لوگ وہ تھے جنہیں ورغلا کر لایا گیا تھا۔) قرآنِ مجید کھولا گیا۔ بلوائی مختلف آیاتِ قرآنی پڑھ کر خلیفہ ثالث کے بعض اقدامات پر اعتراضات کرتے رہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہر بات کا تسلی بخش جواب دیتے گئے۔ ⑥

فسادیوں کے اعتراضات اور ان کے جوابات:

پہلا اعتراض: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ''نقیع'' کی چراگاہ کو اپنے لیے مخصوص کرکے اسے ''حمیٰ'' (علاقہ ممنوعہ) قرار دے دیا ہے اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ نہیں اٹھانے دیتے، جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: (لَاحِمَى اِلَّا لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ۔) (اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کو ایسی حد بندی کا اختیار نہیں۔)''

---

① تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۵۰
② تاریخ دمشق لابن عساکر: ۳۹/۳۲۲
③ تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۵۰ ④ تاریخ دمشق: ۳۹/۳۲۸
⑤ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۶۹۰ ⑥ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۶۹

جواب: یہ سلسلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے جاری تھا جنہوں نے صدقات کے اونٹوں کے لیے چراگاہیں مخصوص کی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں صدقات کے اونٹ اور مجاہدین کے گھوڑے زیادہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا چراگاہوں کا رقبہ بڑھا دیا گیا۔ پس یہ اقدام حدیث نبوی میں بیان کی گئی ممانعت کے خلاف نہ تھا۔ یہ ترقی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذاتی مویشیوں کی نہیں، سرکاری اموال کی تھی۔ ①

دوسرا اعتراض: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے باقی نسخے تلف کر کے ایک نسخے کو رائج کیا۔

جواب: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام صحابہ کے مشورے اور اتفاق سے کیا تھا اور ڈر تھا کہ قرأت میں اختلاف نہ ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''یہ صحابہ کا اجماعی فیصلہ تھا۔ اگر میں خلیفہ ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔'' ②

تیسرا اعتراض: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حج کے موقع پر منیٰ میں ظہر، عصر اور عشاء چار چار رکعات پڑھاتے تھے، جبکہ رسول اللہ ﷺ اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما مسافروں کی طرح دو، دو رکعات (قصر) پڑھایا کرتے تھے۔

جواب: حج کر کے واپس جانے والے نومسلموں میں غلط فہمی پھیل رہی تھی کہ ظہر، عصر اور عشاء کی فرض نماز ہر حالت میں دو، دو رکعات ہے اور وہ اپنے علاقوں میں جا کر بھی دو رکعات پر اکتفا کرنے لگے تھے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہاں چار رکعات پوری پڑھانا شروع کیں۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ وہاں مکہ معظمہ میں نکاح کر لیا اور گھر بھی آباد کر لیا۔ اس طرح وہ وہاں شرعاً مقیم کے حکم میں آ گئے۔ ③

چوتھا اعتراض: حکم بن ابی العاص کو حضور ﷺ نے شہر بدر کر دیا تھا۔ حضور ﷺ، حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی زندگی میں انہیں واپس آنے کی اجازت نہ ملی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں واپس مدینہ کیوں بلا لیا؟

جواب: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے سفارش کر کے حکم بن ابی العاص کی سزا بشرطِ توبہ معاف کرنے کی اجازت لے لی تھی مگر دیگر صحابہ کو اس کا علم نہ تھا۔ اس اعتراض کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہی فرمایا کہ حضور ﷺ کافر کی بھی توبہ قبول فرماتے تھے۔ ④ نیز جلاوطنی کی کوئی مدت ہوتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور تک پندرہ سال گزر چکے تھے اور انہیں حکم بن ابی العاص کی صدقِ دل سے توبہ کا بھی یقین ہو گیا تھا، لہٰذا سزا ختم ہونا مناسب تھا۔

پانچواں اعتراض: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے رشتہ دار نوجوانوں کو اعلیٰ عہدے دیے اور اکابر کو معزول کیا۔

جواب: نوجوان اگر قابل ہوں تو انہیں عہدے دینا غلط نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ان کی قابلیت کی بناء پر امیر بنایا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی قابل نوجوانوں کو عہدے دیے تھے۔ یقیناً بعض صحابہ کرام کو عہدوں سے معزول کیا گیا تھا مگر کہیں بھی کوئی ذاتی غرض نہ تھی بلکہ ہر موقع پر کوئی اہم وجہ تھی۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۰۹؛ تاریخ طبری: ۳/۳۴۷؛ فضائل الصحابہ للامام احمد، ح: ۷۶۵، بسند صحیح
② تاریخ الطبری: ۳/۳۴۶؛ تاریخ المدینۃ، عمر بن شبہ: ۳/۱۱۱۳؛ فتح الباری: ۹/۱۸، ط دار المعرفۃ
③ تاریخ الطبری: ۳/۳۹۹، ۳۴۴؛ فتح الباری: ۲/۵۷۱ ④ تاریخ الطبری: ۳/۳۴۷، ۳۹۹، تاریخ المدینۃ لابن شبہ: ۳/ص ۱۰۹۲

کو معزول اس لیے کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت یہی تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اس لیے معزول کیا گیا کہ وہ بیت المال سے قرض لے کر بروقت واپس نہ کرسکے۔ پس عوام کو بدگمانی سے بچانے کے لیے ایسا کرنا پڑا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر سے اس لیے معزول کیا گیا کہ وہاں سے خراج کم وصول ہو رہا تھا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو والی بنایا تو خراج دوگنا ملنے لگا۔ ①

چھٹا اعتراض: عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ والی مصر کو افریقہ کے مالِ غنیمت سے پانچواں حصہ انعام دیا۔

جواب: عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو مالِ غنیمت کے پانچویں حصے کا پانچواں حصہ (چار فیصد) دیا تھا کیوں کہ افریقہ کی مہم سے پہلے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان سے یہ وعدہ ہو چکا تھا، یہ شرعاً غلط نہیں تھا۔ ایسے انعامات حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی دیتے رہے تھے۔ بہر حال جب سپاہیوں نے ناگواری کا اظہار کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی دلجوئی کی خاطر وہ انعام واپس لے کر ان پر تقسیم کر دیا جبکہ وہ ان کا کوئی واجب حق نہ تھا۔'' ②

ساتواں اعتراض: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے اہل خاندان سے محبت کرتے اور انہیں نوازتے ہیں۔

جواب: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

''خاندان والوں سے محبت ضرور کرتا ہوں مگر کسی پر ظلم تو نہیں کرتا، جہاں تک انہیں انعام دینے کا تعلق ہے وہ میں اپنی جیب سے دیتا ہوں۔ بیت المال کی دولت جو عام مسلمانوں کی ہے، میں نہ اپنے لیے اور نہ کسی اور کے لیے حلال سمجھتا ہوں۔ اپنی جیب سے تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے سے عطیے دیتا چلا آرہا ہوں۔ جوانی میں یہ حال تھا تو اب جبکہ زندگی کی شام ہو چکی ہے، میں بھلا کیوں بخل کروں گا۔'' ③

آٹھواں اعتراض: شہر والوں پر مالی بوجھ اور ٹیکس بڑھا دیا ہے۔

جواب: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''جو یہ الزام لگاتا ہے میں اس کے شہر کے محصولات کا کام اس کو سونپتا ہوں۔ میرے پاس تو پیداوار کے پانچویں حصے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اس میں سے بھی میں اپنی ذات کے لیے ایک پیسہ تک حلال نہیں سمجھتا۔ تقسیم کا بھی تمام اختیار دوسرے مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، وہی اس دولت کو عوام پر خرچ کرتے ہیں۔ میں اپنے خرچ کے لیے اس سے کچھ نہیں لیتا۔ اپنی معاش پر انحصار کرتا ہوں۔'' ④

نواں اعتراض: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بنو امیہ کو ناجائز طور پر زمینیں اور نقد رقوم ہدیہ کی ہیں۔

جواب: اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی ذاتی دولت سے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کیا کرتے تھے۔ آخری عمر میں آپ نے اپنی ذاتی جائیداد اور دولت کو بنو امیہ میں اس طرح تقسیم کر دیا کہ اپنی اولاد کو بھی قبیلے کے عام افراد کے برابر حصے دیے، کوئی امتیاز نہیں برتا۔ یہ تو رشتہ داروں سے حسن سلوک کی ایک شاندار مثال تھی۔ ⑤

---

① الکامل فی التاریخ: ۲/۳۵۳؛ تاریخ الطبری: ۳/۳۴۷؛ تاریخ یعقوبی، ص ۱۷۲؛ تاریخ المدینۃ لابن شبہ: ۳/۱۱۱۳
② تاریخ الطبری: ۳/۳۴۷ ③ تاریخ الطبری: ۳/۳۴۷، ۳۴۸ ④ تاریخ الطبری: ۳/۳۴۸ ⑤ ایضاً

دسواں اعتراض: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بنوامیہ کے علاوہ بھی کچھ افراد کو ناجائز طور پر زمینیں ہدیہ کی ہیں۔

جواب: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی:

''یہ مسئلہ مہاجرین وانصار کی ان زمینوں کا ہے جو فتح ہوئیں تو انہیں اس میں حصے ملے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو وہیں ان زمینوں میں آباد ہو گئے، کچھ واپس اپنے گھروں کو آگئے۔ میں نے ان کے مشورے سے وہ زمینیں جو ان کی ملکیت میں باقی تھیں، وہاں کے عرب زمینداروں کو فروخت کردیں۔ قیمت یہاں ان کے حوالے کردی، اب جو کچھ ہے انہی کے پاس ہے، میں نے اپنے لیے کچھ نہیں رکھا۔''①

گیارھواں اعتراض: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سرکاری اموال سے مروان بن الحکم کو پندرہ ہزار اور عبداللہ بن خالد کو پچاس ہزار کا عطیہ دے دیا جو کہ دونوں اموی تھے۔

جواب: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمائی: ''یہ عطیے میں نے اپنے ذاتی مال سے دیے ہیں، وہ بھی اس لیے کہ یہ لوگ غریب ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اس کا حق حاصل ہے لیکن پھر بھی اگر آپ لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں تو مجھے ٹوک دیا کریں۔ میری رائے آپ لوگوں کی رائے کے تابع ہے۔''②

اپنی برأت ثابت کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان شرپسندوں کو اصلاحِ احوال کا موقع دے کر واپس جانے کی اجازت دے دی، حالاں کہ عام لوگ اصرار کررہے تھے کہ انہیں بغاوت کی سزا میں قتل کیا جائے۔③

اس گفتگو میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو کھلے دل کے ساتھ پیش کش کی:

''آپ لوگ جس عامل کو پسند کریں گے میں اس کا تقرر کردوں گا، جسے ناپسند کریں گے اسے ہٹادوں گا۔''④

بدلے میں آپ نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ انتشار نہیں پھیلائیں گے اور جب تک حکومت اپنے عہد پر قائم ہے وہ بھی اُمت کے اجتماعی دھارے میں شامل رہیں گے۔ ان لوگوں نے بظاہر خوشی سے یہ باتیں مان لیں۔⑤

یہ معاہدہ یکم ذوالقعدہ ۳۵ ہجری کو ہوا تھا۔⑥ معاہدے کی اطلاع سے ہر طرف ایک اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور تشویش کے شکار مسلمانوں نے چین کا سانس لیا۔⑦ شورش کی آگ بظاہر ٹھنڈی پڑگئی اور اس فتنہ انگیز تحریک کے کارکن اپنے علاقوں کو واپس روانہ ہونے لگے۔ البتہ ان کے دو سردار: اشتر نخعی اور حکیم بن جبلہ مدینہ منورہ ہی میں رہ گئے۔⑧

جعلی خط اور بلوائیوں کا دوبارہ حملہ:

اگر یہ فطری شورش ہوتی تو اس منصفانہ معاہدے کے بعد ختم ہوجاتی مگر اصل ڈوری چالیں چلنے والے عیاروں کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے طے کرلیا تھا کہ فساد کی آگ کسی نہ کسی بہانے بھڑکا کر رہیں گے۔⑨

---

①تاریخ الطبری: ۳۴۸/۴ ②تاریخ الطبری: ۳۴۵/۴ ③تاریخ الطبری: ۳۴۸/۴

④مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۶۹۱ ⑤تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۶۸ ⑥خلیفہ بن خیاط: ص ۱۶۸

⑦مصنف ابن ابی شیبہ ۳۷۷۵۷، کتاب الجمل ⑧تاریخ الطبری: ۴ص ۳۴۵ ⑨تاریخ الطبری: ۴ص: ۳۵۰

دسواں اعتراض: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بنوامیہ کے علاوہ بھی کچھ افراد کو ناجائز طور پر زمینیں ہدیہ کی ہیں۔

جواب: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی:

''یہ مسئلہ مہاجرین وانصار کی ان زمینوں کا ہے جو فتح ہوئیں تو انہیں اس میں حصے ملے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو وہیں ان زمینوں میں آباد ہوگئے، کچھ واپس اپنے گھروں کو آگئے۔ میں نے ان کے مشورے سے وہ زمینیں جو ان کی ملکیت میں باقی تھیں، وہاں کے عرب زمینداروں کو فروخت کردیں۔ قیمت یہاں ان کے حوالے کردی، اب جو کچھ ہے انہی کے پاس ہے، میں نے اپنے لیے کچھ نہیں رکھا۔''①

گیارھواں اعتراض: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سرکاری اموال سے مروان بن الحکم کو پندرہ ہزار اور عبداللہ بن خالد کو پچاس ہزار کا عطیہ دے دیا جو کہ دونوں اموی تھے۔

جواب: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمائی: ''یہ عطیے میں نے اپنے ذاتی مال سے دیے ہیں، وہ بھی اس لیے کہ یہ لوگ غریب ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اس کا حق حاصل ہے لیکن پھر بھی اگر آپ لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں تو مجھے ٹوک دیا کریں۔ میری رائے آپ لوگوں کی رائے کے تابع ہے۔''②

اپنی برأت ثابت کرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان شرپسندوں کو اصلاحِ احوال کا موقع دے کر واپس جانے کی اجازت دے دی، حالاں کہ عام لوگ اصرار کر رہے تھے کہ انہیں بغاوت کی سزا میں قتل کیا جائے۔③

اسی گفتگو میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو کھلے دل کے ساتھ پیش کش کی:

''آپ لوگ جس عامل کو پسند کریں گے میں اس کا تقرر کردوں گا، جسے ناپسند کریں گے اسے ہٹادوں گا۔''④

بدلے میں آپ نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ انتشار نہیں پھیلائیں گے اور جب تک حکومت اپنے عہد پر قائم ہے وہ بھی اُمت کے اجتماعی دھارے میں شامل رہیں گے۔ ان لوگوں نے بظاہر خوشی سے یہ باتیں مان لیں۔⑤

یہ معاہدہ یکم ذوالقعدہ ۳۵ ہجری کو ہوا تھا۔⑥ معاہدے کی اطلاع سے ہر طرف ایک اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور تشویش کے شکار مسلمانوں نے چین کا سانس لیا۔⑦ شورش کی آگ بظاہر ٹھنڈی پڑ گئی اور اس فتنہ انگیز تحریک کے کارکن اپنے علاقوں کو واپس روانہ ہونے لگے۔ البتہ ان کے دو سردار: اشتر نخعی اور حکیم بن جبلہ مدینہ منورہ ہی میں رہ گئے۔⑧

جعلی خط اور بلوائیوں کا دوبارہ حملہ:

اگر یہ فطری شورش ہوتی تو اس منصفانہ معاہدے کے بعد ختم ہوجاتی مگر اصل ڈوریں چالیں چلنے والے عیاروں کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے طے کرلیا تھا کہ فساد کی آگ کسی نہ کسی بہانے بھڑکا کر رہیں گے۔⑨

---

①تاریخ الطبری: ۳۳۸/۳ ②تاریخ الطبری: ۳۳۵/۳ ③تاریخ الطبری: ۳۳۸/۳
④مصنف ابن ابی شیبۃ ح: ۳۷۶۹۱ ⑤تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۲۸ ⑥خلیفہ بن خیاط: ص ۱۶۸
⑦مصنف ابن ابی شیبہ ۳۷۷۵۷، کتاب الجمل ⑧تاریخ الطبری: ۳ص ۳۷۵ ⑨تاریخ الطبری: ۳ص: ۳۵۰

چنانچہ ان سازشی عناصر نے ایک جعلی مراسلہ تیار کیا جس پر دربارِ خلافت کی جعلی مہر بھی تھی۔ اسے ایک گماشتے کے ہاتھ اس طرح روانہ کیا گیا کہ مصر واپس جانے والا شورش پسندوں کا قافلہ اسے دیکھ لے۔ یہ گماشتہ منصوبے کے مطابق مصری قافلے سے ذرا فاصلے پر ظاہر ہوا، پھر ان سے دور ہوتا چلا گیا۔ قافلے کے لوگوں کو شک ہوا تو تعاقب کر کے پکڑلیا اور تلاشی لے کر مراسلہ برآمد کر لیا۔ دیکھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منسوب ایک تحریر تھی، جس میں مصر کے حاکم کو حکم دیا گیا تھا کہ جب یہ قافلے والے مصر پہنچیں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔''① قافلے والے یہ تحریر دیکھ کر غصے سے بے حال ہو گئے۔ تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے اس تیزی سے مدینہ واپس پہنچے کہ کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا۔②

بصرہ اور کوفہ جانے والے بھی لوٹ آئے تھے اور اس باغیانہ کارروائی میں شریک تھے۔ شہر کے راستوں اور ناکوں پر قبضہ کرنے کے بعد چند فسادی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور بولے: ''آپ ہمارے ساتھ عثمان کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بے زاری سے کہا: ''اللہ کی قسم! میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔'' وہ بولے: ''تو پھر آپ نے ہمیں وہ خطوط (جن میں بغاوت کی دعوت دی گئی تھی) کیوں لکھے؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا۔'' یہ سن کر فسادی گماشتے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔③

دراصل عام مُفسدین کو پتا ہی نہیں تھا کہ صحابہ کی طرف منسوب انقلاب کی دعوت پر مشتمل خطوط جعلی تھے۔

یہی باتیں کوفہ والوں نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے اور بصرہ والوں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے کیں۔ ان اکابر صحابہ کرام نے بلوائیوں کو یہ بھی کہا: آخر تم کو اپنے ساتھیوں کا حال معلوم کیسے ہوا؟ تم لوگ الگ الگ سمتوں میں کوچ کر چکے تھے، تمہارے درمیان کئی دنوں کا فاصلہ تھا۔ ہو نہ ہو، یہ پہلے سے طے شدہ سازش ہے۔''④

فسادیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''آپ نے ہمارے بارے میں یہ مراسلہ لکھا ہے۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدھی اور اصولی بات کی، فرمایا: ''دو باتوں میں سے ایک اختیار کر لو، یا تو اس پر دو مسلمانوں کی گواہی لے آؤ کہ یہ مراسلہ میں نے لکھوایا ہے یا مجھ سے اللہ کی قسم! لے لو کہ میں نے نہ یہ لکھا ہے، نہ لکھوایا ہے، نہ اس کے متعلق کچھ جانتا ہوں کیوں کہ مہر جعلی بھی لگائی جا سکتی ہے۔'' فسادی کوئی شرعی گواہی پیش کر سکے نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حلف لینے پر آمادہ ہوئے۔ ایک انتہا پسندانہ سوچ کے ساتھ ان کی ایک ہی رٹ تھی: ''تم نے عہد کی خلاف ورزی کی ہے۔''⑤

مشہور ہے کہ خط لے جانے والا شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی غلام تھا مگر صحیح بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کوئی غلام اس سازش میں استعمال نہیں ہوا تھا۔ سازشیوں نے جھوٹ موٹ یہ مشہور کر دیا کہ ان کا غلام پکڑا گیا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو وہ لوگ اس غلام کو اہلِ مدینہ کے سامنے پیش کر دیتے۔ خط کے اصلی یا جعلی ہونے سے کہیں زیادہ ایک انسان کی گواہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مجرم ظاہر کر سکتی تھی مگر اس شخص کو جو یقیناً ان کا اپنا ایجنٹ تھا، کہیں پیش نہیں کیا

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۶۹ ② تاریخ الطبری: ۴ ص ۳۵۱
③ تاریخ الطبری: ۴ ص ۳۵۵ ④ تاریخ الطبری: ۴ ص ۳۵۱ ⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۶۹

گیا۔ بعض روایات میں اس شخص کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا غلام ظاہر کرتے ہوئے اس کا نام ابوالاعور بن سفیان بتایا گیا ہے جو ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ ابوالاعور کوئی غلام نہیں، ایک مشہور جرنیل تھے۔ ان کا نام عمرو بن سفیان تھا۔ وہ جنگِ یرموک اور فتح قبرص کی فتح میں بطورِ افسر شریک تھے۔ ① بعض روایات کے مطابق جعلی خط کی سازش مروان نے کی تھی اور بلوائیوں نے مروان پر سزا جاری کرنے کا مطالبہ کیا تھا مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے منظور نہیں کیا۔ مروان کی سازش میں شرکت بظاہر پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ تاہم حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے نزدیک وہی اس فساد کا ذمہ دار تھا۔ ②

راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ سازش کے مرکزی کرداروں نے پہلے سے جعلی مہر تیار کی ہوئی تھی۔ خط لے کر جانے والا جس طرح مصری قافلے کے پاس ظاہر ہوا اور پھر دور بھاگا، اس سے سازش کی بو آتی ہے۔ اگر کسی کو قافلے سے بچ بچا کر ایسا خفیہ پیغام لے کر جانا ہوتا تو وہ قافلے کی نظروں سے دور رہتے ہوئے اپنی منزل کی طرف آسانی سے جا سکتا تھا، اسے پاس سے گزرنے اور پھر بھاگ کر دوسروں کو خواہ مخواہ تفتیش پر اُکسانے کی کیا ضرورت تھی۔

❁❁❁

مدینہ میں ہنگامہ اور دارِ عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ

بلوائی چند دنوں تک مدینہ میں دندناتے رہے۔ مدینہ کے لوگ فساد سے بچنے کے لیے گھروں میں بیٹھ گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس دوران مسجد نبوی میں نمازیں پڑھاتے رہے۔ جمعے کا دن آیا تو آپ نے منبر پر خطبہ دیا۔ اس دوران بلوائیوں نے ہنگامہ کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کنکروں کی بارش کر دی۔ آپ رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے اور غشی طاری ہو گئی، صحابہ کرام آپ کو اُٹھا کر گھر لے گئے۔ حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی عیادت کے لیے آئے اور اس صورتِ حال پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ ③ پہلے مُفسدین نے آپ رضی اللہ عنہ کے نماز پڑھانے اور خطبہ دینے پر پابندی لگائی۔ پھر نماز باجماعت کے لیے مسجد میں داخلہ بند کیا، اور پھر کچھ دنوں بعد آپ رضی اللہ عنہ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ④ مُفسدین کا مطالبہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلافت سے استعفا دے دیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اس بارے میں حتمی فیصلہ یہ تھا: ''میں اس قمیص کو نہیں اُتاروں گا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے پہنائی ہے۔'' دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ کو تاکیدی وصیت تھی کہ اللہ کی طرف سے خلافت کی ذمہ داری ملے تو اس سے دست بردار نہ ہونا۔ ⑤

بلوائیوں کے ایک سردار اشتر نخعی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مل کر انہیں خلافت سے دستبرداری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے فرمایا: ''اللہ نے مجھے جو قمیص پہنائی ہے، میں اسے نہیں اتاروں گا۔ اگر میری گردن بھی کٹ جائے تو یہ مجھے پسند ہے مگر یہ گوارا نہیں کہ اُمت کا یہ حال کر جاؤں کہ وہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوں۔''

---

① تاریخ الاسلام للذهبی: ۳/ص ۱۵۱

② البدایة والنهایة: ۱۱/ص ۲۳۸، ط دار هجر ③ تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۵۳

④ تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۳۹ ⑤ سنن الترمذی، ح: ۳۷۰۵

اشتر نے مطالبہ نہ ماننے کی صورت میں کھلم کھلا لڑائی کی دھمکی دی۔ آپ نے جواب میں فرمایا: ''اگر تم نے ایسا کیا تو آئندہ کبھی آپس میں باہم محبت نہ کر سکو گے، کبھی سب ایک ساتھ نماز نہ پڑھ سکو گے، کبھی اکٹھے جہاد نہیں کر سکو گے۔ ①

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے استعفاء کیوں نہ دیا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس فتنے کی تفاصیل سے بھی آگاہ کر دیا تھا جس کا انجام آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت تھا۔ رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت نہ چھوڑنے کی اتنی سخت تاکید کیوں کی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ گروہ جو آپ کی معزولی کا مطالبہ کر رہا تھا، اُمت کی رائے عامہ کا ترجمان ہرگز نہیں تھا۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک ایسے گروہ کے مطالبے پر جو اُمت کا صحیح نمائندہ نہیں تھا، خلافت چھوڑ دیتے تو قیامت تک یہ روایت بن جاتی کہ جب کسی عادل، امانت دار اور ذمہ دار امیر کو گرے پڑے لوگوں کی شورش اور احتجاج سے واسطہ پڑتا اسے عہدے سے مستعفی ہونا پڑتا۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مستعفی ہونے سے روکتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: ''اگر آپ خلافت چھوڑ دیں تو کیا ہمیشہ زندہ رہیں گے؟ اور اگر آپ خلافت نہ چھوڑیں تو کیا یہ لوگ آپ کو قتل کرنے سے زیادہ کچھ کر سکتے ہیں؟ مجھے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ آپ اس قمیص کو اُتاریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہنائی ہے۔ ورنہ ایک روایت چل پڑے گی کہ جب بھی کسی جماعت کو اپنا خلیفہ یا امیر پسند نہیں آئے گا وہ اسے معزول کر دیں گی۔ ②

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلوار نہ اُٹھانے کا فیصلہ کیوں کیا؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مزید امتحان یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں شورش پسندوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی جگہ صبر و تحمل کا حکم دیا تھا۔ جب لوگوں نے مُفسدین کے خلاف مسلح کارروائی کی اجازت طلب کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک وعدہ لے رکھا ہے، پس میں اپنی جان کو اسی پر کاربند رکھتے ہوئے صبر کروں گا۔'' ③

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے لڑائی پر اصرار کیا تو خلیفۂ ثالث نے فرمایا:

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین میں سے وہ پہلا شخص نہیں بننا چاہتا جو اُمت کا خون بہائے۔'' ④

حضرت عبداللہ بن زبیر، کعب بن مالک اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم جیسے حضرات نے پیش کش کی کہ اجازت ہو تو دشمن کو مار بھگائیں۔ داماد رسول نے فرمایا: ''مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں۔'' ⑤ اس ممانعت کی دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک شہر کو کشت و خون کا مقام نہیں بنانا چاہتے تھے۔ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد تھا: ''مدینہ سرزمین محترم ہے، نہ اس کا درخت کاٹا جائے، نہ اس میں کسی شرانگیزی کا ارتکاب کیا جائے۔ جو اس میں شرانگیزی کرے گا، اس پر اللہ کی، تمام فرشتوں کی اور سب انسانوں کی لعنت۔'' ⑥

---

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۳۷۱، ۳۷۲ ② طبقات ابن سعد: ۳/۶۶، ط صادر، بسند صحیح؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۰
③ مسند احمد، ح: ۲۲۲۵۳؛ سنن ابن ماجۃ، ح ۱۱۳، باسناد صحیح ④ مسند احمد، ح: ۴۸۱
⑤ طبقات ابن سعد: ۳/۷۰؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۰۸۲؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۷۳ ⑥ صحیح البخاری، ح: ۱۸۶۷

خلیفہ کے گھیراؤ کی خبر سن کر مختلف شہروں سے مسلمان مدینہ کی طرف روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ بعض لوگ اس مہم کے لیے نکل بھی پڑے تھے۔ ① اس دوران خبر آئی کہ معاملہ صلح وصفائی سے حل ہوگیا ہے۔ غالباً شورش پسند کوفہ، بصرہ اور دوسرے شہروں تک غلط خبریں پہنچانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اس لیے لوگ سفر کا خیال چھوڑ کر اپنے معمولات میں مشغول ہوگئے۔ ②

کھانے اور پانی کی بندش:

گرمی شدید ہوئی تو شورش پسندوں نے محاصرے کی سختی بھی بڑھا دی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر اشیائے خورد و نوش اور پانی لے جانے پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ پہلے پہل حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ نہ کچھ ضروریات کا سامان پہنچا دیتے تھے مگر پھر فسادیوں نے انہیں بھی روک دیا، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر سے کھانے پینے کا ذخیرہ ختم ہونے لگا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو مُفسدین سے کہا: ”تمہاری یہ حرکت مسلمانوں جیسی ہے نہ کافروں جیسی۔ رومی اور ایرانی کافر بھی قیدیوں کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ اس شخص نے تمہیں کیا نقصان پہنچایا ہے جو تم اس کے گھیراؤ اور قتل پر تلے ہوئے ہو۔“ مگر بلوائی نہ مانے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو اپنا عمامہ اتار کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں پھینک دیا تا کہ انہیں پتا چل جائے کہ علی رضی اللہ عنہ آئے تھے مگر کچھ کر نہ پائے۔ ③ ایک دن اُم المؤمنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے نکلیں مگر راستے ہی میں اشترنخعی نے ان کی سواری کو طمانچے مار کر واپس کر دیا۔ ④

ایک دن اُم المؤمنین سیدہ اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا ایک خچر پر کھانے پینے کا سامان لاد کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کی طرف تشریف لائیں مگر مُفسدین نے ان سے بدتمیزی کی، سامان چھین لیا اور خچر کو اس طرح مار کر بھگایا کہ اُم المؤمنین گر کر زخمی ہوتے ہوتے بچیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محاصرے کے بقیہ دن بڑی تکلیف میں گزارے، آپ کے پڑوسی حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ بہت چھپ چھپا کر تھوڑا بہت کھانا پینا اپنے گھر سے آپ کے پاس بھیج دیتے تھے جس سے کچھ نہ کچھ گزارا چلتا رہا۔ ⑤

بلوائی سردار اشترنخعی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے بارے میں رائے معلوم کرنا چاہی۔ وہ سخت لہجے میں بولیں: ”معاذ اللہ! میں مسلمانوں کا خون بہانے اور ان کے خلیفہ کو قتل کرنے اور حرام کو حلال کرنے کی اجازت کیسے دے سکتی ہوں۔“ ⑥

خلیفہ ثالث کو جان سے زیادہ حج کے انتظامات کی فکر:

حج کے ایام آگئے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ حجاج کے قافلے کی قیادت

① تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۵۱، ۳۵۲؛ التاریخ الاوسط: ۱/ص ۶۲ ② مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۵۷
③ تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۸۶ ④ مسند علی بن جعد، ص: ۲، ص: ۹۵۰، بسند صحیح ⑤ تاریخ الطبری: ۴/۳۸۶، ۳۸۷
⑥ تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۴/۱۲۲۴، ۱۲۲۵؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۷۶ بسند صحیح

کرتے ہوئے مکہ مکرمہ روانہ ہو جائیں۔ انہوں نے عرض کیا ''امیر المؤمنین! اللہ کی قسم! ان شرپسندوں سے جہاد کرنا میرے نزدیک حج سے بڑھ کر ہے۔'' مگر خلیفہ ثالث نے قسم دے کر انہیں اس حکم کی تعمیل کا کہا تا کہ حج کا عظیم الشان اسلامی رکن حسبِ معمول پورے اہتمام سے ادا ہو۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بھی قافلے کے ساتھ حج پر جانے کا ارادہ کرلیا کیوں کہ آپ کو خطرہ لاحق تھا کہ کہیں شرپسند حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد امہات المؤمنین کو بھی نشانہ نہ بنائیں۔ سیدہ ام حبیبہ اور سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہما کی سرعام توہین کے بعد یہ خدشہ ہرگز بے بنیاد نہیں تھا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جیسے اکابران غیر یقینی حالات میں اپنے گھروں میں بند ہو گئے۔ ①

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جیسے سیاسی ماہر بھی اس بحران کی تاب نہ لاسکے، وہ شدید ندامت کے عالم میں شہر سے جانے لگے۔ روانگی سے پہلے انہوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ''مدینہ والو! ہر وہ شخص جو یہاں موجود ہے اور اس کے سامنے عثمان رضی اللہ عنہ قتل ہو گئے تو اللہ اسے ذلت وخواری میں مبتلا کر کے چھوڑے گا۔ لہٰذا جو شخص عثمان کی مدد کی سکت نہیں رکھتا وہ یہاں نہ رہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے دونوں بیٹوں: عبداللہ اور محمد کے ساتھ مدینہ چھوڑ کر فلسطین چلے گئے۔ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور بہت سے لوگ اسی طرح شہر چھوڑ گئے۔ ②

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی جنہیں فسادی اپنا سرپرست مشہور کر رہے تھے، دل برداشتہ ہو کر مدینہ سے نکل گئے۔ ③

اصلاحی خطاب:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس دوران کوشش کی کہ شرپسندوں میں سے جو لوگ غلط فہمی کا شکار ہو کر اس بغاوت میں شریک ہیں وہ توبہ تائب ہو کر بدبختی سے بچ جائیں۔ آپ نے مکان کے بالا خانے پر کھڑے ہو کر ان سے فرمایا:

''میں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میں نے ہی رُومہ کا کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کیا تھا؟'' سب نے کہا ''جی ہاں'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اس کے باوجود تم نے اس کا پانی مجھ پر کیوں بند رکھا ہے؟''

پھر فرمایا: ''تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں معلوم نہیں میں نے ہی آس پاس کی زمین خرید کر مسجد نبوی کی توسیع کرائی تھی۔ بتاؤ میرے علاوہ کسی اور کو جانتے ہو، جسے اس سے پہلے مسجد میں نماز سے روک دیا گیا ہو۔''

یہ باتیں ایسی لرزا دینے والی تھیں کہ خود فسادیوں میں سے کچھ لوگ کہنے لگے:

''ہمیں امیر المؤمنین پر دست درازی نہیں کرنی چاہیے، انہیں موقع دینا چاہیے۔'' ④

خلیفہ ثالث نے مزید فرمایا: ''تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نہیں جانتے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرا پہاڑ پر تشریف فرما تھے، اچانک پہاڑ لرزنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھوکر مار کر فرمایا: ٹھہر جا۔ تیرے اوپر نبی، صدیق اور شہید کے سوا کوئی نہیں۔ اس دن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی تھا۔''

---

① تاریخ الطبری: ۴ص: ۳۸۶ تا ۳۸۷ ② تاریخ الطبری: ۴ص ۵۵۸
③ تاریخ الطبری: ۴ص ۳۹۲ ④ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۷۲

یہ حدیث یاد دلانے کا مقصد مُفسدین پر واضح کرنا تھا کہ اگر وہ قتل ہوئے تو شہید ہوں گے اور قاتل ظالم ہوں گے۔
پھر فرمایا: ''تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نہیں جانتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعتِ رضوان کے دن جبکہ وہ مجھے مشرکین کے پاس مکہ بھیج چکے تھے، اپنے ہاتھ کے بارے میں فرمایا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔''
پھر فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کی تنگ دستی کے وقت فرمایا تھا: کون ہے جو اللہ کے راستے میں مقبول خیرات کرے؟ تو میں نے آدھے لشکر کا ساز وسامان مہیا کیا تھا۔''
آپ رضی اللہ عنہ نے ہر بات قسم دے کر پوچھی۔ مدینہ کے کئی افراد کے علاوہ کئی بلوائیوں نے بھی آپ کی تصدیق کی۔ ①
انہی ایام میں آپ نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا: ''تم مجھے کس جرم میں قتل کرو گے؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ مسلمان کا قتل صرف تین صورتوں میں جائز ہے: جب وہ شادی شدہ ہوتے ہوئے بدکاری کا مرتکب ہو یا وہ کسی کو ناحق قتل کرے یا مرتد ہو جائے۔ اللہ کی قسم! میں نے نہ تو زمانۂ جاہلیت میں کبھی بدکاری کی اور نہ حالتِ اسلام میں۔ اور میں نے کسی کو قتل بھی نہیں کیا کہ مجھ سے قصاص لیا جائے اور جب سے اسلام قبول کیا ہے، کبھی دین سے برگشتہ نہیں ہوا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ پھر یہ لوگ مجھے کیوں قتل کرنے پر آمادہ ہیں۔'' ②

❀❀❀

سانحۂ شہادت

ایامِ حج کے بعد مدینہ منورہ میں اطلاعات آنے لگیں کہ حاجی مکہ مکرمہ سے واپس آرہے ہیں۔ ③ یہ خبر بھی مشہور تھی کہ کوفہ، بصرہ اور شام سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے افواج آنے کو ہیں۔ ④ تب مُفسدین نے فیصلہ کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان پر یکدم دھاوا بول کر آپ کو شہید کر دیا جائے۔
آپ نے آخری ایام میں ایک دن بالاخانے سے جھانک کر بلوائیوں سے آخری بار خطاب کیا جس میں فرمایا:
''اللہ کی قسم! اگر تم نے مجھے قتل کیا تو پھر کبھی اکٹھے نماز نہیں پڑھ سکو گے، کبھی دشمن سے مل کر جہاد نہیں کر پاؤ گے، تم اختلافات کی انتہا کی وجہ سے یوں گتھم گتھا ہو جاؤ گے'' یہ کہہ کر آپ نے انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر دکھائیں۔ ⑤
آخری خطبے میں لوگوں سے کہا: ''مدینہ والو! تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تمہیں میرے بعد اچھی حکومت عطا فرمائے۔'' ⑥

---

① مسند احمد، ح: ۴۲۰
② البدایہ والنہایہ: ۱۰ ص ۲۹۲
③ تاریخ الطبری: ۴ ص ۳۸۸
④ تاریخ الطبری: ۴ ص ۳۸۵
⑤ تاریخ دمشق: ۳۹/ ۳۵۱، ۳۵۲ ⑥ تاریخ الطبری: ۴ ص ۳۸۵

۱۸ ذی الحجہ کی شب کے آخری پہر آپ کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: ”عثمان! افطار ہمارے ساتھ کرنا۔“ ① چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کو یقین ہو گیا کہ یہی یوم شہادت ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے روزہ رکھا، نیز بیس غلاموں کو آزاد کیا اور عادت کے خلاف پاجامہ منگوا کر زیب تن کیا کہ کہیں حملے کی زد میں آتے ہوئے ستر نہ کھل جائے۔ پھر تلاوت میں مصروف ہو گئے۔ ② اس وقت مکان کے دروازے پر صحابہ اور تابعین کا ایک مجمع دامادِ رسول کی حفاظت کے لیے سربکف تھا، جن میں حضرت ابوہریرہ، حضرات حسن وحسین، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہم اور محمد بن طلحہ اور مروان بن حکم شامل تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دہری زرہ پہنے موجود تھے۔ فسادیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے گھر کے دروازے پر دھاوا بولا تو ان حضرات نے بھرپور دفاع کیا، اس طرح دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ ③ مگر اسی دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قسم دے کر اپنے حامیوں کو کہلوایا کہ سب لوگ اندر آجائیں، چنانچہ یہ حضرات واپس آ گئے اور مکان کا پھاٹک بند کر دیا۔ ④

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اب محافظوں کو حتمی طور پر کہہ دیا کہ وہ پہرہ ختم کر کے گھروں کو چلے جائیں۔ آپ نے فرمایا:

”تم میں سے جو بھی میرے حکم کی تعمیل ضروری سمجھتا ہے وہ اپنا ہاتھ روک لے اور اسلحہ رکھ دے۔“ ⑤

سب لوگ چلے گئے مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نہ اٹھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن منگوایا اور پڑھنے لگے، اس دوران حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کہا: ”تم کو قسم دیتا ہوں کہ چلے جاؤ۔“ پھر دو آدمیوں کو بلا کر بیت المال کی حفاظت کی ذمہ داری انہیں سونپ دی، گویا آخری وقت میں بھی فکر تھی تو اُمت کے حقوق کی۔ ⑥ ایک ایک کر کے آپ نے سب کو پہرے سے ہٹا دیا۔ حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما آخر میں نکلنے والوں میں سے تھے۔ ⑦

یہ بات واضح تھی کہ صحابہ کرام اور تابعین نے آخری وقت میں آپ کے گھر کی حفاظت صرف اس لیے ترک کی تھی کہ وہ آپ کے حکم کے پابند تھے ورنہ وہ دل وجان سے کٹ مرنے کو تیار تھے۔ ⑧ رہا یہ اشکال کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہرہ کیوں ختم کیا جبکہ جان کی حفاظت شرعاً لازم ہے، تو جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب میں اپنے ساتھ افطار کا مژدہ سنانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس دن شام تک اپنی شہادت کا یقین ہو گیا تھا۔ یہ ایسا تھا جیسے کسی مریض یا زخمی کی حالت سے طبیب مایوس ہو کر اسے چند گھنٹوں کا مہمان قرار دے دیں تو پھر شرعاً مریض پر علاج کرانا

---

① مجمع الزوائد للهیثمی، ح: ۱۲۰۰۷، ط القدسی؛ طبقات ابن سعد، ۷۳/۳ ط دار صادر
② فضائل الصحابہ للامام احمد، ح: ۸۰۹، ط الرسالۃ
③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۷۳
④ تاریخ الطبری: ۴ص ۳۸۸
⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۷۴
⑥ تاریخ الطبری: ۴ص ۳۹۳، ۳۹۲
⑦ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۷۳
⑧ طبقات ابن سعد: ۷۰/۳، صادر؛ تاریخ دمشق: ۳۹۹/۳۹، ۴۰۰

لازم نہیں رہتا۔ پس یہاں بھی حفاظتی انتظامات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نزدیک شرعاً واجب نہ رہے تھے۔

آپ رضی اللہ عنہ اب گھر میں تنہا تلاوت میں مشغول ہو گئے، اہل وعیال کے سوا اب وہاں کوئی نہ تھا۔ ① فسادیوں نے بے فکر ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لیے ایک شخص کو اندر بھیجا، یہ انہی لوگوں میں سے تھا جو غلط فہمی کے شکار تھے، اسے حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی، بس اتنا کہہ پایا: ''آپ خلافت چھوڑ دیں۔ ہم آپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔'' آپ نے فرمایا: ''میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قمیص کو کیسے اُتار سکتا ہوں۔ میں اس حال میں رہوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سعادت مندوں کو معزز اور بدبختوں کو ذلیل کر کے دکھائے گا۔'' وہ شخص لرز گیا اور باہر نکل کر کہنے لگا ''ان کا قتل ہمارے لیے حلال نہیں۔'' ② ایک اور شخص آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: ''میرے اور تمہارے درمیان یہ اللہ کا کلام موجود ہے۔'' اس شخص میں بھی ایمان کی رمق باقی تھی۔ وہ بھی ہچکچایا اور باہر نکل گیا۔ ③ بلوائیوں نے یکے بعد دیگرے آدمی بھیجے مگر ہر ایک نادم ہو کر واپس نکلتا رہا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن ابی بکر بھی غلط فہمی کا شکار ہونے والوں میں سے تھے، وہ اندر آئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ''کیا تمہارا یہ غضب اللہ کی عطا کے خلاف تو نہیں؟ (کہ اس نے مجھے خلافت کیوں بخشی) میں نے کون سا جرم کیا ہے، سوائے یہ کہ حق لے کر حق دار کو دیا ہے۔'' ④ پھر کہا: ''تم میرے قاتل نہیں ہو سکتے۔'' ⑤ محمد بن ابی بکر نے آپ کی داڑھی پکڑ لی تو آپ نے فرمایا: ''تم مجھ سے ایسا برتاؤ کر رہے ہو جو تمہارے والد ہوتے تو کبھی پسند نہ کرتے۔'' ⑥ محمد بن ابی بکر نے یہ سن کر ندامت کے مارے اپنا چہرہ کپڑے سے لپیٹ لیا اور باہر جا کر مفسدین کو حملے سے منع کرنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ⑦

غرض نادانی سے اس تحریک کا حصہ بن جانے والے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی آرزو کے عین مطابق دست درازی سے باز آ گئے اور توبہ تائب ہوتے دکھائی دیے تو سازش کے مرکزی کرداروں اور بدبخت ترین افراد نے بلا تاخیر اپنے گھناؤنے عزائم کو خود پایہ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ یہ لوگ اندر گھس گئے، امیر المؤمنین اسی طرح اللہ سے لو لگائے ہوئے، اپنی جان سے بے نیاز ہو کر قرآن مجید سامنے رکھے سورۃ البقرہ کی تلاوت میں مشغول تھے۔ حملہ آوروں میں سے ایک شخص رومان نے لوہے کی بھاری لاٹھی دے ماری۔ ⑧ غافقی بن حرب نے بھی آہنی ہتھیار سے ضرب لگائی۔ ⑨ پھر ایک شخص جو اَلْمَوْتُ الْاَسْوَد کہلاتا تھا، آگے بڑھا اور آپ کا گلا گھونٹ دیا۔ آپ تڑپنے لگے، ادھر اس

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۷۴؛ تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۷۲

② تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۹۱

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۷۴

④ تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۹۱

⑤ الاستیعاب: ۱۰۴۶/۳

⑥ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۷۴

⑦ البدایہ والنہایہ: ۱۰/ص ۳۰۲؛ تاریخ الاسلام للذھبی، ت تدمری، ۳۵۴/۳، ۳۵۵

⑧ البدایہ والنہایہ: ۱۰/ص ۳۱۸ ⑨ تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۹۱

نے تلوار نیام سے نکالی اور آپ پر وار کیا، خون کے چھینٹے قرآنِ مجید پر پڑے اور آیت: ''فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ'' سرخ ہوگئی۔ ① ایک بدبخت نے نیزے کا وار کیا، آپ کی زبانِ مبارک سے نکلا ''بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ'' ساتھ ہی خون کی دھار اُبل پڑی۔ ② اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ اور آپ کی بیٹیاں آپ کو بچانے کے لیے چیخ وپکار کرتی ہوئی دوڑ کر آئیں۔ ③ حضرت نائلہ نے وفاداری کی انتہا کردی اور بچانے کے لیے آپ پر گر گئیں۔ ④ سودان بن حُمران نامی ظالم، تلوار کھینچ کر آگے بڑھا، حضرت نائلہ نے تلوار کی دھار پکڑنے کی کوشش کی تو ان کی انگلیاں کٹ گئیں۔ ⑤ ایک مصری نے تلوار سینے سے پار کردی ⑥ جس کے بعد جبلہ نامی سیاہ فام مصری نے آگے بڑھ کر آخری وار کیا اور دامادِ پیغمبر، خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی روح جسدِ خاکی سے پرواز کرگئی۔ ⑦

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہوگیا، اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کچھ غلام جنہیں آپ نے اس روز اس شرط کے ساتھ آزاد کیا تھا کہ وہ ہتھیار نہ اٹھانے کا وعدہ کریں، دوڑتے ہوئے اِدھر آگئے۔ ان میں سے ایک غلام نے سودان بن حمران پر تلوار کا وار کیا اور اس کا سرتن سے جدا کردیا۔ دوسرے غلام نے قُتَیرہ نامی فسادی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ تیسرے نے کلثوم بن تُجیب نامی ظالم کو جو حضرت نائلہ سے دست درازی اور فحش کلامی کر رہا تھا، مار ڈالا۔ پھر ان میں سے دو غلام وہیں دوسرے قاتلوں سے لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔ ⑧ حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت حسن بن علی، محمد بن حاطب رضی اللہ عنہم اور مروان بن حکم بھی دفاع کے لیے گھر میں گھس گئے تھے اور مُفسدین سے لڑتے لڑتے شدید زخمی ہوگئے تھے۔ بعد میں مدینہ کے لوگوں نے ان چاروں کو لہولہان حالت میں اٹھایا تھا۔ ⑨

یہ قاتل تمام کے تمام مصری تھے ⑩ جو کارروائی کرکے رات کی تاریکی میں مدینہ سے فرار ہوگئے اور شام ومصر کے درمیان سرحدی کوہستان میں روپوش ہوگئے۔ ان کا علم ایک مدتِ دراز تک کسی کو نہ ہوسکا۔ ⑪

اُدھر کئی فسادیوں نے گھر میں گھس کر لوٹ مار کی۔ کچھ بیت المال کی طرف لپکے اور اسے لوٹ لیا۔ ان لوگوں کا یہ پست کردار گواہ تھا کہ وہ دنیا پرست اور فتنہ پرور لوگ ہیں۔ ⑫

---

① خلیفہ بن خیاط، ص: ۱۷۳، ۱۷۵ ② البدایہ والنہایہ: ۱۰ص ۳۱۰

③ تاریخ الطبری: ۴ص ۳۹۳ ④ البدایہ والنہایہ: ۱۰ص ۳۱۸ ⑤ البدایہ والنہایہ: ۱۰ص ۳۱۸

⑥ تاریخ الطبری: ۴ص ۳۹۳ ⑦ مسند اسحٰق بن راہویہ، ح: ۸۸۴۰، اسنادہ صحیح

⑧ تاریخ الطبری: ۴ص: ۳۹۱ ⑨ الاستیعاب: ۳/۱۰۴۶، بسند حسن، ط دار الجیل بیروت

⑩ سُئِلَ الحسن أكَانَ فِيمَنْ قتل عُثمَان أحد من المُهَاجِرِين وَالأنْصَار قَالَ لَا كَانُوا أعلاجا من أهل مصر۔ (تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۷۶) وَدَخَلَ عَلَيْهِ أَهْلُ مِصْرَ فَقَتَلُوهُ۔ (تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۴ص ۱۲۱۹) اسنادہ صحیح۔

⑪ فطعنه احدهما بمشقص في اوداجه وعلاه الآخر بالسيف فقتلوه، ثم انطلقوا هرابا، يسيرون بالليل ويكمنون بالنهار حتى اتوا بلدا بين مصر والشام۔ (مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۶۹۱، ط الرشد، اسنادہ صحیح او حسن)

⑫ تاریخ الطبری: ۴ص ۳۹۱

نمازِ جنازہ اور تدفین:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح مدینہ میں پھیل گئی۔ حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت حسن، حضرت زید بن ثابت، حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہم اور عام صحابہ جوق در جوق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے آئے۔ جنازے میں شرکت کے لیے مدینہ کی خواتین اور بچے تک شہر کی جنازہ گاہ میں جمع ہوگئے۔ ①

نمازِ جنازہ میں تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ آخری دیدار کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ جنازہ قصرِ عثمان میں رکھا گیا اور لوگ گروہ در گروہ زیارت کرتے رہے۔ ایک بدبخت نے یہ ٹھان رکھی تھی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو طمانچہ مارے گا۔ جنازے کی چارپائی کے پاس آکر اس نے چہرہ مبارک پر دست درازی کرنا چاہی تو اسی وقت اس کا ہاتھ مفلوج ہوگیا۔ ②

شہید کو غسل نہیں دیا گیا، کپڑے ہی کفن قرار پائے۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی، اس کے بعد جنازے کو بقیع کے قبرستان میں لے جایا گیا۔ عفت وحیا کا یہ آفتاب، بقیع کی خاکِ پاک میں روپوش ہوگیا۔ ③

یہ بات طے ہے کہ شہادت کے وقت مدینہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی تابعین اور صحابہ بڑی تعداد میں موجود تھے، وہ آپ کے دفاع پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کا ہاتھ روکے رکھنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قسم کی وجہ سے تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قسم دینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے باعث تھا۔ بلوائی مدینہ پر اس طرح قابض نہ تھے کہ صحابہ کرام بے بس ہوتے۔ اس لیے ضعیف روایات میں منقول یہ باتیں خلافِ واقعہ ہیں کہ جنازہ بے گور وکفن پڑا رہا، چند افراد نے ہی نمازِ جنازہ پڑھی اور چھپ چھپا کر کسی گمنام گوشے میں دفن کیا گیا۔

اس سانحے پر اکابر کے تاثرات:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صحیح قول کے مطابق بیاسی سال کی عمر میں ایسی مظلومانہ حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ ہر مسلمان کا دل صدمے سے پارہ پارہ ہوا جاتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اے اللہ! میں تیرے سامنے عثمان کے خون سے اپنی برأت ظاہر کرتا ہوں، میں نے نہ انہیں قتل کیا، نہ کسی کو اس پر آمادہ کیا۔“ ④

بعد میں اس سانحے کو یاد کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ”خدایا! میں تیرے آگے عثمان کے خون سے برأت ظاہر کرتا ہوں۔ جس دن عثمان شہید ہوئے اس دن میری عقل ماؤف ہوگئی۔ میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔“ ⑤

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اللہ حضرت عثمان پر رحمت نازل کرے اور اُن کے خون کا بدلہ لے۔“

---

① تاریخ الطبری: ۴ص: ۴۱۳ ② تاریخ دمشق: ۳۵۸/۳۹

③ تاریخ الطبری: ۴ص ۴۱۳......... حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھانے والے کے بارے میں کئی اقوال ہیں، مثلاً: حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ، جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ، مروان بن حکم۔ مگر راجح یہ ہے کہ نماز جنازہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی۔

عن قتادۃ، قال: صلّی الزبیر علی عثمان ودفنه، وکان أوصی إلیه۔ (مسند احمد، ح: ۵۴۹) رجالہ ثقات۔

④ طبقات ابن سعد: ۸۰/۳، ط صادر، تاریخ دمشق: ۴۷۲/۳۹

⑤ مستدرک حاکم، ح: ۴۵۲۷، بسند صحیح

بالکل یہی تاثرات حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ظاہر فرمائے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے اللہ! ان لوگوں کو ندامت میں مبتلا کر اور پھر ان کو اپنی پکڑ میں لے لے۔''①

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے اس حادثے پر فرمایا: ''اسلام ایک مضبوط قلعے میں محفوظ تھا مگر ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے اس قلعے میں شگاف ڈال دیا ہے جو قیامت تک بند نہ ہوگا۔''

بدری صحابی حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! اب میں مرتے دم تک نہیں ہنسوں گا۔''②

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

''اگر احد پہاڑ کسی سانحہ پر ریزہ ریزہ ہوسکتا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ہوجانا چاہیے تھا۔''③

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جب بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ذکر آتا تو بے ساختہ کہہ اُٹھتے: ''ہائے ہائے۔'' اور زار و قطار رونے لگتے۔④

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کا حکم پوچھا گیا تو فرمایا:

''(قتل تو بہت بڑی بات ہے) جس نے عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بدگوئی کی اس پر بھی اللہ کی لعنت ہے۔''⑤

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مدینہ میں مُفسدین کی آمد پر بے بسی اور صدمے کے عالم میں فلسطین چلے گئے تھے، وہاں انہیں جب یہ خبر ملی تو بے اختیار منہ سے نکلا ''واعثماناہ'' (ہائے عثمان) اور یہ درد بھرے اشعار پڑھے:

(ترجمہ) ''ہائے میرا دل اپنے بھائی مالک کے قتل پر نوحہ خواں ہے۔ مگر کیا یہ آہ و بکا عزت کا تحفظ لوٹا سکتی ہے۔''

''کیا میں ان لوگوں کو معذور سمجھوں یا میری قوم نشے میں دُھت تھی۔''

پھر فرمایا: ''اللہ عثمان پر رحم فرمائے اور ان کی مغفرت کرے۔''

ساتھ ہی پیش گوئی کی: ''اب جنگ تو ہوگی کیوں کہ جو کسی دانے کو کریدے وہ اسے پھاڑ کر ہی چھوڑے گا۔'' مطلب یہ تھا کہ جن سازشیوں نے فتنے کا آغاز کیا ہے وہ آگے مسلمانوں میں باقاعدہ جنگ بھی کروا کے چھوڑیں گے۔⑥

پورے عالم اسلام میں اس المیے پر سوگ کی حالت طاری تھی۔ لوگ زار و قطار روتے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خوبیوں کو یاد کرتے تھے۔ ایک تابعی کلیب جرمی رحمہ اللہ جو بصرہ میں رہتے تھے، فرماتے ہیں:

''میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی خبر پر بزرگوں کو جس قدر روتے دیکھا اس کی کوئی اور مثال کبھی نہیں دیکھی۔ لوگ اتنا رو رہے تھے کہ ڈاڑھیاں بھی آنسوؤں سے تر ہوگئی تھیں۔''⑦

---

① تاریخ الطبری: ۴ص ۳۹۲

② طبقات ابن سعد: ۳/ ۸۱، ط دار صادر ③ صحیح البخاری، ح: ۳۸۶۲

④ طبقات ابن سعد: ۳ص ۸۱ ⑤ التاریخ الکبیر للبخاری: ا ص ۲۶، ط دکن

⑥ تاریخ الطبری: ۴ص ۵۵۹ ⑦ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۵۷، کتاب الجمل

کیا قاتلوں میں بعض صحابہ بھی تھے؟

یہ بات تو ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے عام شر پسند نہیں تھے بلکہ وہ لوگ تھے جن کے دل پتھر سے زیادہ سخت تھے اور وہ سازش کے مرکزی کردار یا ان بدطینتوں کے خصوصی آلۂ کار تھے۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ قتل کے لیے حملہ کرنے والے کئی افراد تھے جنہوں نے مختلف ہتھیاروں سے حملہ کیا۔

کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ قاتلوں میں بعض صحابہ بھی شامل تھے۔ وہ ایک دو فضول قسم کی روایتوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں قاتلوں میں صحابی حضرت عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کا نام بھی بیان کیا گیا ہے اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ انہوں نے شہید کے سینے پر چڑھ کر نو زخم لگائے تھے۔ ① یہ سراسر الزام ہے۔ واقدی اور ابومخنف کی روایت کے سوا حضرت عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک ہونا کہیں مذکور نہیں۔ یہ اصول ہے کہ طعنِ صحابہ پر مشتمل ضعیف روایت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی، پس یہ روایات بالکل ساقط مانی جائیں گی۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں صحابہ میں سے کوئی بھی شریک نہ تھا۔'' ②

اسی طرح حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ان قاتلوں میں صحابہ میں سے کوئی بھی نہ تھا۔'' ③

❁❁❁

---

① تاریخ الطبری: ۴/ص ۳۹۳

② وَلَمْ يُشَارِكْ فِي قَتْلِهِ أَحَدٌ مِنَ الصَّحَابَةِ۔ (شرح مسلم للنووی: ۱۵ ص ۱۴۸، ۱۴۹)

③ وَلَيْسَ فِيهِمْ أَحَدٌ مِنَ الصَّحَابَةِ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۳۰۷)

ملحوظہ در صحابیتِ حضرت عمرو بن الحمق:

کچھ صاحبان حضرت عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کو یہ کہہ کر مشکوک بناتے ہیں: ''اگر وہ قاتل تھے تو صحابی نہ تھے۔ صحابی تھے تو قاتل نہ تھے۔'' کاش انہیں صاف صاف یہ کہنے کی توفیق ملے کہ عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ یقیناً صحابی تھے اور بلاشبہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں سے نہیں تھے۔ حضرت عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کی صحابیت میں شک اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ امام نسائی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ ان سے ارشادِ نبوی نقل کیا ہے:

''مَنْ آمَنَ رَجُلًا عَلَى نَفْسِهِ، ثُمَّ قَتَلَهُ أُعْطِيَ لِوَاءَ غَدْرٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''

''جس نے کسی شخص کو جان کی امان دی، پھر اسے قتل کر دیا تو قیامت کے دن اُسے غداری کا جھنڈا دیا جائے گا۔'' (السنن الکبریٰ للنسائی، ح: ۸۶۸۷؛ مسند احمد، ح: ۲۱۹۴۶) یعنی بروزِ حشر عہد شکن شمار ہو کر سرِ عام رُسوا ہوگا۔

اس روایت کی سند میں عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ نے ''سمعتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کی تصریح کی ہے۔ ان سے یہ حدیث بھی بسندِ صحیح مروی ہے:

''إِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا اسْتَعْمَلَهُ۔ قِيلَ: وَمَا اسْتَعْمَلَهُ؟ قَالَ: يُفْتَحُ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ بَيْنَ يَدَيْ مَوْتِهِ حَتَّى يَرْضَى عَنْهُ مَنْ حَوْلَهُ۔''

(جب اللہ کسی بندے کی بھلائی چاہتا ہے تو اس سے کام لیتا ہے؟'' پوچھا گیا کہ کام لینے کا کیا مطلب؟ تو فرمایا: ''اس کی موت سے قبل اُسے ایسی نیکی کا موقع دیا جاتا ہے کہ ارد گرد کے سب لوگ اس سے خوش ہو جاتے ہیں۔)

(مسند احمد، ح: ۲۱۹۴۹، قال المحقق: اسنادہ صحیح، واسنادہ صریح فی انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم مشافہۃ۔)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ کو ''رجل صالح'' کہہ کر یاد فرمایا تھا۔ (فضائل الصحابۃ للامام احمد بن حنبل، ح: ۱۶۱۲؛ جامع معمر بن راشد ملحق بمصنف عبدالرزاق، ح: ۱۹۸۹۱، ط المجلس العلمی) انہیں جوانی میں برکت کی دعا دی تھی جس کی وجہ سے اسی سال کی عمر میں بھی ان کے تمام بال سیاہ تھے۔ (معرفۃ الصحابہ لابی نعیم: ۳/۲۰۰۶)

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل وکمالات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
❷ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خلافت کے لیے تقرر کس طرح ہوا؟
❸ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے سب سے بڑے بحری معرکے کا مختصر تذکرہ کیجیے۔
❹ عبداللہ بن سبا کون تھا؟ اس کی سازشی تحریک پر نوٹ لکھیے۔
❺ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مفسدین نے کیا کیا الزامات لگائے تھے؟ ان کے مختصر جوابات بھی تحریر کریں۔
❻ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب جعلی خط کی حقیقت کیا تھی؟
❼ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت سے استعفاء کیوں نہ دیا؟
❽ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے تحفظ کی تدابیر کیوں اختیار نہ کیں اور پہرہ کیوں ختم کر دیا؟

عملی کام:

❁ نقشے میں قبرص، خلیج قُسطَنطِینِیَہ اور جنگ صواری کے مقام کی نشاندہی کیجیے۔
❁ اَنْدَلُس اور قُسطَنطِینِیَہ کا درست تلفظ پچاس بار بلند آواز سے دُہرایے۔
❁ ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف سازش اور ان کے قتل میں کوئی صحابی شریک نہیں تھا۔''
اس عنوان پر طلبہ کے درمیان مباحثہ کرایا جائے۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ تیسیر الکریم المنان فی سیرۃ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ از شیخ علی محمد الصلابی
یا اس کا اردو ترجمہ: سیرۃ عثمان رضی اللہ عنہ
❁ فتنۃ مقتل عثمان، للشیخ محمد بن عبداللہ الغبان الصبحی
❁ تاریخ اُمت مسلمہ، حصہ دوم

(یونٹ: 1.12)

خلافتِ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

۱۹ ذوالحجہ ۳۵ھ......تا......۲۱ رمضان ۴۰ھ
۳۰ جون ۶۵۶ء......تا......۹ فروری ۶۶۱ء

فضائل ومناقب:

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ بچپن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مکی دور کی تمام مشقتوں اور تکالیف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ اسلام کے لئے آپ رضی اللہ عنہ کی قربانیاں کسی سے مخفی نہ تھیں۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں اپنی جاںنثاری کا ثبوت پیش کیا تھا اور ہر میدان میں بڑھ چڑھ کر شجاعت کے جوہر دکھائے تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے مدینہ منورہ کا انتظام سنبھالا تھا۔ سرورِ کائنات کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کا آپ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں ہونا آپ رضی اللہ عنہ کے لیے عظیم اعزاز تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر لگ بھگ تینتیس سال تھی اور آپ اب ایک سپاہی سے زیادہ ایک مفکر، قائد، مشیر اور وزیر کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت کے پچیس برسوں میں آپ مدینہ منورہ میں ایوانِ خلافت کی مرکزی شوریٰ کے اہم ترین رکن رہے اور ہمیشہ مسلمانوں کی بہترین رہنمائی کی۔ آپ ورع وتقویٰ، علم وفضل، تدبر وفقاہت، معاملہ فہمی اور دور اندیشی، ہمت و جرأت، صبر وتحمل، مجاہدہ وریاضت اور فقر وزہد میں اخلاقِ نبویہ کا پرتو تھے۔ ①

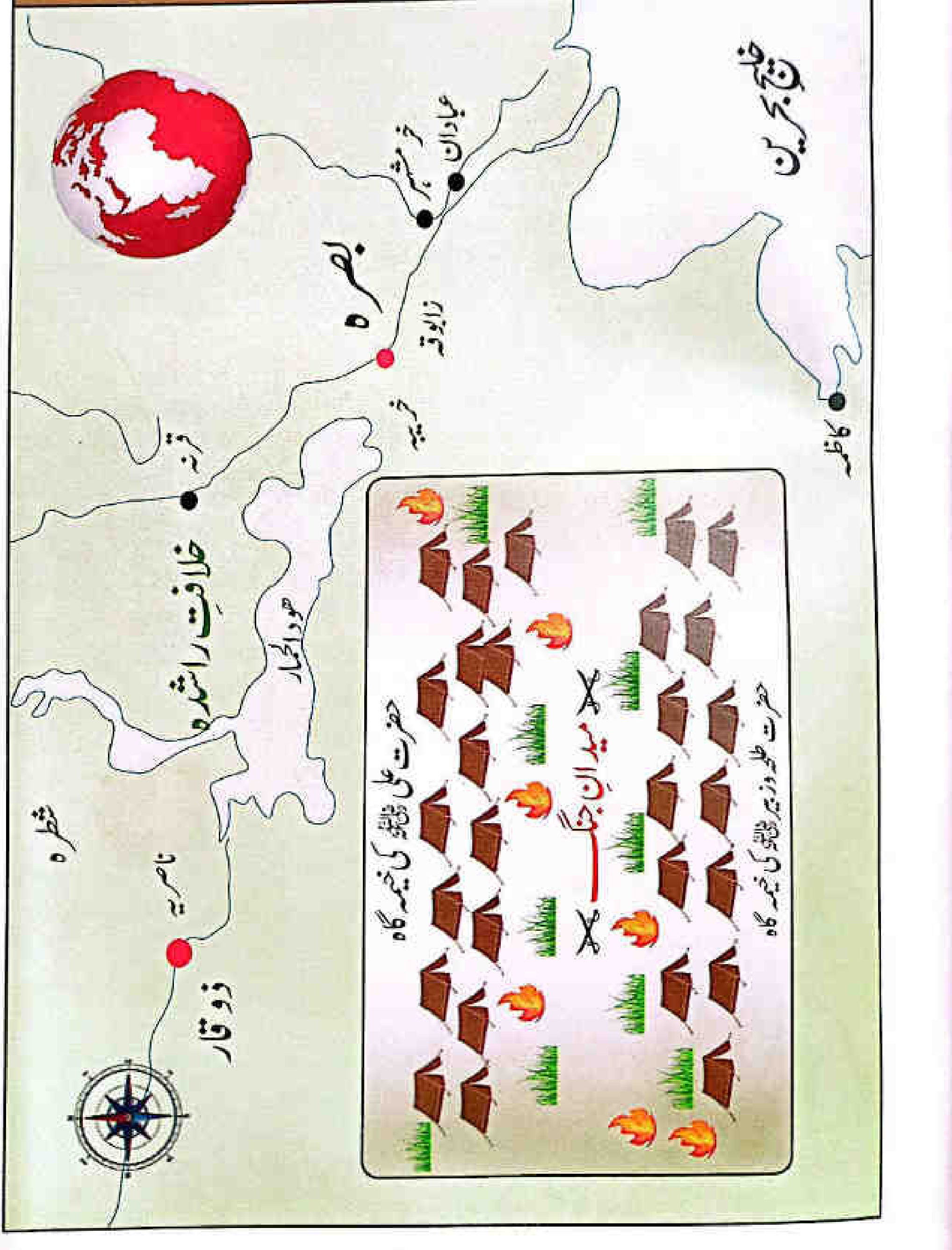
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے جو خاص محبت تھی اس کا اظہار اکثر وبیشتر نطقِ رسالت سے ہوتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا: ''علی میرے ہیں اور میں اُن کا ہوں۔'' ②

ایک بار ارشاد فرمایا: ''علی! تم دنیا وآخرت میں میرے بھائی ہو۔'' ③

---

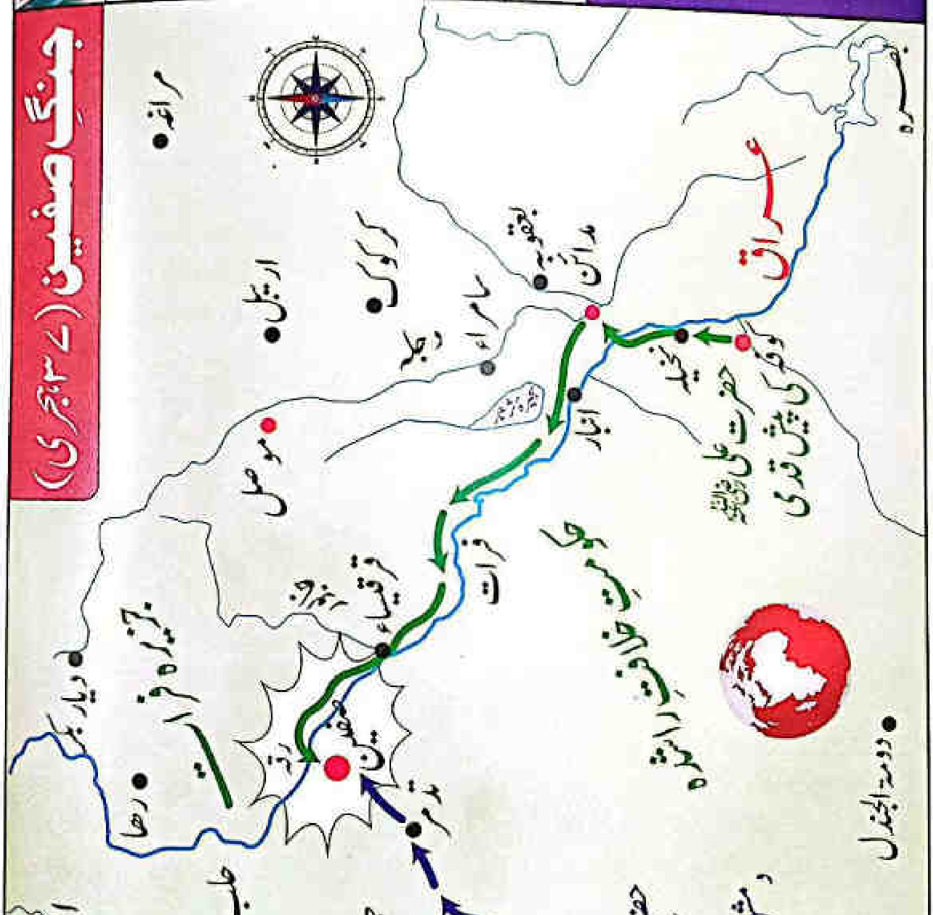
① سیر اعلام النبلاء: ا ص ۲۲۵ تا ۲۵۰، ط الرسالۃ
② سنن الترمذی، ح: ۳۷۱۹ ③ سنن الترمذی، ح: ۳۷۲۰

جنگِ جمل (۳۶ہجری)



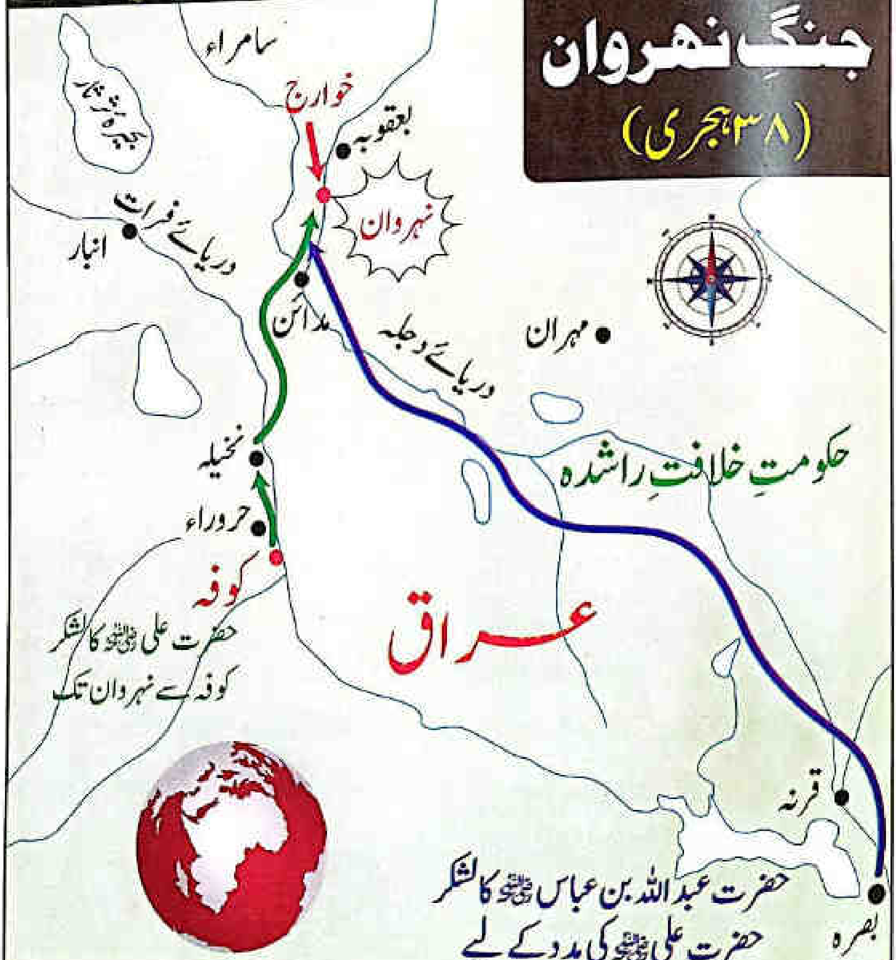


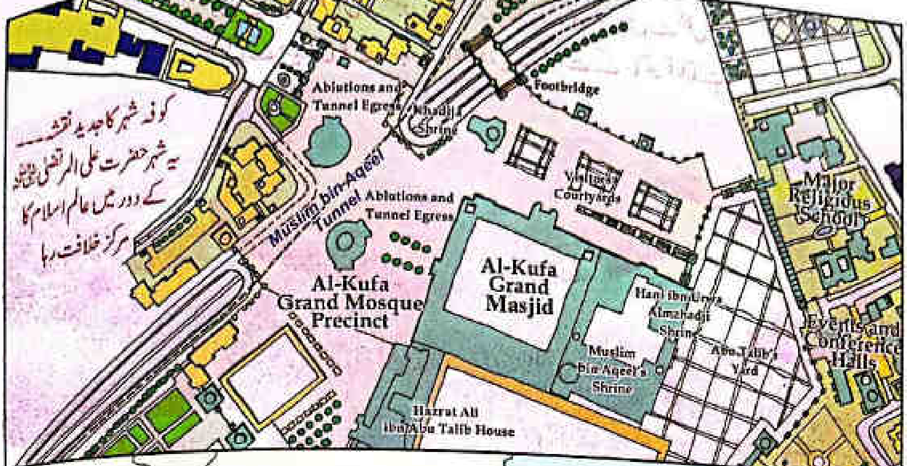
رقہ شہر کے ساتھ دریائے فرات پر قائم جدید پل۔۔۔ یہاں کشتیوں کا پل بنوا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دریائے فرات عبور کیا تھا۔

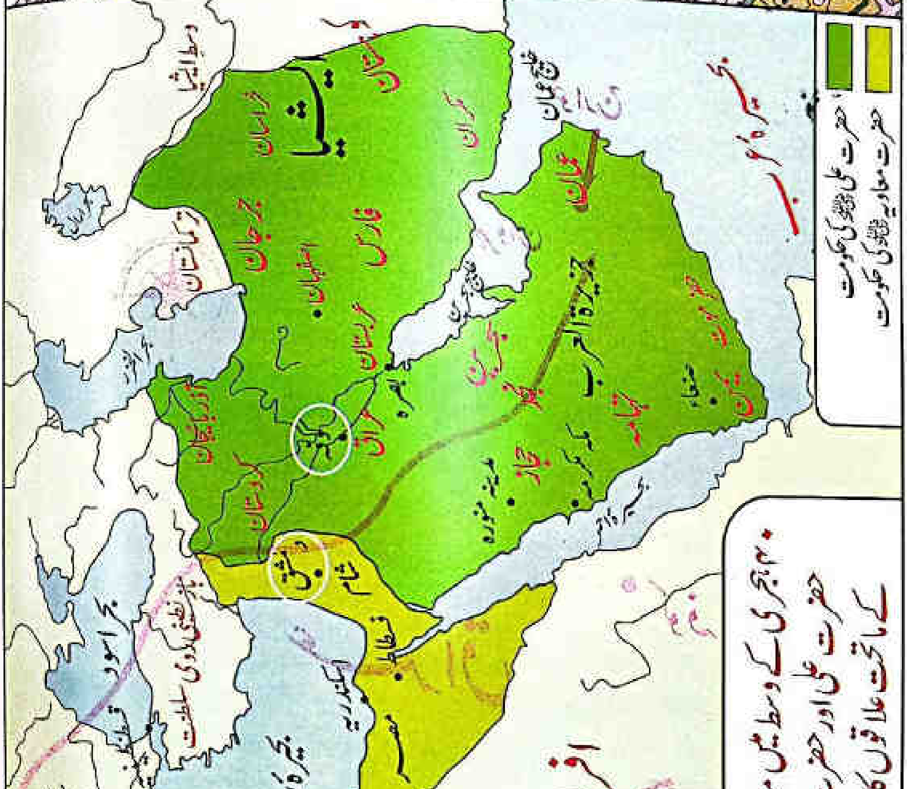


دریائے دجلہ: عراق کا مشہور دریا جو کردستان کے کوہ طوروس سے نکل کر عراق کے میدان کو سیراب کرتا ہوا دریائے فرات کے ساتھ آملتا ہے۔






کوفہ شہر کا جدید نقشہ
یہ شہر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ
کے دور میں عالم اسلام کا
مرکز خلافت رہا
Ablutions and Tunnel Egress
Khadija Shrine
Footbridge
Muslim bin Aqeel Tunnel
Ablutions and Tunnel Egress
Visitors Courtyards
Major Religious Schools
Al-Kufa Grand Mosque Precinct
Al-Kufa Grand Masjid
Hani ibn Urwa Almazhadji Shrine
Muslim bin Aqeel's Shrine
Abu Talib's Yard
Events and Conference Halls
Hazrat Ali ibn Abu Talib House



حضور ﷺ کو شہادتِ عثمان کے بعد آنے والے فتنوں کی خبروں کے تناظر میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دشمنی اختیار کریں گے، اس لیے آپ ﷺ نے یہ بھی فرما دیا:

"علی سے ہر ایمان والا محبت کرے گا اور ان سے منافق ہی بغض رکھے گا۔"①

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد:

فسادی گروہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے میں اس لیے کامیاب ہو گئے تھے کہ انہوں نے صحابہ کو اپنے دفاع سے منع کر دیا تھا۔ ورنہ بلوائی اتنے طاقتور نہ تھے کہ اہلِ مدینہ کو بالکل دبا لیتے اور من مانی کر کے کسی کو خلیفہ تک بنا دیتے۔ خلیفہ کا تقرر اکابر صحابہ ہی کر سکتے تھے۔ ایسے میں مہاجرین وانصار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے پر متفق ہو گئے کیوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بلند مرتبہ ہستی روئے زمین پر اور کوئی نہ تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے امرِ خلافت کے لیے اُمت کے جن چھ حضرات کی کمیٹی بنائی تھی، اس کے چار افراد حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہو چکے تھے اور آخر میں مسئلہ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان دائرہ رہ گیا تھا۔ اس موقع پر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اگر آپ اپنے سوا کسی اور کو خلافت سونپیں تو وہ کون ہوگا؟ تو ان کا بے ساختہ جواب تھا "علی"۔② حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد عوام وخواص سے استصوابِ رائے کر کے امر خلافت کا فیصلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں کر دیا تھا۔ تاہم یہ حقیقت اسی وقت عیاں ہو گئی تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا خلافت کا حق دار کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے آخری ایام میں ایک بار پھر اکابر صحابہ کے سامنے اظہار فرما چکے تھے کہ ان کے نزدیک منصبِ خلافت کے لیے موزوں ترین شخصیت حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔③ صحابہ کرام کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آخری ایام میں بھیجا ہوا یہ پیغام بھی یاد تھا کہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہیں کہ لوگوں کا معاملہ اب آپ کے حوالے ہے۔ آپ وہی کریں جو اللہ تعالیٰ آپ کے دل میں ڈالیں۔"④ اسی لیے آپ کی خلافت اکابرِ صحابہ کے اتفاق سے منعقد ہوئی تھی۔ ہوا یہ کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تجہیز وتکفین، نمازِ جنازہ اور تدفین کا فریضہ ادا کر دیا گیا تو مہاجرین وانصار کے بہت سے حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کی درخواست کی۔ ان میں حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے جو کہہ رہے تھے: "ابوالحسن! آیئے! ہم آپ سے بیعت کرتے ہیں۔" آپ نے فرمایا:

"مجھے اس کی حاجت نہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ جسے منتخب کریں، میں اس پر راضی ہو جاؤں گا۔"⑤

---

① صحیح مسلم، ح: ۲۳۹، کتاب الایمان؛ سنن الترمذی، ح: ۳۷۳۶ ② تاریخ الطبری: ۳ص ۲۳۷

③ لان یلیھا ابن ابی طالب احب الی من ان یلی غیرہ۔ (تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۱۲۰۶/۳)

④ تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۱۲۰۳/۳، ۱۲۰۵ ⑤ تاریخ الطبری: ۳ص ۳۲۷، ۳۲۸

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور تدفین کے اگلے دن ۱۹ ذوالحجہ ۳۵ھ کو مدینہ میں یہ حال تھا کہ لوگ کسی رہنما کے نہ ہونے کے باعث پریشان تھے۔ وہ کبھی ایک صحابی کے پاس جاتے، کبھی دوسرے کے پاس۔ اس دن حضرت علی رضی اللہ عنہ شہر کے بازار سے گزر رہے تھے کہ کچھ لوگوں نے کہا: ''ہاتھ بڑھایئے، ہم بیعت کرتے ہیں۔'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''جلدی مت کرو۔ انتظار کرو کہ لوگ جمع ہو کر باہم مشورہ کرلیں۔''①

آپ رضی اللہ عنہ لوگوں کو ٹالتے رہے۔ آپ کہہ رہے تھے: ''یا الٰہی! میں یہ قدم اٹھانے سے ڈرتا ہوں۔''② اس کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک پیش گوئی تھی کہ جس میں آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا: ''میرے بعد تمہیں ایک سنگین معاملہ درپیش ہوگا۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا تھا: ''میرا دین تو سلامت ہوگا؟'' فرمایا تھا: ''سلامت رہے گا۔''③

بہرکیف صحیح وحسن روایات سے ثابت ہے کہ آخر جمہور اہلِ مدینہ مہاجرین وانصار نے آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی۔

حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما آپ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تحریک پیش کرنے والوں میں سے تھے۔ وہ بار بار کہتے رہے: ''ابوالحسن! آیئے ہم آپ سے بیعت کرتے ہیں۔'' یہی حضرات سب سے پہلے بیعت کرنے والوں میں سے تھے۔④

حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما پر کوئی دباؤ نہ تھا۔ بلکہ ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا تھا: اِنْ شِئْتُمَا فَبَایِعَانِیْ وَاِنْ شِئْتُمَا بَایَعْتُ اَحَدَ کُمَا۔ (اگر تم چاہو تو مجھ سے بیعت کرلو اور اگر چاہو تو میں تم میں سے کسی ایک سے بیعت کرلیتا ہوں۔) مگر ان دونوں حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کو خلیفہ بنانا پسند کیا اور کہا تھا: ''بَلْ نُبَایِعُکَ'' (نہیں بلکہ ہم آپ کی بیعت کریں گے۔)⑤ اس کے بعد ان دونوں حضرات نے اپنی خوشی سے بیعت کی۔⑥

اس بارے میں اور بھی روایات ہیں، مثلاً:

① امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ صحیح سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

''(حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد) لوگوں نے آکر (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے) دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو کر کہا: ''خلیفہ شہید ہوگئے، لوگوں کا کوئی خلیفہ ہونا ضروری ہے۔ ہم آپ سے بڑھ کر اس کا حق دار کسی کو نہیں جانتے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے خلیفہ بنانے کا ارادہ مت کرو۔ میں تمہارے لیے حکمران کی جگہ وزیر اچھا ہوں۔'' لوگوں نے کہا: ''نہیں۔ اللہ کی قسم! ہم آپ سے بہتر کسی کو نہیں جانتے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اگر تم مانتے ہی نہیں تو پھر میری بیعت خفیہ نہیں ہوگی بلکہ میں مسجد میں جاؤں گا، جو چاہے مجھ سے بیعت کرلے۔'' پس وہ مسجد میں گئے اور لوگوں نے ان سے بیعت کرلی۔''⑦

---

① تاریخ الطبری: ۴/۴۳۳، رجالہ ثقات۔
② المستدرک علی الصحیحین، ح: ۴۵۲۷ قال الذہبی: علی شرط البخاری و مسلم
③ المستدرک علی الصحیحین، ح: ۴۶۷۷، قال الذہبی: علی شرط البخاری و مسلم ④ تاریخ الطبری: ۴ ص ۴۲۷، ۴۲۸
⑤ مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۷۰ بسند صحیح الی الزہری ⑥ تاریخ الطبری: ۴/۴۲۸
⑦ فضائل الصحابہ: ۲/۵۷۳

② امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ صحیح سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

"مہاجرین وانصار آئے اور ان سے بیعت کرلی، پھر سب لوگوں نے بیعت کی۔"①

③ امام خلال رحمہ اللہ صحیح سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

"مہاجرین وانصار آئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت ہوگئے، پھر سب لوگوں نے بیعت کرلی۔"②

④ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان صحیح سند کے ساتھ مذکور ہے:

"بے شک طلحہ اور زبیر نے خوشی سے کسی جبر کے بغیر بیعت کی۔"③

یہی روایت حسن سند کے ساتھ بھی منقول ہے۔④

⑤ ایک روایت میں حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما سمیت متعدد حضرات کے متعلق مذکور ہے: بَايَعُوا عَلِيًّا طَائِعِيْنَ غَيْرَ مُكْرَهِيْنَ۔ (انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خوشی کے ساتھ، کسی زور زبردستی کے بغیر کی۔)⑤

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔⑥

⑥ ایک روایت کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو کہا: "آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے۔ میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔" حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: "آپ مجھ سے زیادہ اس منصب کے حق دار ہیں، آپ ہی امیر المؤمنین ہیں۔ آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے۔" چنانچہ سب سے پہلے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بیعت کی۔⑦

⑦ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے فوراً بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی بیعت کرلی۔⑧

کیا حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما سے جبری بیعت لی گئی؟:

بعض روایات میں حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے بیعت سے انکار یا جبراً بیعت کرنے کا ذکر ہے۔⑨

مگر یہ سنداً ضعیف اور متناً منکر ہیں۔ کوئی ابو مخنف سے منقول ہے تو کوئی کسی مجہول یا کسی ضعیف راوی سے۔

ایک طویل روایت میں اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما سے جبراً بیعت لی گئی تھی۔⑩

مگر اس کا راوی سیف بن عمر بالاتفاق ضعیف ہے۔ پس صحیح روایات سے متصادم یہ ضعیف روایات کالعدم ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سب پر لازم:

چونکہ خلافت کے انعقاد میں سابقہ تینوں خلفاء کے لیے بھی اہل مدینہ کی بیعت کافی سمجھی گئی تھی، لہٰذا اب بھی یہی کافی

---

① تاریخ الطبری: ۴ص ۴۲۷، باسناد صحیح ② السنۃ ص ۴۱۷، باسناد صحیح ③ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۹۹

④ تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۱۲۷۵/۴ ⑤ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۰۹، ط الرشد ⑥ فتح الباری: ۵۳/۱۳

⑦ فَقَالَ لِطَلْحَةَ: ابْسُطْ يَدَكَ يَا طَلْحَةُ لِأُبَايِعَكَ، فَقَالَ طَلْحَةُ: انت احق، وانت أمِيرُ الْمُؤْمِنِيْنَ، فَابْسُطْ يَدَكَ، قَالَ: فَبَسَطَ عَلِيٌّ يَدَهُ فَبَايَعَهُ. (تاریخ الطبری: ۴ص ۴۳۴) اسنادہ صحیح الی ابن سیرین، و ذکرہ البلاذری فی انساب الاشراف (۲ص ۲۱۵) رجالہ ثقات۔

⑧ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: رَأَيْتُ الزُّبَيْرَ بَايَعَ عَلِيًّا فِي حَشٍّ مِنْ أَحْشَاشِ الْمَدِينَةِ۔ (انساب الاشراف: ۲ص ۲۱۶، اسنادہ صحیح متصل)

⑨ تاریخ الطبری: ۴۲۹/۴، ۴۳۰/۴، ۴۳۴/۴، ۴۳۵ ⑩ تاریخ الطبری: ۴ص ۴۶۷

تھا۔ چنانچہ دوردراز کے صوبوں اور شہروں کے لیے بھی اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کرلینا واجب تھا۔ جن حضرات نے بیعت نہیں کی تھی جیسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ شام کے بعض صحابہ، انہیں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استحقاقِ خلافت سے انکار نہیں تھا۔ مرکزِ خلافت مدینہ میں تقریباً سبھی صحابہ نے بیعت کرلی تھی، اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اسلامی اصولِ سیاست کے مطابق ثابت ہوگئی تھی اور بعض حضرات کا بیعت نہ کرنا شرعاً اس خلافت کے انعقاد میں کوئی خلل پیدا نہیں کرتا تھا۔ ① امام ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''خلفائے ثلاثہ کے بعد خلافت کے حق دار، امام مرتضیٰ، ولی مجتبیٰ حضرت علی بن ابی طالب تھے جن کی خلافت پر اہلِ حل وعقد کا اتفاق تھا جیسا کہ حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت خزیمہ بن ثابت، حضرت ابوہیثم بن تیہان، حضرت محمد بن مسلمہ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم۔'' ②

بعض اکابر صحابہ کے بیعت نہ کرنے والی ضعیف روایات کا محاکمہ:

آج کل بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد کو مشکوک سمجھتے ہیں اور ایسی روایات پیش کرتے ہیں جن میں اُن کی بیعت سے بعض صحابہ کا گریز مذکور ہے۔ ایک روایت میں حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن مالک، حضرت مسلمۃ بن مخلد، حضرت ابوسعید خدری، حضرت محمد بن مسلمہ، حضرت نعمان بن بشیر، حضرت زید بن ثابت، حضرت رافع بن خدیج، حضرت فضالۃ بن عبید اور حضرت کعب بن عُجرۃ رضی اللہ عنہم کو بیعت سے گریزاں بتایا گیا ہے۔ ③ مگر یہ روایت ضعیف ہے کہ اس کا ایک راوی ''شیخ من بنی ہاشم'' مجہول ہے۔ ایک روایت میں قدامۃ بن مظعون اور عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہما کو بھی انہی میں شمار کیا گیا ہے، ④ مگر اسے ایک رجل مجہول نے الزہری سے نقل کیا ہے، لہٰذا سند ضعیف ہے۔ ایک روایت میں اسامہ بن زید، صہیب رومی، ایوب بن زید اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم کو بھی ان میں شمار کیا گیا ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کو جبر پر محمول کرتے تھے، ⑤ مگر اس کے راوی واقدی کا ضعف ظاہر ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے بیعت کی تو تلوار میرے سر پر تھی۔ اسی روایت میں بیعت نہ کرنے والوں میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت سلمۃ بن وقش رضی اللہ عنہم کے نام بھی ہیں۔ ⑥ مگر اس کا راوی بھی واقدی ہے۔ درحقیقت یہ روایات ان افواہوں کا عکس ہیں جو دورِ فتنہ میں اُمت کو منتشر کرنے کے لیے مشہور کی گئیں اور ضعیف اسناد کے ساتھ نقل ہوتی رہیں۔ ایسی روایات ضعیف ہونے کے علاوہ اُن صحیح روایات کے بھی خلاف ہیں جن میں بلا استثناء تمام اہلِ مدینہ اور مہاجرین وانصار کی بخوشی بیعت کا ذکر ہے۔

---

① الابانۃ عن اصول الدیانۃ لابی الحسن الاشعری: ص ۷۸؛ الاقتصاد فی الاعتقاد للغزالی: ص ۱۵۳؛ الاعتقاد للبیہقی: ص ۳۷۰

② الصواعق المحرقۃ: ۱/۳۳۹، ط الرسالۃ　③ تاریخ الطبری: ۳/ص ۴۲۹، ۴۳۰

④ ایضاً، ص ۴۳۰　⑤ ایضاً، ص ۴۳۰　⑥ ایضاً، ص ۴۳۰، ۴۳۱

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے والوں میں زیادہ تر فسادی تھے؟

بعض لوگ کچھ روایات پیش کر کے دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں مفسدین پیش پیش تھے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سبائیوں کی مدد سے خلیفہ بنے تھے (معاذ اللہ)۔ ایسی روایات محض جھوٹی کہانیاں ہیں۔ اگر ان کو مان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت اسلامی خلافت نہیں سبائیوں کی حکمرانی تھی۔ دراصل باطل فرقوں کے راویوں نے ایسی روایات کو مندرجہ ذیل دو باطل مقاصد کے لیے گھڑا تھا:

1. وہ یہ مشہور کر سکیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حامی تو فقط سبائی گروہ تھا اور یہی گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وارث ہے۔
2. وہ یہ جھوٹا تاثر دے سکیں کہ صحابہ کرام کی اکثریت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے اجتناب کی مجرم تھی۔

اُدھر کچھ نادانوں کی عادت ہے کہ کسی روایت میں اہلِ بیت پر طعن کا کوئی ہلکا سا بھی پہلو ملے، چاہے وہ روایت جھوٹی ہی کیوں نہ ہو، تو اس کی سند دیکھے بغیر اسے ایک اٹل حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پس انہی جعلی روایات کو لے کر انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر سبائیوں کے غلبے کا افسانہ مشہور کر دیا۔

یاد رکھیے کہ اسلامی خلافت کہتے ہی اسے ہیں جس میں ایک عادل اور نیک سیرت شخص، نیک لوگوں کے تعاون اور تائید کے ساتھ با اختیار حکمران بنے اور اسلام کا نفاذ کرے۔ اگر اس کے گرد اکثریت بدکردار لوگوں کی ہو اور وہی اسے اقتدار میں لائے ہوں تو ظاہر ہے وہی حکومت پر حاوی ہوں گے۔ ایسے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ شخص اسلام نافذ کر سکے، چاہے وہ ذاتی طور پر کتنا ہی متقی اور پرہیزگار کیوں نہ ہو۔ اسلامی فقہ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ خلیفہ کا با اختیار ہونا شرط ہے۔ اگر وہ با اختیار نہ ہو تو اُسے خلیفہ نہیں سمجھا جائے گا۔ امام ماوردی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''اگر باغی کسی کو خلیفہ مقرر کر دیں اور اس کی بیعت کر کے اس کے تابع ہو جائیں تو ان کے ہاتھوں میں جکڑا ہوا حکمران، خلافت سے خارج ہوگا۔''[1]

فقہ حنفی کے مشہور ماٴخذ ''مجمع الانہر'' میں ہے:

> ''اگر لوگ خلیفہ کی بیعت کر لیں مگر اس کا حکم اس وجہ سے نافذ نہ ہو کہ وہ لوگوں پر قابو پانے سے عاجز ہو تو وہ خلیفہ نہیں رہے گا۔''[2]

پس اس جھوٹی کہانی کو ماننے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تو کجا، خلیفہ ہی ثابت نہیں ہوتے اور ان کی سیاسی حیثیت کالعدم ہو جاتی ہے۔ نعوذ باللہ کہ ہم ایسا گمان کریں۔ اس قسم کی جھوٹی کہانیاں تاریخ وحدیث کی صحیح روایات کے خلاف ہونے کے علاوہ آیتِ استخلاف (سورۃ النور: ۵۵) سے بھی متصادم ہیں جس میں صحابہ سے خلافتِ ارضی کی عطا کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کا اوّلین مصداق دورِ خلافتِ راشدہ ہے اور بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے۔

---

[1] الاحکام السلطانیۃ، ص ۳۸، ط دار الحدیث قاہرۃ

[2] مجمع الانھر فی شرح ملتقی الابحر للامام شیخی زادہ داماد آفندی: ۱/ ۶۹۹، ط دار احیاء التراث

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اہم اقدامات اور ان کی درست توجیہات

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے اگلے دن ۱۹ ذوالحجہ ۳۵ھ کو ہوئی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں منبر رسول پر رونق افروز ہو کر اس عظیم ذمہ داری کو اپنے سر لیا اور لوگوں سے بیعت خلافت لی۔ ①

ایک روایت میں ہے کہ مدینہ پر پانچ دن بلوائی قابض رہے اور ان کا سردار غافقی بن حرب نمازیں پڑھاتا رہا اور بیعت ۲۴ ذوالحجہ کو ہوئی، مگر یہ روایت سنداً شدید ضعیف اور متناً منکر اور غیر معتبر ہے۔

پہلا خطاب:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''لوگو! میں تمہاری اس ذمہ داری کو قبول کرنا پسند نہیں کرتا تھا مگر تم مجھے منتخب کیے بغیر نہ مانے...... آگاہ رہو کہ مجھے تمہارے بغیر کسی معاملے کا اختیار نہیں ہے...... ہاں تمہارے (بیت المال کے) اموال کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی...... تاہم یہ یاد رکھنا کہ میں تمہاری اجازت کے بغیر ان سے ایک درہم بھی نہیں لے سکوں گا...... کیا تم اس پر راضی ہو؟''

سب نے کہا: ''ہم راضی ہیں۔'' تب آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے بیعت لی۔ بلوائی بھی بیعت میں شامل ہو گئے۔ ②

باغیوں سے بیعت کیوں لی؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا باغیوں سے بیعت لینا اوّلاً تو شرعی بناء پر تھا یعنی باغی اگر مغلوب ہونے سے قبل ہتھیار ڈال دیں اور شرعی حکمران کی بیعت کر لیں تو وہ شرعاً مامون ہو جاتے ہیں اور انہیں تمام حقوق دوبارہ حاصل ہو جاتے ہیں۔ ③

چنانچہ یہ بلوائی بھی اب مامون ہو چکے تھے اور ان کی بیعت رد نہیں کی جا سکتی تھی۔ ثانیاً اسی میں سیاسی مصلحت بھی ملحوظ تھی کیوں کہ فسادیوں کی بڑی تعداد ایسے افراد کی تھی جو بغاوت کے اصل مقاصد سے لاعلم تھے اور صرف نادانی یا جوش میں مدینہ منورہ چلے آئے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنے قبائل کے رئیس تھے جنہیں بڑی حمایت تھی۔ اگر ان سب کی بغاوت کو ناقابل معافی جرم قرار دے کر انہیں سزا دینے کی کوشش کی جاتی تو یہ لوگ یقیناً خود کو بچانے کے لیے مزاحمت کا راستہ اختیار کرتے اور یوں وہی خانہ جنگی شروع ہو جاتی جسے روکنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی جان دی تھی۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ باغی بیعت کر کے مرکزِ خلافت کی وفاداری کا اقرار کر لیں تو انہیں سزا دینے کی گنجائش نہیں، ہاں اُن سے محتاط ضرور رہا جائے گا۔ شرعی دلیل پر مبنی یہ موقف سیاسی حکمت کے بھی عین موافق تھا۔

---

① کذا فی المستدرک للحاکم: ۳/ص ۱۲۳؛ وروی ابن سعد، قال: بُویعَ لِعَلِیِّ بنِ أبی طَالِبٍ بِالْمَدِینَةِ الْغَدَ مِن یَوْمِ قَتْلِ عُثْمَانَ بِالْخِلَافَةِ۔" (طبقات ابن سعد: ۳/ص ۳۱، ط صادر) وقال الحافظ ابن کثیر: "وَذٰلِکَ یَوْمَ السَّبْتِ التَّاسِعَ عَشَرَ مِنْ ذِی الْحِجَّةِ سَنَةَ خَمْسٍ وَثَلَاثِینَ۔" (البدایة والنہایة: سنة ۳۵ھ)

② تاریخ الطبری: ۴/ص ۴۲۸

③ اس مسئلے کے دلائل اور مآخذ کے حوالے آگے آ رہے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمال کو معزول کیوں کیا گیا؟

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک اور اہم مسئلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے حکام کو معزول کرنے یا برقرار رکھنے کا تھا۔ آپ کو خطرہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نائبین ان کی مظلومانہ شہادت پر رنج وغم اور جذبات کی شدت کے باعث مدینہ کی صورتحال کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا نہ کر دیے جائیں۔ یہ حقیقت تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے فوراً بعد شرپسندوں نے جھوٹی شہادتیں دے کر یہ مشہور کر دیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی حصہ ہے۔ مختلف صوبوں کے نائبین جو جائے واردات سے بہت دور تھے، ان افواہوں سے متاثر ہو رہے تھے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: إِنَّ أَقْوَامًا شَهِدُوْا عَلَيْهِ بِالزُّوْرِ عِنْدَ أَهْلِ الشَّامِ أَنَّهُ شَارَكَ فِيْ دَمِ عُثْمَانَ۔

(کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اہلِ شام کے سامنے جھوٹی شہادت دی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک تھے۔)[1]

بعض روایات کے مطابق ان شرپسندوں میں حجاج بن خزیمہ نامی شخص پیش پیش تھا جس نے مدینہ سے شام جا کر ایسے مرثیے کہے جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر براہِ راست اس ظلم کا الزام لگایا تھا۔ اس مرثیے کا ایک شعر یہ تھا:

إِنَّ بَنِيْ عَمِّكَ عَبْدَ الْمُطَّلِبِ ... هُمْ قَتَلُوْا شَيْخَكُمْ بِغَيْرِ الْكَذِبِ

(تمہارے چچازادوں: بنو عبدالمطلب نے ہی تمہارے بزرگ کو قتل کیا ہے۔ اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں۔)[2]

ایسے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدشہ تھا کہ سابق خلیفہ کے نائبین کا مرکز پر اعتماد قائم نہیں ہو سکے گا اور حکومت چلانا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ نے شام اور عراق کے تمام صوبہ داروں کی برطرفی کے احکام جاری کر کے ایسے صحابہ کرام کا تقرر کیا جو آپ رضی اللہ عنہ پر اعتماد کرتے تھے۔ اس میں سابق صوبہ داروں کی آزمائش بھی تھی کہ وہ آپ کے فیصلوں پر بھروسہ کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر وہ آزمائش میں کامیاب ہو جاتے تو انہیں متبادل ذمہ داریاں دی جا سکتی تھیں۔

مگر آپ کا اندیشہ درست نکلا۔ حکام کی برطرفی کے احکام پہنچنے سے پہلے شام، مصر اور عراق میں افواہوں کا بازار گرم ہو چکا تھا اور بہت سے لوگ یقین کر چکے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان[3] کے سرپرست ہیں اور مدینہ میں شورش انہی کے ایماء پر برپا ہوئی تھی۔ چنانچہ بعض صوبہ داروں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اعتماد نہیں کیا اور بیعت سے گریز کرتے ہوئے یہ شرط پیش کر دی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے اپنی بے گناہی ثابت کرتے ہوئے مجرموں کو سزا دیں۔

مسلمانوں کے چار طبقات:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تدبر اور تحمل میں اس وقت وہی حالت تھی جو وفاتِ نبوی پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تھی۔ سب جذبات سے بے حال تھے مگر لگتا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ ٹھوس چٹان ہیں۔ دیگر حضرات کا ردِ عمل جذبات کی شدت کا

---

[1] منہاج السنۃ: ۴۰۶/۳ [2] الاخبار الطوال، ص ۱۵۵

[3] یاد رہے کہ اس وقت لوگ تمام بلوائیوں کو مجازاً "قاتلین عثمان" کہنے لگے تھے۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ اصل قاتل فقط چند افراد تھے۔

تھا، اس لیے اکثر حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی کو سمجھ نہ پائے۔ تاہم بہت سوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات مان لی۔ کچھ نے بیعت کرلی مگر عملاً ساتھ نہ دیا۔ کچھ بیعت کرنے سے رُک گئے اور کچھ نے خاموشی اختیار کرلی۔ اس طرح اس وقت صحابہ کرام کے چار طبقاتِ فکر بن گئے۔ ہر ایک اپنی جگہ اُمت کا ہمدرد، خیر خواہ اور مخلص تھا۔

① پہلا طبقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی حکمتِ عملی سے اتفاق کرنے والے حضرات کا تھا، جو قصاص لینے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تدبیر پر بھروسہ کرتے تھے۔ ان میں حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عمار بن یاسر، حضرت قعقاع بن عمرو، عثمان بن حنیف اور سہل بن حنیف رضی اللہ عنہم جیسے اکابر شامل تھے۔

② دوسرا طبقہ ان حضرات کا تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت تو کرچکے تھے مگر سوچتے تھے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی وجہ سے قصاص لینے سے معذور ہیں تو ہمیں خود قاتلینِ عثمان کے خلاف کارروائی کرنے کا موقع تلاش کرنا چاہیے۔ یہ حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کا خیال تھا۔

③ تیسرا طبقہ ان اکابر کا تھا جن کے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینا بیعت سے بھی مقدم تھا، جیسا کہ حضرت معاویہ، حضرت عمرو بن العاص اور شام کے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہی رائے تھی کیوں کہ ان کے نزدیک قصاص کا مسئلہ چکائے بغیر حضرت علی رضی اللہ عنہ اکابر اور عوام کا اعتماد حاصل نہیں کرسکتے تھے۔

④ چوتھا طبقہ وہ تھا جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے کے باوجود مسلمانوں کے باہمی سیاسی جھگڑوں اور مناقشوں سے یکسو رہنے کا فیصلہ کیا تاکہ اپنی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو تکلیف دینے کی نوبت نہ آئے۔ ان کا یہ فیصلہ ان احادیث کی روشنی میں تھا جن میں اختلاف اور فتنے کے وقت گوشہ نشین رہنے کی ہدایت ہے۔ پس ان حضرات کے سیاسی کش مکش سے کنارہ کش رہنے کو بیعت سے انکار پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کرنے والوں کا موقف:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا مسئلہ خاصا مشکل تھا کیوں کہ ماضی میں ایسی کوئی نظیر نہ تھی۔ یہ مسئلہ نہ ہی فقط بغاوت کا تھا اور نہ ہی محض قتل کا۔ بلکہ یہاں بغاوت اور قتل دونوں جرم یکجا ہوگئے تھے۔ اس لیے مسئلہ پیچیدہ ہوگیا اور نہ صرف عام لوگوں بلکہ بہت سے اکابر صحابہ کرام پر بھی مشتبہ ہوگیا تھا اور ان میں فقہی واجتہادی اختلاف ہوگیا۔ یہ کوئی محال بات نہ تھی۔ چنانچہ حضرات طلحہ وزبیر، سیّدہ عائشہ صدیقہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کا موقف یہ بن گیا کہ تمام مفسدین واجب القتل ہیں، اسی لیے یہ حضرات ان سب کو "قَتَلَةُ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ" یا "قاتلینِ عثمان" کے نام سے یاد کرتے تھے، حالانکہ اصل قاتل چند افراد تھے، باقی مددگار اور ہم خیال تھے۔ حضرات طلحہ وزبیر، سیدہ عائشہ صدیقہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کو معلوم تھا کہ ہر شخص براہِ راست قتل میں شامل نہیں مگر ان کا فقہی مسلک یہ تھا کہ کسی کے قتل میں معاون افراد پر بھی قصاص جاری ہوگا چاہے وہ حملے میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ غالباً ان کے سامنے یہ حدیث تھی:

''اگر آسمان و زمین کے باسی ایک مومن کے قتل میں شریک ہوں تو اللہ ان سب کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے گا۔''①

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک آدمی کے قتل میں سات اَفراد شریک ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ساتوں کو قصاصاً قتل کرایا② اور فرمایا: ''اگر صنعاء شہر کے تمام لوگ اس میں ملوث ہوتے تو میں سب کو قتل کر دیتا۔''③

اس کے ساتھ ہی ان حضرات کا موقف یہ بھی تھا کہ اگر حکومت قصاص نہیں لے رہی تو ہم خود مفسدین کے خلاف کارروائی کا حق رکھتے ہیں۔ غالباً درج ذیل نوع کی احادیث میں انہیں اپنے موقف کی تائید نظر آتی تھی: ''تم میں سے جو کوئی بھی کوئی گناہ دیکھے، تو اسے اپنے ہاتھ سے روک دے۔''④ ایک دوسری حدیث میں ہے: ''اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم، اور ظالم کی مدد اسے ظلم سے روکنا ہے۔''⑤

پس یہ حضرات مدینہ میں فساد مچانے والے ظالموں سے خود بدلہ لینا اور انہیں قصاصاً قتل کرنا درست سمجھتے تھے۔

بہرکیف حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے موقف کے مطابق قائل کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو مکہ چلے گئے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی حج کے بعد وہیں ٹھہر گئی تھیں، ان کے ہم خیال ہو گئیں۔ یہ سب حضرات بصرہ پہنچے۔ مدینہ میں فساد کرنے والے لگ بھگ سات سو سابقہ باغی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کے بعد بصرہ پہنچ چکے تھے جن کا سردار حکیم بن جبلہ تھا۔ وہ اپنا جتھہ لے کر حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے مقابلے پر نکل آیا۔ چونکہ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما ان سب کو قاتلینِ عثمان اور قابلِ قصاص شمار فرماتے تھے، اسی لیے انہوں نے یہ دعائیہ الفاظ کہے: ''اللہ کی حمد ہے جس نے بصرہ کے ان لوگوں کو جن سے ہم انتقام لینا چاہتے ہیں، ایک ساتھ جمع کر دیا۔ اے اللہ! ان میں سے کسی ایک کو بھی باقی نہ چھوڑ، ان سے آج ہی بدلہ لے اور انہیں قتل کر دے۔''⑥ جبکہ یہ بات ظاہر تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں گھسنے اور ان پر قاتلانہ حملہ کرنے والے افراد سینکڑوں نہیں بلکہ گنے چنے تھے۔

یاد رہے کہ حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی حکیم بن جبلہ سے لڑائی دفاعی تھی یعنی حملے کی ابتداء سبائی سردار حکیم بن جبلہ نے کی تھی، اس لیے حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے پاس لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا مگر ان کے دعائیہ کلمات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ان سب لوگوں کو قابلِ سزا سمجھتے تھے۔ ایسے میں جب مجرم خود ہی انہیں لڑنے پر مجبور کرنے لگے تو ان حضرات نے اسے قصاص کا بہترین موقع سمجھ کر اس زور و شور سے جنگ کی کہ ان سات سو میں سے بہت کم اَفراد بچ کر نکل سکے۔ اس کے بعد حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے منادی کرائی: ''خبردار! تمہارے قبائل میں سے جو بھی مدینہ پر چڑھائی کرنے گیا تھا، اسے ہمارے پاس لاؤ۔'' اس اعلان پر ایسے لوگوں کو جو شورش میں شرکت کے لیے مدینہ گئے تھے، چن چن کر گرفتار کیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔⑦ اس کے بعد اس کامیابی کی خبر پر مشتمل مراسلوں میں تحریر کیا گیا:

---

① سنن الترمذی، ح: ۱۳۹۸، ابواب الدیات ② مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۰۷۹

③ مصنف ابن ابی شیبۃ: ۲۷۶۹۳ ④ مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ۔ (مسلم کتاب الایمان، باب النھی عن المنکر)

⑤ صحیح البخاری، ح: ۲۴۴۴، کتاب المظالم ⑥ تاریخ الطبری: ۳/ص ۴۷۰ ⑦ تاریخ الطبری: ۳/ص ۴۷۲

''امیر المومنین (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کے قاتل جنگ کے لیے مسلح ہوئے اور اپنی قتل گاہوں کی طرف نکلے پس ان میں سے حرقوص بن زہیر کے سوا کوئی بچ کر نہ جاسکا۔''①

مسئلہ قصاص و بغاوت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا اور ان کا قصاص لینا بلاشبہ آشد ضروری تھا اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حوالے سے اس قدر فکر مند تھے کہ اپنی بیعت خلافت کے وقت دُعا کی تھی: ''مولا! عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لیے مجھ سے ہر قربانی لے کر تو راضی ہوجا۔''② یعنی ان کے نزدیک یہ کام اللہ کی رضا کے حوالے سے انتہائی ضروری تھا۔ مگر اس کے ساتھ اسلامی سزاؤں کے قواعد و ضوابط کا لحاظ بھی لازم تھا اور اس حوالے سے دو اہم چیزیں ان کے سامنے تھیں:

❶ باغی از خود ہتھیار ڈال کر مامون ہوجاتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے جو شرعی دلائل تھے ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ بُغاۃ از خود ہتھیار ڈالنے کے بعد مامون ہوجاتے ہیں اور ان پر کوئی سزا جاری نہیں ہوسکتی۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت معاویہ ان بلوائیوں کو قاتل سمجھتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نظر میں باغی تھے۔ باغی اگر ہتھیار ڈال دے تو اس سے زمانہ بغاوت میں کیے ہوئے فعل کا قصاص اور ضمان نہیں۔''③

حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس کی اصلی وجہ مسئلے کی شرعی صورت ہے کہ اصل قاتل معلوم نہ تھے جن پر قصاص جاری ہوتا، باقی لوگوں کی حیثیت باغیوں سے زیادہ نہ تھی اور باغی جب اطاعت قبول کرلیں تو پھر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔''④

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت تھی:

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡہِمۡ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ

''سوائے ان کے جو توبہ کرلیں اس سے قبل کہ تم ان پر قابو پاؤ تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا۔''⑤

یہ آیت صرف ڈاکوؤں اور راہزنوں سے متعلق نہیں بلکہ باغیوں کا حکم بھی اسی سے ثابت ہوتا ہے جیسا کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس کی یہی تفسیر منقول ہے۔ ایک موقع پر حارثہ بن بدر نامی ایک باغی پکڑے جانے سے قبل از خود ہتھیار ڈال کر حاضر ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے امان دیتے ہوئے یہی آیت پڑھی تھی۔⑥ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس فقہی رائے میں تنہا نہیں تھے بلکہ بعد میں اسے تمام صحابہ کی تائید حاصل ہوگئی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۴۷۲ ② المستدرک علی الصحیحین، ح: ۴۵۲۷، قال الذھبی: علی شرط البخاری و مسلم
③ عقائد الاسلام: ص ۱۲۰ ④ ناصبیت تحقیق کے بھیس میں: ص ۲۶۱
⑤ سورۃ المائدۃ: آیت ۳۴ ⑥ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۲۷۸۹

"جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر لوگوں میں فتنہ برپا ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بات پر اجماع کیا کہ جس نے کوئی خون بہایا ہو، اس پر قصاص نہیں، جس نے تاویل کی وجہ سے عصمت دری کی ہو، اس پر حد نہیں، اور جس نے تاویل کی وجہ سے مال لوٹا ہو، اس پر کوئی جرمانہ نہیں۔ ہاں اگر کوئی اپنا مال بعینہٖ پالے، تو وہ اس کو لوٹایا جائے گا۔" ①

اسی لیے تمام فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر باغی ہتھیار ڈال دیں تو باغیانہ لڑائی کے دوران وہ جس جانی یا مالی نقصان کا باعث بنے اس کی کوئی سزا یا ضمان نہیں۔ امام سرخسی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

"جب باغی تائب ہو جائیں اور اہلِ عدل کے ساتھ مل جائیں تو ان سے ان کے جرائم کا یعنی جانی نقصانات کا کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔" ②

امام نسفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"اور باغی جب امام عادل کے مطیع ہو جائیں تو ان سے گزشتہ کاموں مثلاً: اہلِ عدل کے اموال کے ضیاع، ان کا خون بہانے اور زخمی کرنے کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ پس امام پر باغیوں کو قتل کرنا یا انہیں (بدلہ) طلب کرنے والوں کے سپرد کرنا واجب نہ ہوگا۔" ③

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"باغیوں نے حالتِ جنگ میں ہمارے جن اموال اور جانوں کو ضائع کیا ہو، اس کا ان سے کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا بشرطیکہ وہ تائب ہو جائیں اور ان کی قوتِ دفاع ختم ہو جائے۔" ④

یہی ملا علی قاری رحمہ اللہ نے "الفقہ الاکبر" کی شرح میں لکھا ہے۔ ⑤

باغیوں کے جرائم کی معافی کی شرعی حکمت کے متعلق حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"حکمت اس استثناء کی یہ ہے کہ ایک طرف ڈاکوؤں (اور اسی طرح باغیوں) کی سزا میں یہ شدت اختیار کی گئی ہے کہ پوری جماعت میں سے کسی ایک سے بھی جرم کا صدور ہو تو سزا پوری جماعت کو دی جاتی ہے۔ اس لیے دوسری طرف اس استثناء کے ذریعے معاملہ ہلکا کر دیا گیا کہ توبہ کر لیں تو سزائے دنیا بھی معاف ہو جائے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک سیاسی مصلحت بھی ہے کہ ایک طاقت ور جماعت پر ہر وقت قابو پانا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کے واسطے ترغیب کا دروازہ کھلا رکھا گیا کہ وہ توبہ کی طرف مائل ہو جائیں۔ نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قتلِ نفس ایک انتہائی سزا ہے، اس میں قانونِ اسلام کا رخ یہ ہے کہ اس کا وقوع کم سے کم ہو۔" ⑥

❷ قصاص انہی پر نافذ ہوگا جو قاتلانہ ضرب میں شریک ہوں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک قصاص کی سزا کے مستحق وہی لوگ تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملے میں

① الفقہ الابسط: ص ۴۰ ② المبسوط سرخسی: ۱۰/۱۲۷
③ الاعتماد فی الاعتقاد شرح العمدۃ فی عقیدۃ اہل السنۃ والجماعۃ: ص ۵۰۲ ④ فتاویٰ عالمگیری عربی: ۲/۲۸۳، دار الفکر
⑤ شرح فقہ الاکبر: ص ۷۹، ۸۰، ط مطبع حنفی ⑥ معارف القرآن: ۳/۱۲۲، ۱۲۳

براہِ راست شامل ہوئے۔ فقہ اسلامی میں اس قسم کے مسئلے کو "قَتْلُ الْجَمَاعَةِ بِالْفَرْدِ الْوَاحِد" سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی ایک فرد کے بدلے ایک گروہ سے قصاص لینا۔ ایک فرد کے قتل کے بدلے کئی افراد کو قتل کرنے کا حکم مطلقاً نہیں بلکہ مشروط ہے۔ اہم ترین شرط یہ ہے کہ حملہ آور کی جرح مہلک ہو۔ قتل پر ابھارنے والے، مقتول کو گرفتار کرنے والے یا تماشا دیکھنے والے چاہے اسی گروہ کے ہوں مگر وہ قابلِ قصاص نہیں۔ فتاویٰ شامیہ کے متن تنویر الابصار میں ہے:

يُقْتَلُ جَمْعٌ بِمُفْرَدٍ اِنْ جَرَحَ كُلُّ وَاحِدٍ جُرْحاً مُهْلِكاً۔

"ایک گروہ کو ایک شخص کے بدلے قتل کیا جائے گا بشرطیکہ ان کے ہر فرد نے مہلک زخم لگایا ہو۔"①

اس پر صاحب دُرِّ مختار لکھتے ہیں: "(ایک شخص کے بدلے پوری جماعت کے لوگوں کو) اس وقت قتل کیا جائے گا جب ہر شخص کا لگایا ہوا زخم ایسا ثابت ہو جس سے روح پرواز کر جاتی ہو۔ پس جو لوگ محض تماشائی ہوں یا اُکسانے والے ہوں یا اس طور پر مدد کرنے والے ہوں کہ انہوں نے ایک شخص کو پکڑ کر رکھا ہو تو ان پر قصاص عائد نہیں ہوتا۔"②

اس بحث کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل ناقابلِ قصاص تھا۔ کیوں کہ شرعاً یہ بھی طے ہے کہ باغیوں نے حالتِ معرکہ سے ہٹ کر کسی کو قتل کیا ہو تو بالاتفاق اس کی سزا دی جائے گی۔③

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل معرکے میں نہیں ہوا تھا بلکہ انہیں گھر میں گھس کر شہید کیا گیا تھا اس لیے ان پر جرح مہلک کے مرتکب یقیناً قابلِ قصاص تھے۔ مگر اصل قاتل چند افراد تھے، ان میں سے بعض موقعِ واردات پر قتل کر دیے گئے تھے، بعض فرار اور روپوش ہو گئے تھے۔ نہ تو کوئی قاتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قلمرو میں موجود تھا اور نہ ہی کسی کے قاتل ہونے پر دو افراد کی گواہی مل سکی تھی۔ ایسی گواہی مقتول خلیفہ کی اہلیہ حضرت نائلہ دے سکتی تھیں یا ان کے غلام، کیوں کہ وہ موقع پر موجود تھے۔ مگر غلام جھڑپ میں شہید ہو گئے تھے اور اہلِ خانہ قاتلوں کی نشاندہی نہیں کر سکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت نائلہ سے قاتلوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بطورِ قاتل کسی کا نام نہیں لیا۔ البتہ محمد بن ابی بکر کے گھر میں گھسنے کا ذکر کیا۔④ پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ محمد بن ابی بکر نے قتل کی نیت سے گھر میں گھسنے کے بعد تائب ہو کر دیگر مفسدین کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ عینی شاہدین میں اُم المؤمنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کے غلام کنانہ بھی تھے۔ ان کا بیان صحیح سند سے منقول ہے جس کے مطابق قاتل محمد بن ابی بکر نہیں، ایک سیاہ فام مصری شخص تھا جس کا نام حمار تھا۔⑤ مختلف

---

① الدر المختار علی تنویر الابصار مع شامی: ج۶ ص ۵۵۶، ۵۵۷، مطبوعہ دار الفکر

② "انما يقتلون اذا وجد من كلّ جرح يصلح لزهوق الروح۔ فاما اذا كانوا نظارة او مغرين ومعينين بامساک واحد، فلا قود عليهم۔" (الدر المختار مع شامی: ج۶ ص ۵۵۶، ۵۵۷، مطبوعہ دار الفکر)

③ الموسوعة الفقهية الكويتية: ۱۴۴/۸ ④ تاریخ الاسلام للذہبی: ۱، ص: ۱۴۹

⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۷۵ ... ایک اور صحیح روایت کے مطابق قاتل کا نام جبلہ بتایا گیا ہے۔ (مسند اسحٰق بن راہویہ، ح: ۸۸۲۰، اسنادہ صحیح) جبلہ یا حمار نامی افراد کا ذکر اس سے قبل یا بعد کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ ان کے انجام کے بارے میں بھی روایات خاموش ہیں۔ بظاہر یہ غیر معروف لوگ تھے اور غالباً انہی لوگوں میں شامل تھے جو فرار ہو کر روپوش ہو گئے تھے۔

روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قاتلوں میں سے تین آدمی: سودان بن حمران، قُتیرہ اور کلثوم بن تُجیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلاموں کے ہاتھوں گھر ہی میں مارے گئے تھے۔ ① باقی فرار ہو کر شام و مصر کی طرف نکل گئے تھے۔ ②

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نمایاں ترین صفت ہی ''قضاء'' کی تھی۔ صحیح حدیث میں ہے:

'' وَأَقْضَاهُمْ عَلِيٌّ۔ '' (قضاء کے سب سے ماہر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔) ③

مسائل قصاص و بغاوت کا تعلق بھی قضا سے تھا۔ اسی لیے بعد میں ائمہ اربعہ سمیت تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ اس بحرانی دور کے مسائل سے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی اپنی آراء میں مصیب تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے دورِ خلافت میں عملاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی پیروی کی اور اُن مفسدین سے جو قاتل نہ تھے، قصاص نہیں لیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فقہی موقف کا خلاصہ:

اس تمام بحث کا خلاصہ چند نکات ہوئے:

① حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں کی دو قسمیں تھیں: ❶ ایک وہ جنہوں نے گھر میں گھس کر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ ❷ دوسرے وہ جو صرف شورش میں شریک تھے۔ ان میں زیادہ تر نادان اور جوشیلے لوگ تھے جو بہکاوے میں آ کر فسادی بن گئے تھے۔ یہ اڑھائی تین ہزار افراد مدینہ میں بلوہ کرنے کے مرتکب تو تھے مگر سب عملاً قتل میں شامل نہ تھے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک جرحِ مہلک کا مرتکب ہوتا کیوں کہ دارِ عثمان میں اتنے افراد کے گھسنے کی گنجائش نہ تھی۔ پس قتل میں گنے چنے لوگ شریک تھے اور باقی لوگ قاتلوں کے حامی، مددگار اور ہم خیال تھے۔

② قاتلوں میں سے بعض کو موقعِ واردات پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غلاموں نے مار دیا تھا۔ باقی قاتل مصری تھے جو راتوں رات بھاگ کر شام اور مصر کے درمیانی کوہستان میں روپوش ہو گئے تھے اور مدتِ دراز تک وہیں رہے۔ ④

③ مصر و شام کا یہ سرحدی علاقہ جہاں یہ قاتل ایک مدت تک چھپے رہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دسترس سے باہر تھا کیوں کہ شام پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حاکم تھے جبکہ مصر کو بھی ۳۸ھ میں انہوں نے اپنی عمل داری میں شامل کر لیا تھا مگر ان روپوش قاتلوں کا انہیں بھی علم نہ تھا۔ (بعد میں یہ لوگ اتفاقاً ہاتھ لگ گئے جس کا ذکر آگے آئے گا۔) بہر کیف قاتلین عثمان میں سے کوئی نہ تو مدینہ میں تھا، نہ عراق میں۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں بھی کوئی قاتل قطعاً نہ تھا۔ ⑤

---

① تاریخ دمشق: ۳۹ ص ۴۲۱، ۴۲۳؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰ ص ۳۱۹، ط دار ھجر؛

② مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۶۹۱، ط الرشد، اسنادہ صحیح او حسن

③ سنن ابن ماجہ، ح: ۱۵۴، کتاب فضائل الصحابہ باب فضائل زید بن ثابت۔ باسناد صحیح

④ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۶۹۱، ط الرشد، بسند صحیح، رجالہ کلھم ثقات

⑤ جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ طعن کرتے ہیں کہ قاتل ان کے لشکر میں بلکہ ان کے مقربین میں شامل تھے، اُن پر لازم ہے کہ صحیح سند سے یہ دونوں باتیں ثابت کریں: اوّل یہ کہ فلاں فلاں قاتل تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے۔ کیوں کہ یہ دعویٰ طعنِ صحابی پر مشتمل ہے جس میں ضعیف روایت سے استدلال خلافِ اصول ہے۔ اگر خلیفہ راشد پر بھی ضعیف روایات سے طعن جائز ہو جائے تو پھر دیگر صحابہ کا دفاع کیسے ممکن ہوگا؟

ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مملکت یا لشکر میں کچھ ایسے لوگ ضرور تھے جو دارِ عثمان کے محاصرے اور بغاوت میں شریک تھے مگر وہ بغاوت ترک کر کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے شرعاً قابلِ سزا نہ رہے تھے۔

بالفرض اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ شام پر قبضہ کر کے پہاڑوں میں ان چھپے ہوئے قاتلوں کو ڈھونڈ کر قتل کرا دیتے تب بھی تنازعہ ختم نہ ہوتا کیوں کہ قتل میں براہِ راست ملوث افراد کے قابلِ قصاص ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ محلِ نزاع ان دو تین ہزار باغیوں سے قصاص لینا تھا جو قاتل نہ تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک وہ قابلِ قصاص نہ تھے اور اختلاف کرنے والوں کے نزدیک قابلِ قصاص تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتظامی موقف:

ملکی نظم ونسق کو برقرار رکھنے کے حوالے سے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک واضح موقف رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان ان کی اطاعت کریں یا کم از کم مخالفت نہ کریں۔ وہ اس مطالبے میں پوری طرح حق بجانب تھے کیوں کہ وہ خلیفہ مقرر ہو چکے تھے اور شرعی قاعدہ ہے کہ جب کسی مسلمان حکمران کا تقرر ہو جائے تو گناہ کے کاموں کے سوا، تمام امور میں اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے جیسا کہ فرمانِ نبوی ہے:

''مسلمان پر سننا اور ماننا واجب ہے چاہے وہ اسے پسند ہو یا ناپسند ہو جب تک کہ اسے گناہ کا حکم نہ دیا جائے، پس جب گناہ کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا چاہیے اور نہ ماننا چاہیے۔''①

اور ارشادِ نبوی ہے: ''سنو اور مانو اگرچہ تم پر کوئی حبشی غلام حکمران بنا دیا جائے جس کا سر کشمش کی طرح ہو۔''②

پس واضح ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب تھی کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی گناہ یا ایسے کسی کام کا حکم ہرگز نہیں دیا تھا کہ جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کے خلاف ہوتا۔ البتہ صحابہ کرام کا ایک طبقہ یہ سمجھ رہا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کے حکم یعنی قصاص کے نفاذ سے معذور ہیں۔ پس وہ یہی سوچ کر کہ اس وقت اللہ کا حکم قصاص لینا ہے، ان کی اطاعت سے رُکے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً تمام باغیوں کو قتل کرائیں۔

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ بے بسی کے باعث مرکز سے مربوط ہونے کی دعوت دے رہے تھے؟

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مرکز سے وابستگی کی دعوت اس لیے دے رہے تھے کہ سبائی اُن پر مسلط تھے جن کا زور کم کرنے کے لیے پہلے تمام صوبوں کی بیعت لازم تھی اور فی الحال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ بھی طاقت نہ تھی۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ ذرا سوچئے کہ جو حکمران جنگِ صفین میں سپاہیوں کا ایسا لشکرِ جرار لے کر گیا ہو جنہیں صحیح حدیث میں ''اولی بالحق'' اور ''مؤمنین'' کہا گیا ہو،③ کیا اُسے کمزور سمجھا جا سکتا ہے؟

---

① صحیح البخاری، ح: ۷۱۴۴　② صحیح البخاری، ح: ۱۴۲

③ تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين، يقتلها أولى الطائفتين بالحق۔ (صحیح مسلم، ح: ۲۵۰۷؛ سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۶۷) وقال عمار رضی اللہ عنہ: لا أموت في مرضي، حدثني حبيبي رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم أني لا أموت إلا قتلاً بين فئتين مؤمنتين۔ (التاريخ الاوسط: ۱ ص ۷۹)

بات یہ ہے کہ اگر کوئی اہم شخصیت قتل ہو جائے اور اُدھر ملک کے بعض صوبے مرکز سے کٹ جائیں تو قاتلوں کی تلاش دشوار ترین ہو جاتی ہے۔ وہ آسانی سے کبھی ایک اور کبھی دوسرے علاقے میں چھپ سکتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کی تلاش میں کامیابی کا انحصار خلیفہ کے تمام صوبوں کے عاملین سے رابطے، باہمی اعتماد، رازداری، خفیہ خبروں کے تبادلوں اور احکام پر فوراً عمل کرنے پر تھا جس کا ابھی تک ماحول نہ بن سکا تھا۔ ان مفرور قاتلوں کو پکڑنے کے لیے جن کا کوئی سراغ سامنے نہ تھا، تمام صوبوں کا یکجان ہو کر مرکز کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھنا، پیغامات کا تبادلہ کرنا اور جاسوسی نظام کا تمام صوبوں میں فعال ہونا ضروری تھا۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ صحابہ کرام کو صبر و تحمل اختیار کرتے ہوئے مرکز کے ساتھ وابستگی کی دعوت دے رہے تھے۔ نیز آپ رضی اللہ عنہ کا یہ فقہی موقف کہ باغی گروہ از خود سرِ تسلیم خم کردے تو وہ شرعی سزا سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے اور فقط مہلک وار کرنے والے قابلِ قصاص ہوتے ہیں، ابھی تک محلِ نزاع تھا اور یہ بات سمجھانے کے لیے جذبات کا ٹھنڈا ہونا ضروری تھا۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے:

"اللہ کی قسم! میں نے ایک رائے قائم کر رکھی ہے، جس کو آپ ان شاء اللہ تعالیٰ جان لیں گے۔"[1]

پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طاقت کم نہ تھی مگر مشکلات ظاہر تھیں لہٰذا آپ توقف اور تحمل سے کام لے رہے تھے۔

❀❀❀

حضرت علی رضی اللہ عنہ عراق میں

بتایا جا چکا ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فوری طور پر قصاص نہ لیتا دیکھ کر خود حصولِ انصاف کے لیے سرگرم تھے اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے بصرہ جا کر نہ صرف ایک جمعیت تیار کر لی تھی بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کرنے والے بہت سے لوگوں کو دورانِ جنگ قتل کر چکے تھے۔ البتہ ایک شرپسند سردار حُرقوص بن زُہیر اُن سے بچ کر نکل گیا تھا اور اس نے ہزاروں افراد کو جوش دلا کر اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو مدینہ میں حالات کا حزم و احتیاط سے جائزہ لے رہے تھے، جب یہ اطلاع ملی تو انہوں نے عراق جانا ضروری سمجھا۔ کیوں کہ اس طرح کی کارروائیوں کے ردعمل میں پورا عالم اسلام ایک بڑی خانہ جنگی میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ آپ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سے لڑنے جا رہے ہیں مگر رفاعۃ بن رافع رضی اللہ عنہ نے جب سفر کا مقصد پوچھا تو فرمایا: "ہماری نیت بس اصلاح کرنا ہے۔" پوچھا گیا "اگر وہ لوگ نہ مانیں تو؟" فرمایا: "ہم ان کو معذور سمجھ کر چھوڑ دیں گے، ان کے حقوق انہیں دیں گے، خود صبر کر لیں گے۔" دریافت کیا گیا: "اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوں تو؟" فرمایا: "ہم اس وقت تک انہیں کچھ نہ کہیں گے جب تک وہ ہمیں نہ چھیڑیں گے۔"

---

① تاریخ الطبری: ۴ص ۴۳۷

② تاریخ الطبری: ۴ص ۴۷۲، ۴۸۹

پوچھا گیا: ''اگر وہ ہمیں نہ چھوڑیں تو؟'' فرمایا: ''ہم ان سے صرف اپنا دفاع کریں گے۔''①

عراق پہنچ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ اور بصرہ کے درمیان ''ذی قار'' میں قیام کر کے افرادی قوت جمع کرنے کی کوشش کی تا کہ منصب خلافت کی بالادستی ثابت رہے۔ اس کام میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے اہم کردار ادا کیا۔②

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کوشش میں کچھ مشکل ضرور پیش آئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت کے جوش میں بعض لوگوں کا لہجہ دوسرے گروہ کے اکابر کے خلاف تلخ ہو گیا تھا، جس کے باعث باقی لوگ بدظن ہو رہے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کوفہ کے اکابر کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اصل حکمتِ عملی کا علم نہیں تھا۔ وہ ڈر رہے تھے کہ مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں میں جنگ نہ چھڑ جائے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ عراق میں بعض اکابر عوام کو سیاسی معاملات سے بالکل کنارہ کش رہنے کا درس دے رہے تھے۔ چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ یہ اعلان کراتے رہے کہ کسی پہاڑ پر جا کر بکریاں چرانا، دونوں گروہوں میں سے کسی ایک پر ہاتھ اٹھانے سے کہیں بہتر ہے۔③

اس طرح حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ بھی چھ ہزار افراد کے ساتھ دونوں جماعتوں سے الگ رہے۔④

بہرکیف حضرت حسن بن علی اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم اہل کوفہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت پر آمادہ کرنے میں کامیاب رہے اور نو ہزار افراد کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔⑤

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے اس جم غفیر کے سامنے ایک تقریر کی جس مین فرمایا:

''کوفہ والو! میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے تا کہ تم ہمارے ساتھ ہمارے بصرہ والے بھائیوں کے پاس چلو۔ اگر وہ اپنی رائے سے رجوع کر لیں تو یہی ہم چاہتے ہیں۔ اگر وہ نہ مانیں تب بھی ہم ان سے نرمی کا معاملہ کریں گے، ہم شر کی جگہ ہر اُس چیز کو اختیار کریں گے جس میں صلح اور خیر ہو۔''⑥

حضرت علی رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ اب اپنی تدبیر کے مطابق ان لوگوں کو ساتھ لے کر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکر کو ساتھ ملا لیں۔ اس دوران حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو بھی کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی حکمت عملی کامیاب نہیں رہی، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ان دنوں فرمایا کرتے تھے: ''یہ وہی فتنہ ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا جاتا تھا۔'' کسی نے کہا: ''آپ اسے فتنہ بھی کہتے ہیں اور اس میں لڑتے بھی ہیں۔'' فرمایا: ''دراصل ہم بہت غور کرتے ہیں لیکن حل سمجھ نہیں آتا۔ اب تک کوئی ایسا قضیہ پیش نہیں آیا تھا۔ پہلے ہر مہم میں ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ اب اگلا قدم کہاں رکھنا ہے، مگر اس مسئلے میں اب تک سمجھ نہیں آ رہا کہ ہم آگے جا رہے ہیں یا پیچھے؟''⑦

---

① تاریخ الطبری: ۳ ص ۷۹

② صحیح البخاری ۷۱۰۰، ۷۱۰۲، ۷۱۰۵، کتاب الفتن، باب فتنۃ تموج کالبحر

③ تاریخ الطبری: ۳ ص ۵۰۲، ۵۰۳۔ ④ تاریخ الطبری: ۳ ص: ۴۹۸

⑤ تاریخ الطبری: ۳ ص ۴۸۵ ⑥ تاریخ الطبری: ۳ ص ۴۸۷ ⑦ تاریخ الطبری: ۳ ص ۴۸۶

یہ تردد اسی لیے تھا کہ یہ بغاوت اور قصاص جیسے نازک فقہی امور کے مسائل تھے جن میں سب سے زیادہ ماہر حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی تذبذب کے بغیر قدم اٹھا رہے تھے جبکہ دیگر حضرات تذبذب کا شکار تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی طرف سفیر بنا کر بھیجا اور فرمایا:

''انہیں محبت اور اتحاد کی دعوت دینا اور انتشار کے نقصانات سے ڈرانا۔''

حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ پہلے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ملے اور عرض کیا: ''امی جان! آپ کس مقصد سے یہاں تشریف لائی ہیں؟'' انہوں نے فرمایا: ''بیٹا! لوگوں کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے۔''

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے اس مقصد سے اتفاق کرتے ہوئے حضرات طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کو بھی اس مجلس میں تشریف لانے کی دعوت دی اور ان سے کہا: ''ام المؤمنین اپنی آمد کا مقصد لوگوں کی اصلاح بتاتی ہیں۔ آپ اس بارے میں ان سے متفق ہیں یا مخالف؟'' دونوں نے فرمایا: ''ہم متفق ہیں۔''

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے کہا ''تو اس اصلاح کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے؟''

دونوں نے فرمایا: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو پکڑنا۔ اس قضیہ کو پس پشت ڈالنا قرآن مجید کو ترک کرنے کے مترادف ہے، اس کو حل کرنا حکم قرآنی کو زندہ کرنا ہے۔''

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ نے بصرہ کے بلوائیوں میں سے چھ سو کو مارا تو اس معرکے سے بچ نکلنے والے واحد آدمی حرقوص بن زہیر کی حمایت میں چھ ہزار افراد آپ کے خلاف کھڑے ہو چکے ہیں۔ اب اگر آپ اس شخص کو نظر انداز کرتے ہیں تو آپ خود قصاص کے مسئلے کو پس پشت ڈالنے والے بنیں گے۔ اگر اس کی حمایت کرنے والوں سے بھی آپ جنگ کریں گے تو جس خانہ جنگی سے اُمت کو بچانے کے لیے آپ نکلے ہیں، آپ خود اس میں ملوث ہو جائیں گے۔'' ام المؤمنین نے دریافت کیا ''آپ ہی بتایئے، آپ کیا کہتے ہیں؟''

عرض کیا ''میں سمجھتا ہوں کہ اس قضیے کا حل یہ ہے کہ حالات کو پر سکون ہونے دیا جائے۔ حالات معمول پر آئیں گے تو فتنہ پروروں میں پھوٹ پڑ جائے گی، اگر آپ تجدید بیعت کر لیں تو یہ خیر کی علامت اور رحمت کی بشارت ہوگی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لیا جا سکے گا۔ اگر آپ متفق نہ ہوئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون ضائع ہو جائے گا۔ یہ معاملہ کوئی عام مقدمہ نہیں، کسی ایک فرد کا قتل نہیں، جسے ایک شخص، ایک گروہ یا ایک قبیلے نے قتل کیا ہو۔''

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے بات کے وزن کو مانتے ہوئے اس سے پوری طرح اتفاق کیا اور کہا ''اگر حضرت علی تشریف لے آئیں اور وہ یہی رائے رکھتے ہوں تو بات بن جائے گی۔'' ①

قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ نے واپس آکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آگاہ کیا تو وہ بے حد خوش ہوئے۔

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۴۸۷ تا ۴۸۹

جنگِ جمل

اب حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ساتھ بصرہ کے قریب پہنچ گئے۔ سامنے حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھیوں نے پڑاؤ ڈال دیا۔ دونوں قافلوں کے درمیان میدان میں ایک بڑا خیمہ لگا دیا گیا۔ اس میں حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مل بیٹھ کر مشاورت کرتے رہے۔ طے پایا کہ باہم کوئی جنگ نہیں ہوگی اور صلح وصفائی سے مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرتے ہوئے اپنی شرعی ذمہ داریاں پوری کی جائیں گی۔① اس کے باوجود فریقین میں جنگ چھڑ گئی۔

جنگِ جمل کے نازک مسئلے پر ہم تاریخی روایات سے پہلے کتبِ حدیث کی صحیح الاسناد روایات پیش کر رہے ہیں:

① ''زید بن وہب سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ (کوفہ وبصرہ کے درمیان واقع قصبے) ذی قار پہنچے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کو اہلِ کوفہ کی جانب بھیجا (تاکہ انہیں لشکر میں بھرتی کریں) ان لوگوں نے اس میں سستی کی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ (ان کی بات سن کر) اہلِ کوفہ نکل پڑے۔ زید کہتے ہیں کہ میں بھی نکلنے والوں میں شامل تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر سے جنگ کرنے سے احتراز کیا اور انہیں (اتحاد کی) دعوت دی، آخر اہلِ بصرہ نے جنگ چھیڑ دی، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان سے قتال کیا۔''②

② ''دونوں لشکروں کے مابین بڑا خیمہ لگایا گیا جو تین دن لگا رہا، حضرت علی، حضرت زبیر اور حضرت طلحہ وہاں آتے اور جو اللہ نے چاہا، اس کا مذاکرہ کرتے، یہاں تک کہ تیسرے دن زوالِ آفتاب کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خیمہ ہٹوا دیا اور جنگ کا حکم دیا۔ پس ہم ایک دوسرے کی طرف چلے اور ہمارے نیزے باہم گتھ گئے۔''③

③ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو (تابع داری کی) دعوت دی یہاں تک کہ انہوں نے جنگ کا آغاز کیا، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے ظہر کے بعد قتال کیا۔ پس سورج ڈوبنے نہ پایا تھا کہ اونٹ کے گرد دفاع کرنے والوں میں سے کوئی آنکھ جھپکتی باقی نہ رہی۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کسی زخمی کو قتل نہ کرنا، کسی مفرور کا تعاقب نہ کرنا اور جو گھر کا دروازہ بند کرلے وہ مامون ہے۔''④

④ ''یہاں تک کہ جب لشکر قریب آ (کر ٹھہر) گئے تو ان کے غلاموں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہا، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قاری حضرات سوار ہوئے، یہ وہ وقت تھا جب لوگوں نے جنگ شروع کردی تھی۔''⑤

صحیح روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ لڑائی کی ابتداء حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہیں کی، البتہ اپنی قوت بڑھانے کے لیے اہلِ کوفہ کو اپنے ساتھ جمع ہونے کی ترغیب دی۔ فریقِ ثانی سے صلح جوئی کے لیے مذاکرات بھی کیے مگر لشکروں کے غلاموں

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۷۷۷، ط الرشد؛ تاریخ الطبری: ۵۰۶/۳

② شرح معانی الآثار، ح: ۵۱۱۲، کتاب السیر، بسند صحیح متصل ③ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۷۷، بسند صحیح متصل

④ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۳۳، بسند صحیح متصل ⑤ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۵۷

اور جوشیلے لوگوں کی اشتعال انگیزی سے جنگ چھڑ گئی تو خاصا صبر کرنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اصحاب کو حملے کا حکم دیا۔ ظہر سے عصر تک لڑائی ہوئی۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لشکر غالب رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زخمیوں کو قتل کرنے اور مفرورین کا تعاقب کرنے سے منع کیا اور عام امان دے دی۔

تاریخی روایات:

تاریخ میں اور بہت سی مزید جزئیات بھی منقول ہیں جو سنداً ضعف کے باوجود صحیح روایات یا کسی مسلمہ شرعی اصول سے متصادم نہیں، اس لیے جمہور علماء نے انہیں قبول کیا ہے۔ ان میں سے اہم باتیں یہ ہیں:

① عبداللہ بن سبا کے شرپسند رات کے اندھیرے میں فریقین میں شامل ہو گئے، چونکہ دونوں طرف سے اب کسی کی آمد و رفت پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی، اس لیے ان کا دوسرے پڑاؤ میں گھس جانا ذرا بھی مشکل ثابت نہ ہوا۔ ①

② صبح منہ اندھیرے حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے قافلے میں شامل شرپسندوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پڑاؤ پر ہلہ بول دیا۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل شرپسندوں نے حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے حامیوں پر حملہ کر دیا اور تیر چلائے۔ لوگ افراتفری کے عالم میں ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہو گئے اور ہر شخص یہی سمجھا کہ دوسرے فریق نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اچانک حملہ کر دیا ہے چنانچہ ہر طرف سے تلواریں نیاموں سے باہر آ گئیں۔ ②

③ شرپسند گروہ حملے کے ساتھ ہی غلط اطلاعات دے کر لوگوں کو حقیقت سے بے خبر رکھنے اور نعرے لگا کر جذبات کو مشتعل کرنے کی منصوبہ بندی کر چکا تھا۔ ان لوگوں نے حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکر میں آوازیں لگائیں کہ اہل کوفہ نے حملہ کر دیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خیمہ گاہ میں شور مچایا کہ بصرہ والوں نے اچانک دھاوا بول دیا ہے۔ ③

④ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، میدانِ جنگ سے دور، بصرہ کی آبادی میں رہائش پذیر تھیں، بصرہ کے قاضی کعب بن سور رحمہ اللہ نے آ کر انہیں اس الیے کی اطلاع دی اور کہا: ''آپ خود تشریف لے جا کر مسلمانوں کو تلواریں نیام کرنے کا حکم دیں شاید اللہ آپ کی بدولت صلح کی توفیق دے۔''

ام المؤمنین رضی اللہ عنہا اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اونٹ پر سوار میدانِ جنگ میں آئیں اور حضرت کعب کو قرآنِ مجید کا نسخہ دیتے ہوئے فرمایا: ''آپ اللہ کی کتاب لے کر آگے بڑھیے اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیجیے۔''

کعب بن سور قرآنِ کریم کے اوراق کھول کر آگے ہو گئے۔ وہ قرآنِ مجید کے حکم پر صلح کرنے کی دعوت دے رہے تھے کہ شرپسندوں نے تیر چلا کر انہیں شہید کر دیا۔ اس کے بعد ام المؤمنین پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ④

⑤ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے ہاتھ بلند کر کے قاتلینِ عثمان اور ان کے حامیوں کے لیے بددعائیں کرنا شروع کیں۔ لوگ

---

① تاریخ الطبری: ۴/ص ۵۰۶

② تاریخ الطبری: ۴/ص ۵۰۶، ۵۰۷

③ تاریخ الطبری: ۴/ص ۵۰۷ ④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۸۵؛ تاریخ الطبری: ۴/ص 513

آپ کی پکار پر آمین کہہ رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ آوازیں سنائی دیں تو پوچھا ''یہ گونج کیسی ہے؟'' لوگوں نے بتایا کہ ام المؤمنین اور ان کے حامی قاتلانِ عثمان اور ان کے ساتھیوں پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر خود بھی آواز لگائی ''خدایا! عثمان کے قاتلوں اور قاتلوں کے حامیوں پر لعنت کر۔''①

❻ اونٹ پر تشریف فرما ام المؤمنین بلندی کی وجہ سے با آسانی حملے کا نشانہ بن سکتی تھیں اور ان کا ہودج تیروں کی زد میں تھا، یہ دیکھ کر حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رائے دی کہ ام المؤمنین کے اونٹ کو بٹھا دیا جائے تاکہ وہ مزید تیروں کا ہدف نہ بننے پائیں اور ان کی سواری کی لگام تھامنے والے مزید نیزوں کا وار بننے سے بچ سکیں اور لڑائی کا یہ سلسلہ کسی طرح ختم ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تجویز کو پسند فرمایا، حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کے کہنے پر بُجَیر بن دُلجَہ نامی ایک شخص نے جا کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جماعت میں شامل اپنے بھائی عُمرو بن دُلجہ کو پکار کر بلایا اور اپنے لیے امن حاصل کرنے کے بعد جا کر اونٹ کے پاؤں پر تلوار کا وار کیا اور اسے بٹھا دیا۔ اُدھر حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ یہ اعلان کرتے ہوئے آگے بڑھے کہ تم سب کو امن دیا جاتا ہے، چنانچہ اہل بصرہ نے بھی ہاتھ روک لیے۔②

❼ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین کو پوری عزت و تکریم کے ساتھ ہودج سے نکال کر ایک خیمے میں منتقل کرایا۔ پھر خود تشریف لائے اور ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی خیریت معلوم کی۔ ساتھ ہی عرض کیا: ''امی جان! اللہ ہمیں بھی معاف فرمائے اور آپ کو بھی''۔ ام المؤمنین نے بھی جواباً کہا: ''اللہ ہماری اور آپ کی مغفرت فرمائے۔''③

❽ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تمام مقتولین کو یکساں مرتبہ دیا اور اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حریف کے اسلحے کو مالِ غنیمت قرار نہیں دیا، بلکہ گم شدہ اموال کی حیثیت دے کر مسجد میں رکھوا دیا کہ جس کسی کی چیز ہو، نشانی بتا کر لے جائے۔④

حاصلِ کلام:

(الف) دونوں لشکر آمنے سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے کہ عبداللہ بن سبا اور اس کے فسادی ساتھیوں نے دونوں طرف سے تیر چلا کر جنگ چھیڑ دی۔ یعنی جنگ کی ابتداء غیر ارادی طور پر ہوئی تھی۔

(ب) فریقین کے قائدین نے اسے رکوانے کی کوشش کی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جنگ چھڑنے کے بعد بیچ بچاؤ کرنے اونٹ پر میدانِ جنگ میں تشریف لائیں، مگر بات قابو سے باہر ہو چکی تھی اس لیے ان کے اونٹ کے گرد نہ رکنے والا معرکہ شروع ہو گیا۔ اسی لیے اسے جنگِ جمل کہتے ہیں۔

(ج) آخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک تدبیر سے کام لے کر ام المؤمنین کے اونٹ کو بٹھا دیا اور جنگ رک گئی۔

(د) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین کو بصد عزت و احترام مدینہ واپس بھیج دیا۔⑤

---

① تاریخ الطبری: ۳/ص: ۵۱۳، ۵۱۴

② تاریخ الطبری: ۳/ص ۵۲۷ ③ تاریخ الطبری ۳/ص ۵۳۳؛ البدایہ والنہایہ: ۱۰/ص: ۳۶۷، ۳۶۸

④ البدایہ والنہایہ: ۱۰/ص: ۳۶۹ ⑤ تاریخ الطبری: سنۃ ۳۶ھ؛ البدایہ والنہایہ: سنۃ ۳۶ھ

حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کا اپنے اجتہاد سے رجوع اور شہادت:

جنگ کا سب سے دردناک پہلو یہ تھا کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ میں اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ سے ہٹ کر کہیں دور جاتے ہوئے شہید کردیے گئے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو صحیح روایات کے مطابق مروان بن حکم نے تیر چلا کر قتل کیا کیوں کہ اسے بدگمانی تھی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث ہیں۔ ① حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے شہادت سے پہلے لشکرِ علوی کے ایک شخص کے ہاتھ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تجدیدِ بیعت کرلی تھی جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اظہارِ مسرت وتشکر کیا تھا اور اسے اپنی حقانیت کی گواہی قرار دیا تھا۔ ② حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے دورانِ جنگ اپنے بیٹے سے فرمایا:

"اے بیٹے! آج کے دن جو بھی قتل ہوگا وہ ظالم ہوگا یا مظلوم، اور میں اُمید کرتا ہوں کہ میں مظلوم قتل ہوں گا۔" ③

اس کے بعد وہ میدانِ جنگ سے نکل گئے مگر ایک شخص عمرو بن جرموز نے ان کا تعاقب کرکے انہیں شہید کردیا۔ ④

یہ خبر ملنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حلفاً فرمایا: "وہ ڈر کر نہیں بلکہ (اجتہاد سے) رجوع کرکے واپس ہوئے تھے۔" ⑤

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اپنے اجتہاد سے رجوع:

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مروی ہے کہ انہیں جب بھی یہ واقعہ یاد آتا تو اس قدر روتیں کہ بے حال ہوجاتیں اور فرماتیں کاش اس سے پہلے ہی موت آگئی ہوتی۔ ⑥ نیز یہ روایت بھی ان کے رجوع کو ثابت کرتی ہے:

"جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا وقت آیا تو فرمایا: مجھے (حجرہ شریفہ کی بجائے) دیگر امہات المؤمنین کے ساتھ (بقیع میں) دفن کرنا، کیوں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک غلطی کرچکی ہوں۔" ⑦

ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے کچھ مدت بعد اُمت کا اجماع ہوگیا کہ مشاجرات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ برحق تھے۔ جیسا کہ عقائد ومسائلِ کلامیہ میں اہلِ سنت کے سرخیل امام ابومنصور الماتریدی رحمہ اللہ (م ۳۳۳ھ) نے لکھا ہے:

"اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اہلِ جمل یعنی حضرت طلحہ وزبیر وعائشہ رضی اللہ عنہم سے بصرہ میں اور اہلِ صفین یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لشکر سے صفین میں جنگ کرنے میں مصیب تھے۔" ⑧

---

① قال ابن حجر: واخرج یعقوب بن سفیان بسند صحیح، عن قیس بن أبی حازم انّ مروان بن الحکم رای فی الخیل فقال: ھذا أعان علی عثمان، فرماہ بسھم فی رکبتہ فمازال الدم یسیح حتی مات۔ (الاصابۃ: ۳ص ۴۳۲) وعن الجارود بن أبی سبرۃ قال نظر مروان بن الحکم إلی طلحۃ بن عبید اللہ یوم الجمل فقال لا اطلب بثأری بعد الیوم فرماہ بسھم فقتلہ۔ (تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۸۱) وصححہ الحافظ ابن حجر۔ (الاصابۃ: ۳ص ۴۳۲) ② الاعتقاد للبیھقی: ۳۷۵

③ صحیح البخاری، ح: ۳۰۲۹، باب برکۃ الغازی فی مالہ ④ تاریخ الطبری: سنۃ ۳۶ھ

⑤ واللہ ما رجع جبنا ولکنہ رجع تائبا۔ (الاعتقاد للبیھقی، ص ۳۷۱) ⑥ تاریخ الطبری: سنۃ ۳۶ھ

⑦ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۷۷۲؛ المستدرک علی الصحیحین، ح: ۶۷۱۷، قال الذھبی علی شرط البخاری ومسلم

⑧ اجمعوا ان علیا مصیب فی قتالہ أھل الجمل طلحۃ والزبیر وعائشۃ بالبصرۃ وأھل صفین معاویۃ وعسکرہ۔ (کتاب الفرق: ص ۳۴)

ملحوظہ: یاد رہے کہ یہاں غلطی سے خطائے اجتہادی مراد ہے۔ معصیت یا قصداً شریعت کی خلاف ورزی مراد نہیں، اس لیے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ شریک دیگر حضرات کی کردارکشی اور تفسیق وتضلیل ہرگز جائز نہیں۔

اہلِ شام سے اختلاف اور کش مکش

جنگِ جمل کے بعد بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اختلاف برقرار تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف تھا کہ وہ تبھی بیعت کریں گے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ میں فساد کرنے والے سب لوگوں سے قصاص لیں یا انہیں اہلِ شام کے حوالے کردیں۔ وہ فرماتے تھے: ''میری حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑائی فقط حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص پر ہے۔''① اس مطالبے کی تکمیل نہ ہونے کی صورت میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ خود میدانِ عمل میں آنا لازم خیال کرتے تھے کیوں کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چچازاد اور رئیس بنواُمیہ ہونے کے ناطے خود کو ''ولیِ قصاص'' یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص لینے کا شرعاً ذمہ دار سمجھتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ وہ مقتول کے ولی ہیں، اس لیے انہیں حق ہے کہ وہ خود قصاص لیں۔ وہ اس آیت سے استدلال کرتے تھے:②

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا (جو ناحق قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے۔)③

یہ دلیل ایسی قوی معلوم ہوتی تھی کہ ایک زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بھی اس سے متاثر ہوکر اسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے غلبے کا پیش خیمہ تصور کرتے تھے۔④

فقہائے اُمت کا ضابطہ:

اس قضیے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف مع دلائل پیچھے گزر چکا ہے کہ فقط مہلک وار کرنے والے لوگ قابلِ قصاص تھے جو کہ مفرور اور روپوش تھے جبکہ باقی مفسدین فقط باغی تھے جو بیعت کرکے مامون ہوگئے تھے۔ رہا مقتول کے ورثاء کا خود قصاص لینا تو اس پر فقہاء کا اجماع ہے کہ یہ لوگ اگر حکمران کے پاس مقدمہ لے جانے کی بجائے خود قصاص لیں تو یہ درست نہیں بلکہ قصاص لینا حکمران ہی کی ذمہ داری ہے۔⑤ فقہاء کے مطابق مذکورہ آیت میں ''سُلْطَانًا'' کا یہ مطلب نہیں کہ مقتول کے ورثاء قانون ہاتھ میں لے کر خود قاتل کو قتل کرنے کا اختیار رکھتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں عدالت میں قاتل کو قتل کروانے یا معاف کردینے کا اختیار ہے۔ آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی بھی آخری رائے یہی تھی کہ قصاص لینا حکومت کا کام ہے، ورثاء کا نہیں۔⑥ پس دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں ان تمام

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۰۵۵۲۔ بسند حسن ② سورۃ بنی اسرائیل، آیت: ۳۳ ③ تاریخ دمشق: ۵۹ ص ۱۳۰

④ تاریخ المدینۃ لابن شبۃ: ۴ ص ۱۲۵۵، اسنادہ صحیح ⑤ المغنی لابن قدامہ الحنبلی: ۸ ص ۳۰۶، ط مکتبۃ القاھرۃ؛ تفسیر القرطبی: ۳ ص ۲۳۶، ۲۳۵، ط دار الکتب المصریۃ قاھرہ؛ المھذب فی فقہ الامام الشافعی لابی اسحاق الشیرازی: ۳ ص ۲۴۱، ط دار الکتب العلمیۃ؛ الفقہ الاسلامی وادلتہ لزحیلی: ۷ ص ۵۹۹، ط دار الفکر دمشق۔

⑥ السنن الکبریٰ للبیہقی، ح ۱۶۰۸۰، باسناد حسن ؛ وراجع الی: الحجۃ علی اھل المدینۃ: ۴ ص ۳۸۳، ۳۸۲، ط عالم الکتب بیروت؛ معرفۃ السنن والآثار للبیہقی: ۱۲ ص ۲۹، ط جامعۃ الدراسات الاسلامیہ کراتشی ؛ تفسیرا لامام الشافعی: ۲ ص ۱۰۳۵، ط دار التدمریۃ السعودیۃ؛ المجموع شرح المھذب للنووی: ۱۸ ص ۳۵۰، ط دار الفکر

معاملات کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عمل بالکل درست تھا اور اسی لیے فقہاء نے اسے شرعی ضابطے کی حیثیت دی۔ تاہم اختلاف کرنے والے بھی نیک نیت اور مجتہد تھے، پس ان کا احترام ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

اہلِ شام نہ صرف یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت پر آمادہ نہ تھے بلکہ وہاں یہ افواہ عام تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث ہیں۔ اس شبہے کو دور کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ انہوں نے جامع مسجد کوفہ کے منبر پر اعلان کیا: ''اے بنو امیہ! جو چاہے مجھے حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے درمیان کھڑا کر کے قسم لے لے کہ میں نے نہ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہے، نہ اس میں شرکت کی ہے۔''[1]

مگر اہلِ شام کے شکوک پھر بھی دور نہ ہوئے۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور پھر ابو مسلم خولانی رحمہ اللہ کو اپنا سفیر بنا کر اہلِ شام کے پاس بھیجا مگر ان کے تحفظات بدستور برقرار رہے۔[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نیک نیتی، حسنِ کردار اور اعلیٰ صلاحیتوں میں کوئی شبہ نہیں تھا، مگر ان کے بیعت نہ کرنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھیجا گیا معزولی کا حکم مسترد کر دینے سے خلافتِ اسلامیہ انتظامی طور پر دو لخت ہو گئی تھی۔ ایسے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقامِ صحابیت کے اعتراف اور ان کے خلوص پر یقین کے باوجود ایک حکمران کی حیثیت سے مملکتِ اسلامیہ کو دو ٹکڑوں میں بٹنے سے بچانے کے ذمہ دار تھے۔ لہٰذا اہلِ شام کا موقف تبدیل کرنے کی کوششوں کے رائیگاں جانے کے بعد آخر کار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک بڑا لشکر ترتیب دینا شروع کیا اور لوگوں کو اس میں شرکت کی ترغیب دی۔ آپ کے نائب حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے لشکر کی روانگی کے وقت جامع مسجد کوفہ میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''لوگو! (اس مہم کے لیے) نکل پڑو۔ جو نکلے گا، مامون رہے گا۔ ہم اس بات کو عافیت کا ذریعہ سمجھتے ہیں کہ اللہ اُمتِ محمدیہ میں صلح کرا دے اور ان کی محبت و الفت کا رشتہ جوڑ دے۔''[3]

جنگِ صفین:

ذوالحجہ ۳۶ ہجری کے ابتدائی دنوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کی کمان خود کرتے ہوئے فرات کے پار صفین پہنچ گئے جہاں ۷۰ ہزار افراد پر مشتمل شامی لشکر پہلے سے خیمہ زن تھا۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کمان میں ایک لاکھ سپاہی تھے جن میں ۹۰ بدری اور ۸۰۰ بیعتِ رضوان والے صحابہ تھے۔[5] صلح و صفائی کی کوششیں بھی ہوتی رہیں مگر بات نہ بنی۔ آخر کار ۷ صفر، سن ۳۷ ہجری کو باقاعدہ جنگ شروع ہوئی جو تین دن تک جاری رہی۔ عراقی فوج کے سالاروں میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہم پیش پیش تھے۔ شامی فوج کے سالاروں میں حضرت عمرو بن العاص، ذوالکلاع حِمیری اور حضرت حبیب بن مَسلَمہ فِہری رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔[6]

---

① تاریخ دمشق: ۳۵۱/۳۹ ② المنتظم لابن جوزی: ۹۷/۵، تاریخ دمشق: ۱۳۲/۵۹، سیر اعلام النبلاء: ۱۳۰/۳، ط الرسالۃ
③ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۷۴ ④ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۹۳، البدایہ والنہایہ: ۱۰ ص: ۴۹۷
⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۹۳، ۱۹۶، بسند صحیح ⑥ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۹۳

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی شہادت:

اسی کش مکش کے دوران حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے قتل کا سانحہ پیش آیا، جو لشکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اکابر اور اسلام لانے والے اولین چند صحابہ میں سے تھے۔ اپنے موقف کی درستگی پر انہیں اتنا یقین تھا کہ فرما رہے تھے: ''واللہ! اگر اہل شام ہمیں مار مار کر کوہ ہجر کی چوٹیوں تک بھی دھکیل دیں تب بھی مجھے اپنے حق پر ہونے اور مخالفین کی غلطی کا یقین رہے گا۔''① اس سے مخالف کی تکفیر یا تفسیق مراد نہ تھی۔ وہ حریف کو اپنی طرح مسلمان تصور کرتے تھے، چنانچہ جب کسی نے کہا: ''شام والے کافر ہو گئے ہیں'' تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہمارا اور ان کا نبی ایک ہے اور قبلہ بھی ایک ہے، مگر وہ لوگ فتنے کا شکار ہو کر صحیح روش سے ہٹ گئے ہیں۔ جب تک وہ باز نہ آئیں ہم پر ان سے لڑنا لازم ہے۔''②

جنگ کی تیسری شام کو عمار رضی اللہ عنہ نے افطار کے لیے دودھ منگوایا اور فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: تم آخری چیز جو دنیا میں پیو گے، وہ دودھ کا ایک گھونٹ ہوگا۔'' افطار کر کے وہ جنگ میں شریک ہوئے اور شہید ہو گئے۔''③

حضرت عمار رضی اللہ عنہ شام کے ایک نامور افسر ابو الغادیہ جہنی اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ چنانچہ ابو الغادیہ جہنی کا اپنا بیان ہے: ''عمار بن یاسر کو ہم اپنے اچھے لوگوں میں شمار کرتے تھے۔ صفین کے دن وہ پہلے دستے میں پیدل آگے بڑھتے ہوئے دونوں صفوں کے بیچ میں آئے تو ایک شخص نے ان کے گھٹنے پر نیزہ مارا، وہ گرے تو ان کا خود ڈھلک گیا، میں نے وار کیا تو دیکھا وہ عمار کا سر تھا۔''④ نیز حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ عمار رضی اللہ عنہ کو ہم لوگوں نے ہی قتل کیا تھا۔⑤ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک بار عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

''مجھے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم بتا گئے تھے کہ میری موت دو مؤمن جماعتوں کے درمیان قتل سے ہوگی۔''⑥

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صفین میں دونوں متحارب فریق بہرحال اہل ایمان اور مخلص تھے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اکثریت منافقین کی تھی یا اہلِ شام بے دین تھے، سراسر جہالت اور گمراہی ہے۔

دورانِ جنگ اخلاق وشرافت کی مثالیں:

جنگ صفین اس لحاظ سے تاریخ میں ایک بالکل نئی طرز کی جنگ تھی کہ اس میں قتل وقتال کی ہولناکیوں کے ساتھ

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۴۰، ط الرشد؛ مجمع الزوائد، ح: ۱۵۶۰۱ ② مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۴۱

③ الآحاد والمثانی لابن ابی عاصم، ح: ۲۷۲؛ مسند احمد بن حنبل، ح: ۱۹۳۹۳؛ طبقات ابن سعد: ۳/۲۵۷، ط صادر

④ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۲/۳۶۳، رجالہ کلھم ثقات؛ مجمع الزوائد، ح: ۸۲۲۲، قال الھیثمی ورجالہ رجال الصحیح؛ مستدرک حاکم، ح: ۵۶۵۸، رجالہ ثقات

⑤ قد واللہ قتلناہ۔ (سنن نسائی الکبریٰ، ح: ۸۲۱۶) اسنادہ صحیح، واخرجہ ابن سعد ایضاً عن الثقات۔ (طبقات ابن سعد: ۳/۲۶۳، صادر)

⑥ التاریخ الاوسط للامام البخاری: ۱ ص ۷۹

ملحوظہ: حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ثابت ہے: "تقتلہ الفئۃ الباغیۃ" (صحیح مسلم، ح: ۷۵۰۶، باب لاتقوم الساعۃ۔ جامع ترمذی، ح: ۳۱۷۰، باب مناقب عمار رضی اللہ عنہ، بسند صحیح) یہ مسئلہ آج کل معرکۃ الآراء بن گیا ہے، تحقیق کے لیے ملاحظہ فرمایئے: شرح مسلم للنووی، فتح الباری لابن حجر، عمدۃ القاری للعینی، تکملۃ فتح الملھم للشیخ محمد تقی العثمانی مدظلہ العالی۔

ساتھ دونوں طرف سے اخلاق، مروت، شرافت اور کشادہ دلی کی بہترین مثالیں سامنے آرہی تھیں۔ کچھ شرپسندوں کو چھوڑ کر دونوں طرف اکثریت اہلِ ایمان کی تھی۔ یہ اُصول کی جنگ تھی جس میں قوانین کی مکمل پاسداری اور مخالف فریق سے شریفانہ برتاؤ کی بابت ایک معیار دے دیا گیا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ دونوں طرف کی قیادت نامور صحابہ کرام کے ہاتھ میں تھی جن کا مقصدِ حیات ہی اللہ کے رسول کی پیروی تھا۔ چنانچہ تلوار نیاموں میں ڈالتے ہی وہ بھائی بھائی نظر آتے، وہ ایک ہی جگہ سے پانی لیتے، رش کے باوجود کوئی کسی دوسرے کو ذرا بھی اذیت نہ دیتا تھا۔ ایک کو دوسرے کی چیز مل جاتی تو امانت سمجھ کر اس کی حفاظت کرتا اور واپس پہنچانے کی پوری کوشش کرتا۔ ① جنگ جمل کی طرح یہاں بھی دونوں طرف سے کم سے کم جانی نقصان کر کے معاملہ طے کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چنانچہ فریقین نہ کسی زخمی کی جان لینے کی کوشش کرتے، نہ کسی بھاگنے والے پر حملہ کرتے، نہ کسی لاش سے اسلحہ اور سامان اتارتے۔ ②

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اہلِ شام کا کوئی سپاہی گرفتار کر کے لایا جاتا تو یہ وعدہ لے کر اسے چھوڑ دیتے کہ وہ دوبارہ ان کے خلاف جنگ میں شرکت نہیں کرے گا۔ ③

جنگ کے باوجود فریقین ایک دوسرے کے لیے وسعتِ ظرف رکھتے تھے اور ایک دوسرے کو مؤمن مانتے تھے۔ اگرچہ بعض جوشیلے لوگ مبالغہ آمیز الزامات لگاتے تھے مگر اکابر فوراً ان کی اصلاح کر دیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی نے آواز لگائی: ”خدایا! شام والوں پر لعنت فرما۔“ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے منع کرتے ہوئے فرمایا ”تمام شام والوں کو برا مت کہو، ان میں ابدال (جلیل القدر اولیاء) موجود ہیں۔“ ④

جب جنگ کے دوران کھانے پینے، آرام، شہداء کی تدفین اور نمازِ جنازہ کے لیے وقفہ ہوتا تو دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے اور بے تکلف ملتے ملاتے تھے۔ ⑤ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو دونوں فوجوں نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ ⑥ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپاہی بلا تکلف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے افسران کے پیچھے نمازیں ادا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی کھلے دل سے اجازت دی تھی۔ ⑦

لیلۃ الہریر:

جمعرات ۹ صفر کو لڑائی شروع ہوئی تو شام ہو جانے پر بھی نہ رکی۔ اس رات کو لَیْلَۃُ الْھَرِیْر (شب آہ و فغاں) ⑧ کہا جاتا ہے جس میں فریقین کے درمیان انتہائی سخت جنگ ہوئی اور رات کے آخری پہر تک جاری رہی۔ ⑨

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اصل مقصد اتحادِ ملت تھا اور فوج کشی کے باوجود پہلا ہدف حریف پر دباؤ ڈال کر اسے لڑے بغیر

① تاریخ الطبری: ۳ص ۵۷۱ ② المستدرک للحاکم، ح: ۲۶۶۰
③ مصنف ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۵۹، ۳۷۸۶۱، ط الرشد
④ اتحاف الخیرۃ: ۳۵۶/۷، ط دار الوطن؛ مصنف عبد الرزاق مع جامع معمر بن راشد، ح: ۲۰۴۵۵
⑤ مجمع الزوائد للہیثمی، ح: ۱۲۰۳۸ ⑥ تاریخ دمشق: ۳۶۰/۱۰ ⑦ بغیۃ الطلب لابن العدیم: ۱ص ۳۰۲
⑧ لسان العرب: ۵۶۰/۵ ⑨ فتح الباری، التکبیر والتسبیح عند المنام: ۱۲۳/۱۱

مغلوب کرنا تھا۔ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تو اضطراری طور پر جنگ کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر جنگ کی انتہائی شدت دیکھنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ معاملہ یہاں تک پہنچ جائے گا تو میں کوفہ سے ہرگز نہ نکلتا۔''①

لیلۃ الہریر کے آخری پہر مقتولین اور زخمیوں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی، تلواریں ٹوٹ چکی تھیں اور نیزے دُہرے ہوگئے تھے۔ سپاہی تھکن سے چُور ہوکر لڑنے سے عاجز ہورہے تھے۔ اس طرح جنگ رُک گئی۔②

اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ اور شامی سپہ سالار حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے مابین طے پایا کہ مقتولین بہت زیادہ ہوچکے ہیں لہٰذا جنگ روک کر مقتولین کی تدفین کرنی چاہیے۔ اس کے بعد دونوں فریق باہم گھل مل گئے۔③

یہ عارضی جنگ بندی رات کے آخری حصے میں ہوئی تھی۔ صبح کو دونوں فریق تلواریں نیام کرکے ایک دوسرے کے پاس آجارہے تھے اور اپنے اپنے زخمیوں اور مقتولین کو تلاش کرکے لے جارہے تھے۔④

جنگ کے بعد یہاں بھی مقتولین کے بارے میں صحابہ کرام کی مجموعی رائے یہ تھی کہ وہ جنتی ہیں، چاہے کسی بھی صف میں رہ کر لڑتے رہے ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ کے اختتام پر مقتولین کو دیکھنے نکلے تو اپنے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقتول سپاہیوں کے لیے یکساں طور پر دعائے رحمت کی۔ کسی نے پوچھا: ''آپ نے ان کا خون بہانا حلال قرار دیا، پھر ان کے لیے دعائے رحمت کررہے ہیں۔'' فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کے قتل کو ان کے گناہوں کا کفارہ بنادیا ہے۔''⑤

ایک عراقی افسر نے شامی مقتولین میں سے ایک بزرگ کو دیکھا تو بے ساختہ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن'' پڑھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وجہ پوچھی تو افسر نے کہا: ''میں اسے مومن سمجھتا تھا مگر آج یہ گمراہی پر مرا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''یہ اب بھی مومن ہی ہے۔''⑥ پھر فرمایا: ''ہم میں سے اور ان میں سے جو بھی اللہ کی رضا کا طلب گار تھا، وہ نجات پاگیا۔''⑦ یہ بھی فرمایا: ''ہمارے اور ان کے مقتولین جنتی ہیں، معاملے کی تمام ذمہ داری مجھ پر اور معاویہ پر عائد ہوتی ہے۔''⑧ ایسا منصفانہ کلام ایک خلیفۂ راشد ہی کے شایانِ شان تھا۔

ملحوظہ: بعض حضرات کا اصرار ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اختلاف کو بالکل نہ چھیڑا جائے کیوں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے صلح کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفۂ برحق ہوگئے تھے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ بے شک یہ موضوع بلاوجہ نہ چھیڑا جائے مگر تاریخ کے طالبِ علم کو اس دور کے صحیح حالات اور ان کی شرعی حیثیت کا علم ہونا ضروری ہے کیوں کہ روافض اور نواصب ان واقعات کے حوالے سے گمراہ کن نظریات پھیلا کر لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں، پس فرقِ باطلہ کو جواب دینے کے لیے صحیح علم ضروری ہے۔ اسلاف نے بھی انہی مصلحتوں کے تحت یہ چیزیں بیان کی ہیں۔

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۸۵۲، ط الرشد ② الاخبار الطوال، ص ۱۸۸

③ انساب الاشراف: ۳۲۸/۲، ط دار الفکر ④ الاخبار الطوال، ص ۱۸۸

⑤ جامع الاحادیث، مسند علی بن ابی طالب، ج ۳۱ ص: ۳۳۲؛ کنز العمال، ح ۳۱۷۱۵

⑥ جامع الاحادیث، ح ۳۴۷۸۶؛ کنز العمال، ح: ۳۱۷۱۱

⑦ جامع الاحادیث، ح: ۳۴۸۶۲؛ کنز العمال، ح: ۳۱۷۰۷ ⑧ مصنف ابن ابی شیبۃ ح: ۳۷۸۸۰، الرشد

جنگ بندی اور مذاکرات کا دور

جنگ کے نقصانات اور افرادی قوت کے ضیاع کو سامنے رکھتے ہوئے اکابر صحابہ نے بہتر یہی سمجھا کہ مسئلے کا حل مذاکرات کے ذریعے نکالا جائے اور اپنے ایمان، عقیدے اور سابقہ روایات کے عین مطابق اس بار بھی فیصلے کا مدار شریعت محمدیہ پر رکھا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں اس نکتے پر متفق تھے، تاہم اس پیشکش کی سعادت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ملی۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا:

''قرآنِ مجید کا نسخہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج کر انہیں کتاب اللہ کی طرف دعوت دیں وہ اس پیشکش کو مسترد نہیں کریں گے۔'' چنانچہ ایک صاحب یہ پیش کش لے کر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور کہا: ''ہمارے اور آپ کے درمیان (فیصلے کے لیے) یہ اللہ کی کتاب موجود ہے۔ پھر ان صاحب نے یہ آیت تلاوت کی:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ۝

(بھلا تو نے دیکھا ان لوگوں کو جنہیں کتاب کا ایک حصہ عطا کیا گیا، انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے پھر بھی ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور توجہ نہیں دیتا۔) ①

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے توقع کے عین مطابق مثبت جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''ہاں! میں تو اس پیشکش کو سب سے پہلے قبول کرنے والا ہوں۔ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب (فیصلے کے لیے موجود) ہے۔'' ②

جنگ بندی کے لیے قرآن مجید کے نسخے بھی نیزوں پر باندھ کر بلند کیے گئے تھے جیسا کہ جنگ میں شریک عبدالرحمٰن بن ابزی رضی اللہ عنہ سے منقول ایک صحیح اور متصل روایت میں ہے:

''ہم آٹھ سو افراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک ہوئے، بدھ، جمعرات، جمعہ اور شب ہفتہ کو جنگ ہوتی رہی، پھر مصاحفِ قرآنی بلند کیے گئے اور صلح کی دعوت دی۔'' ③

عقلاً بھی اس میں کوئی استبعاد نہیں کہ ہزاروں لوگوں کو یکدم متوجہ کرنے کے لیے قرآن مجید کے ایک یا متعدد نسخوں کو اس طرح بلند کر کے سامنے لایا گیا ہو کہ سب فوراً دیکھ لیں اور صلح پر مائل ہو جائیں۔ مگر عراقی لشکر کے جن لوگوں کا خیال تھا کہ ایک دن مزید جنگ لڑ کر ہم فتح حاصل کر سکتے ہیں، وہ جنگ بندی کے حق میں نہیں تھے۔ ان میں کچھ لوگ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وفادار اور مخلص تھے اور ایک رائے کے درجے میں ایسا کہہ رہے تھے۔ مگر کچھ لوگ محض شر پسند تھے اور چاہتے تھے کہ جنگ کی آگ تیز سے تیز تر ہو۔ انہوں نے جنگ بندی کے فیصلے کو قبول نہ کیا۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ

① سورۂ آل عمران: آیت ۲۳

② مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۹۱۴، ط الرشد؛ مسند احمد، ح: ۱۵۹۷۵؛ تفسیر النسائی: ۲/۳۰۶، باسانید صحیحۃ

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۹۴

اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جنگ بندی کو مسترد کرنے کی بنیاد پر جو گروہ وجود میں آیا، وہ ''خارجی'' کہلایا۔ یہ لوگ ''لا حُکمَ اِلَّا لِلّٰہ'' کا نعرہ لگاتے ہوئے دونوں لشکروں سے الگ ہوگئے۔

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ بندی سے انکار کر رہے تھے؟

بعض روایات کو دیکھ کر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اہلِ شام نے دھوکہ دینے کے لیے جنگ بندی کی تھی۔ اگر ان روایات کا حاصل فقط اتنا سمجھا جائے کہ شامی لشکر نے خود کو بچانے کے لیے صلح کی پیش کش کی تھی تو یہ ایک فطری بات تھی کہ جنگ میں ہر فریق شکستِ فاش سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر بعض روایات میں واقعی اس معاملے کو یوں پیش کیا گیا ہے جیسے شامی صحابہ لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے لیے قرآنِ مجید کو بیچ میں لائے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی انہیں بدنیت سمجھتے تھے۔ ابومخنف کی روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پیش کش سے انکار کرتے ہوئے کہا:

''یہ لوگ نہ کسی دین کے پیروکار ہیں نہ قرآن والے ہیں۔ میں ان کے ساتھ بچپن اور جوانی گزار چکا ہوں۔ یہ بچپن اور جوانی میں بدترین لوگ تھے۔''①

ابومخنف ہالک وتالف راوی کے طور پر مشہور ہے، لہٰذا روایت سنداً شدید ضعیف اور متناً مردود ہے۔ صحیح روایات میں صلح کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات اوپر گزر چکے ہیں۔ نیز خود شیعوں کے مستند مآخذ ''نہج البلاغہ'' میں اعلانِ جنگ بندی کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک گشتی مراسلہ نقل کیا گیا ہے جس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگ بندی پر کھلے دل سے آمادگی ظاہر ہوتی ہے۔ مراسلہ درج ذیل ہے:

''ہمارے معاملے کا آغاز اس طرح ہوا کہ ہم اہلِ شام کے ساتھ میدان میں اکٹھے ہوئے، ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا رب ایک، نبی ایک، ہماری اور ان کی اسلام کے بارے میں دعوت ایک۔ اللہ پر ایمان اور اس کے رسول کی تصدیق کے بارے میں نہ ہم ان سے بڑھ کر تھے نہ وہ ہم سے بڑھ کر۔ صرف ایک بات میں ہمارا تنازعہ ہوا یعنی خونِ عثمان۔ ہم اس سے بری ہیں۔ ہم نے اس کا یہ حل پیش کیا کہ جو مقصد آج حاصل نہیں ہوسکتا اس کا عارضی حل یہ ہے کہ جنگ کی آگ کو ساکت کیا جائے اور لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا ہو جانے دیا جائے۔

جب حکومت مستحکم ہو جائے گی اور حالات سازگار ہوں گے تو ہم اتنے قوت والے ہو جائیں گے کہ حق قصاص کو اس کا مقام دے سکیں۔ لیکن انہوں نے کہا کہ اس کا حل صرف جنگ ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ ہر طرف جنگ نے پاؤں پھیلا دیے اور جڑیں پکڑ لیں، شعلے بھڑک کر پائیدار ہوگئے۔ جب سب نے دیکھا کہ لڑائی نے دونوں فریقوں کو دانتوں سے کاٹنا شروع کر دیا ہے اور ان میں اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں تو وہ میری بات ماننے پر آمادہ ہوگئے۔ میں نے بھی ان کی بات کو مانا اور تیزی سے جنگ بندی کی پیش کش منظور کرلی۔''②

---

① تاریخ الطبری: ۵ص ۴۸، ۶۵، ۸۴

② نہج البلاغۃ، سید شریف رضی، مراسلہ: ۵۸۔ ط، المطبعۃ الادبیۃ، بیروت

یاد رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس مراسلے میں حکومت کے مضبوط اور حالات کے سازگار ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس وقت قاتلوں کی تلاش میں جو رکاوٹ ہے، وہ دور ہو جائے، یعنی جن صوبوں میں امراء نے بیعت نہیں کی، وہ بھی خلافت کے دست و بازو بن کر کام کریں تا کہ تفتیش کا دائرہ ہر طرف پھیلایا جا سکے اور مفرور مجرموں کی تلاش بھرپور انداز میں ہو سکے۔ نیز امن کے حالات میں قصاص کے مسئلے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے فقہی غور و فکر کے مواقع ملیں گے اور درست حل پر اتفاق ہو سکے گا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اپنے اجتہاد سے عملی رجوع اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصویب:

اگر چہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یہ اختلاف ختم نہ ہو سکا مگر یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے دورِ اقتدار میں اس مسئلے پر اپنے اجتہاد کو چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد پر عمل پیرا رہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد اور مطالبہ یہی تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغاوت کے مرتکب تمام اڑھائی تین ہزار افراد قصاصاً قتل کیے جائیں مگر کسی ضعیف ترین روایت میں بھی یہ منقول نہیں کہ انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں باقی اڑھائی تین ہزار باغیوں میں سے کسی کو کچھ کہا ہو۔ بلکہ وہ ان باغیوں پر ہاتھ ڈالنے کا مطالبہ سننا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حکومت سنبھالنے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ گئے تو وہاں شہر کی گلیوں سے گزرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر سے ان کی بیٹی کی آہ و زاری کی صدائیں سنیں جو "یا امیرالمؤمنیناہ! یا امیرالمؤمنیناہ!" پکار رہی تھیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا:

"میری بھتیجی! لوگوں نے ناگواری کے باوجود ہماری اطاعت قبول کی ہے اور ہم نے بھی اپنے غصے کو دبا کر ان سے بردباری کا معاملہ کر لیا ہے۔ اگر ہم تحمل چھوڑ دیں تو وہ بھی ہماری اطاعت ترک کر دیں گے۔ دیکھو! تمہارا امیرالمؤمنین کی بیٹی بن کر رہنا بہر حال اس سے بہتر ہے کہ تم عام معمولی لوگوں میں سے ایک ہو جاؤ۔ پس آج کے بعد میں تمہیں حضرت عثمان کا ذکر کرتے ہرگز نہ سنوں۔" ①

الغرض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی ان سینکڑوں باغیوں کے بارے میں جو بدستِ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے میں ملوث نہ تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فقہی رائے کی اتباع کی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بھی صرف انہی چار پانچ افراد سے قصاص لیا جو گھر میں گھس کر خلیفہ ثالث کو بذاتِ خود قتل کرنے کے مجرم تھے۔ ②

اجتہاد کی تبدیلی کے سوا، اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی کمزوری یا مصلحت کی وجہ سے درگزر

---

① یا ابنة عم! ان الناس قد بذلوا لنا الطاعة علی کرہ، وبذلنا لھم حلماً علی غیظ۔ فان رددنا حلمنا ردوا طاعتھم۔ ولان تکونی بنت امیرالمؤمنین خیر من ان تکونی واحدۃ من الناس۔ فلا اسمعنک بعد الیوم ذکرت عثمان۔ (منھاج السنۃ: ۴/۴۰۸)

② تاریخ الطبری: ۶/۲۰۷، ۲۰۸، ۳۶۵؛ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۶۹۱؛ تاریخ دمشق: ۵۰/۲۵۹، ۲۶۰؛ الاصابۃ: ۵/۳۸۶؛ جمھرۃ انساب العرب، ابن حزم: ۲/۲۳۵

کرتے رہے ہوں گے، کیوں کہ اوّل تو ان کا دور بیس سال تک رہا۔ اتنی طویل مدت تک درگزر کی حکمتِ عملی نہیں اپنائی جاسکتی۔ دوسرے انہیں کبھی سیاسی خلفشار، فوجی قوت میں کمی یا خانہ جنگیوں کا سامنا بھی نہیں رہا کہ جس کی وجہ سے وہ مفسدین کو چھوٹ دیتے رہے ہوں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی ساری جدوجہد کا مرکزی ہدف ہی قصاص لینا تھا۔ مگر حکومت سنبھالنے کے بعد بیس سال تک انہوں نے قصاص نہیں لیا تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کا اجتہاد تبدیل ہوگیا تھا اور تمام مفسدین کو قتل کرانے کی شرعی گنجائش انہیں بھی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دارِ عثمان کا محاصرہ کرنے والے دو مشہور افراد: عمیر الضابئی ۷۵ھ تک اور کمیل بن زیاد ۸۳ھ تک عراق میں زندہ سلامت رہے۔ وہ روپوش بھی نہیں تھے بلکہ اپنے قبائل کی نمائندگی کرتے رہتے تھے۔ آخر حجاج بن یوسف نے انہیں اپنی صوابدید پر قتل کیا۔ [1] ظاہر ہے نہ تو حجاج، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ انصاف پسند تھا اور نہ ہی یہ حضرات عدل اور اتباعِ شریعت میں کسی سے کم تھے، اس لیے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا اور جسے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بعد میں اختیار کیا، وہی شرعی طریقہ تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مسئلہ قصاص صرف سیاسی نعرے کے طور پر استعمال کیا تھا مگر مذکورہ حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اس مکروہ پروپیگنڈے پر ہرگز یقین نہیں کرنا چاہیے۔

یہاں یہ اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساڑھے چار سالہ دور میں بار بار مذاکرات کے باوجود ان کے اجتہاد کو کیوں نہ سمجھا جاسکا۔ کیوں کہ بعض اوقات اجتہادی اختلافات صدیوں بھی چلتے رہتے ہیں جیسا کہ احناف، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے درمیان کئی مسائل ایسے ہیں جن پر صدیوں سے جاری بحث کسی نتیجے پر نہیں پہنچی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قولی رجوع:

اپنے زمانہ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ملاقات حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر چھڑ گیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنایا: ”عَلِيٌّ مَعَ الْحَقِّ أَوِ الْحَقُّ مَعَ عَلِيٍّ حَيْثُ كَانَ“

”علی حق کے ساتھ ہیں یا (یوں فرمایا) حق علی کے ساتھ ہے، وہ جہاں بھی ہو۔“

یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لَوْ سَمِعْتُ هٰذَا مِنَ النَّبِيِّ ﷺ لَمْ أَزَلْ خَادِمًا لِعَلِيٍّ حَتّٰى أَمُوْتَ۔
(اگر میں نے یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لیا ہوتا تو تادمِ مرگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خادم بنا رہتا۔) [2]

ایک روایت کے مطابق حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی سنایا: ”أَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى؛ غَيْرَ أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ۔“

(تمہاری مجھ سے نسبت ایسی ہی ہے جیسا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھی فرق یہ ہے کہ میرے بعد نبی کوئی نہیں ہوگا۔)

---

[1] تاریخ الطبری: ۵/ص ۳۳۳، ۳۳۲، بسند صحیح [2] مجمع الزوائد للهیثمی: ۷/ص ۲۳۶

یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کی تصدیق سیدہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے کرائی۔ جب انہوں نے بھی تصدیق کر دی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''أَمَا إِنِّي لَوْ سَمِعْتُهُ مِنْهُ ﷺ لَمَا قَاتَلْتُ عَلِيًّا۔''

''اگر میں نے یہ حدیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لی ہوتی تو کبھی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال نہ کرتا۔''①

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے بھی اپنے اجتہاد سے رجوع اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عملی و قولی توثیق ہو گئی تو کوئی ایسا نہ رہا جو آخر کار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اجتہاد سے متفق نہ ہو گیا ہو۔

اہلِ جمل اور اہلِ شام مجتہد تھے:

باہمی اختلاف کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ اہلِ جمل اور اہلِ شام کی رائے کا اجتہادی پہلو نظر انداز نہیں فرماتے تھے۔ آپ نے ان حضرات کے خلاف کسی کو تشدد آمیز باتیں کرتے سنا تو منع کر دیا اور فرمایا:

''لا تقولوا۔ انما هم قوم زعموا انا بغينا عليهم وزعمنا انهم بغوا علينا فقاتلنا۔

''ایسا مت کہو! وہ سمجھے کہ ہم نے بغاوت کی ہے اور ہماری رائے میں انہوں نے بغاوت کی ہے۔ پس ہم نے باہم جنگ کی۔''②

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان ارشادات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خود ان کے نزدیک بھی حضرت معاویہ اور حضرت عائشہ سے ان کا اختلاف اجتہادی اختلاف تھا اور وہ نہ صرف یہ کہ انہیں اس بناء پر فاسق نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے حق میں کلماتِ خیر کے سوا کسی بات کے روادار نہ تھے۔''③

نتائج:

① حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دور میں خلیفہ راشد اور خلیفہ برحق تھے۔

② مسئلہ قصاص اور مسئلہ بغاوت میں ان کا اجتہاد بالکل درست تھا۔

③ ان کے بالمقابل آنے والے صحابہ کرام اور تابعین سے اپنے اجتہاد میں خطا ہوئی۔

④ یہ سبھی حضرات مغفور و ماجور اور جنتی ہیں۔ سبھی اُمت کے لیے انتہائی قابلِ احترام ہیں۔

مشاجرات اور غیر جانبدار صحابہ:

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ صحابہ کی ایک بڑی جماعت نے ان مہمات میں شرکت سے گریز کیا تھا۔ ان کے

---

① البدایۃ والنہایۃ، ترجمۃ سعد بن ابی وقاص؛ اتحاف الجماعۃ بما فی الفتن والملاحم للتویجری: ۱ ص ۱۸۵، ۱۸۶

② تعظیم قدر الصلوٰۃ از محمد بن نصر المروزی م ۲۹۴ھ، روایت ۵۹۴؛ منہاج السنۃ از علامہ ابن تیمیہ: ۵ ص ۲۴۵ فصل اللہ امر بالاستغفار لاصحاب محمد؛ تاریخ دمشق: ۱/۳۴۳

③ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق ص ۲۴۲

کے وقت گوشہ نشین رہنے کا حکم ہے۔ مثلاً ایک حدیث سامنے وہ احادیث تھیں جن میں خانہ جنگی سے گریز اور فتنے میں ہے: ''عن قریب ایسے فتنے نمودار ہوں گے جن میں بیٹھنے والا شخص کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا۔''①

ایک اور حدیث میں ہے: ''جب دو مسلمان اپنی تلواروں سے ایک دوسرے کا سامنا کریں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہوں گے۔''②

مگر علمائے اسلام کا کہنا ہے کہ زیادہ اجر پانے والے وہی تھے جنہوں نے تمام مہمات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شانہ بشانہ حصہ لیا، کیوں کہ شرعی قاعدہ یہ ہے کہ اگر عادل خلیفہ رعایا کو کسی مہم میں شرکت کی دعوت دے چاہے وہ کفار سے جہاد ہو یا باغیوں سے جنگ ہو، تو اس میں شرکت کرنی چاہیے۔ گوشہ نشینی کا حکم اس وقت ہے جب کوئی شرعی خلیفہ نہ ہو اور ہر طرف انتشار کی کیفیت ہو۔ چنانچہ امام ابن مودود حنفی رحمہ اللہ (م ۶۸۶ھ) فرماتے ہیں:

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کی ایک جماعت سے فتنے کے وقت بیٹھے رہنا مروی ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت کچھ کرنے سے عاجز ہوں اور جسے قدرت حاصل نہ ہو اس پر کچھ کرنا لازم بھی نہیں ہوتا۔ اور جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''چاہیے کہ آدمی فتنے سے دور رہے اور گھر سے نہ نکلے۔'' تو یہ اس وقت کے لیے ہے جب کوئی خلیفہ نہ ہو جو قتال کی طرف بلا رہا ہو۔ رہی وہ صورت جب خلیفہ دعوت دے رہا ہو اور آدمی کے پاس تونگری اور قدرت ہو تو اس کے لیے پیچھے رہنا جائز نہیں ہوتا۔''③

اسی طرح امام نووی رحمہ اللہ فتنے میں شریک ہونے والوں کے متعلق وعیدوں کی حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

''یہ وعید ان کے لیے ہے جو کسی تاویل کے بغیر عصبیت کے لیے لڑ رہے ہوں۔ .... جان لو کہ صحابہ کے مابین ہونے والی خونریزی اس وعید میں داخل نہیں۔ اہل سنت کا مذہب اور حق بات یہ ہے کہ ان کے بارے میں حسنِ ظن رکھا جائے۔ وہ مجتہد اور متاوّل تھے۔ معصیت یا دنیا ان کا مقصد نہ تھی۔''④

اجتہادی اختلاف کا حکم:

جس مسئلے میں قرآن وسنت کی نصوص واضح نہ ہوں، اُسے کوئی ماہر فقیہ غور وفکر کے ساتھ حل کرے تو یہ عمل اجتہاد کہلاتا ہے۔ اس عمل میں کبھی غلطی بھی ہو سکتی ہے جسے ''خطائے اجتہادی'' کہا جاتا ہے۔ خطائے اجتہادی پر مجتہد کو ہرگز کسی قسم کا گناہ نہیں ہوتا بلکہ اُسے خطاء میں معذور سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اُس نے اپنے طور پر مسئلے کو حل کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ نیز علماء نے لکھا ہے کہ اُس کی کوشش یعنی اجتہاد کا اجر بھی محفوظ ہوتا ہے۔ پس صحابہ کرام یا بعد کے فقہاء سے اگر کہیں اجتہادی خطاء ہوتی ہے تو اس سے ان کے مقام اور عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔⑤

❁❁❁

① صحیح مسلم، ح: ۷۴۲۹، کتاب الفتن، ط دار الجیل ② صحیح مسلم، ح: ۷۴۳۴
③ الاختیار فی تعلیل المختار: ۳ص ۱۵۱، ط الحلبی قاهرة ④ شرح مسلم للنووی، کتاب الفتن
⑤ نور الانوار: ۲ص ۲۲، ۲۳، باب القیاس، بیان حکم الاجتهاد، ط مکتبة البشری

(یونٹ:1.13)

قضیہ تحکیم

جنگِ صفین کے بعد حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان باہمی اختلاف کی وجہ کو دور کرنے کے لیے یہ طے ہوا کہ فریقین اپنا ایک ایک "حَکَم" یا ثالث (فیصلے کا اختیار رکھنے والا نمائندہ) مقرر کردیں۔ دونوں ثالث مل کر بیٹھیں اور اُمت کے درمیان اختلاف کی وجہ دور کریں، مستقل اور پائیدار امن کا کوئی طریقہ وضع کریں۔ ان کا فیصلہ کتاب وسنت کے مطابق اور اُمت کے وسیع تر مفاد میں ہو، جسے دونوں فریق قبول کریں گے۔

صحیح روایات کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس اہم کام کے لیے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بھی چھوڑ کر اپنی رائے سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا اور انہیں فیصلے کا بھرپور اختیار دیتے ہوئے یہاں تک فرمادیا تھا: "تم فیصلہ کردینا، چاہے میری گردن کٹے۔"①

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے انتخاب کی وجہ:

ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے چناؤ کی وجہ یہ تھی کہ وہ عمر، عقل، علم اور تجربے میں بھی ممتاز تھے اور ساتھ ساتھ سیاسی مناقشوں میں غیر جانبدار رہنے کی وجہ سے وہ فریقین کے لیے قابلِ قبول تھے۔ ان کی ذکاوت، دوراندیشی، علم وفضل اور معاملہ فہمی کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں زَبید اور عدن کا عامل بنایا تھا۔② پھر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی وہ بصرہ اور کوفہ میں حاکم اور قاضی کے عہدوں پر رہے، ظاہر ہے اتنے بڑے مناصب پر علم ودانش سے آراستہ شخص ہی فائز ہوسکتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شوریٰ کے اکابر بھی اس انتخاب پر مطمئن تھے، چنانچہ جب حضرت اَحنف بن قیس رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا: "آپ نے دیہی علاقوں کے ایک نرم دل انسان کو مقرر کیا ہے، ان کی جگہ مجھے بھیج دیں تو میں معاملے کو آپ کی مرضی کے مطابق طے کرسکوں گا۔" تو جواب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: "اَحنف! ہمیں چھوڑ دیں۔ ہم اپنے معاملات کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں۔"③

افسوس کہ خانہ ساز روایات میں ایسے عالم فاضل صحابی کو نعوذ باللہ "مغفل" (احمق) مشہور کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ابومخنف اور نصر بن مزاحم کی روایات میں یہ جھوٹا دعویٰ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پر اعتماد نہیں کرتے تھے بلکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو اپنا نمائندہ بنانا چاہتے تھے مگر عراقی لشکر کے خودسر امراء کے اصرار کی وجہ سے وہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یہ اختیار دینے پر مجبور ہوگئے تھے۔④

یہ روایات سنداً انتہائی ضعیف ہونے اور صحیح روایتوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ناقابلِ قبول ہیں۔

---

① مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۵۳ بسند صحیح؛ کتاب الآثار للقاضی ابی یوسف، ح: ۹۲۹، ط العلمیۃ

② تاریخ خلیفۃ ابن خیاط: ص۹۷

③ انساب الاشراف: ۲/۳۳۰ باسناد حسن، ط دار الفکر ④ وقعۃ صفین، نصر بن مزاحم، ص ۵۶۱؛ تاریخ الطبری: ۵/۵۱

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے تقرر کی وجہ:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے مسئلۂ تحکیم کے لیے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مقرر کیے گئے۔ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قابلِ اعتماد رفقاء میں سے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ ذاتِ السلاسل میں انہی کو امیر بنایا تھا۔ ①

اہلِ باطل نے انہیں لالچی اور دنیا پرست مشہور کرنے کی پوری کوشش کی ہے جبکہ ان کے متعلق ارشادِ نبوی ہے:

''عمرو بن العاص قریش کے صالحین میں سے ہیں۔'' ②

اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو صالح اور قابلِ اعتماد سمجھتے تھے۔ نیز دونوں صحابہ کو اُمت کے اکابر کی طرف سے باہمی اتحاد جیسے اہم ترین کام کی ذمہ داری سونپ دینا خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ حضرات نہایت قابل اور مخلص تھے۔

تحکیم کا واقعہ: کیا درست اور کیا غلط!!

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان تصفیے کے لیے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما صفین کی جنگ کے آٹھ ماہ بعد رمضان ۳۷ھ میں عراق اور شام کی سرحد ''اَذرُح'' کے قریب دُومۃ الجَندَل کے مقام پر جمع ہوئے تھے تاکہ اُمت کے دونوں گروہوں کے درمیان تنازعے کا حل تلاش کیا جائے۔ جس اجتماع میں یہ گفتگو ہوئی اسے ''مجلسِ تحکیم'' کہا جاتا ہے اور ان دونوں حضرات کو حَکَمین۔ ③

اس اجتماع میں ہونے والی گفت وشنید کی تفصیل ہم تک کسی معتبر سند کے ذریعے نہیں پہنچ سکی جبکہ اس بارے میں افواہوں اور من گھڑت روایات کی کثرت رہی ہے۔ چنانچہ تاریخ طبری میں مروی ہے:

''تحکیم میں جب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کسی بات پر متفق نہ ہو سکے تو طے کیا کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں کو معزول کر کے خلافت کو مسلمانوں کے مشورے پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جسے پسند کریں اپنا خلیفہ مقرر کرلیں۔ اس کے بعد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا کہ آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں، اس لیے آپ پہلے اعلان کریں تو میں بھی اعلان کردوں۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اعلان کر دیا: ''میں اور ابوموسیٰ ایک بات پر متفق ہو گئے ہیں، ہمیں امید ہے کہ اللہ عزوجل اس کے ذریعے مسلمانوں کی اصلاح فرمادے گا۔ وہ یہ ہے کہ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو معزول کردیں۔ اس لیے میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو معزول کیا۔ اب تم لوگ جسے اہل سمجھو اسے خلافت سونپ دو۔'' اس کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور انہوں نے اعلان کیا:

---

① سیرت ابن ھشام: ۶۲۳/۲

② سنن الترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب عمرو بن العاص، قال الترمذی: ولیس اسنادہ بمتصل۔

③ تاریخ الطبری: ۶۷/۵

''ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کہا وہ آپ نے سن لیا، انہوں نے اپنے ساتھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا ہے، میں بھی انہیں معزول کرتا ہوں مگر میں اپنے ساتھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو برقرار رکھتا ہوں کیوں کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وارث اور ان کے قصاص کے طلب گار ہیں۔'' یہ سن کر حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تم نے مکاری کی اور دھوکہ دیا۔'' اس کے بعد لوگ کھڑے ہو گئے اور ان میں مزید اختلاف پیدا ہو گیا۔''[1]

اس روایت کا راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہے جو ہالک و تالف راوی ہے،[2] لہٰذا اس روایت کی کوئی حیثیت نہیں، نیز درج ذیل پہلوؤں پر غور کریں تو بھی معلوم ہوگا کہ یہ داستان فرضی ہے:

❶ یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ایسی غیر سنجیدہ حرکت کرتے جسے بچگانہ شرارت کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ حکمین کا کام فریقین کے لیے قابلِ قبول بات طے کرنا تھا۔ تو کیا ایک کھلا فریب اہلِ عراق کو راضی یا مجبور کر سکتا تھا؟ کیا ایسی حرکت سے افتراق میں اضافہ نہ ہوتا؟ تو صلح کے لیے بھیجے گئے نمائندہ صحابی ایسا کام کیسے کر سکتے تھے؟

❷ یہ بات ثابت ہے کہ متنازعہ مسئلہ جس پر جنگ صفین چھڑی تھی، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا طریقۂ کار تھا۔ خلافت کے استحقاق پر کوئی تنازعہ نہ تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیعت کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص پر موقوف کر رکھا تھا۔ ان کا ارشاد تھا: ''میں جانتا ہوں علی مجھ سے افضل ہیں، اور خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ وہ قاتلین عثمان کو ہمارے حوالے کر دیں، میں سرِ تسلیم خم کر دوں گا۔''[3]

❸ خلیفہ کا انتخاب عشرہ مبشرہ میں سے ہوتا رہا تھا۔ اس وقت عشرۂ مبشرہ میں سے صرف تین افراد: حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت سعید بن زید اور حضرت علی رضی اللہ عنہم ہی باقی رہ گئے تھے۔ ان تینوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی افضل تھے لہٰذا ان کے سوا اور کون خلافت کا حق دار ہوتا؟

❹ حکمران کو نااہلی، کسی بڑی خیانت یا کسی قومی جرم کی وجہ سے معزول کیا جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں خلافت کی تمام شرائط اور قیادت کی تمام خوبیاں پورے طور پر موجود تھیں۔ ان سے کوئی جرم صادر ہوا تھا نہ قومی خیر خواہی میں کوئی کوتاہی واقع ہوئی تھی جس کی بنیاد پر انہیں برطرف کیا جاتا۔

گفتگو کا آخری دور:

تحکیم میں طویل بحث کے بعد جب متنازعہ امور پر اتفاقِ رائے نہ ہو سکا تو آخر میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا:

مَا تَرىٰ فِي هٰذَا الْأَمْرِ؟ (آپ اس معاملے میں کیا فرماتے ہیں؟)

جواب میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیثیت واضح فرماتے ہوئے کہا:

---

① تاریخ الطبری: ۵ص ۷۰، ۷۱ ② میزان الاعتدال للذھبی: ۳ص: ۲۹۹۲

③ تاریخ دمشق: ۱۳۲/۵۹؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۴۰/۳، وھذا الاسناد حسنہ ابن حجر۔ (فتح الباری: ۸۶/۱۳)

”أَرَى أَنَّهُ مِنَ النَّفَرِ الَّذِيْنَ تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَهُوَ عَنْهُمْ رَاضٍ۔“

”حضرت علی رضی اللہ عنہ میرے علم کے مطابق ان ہستیوں میں سے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اپنی وفات تک راضی تھے۔“

مطلب یہ تھا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے راضی تھے تو اگر آپ بھی غیر مشروط طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر راضی ہو جاتے تو بہتر تھا۔ پھر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا:

فَأَيْنَ تَجْعَلُنِيْ أَنَا وَمُعَاوِيَةَ؟ (تو اس صورت حال میں آپ مجھے اور معاویہ کو کیا حیثیت دیتے ہیں؟)

(یعنی اگر ہم اپنے موقف پر برقرار رہیں تو ہماری کیا حیثیت ہوگی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تعلق کس نوعیت کا ہوگا؟ آیا ہمیں آپ باغی اور متحارب گروہ شمار کریں گے یا ایک الگ حکومت وریاست کی حیثیت دیں گے؟)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جواباً خلیفۂ راشد کے غالب مرتبے کا بھی دفاع کیا اور دوستانہ تعلقات کے امکانات کا اشارہ بھی دے دیا اور فرمایا:

”إِنْ يَسْتَعِنْ بِكُمَا فَفِيْكُمَا مَعُوْنَةٌ وَإِنْ يَسْتَغْنِ عَنْكُمَا فَطَالَ مَا اِسْتَغْنٰى أَمْرُاللّٰهِ عَنْكُمَا۔“

”اگر حضرت علی تم سے تعاون طلب کریں تو تمہارے اندر تعاون کی صلاحیت ہے۔ اگر وہ تم سے بے نیاز رہیں تو بھی (کوئی بات نہیں) کہ بہت عرصہ (یعنی تمہارے اسلام لانے سے قبل) اللہ کا نظام تمہارے بغیر بھی چلتا رہا۔“[1]

مطلب یہ تھا کہ جب تک متنازعہ مسئلے کا حل طے نہیں ہو جاتا، تب تک فریقین دو الگ الگ علاقوں پر قابض رہیں گے اور دو طرفہ تعلقات کی بہتری آئندہ کے حالات پر منحصر ہوگی۔

قدیم مؤرخ خلیفہ بن خیاط تحکیم کی گفتگو کا ذِکر بالکل نہیں کرتے اور نتیجے کے طور پر یہ بیان کرتے ہیں:

”فلم يتفق الحكمان على شيء وافترق الناس۔“

”دونوں ثالث کسی بات پر اتفاق نہ کر سکے اور لوگ منتشر ہو گئے۔“[2]

مجلسِ تحکیم میں جو کچھ ہوا، اسے فتنہ پرور لوگوں نے بہت غلط انداز میں مشہور کیا۔ اس جھوٹے پروپیگنڈے کی گونج اکابر صحابہ کرام تک بھی پہنچ گئی تھی، چنانچہ انہوں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ تحکیم کے اجتماع میں ایسی بدمزگی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مصاحب حضرت حُضَین بن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور پوچھا: ”مجھے اس فیصلے سے آگاہ فرمائیے جس کا ذمہ دار آپ کو اور ابو موسیٰ اشعری کو بنایا گیا تھا۔ آپ نے اس معاملے میں کیا طے کیا تھا؟“ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اس بارے میں لوگوں نے جو کہنا تھا، وہ کہہ چکے ہیں، مگر اللہ کی قسم! بات اس طرح نہیں ہوئی جس طرح لوگوں

① تاریخ دمشق: ۳۶/۱۷۵، ترجمہ: عمرو بن العاص؛ وذکر ھذا الاسناد الامام البخاری (التاریخ الکبیر: ۵/۳۹۸)
② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۹۲

نے کہی ہے۔" ①

معلوم ہوا کہ اکابر اُمت نے جھوٹے پروپیگنڈے کی تردید کی تھی۔ ان میں سے کسی سے بھی قضیۂ تحکیم کی بابت کوئی ایسی روایت منقول نہیں جو تحکیم کے فیصلے میں فریب اور ہنگامے کے افسانے کی تائید کرتی ہو۔

شام میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی بطورِ حکمران بیعت:

تحکیم کے بے نتیجہ ہونے پر عراق اور شام کا ایک پرچم تلے آنا بظاہر ناممکن ہوگیا تھا۔ لہٰذا ذوالقعدہ ۳۷ھ میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک حکمران کے طور پر اہلِ شام سے بیعت لی اور اپنی باضابطہ حکومت کا اعلان کردیا۔ ②

❁❁❁

چند جھڑپیں، مصر کا قضیہ اور خوارج

تحکیم کی مجلس میں کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا، لہٰذا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ گنجائش سمجھتے تھے کہ جن علاقوں پر اہلِ عراق کی گرفت کمزور دیکھیں انہیں زیر نگیں کرنے کی کوشش کریں، اس لیے تحکیم کے واقعے کے بعد انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ماتحت علاقوں میں چند بار مداخلت کی اور بعض جگہ معمولی کشمکش بھی ہوئی۔ ان واقعات کا خلاصہ یہ ہے:

❶ بصرہ کے حاکم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خوارج سے مقابلے کے لیے نکلے تو اس موقع پر بصرہ میں موجود قصاصِ عثمان کی تحریک کے کچھ کارکنوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بصرہ پر قبضے کی دعوت دی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کچھ افراد کو اس مقصد سے بھیجا مگر وہ سب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جرنیل جاریہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں محاصرے کی حالت میں قتل ہوگئے۔ ③

❷ سن ۳۹ ہجری میں حج کے موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید بن شجرہ رضی اللہ عنہ کو حج کے انتظامات سنبھالنے کے لیے بھیجا۔ وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے مقرر کردہ امیرِ حج حضرت قُثَم بن عباس رضی اللہ عنہ ان کے آڑے آئے۔ آخر میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی کوشش سے یہ معاملہ صلح وصفائی سے اس طرح طے پاگیا کہ امارتِ حج حضرت شیبہ بن عثمان رضی اللہ عنہ کے حوالے کردی گئی۔ ④

❸ ایک کوشش حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اَفسر بُسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کی یمن پر لشکر کشی کی شکل میں سامنے آئی جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائب حضرت عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تھے۔ بُسر بن اَرطاۃ رضی اللہ عنہ نے انہیں بے دخل کرکے وہاں قبضہ کرلیا۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے جاریہ بن قدامہ رضی اللہ عنہ تازہ دم فوج لے کر آگئے اور بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کو یمن سے نکلنا پڑا۔ ⑤

---

① تاریخ دمشق: ۱۷۵/۴۶، ترجمۃ: عمرو بن العاص؛ التاریخ الکبیر، امام البخاری: ۳۹۸/۵

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۲؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۵۵۲/۳، تدمری ③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص: ۱۹۶، ۱۹۷

④ مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۷۷۰؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۹۸ ⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۹۸

مصر کا سیاسی بحران:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے شروع ہی سے مصر شدید سیاسی بحران کی زد میں آگیا۔ تین چار برسوں کے اندر اندر مصر میں کئی حاکم تبدیل ہوئے، یعنی: حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ، اشتر نخعی، محمد بن ابی بکر اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں مصر کا دارالحکومت فسطاط باغیوں کی تحریک کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ باغیوں کا سب سے بڑا قافلہ مصر ہی سے مدینہ منورہ گیا تھا اور باغی سردار عبداللہ بن سبا یہیں مقیم تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے مصر کے حاکم حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ تھے، جو شمالی افریقہ کے فاتح تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باغیوں کی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے وہ ۳۵ھ کے آخر میں (غالباً فوج سمیت) مصر سے نکل پڑے تھے مگر راستے میں انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی۔ اس کے بعد وہ فلسطین کے شہر عسقلان میں گوشہ نشین ہوگئے اور کچھ مدت بعد وہیں فوت ہوگئے۔ ①

اِدھر باغی تحریک کے رہنما محمد بن ابی حذیفہ نے "فسطاط" کو حاکم اور فوج سے خالی دیکھ کر وہاں قبضہ کرلیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے پڑوس میں باغیوں کا قبضہ برداشت نہیں کرسکے اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو فوج دے کر وہاں بھیجا، جنہوں نے محمد بن ابی حذیفہ کو قتل کر کے وہاں سے باغیوں کی اجارہ داری ختم کردی۔ ②

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس وقت اسی پر اکتفا کیا اور مصر پر مزید فوج کشی نہ کی۔ اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے اور انہوں نے قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کو مصر کا حاکم مقرر کردیا جو مشہور صحابی حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے فرزند، انصار کے مشہور قبیلے بنوخزرج کے رئیس اور سیاسی بصیرت میں مشہور تھے۔ حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے مصر پہنچ کر عوام سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت لے لی، مگر ایک علاقے "خَرِبتا" ③ کے دس ہزار افراد نے بیعت کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لیے جانے تک مؤخر رکھنے کا اعلان کیا۔ ان لوگوں میں حضرت مَسلَمہ بن مُخَلَّد اور حضرت معاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ بھی تھے۔ حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے ان کی بیعت کو مؤخر رکھا اور ان پر کوئی سختی نہ کی۔ ④

بعد میں کوفہ کے کچھ سردار حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگئے۔ ان کا اصرار تھا کہ انہیں مصر سے برطرف کردیا جائے۔ کچھ لوگ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اشتر نخعی کو مصر کا حاکم بنادیا جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ اشتر نخعی کو اپنے سے دور کردیا جائے چنانچہ قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کردیا اور ان کی جگہ اشتر نخعی کو مصر کا حاکم بنا کر روانہ کردیا۔ اشتر کو راستے میں کسی نے زہریلا شہد پلا کر قتل کردیا۔ ⑤

---

① تاریخ ابن یونس المصری (م۳۴۷ھ): ۱/۴۷۰، ۴۳۱، ط العلمیة

② بعض علماء مثلاً ابن اثیر الجزری نے "خَرِبتا" کو "خرنبا" کہا ہے مگر حموی نے اوّل کو ہی راجح قرار دیا ہے۔ (معجم البلدان: مادة خربتا)

③ تاریخ الطبری: ۴ص ۵۴۶؛ البدایہ والنہایہ: ۱۰ص ۳۸۵ تا ۳۸۷

④ تاریخ الطبری: ۴ص ۵۴۹ ⑤ تاریخ الطبری: ۴ص ۵۵۳

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مصر پر قبضہ:

اشتر نخعی کی موت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا حاکم بنا کر بھیجا۔ انہوں نے مصر پہنچ کر اہلِ خربتا کو بیعت کے لیے ایک ماہ کی مہلت دی اور جب وہ بیعت کو ملتوی رکھنے کے موقف پر قائم رہے تو ان سے جنگ شروع کر دی۔ یہ سن ۳۸ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس کے نتیجے میں مصر میں حالات بہت کشیدہ ہو گئے۔ ①

دس ہزار جنگجو جو حضرت معاویہ بن حُدَیج اور مَسلَمہ بن مُخَلَّد رضی اللہ عنہما کی کمان میں تھے، محمد بن ابی بکر سے مغلوب نہ ہوئے۔ ان حالات کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مصر پر قبضے کا فیصلہ کیا اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو وہاں بھیجا جنہوں نے محمد بن ابی بکر کو شکست دے کر مصر پر قبضہ کر لیا۔ ② اس کش مکش کی انتہا محمد بن ابی بکر کی گرفتاری اور قتل پر جا کر ہوئی۔ اس طرح مصر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قلمرو میں شامل ہو گیا۔ یہ ۳۸ھ کا واقعہ ہے۔ ③

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اخلاص اور صلاحیتوں کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا۔ اسی لیے آپ رضی اللہ عنہ نے صفین سے واپسی پر اپنے حامیوں سے فرمایا:

> ''معاویہ کی حکمرانی کو ناگوار محسوس نہ کرو۔ اللہ کی قسم! اگر تم ان کو کھو بیٹھے تو کندھوں سے سر کٹ کٹ کر یوں گریں گے جیسے حنظل کے پھل۔'' ④

خوارج کا ظہور:

حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جنگ بندی پر اچانک ہزاروں افراد نے مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا اور یکدم ''لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ'' (اللہ کے سوا کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں) کا نعرہ لگاتے ہوئے الگ ہو گئے۔ یہ لوگ ''خوارج'' کہلائے۔ ان کے سرکردہ لوگوں میں کئی ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور سے سبائی تحریک کے سرغنے تھے جن میں حُرقُوص بن زُہَیر اور عبداللہ ابن الکَوَّاء کے نام نمایاں ہیں۔ خوارج، بنیادی طور پر ایسے لوگوں کا گروہ تھا جو شریعت پر عمل میں تشدد کے عادی تھے اور اپنی عبادت وریاضت پر گھمنڈ میں مبتلا تھے۔ ان کی نگاہ میں اکابر صحابہ کا مقام بھی عام انسانوں سے کچھ زیادہ بلند نہیں تھا۔ وہ قرآن مجید کے ظاہری مفہوم پر شدت سے عمل کرتے تھے اور فرامینِ الٰہیہ کی گہرائی میں نہیں جاتے تھے۔ ان میں عام طور پر جذباتی اور سخت مزاج لوگ شامل تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا تھا: ''ان کی نمازیں روزے دیکھ کر تمہیں اپنی نمازیں روزے کم لگیں گے، مگر وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر نشانے سے پار نکل جاتا ہے۔'' ⑤

---

① تاریخ الطبری: ۳/ص ۵۵۷ ② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۹۲، ۱۹۳

③ تاریخ خلیفہ: ص ۱۹۳، بسند صحیح ④ تاریخ دمشق: ۵۹/ص ۱۵۱

⑤ صحیح البخاری، ح: ۲۳۳۲؛ صحیح مسلم، باب ذکر الخوارج

خوارج نے "لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ" کو نعرہ بنالیا۔ اسے "نعرۂ تحکیم" کہا جاتا تھا۔ ①

خوارج اس قدر تشدد پسند تھے کہ وہ اپنے سے اختلاف رکھنے والے ہر شخص کا خون بہانا درست سمجھتے تھے۔ ②

خوارج کی قہر انگیزی اور جنگ نہروان:

جب خوارج نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی طرح ان کے نظریات اور عزائم کا ساتھ دینے پر تیار نہیں تو انہوں نے الگ ہو کر ایک متوازی طاقت کی شکل اختیار کر لی اور عبداللہ بن وہب کو اپنا امیر بنا کر مدائن کے قریب جوخا نامی نہر کے پار عسکری کیمپ لگالیا۔ ③ پھر انہوں نے گرد و نواح میں غارت گری کا طوفان برپا کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اب تک خارجیوں کے خلاف سخت کارروائی سے اس لیے رکے ہوئے تھے کہ کسی کا نظریاتی اختلاف فوجی کارروائی کے لیے وجہِ جواز نہیں بن سکتا تھا۔ انہیں جب خوارج کے خلاف مسلح کارروائی کا مشورہ دیا گیا تھا تو انہوں نے کہا تھا: "اس وقت تک ایسا نہیں کیا جائے گا جب تک وہ خون ریزی، رہزنی اور بدامنی کا ارتکاب نہ کریں۔" ④

مگر اب خوارج مسلمانوں کے خون میں عملی طور پر ہاتھ رنگنے لگے تھے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ اس دوران کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شام پر حملہ کرنے کا مشورہ دے رہے تھے مگر آپ رضی اللہ عنہ نے خوارج کے سدباب کو ضروری قرار دیا اور فرمایا: "کیا تم معاویہ اور اہلِ شام کی طرف پیش قدمی کرو گے اور ان دشمنوں کو اپنے اہل و عیال اور مال و دولت پر مسلط چھوڑ جاؤ گے؟" ⑤

جنگ سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سفیر بن کر خوارج کے پاس گئے اور انہیں سمجھایا جس سے بعض خوارج تائب ہو گئے اور جو اپنی ضد پر قائم رہے، ان کے ساتھ جنگ ہوئی۔ ⑥

دونوں لشکر قریب آئے تو خوارج کے سردار عبداللہ بن وہب نے حکم دیا: نیزے پھینک دو اور تلواریں سونت لو۔"

ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوار نیزے تان کر ان پر پل پڑے۔ خوارج بڑی بے جگری سے لڑے مگر جلد ہی ان کا زور ٹوٹ گیا اور تقریباً سب کے سب وہیں مارے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں سے صرف دو افراد شہید ہوئے۔ ⑦ یہ جنگ شعبان سن ۳۸ ہجری میں ہوئی تھی۔ ⑧ جنگ جمل اور صفین کے برخلاف یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ اعلان فرما رہے تھے: "ہمارے مقتولین جنتی ہیں اور ان کے جہنمی۔" ⑨

جبکہ صفین کے اختتام پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا "ہمارے اور ان کے مقتولین جنتی ہیں۔" ⑩

---

① تاریخ الطبری: ۵/ ص ۷۳

② مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۹۰۳ ③ البدایہ والنہایہ: ۱۰/ ص: ۵۸۰، ۵۸۱

④ مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۵۷۳، باب قتال الحروراء ⑤ صحیح مسلم، ح: ۲۵۱۶، باب تحریض علی قتل الخوارج

⑥ مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۵۷۸، باب قتال الحروراء، مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۹۲۳، ۳۷۸۹۳

⑦ صحیح مسلم، ح: ۲۵۱۶، باب تحریض علی قتل الخوارج ⑧ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۹۷

⑨ البدایہ والنہایہ ۱۰/ ص: ۶۰۳ ⑩ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۷۸۸۰

حالات کی بہتری، معاہدہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت

۳۸ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مصر پر قبضہ کیا، یوں شام اور مصر کے درمیان واقع وہ کوہستان بھی ان کی عملداری میں آگیا جہاں قاتلینِ عثمان ایک مدت سے روپوش تھے۔ کچھ مدت گزری تھی کہ ایک دیہاتی کو اپنے گم شدہ گدھے کی تلاش کے دوران قاتلوں کی خفیہ پناہ گاہ کا علم ہوگیا اور اس کی اطلاع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قاتلوں کو گرفتار کر کے تفتیش کے بعد سزائے موت دے دی۔ یوں یہ بد بخت لوگ اپنے انجام کو پہنچے۔ ①

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سرحدوں کے احترام کا معاہدہ:

۴۰ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں سرحدوں کے احترام کا معاہدہ ہوگیا جس میں پہل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو درج ذیل خط لکھا:

''امّا بعد! اگر آپ پسند کریں تو عراق آپ کے پاس رہے اور شام میرے پاس، تاکہ اُمت کے درمیان تلوار چلنا بند ہو جائے اور مسلمانوں کا خون نہ بہے۔''

یعنی اس صلح کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ فریقین ایک دوسرے کی حدود میں مداخلت نہ کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے بخوشی قبول کرلیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخر تک دونوں طرف امن وامان رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے علاقے کے محصولات وصول کر کے اپنی فوج کے اخراجات ادا کرتے رہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے علاقے کی پیداوار سے اپنی فوج پر خرچ کرتے رہے۔ ②

ایک سبق آموز واقعہ:

اس معاہدے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصر روم عالم اسلام پر حملے کے لیے ایک بڑا لشکر لے کر شام کی طرف بڑھنے لگا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پتا چلا تو اسے ایک دھمکی آمیز مراسلہ لکھا جس میں تحریر تھا:

''اے ملعون! اگر تو واپس نہ لوٹا تو اللہ کی قسم! میں اور میرا چچازاد بھائی علی تیرے خلاف متحد ہو کر برسرِ پیکار ہوں گے اور تجھے تیری تمام سلطنت سے بھی نکال باہر کریں گے اور زمین کی وسعتوں کو تجھ پر تنگ کر کے دم لیں گے۔''

شاہِ روم یہ خط پڑھ کر کانپ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ مسلمان قائدین کے باہمی اختلافات عارضی ہیں اور وہ حقیقت میں اغیار کے مقابلے میں اب بھی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں، چنانچہ وہ فوراً اپنے لاؤ لشکر سمیت واپس ہوگیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی درخواست کی۔ ③

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۷۶۹۱، ط الرشد، اسنادہ صحیح

② تاریخ الطبری: ۵/ص ۱۴۰ ③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/ص: ۴۰۰، ترجمۃ معاویۃ رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی کو ولی عہد نہیں بنایا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے بھی دنیا کی دلچسپیوں سے لاتعلق تھے۔ اب جہانِ فانی سے اور زیادہ بے زار ہو چلے تھے۔ آخری ایام میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''اے اللہ! میں ان لوگوں سے اُکتا گیا ہوں اور یہ مجھ سے اکتا گئے ہیں۔ میں ان سے نالاں ہوں اور یہ مجھ سے نالاں ہیں۔ تو مجھے ان سے دور کر کے آرام دے اور انہیں مجھ سے آزاد کر کے راحت دے۔''

پھر داڑھی پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''تمہارے شقی ترین شخص کو کوئی نہ روکے گا کہ وہ میری داڑھی کو خون سے رنگ دے۔'' ①

انہی ایام میں مشیروں نے مشورہ دیا کہ آپ رضی اللہ عنہ اپنا جانشین مقرر کر دیں مگر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ میں تمہیں اس طرح چھوڑ کر جاؤں گا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کوئی باضابطہ نائب مقرر کیے بغیر اُمت کو) چھوڑ گئے تھے۔'' ②

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت:

انہی دنوں خوارج کے تین افراد: عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی، برک بن عبداللہ تمیمی اور عمرو بن بکر نے باہم معاہدہ کیا کہ اسلامی سیاست کے تینوں اہم ستونوں: حضرت علی، حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کو ایک ہی دن شہید کر دیا جائے۔ انہوں نے اپنی تلواروں کو زہر آلود کیا اور ۱۷ رمضان کو تینوں نے عظیم اسلامی شخصیات پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابن ملجم کوفہ روانہ ہو گیا تا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرے۔ برک بن عبداللہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر حملے کے لیے شام کی طرف نکل گیا اور عمرو بن بکر نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ختم کرنے کے لیے مصر کا رخ کیا۔ ③

۱۷ رمضان کی صبح تینوں نے اپنے اپنے اہداف پر حملہ کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے مگر بچ گئے، حملہ آور قتل کر دیا گیا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس صبح بیماری کے سبب حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو نمازِ فجر پڑھانے بھیج دیا تھا۔ وہ عمرو بن بکر کی زہر آلود تلوار کی زد میں آ کر شہید ہو گئے، قاتل یہاں بھی پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ ④

عبدالرحمٰن بن ملجم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کوفہ پہنچا۔ وہاں ایک اور خارجی شبیب بن بجرہ کو بھی ساتھ ملا یا۔ سترہ رمضان شب جمعہ کے آخری پہر دونوں مسجد میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تاک میں بیٹھ گئے۔ ⑤ حضرت علی رضی اللہ عنہ فجر کے وقت مسجد کی دہلیز پر پہنچے تھے کہ عبدالرحمٰن اور شبیب نعرۂ تحکیم لگاتے ہوئے حملہ آور ہو گئے۔ پہلے شبیب نے تلوار چلائی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ بچ گئے۔ اتنے میں دوسری جانب سے عبدالرحمٰن نے سر پر زوردار وار کیا، تلوار پیشانی میں اتر گئی۔ لوگ دوڑ کر آئے تو عبدالرحمٰن بن ملجم اور شبیب ان پر حملہ آور ہوئے۔ شبیب تو بھاگ نکلا اور پھر اس کا کچھ پتا

---

① مصنف عبدالرزاق، ح: ۱۸۶۷۰ بسند صحیح
② مسند احمد، ح: ۱۰۷۸ بسند صحیح
③ تاریخ الطبری: ۵ص ۴۳
④ تاریخ الطبری: ۵ص ۱۴۱
⑤ تاریخ الطبری: ۵ص ۱۴۳

نہ زچلا، البتہ ابن ملجم پکڑا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن ملجم کو بلوایا اور پوچھا: ’’تجھے کس بات نے اس حرکت پر آمادہ کیا؟‘‘ وہ بولا: ’’ہزار کی تلوار خرید کر اس پر ہزار کا زہر لگایا۔ چالیس دن تک اس تلوار کو تیز کرتا رہا اور دعا کرتا رہا کہ اس سے بدترین انسان قتل ہو۔ اگر پورے شہر کے لوگ اس کے وار کے نیچے آتے تو خدا کی قسم! ان میں سے ایک بھی نہ بچتا۔‘‘ ①

لوگ اس بدبخت کو مار ڈالنا چاہتے تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے قضیے کو ملتوی کرنے کا حکم دیا اور فرمایا:

’’اسے کھلاؤ پلاؤ، نرم بستر دو، قید میں اچھی طرح رکھو۔ اگر میں بچ گیا تو چاہوں گا تو معاف کر دوں گا، چاہوں گا تو بدلہ لوں گا، اور اگر میں مرگیا تو تم اسے بس تلوار کے ایک وار سے قتل کر دینا، اس کی لاش کو نقصان نہ پہنچانا۔‘‘ ②

آخری وصیت:

زہریلی تلوار کے زخم سے پورے جسم میں زہر پھیل گیا اور آپ رضی اللہ عنہ کے بچنے کی اُمید نہ رہی تھی۔ آخری وقت میں اولاد کو کئی اہم نصیحتیں کیں، فرمایا:

’’حسن! میں تمہیں اور اپنے سارے بچوں کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں۔ مرتے دم تک اسلام پر ثابت قدم رہنا۔ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوط تھامے رہنا، منتشر مت ہونا۔ رشتہ داروں سے صلہ رحمی کا برتاؤ کرنا۔ یتیموں کے بارے میں اللہ سے ڈرنا۔ پڑوسیوں کا خیال رکھنا، قرآن مجید پر عمل کرنے میں بڑھ چڑھ کر کوشش کرنا۔ نماز کا بہت اہتمام کرنا کہ یہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت تھی۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے رہنا۔ زکوٰۃ ادا کرنا کہ یہ رب کے غصے کو ٹھنڈا کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا لحاظ کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں یہی تاکید فرمائی ہے۔ فقیروں، مسکینوں، غلاموں اور باندیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرنا۔ لوگوں سے شائستہ کلامی برتنا، نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا، نیکیوں میں باہم تعاون کرنا اور گناہ یا دشمنی کے کاموں میں ساتھ مت دینا۔‘‘ ③

آپ رضی اللہ عنہ تین دن تک زخمی حالت میں رہنے کے بعد ۲۱ رمضان کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ④

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ رضی اللہ عنہ کی عمر مبارک تریسٹھ برس تھی ⑤ اور خلافت کی مدت چار سال نو ماہ تھی۔ ⑥ نمازِ جنازہ صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی۔ ⑦ تدفین دار الامارۃ کی عمارت کے اندر ہی کی گئی، کیوں کہ خدشہ تھا کہ کہیں خوارج موقع پا کر لاش کی بے حرمتی نہ کریں۔ ⑧

---

① تاریخ الطبری: ۵/۱۴۴ تا ۱۴۶

② السنن الکبری للبیہقی، ح: ۱۶۷۵۹؛ تہذیب الآثار للطبری، ۳/۷۵، ط المدنی؛ تاریخ الطبری: ۴/۷۹

③ مجمع الزوائد، ح: ۱۴۷۹۱، قال الہیثمی: رَوَاہُ الطَّبَرَانِیُّ، وَھُوَ مُرْسَلٌ، وَإِسْنَادُہٗ حَسَنٌ۔

④ التاریخ الاوسط للبخاری، ح: ۲۸۸، اسنادہ حسن ⑤ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱/۹۵ ⑥ تاریخ الطبری: ۵/۱۵۲

⑦ مجمع الزوائد، ح: ۱۴۷۹۱، اسنادہ حسن؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۱۹۹؛ تاریخ الطبری: ۵/۱۴۷، ۱۴۸

⑧ تاریخ الطبری: ۵ ص ۱۵۱، ۱۵۲

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق قاتل ابن ملجم کو قصاصاً قتل کرا دیا۔[1] جن روایات میں یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ورثاء نے انتقام کے جوش میں قاتل کے ہاتھ پاؤں کاٹے، آنکھیں پھوڑیں، بدترین اذیتیں دے دے کر مارا اور آخر میں لاش کو جلا دیا، ان کی اسنادی حیثیت معتبر نہیں۔ مستند روایات میں بس اس قدر منقول ہے کہ قاتل کو قصاصاً قتل کر دیا گیا۔

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک ناکام حکمران تھے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عالم اسلام کی زمامِ اقتدار جن حالات میں ملی تھی، وہ ان کے حوصلے، استقامت، تدبیر، توکل اور اخلاص کا بہت بڑا امتحان تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ اللہ کی عطا کردہ توفیق سے ان سخت ترین آزمائشوں سے نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے تھے۔ ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ ان کا دورِ خلافت ناکامیوں کا دور تھا، وہ قاتلینِ عثمان سے قصاص لے سکے نہ اُمت کو متحد کر پائے۔ مگر یہ ایک بالکل سطحی تجزیہ ہے۔

دراصل آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے مسئلہ صرف قصاصِ عثمان لینے کا نہیں، پوری شریعت کی پیروی اور خلافتِ راشدہ کی بقا کا تھا، جسے سازشی عناصر داؤ پر لگانے کے لیے سرگرم تھے۔ مگر ان مشکل حالات کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے بہترین سیاسی حکمتِ عملی اپنا کر ہر قسم کے شرپسند عناصر سمیت اسلام دشمن طاقتوں کی خفیہ جنگ کا نہایت فراست، تدبر اور پامردی سے مقابلہ کیا اور ان کو رفتہ رفتہ کمزور کیا۔ سبائیت کے مسلح بازو خارجیت کو نہروان میں خون کا غسل دے کر ایسے ہزاروں بدبختوں کو انجام تک پہنچایا جو باقی رہتے تو شاید پوری اُمت کو کسی اور ہی ڈگر پر چلا کر چھوڑتے۔

یہ درست ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے دور میں قاتلینِ عثمان کو بروقت عدالتی کٹہرے میں لا کر ان پر مقدمہ نہ چلایا جاسکا مگر یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے قصاص کے معاملے کو ترک کر کے قاتلوں کو اپنے گرد جمع کیے رکھا۔ درحقیقت قتل میں براہِ راست شریک کسی شخص کے متعلق نہ تو کوئی تاریخی شہادت موجود ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ہو اور نہ یہ ثابت ہے کہ کوئی قاتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دسترس میں ہو مگر اس سے قصاص نہ لیا گیا ہو۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

رہی یہ بات کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سبائیوں اور خارجیوں کو بالکل ختم کیوں نہ کر سکے اور ان کی شرانگیزیاں بعد میں بھی کیوں جاری رہیں؟ تو دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی بھی قائد سے ایسی اُمیدیں وابستہ کرنا ایک محال کام کی توقع کرنے کے مترادف ہے۔ سبائیت ہو یا خارجیت، یہ سب نظریاتی فتنوں کی شکلیں ہیں جو زمانے کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں۔ دنیا کے ہر معاشرے میں ایسی تنظیمیں یا تحریکیں ہر دور میں موجود چلی آئی ہیں۔ ان سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانا ایسا ہی مشکل ہے جیسے گندم میں گھن پیدا ہونے کو روکنا۔ جہاں کھیت ہے وہاں کچھ موذی کیڑے مکوڑے ضرور ہوں گے۔ ایک حکمران کے لیے اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ ہر حال میں آئین اور قانون کا پابند ہو، ملکی سلامتی وامن وامان کے لیے کوشاں رہے، رعایا کے حقوق ادا کرتا رہے اور مخالفین کے بارے میں بھی آئین سے تجاوز نہ کرے۔

[1] تاریخ الطبری: ۵ ص ۱۴۸

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے سیاست یا جنگ میں جو کامیابیاں حاصل کیں وہ کم نہ تھیں مگر جہاں عام آدمی کو ان کامیابیوں کا گراف بڑھانے کے لیے شریعت، اسوۂ رسول اور اسلامی آئین کے دائرے سے باہر قدم نکالنے میں مصلحت نظر آتی تھی وہاں آپ رضی اللہ عنہ مصلحت کو ترک کر کے شرع کی پاسداری کو اہم سمجھتے تھے۔ یہ بات قانون سے ناواقف لوگوں یا اس کی اہمیت نہ سمجھنے والوں کی نگاہ میں چاہے کم درجے کی سیاست ہو مگر ایک مثالی حکمران کے لیے یہی کامیابی کی معراج ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قانون و آئینِ شرع کی پابندی کرتے ہوئے اور فتوحات کے بعض مواقع سے دست کش ہوتے ہوئے بھی جو کامیابیاں حاصل کی تھیں، ان مخدوش ترین حالات میں کوئی بہتر سے بہتر حکمران بھی اس سے زیادہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ مخدوش حالات نے باعث آپ اُمت کو سیاسی طور پر متحد نہ کر سکے مگر آپ رضی اللہ عنہ نے اتحاد کی بنیاد یعنی صحیح عقیدے اور شریعت کو ضرور بچا لیا تھا۔ آپ نے ایک طرف اسلام کے خلاف چھیڑی گئی نظریاتی و اعتقادی جنگ کا حکمت و جرأت سے سامنا کیا اور دوسری طرف شامی بھائیوں سے سیاسی اختلاف کے باوجود آپ نے اُمت کی اکثریت کو راہِ حق سے بھٹکنے نہ دیا۔ ایک اقلیت کے سوا پورے عالمِ اسلام میں لوگوں کا عقیدہ اور مسلک و مشرب وہی رہا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ کرام کا تھا۔

سیرت کی کچھ درخشاں جھلکیاں:

آپ رضی اللہ عنہ نے پوری زندگی فقر میں گزاری۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں غزوۂ خیبر تک آپ کی گزر بسر ایک معمولی مسلمان کی طرح محنت مزدوری پر تھی اور فاقوں کی نوبت آتی رہتی تھی۔ فرماتے تھے: مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اور بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا۔① ایثار کا یہ عالم تھا کہ جو میسر ہوتا ضرورت مندوں پر خرچ فرما دیتے اور گھر والوں کے فاقے کا بھی خیال نہ کرتے۔ ایک بار آپ رضی اللہ عنہ نے رات بھر ایک باغ میں مزدوری کی۔ صبح مزدوری میں جَو ملے۔ وہ لے کر گھر تشریف لائے اور اس کے تین حصے کیے: ایک حصہ پسوا کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا کہ وہ حریرہ پکا دیں۔ ابھی وہ پک کر تیار ہوا تھا کہ ایک ضرورت مند مسکین آ گیا۔ وہ سارا کا سارا اُس پر صدقہ کر دیا۔ پھر دوسرا حصہ پکوایا، اتنے میں ایک یتیم آ گیا۔ وہ اسے پیش کر دیا۔ پھر تیسرا حصہ پک کر تیار ہوا تو مشرکین میں سے ایک قیدی آن پہنچا۔ وہ اسے کھلا دیا۔ اس کے بعد پورا گھرانہ بھوکا سو گیا۔②

بعد میں جب آپ رضی اللہ عنہ عظیم الشان ملک کے فرمانروا ہو گئے تب بھی آپ رضی اللہ عنہ کے زہد و قناعت اور فقر میں فرق نہ آیا۔ زمانۂ خلافت میں ایک دن گھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنی تلوار لے کر باہر نکل گئے اور آواز لگائی: ''کون ہے جو میری یہ تلوار خرید لے؟ اگر میرے پاس ایک چادر خریدنے کے بقدر رقم ہوتی تو میں اسے فروخت نہ کرتا۔''③

① کتاب الزہد للإمام احمد بن حنبل، ح: ۷۱۱، ط العلمیۃ

② التبصرۃ لابن الجوزی: ۱ ص ۳۵۳، ط العلمیۃ ③ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۳۵۱۰

آپ رضی اللہ عنہ بیت المال میں اَموال کو بھر کر رکھنے کے بالکل قائل نہ تھے۔ جس قدر ممکن ہوتا رعایا پر خرچ فرما دیتے۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے بیت المال کی تمام رقم اور اجناس تقسیم کرادیں یہاں تک کہ عمارت خالی ہوگئی اور آپ رضی اللہ عنہ نے اس میں جھاڑو لگا کر دو رکعت نماز پڑھی تا کہ اللہ کے ہاں بروزِ حشر یہ گواہی دی جائے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے اَموال میں سے کچھ بھی ذخیرہ کر کے نہیں رکھا۔ ①

دورِ حکومت کی اصل خصوصیت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت کی اصل خصوصیت مزاجِ نبوت سے وہ مکمل ہم آہنگی اور ذوقِ محمدی سے وہ کامل مطابقت ہے جس کی نظیر خلفائے راشدین کے دور کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ وہ عدل وانصاف کا پیکر، مخلوق کے لیے سراپا شفقت، آزمائش کے وقت جبلِ استقامت اور سیاستِ شرعیہ کی الجھنوں میں اجتہادِ صائب کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ وہ دشمنوں کے حق میں شرعی حدود سے سرِ مو تجاوز نہ کرتے تھے۔ تمام اختیارات وطاقت رکھتے ہوئے زبان تک سے کوئی خلافِ عزیمت جملہ نہ صادر ہونے دیتے تھے۔ ان کے زہد وفقر، سادگی وقناعت، مجاہدہ وریاضت، فانی دنیا سے انتہائی بے رغبتی، خداخوفی اور فکرِ آخرت میں صفاتِ نبویہ کا وہ عکس نظر آتا ہے جسے تصوف کی اصطلاح میں "نسبتِ اتحادی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مذہب ومسلک کے لیے گزشتہ خلفاء کو معیار بنایا اور انہیں اپنا پیشرو قرار دیا۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے محبت کرنے والوں اور ان سے نفرت کرنے والوں میں ایک خطِ امتیاز آپ رضی اللہ عنہ ہی کے دور میں کھینچا گیا اور آپ نے متعدد مواقع پر خود کو ان گزشتہ خلفاء کا مداح قرار دے کر بتادیا کہ آپ کن کے ساتھ ہیں اور اہلِ حق کون ہیں۔ چنانچہ اہلِ شام سیاسی اختلافات کے باوجود اعتقاد میں آپ سے الگ نہ تھے۔ سیاسی عدمِ اتحاد کے باوجود مسلک ومشرب کے معاملے میں آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو دنیا وآخرت کے لحاظ سے اپنے زمرے میں شامل قرار دیا، جنگِ جمل کے تمام مقتولین کی نمازِ جنازہ آپ رضی اللہ عنہ نے خود پڑھائی۔ صفین کے مقتولین کے متعلق فرمایا: قَتْلَانَا وَقَتْلَاهُمْ فِي الْجَنَّةِ.

"ہمارے اور ان کے مقتولین جنت میں ہیں۔" ②

عقیدے اور نظریے کے بارے میں آپ رضی اللہ عنہ کی اس دوٹوک حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند برس الگ الگ رہ کر بھی پورا عالمِ اسلام سچے دین کا اس کی اصل حالت میں پیروکار رہا اور آپ کے بعد جلد ہی تمام مسلمان ایک بار پھر متحد ہوگئے اور ان کے سوادِ اعظم میں کوئی نظریاتی امتیاز پنپ نہ سکا۔

❁❁❁

---

① کتاب الزهد للامام احمد بن حنبل، ح: ۶۹۵، ط العلمیة

② مصنف ابن ابی شیبة، ح: ۳۷۸۸۰

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟

❷ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد کے بارے میں معتبر اور غیر معتبر روایات کے بیانیے میں کیا فرق ہے؟

❸ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قصاص عثمان کے بارے میں فقہی وسیاسی موقف کیا تھا؟

❹ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باغیوں کو امان کیوں دی؟

❺ جنگِ جمل کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے تاثرات کیا تھے؟

❻ جنگِ صفین، جنگ بندی اور پھر تحکیم کے حوالے سے معتبر اور غیر معتبر روایات میں کیا فرق ہے؟

❼ خوارج کون تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کیوں کی؟

❽ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت کی اہم خصوصیت پر روشنی ڈالیے۔

عملی کام:

❁ جنگِ جمل، جنگِ صفین اور تحکیم کے مقامات کو نقشے پر دیکھیے اور سمجھیے۔

❁ مشاجرات کے بارے میں صحیح موقف کو قرآن وسنت اور عباراتِ اسلاف کی روشنی میں زبانی بیان کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ

❁ تاریخ اُمتِ مسلمہ، حصہ دوم، دورِ خلافت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

❁ اسمی المطالب فی سیرۃ امیر المؤمنین علی بن ابی طالب، للشیخ علی محمد الصلابی

(یونٹ: 1.14)

خلافتِ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ

رمضان ۴۰ھ ......تا...... ربیع الاوّل ۴۱ھ

فضائل ومناقب:

حضرت علی ؓ کی شہادت کے بعد ان کے فرزند حضرت حسن ؓ ملّت کے رہنما بن کر اُبھرے جن کی خداداد محبوبیت ومقبولیت سب پر عیاں تھی۔ حضور ﷺ کو اپنے اس نواسے سے اس قدر محبت تھی کہ کئی مواقع پر فرمایا: ''اے اللہ! میں حسن سے محبت کرتا ہوں، تو بھی اس سے محبت فرما اور اُس سے بھی محبت فرما جو حسن سے محبت کرے۔''①

صحابہ کرام ؓم فرماتے تھے کہ حضرت حسن ؓ، رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔②

چنانچہ عراق کے اکابر صحابہ وتابعین کو توقع تھی کہ حضرت حسن ؓ کی خلافت مسلمانوں کے لیے بڑی بابرکت ثابت ہوگی، اس لیے وہ حضرت حسن ؓ سے بیعت پر فوراً متفق ہوگئے۔ حضرت حسن ؓ نے ان کی فرمائش پر پہلے تو سکوت اختیار کیا مگر پھر اُمت کی مصلحت دیکھتے ہوئے انہیں بیعت فرمانے لگے، سب سے پہلے حضرت قیس بن سعد بن عبادہ ؓ نے بیعت کی جو افواجِ کوفہ کے سپہ سالار تھے۔③

ایک اعتراض کا جواب:

کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت حسن ؓ نے باپ کی جانشینی قبول کر کے موروثی حکومت اور ملوکیت کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت حسن ؓ کو اربابِ حل وعقد نے خلافت کے لیے منتخب کیا تھا، لہٰذا یہ عمل سرے سے قابلِ اعتراض نہیں۔ پھر حضرت حسن ؓ نے بھلا کب حکومت کو اپنے گھر میں رکھنے کے لیے مسندِ خلافت سنبھالی تھی؟ انہوں نے تو اس لیے یہ عہدہ قبول کیا تھا تاکہ اُمت کو بہر صورت متحد کیا جائے، اس کی خاطر وہ خلافت دوسرے خاندان کو سپرد کرنے پر بھی تیار ہوگئے۔ یہ وہ عظیم قربانی تھی جس کی پیش گوئی رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمائی تھی:

---

① مسند احمد، ح: ۷۳۹۸، بسند صحیح

② صحیح البخاری، ح: ۳۵۴۲، کتاب المناقب، باب صفۃ النبی ﷺ

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱ ص ۱

إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ

''میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ امید ہے کہ اللہ اس کی بدولت مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرادے۔''①

کیا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مجبوراً صلح کی؟

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے طے کیا کہ وہ اُمت کے وسیع تر مفاد کی خاطر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو جائیں گے اور اُمت کو ایک خلیفہ پر متحد کرنے کے لیے اپنے اقتدار کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اس فیصلے میں کسی کمزوری یا بزدلی کا دخل نہیں تھا، بلکہ صحیح روایات کے مطابق حسن رضی اللہ عنہ پوری طرح بااختیار اور طاقتور ہونے کے باوجود یہ حکمت عملی اختیار کر رہے تھے۔ جو روایات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنی افواج کی کمزوری اور سرکشی سے بددل ہو کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کا فیصلہ مجبوری میں کیا تھا وہ سنداً و متناً ناقابل اعتبار ہیں۔ ہاں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی فوج میں خارجی یا سبائی ذہنیت رکھنے والا ایک عنصر ضرور تھا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے آپ کی صلح کو پسند نہیں کرتا تھا مگر غالب طبقہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے وفاداروں ہی کا تھا، جن کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے شروع میں اپنے لائحہ عمل کا اظہار نہیں کیا تا کہ یکدم کوئی مخالف آواز بلند نہ ہونے پائے بلکہ احتیاطاً آپ نے بیعت لیتے ہوئے لوگوں سے یہ شرط لی:

''تم میری بات سنو اور مانو گے، جس سے صلح کروں، اس سے صلح کرو گے، جس سے لڑوں اس سے لڑو گے۔''②

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اعلانِ صلح اور شرپسندوں کی مخالفت:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اہل عراق کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اتحاد پر آمادہ کرتے رہے۔ شرپسندوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ان میں سے ایک شخص نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار تھے۔ اچانک حملے سے ران پر زخم آ گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے وفاداروں نے حملہ آور کو موقع پر پکڑ کر قتل کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ مدائن کے قصرِ ابیض میں ٹھہر گئے جہاں زخم کا علاج ہوا اور آپ رضی اللہ عنہ شفایاب ہو گئے۔③

ان ظالموں کو دست درازی کے یہ مواقع اس لیے ملے تھے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اپنے والد ماجد کی طرح پہرے کا انتظام نہیں کرتے تھے۔ ایسا ہرگز نہ تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کے مخلص ساتھی جو ہزاروں کی تعداد میں تھے، باغی ہو گئے ہوں۔ صحیح روایات کے مطابق حضرت حسن رضی اللہ عنہ آخر تک بااختیار اور طاقتور خلیفہ تھے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عراق پر لشکر کشی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اقدام:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے فوراً بعد رمضان ۴۰ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شام میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا جس کے بعد اہلِ عراق اور اہلِ شام میں ایک اور بڑی جنگ کے خدشات نمایاں ہو گئے تھے۔④

---

① صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ ان ابنی ھذا سید ② تاریخ الطبری: ۵ص ۱۶۲

③ تاریخ الطبری: ۱۵۹/۵؛ والاخبار الطوال: ص ۲۱۷ ④ تاریخ الطبری: ۱۶۱/۵

شام سے نکلے اور حدودِ عراق میں داخل ہو گئے۔① اُدھر ۴۱ھ کے آغاز میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنا لشکر لے کر شام سے نکلے اور حدودِ عراق میں داخل ہو گئے۔ اُدھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ کوفہ سے نکلے۔② فریقین کا آمنا سامنا "مَسکِن" کے مقام پر ہوا۔③

بظاہر یہی لگتا تھا کہ عراقی اور شامی لشکر باہم لڑنے نکلے ہیں اور بہت سخت جنگ ہونے کو ہے۔ مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ درحقیقت بغیر لڑے تصفیہ چاہتے تھے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی یہی مناسب سمجھتے تھے کہ وہ تمام لوگ جو اُن سے صلح اور جنگ کے معاملات میں اطاعت کا وعدہ کر چکے ہیں، ایک بار یکجا ہو جائیں اور وہ ان سب کو ساتھ لے کر مسلمانوں کے ایک عظیم اجتماع میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت کی ذمہ داری سپرد کر دیں۔ اس بارے میں دونوں حضرات کے مابین خفیہ طور پر خط و کتابت بھی ہوئی۔④ درج ذیل روایات اس صورتحال کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں:

❶ امام زہری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو وہ جنگ نہیں چاہتے تھے۔⑤

❷ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بیعت کرتے ہوئے عہد لیا تھا کہ جس سے میں صلح کروں گا تم بھی اس سے صلح کرو گے۔⑥ یہ شرط بیعت کے الفاظ میں اس لیے شامل کی گئی تھی کہ شروع سے ہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ صلح کے خواہش مند تھے۔

❸ بیعت کے وقت بعض امرائے فوج نے یہ الفاظ کہنا چاہے:

"ہم آپ سے کتاب و سنت کی پیروی اور باغیوں (اہل شام) سے قتال کے عہد پر بیعت کرتے ہیں۔"

مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ کو مسترد کر کے یہ الفاظ کہلوائے: "عَلٰی كِتَابِ اللّٰهِ وَسُنَّةِ نَبِيِّهٖ"

پھر فرمایا: "کتاب و سنت کی پیروی تمام شرطوں کو حاوی ہے۔"⑦

❹ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا لشکرِ جرار لے کر پیش قدمی کرنا اور پھر اچانک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لینا ثابت کرتا ہے کہ یہ لشکر کشی لڑائی کے ارادے سے نہیں تھی ورنہ اتنی بڑی طاقت کے ساتھ اہلِ شام سے لڑنا کیا مشکل تھا۔

❺ صحیح بخاری کی روایت میں خود حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بیان موجود ہے کہ انہوں نے اُمتِ مسلمہ کو مزید خون ریزی سے بچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بڑی دردمندی کے ساتھ فرمایا تھا: "إِنَّ هٰذِهِ الْأُمَّةَ قَدْ عَاثَتْ فِيْ دِمَآئِهَا۔" (بلاشبہ یہ اُمت اپنے ہی خون میں لت پت ہو چکی ہے۔)⑧

غیر معتبر روایتوں میں یہ ہے کہ شامی جرنیل عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے آ کر مدائن میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو گھیر لیا تھا۔ تب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح کے سوا کوئی راہ نہ پائی۔⑨ بعض بے سروپا روایات میں ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا لشکر

---

① المعارف لابن قتیبہ: ص ۳۴۹ ② صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴

③ یہ مقام دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر سوادِ عراق اور ضلع تکریت کی حدود کے درمیان نہرِ دُجیل کے قریب واقع ہے۔ (معجم البلدان: مادۃ دُجیل؛ الروض المعطار: ص ۲۵۱)

④ فأصلح الذی بینه وبینه سرا۔ (طبقات ابن سعد، متمم الصحابة الطبقة الخامسة: ۱ ص ۳۳۱) رجالہ ثقات۔

⑤ تاریخ الطبری: ۵ ص ۱۵۸

⑥ تاریخ الطبری: ۵ ص ۱۶۲ ⑦ تاریخ الطبری: ۵ ص ۱۵۸

⑧ صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴ ⑨ الاخبار الطوال، ص ۲۱۷؛ تاریخ الطبری: ۵/۱۵۹

ان کا مخالف اور سرکش ہو گیا تھا جس کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہی تھی۔ ایسی روایات وضع کرنے کا مقصد یہ تاثر دینا تھا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ دل سے صلح پر راضی نہ تھے، بس عاجز ہو کر صلح کر لی ورنہ وہ شامیوں سے ضرور لڑتے۔ صحیح بخاری کی روایت اس بیانیے کی تردید کرتی ہے جس کے مطابق حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ اتنا بڑا لشکر تھا جسے دیکھ کر شامی افسران پریشان ہو گئے۔ چوں کہ حضرت حسن اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین مراسلت خفیہ تھی، لہٰذا اعلیٰ شامی افسران کو بھی معلوم نہ تھا کہ صلح ہونے کو ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

''حضرت حسن رضی اللہ عنہ پہاڑوں جیسے لشکر لے کر آن پہنچے تو عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کہا: ''میں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس ایسا لشکر دیکھا ہے جو اپنے مدمقابل کو مارے بغیر جانے والا نہیں۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے عمرو! بتاؤ اگر اس فوج نے اُس فوج کو اور اُن لوگوں نے اِن لوگوں کو مار ڈالا تو میرے پاس عوام کی دیکھ بھال کرنے والا کون رہے گا؟ کون ہوگا جو عوام کا اور خواتین کا خیال رکھے گا؟ کون ہوگا جو ان کی جائیدادوں کی خبر گیری کرے گا؟'' ①

پس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قریش کے خاندان بنو عبد شمس کے دو (ممتاز) افراد: عبد الرحمن بن سمُرہ اور عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہما کو بلا کر فرمایا: ''آپ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر انہیں (صلح کی) پیش کش کریں، ان سے بات چیت کریں اور (مفاہمت کی) درخواست کریں۔''

یہ دونوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور بات چیت کر کے مفاہمت کی درخواست کی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے فرمایا: ''ہم عبد المطلب کی اولاد ہیں (جو سخاوت اور کرم نوازی میں نامور چلے آئے ہیں۔) اور ہم اس مال و دولت سے (لوگوں پر بہت کچھ) خرچ کر چکے ہیں (جس کا قرض ہمارے اوپر ہے۔ علاوہ ازیں) بلاشبہ یہ اُمّت اپنے ہی خون میں لت پت ہے۔'' (اور یہ خون خرابا ختم کرنے کے لیے صلح بہر صورت ضروری ہے۔)

شام کے سفیروں نے کہا: ''جی ہاں! حضرت معاویہ آپ کو (ہر شرط قبول کرنے کی) پیش کش کر رہے ہیں اور آپ سے صلح کی درخواست کر رہے ہیں۔'' حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تو پھر اس پیش کش کے پورا کرنے کی ضمانت کون لیتا ہے؟'' دونوں حضرات بولے: ''ہم اس کے ضامن ہیں۔''

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد جس بات کی بھی فرمائش کی (کہ صلح کے بدلے اس کی ضمانت دی جائے) دونوں حضرات نے اس کی ضمانت دی۔ چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی۔'' ②

ایک اور صحیح روایت کے مطابق حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں تحریری طور پر کچھ شرائط پیش کی تھیں جنہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے منظور کر لیا اور انہیں ایک خطیر رقم بھیج دی۔ ③

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے غالباً عین موقع پر اپنے اُمراء کو ذہنی طور پر صلح کے لیے تیار کرنے کی خاطر اس قسم کی باتیں کی تھیں۔
② صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی، ان ابنی ھذا سید
③ وبایعہ بالخلافۃ علی شروط ووثائق، وحمل معاویۃ الی الحسن مالا عظیما۔ (المستدرک علی الصحیحین، ح: ۴۸۰۸) رجالہ ثقات۔

شرائطِ صلح:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو شرائط طے پائی تھیں، وہ درج ذیل تھیں:

❶ **سنتِ خلفائے راشدین کی پیروی:** حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کتاب اللہ، سنتِ نبویہ اور خلفائے راشدین کی سیرت کے مطابق حکومت کریں گے۔ ① (اس شرط کی اہمیت ظاہر ہے کہ ان حضرات کا مقصدِ حیات ہی یہی تھا۔)

❷ **عام معافی:** تمام لوگ اللہ کی زمین میں جہاں بھی ہیں، چاہے شام میں ہوں، عراق میں ہوں، حجاز میں ہوں یا یمن میں ہوں اُن سب کو امان دی جائے گی۔ ②

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح اسی لیے کی تھی کہ کسی طرح خونریزی ختم ہو اور جانیں بچ سکیں اور ان لوگوں کی بھی جاں بخشی کی جائے جنہیں اہلِ شام باغی تصور کرتے آئے ہوں۔ یہ شرط حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد پر مبنی تھی کہ بُغاۃ بیعت کر لیں تو ماضی کے کشت و خون کی بناء پر ان میں سے کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ پس اس شرط کی اہمیت ظاہر ہے۔

❸ **خاص امان:** اہلِ بیتِ نبوی، اصحابِ علی اور شیعانِ علی جہاں بھی ہوں، ان کی جان و مال اور گھرانوں کو کوئی گزند نہیں پہنچائی جائے گی۔ ③

اس شرط سے ظاہر ہے کہ ان حضرات کو بعض شدت پسند عناصر سے خدشات لاحق تھے۔

❹ **مال کی شرط:** حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مال کی ایک معینہ مقدار حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے سپرد کریں گے۔ ④

یہ شرط اس لیے لگائی تھی کہ لوگ اپنی حاجات لے کر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آتے رہتے تھے جنہیں پورا کرنے کے لیے آپ رضی اللہ عنہ قرض لیتے رہتے تھے۔ ان قرضوں کی ادائیگی لازم تھی۔ نیز مختلف لوگوں سے آپ اُن کی ضروریات

---

① بسم اللہ الرحمن الرحیم. ہذا ما صالح علیہ الحسن بن علی رضی اللہ عنہما معاویۃ بن ابی سفیان، صالحہ علی أن یسلم الیہ ولایۃ المسلمین علی أن یعمل فیہم بکتاب اللہ تعالی وسنۃ رسول اللہ ﷺ وسیرۃ الخلفاء الراشدین المہدیین۔ (کتاب الفتوح لابن اعثم (م ۳۱۴ھ): ۳ص ۲۹۱؛ الصواعق المحرقۃ لابن حجر الہیثمی: ۲ص ۳۹۹)

② وعلی أن الناس آمنون حیث کانوا من ارض اللہ تعالی فی شامہم وعراقہم وحجازہم ویمنہم۔ (کتاب الفتوح لابن اعثم (م ۳۱۴ھ): ۳ص ۲۹۱؛ الصواعق المحرقۃ لابن حجر الہیثمی: ۲ص ۳۹۹)

الا یؤخذ احدا من أہل العراق باحنۃ، وأن یؤمن الأسود والأحمر ویحتمل ما یکون من ہفواتہم۔ (الاخبار الطوال: ص ۲۱۸)

وعلی أن لا یطلب أحدا من أہل المدینۃ والحجاز والعراق بشیء مما کان أیام ابیہ۔ (اسد الغابۃ: ۲ص ۱۳، ط العلمیۃ؛ تاریخ الخلفاء: ص ۱۴۷) ویحقن الدماء بین المسلمین۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۱ص ۱۳۳، ط دار ہجر)

③ وعلی أن أصحاب علی وشیعتہ آمنون علی أنفسہم وأموالہم ونسائہم وأولادہم حیث کانوا۔ (کتاب الفتوح لابن اعثم (م ۳۱۴ھ): ۳ص ۲۹۱؛ الصواعق المحرقۃ لابن حجر الہیثمی: ۲ص ۳۹۹)

وأن لا یبتغی للحسن بن علی ولا لأخیہ الحسین ولا لأحد من أہل بیت رسول اللہ ﷺ غائلۃ سرا ولا جہرا ولا یخیف أحدا منہم فی أفق من الآفاق۔ (کتاب الفتوح لابن اعثم (م ۳۱۴ھ): ۳ص ۲۹۱؛ الصواعق المحرقۃ لابن حجر الہیثمی: ۲ص ۳۹۹)

④ صحیح البخاری، ح: ۲۷۰۴، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی إن ابنی ہذا سید؛ المستدرک علی الصحیحین، [illegible]

پوری کرنے کے وعدے کر چکے تھے۔[1] اس کے علاوہ عراق کی موجودہ فوج کی تنخواہیں بھی آپ کے ذمہ تھیں۔ نیز کچھ لوگ صلح کے مخالف بھی تھے۔ انہیں مطمئن کرنے کے لیے بھی اس وقت ان کا معمول سے کچھ زائد اکرام ضروری تھا۔

⑧ جانشینی: اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ بقیدِ حیات ہوئے تو انہی کو نیا خلیفہ نامزد کیا جائے گا۔[2]

بعض ضعیف روایات میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر صلح کی شرائط کو پورا نہ کرنے کا الزام لگایا گیا ہے جو غلط ہے۔

صلح کی شرائط کے بارے میں بعض شبہات کا ازالہ:

صلح نامے کے بارے میں بعض باتیں بلا تحقیق مشہور ہو گئی ہیں، مثلاً: ❶ طے پایا تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے۔ جبکہ در حقیقت طے یہ تھا اگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دوبارہ خلیفہ بنا دیا جائے گا، مگر ظاہر ہے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آسکی، کیوں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات پہلے ہو گئی تھی۔ اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر عہد شکنی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔

❷ ایک روایت میں یہ شرط مذکور ہے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اتنی اونچی آواز میں سب و شتم نہیں کیا جائے گا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سن سکیں۔''[3] مگر یہ روایت سنداً ضعیف ہے اور اس کے متن میں نکارت ہے۔ نیز یہ درایت کے لحاظ سے بھی مشکوک ہے۔ یہ بعید ہے کہ قوت و شوکت کے ساتھ کی گئی اس صلح میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنی غیر موجودگی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کو برداشت کر لیا ہو اور فقط یہ پابندی لگائی ہو کہ ہماری موجودگی میں ایسا نہ کیا جائے۔

❸ ایک روایت میں ہے کہ: ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے صلح کو مسترد کر کے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت کی منافی قرار دیا تھا اور اس صلح کو عراقی سپہ سالار قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے ''امام ضلالت'' کی پیروی کا نام دیا تھا۔''[4] مگر یہ روایت انقطاع کے باعث ضعیف اور درایۃً مشکوک ہے۔ حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ صلح کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت کے خلاف قرار نہیں دے سکتے تھے کیوں کہ واقعہ تحکیم ثابت کرتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ صلح اور امن کے انتہائی خواہاں تھے۔ نیز صحیح روایات سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا جس قوت و احتشام کے ساتھ صلح کرنا ثابت ہے، اسے ماننے کے بعد باور نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے رفقاء حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ''امام ضلالت'' مانتے ہوئے ان سے بیعت کر رہے ہوں۔

❁❁❁

---

① قال لی شرطہ: ان علیّ عِدات و دیونا۔ (تاریخ الاسلام للذھبی: ۴ ص ۷، تدمری) علی ان یقضی دینہ لہ۔ (تاریخ الخلفاء: ص ۱۴۷)

② واعطاہ معاویۃ عهدا أن حدث بہ حدث والحسن حی لیسَمِّیَنَّہ، ولیجعلنّ هذا الأمر الیہ۔ (طبقات ابن سعد، متمم الصحابۃ الطبقۃ الخامسۃ: ۱ ص ۳۳۱) رجالہ ثقات۔

بعض عبارات اسلاف میں جو منقول ہے کہ معاہدے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت طے کی گئی تھی، اس کا محمل یہی ہے۔

واشترط علیہ الحسن ان یکون لہ الامر من بعدہ۔ (الاستیعاب: ۱ ص ۳۸۵) علی ان تکون لہ الخلافۃ بعدہ۔ (اسد الغابۃ: ۲ ص ۱۳، ط العلمیۃ) واشترط علیہ الحسن أن یکون لہ الأمر من بعدہ۔ (سیر اعلام النبلاء: ۳ ص ۲۷۹)

③ تاریخ الطبری: ۵ ص ۱۶۰ ④ تاریخ الطبری: ۵ ص ۱۶۵

انتقالِ اقتدار:

اس کے بعد کوفہ سے کچھ دور شام جانے والی شاہراہ پر واقع قصبے "نُخَیْلَہ" میں ایک اجتماع منعقد کر کے صلح کا باقاعدہ اعلان کیا گیا[1] جس میں لوگ دور دور سے آئے۔ جب اکابر اُمت جمع ہو گئے اور صلح طے ہوگئی تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو کہا: "اٹھ کر اعلان فرما دیجئے کہ آپ نے امرِ خلافت مجھے سونپ دیا ہے۔"

حضرت حسن رضی اللہ عنہ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا:

"سب سے بڑی عقل مندی تقویٰ اور سب سے بڑی حماقت گناہ ہے۔ یہ معاملہ جس میں میرا اور مُعاویہ کا اختلاف تھا، اس میں اگر میں برحق تھا تو میں نے اُمّت کے اَمن وامان اور ان کے خون محفوظ رکھنے کے لیے اپنا حق خود ترک کر دیا ہے، اور اگر کوئی دوسرا زیادہ حق دار تھا تو میں نے اس کا حق اسے دے دیا۔"

پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ[2]

(میں نہیں جانتا کہ شاید یہ تمہارے لئے آزمائش کا ذریعہ ہو اور ایک محدود وقت تک کا سرمایہ۔)"[3]

انتقالِ اقتدار کی یہ کارروائی ۵ ربیع الاوّل ۴۱ھ کو ہوئی تھی۔[4]

اس کے بعد حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ ۲۴ ربیع الاوّل کو "کوفہ" تشریف لے گئے اور لوگوں سے اپنے لیے بیعت لی۔[5]

دورِ خلافتِ راشدہ کا اختتام:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی منصبِ خلافت سے ازخود سبک دوشی کے ساتھ ہی اُمّت کی تاریخ کا وہ مبارک ترین دور اختتام پذیر ہوگیا جسے "خلافتِ نبوت" یا "خلافتِ راشدہ" کہا جاتا ہے۔[6] اس کے بعد جو دور شروع ہوا، جمہور علمائے اسلام اسے "خلافتِ عامہ" کہتے ہیں۔ اسے "خلافت" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد بھی حکمرانوں نے منصب کو یہی عنوان دیا اور "خلیفہ" کا لقب اسی طرح باقی رکھا۔ نیز شرعی قوانین، حدود وقصاص عموماً اسی طرح نافذ رہے، عدلیہ اور معیشت کا نظام اسلام کے مطابق چلتا رہا۔ اسے "راشدہ" کی جگہ "عامہ" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں اچھے، بُرے، متوسط ہر قسم کے حکمران آئے۔ جبکہ خلافتِ راشدہ مثالی حیثیت رکھتی تھی۔[7]

---

① المعجم الکبیر للطبرانی: ۳ص ۲۶؛ المعارف: ص ۳۳۲؛ معجم البلدان: ۲۷۸/۵ ② سورۃ الانبیاء، آیت: ۱۱۱

③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۶/۳؛ المستدرک للحاکم، ح: ۴۸۱۳؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۰۶۹۸

④ تاریخ الطبری: ۵/ ۱۶۲ تا ۱۶۴...... حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے مدائنی سے نقل کیا ہے کہ صلح ۵ ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ (البدایۃ والنھایۃ: ۱۳۹/۱۱)

⑤ سلم الحسن بن علی إلی معاویۃ الکوفۃ، ودخلھا معاویۃ لخمس بقین من ربیع الأول۔ (تاریخ الطبری: ۱۶۳/۵) وأخذ معاویۃ أھل الکوفۃ بالبیعۃ، فبایعوا۔ (الاخبار الطوال: ص ۲۱۷) وَدَخَلَ النَّاسُ فِي طَاعَةِ مُعَاوِيَةَ، وَدَخَلَ مُعَاوِيَةُ الْكُوفَةَ، فَبَايَعَهُ النَّاسُ۔ (تاریخ الطبری: ۵، ص ۱۶۰)

⑥ قال ابن کثیر بعد ذکر حدیث سفینۃ: وَقَدْ بَيَّنَّا دُخُولَ خِلَافَةِ الْحَسَنِ وَكَانَتْ نَحْوًا مِنْ سِتَّةِ أَشْهُرٍ فِيهَا أَيْضًا۔ (البدایۃ والنھایۃ: ۲۸۸/۹)

⑦ قال ابن حجر الھیثمی: المراد ھنا الخلافۃ الکاملۃ ثلاثون سنۃ وھی منحصرۃ فی الخلفاء الأربعۃ والحسن لأن مدتہ ھی المکملۃ للثلاثین والمراد ثم مطلق الخلافۃ التی فیھا کمال وظھرہ العامر أن من جملتھم نحو یزید بن معاویۃ: (الصواعق المحرقۃ: ۱ ص ۶۶)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلافت سے دست برداری کے بعد

خلافت سے دست برداری کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کوفہ سے رخصت ہو گئے۔ جاتے ہوئے ایک پر اثر تقریر کی جس میں لوگوں کو پڑوسیوں، مہمانوں اور اہل بیت کے حقوق کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ اپنے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر خاندان کے ساتھ ایک قافلے کی شکل میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ ①

اس نقل مکانی میں کئی مصلحتیں تھیں۔ آپ اپنا دامن سیاسی جھمیلوں سے بچانا چاہتے تھے۔ کوفہ میں یہ ممکن نہ تھا۔ پھر وہاں آپ کو اپنے حامیوں کے روپ میں چھپے ہوئے بعض شرپسندوں اور خوارج وغیرہ سے خطرات لاحق تھے۔ مدینہ منورہ آپ کے لیے محفوظ اور محبوب مقام تھا، جہاں آپ بقیہ زندگی یکسوئی سے بسر کرنا چاہتے تھے۔ آپ کی باقی عمر مدینہ منورہ میں اُمت کی روحانی تربیت اور اصلاحِ عقائد میں گزری۔

آپ رضی اللہ عنہ شرپسند عناصر کی اہل بیت کے بارے میں مبالغہ آرائیوں کی ہمیشہ نفی کرتے رہے۔ کسی نے پوچھا: ''آپ کے بعض حامی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قیامت سے پہلے دوبارہ زندہ ہوں گے۔'' حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پرزور الفاظ میں تردید کرتے ہوئے فرمایا: ''خدا کی قسم! وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ ہمارے گروہ کے لوگ نہیں، اگر ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زندہ ہونے کا عقیدہ رکھتے تو ان کی ازواج دوبارہ نکاح نہ کرتیں، ان کی میراث تقسیم نہ ہونے پاتی۔'' ②

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح پسندی:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے نہ صرف حکومت اور طاقت کے ہوتے ہوئے خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی، بلکہ بعد میں بھی وہ اُمت کے ایسے محبوب بزرگ رہے کہ ان کے اشارے پر ہزاروں گردنیں کٹنے کو تیار تھیں، مگر وہ اُمت کے مفاد کو مدنظر رکھنے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی اہلیت کو دل سے تسلیم کرنے کی وجہ سے ان کے تابعدار رہے۔ اگرچہ کچھ لوگ انہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف اُکسانے کی کوشش کرتے رہے اور آپ کی طرف سے انکار کو آپ کی کمزوری یا بزدلی قرار دیتے رہے مگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے فیصلے پر اٹل رہے اور غلط باتیں پھیلانے والوں کی تردید بھی کرتے رہے۔ کسی موقع پر ان سے پوچھا گیا: ''لوگ کہتے ہیں کہ آپ (اب بھی) خلافت کے خواہش مند ہیں۔''

آپ رضی اللہ عنہ نے بھرپور نفی کرتے ہوئے فرمایا: ''عربوں کے سر میرے لیے کٹنے کو تیار ہیں۔ وہ اس سے لڑیں گے جس سے میں لڑوں گا۔ وہ اس سے صلح کریں گے جس سے میں صلح کروں گا۔ میں نے خلافت کو اللہ تعالیٰ کی رضا پانے اور اُمت محمدیہ کا خون محفوظ رکھنے کی خاطر ترک کیا تھا۔ تو کیا اب میں دوبارہ اہل حجاز میں خون ریزی کراؤں؟'' ③

---

① تاریخ الطبری: ۵ ص ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۵

② سیر اعلام النبلاء: ۲۶۳/۳، ط الرسالۃ

③ المستدرک للحاکم، ح: ۴۷۹۵ بسند صحیح

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حسنین کریمین سے حسن سلوک:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عمر بھر حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کا اعزاز واکرام فرماتے رہے۔ ایک بار حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انہوں نے فرمایا: ''میں آپ کو ایسا عطیہ دوں گا جو اس سے پہلے کسی نے کسی کو نہ دیا ہوگا۔'' پھر انہیں دو لاکھ درہم دیے۔ ایک بار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما اور (ان کے چچا زاد) حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کو ایک ایک لاکھ درہم بھیجے۔[1] تحائف دینے کا یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا اور حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہدیے قبول کرتے رہے۔

صلح سے غلط عقائد پر ضرب:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح روافض کے اس عقیدے کی نفی کرتی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ امام معصوم تھے اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ معاذ اللہ منافق یا فاسق وفاجر تھے۔ کیوں کہ اگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا حضرت مُعاویہ کو خلیفہ بنانا غلط تھا تو پھر وہ امام معصوم ثابت نہیں ہوتے۔ اور اگر ان کا یہ عمل درست تھا تو حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا ایمان دار ورعادل ہونا ثابت ہوجاتا ہے کیوں کہ ایسی ہستی کبھی کسی کافر یا فاسق وفاجر کو اتنے بڑے منصب پر فائز نہیں کرسکتی۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات:

کوفہ سے مدینہ آکر حضرت حسن رضی اللہ عنہ عمر بھر وہیں رہے۔ دشمنوں نے کئی بار آپ کو زہر دیا مگر اللہ نے آپ کو بچالیا۔ آخر آپ کو تیز قسم کا زہر دیا جس سے جگر کٹ گیا اور خون کی قے ہونے لگی۔ اسی حالت میں آپ رضی اللہ عنہ کچھ دنوں بعد وفات پاگئے۔[2] یہ ۴۹ھ کا واقعہ ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کی عمر ۴۷ سال تھی۔[3] نمازِ جنازہ کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو آگے کیا جو اس وقت مدینہ کے اَمیر تھے۔[4] آپ رضی اللہ عنہ کو جنت البقیع میں اپنی والدہ ماجدہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے پہلو میں دفنایا گیا۔[5] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر مسجد نبوی میں جمع لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا: ''لوگو! آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیارا چل بسا۔'' یہ سن کر سب بے اختیار رونے لگے۔[6]

مشہور ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دلوانے میں ان کی اہلیہ جَعدَہ بنت اشعث اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھا۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ جن روایات میں یہ افسانہ تراشا گیا ہے وہ بے سند یا مجہول وضعیف راویوں پر مشتمل ہیں۔[7]

❁❁❁

---

① تاریخ دمشق: ۵۹ ص ۱۹۳، ۱۹۴

② طبقات ابن سعد: متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۱ ص ۳۳۶، ۳۳۵، اسنادہ حسن لغیرہ

③ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۴۹ھ؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۴۹ھ

④ مصنف عبدالرزاق، ح: ۶۳۶۹، اسنادہ صحیح

⑤ الفتن لنعیم بن حماد، ح: ۳۲۱، اسنادہ صحیح؛ انساب الاشراف: ۳ ص ۶۰، اسنادہ حسن؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱ ص ۲۱۱

⑥ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱ ص ۲۱۰، ۲۱۲

⑦ تفصیل کے لیے دیکھیے: تاریخ اُمت مسلمہ حصہ دوم، ''ازالۂ شبہات''

چند مفید مباحث

① مشاجراتِ صحابہ تکمیلِ شریعت کے لیے تھے:

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ نے ”شریعت وطریقت کا تلازم“ کے ابتدائی اور ”الاعتدال فی مراتب الرجال“ کے آخری باب میں ”مشاجراتِ صحابہ“ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ ان ابواب کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔ راقم یہاں ان کا حاصلِ مطلب اپنے الفاظ پیش کر رہا ہے:

”صحابہ کرام کے درمیان ”مشاجرات“ در حقیقت اللہ کی طرف سے شریعت کی تکمیل کے لیے تکوینی طور پر کرائے گئے تھے۔ اگر تکوینی حکمتوں کو نظر انداز کر کے ”مشاجرات“ کو دیکھا جائے تو یہ محض مصیبت اور آفت دکھائی دیں گے مگر تکوینی حکمتیں سامنے ہوں تو پھر ان میں بھی اللہ کی رحمتِ خاصہ کی جلوہ نمائی محسوس ہوگی۔

کسی بھی قانون کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک اسے نافذ نہ کر دیا جائے، قانون کے نفاذ کے بعد ہی یہ عملی ثبوت مل سکتا ہے کہ وہ انسانوں کے لیے مفید ہے یا مضر۔ شرعی احکام اللہ کی طرف سے ہیں، اس لیے ان کا مفید ہونا ایک مسلمان کے لیے یقینی ہے۔ مگر عام انسان جب تک ان کے نفاذ کے اثرات کو نہ دیکھ لے وہ مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اللہ نے دنیا والوں کے سامنے ہر قسم کے شرعی احکام کا عملی نمونہ محفوظ فرما دیا۔ یہ شرعی احکام چار قسم کے ہیں:

① ایک وہ جنہیں کر کے دکھانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی کے شایانِ شان تھا۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، جہاد وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے کام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کرائے۔ تاکہ اُمت کو براہِ راست پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے عملی نمونہ ملے۔

② دوسری قسم کے احکام ایسی لغزشوں سے متعلق تھے جن کا صدور، ذاتِ نبوت سے ہونا بھی عصمتِ انبیاء کے منافی نہ تھا جیسے نماز میں بھول چوک ہو کر سجدہ سہو واجب ہونا، نماز قضا ہو جانا۔ ایسے احکام کی تکمیل بھی خود ذاتِ نبوت سے کرائی گئی اور اس کے لیے کبھی کبھار پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو سہو کرا دیا گیا، ایک آدھ مرتبہ نیند طاری کر کے نمازِ فجر قضا کرا دی گئی تاکہ اُمت کو خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے ایسے مسائل کا شرعی حکم معلوم ہو جائے۔

③ تیسری قسم کے احکام شرعی سزاؤں سے متعلق تھے، جیسے، شراب نوشی، چوری اور بدکاری کی سزائیں۔ چونکہ پیغمبر کی ذات معصوم ہوتی ہے اس لیے ایسے کاموں کا ارتکاب، ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ممکن ہی نہ تھا۔ لہٰذا اللہ نے ایسے کام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، بعض غیر معروف صحابہ سے کروا دیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان پر شرعی سزائیں جاری ہوئیں۔ دنیا کے سامنے عملی طور پر یہ نمونہ آگیا کہ سنتِ نبویہ میں ایسے جرائم کی یہ سزا مقرر ہے۔

ان جرائم کے مرتکب حضرات بذاتِ خود نہایت پاکباز تھے مگر اللہ کی تقدیر اور مشیت نے ان سے ایسے کاموں کو کروا دیا تاکہ شرعی احکام صرف زبانی اور تحریری ہی نہ رہیں بلکہ ان کا عملی ثبوت بھی موجود ہو، تاکہ شریعت کی تکمیل ہو سکے۔ پس ان خطاؤں کو لے کر ان حضرات پر طعن وتشنیع کی ہرگز اجازت نہیں بلکہ ان کا احترام بہر حال ضروری ہے۔

۴ چوتھی قسم کے شرعی احکام وہ ہیں جن کے نفاذ کے لیے حضور ﷺ کا پُرنور زمانہ مناسب نہ تھا؛ کیوں کہ یہ احکام فتنوں، فساد، اختلاف اور خانہ جنگی سے متعلق ہیں۔ اسلام میں ان مسائل کا حل اور ان سے متعلق ہدایات موجود ہیں مگر یہ حضور اکرم ﷺ کے مبارک زمانے کے شایانِ شان نہ تھا کہ اس میں ایسے فتنے ظاہر ہوتے۔ اس لیے ان احکام کے عملی نفاذ کے لیے اللہ نے حضور ﷺ کی رحلت کے بعد کا وقت رکھا اور وہ بھی تب جب اسلام دنیا میں غالب اور مستحکم ہوجائے، تاکہ اندرونی فتنوں سے اسلامی ریاست ایسی کمزور نہ ہوجائے کہ بیرونی طاقتیں اس پر چڑھ دوڑیں۔

اللہ کی تقدیر کے اس فیصلے کے مطابق، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ اختلافات رونما ہوئے، جن میں موقع بموقع فتنوں سے متعلق تمام شرعی احکام کا عملی نمونہ سامنے آتا چلا گیا۔ ان احکام کے نفاذ کے اثرات بھی دنیا کے سامنے آگئے کہ جلد ہی مسلمان متحد ہوگئے اور اسلامی فتوحات اور عروج کا دور ایک بار پھر شروع ہوگیا۔

❀ الغرض صحابہ کرام وہ سچے جانثار تھے جنھوں نے شریعت کی تکمیل کے لیے جہاں قدم قدم پر جان ومال کی قربانی دی، وہاں اپنی عزتیں بھی اللہ کی مشیت کی تکمیل کے لیے پیش کردیں۔ اگر شریعت کی تکمیل کے لیے اللہ کی مشیت ان سے کسی خطا یا کسی جرم کا ارتکاب کراتی ہے جس کی پاداش میں ان میں سے کسی کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، کسی کو کوڑے لگائے جاتے ہیں اور کسی کو سنگسار کیا جاتا ہے، تو وہ اپنی خطا پر ندامت کے ساتھ ساتھ تقدیر کے اس فیصلے پر راضی برضا ہیں۔ وہ شکوہ نہیں کرتے کہ ہم جیسے نبی کے لاڈلوں کو سزا دی جارہی ہے اور سرِعام رسوائی ہورہی ہے۔ نہیں بلکہ وہ اس بے عزتی پر بھی صبر کیے ہوئے ہیں اور اللہ سے مغفرت کی امید رکھتے ہیں۔ پھر حضور اکرم ﷺ کی رحلت کے پچیس برس بعد، ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے یہی حضرات اللہ کی تقدیر کے آگے بے بس ہوکر باہم نبرد آزما ہوتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں کٹ جاتے ہیں۔ ظاہر بین کے نزدیک یہ محض خونریزی ہے مگر اللہ کی مشیت یہاں حالتِ فتنہ اور خانہ جنگی کے شرعی احکام کا نفاذ کرکے دکھانا چاہتی تھی۔ صحابہ ان صدمات کو بھی جھیل جاتے ہیں۔ جان ومال کے ساتھ عزت وشہرت کی قربانیاں بھی دیتے ہیں اور اللہ کی تقدیر میں لکھے اتنے بڑے سانحوں پر بھی راضی برضا رہتے ہیں۔ حرف گیری کرنے والوں نے مشاجرات میں تلواروں کا چلنا اور لاشوں کا گرنا دیکھا اور صحابہ کو دنیا پرست اور اغراض پسند سمجھ کر گمراہ ہوگئے۔ اللہ والوں نے ان واقعات کے پیچھے اللہ کی حکمت اور مشیت کو دیکھا اور صحابہ کرام کے بارے میں وہی عقیدہ رکھا جو قرآن مجید نے بتایا ہے: رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

مشاجرات مسلم قوم کے لیے اجتماعی دھچکے اور صدمے تھے مگر ایسے دھچکوں اور صدموں سے قوموں کی اندرونی ساخت مضبوط ہوتی ہے۔ ایک مثال سے اس بات کو سمجھیں۔ کچھ مدت پہلے بچوں کے لیے مٹی میں کھیلنا اور مٹی کھانا مضرِ صحت سمجھا جاتا تھا مگر اب جدید طبی تحقیق بتاتی ہے کہ جو بچے مٹی میں کھیل کر بڑے ہوتے ہیں اور مٹی کھاتے ہیں، بڑی عمر میں وہ قوتِ مدافعت میں دوسروں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ مٹی کے ساتھ جو جراثیم جسم میں داخل ہوتے ہیں، وہ جسم کو مختلف قسم کے مضر جراثیموں کا عادی بنادیتے ہیں، پھر معمولی قسم کی نقصان دہ

چیزیں انسان کو متاثر نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس جو بچے جراثیم سے بالکل محفوظ ماحول میں پرورش پاتے ہیں، وہ زندگی کے عملی میدان میں اتر کر باہر کے ماحول کے ایک معمولی جھونکے کے باعث نزلہ، زکام، کھانسی اور بخار کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح جن بچوں کی تربیت نہایت لاڈ پیار سے ہوتی ہے اور انہیں سردی گرمی سے ہر طرح بچایا جاتا ہے، وہ بڑے ہوکر معمولی ٹھنڈ یا معمولی گرمی سے بیمار پڑ جاتے ہیں جبکہ بچپن میں سردی گرمی کا مقابلہ کرنے والے بچے بڑے ہوکر مضبوط قوتِ مدافعت کے حامل ہوتے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ نے بھی اپنے ابتدائی زمانے میں جو جو صدمے سہے، وہ اس کی قوتِ مدافعت کی مضبوطی کا باعث بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے اور آفات کے ہزار ہا طوفانوں سے پالا پڑنے کے باوجود اُمت مسلمہ نہ صرف باقی ہے بلکہ دن بدن اس کا دائرہ بڑھتا جارہا ہے۔

④ کیا صحابہ کرام کے تنازعات ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' کے خلاف ہیں؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ صحابہ کرام کے تنازعات اور اختلافات نصِ قرآنی: ''رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ'' کے خلاف ہیں، قرآن مجید تو کہتا ہے کہ وہ آپس میں بڑے رحیم و کریم ہیں جبکہ تاریخ میں مذکور یہ واقعات اس کے برعکس ہیں۔ اس لیے جس تاریخ میں ایسے تنازعات کا ذکر ہے، اسے دریابرد کردینا چاہیے۔

مگر اوّل تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ ایسے واقعات صرف تاریخ میں ہیں۔ صحابہ کرام کے باہمی اختلاف اور ناراضی کے واقعات تو کتبِ حدیث میں بھی ہیں۔ عام صحابہ میں نہیں، امہات المؤمنین میں بھی کبھی کبھار ایسی نوبت آجاتی تھی جس کی مثالیں حدیث کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک دو واقعات خلفائے راشدین کی بھی باہمی خفگی کے مل جائیں گے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض امہات المؤمنین سے وقتی طور پر خفا ہونا ثابت ہے۔ مگر اس میں سے کسی بات کو خلافِ محبت و مودّت نہیں کہا جاسکتا۔ آپس میں کبھی کبھار شکر رنجی اور تکرار ہوجانا پیار و محبت کے ہرگز خلاف نہیں۔ کونسا گھر ہے جہاں باپ بیٹے، میاں بیوی اور بہن بھائیوں میں کبھی کدورت اور خفگی نہ ہوئی ہو۔ مگر اس سے ان رشتوں پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اسی طرح دوستوں بلکہ استادوں اور شاگردوں میں بھی اختلافِ رائے بلکہ بعض اوقات رنجش تک ہوجاتی ہے۔ بالخصوص جہاں ذہین اور کھلے دماغ کے لوگ ہوں وہاں اختلافِ رائے ہونا لازمی ہے۔ صحابہ کرام کے ہاں ماحول بھی بے تکلفانہ تھا۔ کوئی کسی کا تابعِ مہمل اور لکیر کا فقیر نہ تھا۔ جو جس بات کو درست سمجھتا تھا، خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ اسے برملا کہتا تھا۔ اگر ہم اپنے گھر کے افراد، بہن بھائیوں اور اپنے عزیزوں میں ایسے واقعات کو محبت کے خلاف نہیں سمجھتے، تو کیا وجہ ہے کہ صحابہ کرام کو ان معاملات میں اس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ جیسے وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں۔ صحابہ کرام کے دل معصوم بچوں کی طرح پاک تھے۔ جس طرح بچے باہم لڑ جھگڑ کر تھوڑی دیر میں ہنسی خوشی کھیلنے لگتے ہیں اسی طرح صحابہ بھی کسی وقتی رنجش کے بعد جلد ہی شیر و شکر دکھائی دیتے تھے۔ نیز ان کے اکثر اختلافات خالص علمی و فقہی نوعیت کے تھے جو ہمیشہ علماء و حکماء کے ہر طبقے میں ہوا کرتے ہیں۔ ایک دو معاملات میں اگر ان کے درمیان جنگ کی نوبت آئی ہے تو وہ بھی قرآنِ مجید میں ان کی بیان کردہ صفت کے

خلاف نہیں کیوں کہ صحابہ کرام جہاں "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ" تھے، وہاں ان کی ایک صفت "لَا یَخَافُوْنَ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَآئِم" بھی ہے۔ جو جس بات کو شرعی حکم سمجھتا تھا، اسے پورا کرنے کے لیے جان دینے اور جان لینے پر بھی تیار تھا۔ جس ایمانی غیرت سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی پکڑی اور جس جذبے سے ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری چلائی، اسی جذبے سے صحابہ کرام نے جمل و صفین میں زخم کھائے۔ جس طرح موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے ان واقعات کا نہ تو کوئی انکار کرسکتا ہے، نہ انہیں کسی منفی جذبے پر محمول کرسکتا ہے، اسی طرح صحابہ کرام کے مشاجرات کا انکار کرنا عبث اور انہیں غلط معنیٰ پر محمول کرنا ضلالت ہے۔ جس طرح وہ حقائق انبیائے کرام کی عصمت کے ہرگز منافی نہیں، اسی طرح یہ مناظر صحابہ کی عدالت سے قطعاً متصادم نہیں۔

③ عبداللہ بن سبا کا انجام کیا ہوا؟

عبداللہ بن سبا کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ وہ انہی ملحدین میں شامل تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خالق و رازق کہہ رہے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں زندہ جلاڈالا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری اور سنن ابی داؤد میں ہے۔①

مگر صحیح بخاری اور سنن ابی داؤد کی ان روایات میں عبداللہ بن سبا کا نام مذکور نہیں، صرف اتنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ زندیقوں کو جلادیا تھا۔ کچھ حضرات قیاس کرکے کہتے ہیں کہ ابن سبا انہی میں ہوگا۔

دوسری طرف اہلِ تشیع کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت زندہ تھا اور مدائن میں تھا (جہاں اسے شہر بدر کرکے بھیجا گیا تھا)۔ شہادت کی اطلاع ملنے پر اس نے خبر دینے والے کو کہا:

كَذَبْتَ اِنْ جِئْتَنَا بِدِمَاغِهٖ بِسَبْعِيْنَ صُرَّةً وَ اَقَمْتَ عَلٰى قَتْلِهٖ سَبْعِيْنَ عَدْلًا، مَا صَدَّقْنَاكَ، لِعِلْمِنَا اَنَّهٗ لَمْ يَمُتْ وَلَمْ يُقْتَلْ، وَلَا يَمُوْتُ حَتّٰى يَمْلِكَ الْاَرْضَ۔

(تو جھوٹ بولتا ہے۔ اگر تو ان کا بھیجا، ستر تھیلیوں میں لادے اور ان کے قتل ہونے پر ستر عادل گواہ پیش کردے، تب بھی ہم تیری تصدیق نہ کریں گے، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہ مرے نہ قتل ہوئے۔ وہ اس وقت تک نہیں مریں گے جب تک پوری دنیا پر قابض نہیں ہوجاتے۔)②

ابن سبا کے اس دعوے کے پیچھے یہودیوں کے اس عقیدے کی چھاپ صاف محسوس ہوتی ہے جس کے مطابق ایک دن مسیح دجال کا ظہور ہوگا اور وہ اپنے پیروکاروں کے لیے ساری دنیا فتح کرے گا۔

اندازہ یہی ہے کہ عبداللہ بن سبا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک زندہ تھا۔ چونکہ وہ پسِ پردہ رہ کر سازشیں کرنے والا سرغنہ تھا، لہٰذا کسی کو خبر نہیں ہوسکی کہ کب اور کہاں مرا۔ اسی لیے تاریخ اس کے انجام کے متعلق خاموش ہے۔

❁❁❁

① صحیح البخاری، ح: ۲۹۲۲؛ سنن ابی داؤد، ح: ۴۳۵۱؛ لسان المیزان: ۲۸۹/۳

② فرق الشیعۃ، حسن بن موسیٰ نوبختی (م ۳۱۰ھجری)، ص ۲۳

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب پر روشنی ڈالیے؟
❷ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کی پیش گوئی کس حدیث مبارکہ میں ہے؟
❸ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اہلِ شام سے صلح اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت منتقل کرنے کی وجہ کیا تھی؟
❹ کیا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مجبوری ولاچاری کے باعث حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی تھی؟
❺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح میں مال کی شرط کیوں رکھی تھی؟ اور کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عہد کی پاسداری کی؟
❻ حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلافت چھوڑنے کے بعد مدینہ منورہ کیوں منتقل ہو گئے تھے؟
❼ کیا صحابہ کرام کے تنازعات رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کے خلاف ہیں؟
❽ عبداللہ بن سبا کا انجام کیا ہوا؟

عملی کام:

❀ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کے حالات کا کوئی اقتباس کسی بڑی کتاب سے نقل کریں۔
❀ اس موضوع پر دس منٹ کی تقریر کیجیے: ''مشاجراتِ صحابہ شریعت کی تکمیل کے لیے تھے۔''

کتب برائے مطالعہ:

❀ امیر المؤمنین الحسن بن علی، شخصیتہ وعصرہ، للشیخ علی محمد الصلابی،
❀ المرتضیٰ، از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ
❀ مقام صحابہ از حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ
❀ تاریخ اُمت مسلمہ، جلد دوئم

دوسرا باب

خلافتِ راشدہ میں
نظم ونسق اور تہذیب وتمدّن

تعارف:

خلافتِ راشدہ میں اسلامی ریاست کی تنظیم اور مختلف شعبوں کی تشکیل ہوئی اور اسلامی علوم کا پھیلاؤ عام ہوا۔ خلافتِ راشدہ کے کامیاب نظام سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل میں اسلامی تہذیب وتمدن کی نشوونما ہوئی اور مختلف اسلامی حکومتوں اور سلطنتوں کے تفصیلی، وسیع اور دقیق نظام وجود میں آئے۔

اہداف ومقاصد:

اس باب کو پڑھ کر آپ ان شاء اللہ اس قابل ہوجائیں گے کہ:

1. خلافتِ راشدہ کے انتظامی ڈھانچے سے واقف ہوسکیں۔
2. دورِ خلافتِ راشدہ میں تعمیری وترقیاتی کاموں سے آگاہ ہوسکیں۔
3. دورِ خلافتِ راشدہ کی علمی سرگرمیوں اور تہذیب وتمدن کے بارے میں جان سکیں۔

(یونٹ:1.15)

خلافتِ راشدہ کی انتظامی وتمدّنی خصوصیات

خلافتِ راشدہ میں ملکی نظم ونسق اور تہذیب وتمدن اسلامی روح کے عین مطابق رُو بہ ترقی رہا۔ خلیفہ کا قیام مدینہ منورہ میں ہوتا تھا۔ نظم ونسق کے اعتبار سے خلفائے راشدین کے عہد میں درج ذیل خصوصیات نمایاں تھیں:

① شورائیت:

خلافتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا سیاسی ادارہ مجلسِ شوریٰ تھی۔ مجلس شوریٰ بہت بااختیار اور مستعد تھی۔ ارکانِ شوریٰ میں وہ صحابہ کرام سب سے نمایاں تھے جنہیں عشرۂ مبشّرہ کہا جاتا ہے۔

② انتقالِ اقتدار کا ضابطہ:

نئے خلیفہ کے انتخاب میں شوریٰ کا کردار سب سے اہم ہوتا تھا۔ شوریٰ حکمران کے انتخاب میں خدمتِ اسلام اور صحبتِ نبویہ کو خاص اہمیت دیتی تھی۔ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے خلفاء کے تقرر کے بارے میں یہ ضابطہ مقرر کیا تھا:

"امرِ خلافت بدری صحابہ کے لیے رہے گا جب تک ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے۔ پھر غزوۂ اُحد والوں کے لیے رہے گا جب تک ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے۔ پھر فلاں اور فلاں غزوے والوں کے لیے۔ طُلَقَاء، ان کی اولاد اور فتح مکہ کے وقت اسلام لانے والوں کا اس (خلافت) میں کوئی حصہ نہیں۔"[①]

③ عہدے داروں کی تقرری:

صوبے داروں اور نائبین کی تقرری اور برخاستگی کے اختیارات خلیفہ کے پاس ہوتے تھے۔ حکام کا تقرر قابلیت، علمی صلاحیت اور انتظامی مہارت کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ اعلیٰ عہدوں کے لیے صحابہ کرام کو ترجیح دی جاتی تھی۔[②]

④ مرکزِ خلافت:

۱۱ھ سے ۳۶ھ تک مدینہ منورہ دار الخلافہ رہا۔ جب خلیفہ کو حج یا کسی اور ضروری کام کے لیے مدینہ سے باہر جانا ہوتا تھا تو مدینہ میں نائب خلیفہ کا تقرر کر دیا جاتا تھا۔[③] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی ابتدائی چند ماہ مدینہ کی مرکزی حیثیت برقرار رہی۔ ۳۶ھ میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ عراق تشریف لے گئے تو کوفہ دار الخلافہ بن گیا۔

---

① عن عبدالرحمن بن ابزی رضی اللہ عنہ عن عمر رضی اللہ عنہ قال: ھذا الامر فی اھل بدر ما بقی منھم احد، ثم فی اھل احد ما بقی منھم احد، و فی کذا و کذا، ولیس فیھا لطلیق ولا لولد طلیق ولا لمسلمۃ الفتح شیء۔ (طبقات ابن سعد: ۳/۳۴۲؛ فتح الباری: ۱۳/۲۰۷)

ملحوظہ: "طُلَقَاء" (آزاد کردہ) وہ لوگ تھے جنہیں مکہ معظمہ کی فتح کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معافی دے کر آزاد کر دیا تھا۔

② عصر الخلافۃ الراشدۃ: ص ۱۱۵، ۱۱۶ ③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۰۱

⑤ شعائرِ خلافت:

خلفائے راشدین کے دور میں شعائرِ خلافت دو تھے: ❶ مُہرِ نبوی ❷ عصائے نبوی[①]

عصائے نبوی وہ مبارک لاٹھی تھی جس پر رسول اللہ ﷺ خطبے کے دوران سہارا لیا کرتے تھے اور بعد میں تمام خلفاء کے پاس وہ منتقل ہوتی رہی۔[②]

مُہرِ نبوی حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چھ سالوں تک خلفاء کے پاس محفوظ رہی۔ اس پر "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" نقش تھا۔ ۳۰ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے یہ انگشتری بِئرِ اَرِیس میں گر کر گم ہوگئی اور تلاش کے باوجود نہ ملی جس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس جیسی ایک انگشتری بنوالی[③] مگر ان کے سانحۂ شہادت کے وقت وہ انگشتری بھی گم گئی۔[④] خلفائے راشدین میں سے ہر ایک نے اپنے لیے ایک الگ مہر بھی بنوائی تھی جس پر اپنے اپنے ذوق کے مطابق مختلف الفاظ نقش کرائے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مُہر کا نقش "نِعْمَ الْقَادِرُ اللّٰہُ" تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مُہر کا نقش "کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظاً" تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مُہر کا نقش "آمَنْتُ بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ" تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مُہر کا نقش "اَلْمُلْکُ لِلّٰہِ" تھا۔[⑤]

⑥ مرکزی عہدے:

صوبوں میں مرکزی عہدے چار ہوا کرتے تھے:

❶ امیر، عامل (حاکم)

❷ کاتبِ دیوان (سیکرٹری) جو دفتری کام انجام دیتا تھا۔

❸ والیٔ بیت المال (وزیرِ خزانہ)

❹ عاملِ خراج (وزیرِ محصولات۔کلکٹر) جو زمینوں پر لگان مقرر کرتا اور وصول کرتا تھا۔

ان چاروں عہدے داروں میں سے ہر ایک کا تقرر خلفاء خود کیا کرتے تھے اور وہ تمام معاملات میں براہِ راست خلیفہ کو جواب دہ ہوتے تھے۔[⑥]

---

① مآثر الانافۃ فی معالم الخلافۃ للقلقشندی: ۲ص ۲۳۲تا۲۳۳

② شرح صحیح البخاری لابن بطال: ۹ص ۳۶۳؛ عمدۃ القاری: ۲۲ص ۲۲۲

③ سنن النسائی، ح: ۵۲۱۷؛ عمدۃ القاری: ۲۲ص ۳۸، ط دار احیاء التراث العربی؛ مرقاۃ المفاتیح، باب الخاتم،

④ تاریخ الطبری: ۴ص ۲۸۳

⑤ التنبیہ والاشراف: ص ۲۴۹، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۸

⑥ [illegible] ص ۱۵۳تا۱۵۶

⑦ عاملین کی ذمہ داریاں:

عاملین کی ذمہ داریاں غیر معمولی تھیں اور اختیارات بھی۔ وہ بیک وقت سپہ سالار بھی تھے اور سیاسی نظم وضبط کے ستون بھی۔ اپنے علاقے کی وزارتِ داخلہ اور فوجی کمان دونوں ان کے ماتحت ہوتی تھیں۔ ان کی اپنی شوریٰ ہوتی تھی جس میں تمام امور پر بحث ہوتی۔ عوامی مسائل سننے کے لیے کچہری لگا کرتی تھی۔ نہریں کھدوانا، پل بنوانا، جیل خانوں کا انتظام، نئے شہروں، بازاروں اور مساجد ومدارس کی تعمیر، عوام وخواص کی رہائش اور زراعت کرنے کے لیے زمینوں کی الاٹمنٹ یہ سب کام ان کے ذمے تھے۔ سرحدوں پر دشمنوں سے دفاع، ان کے احوال اور عزائم کی خبر رسانی، قلعوں کا استحکام، افواج کی بھرتی اور تیاری، لڑکوں کی عسکری تربیت (جس میں گھڑ سواری، تیراندازی اور تیراکی کی مشق لازماً کرائی جاتی تھی) بھی ان کی اہم ذمہ داریاں تھیں۔ دشمن کے خلاف لشکر کشی کے لیے دربارِ خلافت سے منظوری لینا ضروری تھا، البتہ اگر اپنی سرحدوں پر جارحیت ہوتی تو حاکم خلیفہ سے پوچھے بغیر ملک کے دفاع کا پابند تھا۔ ①

ان ذمہ داریوں کے صلے میں عاملین کو گزر بسر کے لیے معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں تاکہ وہ فکرِ معاش سے بالکل بے پروا ہو کر پوری یکسوئی کے ساتھ عوام کی خدمت کریں۔ تنخواہ کی بلند سطح دو سو دینار سالانہ تک چلی جاتی تھی۔ ②

بعض اوقات شعبۂ مالیات بھی حاکم کے سپرد ہوتا تھا، جیسے شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اُرْدُن میں حضرت شُرَحْبِیل بن حَسَنہ رضی اللہ عنہ مالی امور کا خود حساب وکتاب کرتے تھے۔ مگر عام طور پر بیت المال اور محصولات کا شعبہ حاکم کے اختیار سے باہر ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جب کوفہ کے عامل تھے تو صوبائی خزانے کے نگران حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ ③ جب حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کوفہ کے عامل بنے تو خراج وصول کرنے کی ذمہ داری حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کی تھی۔ ④

⑧ قبائلی سرداری نظام:

جزیرۃ العرب میں زمانۂ قدیم سے قبائلی نظام چلا آرہا تھا اور قبیلوں کے سردار تمام اُمور کے نگران ہوا کرتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر دیہی علاقوں میں اسی نظام کو باقی رکھا اور عموماً انہی قبائلی سرداروں کو جو اسلام قبول کرنے میں پیش پیش تھے، ان کے علاقوں کا والی مقرر فرما دیا۔ خلفائے راشدین کے دور میں بھی مرکزی شہروں کو چھوڑ کر جزیرۃ العرب اور اس سے متصل علاقوں میں قبائلی نظام قائم رہا۔ قبائلی سردار اپنے علاقوں میں اسلامی نظام قائم رکھتے تھے اور اپنے پرچموں کے ساتھ جہاد میں شرکت کرتے تھے۔ ⑤

---

① عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۱۷، ۱۱۸

② عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۳۰؛ دو سو دینار چھ ہزار ڈالر سے زائد بنتے ہیں۔

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۱۳۹

④ الخراج للقاضی ابی یوسف، ص ۳۶

⑤ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۱۳، ۱۱۴

⑨ تبادلہ اور برطرفی:

یہ ضروری نہیں تھا کہ کسی کو اعلیٰ عہدہ دینے کے بعد اس کو مستقل اس پر برقرار رکھا جائے۔ قومی مفاد کے پیش نظر بعض اوقات حکام کو تبدیل بھی کر دیا جاتا تھا۔ ایک خلیفہ کے مقرر کردہ عاملوں کو دوسرا خلیفہ چاہتا تو باقی رکھ سکتا تھا لیکن اگر کسی کا زیادہ عرصے تک تقرر قومی مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا تو اس کو برخواست بھی کر دیا جاتا تھا۔ تقرری اور برخواستگی کے احکام بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ پر بھی جاری ہوتے مگر اُمتِ مُسلمہ کی خیر خواہی کا جذبہ اور خلافت کا احترام ایسا تھا کہ کبھی کسی نے اسے اپنی اَنا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد میرے مقرر کردہ حکام کو ایک سال سے زیادہ مدت تک باقی نہ رکھا جائے، سوائے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے۔ انہیں چار سال مزید اس عہدے پر رہنے دیا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے مطابق عمل کیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اس کے بعد دوبارہ بھی کوفہ کے حاکم بنائے گئے۔ انہوں نے بھی اپنی معزولی کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ ①

⑩ مالی معاملات میں احتیاط:

حاکم کو بھی بیت المال سے کچھ لینا ہوتا تو اسے نگران سے منظوری لینا پڑتی تھی۔ رقم کے لین دین کے سلسلے میں بڑی سے بڑی شخصیت سے رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ ایک ایک درہم کا حساب ہوتا تھا تاکہ مسلمانوں کے سرکاری خزانے کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ اگر غلطی سے بھی رقم آگے پیچھے ہو جاتی تو پوچھ گچھ ضرور ہوتی اور بعض اوقات خلیفہ تادیبی کارروائی بھی کرتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اس معاملے میں نرمی نہیں برتتے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جو کوفہ کے عامل تھے، صوبائی نگران بیت المال حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھ کر خزانے سے کچھ رقم قرض لی۔ بعد میں اپنے مالی حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے وہ طے شدہ وقت پر یہ رقم بیت المال میں نہ لوٹا سکے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تقاضے کے باوجود جب حاکم ادائیگی نہ کر سکے تو خلیفہ کو اطلاع دے دی گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے مرتبے اور مقام کے باوجود اس موقع پر انہیں معزول کرنا ہی بہتر سمجھا تاکہ عوام میں یہ تاثر نہ پھیلے کہ حکام اپنے عہدے سے ناجائز مفادات حاصل کر رہے ہیں۔ ②

اوپر کے یہ اثرات نیچے تک پڑتے تھے۔ اس لیے افسران اور ماتحتوں میں بھی دیانت داری اور مالی احتیاط عام تھی۔ افسران کی جانب سے دیانت داری کی نصیحتیں بار بار کی جاتی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری سال ایک محاذ پر لڑنے والے کلیب جرمی رحمہ اللہ اپنے صاحبزادے کو اپنا واقعہ یوں سناتے تھے:

''ہم نے تَوَّج کا محاصرہ کیا۔ بنی سلیم کے مُجاشع بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمارے امیر تھے۔ قلعہ فتح ہو گیا۔ میرا کرتا بہت پھٹا پرانا تھا۔ میں ایک عجمی کی لاش کی طرف بڑھا، اس کی قمیص اتاری، اسے چٹانوں پر رکھ کر خوب رگڑا، دھویا اور

① سیر اعلام النبلاء: ۲/۳۹۱، ط الرسالۃ
② الکامل فی التاریخ: ۲/۴۵۶

پاک صاف کر کے پہن لیا۔ پھر سوئی دھاگا حاصل کیا اور ایک دیہات میں جا کر اپنے کرتے کی سلائی کرائی۔ اس دوران امیر لشکر مجاشع بن مسعود نے کھڑے ہو کر اعلان کیا: ''لوگو! مال غنیمت میں سے کچھ نہ دبانا۔ جو کسی چیز میں خیانت کرے گا قیامت کے دن اس چیز سمیت حاضر ہوگا چاہے وہ دھاگا ہی کیوں نہ ہو۔''

یہ سنتے ہی میں نے وہ قمیص اتار دی۔ پھر اپنے کرتے کو بھی ادھیڑنے لگا۔ بیٹے اللہ کی قسم! میں نے پوری احتیاط کی کہ کوئی دھاگا تک ٹوٹنے نہ پائے۔ پھر مال غنیمت سے لی گئی وہ قمیص، وہ دھاگا اور وہ سوئی سب چیزیں وہیں واپس پہنچا دیں۔''①

⑪ ہدایت اور تادیب پر مشتمل مراسلے:

خلفاء کی طرف سے عاملوں کے نام خصوصی ہدایات بھی وقتاً فوقتاً جاری ہوتی رہتی تھیں اور عمومی نصیحت نامے یا اعلامیے (سرکلر) بھی بھیجے جاتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت کے آغاز میں عمال کو جو اعلامیہ جاری کیا اس میں کہا گیا تھا:

''اللہ نے حکمرانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ محافظ بنیں، انہیں ٹیکس لینے والا بننے کا حکم نہیں دیا۔ وہ وقت دور نہیں جب وہ ٹیکس وصول کرنے والے بن جائیں گے، محافظ نہیں رہیں گے۔ تب حیاء امانت اور وفا ختم ہو جائے گی، انصاف کا چلن یہ ہے کہ ہر وقت مسلمانوں کے معاملات پر نظر رہے کہ ان کی ذمہ داریاں اور حقوق کیا ہیں، ان کے حقوق ادا کرو اور ذمہ داریاں ان پر ڈالو، ذمیوں کے حقوق ادا کرو اور جو ان کے ذمے ہے وصول کرو۔''②

⑫ مملکت کی تقسیم...... مرکز اور صوبوں کا رابطہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلامی ریاست کے صوبے: مکہ، مدینہ، بحرین، یمن، شام، کوفہ، بصرہ اور مصر پر مشتمل تھے۔ افریقہ مصر کے ماتحت تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آرمینیا فتح ہوا تو کئی علاقوں کو ایک مستقل صوبہ بنا دیا گیا۔ عاملوں سے گاہے گاہے ملاقات کی جاتی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس مقصد کے لیے دو تین بار خود شام کے سفر کیے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اکثر حج کے لیے بھی تشریف لے جاتے، وہاں عاملوں کے علاوہ پوری دنیا کے مسلمانوں سے عام مجمع میں ملاقات ہوتی، لوگوں کو اپنی شکایات بیان کرنے کا موقع دیا جاتا۔③

⑬ تجارتی شعبہ:

معاشی واقتصادی ترقی کے لیے تجارتی شعبے کی خاص دیکھ بھال کی جاتی۔ حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم بذات خود تاجر پیشہ تھے، اس لیے خرید وفروخت کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور ناجائز طریقوں سے دولت کمانے کی سخت ممانعت تھی، سودی لین دین بالکل ممنوع تھا، شراب نوشی کی طرح شراب فروشی پر بھی مکمل

---

① مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۳۳۸۲۸

② تاریخ الطبری: ۴/۲۴۴، ۲۴۵ ③ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۱۸، ۱۱۹

پابندی عائد تھی۔ بازار میں تجارت کے لیے بیٹھنے سے قبل لازم تھا کہ تجارت کے احکام سیکھے جائیں۔ ①

⑭ نظام کفالت۔ ادارۃ العُرَ فاء:

نظامِ خلافت کا ایک خاص ادارہ "العُرَ فاء" تھا جو رعایا کی کفالت، عوامی نمایندگی اور قومی نظم وضبط کی بہترین مثال تھا۔ اس نظام کے تحت رعایا کے ہر بڑے مجمعے مثلاً فوج، کسی شہر کی آبادی یا کسی قبیلے کے افراد سے دس نمایندے چن لیے جاتے تھے، ان میں سے ہر ایک کو "عَرِیف" کہا جاتا تھا اور انہیں دس، دس افراد کی نمایندگی اور ان کے احوال کی دیکھ بھال کی خدمت سونپ دی جاتی تھی۔ یہ ماتحت افراد اسی طرح مزید دس، دس افراد سے رابطے کے ذمہ دار بنتے تھے اور وہ مزید دس، دس کے۔ یہ سلسلہ چلتا جاتا، اس طرح اوپر سے نیچے تک لاکھوں افراد جن میں خواتین اور بچے تک شامل ہوتے، ربط وضبط کی ایک لڑی میں پروئے جاتے۔ حکومت کو تازہ دم مجاہدین درکار ہوتے تو قبیلے یا شہر کے "عریف" فوراً بات نیچے پہنچا کر یہ ضرورت پوری کردیتے۔ سرکاری اعلانات اسی طرح مشتہر ہوتے۔ کسی غریب ولاچار کو اپنی فریاد پہنچانا ہوتی تو وہ اپنے "عریف" کو کہہ دیتا۔ مسئلہ فوراً اوپر پہنچ جاتا اور اس کی شکایت دور کردی جاتی۔ سرکاری خزانے سے سالانہ وظائف بھی عرفاء کے ذریعے تقسیم ہوتے اور ہر شہری کو اپنا حصہ کسی بھاگ دوڑ کے بغیر گھر بیٹھے مل جاتا تھا۔ ②

⑮ عدلیہ:

عدلیہ کا شعبہ نہایت فعال اور بااختیار تھا۔ عوام کو فوری انصاف ملتا تھا، اکثر شہروں میں عامل کو قاضی کے اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے، ان میں سے زیادہ تر صحابہ کرام اور بعض تابعین تھے جو قرآن وسنت سے خوب واقف تھے۔

چونکہ ہر طرف امن وسکون کا دور دورہ تھا، لہٰذا عامل کے پاس اکادکا مقدمے ہی آیا کرتے تھے، جنہیں وہ بلاتاخیر نمٹا دیا کرتے تھے۔ بعض مقامات پر قاضی الگ سے مقرر کیے جاتے تھے، جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں حضرت کعب بن سور رحمہ اللہ کو یہ منصب دیا تھا۔ ③ فیصلے زبانی ہوتے تھے، ان کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا۔ ④ عام طور پر قاضی حضرات اپنے گھروں یا مساجد میں ہی مقدمہ سنتے اور فیصلہ دیتے تھے۔ عدالتوں کی الگ سے عمارتیں نہیں تھیں۔ ⑤ وجہ یہ تھی کہ مقدمات بہت کم آتے تھے اور عموماً فوری ساعت پر فیصلے ہوجاتے تھے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور میں مدینہ طیبہ کے قاضی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، دو سال میں ان کے پاس ایک مقدمہ بھی نہیں آیا۔ ⑥

حضرت سلمان بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے تو فارغ ہی بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے ایک دوست کا کہنا ہے: "میں چالیس دن تک روزانہ ان کے پاس جاتا رہا، کبھی کوئی مقدمہ ان کے ہاں نہیں آیا۔" ⑦

---

① عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۳۸، ۱۳۹

② تاریخ الطبری: ۳۸/۳، ۳۹

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۱۷۹

④ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۶۰ ⑤ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۵۹، ۱۶۰

⑥ تاریخ الطبری: ۳۲۶/۳ ⑦ الاستیعاب: ۲ص ۱۳۲؛ اسد الغابۃ، تر: سلمان بن ربیعۃ

قاضیوں کی تنخواہیں معقول تھیں تا کہ وہ رشوت لینے کی طرف مائل نہ ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح رحمہ اللہ کی ماہانہ تنخواہیں سو، سو درہم تھیں۔ (1)

(16) غیر مسلم شہریوں کے حقوق:

غیر مسلم شہریوں کو ذمی کہا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ کئے گئے معاہدوں کو پورا کیا جاتا تھا۔ از روئے شرع ان پر کچھ پابندیاں ضرور تھیں مثلاً وہ مسلمان عورت سے نکاح نہیں کر سکتے تھے، مسلمان کی وراثت میں حصہ دار نہیں بن سکتے تھے، انہیں اپنے عقائد کی تبلیغ کی اجازت نہ تھی۔ تاہم کسی ذمی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا جاتا تھا۔ ذمیوں کی عبادت گاہیں محفوظ تھیں، وہ اسلامی ریاست میں سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ مسلمانوں کے اچھے اخلاق اور عمدہ برتاؤ کے باعث ہر سال بے شمار ذمی اسلام کی طرف راغب ہو کر مسلمان ہو جاتے تھے۔

ذمی عبادات و رسومات کے علاوہ خرید و فروخت، زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت میں آزاد تھے۔ حکومت کی مہیا کردہ سہولیات کے بدلے ان پر فقط ایک معمولی ٹیکس لاگو ہوتا تھا جسے جزیہ کہا جاتا تھا۔ اس کی شرح نہایت معمولی تھی یعنی مالداروں پر اڑتالیس درہم، متوسط طبقے کے افراد پر چوبیس درہم اور غریبوں پر بارہ درہم سالانہ۔ (وقت کے لحاظ سے اس میں کمی بیشی ہو جاتی تھی) غیر مسلموں پر اس کے سوا کسی قسم کا کوئی ٹیکس نہیں تھا اور یہ بھی سال میں صرف ایک بار ادا کرنا پڑتا تھا۔ جو غیر مسلم تنگ دست ہو، اسے جزیہ معاف کر دیا جاتا تھا۔ ان رعایتوں کے باجود خلفائے اسلام کو غیر مسلم شہریوں کا اتنا خیال تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وفات سے قبل بڑے اہتمام سے یہ وصیت کی تھی:

"ذمیوں سے اچھا سلوک برقرار رکھا جائے، ان سے کیے گئے معاہدوں کی پابندی کی جائے، انہیں تحفظ فراہم کیا جائے اور ان کی سکت سے زیادہ ٹیکس نہ لگایا جائے۔" (2)

(17) ذاتی زندگی میں بے جا مداخلت سے اجتناب:

اگرچہ قانون اپنی جگہ بے لچک تھا اور زیر سماعت مقدمات میں کسی کی بے جا رعایت نہیں کی جاتی تھی مگر حکومت عوام کی نجی زندگی میں از خود مداخلت کر کے ان کے عیوب، خفیہ گناہوں اور قانونی خلاف ورزیوں کا کھوج لگانے کی قائل نہیں تھی، بلکہ خلفاء کی طرف سے عاملوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ کسی کے پوشیدہ گناہ کا پتا چل جائے تو اسے چھپایا جائے اور کوشش کی جائے کہ گناہ گار نادم ہو کر توبہ کر لے۔ معاشرے میں اس گناہ کے ارتکاب کا شور و شغب نہ پھیلے۔ (3)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے پوری اسلامی ریاست میں عاملوں کو یہ ہدایت کی گئی تھی:

---

(1) عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۷۳

سو درہم کی مالیت آج کل کے حساب سے 270 ڈالر سے زائد بنتی ہے۔ اگر اس دور میں اجناس کی ارزانی اور تمدن کی سادگی کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ایک خطیر رقم تھی جو ایک کنبے کو فارغ البال رکھنے کے لیے بہت کافی تھی۔

(2) عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۸۵ تا ۱۹۰

(3) کتاب الام للامام الشافعی: ۶/ ۱۳۹، ط المعرفۃ

”لوگوں کو وہ گناہ افشاء کرنے کا مت کہو جن پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ہاں جب لوگ کوئی معاملہ عدالت میں لے آئیں تو پھر حکومت کو کسی لچک کے بغیر سزا کے قانون پر عملدرآمد کرنا چاہیے۔“ ①

⑱ ذرائع آمدن:

رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے حکومت کی آمدن کے ذرائع زکوٰۃ، عشر، جزیہ، خراج اور مالِ غنیمت تھے۔ زکوٰۃ مسلمانوں کے مخصوص اموال مثلاً سونے، چاندی، سامانِ تجارت وغیرہ پر عائد ہوتی تھی۔ اس کی شرح اڑھائی فیصد تھی۔ عشر بھی مسلمانوں پر فرض تھا جو زرعی و معدنی پیداوار سے لیا جاتا تھا، اس کی شرح پانچ سے بیس فیصد تک ہوا کرتی تھی۔ جزیہ اور خراج غیر مسلمانوں پر عائد ہوتے تھے۔ خراج زرعی پیداوار کا لگان تھا جس کی شرح کسی علاقے کی فتح کے وقت مقامی عمائد سے مل کر مقرر کی جاتی تھی جیسا کہ آذربائیجان کے غیر مسلم سالانہ ۸۰ لاکھ درہم خراج دیا کرتے تھے۔

دشمن پر بزورِ شمشیر فتح حاصل کرنے کے دوران جو مال و اسباب ہاتھ آتا، اسے ”غنائم“ یا ”مالِ غنیمت“ کہا جاتا تھا۔ اس کا اسّی (۸۰) فیصد فوج پر تقسیم کیا جاتا اور بیس فیصد (پانچواں حصہ) بیت المال میں جمع کرایا جاتا تھا۔ ②

⑲ زرعی ترقی۔ مالی خوشحالی:

آمدن کے ان محدود ذرائع کے باوجود اسلامی حکومت مالی طور پر بہت مستحکم تھی۔ زرعی علاقوں میں نئی نہریں کھود کر دور دور تک زمینیں سرسبز و شاداب کر دی گئی تھیں۔ بصرہ کے شہریوں کو میٹھے پانی کی فراہمی کے لیے دریائے دجلہ سے نو میل (ساڑھے ۱۴ کلومیٹر) لمبی نہر کھود کر شہر تک لائی گئی تھی۔ ③

کبھی ایک صوبے میں قحط پڑتا تو دوسرے صوبے کی فاضل پیداوار وہاں بھیجنے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں قحط کے دور میں خلیج ایلہ سے بحیرۂ احمر میں کشتیاں روانہ کی تھیں جو غذائی ذخائر مدینہ کی قریبی بندرگاہ تک لے گئی تھیں۔ ④

زمین دار اور کسان محنت کا پورا پھل پاتے تھے اس لیے پوری جانفشانی سے کھیتی باڑی کرتے تھے۔ بارشیں اکثر وقت پر ہوتی تھیں۔ محصولات کے افسران نہایت دیانت دار تھے، اس لیے رقم میں خرد برد نہیں ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر سال بیت المال میں کروڑوں درہم جمع ہو جاتے تھے۔ ⑤

⑳ بیت المال کے مصارف:

سرکاری خزانے میں جمع شدہ اموال کو پوری احتیاط سے ان کے مصارف پر خرچ کیا جاتا تھا۔ زکوٰۃ کی رقم غریبوں، فقیروں، یتیموں، بیواؤں، مسافروں، طلبہ اور مجاہدین میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ دیگر اموال کو ملک کے دفاع، رعایا کی

---

① مصنف عبدالرزاق، ح: ۹۳۷۱، ط المجلس العلمی پاکستان

② عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۱۸۵ تا ۱۹۰ ③ فتوح البلدان، ص ۳۴۷، ط الھلال

④ تاریخ المدینۃ ابن شبۃ: ۷۴۵/۲ ⑤ فتوح البلدان، ص ۲۶۶، ط الھلال

ضروریات اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں خرچ کیا جاتا تھا۔ رفاہِ عامہ: یعنی سڑکوں، پلوں، نہروں، مساجد، مدارس، مسافر خانوں اور نئے شہروں کی تعمیر پر بھی سالانہ خطیر رقم صرف کی جاتی۔ ①

خلفائے راشدین سرکاری سامان اور بیت المال کی رقوم کو صحیح مصرف میں خرچ کرنے اور اسے ضائع نہ ہونے دینے کا سخت اہتمام کرتے تھے۔ اپنے لیے طے شدہ معمولی وظیفے کے سوا کچھ لینے سے شدید احتراز کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ کے ذاتی مال میں کوئی دینار تھا نہ کوئی درہم۔ ایک خادم اور ایک اونٹنی کے سوا کوئی سرکاری چیز بھی آپ کے استعمال میں نہیں تھی۔ ان دو چیزوں کے بارے میں بھی وصیت فرما گئے تھے کہ فوراً اگلے خلیفہ کے حوالے کر دی جائیں۔ ②

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عموماً صحابہ کرام میں بیت المال سے عمدہ کپڑے تقسیم کرتے اور مہاجرین کو ترجیح دیتے مگر اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو پیچھے رکھتے اور انہیں معمولی کپڑے کے قابل شمار کرتے۔ ③ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''اگر فرات کے کنارے ایک اونٹ بھی ضایع ہوا تو ڈر ہے کہ اللہ کے ہاں مجھ سے باز پرس ہوگی۔'' ④

(۲۱) حرمین شریفین اور مساجد کی تعمیر و توسیع:

خلفائے راشدین کو مقاماتِ مقدسہ: حرمین شریفین اور قبلہ اوّل کی خدمت اور نگہبانی کا ہمیشہ خیال رہا۔ مسجدِ نبوی اس سے پہلے مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ چھت کھجور کی چھال کی تھی۔ ستون کھجور کے تنوں کے تھے۔ ⑤

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی پر کھجور کی ٹہنیوں کی نئی چھت تعمیر کرائی۔ ⑥ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسجد کے رقبے میں اضافے کے لیے حضرت عباس بن عبدالمُطّلِب رضی اللہ عنہ کا مکان اس میں شامل کر دیا۔ ⑦ کچی اینٹوں سے نئی دیواریں چنائیں، مسجد حرام میں بھی تعمیری کام کرایا، مقامِ ابراہیمی بیت اللہ سے ملا ہوا تھا جس سے طواف کرنے والوں کو مشکل پیش آتی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے ہٹا کر دور کر دیا اور اس کے گرد کٹہرا نصب کرایا۔ ⑧

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مسجد الحرام میں غیر معمولی توسیع ہوئی۔ مسجد نبوی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی توسیع اور مرمت کے باوجود مسجد کی ہیئت وہی قدیم تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد کو بہتر انداز میں از سرِ نو تعمیر کرایا۔ چونے اور پتھر کی مضبوط دیواریں بنوائیں جن پر نقاشی اور مینا کاری کرائی گئی۔ ساگوان کی پائیدار چھت ڈالی گئی۔ رقبے میں اضافہ کیا گیا۔ یہ کام ربیع الآخر ۲۹ھ سے محرم ۳۰ھ کے دوران دس ماہ میں مکمل ہوا جس کے بعد مسجد کا طول ۲۴۰ فٹ

---

① تاریخ الطبری: ۲۵۶/۳؛ فتوح البلدان، ص ۲۶۹، ۲۷۲، ۳۴۷ تا ۳۷۵، ۳۵۰، ط الھلال

② طبقات ابن سعد: ۱۹۶/۳ ط صادر ③ الاموال لابن زنجویہ: ۵۵۱/۲، ط مرکز الملک فیصل

④ ''لو مات جمل ضیاعا علی شط الفرات لخشیت ان یسئلنی اللہ عنہ۔'' (تاریخ الطبری: ۵۶۶/۲؛ طبقات ابن سعد: ۳۰۵/۳)

⑤ صحیح البخاری، ح: ۴۴۶، کتاب الصلوۃ، باب بنیان المسجد ⑥ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۳۰۷، ۳۹۶

⑦ سنن ابی داؤد، ح: ۴۵۱، کتاب الصلوۃ، باب فی بناء المساجد ⑧ طبقات ابن سعد: ۲۱/۳، ۲۲، ط صادر

⑨ تاریخ الطبری: ۲۵۱/۳ ⑩ صحیح البخاری، ح: ۴۴۶، کتاب الصلوۃ، باب بنیان المسجد

اور عرض ۲۲۵ فٹ ہوگیا۔ جنوب کی سمت محرابِ نبوی سے آگے نئی محراب تعمیر کرائی گئی جو آج تک قائم ہے۔ ①

مساجد کی تعمیر و توسیع کے ساتھ ان کو اعمالِ صالحہ سے آباد کرنے کا پورا اہتمام کیا جاتا تھا۔ حرمین شریفین اور کوفہ، بصرہ اور فسطاطِ مصر کی نو تعمیر کردہ وسیع و عریض جامع مساجد نہ صرف نمازیوں سے بھری رہتی تھیں بلکہ وہ ذکر و عبادت، علم و معرفت، وعظ و تذکیر اور مسلمانوں کے باہمی میل ملاپ کے مراکز کی حیثیت رکھتی تھیں۔ عدالتی فیصلے اور سرکاری احکام بھی یہیں سنائے جاتے تھے۔ ②

㉔ نوجوانوں کی صلاحیتوں کی آزمائش:

کلیدی عہدے اکابر صحابہ کے پاس ہوتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نئے خون کو بھی آزمایا جاتا اور نوجوانوں کو صلاحیتوں کے اظہار کا موقع فراہم کیا جاتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا عامل بنایا اور مصر میں عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے اختیارات میں اضافہ کر کے انہیں پورے صوبے کا حاکم بنا دیا۔ ان نوجوانوں نے فتوحاتِ اسلامیہ کا دائرہ دور دور تک پھیلا دیا۔ ③

❁❁❁

خلافتِ راشدہ میں علمی سرگرمیاں

خیر و برکت کے اس زمانے میں تعلیمی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ بلند مرتبہ اس کو ملتا تھا جو علم میں ممتاز ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت لگ بھگ پندرہ برس کے تھے۔ قرآن و سنت کا زیادہ علم حاصل نہیں کر سکے تھے، مگر علمی ولولے کا یہ حال تھا کہ صحابہ کرام میں سے ایک ایک کے پاس جا کر احادیث یاد کرتے۔ چند برسوں میں وہ تفسیر، حدیث اور فقہ کے بڑے عالموں میں شمار ہونے لگے اور ان کے گرد علم کے پیاسوں کا جھرمٹ لگ گیا ④ اور اسی وجہ سے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ میں اکابر صحابہ کرام کی صف میں شامل کیے گئے، جبکہ ان کی عمر بیس، بائیس سال تھی۔ ⑤ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کو لڑکپن میں تعلیم کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: ''سردار بننے سے پہلے علم حاصل کرو۔'' ⑥

مطلب یہ تھا کہ علم حاصل کرو گے تو کچھ بن پاؤ گے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ عملی زندگی میں قدم رکھنے اور اہم ذمہ داریاں سنبھالنے سے پہلے علم حاصل کر لو، ورنہ بعد میں فرصت نکالنا مشکل ہوگا۔

---

① تاریخ مکۃ المشرفۃ والمسجد الحرام والمدینۃ الشریفۃ لابن ضیاء المکی، ص ۲۸۱

② عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۲۹۹، ۳۰۰

③ ان فتوحات کی تفصیلات دورِ فاروقی اور دورِ عثمانی کے ذیل میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

④ مستدرک حاکم، ح: ۶۲۹۳

⑤ اسد الغابۃ، الاستیعاب، تر: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ⑥ مصنف ابن ابی شیبۃ، ح: ۲۶۱۱۶، ط الرشد

علمی سرگرمیوں کے مختلف شعبوں اور متنوع پہلوؤں کا مختصر جائزہ یہ ہے:

① قرآنِ مجید کی حفاظت:

علمی میدان میں سب سے زیادہ توجہ قرآنِ مجید کے الفاظ کو محفوظ رکھنے، اس کی صحیح تلاوت کرنے اور اس کے معانی کو سمجھنے پر تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی: ''خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ۔'' سب کے پیشِ نظر تھا۔ ①

یمامہ کی جنگ میں قاری صحابہ کی خاصی تعداد کے شہید ہو جانے کے بعد خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں حفاظ کے چلے جانے سے قرآن کی حفاظت میں کوئی رخنہ نہ آجائے کیوں کہ اس وقت تک دار و مدار حفظِ قرآن پر تھا اور مکمل مصاحف موجود نہ تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قراء و حفاظ کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر قرآنِ مجید کی ایک ایک آیت کو پوری احتیاط کے ساتھ جمع کیا اور ایک تصدیق شدہ مجموعہ تیار کر دیا۔ ②

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں آذربائیجان کے محاذ پر جہاد کرنے والے اسلامی سالار حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے مدینہ آکر انہیں بتایا کہ لوگ قرآنِ کریم کی تلاوت کے بارے میں اختلافات کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایک آیت کو کوئی ایک طرح پڑھتا ہے، کوئی دوسری طرح۔ وجہ یہ تھی کہ اسلام دور دور تک پھیل گیا تھا اور مختلف قوموں کے لوگ اپنے اپنے رسم الخط میں قرآنِ مجید کو نقل کر رہے تھے اور پھر مختلف طریقوں سے اسے پڑھنے لگے تھے۔ اس لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں تورات، انجیل کی طرح قرآن بھی کئی قسموں کا نہ بن جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس خدشے کے پیشِ نظر قرآنِ مجید کی کتابت اور اشاعت کا کام سرکاری تحویل میں لے لیا۔ یہ کام دوبارہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں مرتب کردہ مصدقہ مجموعے کو سامنے رکھا۔ اس نسخے کے ایک ایک لفظ کو دوبارہ جانچا اور صحت کی تصدیق کے بعد، پوری احتیاط سے اس کی کئی نقول تیار کیں جنہیں عالمِ اسلام کے تمام صوبائی مراکز میں بھیج دیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے غیر سرکاری طور پر لکھے گئے قرآنی نسخے تلف کر دیے گئے، کیوں کہ ان کی صحت توثیق شدہ نہ تھی۔ سرکاری نسخے کو ''مصحفِ عثمانی'' اور اس کے اندازِ کتابت کو ''رسمِ عثمانی'' کہا جاتا ہے اور آج تک اُمتِ مسلمہ اسی سے مستفید ہو رہی ہے۔ ③

خلفائے راشدین نے قرآن مجید کی تعلیم عام کرنے پر خاص توجہ دی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جانب سے دیہات میں قرآنِ کریم کی خواندگی کا جائزہ لینے کے لیے نگران مقرر کیے گئے تھے۔ ④ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بَصرَہ میں اتنے شاگرد تیار کیے کہ وہاں قاری حضرات کا ایک مستقل طبقہ پیدا ہو گیا۔ ⑤ کوفہ کی علمی رونقیں سب سے

---

① صحیح البخاری، ح:۵۰۲۷، کتاب فضائل القرآن ② صحیح البخاری، ح:۴۹۸۶، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن

③ صحیح البخاری، ح:۴۹۸۷، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن؛ فتح الباری: ۹/۱۷ تا ۲۱، ط دار المعرفة

اس وقت نقطے اور زبر، زیر وغیرہ نہ تھے، لوگ ان کے بغیر بلاتکلف عربی عبارت پڑھ لیتے تھے، بعد میں نومسلم عجمیوں کو حروف شناسی میں دشواری ہونے لگی تو بنواُمیہ کے دور میں نقطوں اور بنوعباس کے زمانے میں اعراب لگانے کا رواج شروع ہوا۔ (تطور کتابة المصحف الشریف لسالم بن شدید: ص ۵ تا ۱۰) ④ الاصابہ: ۱/۲۹۸، ترجمة: أوس بن خالد۔ ط العلمیة ⑤ عصر الخلافة الراشدة، ص ۲۹۶، ۲۹۷

بڑھ کر تھیں جہاں بیعتِ رضوان سے مشرف تین سو اور غزوۂ بدر میں شامل ستر صحابہ کرام آباد تھے۔ ①

صحابہ کرام کے اس زریں دور میں قرآنِ مجید پڑھانے اور یاد کرانے والوں میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت مُعاذ بن جبل، حضرت اُبی بن کعب اور حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہم سب سے فائق تھے، کیوں کہ ان چاروں کے بارے میں خود حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ان سے قرآن مجید سیکھا جائے۔ ② حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی قرآن کے نامور معلم تھے۔ ③ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پختہ حافظ تھے، روزانہ ایک ختم کرتے تھے۔ ④ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قراءت اور حفظ میں مہارت مشہور ہے۔ ⑤ صفِ اوّل کے ان قراء نے حضور اکرم ﷺ سے قرآن سیکھا تھا۔ حضرت ابو الدرداء، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہم بھی بہترین قاریوں میں سے تھے۔ ⑥

تابعین بھی حافظ وقاری بن کر آگے اس علم کو پھیلاتے رہے۔ ان میں مُغیرہ بن ابی شہاب، اسود بن یزید، علقمہ بن قیس، ابو عبدالرحمن السلمی، عبداللہ بن عیاش، ابو رجاء البصری، ابو الاسود الدؤلی، حسن بصری، عیسیٰ بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، مجاہد بن جبر، یحییٰ بن یعمر اور سعید بن جُبیر رحمہم اللہ بہت نمایاں تھے۔ ⑦

قرآن مجید کے الفاظ کے ساتھ اس کے احکام اور آیات کی تفسیر بھی سکھائی جاتی تھی۔ کسی آیت کی وہ تفسیر معتبر مانی جاتی تھی جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ ایک آیت کے الفاظ سکھاتے اور پھر دیر تک اس کی تفسیر سمجھاتے۔ حضرت عبداللہ عباس رضی اللہ عنہ اُمتِ مُسلمہ کے سب سے بڑے مفسرِ قرآن کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے، مگر تفسیر میں اپنی رائے اور خیال کو دخل دینے سے احتراز کیا جاتا تھا۔ کوشش یہی کی جاتی تھی کہ اگر تفسیر کے متعلق کوئی حدیث معلوم ہو تو بیان کردی جائے ورنہ خاموشی اختیار کی جائے۔ ⑧

④ سنت کی حفاظت کی کوشش:

سنت کے متن یعنی حدیث کے الفاظ کو یاد کرنے کا ولولہ بھی بہت عام تھا۔ حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں حدیثوں کو لکھنے کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی تھی کہ کہیں قرآنِ مجید کے اوراق، احادیث کے اوراق میں نہ مل جائیں مگر اب یہ خدشہ نہیں تھا۔ قرآنِ کریم کے مکمل نسخے مرتب ہو چکے تھے، اس لیے صحابہ کرام اور تابعین میں احادیث لکھنے کا سلسلہ بھی عام ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ لکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ اُن کا نوشتہ "صحیفہ صادقہ"

---

① طبقات ابن سعد: ۹/۶ ط صادر
② صحیح البخاری، ح: ۳۷۵۸، کتاب المناقب، باب مناقب سالم رضی اللہ عنہ
③ صحیح البخاری، ح: ۳۸۱۰، کتاب المناقب، باب مناقب زید بن ثابت رضی اللہ عنہ
④ المعجم الکبیر للطبرانی: ۸۷/۱، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ
⑤ معرفۃ القراء الکبار للذھبی: ص ۱۳، ط العلمیۃ
⑥ معرفۃ القراء الکبار للذھبی، ص ۱۱، ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۴
⑦ معرفۃ القراء الکبار للذھبی، ص ۲۵ تا ۳۰ ⑧ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۳۰۷

کے نام سے مشہور تھا۔ اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ، حضرت سمرہ بن جندب، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہم کی لکھے ہوئے مسوداتِ حدیث سے لوگوں نے بہت استفادہ کیا۔ ①

حدیث سیکھنے کے لیے خود صحابہ دور دراز کے اسفار کرتے تھے۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ ایک حدیث کے لیے شام اور ایک کے لیے مصر تک گئے۔ ②

مساجد میں مجالسِ حدیث عام تھیں۔ مسجد نبوی میں حضرت ابوہریرہ، عبداللہ بن عمر اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کے حلقے مشہور تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے حجرے سے پردے میں احادیث بیان فرماتی تھیں۔ کوفہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ، بصرہ میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ، مصر میں عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اور شام میں ابودرداء رضی اللہ عنہ کے حلقے مرجعِ خلائق تھے۔ ③

④ فقہ پر توجہ:

دین اسلام میں علم کے تصور کی بلندی اور خلفاء کی طرف سے اس کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی نے کچھ ہی برسوں میں علم کو مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا ایسا لازمی عنصر بنادیا تھا کہ ہر مسلمان علم کا متوالا نظر آتا تھا۔ اسلام سے پہلے عربوں کا علم چند مذہبی قصوں اور شعر وشاعری تک محدود تھا، اسلام نے قرآن وسنت کی روشنی بخشی تو زندگی کو ایک نیا معنی ملا۔ انسان ہر کام یہ سوچ کر کرنے لگا کہ اس سے اللہ راضی ہوگا یا ناراض۔ ہر معاملے کو جائز یا ناجائز کے پہلو سے دیکھا جانے لگا۔ بہت سے معاملات کے بارے میں قرآن وسنت میں واضح فیصلے موجود تھے۔ چوری، ڈاکا، بدکاری، شراب نوشی اور ناحق تہمت کا حرام ہونا واضح تھا، ان کی شرعی سزائیں بھی طے تھیں جو "حدود" کہلاتی تھیں۔ بعض جرائم سنگین تھے مگر ان کی سزا طے کرنے کا حکام کو اختیار دیا گیا تھا، جیسے ہم جنس پرستی، جادو ٹونا، نماز ترک کرنا وغیرہ۔ ان کی سزائیں "تعزیرات" کہلاتی تھیں۔ بعض گناہ بہت سخت تھے مگر ان پر سزا دینا حکومت کے ذمے نہیں تھا۔ جیسے جھوٹ، بدنظری، حسد، چغلی وغیرہ۔ قرآن وسنت سے واقف حضرات، عوام کو اُن کی خرابیوں سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

بعض مسائل کی نوعیت نئی ہوتی تھی، زمانے کی تبدیلی، احوال کے تغیر، وسائل اور رہن سہن کے معیارات کی ترقی ایسے نئے واقعات کو جنم دے رہی تھی جن کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی واضح فیصلہ نہیں تھا۔ لوگ ان مسائل کے بارے میں شرعی حکم دریافت کرتے تھے۔ اب جن کو قرآن وسنت کا علم نصیب ہوا تھا وہ آیات واحادیث کے الفاظ میں سوچ بچار کرنے لگے کہ ان سے نت نئے پیش آمدہ مسئلے کا حل کس طرح نکلے گا۔ یہ لوگ فقہاء کہلائے۔ ان میں سے جدید مسائل میں رہنمائی کرنے والے جنہیں اہل فتویٰ کہا جاتا ہے، تیس سے زائد تھے جن میں حضرت ابوبکر صدیق،

---

① عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۳۰۳ تا ۳۰۹

② الرحلۃ فی طلب الحدیث للخطیب البغدادی، ح: ۳۱، ۳۲، ط العلمیۃ

③ عصر الخلافۃ الراشدۃ، ص ۲۷۸؛ منہاج المحدثین فی القرن الاوّل الہجری وحتیٰ عصرنا الحاضر، علی عبدالباسط مزید، ص ۸۷؛ الانوار الکاشفۃ لما فی کتاب "اضواء علی السنۃ" من الزلل والتضلیل والمجازفۃ، عبدالرحمن الیمانی، ص ۳۶
نیز الاصابہ، الاستیعاب اور اسد الغابہ میں مذکورہ صحابہ کے احوال دیکھیے۔

حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوسعید خدری رضوان اللہ علیہم اجمعین زیادہ مشہور تھے۔ ①

④ اِفتاء:

فقہاءِ کرام میں اہلِ فتویٰ کا ایک مستقل طبقہ موجود تھا جن سے لوگ مسائل پوچھا کرتے تھے، ان میں اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ، عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت مُعاذ بن جبل، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہم سب سے نمایاں تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم فقہاء اور اہلِ فتویٰ میں سب سے بلند پایہ تھے۔ ②

دورِ خلافتِ راشدہ میں بعض تابعین بھی نہایت ماہر فقیہ، مفتی اور قاضی تھے۔ ان میں حضرت کعب بن سور اور حضرت شریح رحمہما اللہ بہت مشہور ہوئے۔ کعب بن سور رحمہ اللہ بصرہ اور شریح رحمہ اللہ کوفہ کے قاضی تھے۔ ③

⑤ شعروادب، تاریخ، زبان دانی:

خالص عربی زبان سیکھنے سکھانے اور اس کی لغات یاد رکھنے کے لیے عرب شعراء کے کلام کو بھی سنا اور سنایا جاتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تاکید کرتے تھے کہ عرب شاعری کو اوراق میں محفوظ رکھا جائے، کیوں کہ قرآن وسنت کی نصوص کو سمجھنے میں عربی لغت کی اہمیت ثابت ہے۔ مسلمانوں میں تاریخ کا ذوق بھی پیدا ہو گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور خصوصاً جہادی مہمات کے احوال اس طرح یاد کیے جاتے تھے جیسے قرآن وحدیث۔ غیر ملکی زبانیں سیکھنے کی اہمیت بھی محسوس کی گئی تھی۔ حضرت زید بن ثابت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عبرانی، سُریانی، حبشی اور قبطی زبانیں سیکھ لی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی اہلِ کتاب کی زبانیں جانتے تھے۔ حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ فارسی زبان جانتے تھے۔ ④

⑥ طب وحکمت اور کیمیا:

یونانی اور فارسی اَطباء کے تلامذہ قدیم دور سے عرب میں طبی خدمات انجام دیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں طائف کے طبیب حارث بن کلدہ (حضرت ابوبکرۃ ثقفی رضی اللہ عنہ کے والد) کا بڑا شہرہ تھا۔ ⑤

❀❀❀

① عصر الخلافة الراشدة، ص ۳۱۲ ② اعلام الموقعین من رب العالمین، لابن قیم الجوزیة: ۱/ ۱۰ تا ۱۲، ط دار الکتب العلمیة

③ طبقات ابن سعد، تراجم: کعب بن سور، شریح بن الحارث ④ عصر الخلافة الراشدة، ص ۳۱۲ تا ۳۲۱

⑤ الاصابہ: ۱ ص ۶۸۸

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ خلافتِ راشدہ میں قرآن مجید کی حفاظت کے لیے کی جانے والی مساعی پر روشنی ڈالیے؟
❷ دورِ خلفائے راشدین میں حکومت کے ذرائعِ آمدن کیا تھے؟
❸ خلافتِ راشدہ میں غیر مسلم شہریوں کے حقوق کی نگہداشت پر ایک نوٹ لکھیے۔
❹ حرمین شریفین کی توسیع میں کن کن خلفائے راشدین کا اہم کردار رہا۔ مختصراً ان کی کوششوں کا ذکر کیجیے۔
❺ کیا دورِ خلافتِ راشدہ میں شعروادب، تاریخ اور غیر ملکی زبانیں سیکھنے میں دلچسپی لی جاتی تھی۔ مثالوں سے بتائیے۔
❻ "نظام کفالت" سے کیا مراد ہے۔ اس کا آغاز کن خلیفۂ راشد کے دور میں ہوا؟
❼ خلفائے راشدین کے عاملین (نائبین، اُمراء) کی کیا ذمہ داریاں تھیں؟
❽ خلافتِ راشدہ میں سنت کی حفاظت واشاعت کے لیے کیا کوششیں کی گئیں؟

عملی کام:

❁ ایک چارٹ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کے اہم عہدے داروں کے نام لکھیے۔

❁ دورِ خلافت راشدہ کے فقہاء اور اہلِ فتویٰ کے نام مع سنِ وفات خوش خط لکھ کر درسگاہ میں آویزاں کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ

❁ عصر الخلافۃ الراشدۃ، از الشیخ اکرم ضیاء العمری

❁❁❁

جدول

دورِ خلافتِ راشدہ

نمبر	حکمران	دور حکمرانی	خاص انقلاب
۱	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	۱۳ ربیع الاوّل ۱۱ھ تا..... ۲۲ جمادی الآخرۃ ۱۳ ہجری (۹ جون ۶۳۲ء......تا ...... ۴ ستمبر ۶۳۴ء)	اسلامی خلافت کا آغاز، منکرینِ ختم نبوت کی سرکوبی، قرآن مجید جمع کیا گیا، عراق اور شام میں جہاد کا آغاز،
۲	حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	۲۳ جمادی الآخرۃ ۱۳ھ تا......اواخرِ ذوالحجہ ۲۳ھ (۵ ستمبر ۶۳۴ء تا وسطِ نومبر ۶۴۴ء)	مشرق و مغرب میں فتوحات کا دور دورہ۔ انتظامی اصلاحات اور نئے شعبہ جات کا قیام
۳	حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	یکم محرم ۲۴ھ تا......۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ (۱۹ نومبر ۶۴۴ء تا ۲۹ جون ۶۵۶ء)	مزید فتوحات، بحری جنگوں میں کامیابیاں، ابن سبا کی تحریک اور دورِ فتنہ کا آغاز
۴	حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ	۱۹ ذوالحجہ ۳۵ھ تا ۲۱ رمضان ۴۰ھ مئی ۶۵۶ء تا جنوری ۶۶۱ء	دارالخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل، مشاجرات، فتنہ خوارج، اندرونی جنگوں کے احکام و آداب سکھائے گئے۔
دورِ تکملہ	حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ	۲۲ رمضان ۴۰ھ تا ۵ ربیع الاول ۴۱ھ ۱۰ فروری ۶۶۱ء تا ۲۰ جولائی ۶۶۱ء	اتحادِ اُمتِ مسلمہ کے لیے اقتدار کی عظیم قربانی، خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد

خلافتِ بنو اُمیہ و
خلافتِ زبیریہ

حصہ سوم

خلافتِ اُمویہ سفیانیہ

۴۱ھ تا ۶۴ھ (۶۶۱ء تا ۶۸۴ء) ۲۳ سال

خلافتِ زبیریہ

۶۴ھ تا ۷۳ھ (۶۸۴ء تا ۶۹۲ء) تقریباً ۹ سال

خلافتِ اُمویہ مروانیہ

۷۳ھ تا ۱۳۲ھ (۶۹۲ء تا ۷۴۹ء) ۵۹ سال

تبویب

پہلا باب: خلافتِ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ

دوسرا باب: عہدِ یزید

تیسرا باب: خلافتِ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

چوتھا باب: دولتِ بنو مروان

پانچواں باب: اُموی عہد میں تہذیب و تمدن اور معاشرہ

پہلا باب

خلافتِ حضرت

معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ

ربیع الاوّل ۴۱ھ تا رجب ۶۰ھ

(۶۶۱ء تا ۶۸۰ء)

تعارف:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تقریباً بیس سالہ دورِ حکومت اسلامی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں بہت سے علاقے فتح ہوئے، اسلام مزید پھیلا، کئی جدید حکومتی شعبے وجود میں آئے اور کئی قدیم شعبوں میں ترقی ہوئی۔ عمومی طور پر یہ دور امن وامان، خوشحالی اور فتوحات کا تھا۔

اہداف ومقاصد:

اس باب کو پڑھ کر ان شاء اللہ آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1. حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب سے آگاہ ہو سکیں۔
2. ان کے دورِ خلافت کے کارناموں سے واقف ہو سکیں۔
3. ان پر کیے جانے والے بعض مشہور اعتراضات کے جوابات دے سکیں۔
4. یزید کی ولی عہدی سے متعلق بحث کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سمجھ سکیں۔

وسطِ ایشیا کا دروازہ آمو دریا: جسے اسلامی لشکر نے سب سے پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عبور کیا۔

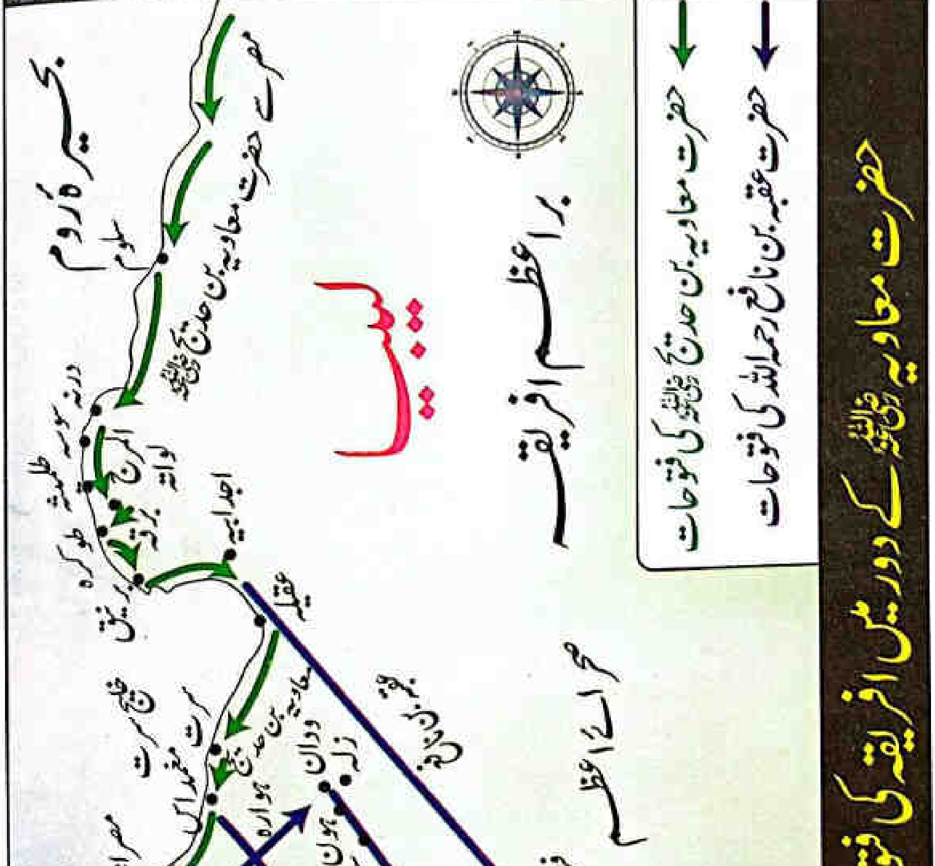




حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں خراسان اور وسط ایشیا کے معرکے



برقہ الرومی کے کھنڈر، جسے مسلمانوں نے سنہ 22 ہجری بمطابق 643 عیسوی میں فتح کیا۔



(یونٹ:1.16)

خاندانِ بنواُمیہ کا تعارف

قبیلۂ قریش آلِ اسماعیل کے ایک فرد نضر بن کنانہ کی اولاد سے تھا۔ پھر قریش کی کئی شاخیں بن گئیں۔ مشہور یہ تھیں:

(1) بنو ھاشم (2) بنوالمطّلب (3) بنواُمیہ (4) بنو عَدِی (5) بنوتَیم (6) بنو زُھرہ (7) بنو مَخزُوم
(8) بنو سَھْم (9) بنو اَسد (10) بنو نَوْفَل (11) بنو لُؤَیّ (12) بنو عامر (13) بنوجُمَح (14) بنو عَبْدُ الدّار [1]

ان شاخوں میں بنو ہاشم اور بنواُمیہ اپنی قابلیت اور کارناموں کے باعث سب سے ممتاز تھے۔ "بنوہاشم" ہاشم بن عبدِ مناف کی اولاد تھے۔ انہیں آبِ زم زم پلانے اور حاجیوں کی خدمت کے حوالے سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ "بنواُمیہ" اُمَیّہ بن عبدِ شمس بن عبدِ مناف کی اولاد میں سے تھے۔ وہ افرادی قوت، مال و دولت اور جنگی مہارت کے اعتبار سے نامور تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو بنواُمیہ آپ کی مخالفت میں پیش پیش رہے اور ہجرتِ مدینہ کے بعد جب قریش سے جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اکثر مواقع پر قریش کی قیادت اُموی رؤساء کرتے رہے۔ تاہم صلح حدیبیہ کے بعد اس مخالفت کا زور ٹوٹنے لگا۔

فتح مکہ کے بعد قریش کی دیگر شاخوں کے ساتھ بنواُمیہ بھی مشرف بہ اسلام ہوگئے، اسلام نے قدیم عداوت کے جذبات کو مٹا دیا اور بنواُمیہ بھی اسلام کے سپاہی بن گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دلجوئی کے لیے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے اُموی حضرات کو نمایاں عہدے اور اعزازات دیے۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی سفارش پر ان کے صاحبزادے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنا کاتب بنالیا۔ جبکہ ان کی صاحبزادی اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا بہت پہلے اسلام قبول کرچکی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دُہرے داماد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ بھی اُموی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حیاتِ مبارکہ کے آخری سالوں میں ایک اُموی گھرانے کے تین بھائی: خالد بن سعید بن العاص، عمرو بن سعید بن العاص اور ابان بن سعید بن العاص رضوان اللہ علیہم اجمعین مختلف علاقوں کے اُمیر تھے۔ مکہ کے امیر عتاب بن اَسید رضی اللہ عنہ بھی اُموی تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو یہ چاروں اُموی اُمراء اپنے عہدوں پر تھے: خالد بن سعید یمن میں [2]، عمرو بن سعید خیبر میں [3]، ابان بن سعید بحرین میں [4] اور عتاب بن اَسید مکہ میں [5] رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

ان میں سے اوّل الذکر تینوں بھائی (اولادِ عاص) جنگِ اجنادین میں شہید ہوگئے [6] جب کہ عتاب بن اَسید رضی اللہ عنہ

---

(1) نہایۃ الارب فی معرفۃ انساب العرب، لابی العباس القلقشندی: ص ۳۹۸، ط دار الکتاب بیروت
(2) الاستیعاب: ۲ص ۴۲۰ تا ۴۲۲؛ تاریخ الطبری: ۳ص ۳۱۸
(3) معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم: ۴ص ۱۹۷۹؛ الاستیعاب: ۳ص ۱۱۷۸، ۱۱۷۷؛ المحبر: ص ۱۲۶
(4) تاریخ الاسلام للذھبی: ۲ص ۵۳، ۵۴، ت بشار (5) تاریخ الطبری: ۳ص ۳۱۸
(6) تاریخ الاسلام للذھبی: ۲ص ۵۴، ۵۵، ۵۸، تراجم: ابان بن سعید، خالد بن سعید، عمرو بن سعید، ت بشار

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن یا اس سے ذرا پہلے فوت ہو گئے۔[1]

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسند نشین ہوئے تو اُموی اُمراء میں سے کوئی بھی باقی نہیں تھا۔ لہٰذا اُنہوں نے ایک اُموی اُمیر کا اضافہ کیا یعنی شام کی فتوحات کے بعد یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو دمشق کا اُمیر مقرر کر دیا۔[2]

۱۸ھ میں یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ طاعون سے وفات پانے لگے تو اپنے چھوٹے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اس عہدے پر باقی رکھا اور کچھ عرصے بعد پورے شام کا امیر بنا دیا۔[3]

تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی اُموی تھے۔ جب وہ خلیفہ بنے تو گزشتہ دور کے اُموی اُمراء میں سے فقط حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ باقی تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں ان کے عہدے پر برقرار رکھا۔ ۲۵ھ میں ایک اور اُموی صحابی ولید بن عُقبہ رضی اللہ عنہ کو حاکم کوفہ مقرر کیا۔[4] ۲۹ھ میں انہیں برطرف کر دیا اور ان کی جگہ ایک اور اُموی صحابی حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کا تقرر کیا۔[5] ۳۴ھ میں بعض شرپسندوں کے احتجاج پر انہیں معزول کر دیا۔[6]

یوں آخر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اُمراء میں فقط ایک اُموی اُمیر باقی رہ گئے یعنی حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ۔

صوبوں کی اِمارت کے علاوہ بھی بنواُمیہ کے کئی اَفراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مختلف اہم خدمات پر مامور رہے۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نجران سے صدقات وصول کرنے کی ذمہ داری انجام دی۔[7] سعید بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کچھ دن مکہ کے بازار کے نگران رہے۔[8] ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نجران سے صدقات وصول کرنے کی خدمت انجام دی۔[9] پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں وہ بنوتغلب سے صدقات وصول کرنے کے ذمہ دار بنے۔[10] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کاتب مروان بن الحکم کا تعلق بھی بنواُمیہ سے تھا۔ الغرض بنواُمیہ کے متعدد اَفراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اور اس کے بعد دورِ خلافتِ راشدہ میں اہم عہدوں پر رہے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بنواُمیہ نے قصاصِ عثمان کی تحریک چلا کر ایک متبادل قوت کی حیثیت حاصل کر لی اور باہم جنگیں بھی ہوئیں جن میں کوئی فریق دوسرے کو پوری طرح مغلوب نہ کر سکا۔ اس طرح عالم اسلام عملاً دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس کش مکش کی انتہاء حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دست برداری اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکمرانی پر ہوئی۔

❁❁❁

---

① تاریخ الاسلام للذھبی: ۲ص ۵۷، ت بشار ② تاریخ الاسلام للذھبی: ۳ص ۱۸۰، ت بشار
③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۵۵ ④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۵۷
⑤ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۶۳ ⑥ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۱۶۸
⑦ تاریخ الطبری: ۳ص ۳۱۸ ⑧ الاستیعاب: ۲ص ۶۲۱
⑨ سیر اعلام النبلاء: ۳ص ۴۱۳، ط الرسالۃ؛ تھذیب الکمال: ۳۱ص ۵۳
⑩ تاریخ الاسلام للذھبی: ۲ص ۳۷۹، ت بشار؛ تھذیب الکمال: ۳۱ص ۵۴

خلافتِ حضرت مُعاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ قریش کے خانوادے، بنواُمیہ کے نہایت باصلاحیت اور ہونہار فرد تھے۔آپ کے والد حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ اور والدہ ہند بنت عُتبہ رضی اللہ عنہا نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا جبکہ آپ اس سے پہلے سن ۷ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرۂ قضا کے وقت خفیہ طور پر مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔اس وقت ان کی عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی۔ ① حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ طویل قدو قامت اور گوری رنگت والے نہایت خوبصورت انسان تھے۔ ② بچپن ہی سے آپ رضی اللہ عنہ میں قیادت کے جوہر اتنے نمایاں تھے کہ قیافہ شناس لوگ کہتے تھے:

"اللہ کی قسم! یہ بچہ اپنی قوم کا رہنما بنے گا۔" ③

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ قریش کے گنے چنے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں شمار ہوتے تھے۔فتح مکہ کے بعد وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب مقرر ہوئے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے عرب رؤسا کے نام خطوط لکھواتے اور وحی کی کتابت بھی کراتے تھے۔ ④ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو تین سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب نصیب رہا اور بکثرت احادیث سننے اور نقل کرنے کا موقع ملا۔ان سے ایک سو تریسٹھ (۱۶۳) احادیث مروی ہیں۔ ⑤

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمات سے خوش ہو کر دعائیں دیا کرتے تھے۔ایک بار یہ دعا دی:

"اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ ھَادِیًا مَھْدِیًّا وَاھْدِ بِہٖ۔"

"اے اللہ! اسے ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنادے اور اس کے ذریعے ہدایت عام فرما۔" ⑥

ایک بار آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: "مُعاویہ! اگر تمہیں حکومت کا ذمہ دار بنایا جائے تو اللہ سے ڈرتے رہنا اور عدل وانصاف سے کام لینا۔"

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے (جو بلاشبہ ایک پیش گوئی تھی) مجھے برابر یہ خیال رہا کہ مجھے حکومت کی آزمائش میں ضرور مبتلا کیا جائے گا اور آخر مجھے اس سے سابقہ پڑ کر رہا۔" ⑦

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بڑے بھائی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام کی فتوحات میں شریک رہے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔شام کی فتح مکمل ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یزید بن ابی سفیان اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما کو اس سرزمین میں اپنا نائب مقرر کیا۔یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو

---

① تاریخ دمشق لابن عساکر: ۷۵/۵۹؛ طبقات ابن سعد: ۴۰۶/۷، ط صادر

② سیر اعلام النبلاء: ۱۲۱/۳، ط الرسالۃ ③ تاریخ دمشق لابن عساکر: ۷۵/۵۹

④ سیر اعلام النبلاء: ۱۲۳/۳، ط الرسالۃ ⑤ اسماء الصحابۃ الرواۃ لابن حزم، ص ۵۵

⑥ سنن الترمذی، ح: ۳۸۴۱، ابواب المناقب، بسند حسن ⑦ مسند احمد، ح: ۱۶۹۳۳، رجالہ ثقات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کا حاکم بنا دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سمندری جہاد شروع کیا اور متعدد علاقے فتح کیے۔ ①

خلفائے راشدین اور صحابہ کو آپ کی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:
''تمہیں قیصر و کسریٰ کی حکمرانی کے تذکرے کی کیا ضرورت، جبکہ تمہارے درمیان معاویہ موجود ہیں۔'' ②

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر حکمرانی کے قابل کوئی اور نہیں دیکھا۔'' ③

دورِ خلافت:

ربیع الاوّل سن ۴۱ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے متفقہ خلیفہ کی حیثیت سے مسندِ خلافت پر بیٹھے تو عالم اسلام میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، مخلص مسلمانوں کے تمام طبقات یکجا ہو گئے۔ آپ نے مدینہ یا کوفہ کی بجائے دمشق کو دارالخلافہ قرار دیا۔ اس کے بعد (دورِ خلافتِ زبیریہ کو مستثنیٰ کر کے) ۸۲ برس تک مرکزِ خلافت شام میں رہا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی شرعی حیثیت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت مخلص مسلمان تین طبقوں میں بٹے ہوئے تھے: پہلا طبقہ شام والوں کا تھا، جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے وفادار تھے۔ دوسرا طبقہ عراق کے مسلمانوں کا تھا جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے یہ بیعت کر چکے تھے کہ آپ جس سے صلح کریں گے، ہم بھی اس سے صلح کرلیں گے۔ تیسری جماعت غیر جانبدار تھی، جن میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت محمد بن مسلمہ، حضرت اسامہ بن زید، حضرت سلمہ بن اکوع اور حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت کا منصب چھوڑ دیا تو عراق کے مخلص مسلمانوں نے بھی حضرت معاویہ سے بیعت کرلی۔ ان میں حضرت قیس بن سعد اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسے اکابر بھی تھے۔ غیر جانب دار طبقے نے سب کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق دیکھا تو انہوں نے بھی بیعت کرلی۔ اس طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو مسلمانوں کے تمام طبقات اور تمام گروہوں کی تائید نصیب ہوئی اور اس سال کا نام ہی ''عام الجماعۃ'' (اجتماعیت اور اتحاد کا سال) پڑ گیا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق اور شرعی تھی۔ ہاں! اس سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت نہ کرنا اور شام پر اپنی آزاد حکومت قائم رکھنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ایک اجتہادی غلطی تھی (جس میں ان کی نیت بالکل صاف تھی) مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جانشین حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور ان کے پیروکاروں سمیت تمام مسلمانوں کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مان لینے کے بعد ان کی خلافت کو غیر آئینی اور غیر شرعی کہنا انصاف سے بعید ہے۔

---

① اسد الغابۃ: ۵/۲۰۱ ② تاریخ الطبری: ۵/۳۳۰ بسند صحیح

③ تاریخ الطبری: ۵/۳۳۷ بسند صحیح ... یہ قول اس زمانے کے اعتبار سے ہے جس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تھے، یعنی اس دور میں امورِ حکومت و سیاست کا ماہر ان سے زیادہ کوئی نہ تھا۔ انہیں خلفائے راشدین پر فوقیت دینا ہرگز مراد نہیں۔

عالمِ اسلام کا دفاع اور جہاد

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جہادی سلسلہ پوری آب وتاب سے چلا۔ آپ رضی اللہ عنہ ایک کہنہ مشق سپہ سالار اور عسکری منصوبہ ساز تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو مصر، حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بصرہ اور حضرت مسلمہ بن مخلد رضی اللہ عنہ کو افریقہ کا حاکم مقرر کیا۔ یہ سب مانے ہوئے سپہ سالار اور سیاست دان تھے۔ انہوں نے بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ مشرق ومغرب میں اسلامی افواج کو آگے بڑھایا جس کے نتیجے میں شورش پسندوں کا صفایا ہوا اور ہر طرف اسلامی افواج کے قدم جم گئے۔ ان جہادی مہمات کا خلاصہ یہ ہے:

(الف) برصغیر:

ہندوستان کی سرحدوں، سندھ اور بلوچستان میں کئی جہادی مہمات پیش آئیں۔ مُہلّب بن ابی صفرہ نے برصغیر میں بنّوں سے صوابی تک یلغار کی۔ ① حضرت عبداللہ بن سوار رحمہ اللہ اور سنان بن سلمہ رضی اللہ عنہ نے بلوچستان میں یکے بعد دیگرے پیش قدمی کر کے "قیقان" کے پہاڑی علاقے کو فتح کیا جو کوہ کھیرتھر سے قلات تک وسیع تھا۔ ②

(ب) خراسان:

خراسان میں مزید پیش قدمی ہوئی۔ حضرت قیس بن ہیثم نے بلخ کے باغیوں کی گوشمالی کی اور اُن کا آتش کدہ مسمار کر دیا۔ عبداللہ بن خازم رحمہ اللہ نے ہرات اور بادغیس کے شورش پسندوں پر قابو پایا۔ ③ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے ایک بہت طویل مہم کے بعد کابل کو مسخر کر لیا۔ کابل کے محاصرے کے دوران حضرت عبدالرحمن بن سمرۃ رضی اللہ عنہ حدیث اور فقہ کی تعلیم دیتے رہے۔ اس محاذ پر ان کے ساتھ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سمیت متعدد تابعین شاگردوں کے طور پر موجود تھے۔ یہ سب بیک وقت عالم بھی تھے اور مجاہد بھی۔ ④ حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے انہیں جنگ کے دوران صلوٰۃِ خوف پڑھا کر اس کی عملی مشق کرائی۔ ⑤

آخر کابل فتح ہو گیا۔ یہاں سے جو غلام ہاتھ لگے ان میں چند لڑکے بہت باصلاحیت تھے۔ یہ لڑکے علمائے اُمت کے حلقوں میں بیٹھ کر آخر کار نامور محدث، مفسر اور مشائخ بنے۔ ان میں نافع مولیٰ ابن عمر، سالم بن عجلان، ایوب سختیانی اور حمید الطویل مہران رحمہ اللہ علم وفضل میں بہت مشہور ہوئے۔ ⑥ انہی میں مکحول رحمہ اللہ بھی تھے جو دراصل سندھی تھے مگر شام میں منتقل ہونے کی وجہ سے بعد میں مکحول الشامی مشہور ہو گئے اور بہت بڑے محدث بنے۔ ⑦

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۰۶ ② فتوح البلدان: ص ۴۱۷؛ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۰۸ تا ۲۱۳

③ فتوح البلدان: ص ۳۹۶ ④ مسند احمد، ح: ۲۰۶۲۹

⑤ السنن الکبری للبیہقی، ح: ۶۰۰۷، ۶۰۳۵ ⑥ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۰۶

⑦ سبل السلام للامیر الصنعانی: ۲ ص ۴۷۷، ۴۷۸؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص: ۲۰۶

کابل کی فتح کے بعد حضرت عبدالرحمن بن سمرۃ رضی اللہ عنہ نے بجستان (جنوبی افغانستان) کی طرف پیش قدمی کی اور مختلف شہروں، قلعوں اور قبائل کو مسخر کرتے ہوئے رَخّج (قندھار) اور بُست تک جا پہنچے۔ اسی یلغار میں انہوں نے غزنی کے نواح میں زابل کو بھی فتح کیا۔ ① سن ۴۷ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے جرنیل حضرت حکم بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ نے پہلی بار غور کے دشوار گزار علاقے کو فتح کیا۔ ② سن ۵۰ ہجری میں انہوں نے کوہِ اَشل کو مسخر کیا جہاں اتنا سونا تھا کہ لوگ سونے کے برتن استعمال کرتے تھے۔ ③

(ج) وسطِ ایشیا:

ربیع بن زیاد حارثی دریا آمو پار کر کے وسطِ ایشیا میں پہنچے اور سرحدی علاقوں میں جہاد کر کے بکثرت مالِ غنیمت لے کر واپس آئے۔ یہ وسطِ ایشیا میں اُمت محمدیہ کا پہلا جہاد تھا۔ ④ سن ۵۳ ہجری میں عبیداللہ بن زیاد نے چوبیس ہزار سپاہی لے کر وسطِ ایشیا میں یلغار کی اور دو سال کی مہم جوئی میں بخارا کے مضافاتی علاقے: نَسَف اور بیکند فتح کر لیے۔ ⑤ اس کے بعد حضرت سعید بن عثمان یہاں کے سپہ سالار مقرر ہوئے جنہوں نے بخارا، سمرقند اور ترمذ کو فتح کر لیا۔ ⑥ قُثم بن عباس رضی اللہ عنہ اس جہاد میں شریک رہے اور آخر سمرقند کے معرکے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ⑦

(د) افریقہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں افریقہ میں کچھ فتوحات ہوئی تھیں مگر مسلمانوں کو یہاں ابھی تک استحکام نصیب نہیں ہوا تھا۔ یورپی بادشاہ اور قیصر روم یہاں کے کفار کی مدد کرتے تھے تاکہ وہ مسلمانوں کے آگے ڈٹے رہیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر مصر میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نائب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے افریقہ کی فتح کے لیے اپنے خالہ زاد بھائی حضرت عقبہ بن نافع رحمہ اللہ کو ذمہ دار بنایا۔ جو صحرائے اعظم کو عبور کرتے ہوئے لوبیا (لیبیا) تک جا پہنچے۔ ⑧

سن ۴۳ ہجری میں وہ صرف چار سو گھڑ سواروں، چار سو شتر سواروں اور پانی کے آٹھ سو مشکیزوں کا زادِ سفر لے کر سوڈان کے صحرائی علاقے میں گئے اور "برقہ" کے نواح میں "ودّان" کو فتح کر کے مقامی سردار کو گرفتار کر لیا۔ ⑨

سن ۵۰ ہجری میں حاکمِ مصر حضرت مَسلَمَہ بن مُخَلّد رضی اللہ عنہ کی طرف سے معاویہ بن حدیج رضی اللہ عنہ کو افریقہ بھیجا گیا۔ ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما جیسے نامور قریشی صحابہ تھے۔ ساحلی شہر سوس کے قریب رومیوں نے عین اس وقت مسلمانوں پر حملہ کیا جب مسلمان نماز ادا کر رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اطمینان سے نماز ادا کرتے رہے۔ دشمن کے قریب آنے سے ذرا پہلے وہ سلام پھیر کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور تکبیر کہتے ہوئے

---

① فتوح البلدان، ص: ص ۳۸۴ ② تاریخ الطبری: ۲۲۹/۵
③ تاریخ الطبری: ۵ ص ۲۵۰ تا ۲۵۲ ④ البدایہ والنہایہ: ۱۱ ص ۲۴۳
⑤ الکامل فی التاریخ، سن ۵۳ ھجری؛ فتوح البلدان، ص ۳۹۷؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۲۲
⑥ فتوح البلدان: ص ۳۹۸، ۳۹۷ ⑦ طبقات ابن سعد: ۳۶۷/۷، ط صادر
⑧ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۵ ⑨ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۰۶؛ معجم البلدان: ۳۶۶/۵

رومیوں پر پل پڑے۔ کچھ ہی دیر میں رومی سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہو گئے۔ ① ان فتوحات کے دوران حضرت معاویہ بن حَدِیج رضی اللہ عنہ نے تیونس سے بتیس میل مغرب میں ساحل پر واقع ''بَنْزَرْت'' کا مشہور شہر بھی فتح کر لیا۔ ②

اب تک افریقہ میں مسلمانوں کے حملے حریف ریاستوں پر دباؤ بڑھانے اور ان کی شر پسندی کا زور توڑنے کے لیے تھے۔ مسلمانوں کی افواج یہاں آ کر مستقل قیام نہیں کرتی تھیں اس لیے اب تک کئی جہادی مہمات کے باوجود افریقہ میں مسلمانوں کا کوئی شہر آباد نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اسلامی افواج کے جاتے ہی کوئی نہ کوئی شر پسند سردار لوگوں کو جمع کر کے بغاوت کر دیتا اور کچھ مدت بعد مسلم فوج کو دوبارہ آ کر علاقہ فتح کرنا پڑتا۔

سن ۵۰ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپہ سالار حضرت عقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے افریقہ میں پہلی چھاؤنی قائم کرنے کے لیے گھنے جنگل میں ایک شہر بسایا۔ یہ جنگل درندوں، سانپوں اور بچھوؤں سے پٹا پڑا تھا۔ حضرت عقبہ رحمہ اللہ نے وہاں بلند آواز سے اعلان کیا: ''اے جنگل کے درندو! سانپو! اور بچھوؤ! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم یہاں قیام کریں گے۔ آیندہ تم میں جو دکھائی دیا اسے مار دیں گے۔''

دیکھتے ہی دیکھتے درختوں کے جھنڈوں سے درندے اور بلوں سے سانپوں اور بچھوؤں کے غول نکلنے لگے اور جنگل خالی ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر بربر قبائل کے ان گنت لوگ مسلمان ہو گئے۔ اس شہر میں پہلے ایک بڑی مسجد تعمیر کی گئی۔ پھر مجاہدین کے مکانات بنائے گئے۔ فصیل کا دائرہ ساڑھے چار میل رکھا گیا۔ اسے ''قیروان'' کا نام دیا گیا (جو فارسی لفظ ''کاروان'' کی تبدیل شدہ شکل ہے) یہ افریقہ میں مسلمانوں کی پہلی فوجی چھاؤنی اور پہلا شہر تھا۔ ③

حضرت عقبہ بن نافع رحمہ اللہ مفتوحہ علاقوں میں تبلیغ کا کام بھی کرتے رہے جس سے اس براعظم میں تیزی سے اسلام پھیلا اور بے شمار بربر اور دیگر قبائل اسلام میں داخل ہوئے۔ ④

چند سال بعد حضرت عقبہ رحمہ اللہ واپس بلا لیے گئے تو ۵۴ھ میں حضرت خالد بن ثابت رحمہ اللہ اور ان کے بعد حضرت ابو مہاجر دینار رحمہ اللہ نے یکے بعد دیگرے افریقہ کے محاذ پر جہادی خدمات انجام دیں۔ ⑤ سن ۵۷ ہجری میں یہاں حضرت حسان بن نعمان رحمہ اللہ کا تقرر رہا۔ انہوں نے بربر قبائل کو جو الجزائر سے مراکش تک پھیلے ہوئے تھے، مغلوب کر کے ان پر خراج مقرر کیا۔ ⑥ سن ۵۹ ہجری میں حضرت ابو مہاجر دینار رحمہ اللہ نے شمالی افریقہ کے ساحل پر رومیوں کے قدیم تاریخی شہر ''قَرطَاجَنَّہ'' کو فتح کیا۔ ⑦ اس طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کے اختتام تک تقریباً پورے شمالی افریقہ میں مسلمانوں کے قدم نہایت مضبوطی سے جم گئے۔

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۱۱؛ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب، مراکشی: ۱/۱۰، ۱۱
② معجم البلدان: ۱/۵۰۰
③ البیان المغرب: ا ص ۲۰، ۱۹؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۱۰
④ فتوح مصر والمغرب لابی القاسم المصری: ۳/۴۵۴
⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۲۳
⑥ خلیفہ بن خیاط، ص: ۲۲۴
⑦ تاریخ خلیفہ بن خیاط: سنة ۵۹ھ

(ہ) رومیوں سے جنگیں:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ساسانیوں کا پایۂ تخت فتح ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ان کا آخری کسریٰ بھی مارا گیا تھا۔ تاہم قیصرِ روم ایشیا سے بے دخل ہونے کے باوجود یورپ میں پوری آن بان کے ساتھ موجود تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قیصری سلطنت کا خاتمہ چاہتے تھے۔ رومیوں کے پایۂ تخت قُسطَنطِینِیّہ پر اسلام کا پرچم گاڑنا آپ کا اہم ہدف تھا تاہم خلافت کے پہلے سال آپ کو اندرونی شورشوں پر قابو پانے اور دوسرے محاذوں پر قدم جمانے کے لیے فرصت درکار تھی۔ اُدھر قیصر صلح کی پیش کش کر چکا تھا، چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں سے صلح کر لی جو دو سال تک قائم رہی۔ پھر رومیوں نے اپنی عادت کے مطابق عہد شکنی کی اور صلح کا معاہدہ یک طرفہ طور پر توڑ دیا۔ ①

اس کے بعد سن ۴۲ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں کے خلاف چھاپہ مار کارروائیوں کا آغاز کر دیا اور ہر سال موسم سرما اور موسم گرما میں الگ الگ افواج کو رومیوں کی سرحدوں پر تعینات کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ پہلی مہم سن ۴۳ ہجری میں روانہ ہوئی اور خلیج قُسطَنطِینِیّہ تک گئی۔ ②

سن ۴۳ اور ۴۵ ہجری کے سرما میں سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ مجاہدین کے قائد بن کر رومیوں کے مدمقابل رہے۔ ③ ان کے بعد حضرت مالک بن ہبیرہ رحمہ اللہ اور حضرت عبدالرحمن القینی رحمہ اللہ ۴۷ ہجری سے ۴۹ ہجری تک مختلف سالوں کے موسم سرما میں ایشیائے کوچک اور انطاکیہ کے محاذوں پر سینہ سپر رہے۔ ④

موسم گرما میں بھی رومیوں کے خلاف لشکر کشی ہوتی رہی جن کی قیادت حضرت عبداللہ بن قیس الفزاری اور حضرت مالک بن ہبیرۃ الیشکری رحمہ اللہ کرتے رہے۔ ⑤ تاہم گرمی کی مہمات میں سب سے زیادہ کردار حضرت مالک بن عبداللہ رحمہ اللہ کا تھا جو اپنے کارناموں کی وجہ سے "مالک الصوائف" (مہماتِ گرما کے مالک) کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ ⑥

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں کی سرزمین پر سولہ جہادی مہمات روانہ کیں۔ ایک ایک لشکر باری باری سردی اور گرمی میں وہاں جاتا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی اپنے بیٹے یزید کو آخری وصیت یہ تھی کہ رومیوں کا گلا گھونٹ دو۔" ⑦

ان تمام مہمات کا مقصد اپنی سرحدوں کا دفاع کرنا، دشمن پر دباؤ ڈالنا، اسے اقتصادی نقصان پہنچانا اور اس کی طاقت کا اندازہ لگاتے رہنا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے آٹھ سال تک یہ حکمت عملی آزمانے کے بعد آخر کار ۵۰ھ میں رومیوں کے پایۂ تخت قُسطَنطِینِیّہ پر باقاعدہ حملے کی تیاری کی۔ (بعض نے سن ۵۲ ہجری بھی لکھا ہے)۔ یزید بن

---

① فتوح البلدان: ص ۱۵۹؛ تاریخ خلیفہ ابن خیاط، ص: ۲۰۶

② تاریخ خلیفہ خیاط: ص ۲۹۶؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/۱۱ ③ تاریخ خلیفہ ابن خیاط: ص ۲۰۷

④ تاریخ خلیفہ ابن خیاط: ص ۲۰۸، ۲۰۹ ⑤ تاریخ ابن خلدون: ۳ ص ۱۱

⑥ اسد الغابۃ: ۵/۲۸؛ الاصابۃ، ۵/۵۳۱، ۵۳۲ ترجمۃ: مالک ابن عبداللہ ابن سنان ⑦ البدایہ والنہایہ: ۱۱ ص ۴۳۵

معاویہ کو لشکر کا امیر بنایا گیا۔ ① حضرت عبدالرحمن بن خالد، حضرت عقبہ بن عامر اور حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہم لشکر کے مختلف حصوں کے سالار تھے۔ ②

اس لشکر کی روانگی سے قبل ۵۰ھ ہی میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے سفیان بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلادِ روم یعنی ایشیائے کوچک میں رومیوں کے خلاف ایک لشکر دے کر بھیج دیا اور تاکید کی وہ ''طُوَانَہ'' کے مقام تک پیش قدمی کرتے چلے جائیں۔ غالباً اس لشکر کشی کا مقصد رومیوں کو مصروف رکھنا تھا تاکہ وہ قسطنطنیہ جانے والے لشکر کا راستہ نہ روک سکیں۔ ③

قُسطَنطِینِیَّہ کے لیے جانے والا لشکر کئی ماہ کی مسافت طے کر کے ایشیائے کوچک سے ہوتا ہوا خلیج قُسطَنطِینِیَّہ تک جا پہنچا۔ یہاں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ شدید بیمار ہو گئے تو وصیت کی کہ میں مرجاؤں تو مجھے غسل دے کر کفن پہنانا اور دشمن کے ملک میں جتنا ممکن ہو اندر لے جا کر تدفین کرنا۔ ④ آخر کار مسلمان آبنائے قُسطَنطِینِیَّہ عبور کر کے رومیوں کے اس ناقابلِ تسخیر پایۂ تخت پر حملہ آور ہوئے۔ یہاں کھلے میدان میں بھی معرکے ہوئے۔ ⑤

کچھ دنوں بعد حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا اسی محاذ پر انتقال ہو گیا اور یزید بن معاویہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ⑥

مسلمانوں نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق قُسطَنطِینِیَّہ کی فصیل کے قریب انہیں دفن کر دیا۔ تدفین کے بعد ان کی قبر سے ایک روشنی کی لہر نکلی اور آسمان تک چلی گئی۔ یہ عجیب منظر رومی سپاہیوں نے بھی دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئے۔ اگلے دن ان کے سفیر نے آکر پوچھا: ''یہ کون شخص ہے جسے تم نے دفنایا ہے؟'' جواب ملا: ''ہمارے رسول کے صحابی ہیں۔'' شہید کی یہ کرامت دیکھ کر بہت سے رومی مسلمان ہو گئے۔ ⑦ مسلمان ایک مدت تک قُسطَنطِینِیَّہ کا محاصرہ کیے رہے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر یزید نے لشکر سمیت واپسی اختیار کی۔ ⑧

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے اس کے بعد بھی موسم سرما اور گرما میں روم کی سرحدوں پر لشکر کشی کا سلسلہ جاری رہا۔ سن ۵۳ ہجری میں عبدالرحمن بن ام الحکم، سن ۵۴ ہجری میں محمد بن مالک، ۵۶ ہجری میں مسعود بن ابی مسعود، ۵۷ ہجری میں عبداللہ بن قیس، ۵۸ ہجری میں مالک بن عبداللہ خَثْعَمِی اور ۵۹ ہجری میں عُمرو بن مُرَّۃ مہری رضی اللہ عنہم نے ان مہمات کی قیادت کی۔ ⑨ ان لشکروں میں بڑے بڑے عالم اور قاری شرکت کرتے تھے اور جہاد کے دوران قرآن

---

① مسند احمد، ح: ۲۳۵۲۳؛ اسد الغابۃ: ۱۲۱/۲، ترجمۃ: خالد بن زید بن کلیب ابی ایوب الانصاری

② السنن الکبری للبیہقی، ح: ۱۷۹۲۵، ۱۸۰۲۰، ۱۸۱۹۵

③ تاریخ دمشق: ۶۵ ص ۲۰۵

④ شرح السیر الکبیر للسرخسی: ۲۳۵/۲ باب الشہید وما یصنع بہ؛ اسد الغابۃ: ۱۲۱/۲

⑤ سنن ابی داؤد، ح: ۲۵۱۲، کتاب الجہاد؛ السنن الکبری للبیہقی، ح: ۱۷۹۲۵

⑥ البدایہ والنہایہ: ۱۱ ص ۲۵۲، ۲۵۳

⑦ شرح سیر الکبیر للسرخسی: ۲۳۵/۱

⑧ تاریخ ابن خلدون: ۳ ص ۱۱

⑨ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۱۹ تا ۲۲۶

وحدیث پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ ①

سن ۵۲ ہجری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت جنادہ بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کو ایک مضبوط بحری فوج کے ساتھ بحیرۂ روم کے مشہور جزیرے "روڈس" کی تسخیر کے لیے روانہ کیا جہاں سے رومی شام کے ساحلوں پر حملے کیا کرتے تھے۔ حضرت جنادہ بن امیہ رضی اللہ عنہ نے سن ۵۳ ہجری میں روڈس کو فتح کر کے یہاں مسلمانوں کی چھاؤنی قائم کی جو ایک بہت مستحکم قلعے میں تھی۔ ②

زیاد بن ابی سفیان کی کارکردگی:

زیاد طائف کی ایک لونڈی سُمَیّہ کا بیٹا تھا۔ اس کے والد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ تھے مگر انہوں نے زمانۂ جاہلیت میں سُمَیّہ سے خفیہ نکاح کیا تھا، اس لیے یہ بات مشہور نہ تھی، بہرحال زیاد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا باپ شریک بھائی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت زیاد کی عمر دس، گیارہ برس تھی، تاہم طائف میں قیام کے باعث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف نہ مل سکا۔ وہ دفتری امور اور حساب وکتاب کا ماہر تھا چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کی ماتحتی میں کتابت کی ذمہ داریاں انجام دیں۔ ③ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں زیاد کو بصرہ کا محصل زکوٰۃ بنایا گیا۔ ④ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اختلاف کے دنوں میں زیاد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور فارس کی امارت سنبھالی۔ زیاد کی کوششوں سے وہاں باغیانہ سرگرمیاں تھم گئیں اور امن وامان ہوگیا۔ ⑤

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی تو زیاد نے ایک سال تک فارس کے ایک قلعے میں محصور رہ کر بیعت نہ کی۔ ایک سال بعد زیاد نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو قبول کر کے شام میں قیام کر لیا۔ ⑥

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۴۵ھ میں زیاد کو بصرہ کا حاکم بنادیا۔ ⑦ اس نے شہر کے نظم ونسق کے لیے چار ہزار سپاہی بھرتی کیے۔ یوں بصرہ میں مکمل امن ہوگیا۔ ⑧ سن ۵۰ھ میں کوفہ کے امیر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ وفات پاگئے تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کو بصرہ کے ساتھ ساتھ کوفہ کا امیر بھی بنادیا۔ اس طرح پہلی بار کسی امیر کو ان دو صوبوں کی ولایت ایک ساتھ ملی۔ زیاد نے ان دونوں صوبوں کے انتظامات اس طرح سنبھالے کہ موسم سرما بصرہ میں گزرتا اور گرما کوفہ میں۔ ⑨

---

① تاریخ دمشق: ۳۰/۴۷۳، ۴۷۴، ترجمۃ: عطیہ بن قیس؛ فتوح البلدان، ص ۲۳۳

② البدایہ والنہایہ: ۱۱ ص ۲۵۹؛ فتوح البلدان، ص: ۲۳۳

③ سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۹۶، ۴۹۷، ط الرسالۃ

④ الاصابۃ: ۲/۵۲۸؛ تہذیب الاسماء واللغات للنووی: ۱/۱۹۹، ط العلمیۃ ⑤ تاریخ الطبری: ۵ ص ۱۳۷، ۱۳۸

⑥ تاریخ الطبری: ۵ ص ۱۷۶ تا ۱۷۸ ⑦ تاریخ الطبری: ۵ ص ۲۱۷، ۲۱۶

⑧ تاریخ الطبری: ۵ ص ۲۲۲، ۲۲۳ ⑨ تاریخ الطبری: ۵ ص ۲۳۴

اندرونی قضیے

فتوحات اور ملکی انتظامات کے ساتھ ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اندرونی مشکلات پر بھی بخوبی قابو پایا۔ آپ کی خلافت کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ پہلے کوفہ اور پھر بصرہ کے باغی گروہ اپنی طاقت کے ساتھ منظر عام پر آ گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوری مستعدی سے ان دونوں شہروں کو فتنوں کا مرکز بننے سے بچایا جس کی تفصیل پیش خدمت ہے:

کوفہ میں خوارج کی بغاوتیں:

سب سے پہلے کوفہ میں خارجی گروہ نے بدامنی کی۔ نہروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے شکست کھانے کے بعد یہ گروہ خفیہ طور پر جماعت سازی کر کے انقلاب لانے کی تیاری کر رہا تھا اور سینکڑوں افراد جمع کر چکا تھا چنانچہ ان کے کئی سردار: فروہ بن نوفل، عبداللہ بن ابی الحوساء اور حوثرہ بن ذراع یکے بعد دیگرے سرکاری افواج سے لڑنے نکلے اور سبھی موت کے گھاٹ اتر گئے مگر خوارج ایک سردار کے مرتے ہی دوسرے کو امیر بنا کر پھر برسر پیکار ہوتے رہے۔

آخر کار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مشہور صحابی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا حاکم بنا کر بھیجا جن کی شجاعت، فراست اور سیاست کو سارا عرب مانتا تھا۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے بڑی حکمت اور تدبیر کے ساتھ خوارج کے خلاف کارروائیاں شروع کیں۔ خوارج شبیب بن بجرہ، معین بن عبداللہ ابو مریم اور ابولیلیٰ جیسے سرداروں کی قیادت میں جمع ہو ہو کر ٹکرائے مگر ایک سال کے اندر اندر ان کا زور ٹوٹ گیا اور وہ تتر بتر ہو گئے۔

دو سال بعد سن ۴۳ ہجری میں خارجی گروہ مستورد بن علقمہ نامی سردار کی قیادت میں پھر منظم ہو گیا۔ مستورد نے طے کیا کہ یکم شوال ۴۳ ہجری کو جب شہر کے لوگ نماز عید کے لیے باہر جائیں تو اچانک حملہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا جائے مگر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو بروقت یہ اطلاع مل گئی۔ انہوں نے اس گھر پر جو سازش کا مرکز تھا، چھاپہ مارا۔ مستورد فرار ہو گیا۔ اس کی جماعت کے کچھ اہم لوگ پکڑے گئے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ کوفہ والوں میں اب بھی خارجیت اور سبائیت کے اثرات موجود ہیں اور انہی میں سے کچھ لوگوں کی خفیہ حمایت سے شورش پسند لوگ پنپ رہے ہیں۔ ایسے لوگ حکمرانوں کی نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور عوام کے لیے مصائب کا باعث بنتے ہیں۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی کوشش تھی کہ خون ریزی کے بغیر یہ فتنہ ختم ہو جائے اور شر پسند لوگ باز آ جائیں۔

آپ رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا:

"لوگو! میں تمہارے لیے امن پسند کرتا ہوں، تکالیف اور مصائب سے تمہیں بچانا چاہتا ہوں مگر مجھے خطرہ ہے کہ میرے سلوک سے شر پسند لوگ بگڑ نہ جائیں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں جاہلوں کے ساتھ شریف اور بھلے مانس بھی میری گرفت میں نہ آ جائیں، لہٰذا اس سے پہلے کہ تمہارے خلاف کوئی عام کارروائی کرنی پڑے تم اپنے جاہلوں کو روک لو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ لوگ جہالت اور منافقت کا بیج بو رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! ایسے لوگ چاہے عرب

کے کسی قبیلے میں بھی ہوں میں انہیں مار ڈالوں گا اور انہیں بعد والوں کے لیے عبرت کا نمونہ بنادوں گا۔''

اس دھمکی سے لوگ ڈر گئے اور ان کے سرداروں نے اپنے اپنے قبیلوں کی ضمانت دی کہ وہ کسی بغاوت کا حصہ نہیں بنیں گے۔ اس وعدے کے مطابق جب سرداروں نے اپنے ماتحت لوگوں کو باغی ذہنیت سے باز رکھنے کی کوشش کی تو خارجیوں کی دال گلنا بند ہوگئی۔ ان کا امیر مستورد اپنے خاص حامیوں کو لے کر علاقے سے دور نکل گیا۔

اب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے معقل بن قیس رحمہ اللہ کو اس کے تعاقب میں بھیج دیا۔ کئی لڑائیوں کے بعد آخر کار خارجیوں کی بڑی تعداد ماری گئی۔ آخری جھڑپ میں مستورد نے آواز لگا کر معقل بن قیس رحمہ اللہ کو لڑائی کی دعوت دی۔ وہ شمشیر سونت کر نکلے۔ مستورد نے معقل رحمہ اللہ کو نیزہ گھونپ کر شہید کر دیا مگر اس سے پہلے معقل رحمہ اللہ مستورد کی کھوپڑی میں تلوار اتار چکے تھے۔ اس شکست کے بعد خارجی منتشر ہوگئے اور عراق کا امن وامان بحال ہوگیا۔ ①

حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کا قضیہ:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک نہایت کٹھن امتحان کوفہ کے بعض بزرگوں کے سخت اختلاف اور شدید احتجاج کی شکل میں سامنے آیا۔ ان کے رئیس حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ تھے جو علم وفضل اور زہد وعبادت میں ممتاز تھے۔ صحابہ کرام کے حلقے میں ان کا غیر معمولی احترام تھا۔ ② امام بخاری، ابن ابی حاتم، خلیفہ بن خیاط اور ابن حبان نے انہیں تابعین میں شمار کیا ہے۔ ③ جبکہ محمد بن سعد اور امام حاکم نیشاپوری نے مُصعَب الزبیری سے نقل کر کے لکھا ہے کہ وہ اپنے بھائی ہانی کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد بن کر حاضر ہوئے تھے۔ ④ اسی بناء پر امام محمد بن الحسن الازدی، علامہ ابن عبد البر، حافظ ابن عساکر، علامہ ابن اثیر الجزری، قاضی ابن عدیم حلبی، حافظ ذہبی، امام الصفدی رحمہم اللہ اور دیگر بہت سے علماء نے انہیں صحابی قرار دیا ہے۔ ⑤ وہ کوفہ میں شیعانِ علی کے رئیس تھے۔ ⑥

---

① تاریخ الطبری: ۵ ص: ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۷۳ تا ۱۷۹، ۱۸۱ تا ۲۱۰

② معرفۃ الصحابۃ: ۲۰۰۶/۳؛ الاصابۃ: ۵۱۴/۲؛ الاستیعاب: ۳۲۹/۱؛ اسد الغابۃ: ۶۹۷/۱ ③ الاصابہ: ۳۲/۲، ۳۳

④ الطبقات الکبری: ۶ ص ۲۱۷؛ المستدرک علی الصحیحین: ۳ ص ۵۳۱؛ الاصابہ: ۳۲/۲، ۳۳، ط العلمیۃ

⑤ الاشتقاق: ص ۳۶۴؛ الاستیعاب: ۳۲۹/۱؛ تاریخ دمشق: ۱۲ ص ۲۰۷؛ اسد الغابہ: ۱ ص ۶۹۷؛ بغیۃ الطلب: ۵ ص ۲۱۰۵؛ سیر اعلام النبلاء: ۳ ص ۳۵۶؛ الوافی بالوفیات: ۱۱ ص ۲۴۷؛ توضیح المشتبہ: ۳ ص ۱۲۵؛ الاعلام: ۲ ص ۱۶۹

⑥ اس دور میں ''شیعانِ علی'' کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا تھا جو سیاسی اختلافات کے مواقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے جن میں کئی اکابر صحابہ کرام اور صدہا جلیل القدر تابعین شامل تھے جن سے ہمیں دین کا بہت بڑا حصہ پہنچا ہے۔ بعض ارشاداتِ نبویہ سے ان اختلافات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت کا ''اولیٰ بالحق'' ہونا ثابت ہے، مثلاً: تَمْرُقُ مَارِقَةٌ عِنْدَ فُرْقَةٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ يَقْتُلُهَا أَوْلَى الطَّائِفَتَيْنِ بِالْحَقِّ. ''مسلمانوں میں افتراق کے وقت ایک فرقہ نکلے گا جسے زیادہ حق پرست فریق قتل کرے گا۔'' (صحیح مسلم، ح: ۲۵۰۷؛ سنن ابی داود، ح: ۴۶۶۷) چنانچہ خوارج کی سرکوبی کا شرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت کو حاصل ہوا۔ ان شیعانِ علی میں اگر کچھ سبائی وغیرہ گھل مل گئے تھے تو ان کا تناسب اتنا کم تھا کہ فرمانِ نبوی میں انہیں مستثنیٰ کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ البتہ چند عشروں بعد شیعانِ علی میں غالی گروہ کا اثر ورسوخ بڑھ گیا، چنانچہ اصل شیعانِ علی نے حجاز اور شام کے صحیح العقیدہ مسلمانوں کے ساتھ اشتراک کر کے ''اہلِ سنت'' کا لقب پسند کرلیا۔ (تحفہ اثنا عشریہ اردو، از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی: ص ۳۹، ۴۰)

جب زیادہ کوفہ کا اُمیر مقرر ہوا تو اس نے اپنے ابتدائی خطاب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کی تعریف کی، ان کے قاتلین کو بددعا دی اور ان پر لعنت بھیجی۔ اس پر حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور سخت احتجاج کیا۔ ①

دراصل حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کا گمان تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل مانتے ہیں اور امرائے بنواُمیّہ جب بھی قاتلینِ عثمان پر لعنت کرتے ہیں تو اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء ہوتے ہیں۔ چاہے یہ حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کی غلط فہمی سہی، مگر ظاہر ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک عقیدت مند ایسا سمجھنے کے بعد ایسی بددعا کو کیسے برداشت کر سکتا تھا؟ اس لیے حضرت حُجر رضی اللہ عنہ زیاد کے خطبے میں آڑے آنے لگے۔

امام ابن سیرین رحمہ اللہ کے مطابق حضرت حُجر رضی اللہ عنہ کے احتجاج کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زیاد جمعے کے خطبے کو بہت طول دیا کرتا تھا جس کے باعث نماز میں تاخیر ہو جاتی تھی۔ ایک دن حُجر بن عدی رضی اللہ عنہ مزید تاخیر برداشت نہ کر سکے اور آواز لگائی: ''نماز! نماز!'' اور ہاتھ زمین پر رکھا جیسے کنکریاں اٹھانے والے ہوں، اُن کے ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ زیاد نے یہ دیکھ کر خطبہ ختم کر دیا اور نماز پڑھا دی اور یہ صورتحال مبالغے کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجی۔ ②

الغرض یوں زیاد اور حجر بن عدی کے درمیان بدگمانیاں بڑھتی گئیں اور نوبت کشیدگی تک پہنچ گئی۔ زیاد حسبِ معمول بصرہ کے انتظامات سنبھالنے گیا تو پیچھے کوفہ میں حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ اور ان کے اُصحاب سرکاری نظم وضبط میں آڑے آنے لگے اور بدامنی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ یہ خبر ملنے پر زیاد واپس کوفہ آیا اور ان کے خلاف سخت کارروائی شروع کرا دی، یہاں تک کہ نوبت مسلح جھڑپوں تک پہنچ گئی۔ بہرکیف زیاد حضرت حجر رضی اللہ عنہ کو ان کے کئی ساتھیوں سمیت گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا جبکہ ان کے ایک اہم ساتھی حضرت عَمرو بن الحَمِق رضی اللہ عنہ موصل کے پہاڑوں میں روپوش ہو گئے جہاں سانپ کے ڈسنے سے ان کی وفات ہو گئی۔ زیاد نے شرفائے کوفہ سے حُجر رضی اللہ عنہ کے ''خروج'' پر تحریری شہادتیں لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ارسال کیں اور حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو بھی ان کے رفقاء سمیت دمشق بھیج دیا جہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں سزائے موت سنا دی۔ چنانچہ انہیں قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۵۱ ہجری کا ہے۔ ③

یاد رہے کہ اس سانحے کے اسباب وعلل اور دیگر تفصیلات کا بیشتر حصہ ضعیف راویوں سے منقول ہے۔ طبری میں ''ذکر مقتل حجر بن عدی واصحابہ'' کے عنوان سے اس پر پچیس، تیس صفحات کا مواد موجود ہے جس میں سے چند سطروں

---

① تاریخ الطبری: ۵/۲۵۵، ۲۵۶، عن ابو عوانہ؛ تاریخ دمشق: ۱۲/۲۱۷، ترجمۃ: حجر بن عدی

② عن ابن سیرین، أنّ زیادًا، أطالَ الخطبۃ، فقال حجر بن عدیّ: الصّلاۃ! فمضی فی خطبتہ، فقال لہ: الصّلاۃ، وضرب بیدہ إلی الحصی، وضرب النّاس بأیدیہم إلی الحصی، فنزل فصلّی، ثم کتب فیہ إلی معاویۃ۔ (المستدرک للحاکم، ح: ۵۹۸۱) رجالہ ثقات۔

عن محمد ابن سیرین، قال: خطب زیاد یوما فی الجمعۃ فاطال الخطبۃ واخر الصلاۃ، فقال لہ حجر بن عدی: الصلاۃ! فمضی فی خطبتہ، ثم قال: الصلاۃ! فمضی فی خطبتہ، فلما خشی حجر فوت الصلاۃ ضرب بیدہ إلی کف من الحصا، وثار إلی الصلاۃ وثار الناس معہ، فلما رای ذلک زیاد نزل فصلّی بالناس، فلما فرغ من صلاتہ کتب إلی معاویۃ فی امرہ، وکثّر علیہ۔ (تاریخ الطبری: ۵ص ۲۵۶، ۲۵۷) اسنادہ صحیح۔

③ طبقات ابن سعد: ۶/۲۱۸، ۲۱۹، ط صادر؛ تاریخ دمشق: ۱۲/۲۱۶، ۲۱۸

کے سوا سارا واقعہ ہالک وتالف راوی ابو مخنف سے مروی ہے۔① ابو مخنف کے مطابق: ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو ظالمانہ طور پر قتل کرایا تھا اور حضرت حجر رضی اللہ عنہ کا قصور یہ تھا کہ وہ منبر پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نائبین کو علی رضی اللہ عنہ پر طعن وتشنیع کرتا نہ دیکھ سکتے تھے پس انہوں نے احتجاج کیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نائب زیاد نے انہیں گرفتار کر کے شام بھیج دیا جہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں اوران کے چند ساتھیوں کو سزائے موت دے دی۔'' ②

ہمیں اس قضیے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ دونوں کے مقام کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہم یہی حسن ظن رکھتے ہیں کہ انہوں نے جو احتجاج وغیرہ کیا (جو بعد میں مسلح جھڑپوں تک جا پہنچا) چاہے وہ غلط فہمی کے باعث سہی، مگر اس میں وہ نیک نیت تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی یہی سوچنا چاہیے کہ انہوں نے شرعی ذمہ داری سمجھتے ہوئے حضرت حجر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو سزا دی تھی۔ یقیناً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس سزا دینے کا اختیار بھی تھا اور معافی کا بھی۔ سزا سے متعلق یہ احادیث نبویہ موجود تھیں:

مَنْ أَرَادَ أَنْ يُفَرِّقَ هٰذِهِ الْأُمَّةَ وَهِيَ جَمِيعٌ فَاضْرِبُوا بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَا كَانَ۔

''جو اس اُمت کو منتشر کرنا چاہے، جبکہ اُمت مجتمع ہو تو اسے تلوار سے مار دو چاہے وہ کوئی بھی ہو۔'' ③

دوسری طرف حضرت حجر رضی اللہ عنہ کا مقام ومرتبہ اور ان کا غلط فہمی کا شکار ہو کر خروج میں شامل ہو جانا انہیں شک کا فائدہ دے کر معافی کا حق دار بناتا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا طبعی میلان یہی تھا کہ حضرت حجر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی جان بخشی کر دی جائے مگر ان کے اکثر مشیروں نے سزا نافذ کرنے پر زور دیا۔ تقدیر کی بات کہ آخر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے حلم اور نرم خوئی کے برخلاف اسی رائے کو مان کر حضرت حجر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے لیے سزائے موت کی منظوری دے دی۔ یہ لوگ ''مَرْج عَذراء'' کے مقام پر قید تھے۔ وہیں ان کو سزائے موت دے دی گئی۔ ④

حضرت حجر رضی اللہ عنہ کے قتل سے عالم اسلام میں سوگ طاری ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان کی خیر خبر پوچھتے رہتے تھے۔ جب قتل کی اطلاع ملی تو روتے روتے حالت غیر ہو گئی۔⑤ خراسان میں سپہ سالار ربیع بن زیاد حارثی کو یہ خبر ملی تو رنجیدہ ہو کر لوگوں کو جمع کر کے اپنی موت کی دعا کی۔ مجلس سے اٹھنے نہ پائے تھے کہ روح جسم سے پرواز کر گئی۔ ⑥

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو جلد ہی احساس ہو گیا تھا کہ اگر حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کو سزائے موت نہ دی جاتی بلکہ انہیں معاف کر دیا جاتا یا زیادہ سے زیادہ قید رکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچتے تھے

---

① تاریخ الطبری: ۲۵۵/۵ تا ۲۷۷

② تاریخ الطبری: ۵ ص: ۵۵۳ تا ۵۷۷ .... تاریخ اُمت مسلمہ حصہ دوئم اور ازالۂ شبہات میں اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب وشتم کی مہم جاری کرنا ایک غلط دعویٰ ہے جس کا کسی صحیح روایت سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، از شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ

③ صحیح مسلم، ح: ۴۹۰۲، کتاب الامارۃ، حکم من فرق امر المسلمین ④ طبقات ابن سعد: ۲۱۹/۶، صادر

⑤ تاریخ دمشق: ۱۲ ص ۲۱۰ ⑥ تاریخ الطبری: ۳ ص ۲۱۰

کہ کہیں حضرت حجر رضی اللہ عنہ کو معاف کردینے سے کشت و خون کا ایک نیا سلسلہ نہ شروع ہو جاتا۔ جیسا کہ ان کے اکثر مشیروں نے بھی اسی لیے سزا دینے پر زور دیا تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر ملت اسلامیہ کو ایک نئی خانہ جنگی سے بچانے کے لیے ہی یہ تلخ فیصلہ کیا تھا، ورنہ حضرت حجر رضی اللہ عنہ سے انہیں کوئی ذاتی عناد نہ تھا۔ اس سانحے کے بعد (۵۶ھ میں) جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حج کے لیے گئے اور مدینہ منورہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضری دی اور ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے ان کے اس اقدام پر ناراضی کا اظہار کیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''امی جان! ایک آدمی کو قتل کر کے باقی لوگوں کو بچا لینا مجھے اسے چھوڑ کر باقی کو تباہ کرنے سے بہتر لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ معاملہ بڑھ نہ جائے اور ایسا فتنہ نہ کھڑا ہو جائے جس میں خون ریزی ہوتی اور حلال و حرام کی حدیں مٹ جاتیں۔ آپ حضرت حجر کا اور میرا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔'' ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے آپ کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔''[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مرض الموت میں حضرت عبداللہ بن یزید ان کی عیادت کے لیے آئے جن کے والد یزید بن اسد نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت حجر رضی اللہ عنہ کے بارے میں درگزر کا مشورہ دیا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اسے یاد کر کے بولے: ''اللہ تمہارے والد پر رحم کرے جنہوں نے حجر بن عدی کے معاملے میں مجھے خیر خواہانہ مشورہ دیا تھا۔''[2]

حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کے سانحے سے متاثر ہو کر اسلامی تاریخ میں انہیں شہید کا درجہ دیا گیا اور چونکہ وہ ایک تاویل کی بنا پر حکومت کے خلاف کھڑے ہوئے تھے اور اپنے طور پر حق کے لیے لڑ رہے تھے، اس لیے ان کے کردار کی بلندی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اسی طرح اس حوالے سے کسی کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع کا کوئی حق نہیں۔ اس دور کے اکابر نے بھی اظہارِ افسوس کیا تھا مگر کسی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلائی اور انہیں برا بھلا نہیں کہا کیوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اقدام شرعی حدود کے خلاف نہ تھا کہ اس پر کوئی احتجاج کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اور حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ دونوں سے راضی ہو۔ آمین۔

❁❁❁

یزید کی ولی عہدی

ہر دور اندیش حکمران کی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی چاہتے تھے کہ ملک اندرونی اور بیرونی طور پر مضبوط و مستحکم ہو۔ چونکہ عموماً انتقالِ اقتدار کا مرحلہ خانہ جنگی کا محرک بنتا تھا، اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خطرہ تھا کہ ان کی وفات پر کہیں پھر کوئی بحران نہ پیدا ہو جائے۔ وہ انتقالِ اقتدار کو ایسے جھمیلوں سے دور رکھنا چاہتے تھے جو آراء کے تضاد اور مرکز گریزی کا سبب بنیں۔ دریں حالات اپنی حکومت کے سولہویں سال (۵۶ ہجری میں) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو

---

① تاریخ دمشق: ۱۲/ص ۲۲۹؛ البدایہ والنہایہ: ۸/ص ۶۰، بسند حسن

② تاریخ دمشق: ۱۲/ ۲۳۱؛ تعجیل المنفعۃ لابن حجر: ۲/ ۳۶۸، ط دار البشائر

اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ اگرچہ صحابہ کرام جیسی افضل شخصیات کی موجودگی میں ایک کم تر فرد کو جانشین بنانا غیر متوقع تھا مگر چونکہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت کا اکثر دارومدار بنوامیہ اور اہلِ شام کی طاقت پر تھا، اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ اگر خاندان سے باہر کے کسی شخص کو ولی عہد بنا دیا گیا تو اہلِ شام اسے برداشت نہیں کریں گے اور اُمت خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائے گی۔ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ اس فیصلے کی وجوہ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''جو چیز حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دوسروں کی جگہ یزید کو ولی عہد بنانے کا محرک بنی، وہ اُمت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی۔ بنواُمیہ کے اربابِ حل وعقد اس پر متفق تھے۔ اس وقت وہ اپنے علاوہ کسی پر راضی نہیں تھے۔ وہ قریش کا سب سے مضبوط گروہ تھے اور اہلِ ملت کی اکثریت انہی سے تعلق رکھتی تھی، اس لیے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو ترجیح دی اور افضل کی جگہ غیر افضل کو چنا، یہ اتحاد اور اتفاقِ رائے کے لیے ہی کیا جس کی شریعت میں بہت اہمیت ہے۔ اور بلاشبہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ سے اس کے سوا کچھ اور متصور نہیں کہ اُن کی عدالت اور شرفِ صحبت ایسا سوچنے سے مانع ہے۔''①

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ یزید خلافت کا اہل ہے۔ باپ کی بیٹے سے شدید طبعی محبت کے ساتھ ساتھ یزید کی دنیوی شرافت، اس میں شہزادوں جیسی خصوصیات، عسکری امور سے واقفیت، حکومتی نظم ونسق چلانے کی قابلیت اور اس کی ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت کی وجہ سے ان کی یہ رائے بنی...... اور ان کا گمان تھا کہ صحابہ کرام کے فرزندوں میں سے کوئی اس انداز سے ملکی انتظام نہیں سنبھال سکے گا۔''②

یزید کی ولی عہدی پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے رفقاء کے تحفظات:

یزید کی ولی عہدی پر خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے قریبی رفقاء کو بھی تحفظات تھے۔ ان کے دوست حضرت عَمرو بن حزم انصاری رضی اللہ عنہ اسی مسئلے کے لیے مدینہ سے دِمشق گئے اور کھل کر گفتگو کی۔ ان کا زور اس پر تھا کہ یزید کو ولی عہد نہ بنایا جائے۔ انہوں نے حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی:

''اللہ نے بندے کو جن کی ذمہ داری سونپی ہو، ان کے بارے میں وہ قیامت کے دن اس سے ضرور پوچھے گا۔''

یہ کہہ کر حضرت عَمرو بن حزم انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مُعاویہ! میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اچھی طرح سوچ لیں، اپنے بعد کس کو امتِ محمدیہ کا نگران بنا کر جا رہے ہیں۔''

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ خیر خواہ انسان ہیں۔ آپ نے اپنی رائے کا اظہار خوب کھل کر کیا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اس وقت یا تو میرا بیٹا موجود ہے یا دیگر صحابہ کے بیٹے۔ اور میرا بیٹا ان کے بیٹوں سے زیادہ اہل ہے۔''

① تاریخ ابن خلدون: ۱/۲۶۳، مقدمہ
② البدایۃ والنھایۃ: ۱۱/۳۰۸، دار ھجر

اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں انعام واکرام دے کر رخصت کیا۔ ①

زیاد بن ابی سفیان کو بھی اس فیصلے پر اطمینان نہ تھا۔ تاریخ طبری میں ہے:

"جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کے لیے بیعت لینے کا ارادہ کیا تو زیاد کو خط لکھ کر مشورہ مانگا۔ زیاد نے عُبید بن کعب کو بلوا کر یہ ماجرا سنایا اور کہا: "امیر المؤمنین کو اس معاملے میں لوگوں کی مخالفت کا اندیشہ ہے اور وہ ان کی تائید چاہتے ہیں اور مجھ سے مشورہ مانگ رہے ہیں۔ یہ اسلام کا مسئلہ اور بڑی ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ یزید میں کچھ لاأبالی پن ہے اور وہ شکار کا بھی بہت شوقین ہے۔ تم امیر المؤمنین سے جا کر میری طرف سے یزید کے مشاغل سے آگاہ کر دو اور کہہ دو کہ وہ اس معاملے میں جلدی نہ کریں۔" عُبید نے کہا: "امیر المؤمنین کو اپنے بیٹے سے بددل کرنا مناسب نہیں، میں یزید سے جا کر ملتا ہوں، اسے بتاؤں گا کہ امیر المؤمنین اسے ولی عہد بنانے کا مشورہ کر رہے ہیں۔ وہ ایسے مشاغل کو چھوڑ دے تاکہ لوگوں کو حرف گیری اور مخالفت کا بہانہ نہ ملے۔"

زیاد نے اس رائے کی تائید کی اور عُبید کو یزید کے پاس روانہ کر دیا۔ عُبید کے سمجھانے پر یزید نے اپنی بہت سی (قابلِ اعتراض) عادات ترک کر دیں۔" ②

خراسان کے فاتح اور عراق کے مدبرِ اعظم اَحنف بن قیس رحمہ اللہ بھی یزید کی ولی عہدی سے متفق نہ تھے، جب ان سے رائے لی گئی تو ان کا جواب تھا: "یزید کے شب وروز اور ظاہر وباطن سے آپ زیادہ واقف ہیں۔ ہمارا کام ہے سننا اور ماننا۔ آپ کا کام ہے اُمت کی خیر خواہی کرنا۔" ③

اکابرِ مدینہ کے یزید کی ولی عہدی پر تحفظات:

یزید کی ولی عہدی کی سب سے زیادہ مخالفت اکابرِ مدینہ کی طرف سے تھی جن کا عالمِ اسلام کی سیاست میں اہم ترین کردار تھا۔ ان حضرات کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ اس طرح موروثی حکومت اور ملوکیت کی بنیاد پڑ جائے گی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اکابرِ مدینہ کو ہم آہنگ بنانے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے خاص طور پر عراق کے حاکم زیاد کو مدینہ منورہ بھیجا تاکہ وہ اہلِ مدینہ کو قائل کرے۔ زیاد نے تقریر کر کے لوگوں کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی مگر حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ (جن کی عمر اس وقت لگ بھگ اسی برس تھی) کھڑے ہو گئے اور بولے:

"اے بنو امیہ! تم ہماری تین باتوں میں سے کسی کو اختیار کر لو: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سنت کو لے لو۔ یہ معاملہ ان سب کو پیش آیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے گھرانے میں اس منصب کے اہل موجود تھے مگر انہوں نے معاملہ مسلمانوں کی جماعت کے سپرد کر دیا۔ تم قیصری نظام لانا چاہتے ہو کہ جب ایک قیصر مرے تو دوسرا مسلط ہو جائے۔" ④

---

① مسند ابی یعلی، ح: ۷۱۷۳، اسنادہ صحیح، ط دار المامون ② تاریخ الطبری: ۳۰۳/۵

③ البدایۃ والنہایۃ: ۳۰۷/۱۱ ④ التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمۃ، السفر الثالث: ۷۱/۲، ح: ۱۷۸۷، رجالہ ثقات

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کچھ مدت بعد یہی کام مروان کو سونپا جسے ۵۴ھ میں دوسری بار مدینہ کا حاکم بنایا گیا تھا۔

مروان نے یزید کی ولی عہدی کے حق میں دلیل دیتے ہوئے کہا: ''یہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سنت راشدہ ہے۔''

عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے پھر اعتراض کیا اور کہا:

''یہ قیصر ہرقل کا طریقہ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر اور برادری کو بھی چھوڑ کر بنوعدی کے ایک شخص (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کو فقط یہ دیکھ کر منتخب کیا کہ وہ اس کام کا اہل ہے۔''①

ان حضرات کے اختلاف رائے کے پیش نظر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خود مل کر انہیں حکمت وتدبیر کے ساتھ یزید کی بیعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ۵۶ھ میں وہ عمرے کے ارادے سے حجاز تشریف لے گئے۔② ان کی توجہ جن حضرات کی طرف تھی ان میں عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم اہم ترین تھے، مگر یہ تینوں یزید کی بیعت سے بچنے کے لیے مکہ روانہ ہوگئے۔③ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے پیچھے مکہ پہنچے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور فرمایا: ''ابن عمر! آپ کہا کرتے تھے کہ آپ کو ایک رات بھی کسی حکمران کے بغیر گزارنا پسند نہیں۔ دیکھیے! اب آپ کہیں کچھ ایسا نہ کر بیٹھیں کہ مسلمانوں میں انتشار اور فتنہ وفساد پیدا ہو جائے۔''

انہوں نے جواب دیا: ''بیٹے گزشتہ خلفاء کے بھی تھے، آپ کا بیٹا ان سے بڑھ کر نہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کے لیے وہ نہ سوچا جو آپ اپنے بیٹے کے لیے سوچ چکے ہیں، جہاں تک مسلمانوں میں انتشار اور فساد پھیلانے کی بات ہے تو میں ایسا کرنے والا نہیں۔ جب لوگ ایک فیصلے پر متفق ہو جائیں گے تو میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں گا۔''④

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا: ''ایک ہی وقت میں دو، دو افراد کی بیعت کیسے ہو سکتی ہے۔ آپ خود ہی تو یہ حدیث روایت کرتے ہیں کہ جب دو خلیفوں کی بیعت ہو تو دوسرے کو قتل کر دیا جائے۔''⑤

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس فیصلے کے خلاف تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ان سے بھی گفتگو ہوئی مگر کوئی ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکا۔ اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان حضرات کو ان کے حال پر چھوڑ کر شام تشریف لے گئے۔⑥

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول ہے:

''حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت حسین بن علی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کی بیعت نہیں کی تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں چھوڑ دیا تھا۔''⑦

---

① صحیح البخاری، ح:۴۸۲۷، کتاب التفسیر، باب الذی قال لوالدیہ اف لکما؛ مصنف ابن ابی شیبہ، ح: ۳۰۵۶۷؛ السنن الکبری للنسائی، ح:۱۱۴۲۷؛ تفسیر ابن ابی حاتم: ۲۲۴/۱۲

② تاریخ الطبری: ۵ص ۳۰۱ ③ التاریخ الاوسط للبخاری: ۱۰۳/۱ باسناد حسن ④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۱۳، ۲۱۴

⑤ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص۲۱۳؛ المعجم الاوسط، ح:۳۸۸۵ باسناد حسن؛ مجمع الزوائد، ح: ۹۰۱۱؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۳۱۴/۱۹

⑥ مجمع الزوائد، ح: ۹۰۰۹ ⑦ موسوعۃ اقوال الامام احمد: ۱۵۷/۳، ۱۵۸

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اختلاف رائے کی قدر کرتے تھے، تاہم اپنے طور پر وہ سمجھتے تھے کہ یزید کی تقرری میں بہتری ہے۔ آخر میں انہوں نے سرکاری عمائد کو دمشق بلاکر ان سے بات کی۔ مندوبین نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا اور پورے عالمِ اسلام میں نائبین کے ذریعے یزید کی ولی عہدی کی بیعت لے لی گئی۔ ①

یزید کی ولی عہدی پر جمہور علماء کا مسلک:

اس میں شک نہیں کہ یزید کو ولی عہد بنانے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مخلص اور اُمت کے خیر خواہ تھے اور ان کے نزدیک اس فیصلے کی کچھ وجوہ بھی تھیں تاہم اس بارے میں جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ اس مسئلے میں ان صحابہ کی رائے درست تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے۔ اگرچہ وقتی حالات کے تحت انعقادِ خلافت اس طرح بھی ہو جاتا ہے جیسے یزید کے معاملے میں ہوا۔ قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یقیناً افضل یہ تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس قضیے کو شوریٰ کے سپرد کر دیتے اور اپنے کسی رشتہ دار کو بھی اس کے لیے مقرر نہ کرتے چہ جائے کہ بیٹے کو۔ لیکن انہوں نے افضل صورت کو ترک کر دیا۔'' ②

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''جمہور اُمت کے محقق علماء ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست ثابت نہیں ہوا اور اس کی وجہ سے اُمت کے مصالح کو نقصان پہنچا۔'' ③

نیز فرماتے ہیں:

''جمہور اُمت کا کہنا یہ ہے کہ اس معاملے میں رائے انہی حضرات صحابہ کی صحیح تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے۔'' ④

حضرت شیخ الاسلام مدظلہ جمہور کے موقف کے دلائل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تو بے شک اپنے بیٹے کو نیک نیتی کے ساتھ خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا لیکن ان کا عمل ایک ایسی نظیر بن گیا جس سے بعد کے لوگوں نے نہایت ہی ناجائز فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اس کی آڑ لے کر خلافت کے مطلوبہ نظامِ شوریٰ کو درہم برہم کر ڈالا اور مسلمانوں کی خلافت بھی شاہی خانوادے میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

② بلاشبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں یزید کا فسق و فجور کسی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں، اس لیے اس کو خلافت کا اہل تو سمجھا جاسکتا تھا لیکن اُمت میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی جو نہ صرف دیانت وتقویٰ بلکہ ملکی

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۳۰۷؛ العقد الفرید: ۵/۱۱۷، ۱۱۸؛ مروج الذھب: ۳/۲۱۸، ۲۱۹، ط الجامعۃ اللبنانیۃ

② العواصم من القواصم، ص ۲۲۸، ط دار الجیل

③ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق: ص ۱۰۵ ④ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق: ص ۱۱۲

انتظام اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے بھی یزید کے مقابلے میں بدر جہا بلند مقام رکھتے تھے، اگر خلافت کی ذمہ داری ان کو سونپی جاتی تو بلاشبہ وہ اس سے کہیں بہتر طریقے پر اہل ثابت ہوتے۔ یہ درست ہے کہ افضل کی موجودگی میں غیر افضل کو خلیفہ بنانا شرعاً جائز ہے (بشرطیکہ اس میں شرائطِ خلافت موجود ہوں) لیکن افضل یہی ہے کہ خلیفہ ایسے شخص کو بنایا جائے جو تمام اُمت میں اس منصب کا سب سے زیادہ لائق ہو۔

③ نیک نیتی کے ساتھ بیٹے کو ولی عہد بنانا شرعاً جائز تو ہے لیکن موضعِ تہمت ہونے کی وجہ سے اس سے بچنا ہی بہتر ہے اور شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنا اپنے آپ کو ایک سخت آزمائش میں ڈالنا ہے۔ اس لیے تمام خلفائے راشدین نے اس سے پرہیز کیا۔ خاص طور پر حضرت عمر فاروق اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما نے تو لوگوں کے کہنے کے باوجود اپنے قابل اور لائق فرزندوں کو ولی عہد بنانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔‘‘①

ذاتی کردار کے لحاظ سے یزید کی اہلیت:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے سے متفق ہو کر جن لوگوں نے یزید کی ولی عہدی کو قبول کیا، ان کا موقف بھی شرعی حدود سے باہر نہ تھا۔ ولی عہدی کی شرائط کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یزید کا عاقل، بالغ، مسلمان، تندرست اور قریشی ہونا ظاہر ہے۔ وہ ایک جہادی مہم کا قائد اور امیرِ حج بھی رہ چکا تھا جس سے اس میں جنگجوئی اور انتظام کی کسی نہ کسی درجے میں صلاحیت ثابت ہوتی تھی۔ پس اس کے ظاہری حالات کو دیکھتے ہوئے یہ مان لینے کی گنجائش بھی موجود تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے۔ جبکہ کچھ حضرات یہ دیکھ رہے تھے کہ اس طرح معاملہ موروثی حکومت کی طرف جا رہا ہے اور اس وقت منصبِ خلافت کے بہترین حق دار اکابر صحابہ کرام موجود ہیں جن کی موجودگی میں یزید کی کوئی وقعت نہیں لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ یزید ولی عہد نہ بنے۔ شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں:

’’اگر اس ماحول کو پیشِ نظر رکھا جائے جس میں یہ خلافت منعقد ہو رہی تھی تو بلاشبہ یہ رائے قائم کرنے کی بھی پوری گنجائش تھی کہ وہ موجودہ حالات میں خلافت کا اہل نہیں۔ ظاہر ہے جس ماحول میں حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم وغیرہم جیسے جلیل القدر صحابہ، صلحائے اُمت اور مدبرین موجود ہوں، اس ماحول میں یزید کو خلافت کے لیے نااہل یا غیر موزوں سمجھنا کچھ بعید نہیں۔‘‘②

جہاں تک یزید کے شراب نوشی اور دوسری بدکاریوں میں ملوث ہونے کا سوال ہے، تو جو روایات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ان حرکتوں کا عادی تھا وہ سنداً و متناً غیر معتبر ہیں۔ جیسا کہ ایک روایت میں منقول ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کے پینے پلانے سے آگاہ ہو کر اسے مشورہ دیا تھا کہ یہ مشغلہ لوگوں سے چھپ کر کیا کرو۔ مذکورہ روایت سند کے ساتھ فقط تاریخ دمشق میں منقول ملتی ہے جبکہ اسے زیادہ شہرت البدایہ والنہایہ

① حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۱۴، ۱۱۵ ② حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، ص ۱۱۳

میں نقل ہونے کے باعث ملی ہے۔ یہاں طعن صرف یزید پر نہیں ہے بلکہ ایک صحابی پر گناہِ کبیرہ کی اجازت دینے کا الزام عائد ہو رہا ہے۔ یہ روایت سنداً بھی شدید ضعیف ہے، اس لیے ہرگز قابلِ اعتماد نہیں۔ ① ہم اسلاف کا یہ اصول بیان کر چکے ہیں کہ طعنِ صحابی پر مبنی ضعیف روایت ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگی۔

یاد رہے کہ یہ گفتگو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یزید کے کردار سے متعلق ہے۔ حکمران بننے کے بعد یزید کا اپنے والد گرامی کی وصیتوں کو بھلا دینا اور فسق و فجور میں مبتلا ہونا ایک الگ بحث ہے۔ جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ فسق میں ملوث تھا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ کیا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو اپنے روبرو خلیفہ کیا ہے یا نہیں؟ حضرت رحمہ اللہ نے جواباً تحریر فرمایا:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو خلیفہ کیا ہے۔ اس وقت یزید اچھی صلاحیت میں تھا۔" ②

ہاں خلیفہ بننے کے بعد یزید کی بعض زیادتیاں صحیح روایات سے ثابت ہیں۔ یہ وہ اقدامات تھے جنہوں نے سانحۂ کربلا، وقعۂ حرہ اور حصارِ مکہ جیسے سانحوں کو جنم دیا۔ نیز بعض مدنی صحابہ اور تابعین کے ایک جمِ غفیر کا یزید کے فسق پر یقین کر کے اس کے خلاف خروج کرنا صحیح السند بلکہ متواتر ہے۔ ان حضرات کے یقین پر چودہ صدیاں بعد والے اپنے حسنِ ظن کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور علمائے اسلام "فسقِ یزید" پر متفق رہے ہیں اور اس کے فسق کی روایات کو قابلِ استدلال مانتے رہے ہیں۔ اگرچہ یزید پر بعض جھوٹے الزامات بھی لگائے گئے اور ایسے الزامات کے دفاع میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سب سے پیش پیش رہے مگر وہ بھی فرماتے ہیں:

"اس کے باوجود یزید میں ظلم کا مادہ جو تھا، وہ تو تھا۔ پھر یزید اور یہ حضرات (مدینہ کے صحابہ و تابعین) باہم نبرد آزما ہوئے اور اس نے حرہ والوں کے ساتھ برا سلوک کیا۔" ③

نیز وہ فرماتے ہیں:

"جو بندہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ کبھی یزید اور اس جیسے غیر عادل حکمرانوں کے ساتھ ہونا پسند نہیں کرے گا۔" ④

❁❁❁

① اس روایت کے راوی محمد بن زکریا الغلابی (م ۲۸۱ھ) کو اکثر ائمہ جرح و تعدیل نے ضعیف قرار دیا ہے جبکہ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے انہیں روایت ساز کہا ہے۔ فقط ابن حبان رحمہ اللہ نے الغلابی کا ذکر "الثقات" میں کیا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ ثقہ سے نقل کریں مگر یہاں وہ اسے سلیمان بن احمد واسطی (م ۲۴۰ھ) سے نقل کر رہے ہیں جنہیں امام نسائی رحمہ اللہ نے ضعیف، یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے کذاب، ابن عدی رحمہ اللہ نے سارق الحدیث کہا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کے بقول وہ آخر میں لہو لعب اور پینے پلانے کے باعث متروک ہو گئے تھے۔ (میزان الاعتدال: ۳ص ۵۵۰؛ ۲ص ۱۹۳)

② تالیفات رشیدیہ، ص ۲۴۲

③ "مع انہ کان فیہ من الظلم ما کان ثم انہ اقتتل ہو وہم وفعل باھل الحرۃ امورا منکرۃ" (منہاج السنۃ: ۱/۱۱۱)

④ ومن آمن باللہ والیوم الآخر لا یختار ان یکون مع یزید ولا مع امثالہ من الملوک الذین لیسوا بعادلین۔ (مجموع الفتاویٰ: ۳/۴۸۳)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت اور حکومت کی خوبیاں

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ رجب ۶۰ ہجری میں دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ راجح قول کے مطابق یہ ۴ رجب کا واقعہ ہے۔ ① آپ رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت بڑا بابرکت تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے زیرِ سایہ عالمِ اسلام میں کتاب وسنت کا قانون نافذ تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے کردار اور دورِ حکومت کی خوبیوں کی ایک جھلک پیش خدمت ہے:

نصیحت کی قدر: آپ ایک عادل حکمران تھے اور خیر خواہی پر مشتمل ہر اچھے مشورے کو قبول فرماتے تھے۔ آپ گزشتہ خلفاء پر قاتلانہ حملوں کے تجربات کے پیش نظر اپنے لیے پہرہ لگوایا کرتے تھے، اس وجہ سے ہر وقت ہر کوئی آپ سے آزادانہ نہیں مل سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک بار ایک صحابی آپ کے پاس گئے اور فرمایا: ’’میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس شخص کو اللہ لوگوں کا ذمہ دار بنائے اور پھر وہ اپنے اور مسلمانوں کی ضروریات اور مسائل کے درمیان پردے حائل کرلے تو اللہ اس کے مسائل اور اپنے درمیان پردے حائل کردے گا۔‘‘ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ سنتے ہی ایک شخص کو مقرر کردیا کہ وہ لوگوں کی ضروریات اور مسائل ان تک پہنچاتا رہے۔ ②

عدل وانصاف اور امن وامان: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مدینہ منورہ میں کچھ زمین تھی اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھتیجے حضرت عبدالرحمن نے اپنے استحقاق کا دعویٰ کردیا۔ اس سلسلے میں وہ دمشق جاکر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ملے۔ آپ نے ان کا دعویٰ سن کر بڑی خوش دلی سے فرمایا: ’’اس بارے میں فضالہ بن عبید (قاضی) جو فیصلہ کریں وہ ہمیں منظور ہوگا۔‘‘ فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ نے فریقین کے بیانات سن کر حضرت عبدالرحمن کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے خوشی سے قبول کیا اور اپنی زمین سے دستبردار ہوگئے۔ ③

مدینہ طیبہ کے حاکم مروان بن حکم نے حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے بیٹے کی تنخواہ اس لیے بند کردی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالفین کی تحریک سے متاثر رہے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو مروان کو لکھا:

’’تم نے صہیب کے بیٹے کا حضرت عثمان سے معاملہ تو یاد رکھا مگر اس کے باپ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق بھول گئے۔ صہیب کے فرزند کی تنخواہ جاری کرو۔ اس کی عزت کرو اور اچھا سلوک برتو۔‘‘ ④

عدل وانصاف کا سایہ ہر شہری کے لیے عام تھا، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ دمشق میں نصرانیوں کا ایک گرجا مسجد سے ملا ہوا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مسجد کی توسیع کے لیے گرجا لینا چاہتے تھے مگر نصرانیوں نے اسے دینے سے انکار

---

① البدایہ والنہایہ: ۱۱ ص ۴۵۸، ۴۵۹

② سنن ابی داؤد، ح: ۲۹۴۸، کتاب الخراج والامارۃ، باب فی مایلزم الامام من امر الرعیۃ والحجبۃ عنہ

③ انساب الاشراف، بلاذری: ۱۳۲/۵، ط دار الفکر

④ انساب الاشراف، بلاذری: ۱۰۸/۵، ط دار الفکر

کر دیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان پر کوئی سختی نہ کی اور ان کی مرضی کے خلاف مسجد کی توسیع نہ کرائی۔ ①

عدل وانصاف کی بالادستی کے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑے بڑے نامور صحابہ کرام کو جو علم وفقاہت، زہد وتقویٰ اور حکمت وتدبر میں ممتاز ہونے کے ساتھ ساتھ حق گوئی میں بھی نمایاں تھے، مختلف شہروں میں قاضی مقرر کیا۔ دارالخلافہ دمشق میں حضرت فضالۃ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے۔ ②

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مدینہ میں اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بصرہ میں قاضی مقرر تھے۔

کوفہ میں قاضی حضرت شریح رحمہ اللہ تھے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے اس منصب پر چلے آرہے تھے۔ قیامِ امن کو یقینی بنانے کے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے محکمہ شرطہ (پولیس) کو جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے شروع ہوا تھا، مزید بہتر بنایا۔ خراسان سے مصر تک چوری چکاری، ڈاکے اور بدامنی کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ پولیس کی نگرانی پہلے حضرت یزید بن حرہ، پھر حضرت قیس بن حمزہ اور پھر حضرت ذہل بن عمرو کے سپرد رہی۔ ③

دیوان الخاتم: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے پہلے سرکاری خطوط اور حکم نامے کھلے ورق کی شکل میں روانہ کیے جاتے تھے۔ ان میں تحریر کے نیچے خلیفہ یا امیر کی مہر کا ہونا کافی سمجھا جاتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کسی شخص کو ایک لاکھ درہم یا دینار وصول کرنے کا رقعہ لکھ کر دیا۔ اس نے رقعے کی تحریر میں تبدیلی کر کے سرکاری دفتر سے دو لاکھ وصول کر لیے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے جب حساب آیا تو آپ نے تحقیق کرائی۔ معلوم ہوا کہ اصل تحریر میں تبدیلی کر کے ایک کی جگہ دو لاکھ وصول کر لیے گئے۔ تب آپ نے آیندہ ایسی جعل سازی کے سدباب کے لیے ایک نیا طریقہ کار وضع کیا، جس کے تحت ہر سرکاری تحریر یا حکم نامے کو مہر بند لفافے میں (سیل کرا کے) بھیجا جانے لگا۔ جس دفتر میں سرکاری حکم ناموں کو مہر بند کیا جاتا تھا اسے ''دیوان الخاتم'' کا نام دیا گیا۔ ④

حراسہ (محافظ دستہ): اس سے پہلے خلفاء کی حفاظت کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں ہوا کرتا تھا۔ دشمنوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو شہید کیا تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی پہرہ نہ ہونے کی وجہ سے حملے میں زخمی ہوئے تھے۔ خود حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اس قسم کی وارداتوں سے پورے عالم اسلام کی چولیں ہل جایا کرتی تھیں۔ اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مزید نقصانات سے بچنے کے لیے حراسہ (محافظ دستے) کا شعبہ قائم کیا، جس کا سربراہ حضرت ابو مخارق کو مقرر کیا۔ ⑤

حجابہ: گزشتہ ادوار میں ہر شخص جب موقع پاتا خلیفہ سے مل لیا کرتا تھا۔ ان میں معمولی ضرورتوں والے لوگ بھی ہوا کرتے تھے اور وقت ضائع کرنے والے بھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے وقت کی حفاظت اور نظام کی بہتری کے لیے ایک نئی ترتیب بنائی جس کے تحت لوگوں کو خلیفہ سے خصوصی ملاقات کے لیے اجازت اور وقت لینا ضروری قرار دیا

---

① فتوح البلدان: ۱ص ۱۲۹ ② اسد الغابۃ: ۴ص ۳۳۶

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص: ۲۲۷، ۲۲۸ ④ تاریخ الخلفاء: ص ۱۵۳ ⑤ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱ص ۳۶۵

گیا۔ اس کام کے ذمہ دار افسر کو حاجب اور اس انتظام کو ''حجابة'' کہا جاتا تھا۔①

ردائے نبوی علامتِ خلافت: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور تک نبی اکرم ﷺ کی انگشتری اور عصائے مبارک خلافت کی علامت ہوا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اصل انگشتری مبارک کھو گئی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی نقل بنوائی۔ نگران کی شہادت کے ہنگامے میں وہ بھی غائب ہو گئی۔ یوں عصائے نبوی ہی خلافت کی علامت رہ گیا۔② حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی وہ بابرکت چادر چالیس ہزار درہم میں خرید لی جو انہیں مشہور نعت ''بانت سعاد'' پڑھنے پر دربارِ رسالت سے عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ چادرِ مبارک بنو اُمیہ اور بنو عباس کے ہر خلیفہ کے پاس علامتِ خلافت کے طور پر منتقل ہوتی رہی۔③

نئے قلعے اور چھاؤنیاں: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی ملک کے استحکام و دفاع کے لیے ترقیاتی کام کرائے۔ نئی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور کئی نئے قلعے بنوائے۔ شام کے ساحل پر خاص توجہ دی۔ ساحل پر جَبَلَہ نامی تباہ شدہ رومی قلعے کو آپ نے از سر نو تعمیر کرا کے فوج کا بڑا مرکز بنا دیا۔ لاذِقِیَہ اور اَنطَرطُوس کو شہروں کی شکل میں آباد کرایا۔④ آپ کے دور میں قلعہ مَرعَش تعمیر ہوا جو مضبوطی میں ضرب المثل تھا۔⑤ بُلُنیاس کی آبادی بھی آپ کا کارنامہ ہے۔⑥

جہاز سازی کے نئے کارخانے: آپ سے پہلے جہاز سازی کے کارخانے صرف مصر میں تھے، آپ نے سن ۴۹ ہجری میں شام میں نئے کارخانے قائم کرنے کا حکم دیا، چنانچہ دور دراز سے انجینئر، کاریگر اور بڑھئی جمع کیے گئے اور شام کے ساحلی شہر عکا پر جہاز سازی کا کام زور و شور سے شروع ہوا۔⑦

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وصیتیں:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اُمت کے لیے خیر خواہی کا اندازہ اُن نصائح سے ہوتا ہے جو آپ نے یزید کو کیں۔ آپ چاہتے تھے کہ یزید کے دور میں ہر طرف امن و امان ہو اور کسی پر کوئی زیادتی نہ ہو۔ اس لیے آپ نے یزید کو کہا:

- اللہ سے ڈرتے رہنا۔ میں نے تمہارے لیے امرِ خلافت طے کر دیا۔ تم ان کے ذمہ دار بنا دیے گئے ہو۔
- اگر بھلائی سے رہو گے تو یہ میری سعادت ہوگی۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو یہ تمہاری بدبختی ہوگی۔
- لوگوں سے نرمی کا معاملہ کرنا۔
- تمہیں اپنی توہین و تنقیص کی جو باتیں پہنچیں انہیں نظر انداز کر دینا۔
- شرفاء کے ساتھ سختی نہ برتنا۔ ان کی ہتکِ عزت سے بہت بچنا۔ انہیں اپنے قریب رکھنا۔
- جب بھی کوئی اہم معاملہ پیش آئے تو عمر رسیدہ، تجربہ کار، نیک اور پرہیزگار افراد سے مشورہ لینا۔ ان کی

---

① البدایة والنہایة: ۱۱ ص ۴۶۵

② تاریخ الطبری: ۴ ص ۳۶۶، ۴۲۸　③ المختصر فی اخبار البشر: ۱ ص ۱۳۸

④ فتوح البلدان، ص ۱۳۵، ط الہلال، معجم البلدان: ۱/ ۲۷۰　⑤ فتوح البلدان: ۱ ص: ۱۸۸

⑥ فتوح البلدان: ۱ ص ۱۳۵　⑦ فتوح البلدان: ۱ ص ۱۲۰

رائے کی مخالفت نہ کرنا۔

❁ اپنی رائے پر کبھی اصرار نہ کرنا کیوں کہ صرف ایک ذہن میں آنے والی رائے صحیح نہیں ہوا کرتی۔

❁ اپنے نفس کی اصلاح کا اہتمام کرنا، لوگ بھی تمہارے ساتھ درست چلیں گے۔

❁ لوگوں کو کبھی کسی اعتراض کا موقع مت دینا کہ لوگ بری بات کو تیزی سے پھیلایا کرتے ہیں۔

❁ نماز باجماعت کی پابندی کرتے رہنا۔

❁ اگر ان نصیحتوں پر عمل کرو گے تو لوگ اپنے اوپر تمہارا حق سمجھیں گے اور تمہاری حکومت طاقتور ہوگی۔''①

غور کریں تو یہ قیمتی وصایا کسی بھی حکمران، کسی بھی ادارے کے سربراہ اور کسی بھی تحریک کے قائد کے لیے یکساں مفید ہیں۔ نیز عام مسلمانوں کے لیے بھی ان کی افادیت کم نہیں۔

یاد رہے کہ بے بنیاد روایات میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یزید کو وصیت کی تھی کہ وہ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اہمیت نہ دے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر قابو پا کر نرمی برتے اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ یہ روایات ابو مخنف اور ہشام کلبی کی ہیں جو غیر معتبر راوی تھے۔ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف یہ جھوٹی وصیتیں منسوب کر کے انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ معتبر وصیت وہ ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔

یزید کی ولی عہدی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ:

حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ پر سب سے مشہور اعتراض یہی ہے کہ انہوں نے یزید کو ولی عہد بنا دیا جو ظالم حکمران ثابت ہوا۔ اس بارے میں گزشتہ صفحات میں ضروری وضاحت آ گئی ہے۔ اُس پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو ولی عہد بنانا ایک تجربہ یا ایک ''ٹیسٹ کیس'' تھا جس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ بعد کے نتائج سے ہو سکتا تھا۔ امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ عالم الغیب نہ تھے کہ بعد کے المناک حالات کو دیکھ لیتے اور اپنے فیصلے کو تبدیل کر دیتے۔ وہ اس تجربے کے نتائج کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے تھے۔ تجربے کو ناکام کہا جا سکتا ہے مگر اس کی بناء پر امیر مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی نیت پر شک کرنا، شرافت اور انصاف سے بعید ہے۔

لوگوں میں یہ بھی مشہور ہے کہ یزید کی ولی عہدی کا خیال ذاتی مفادات پر مبنی تھا اور حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ کے کہنے پر یزید کی ولی عہدی کا فیصلہ کیا مگر یہ بات درست نہیں؛ کیوں کہ حضرت مُغیرَہ بن شُعبَہ رضی اللہ عنہ کی وفات سن ۵۰ھ میں ہوئی اور یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ سن ۵۶ھ میں شروع ہوا۔

---

① الطبقات الکبرٰی لابن سعد، جزء متمم الصحابۃ، الطبقۃ الرابعۃ: ۱ص ۱۴۳، ۱۴۴؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۴۴۴، ۴۴۵

افسوس کہ یزید نے اپنے والد گرامی رضی اللہ عنہ کی ان قیمتی نصیحتوں کا ذرا بھی خیال نہ کیا جس کے باعث اس کے دور میں طرح طرح کے فتنے پھوٹے اور اس کا زمانہ اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کا ایک افسوس ناک باب بن گیا۔

یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت کے لیے صحابہ کی وفاداریاں رشوت دے کر خریدنے کی کوشش کی۔ ایسی اکثر روایات ضعیف بلکہ موضوع ہیں، البتہ صحیح سند کی ایک دو روایات ہیں مگر ان کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کا ان بزرگوں کو عطیات اور ہدیے دینے کا معمول تھا۔ یزید کی ولی عہدی والے سال بھی ہدایا ارسال کیے۔ کچھ مدت بعد جب یزید کی بیعت کا مطالبہ پیش کیا (جس کا درحقیقت اس ہدیے سے کوئی تعلق نہ تھا) تو یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ وہ رقم دراصل سیاسی رشوت تھی جس کا مقصد اس تحریک میں ہم نوائی حاصل کرنا تھا۔ حالاں کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ کی نیت یہ نہیں تھی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت مُعاویہ رضی اللہ عنہ نے مکر و فریب اور جبر و تشدد کے بل بوتے پر بیٹے کے حق میں استصواب رائے کرایا۔ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم جیسے اکابر کو ڈرایا دھمکایا، لالچ بھی دیا، ان کے سر پر شمشیر بکف جلاد کھڑے کر دیے کہ اگر یہ نفی کریں تو سر کاٹ دینا، پھر مجمع عام میں جا کر جھوٹا اعلان کر دیا کہ ان حضرات نے بیعت کر لی ہے۔ ایسی روایات سنداً و متناً ناقابلِ اعتماد ہیں۔ ①

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کی اصل حیثیت:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کی جو تصویر ہم نے معتبر روایات کی روشنی میں پیش کی ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا دورِ حکومت بھی شریعت کی پابندی، عدل و انصاف، قومی ہمدردی، خدا ترسی، عوامی حقوق کی پاسداری اور ملت کی نگہبانی کے اعتبار سے قابلِ رشک اور بلاشبہ ''خلافتِ عادلہ'' تھا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حضرات خلفائے راشدین کے دور کے تیس سال ختم ہونے پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت آتے ہی یکدم خلافت کی جگہ ملوکیت، عدل کی جگہ ظلم، نیکی کی جگہ فسق و فجور، ایثار کی جگہ خود غرضی اور ہمدردی کی جگہ اقرباء پروری نے لے لی۔

تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ان کا دور بالکل خلفائے راشدین کے دور کے مطابق تھا اور اس میں خیر و برکت، ایثار و قربانی اور سادگی و قناعت کا وہی معیار تھا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں تھا۔ بلکہ زمانے کے تغیر، حالات کی تبدیلی، لوگوں کی معاشی حیثیت میں ترقی، نومسلم آبادی کی کثرت، اکابر صحابہ کی رخصتی اور زمانۂ نبوت سے بُعد سمیت متعدد وجوہ سے نہ تو اسلامی معاشرہ بالکل اسی معیار پر تھا نہ نظامِ حکومت۔ یہ تغیر و تبدل بالکل فطری اور قدرتی تھا۔ چونکہ اس دور میں گزشتہ زمانے جیسی اعلیٰ ترین مراتب والی شخصیات نہ تھیں اس لیے سابقہ خیر و برکت کی توقع بھی اس دور میں نہیں کی جا سکتی تھی۔ گزشتہ دور سے اس دور کا یہ فرق نہ صرف قابلِ قبول تھا بلکہ بعد والوں کے لیے اس کا معیار قابلِ رشک اور اس کی برابری کرنا مشکل تھا۔ ہاں جن لوگوں نے حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور کے ورع و تقویٰ اور امانت و احتیاط کا مشاہدہ کیا تھا انہیں کچھ نہ کچھ کمی محسوس ہوتی تھی اور بعض اوقات وہ اس تغیر

① ان شبہات کے جوابات زیادہ تفصیل سے تاریخ اُمتِ مسلمہ حصہ دوئم، ازالۂ شبہات میں آ گئے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ اساتذہ اس مقام کو دیکھ لیں اور طلبہ کو کچھ ضروری حوالے نوٹ کروا دیں۔

پرنا گواری کا اظہار بھی کر دیتے تھے تاہم جو بھی تبدیلی تھی وہ زمانے کا فطری تقاضا تھی اور حدِ جواز کے اندر ہی تھی۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس فرق کی حیثیت یوں واضح فرماتے ہیں:

''اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے کا موازنہ بعد والوں سے کیا جائے تو نہ کوئی مسلمان حکمران ان سے بہتر گزرا، نہ عوام کسی زمانے میں اتنے بہتر رہے۔ ہاں اگر ان کا موازنہ حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانے سے کیا جائے تو مراتبِ فضیلت کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔''[①]

علامہ عبدالعزیز فرہاری رحمہ اللہ کی تحریر سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کی اس حیثیت کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''اہلِ خیر کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت ہوتی ہے۔ ہر درجہ اپنے سے بلند درجے کے لحاظ سے قابلِ اعتراض بن جاتا ہے۔ اسی لیے مقولہ مشہور ہے کہ ''نیک لوگوں کی نیکیاں مقرب حضرات کی برائیاں شمار ہوتی ہیں''۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو ارشاد منقول ہے کہ ''میں روزانہ ستر بار استغفار کرتا ہوں'' تو اس کی تشریح بعض اکابر نے اس طرح فرمائی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات میں ہر آن ترقی ہوتی رہتی تھی، اور آپ جب بھی ترقی کا کوئی اگلا درجہ پاتے تو (گزشتہ درجہ اس کی بہ نسبت کی کوتاہی پر مشتمل محسوس ہوتا لہٰذا اس) گزشتہ درجے پر استغفار کرتے۔ جب یہ بات واضح ہوگئی تو ہم کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین نے مباحات میں توسع سے کام نہیں لیا۔ ان کی سیرت تنگ عیشی اور مجاہدے کے لحاظ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے مشابہ تھی۔

جہاں تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے اگرچہ انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا لیکن مباحات میں توسع اختیار کیا۔ حقوقِ خلافت کی ادائیگی میں وہ خلفائے راشدین کے درجے کے نہیں تھے۔ تاہم ان حضرات کی برابری نہ کر سکنا، ان کے لیے کسی اعتراض کا سبب نہیں۔''[②]

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم اس بحث کا خلاصہ نہایت جامعیت کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور خلفائے راشدین کے عہدِ حکومت میں فرق تو بے شک تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت اس معیار کی نہیں تھی، جو خلفائے راشدین کو حاصل تھا، لیکن جمہورِ اُمت کے نزدیک یہ فرق اتنا بڑا نہیں تھا کہ ایک طرف تقویٰ ہو، دوسری طرف فسق وفجور، یا ایک طرف عدل ہو، اور دوسری طرف ظلم وجور۔ بلکہ یہ فرق عزیمت ورخصت کا، تقویٰ اور مباحات کا، احتیاط اور توسع کا، اور اصابتِ رائے اور قصورِ اجتہاد کا فرق تھا۔''[③]

❁❁❁

---

① منہاج السنۃ: ۶/۲۳۲
② النبراس علی شرح العقائد: ص ۵۱۰، طرشیدیہ ③ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق: ص ۱۴۹، ۱۵۰

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ بنواُمیہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ خلفائے راشدین کے دور میں ان کے اہم عہدے دار کون تھے؟

❷ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب بیان کیجیے۔

❸ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں وسطِ ایشیا کی فتوحات پر روشنی ڈالیے۔

❹ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں خوارج کی بغاوت کو کیسے فروکیا؟

❺ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت کے ترقیاتی کاموں اور ادارہ جاتی جدتوں پر ایک نوٹ لکھیے۔

❻ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں بازنطینی روما کے خلاف جہاد کی کون کون سی اہم مہمات انجام دی گئیں۔

❼ یزید کی ولی عہدی کے بارے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا موقف کیا تھا؟ اور ولی عہدی کے مخالف حضرات کیا فرماتے تھے۔ جمہور علمائے اُمت کا اس پر کیا موقف ہے؟ دلائل کے ساتھ پیش کیجیے۔

❽ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو کیا وصیتیں کی تھیں؟

عملی کام:

❁ ایک چارٹ بنا کر اس پر قریش کے اہم قبائل کے نام خوش خط لکھیے۔

❁ ایسا نقشہ دیکھیے جس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کی اہم فتوحات کی نشاندہی کی گئی ہو۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق، از شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

❁ دفاعِ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، از حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ

❁ تاریخ اُمتِ مسلمہ، حصہ دوم، از الۂ شبہات

❁ معاویۃ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، کشف شبہات وردّ مفتریات، للشیخ شحاتۃ محمد صقر

❁❁❁

دوسرا باب

عہدِ یزید بن معاویہ

رجب ۶۰ھ......تا......ربیع الاول ۶۴ھ

اپریل ۶۸۰ء......تا......اکتوبر ۶۸۳ء

تعارف:

یزید اسلامی تاریخ کا وہ پہلا سربراہِ حکومت ہے جو نہ صرف تقویٰ و پرہیزگاری اور علم و فضل کے لحاظ سے ممتاز نہ تھا بلکہ سیاسی سمجھ بوجھ اور دانش و تدبر سے بھی محروم تھا۔ اس کا دور المیوں اور حوادث سے بھرپور ہے۔ اس دور میں سانحۂ کربلا، وقعۂ حرّہ اور حصارِ کعبہ جیسے واقعات مسلمانوں کے لیے انتہائی اذیت ناک تھے۔

اہداف:

اس باب کو پڑھ کر آپ ان شاء اللہ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1. سانحہ کربلا، سانحۂ حرہ اور سانحۂ حصارِ کعبہ کو صحیح روایات کی روشنی میں سمجھ سکیں۔
2. حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقاصد اور اہداف سے آگاہ ہو سکیں۔
3. یزید کی بیعت کرنے والے صحابہ و تابعین کے موقف سے واقف ہو سکیں۔
4. یزید کے کردار کے متعلق جمہور علمائے اُمت کی آراء کا جائزہ لے سکیں۔
5. یزید کے دور میں آنے والی تبدیلیوں پر غور کر سکیں۔

(یونٹ:2.1)

عہدِ یزید بن معاویہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت ان کا جانشین یزید ''حمص'' کے مضافاتی قلعے ''حُوّارِین'' میں تھا۔ اس سانحے کی خبر سن کر وہ دار الخلافہ آیا، تب تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تدفین ہو چکی تھی۔ یزید نے مملکت کے عمائد اور اہلِ دمشق سے تعزیتی خطاب کرتے ہوئے حمد وثنا کے بعد کہا:

''معاویہ رضی اللہ عنہ بلاشبہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے تھے، اللہ نے ان پر انعام واکرام کیا اور پھر اپنے پاس بلالیا۔ وہ بعد والوں سے بہتر اور پہلے والوں سے فروتر ہیں۔ میں انہیں اللہ کے یہاں معصوم قرار نہیں دیتا کہ وہی ان کا حال بہتر جانتا ہے۔ اگر ان کی بخشش ہوگی تو اللہ کی رحمت سے اور اگر پکڑ ہوگی تو ان کی اپنی لغزش کی وجہ سے۔ ان کے بعد ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔ میں نے خود اس کی کوشش نہیں کی۔ مگر جو اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ آپ اللہ کا ذکر اور استغفار کریں۔''[1]

بیعت لینے کی کوشش:

جب یزید بن معاویہ نے تخت سنبھالا تو پورے عالم اسلام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کی اطلاع کے لیے تیز رفتار سوار اور یزید کی بیعتِ خلافت کے لیے نمائندے روانہ کر دیے گئے۔[2]

اکثر صحابہ وتابعین کی بیعت کا سبب:

اکثر صحابہ کرام اور تابعین نے یزید کی بیعت کر لی۔ وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بعض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دلائل اور اجتہاد سے متفق تھے اور کچھ نے شریعت کے ایک دوسرے حکم کی پیروی میں بیعت کر لی تھی۔ وہ حکم ہے اتحاد واتفاق کو برقرار رکھنا اور افتراق سے گریز کرنا جو قرآن وحدیث کی متعدد نصوص میں موجود ہے۔ اس اہم حکم کو پورا کرنے کے لیے بعض حالات میں معمول سے ہٹ کر کسی غیر افضل صورت کو ناگواری کے باوجود اختیار کر لیا جاتا ہے۔

تاہم یزید کو حجاز کے اکابر سے عدمِ تعاون کا خدشہ تھا جن کے پیشوا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ جب لوگ بیعت کر لیں گے تو میں بھی کر لوں گا۔ حاکم مدینہ ولید بن عتبہ نے ان پر دباؤ نہ ڈالا۔ کچھ توقف کے بعد انہوں نے بیعت کر لی۔[3] یزید کی بیعت کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا:

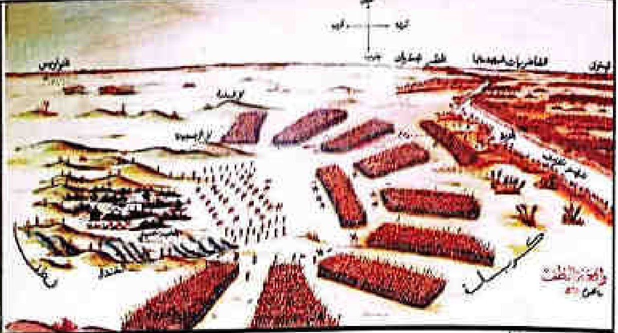
---

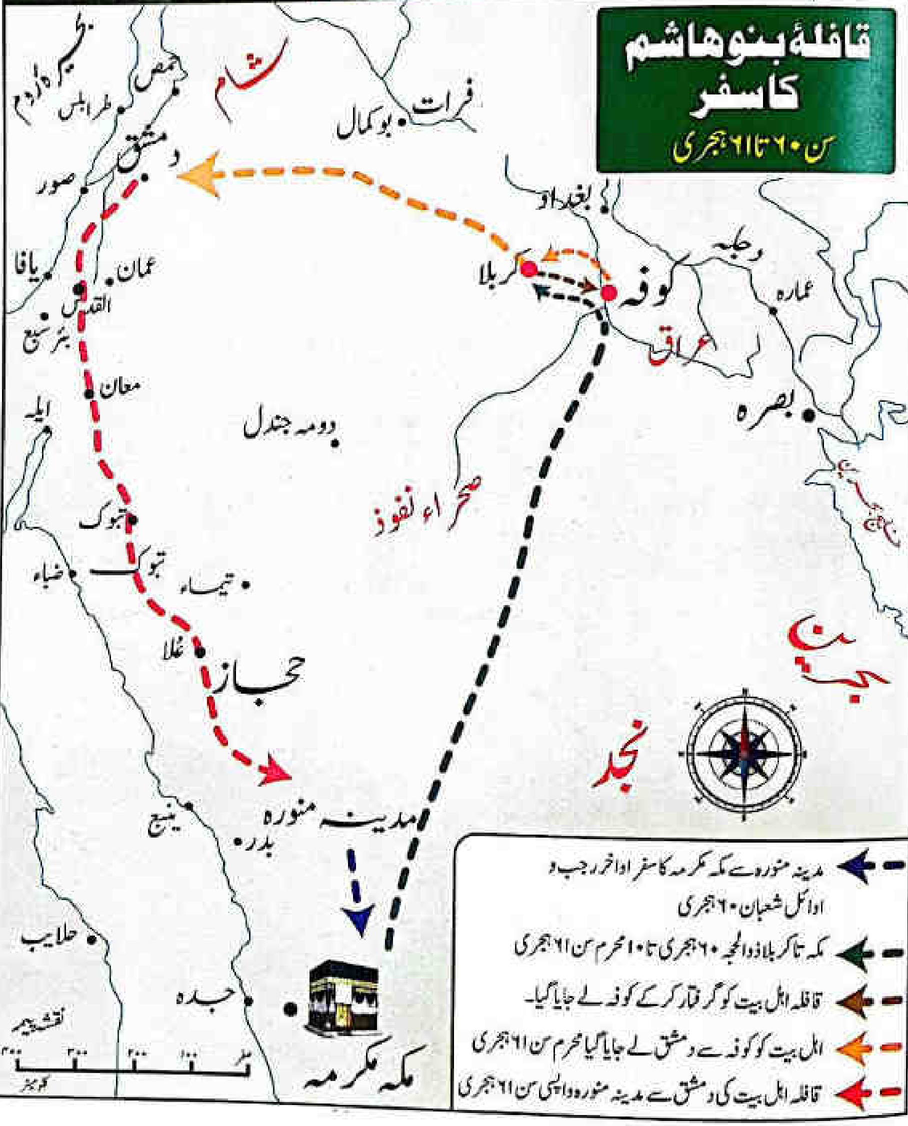
① البدایہ والنہایہ: ۱۱ ص ۳۵۹؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۶۲/۳

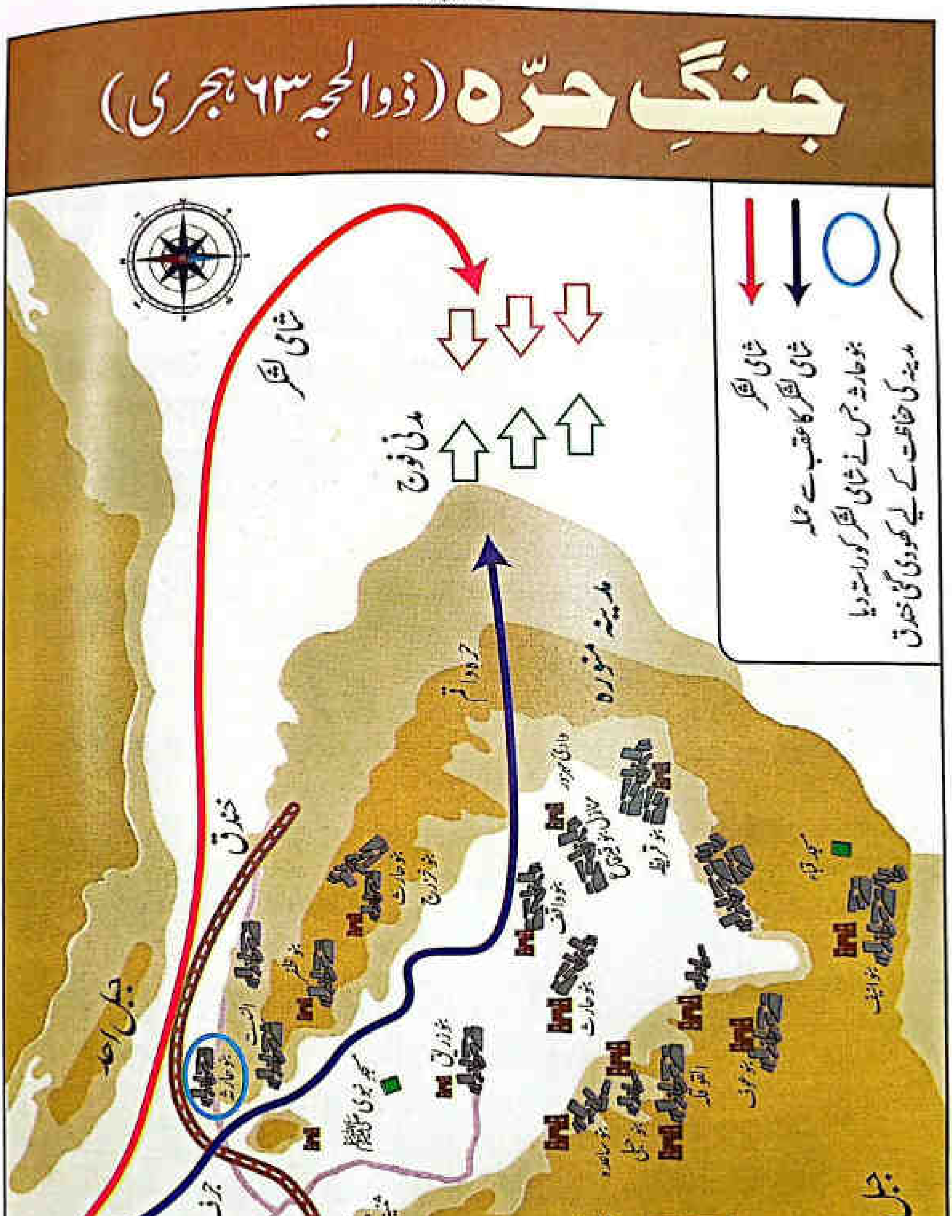
② تاریخ الطبری: ۵ ص ۳۲۷

③ انساب الاشراف: ۳۰۱/۵؛ السنن الکبریٰ للبیہقی، ح: ۱۶۶۳۲، ۱۶۸۰۹، ط العلمیۃ

واقعۂ کربلا کا ایک تصوراتی خاکہ






جنگِ حرّہ (ذوالحجہ ۶۳ ہجری)
شامی لشکر
شامی لشکر کا عقب سے حملہ
بنو حارثہ جس نے شامی لشکر کو راستہ دیا
مدینہ کی حفاظت کے لیے کھودی گئی خندق
مدینہ منورہ
جبل احد
خندق
وادی عقیق
جبل عیر
مسجد نبوی

"اگر اس (بیعت) میں خیر ہوئی تو ہم راضی ہیں، آزمائش ہوئی تو صبر کریں گے۔" ①

اس موقع پر ایک اور صحابی نے فرمایا: "تم کہتے ہو کہ یزید اُمتِ محمدیہ کا بہترین فرد نہیں، علم وفقاہت اور مرتبے میں سب سے اعلیٰ نہیں، میں بھی یہی کہتا ہوں مگر واللہ! میں اُمت کے اتحاد کو اس کے منتشر ہونے پر ترجیح دیتا ہوں۔" ②

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا موقف:

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے نظامِ سیاست میں موروثی حکومت کا رواج قائم ہو جانے کے خطرے کے پیشِ نظر یزید کی بیعت نہیں کی تھی۔ ان کے خیال میں موروثی حکومت سے آگے چل کر متعدد مفاسد پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ خلفائے راشدین کے دور کی وسیع البنیاد شورائیت کو واپس لانا چاہیے اور امت کی زمامِ اقتدار کو افضل فرد کے سپرد کر دینا چاہیے۔ ان دونوں کے نزدیک ایسے حالات میں بیعت کر لینا رخصت کے زمرے میں تو آ سکتا تھا مگر عزیمت کی بات یہی تھی کہ طرزِ سیاست کو خلفائے راشدین کے شورائی منہج پر لوٹانے کی کوشش کی جائے بشرطیکہ مسلمانوں میں خانہ جنگی کی نوبت نہ آئے۔ اس کوشش کا کم از کم درجہ اپنے اختلافِ رائے پر برقرار رہتے ہوئے بیعت سے گریز کرنا تھا تاکہ وہ اپنے ضمیر کی رائے کے خلاف کسی قول وفعل کے مرتکب نہ ہوں۔ ایسی کوئی صحیح روایت نہیں ملتی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ شروع میں یہ حضرات کوئی مخالفانہ تحریک برپا کرنے لگے تھے۔

یزید کا سخت طرزِ عمل:

یزید کو چاہیے تھا کہ وہ ان حضرات کو بیعت پر مجبور کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں کتنے ہی حضرات کو غیر جانب دار رہنے دیا اور ان کی عزت وتکریم میں کوئی کمی نہ کی۔ اسی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعتِ ولی عہدی نہ کرنے والے اکابر کو ان کے ضمیر کے خلاف چلنے پر مجبور نہیں کیا۔ یہ یزید کی پہلی سیاسی غلطی تھی کہ اس نے ان بزرگوں سے بدگمانی رکھی اور خیال کیا کہ وہ نگاہ چوکتے ہی مسلح بغاوت کر دیں گے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے اس نے ان بزرگوں پر فوری بیعت کے لیے دباؤ ڈالا اور اپنے والدِ گرامی کی وہ وصیت نظر انداز کر دی جس میں اسے شرفاء کے ساتھ سختی نہ برتنے اور اپنی رائے پر اصرار نہ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ ③

یزید نے اس وصیت کو فراموش کر کے تمام صحابہ کرام سے بہر صورت بیعت لینے کا نامناسب فیصلہ کیا جس نے مزید دشوار حالات کو جنم دیا جن سے نمٹنے میں یزید نے مزید غلط فیصلے کیے اور یوں حالات قابو سے باہر ہوتے چلے گئے۔

یزید کی جانب سے حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت لینے کی کوششیں:

غیر معتبر رُواۃ کی روایات سے قطعِ نظر صحیح العقیدہ ثقہ حضرات کی روایتوں سے ثابت ہے کہ حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے جبراً بیعت لینے کی پوری کوشش کی گئی تھی، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ مدینہ منورہ جیسی محبوب جگہ کو

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۱۷، بسند صحیح

② تاریخ خلیفہ: ص ۲۱۷، بسند صحیح ③ البدایہ والنہایہ: ۱۱ ص ۲۳۳، ۲۳۵

چھوڑ کر کہیں اور جاتے۔ چنانچہ یزید نے تخت نشین ہونے کے بعد مدینہ کے حاکم ولید بن عتبہ کو حکم بھیجا کہ وہ حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو فوراً بلوا کر ان سے بیعت لے۔ یہ حکم نامہ رات کے وقت مدینہ پہنچا۔ ①

ولید بن عتبہ نے اسی وقت پہلے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قصرِ امارت میں بلوایا۔ جب بیعت کا مطالبہ کیا تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''نہ تو یہ بیعت کا وقت ہے اور نہ مجھ سا آدمی یوں تنہائی میں بیعت کر سکتا ہے۔ آپ کل منبر پر بیٹھ کر بیعت لیں، ہم کھلم کھلا بیعت کر لیں گے۔'' ولید بن عتبہ نرم دل تھا، اس نے رعایت دے دی۔ یہ حضرات حکومت کا رویہ دیکھ کر اندازہ لگا چکے تھے کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں ان پر جبر کیا جائے گا۔ آخر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ رات کے آخری پہر ایک غیر معروف راستے سے مکہ روانہ ہو گئے۔ ②

ان کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی خاندان سمیت مکہ تشریف لے گئے۔ ③

حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے مدینہ سے نکلنے کا سبب:

ان حضرات کے مدینہ سے مکہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ دارالخلافہ دمشق سے نسبتاً قریب تھا جبکہ مکہ اس سے دور اور پہاڑوں میں گھرا ہوا محفوظ ترین شہر تھا۔ پھر وہاں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر ہاشمی رؤساء موجود تھے۔ نیز حرم کی تقدیس کے پیشِ نظر حکومت سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ مکہ میں خواہ مخواہ کوئی سخت کارروائی کر کے بدنامی مول نہیں لے گی۔ پس ان حضرات کے لیے مدینہ کی بہ نسبت مکہ زیادہ مامون تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مدینہ سے نکلے تو راستے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس گزشتہ سالوں میں بھیجے گئے اہلِ کوفہ کے کچھ خطوط تھے جن میں انہیں عراق آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اہلِ کوفہ کے پاس نہ جانے کا مشورہ دیا۔ مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ قائل نہ ہوئے۔ ④ رخصت کرتے ہوئے ابن عمر رضی اللہ عنہ انہیں گلے لگا کر خوب روئے اور فرمایا: ''اے شہید ہونے والے! تجھے اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔'' ⑤

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مکہ کے راستے میں عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ ملے اور پوچھنے لگے: ''کہاں کا ارادہ ہے؟''

فرمایا: ''ابھی مکہ جا رہا ہوں۔ وہاں آئندہ کے لیے استخارہ کروں گا۔'' ⑥

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ سے نکلتے ہوئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کوفہ جانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ہاں ان کے ذہن میں وہاں جانے کا خیال ضرور موجود تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے سفر کا رُخ بھی ظاہر کرتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اس وقت کوفہ جانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا ورنہ مدینہ سے سیدھے کوفہ چلے جانا زیادہ آسان تھا کیوں کہ یہ راستہ نسبتاً محفوظ اور مختصر تھا۔

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۲؛ المحاسن والمساوی للبیہقی: ص ۲۶

② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۲ ③ تاریخ الطبری: ۵ص ۳۴۱

④ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خطرہ تھا کہ اہلِ عراق ساتھ دینے میں کوتاہی نہ کریں، مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے سفرِ عراق کا خیال امکانی طور پر ذہن میں رکھا۔

⑤ مجمع الزوائد، ح: ۱۵۱۳۰، رجالہ ثقات؛ المعجم الاوسط للطبرانی، ح: ۵۹۷؛ تاریخ دمشق: ۲۰۲/۱۴

⑥ انساب الاشراف: ۱۵۵/۳، ۱۵۶، ط دار الفکر

نئے حاکمِ حجاز کا مکہ پر حملے کا عزم:

۲۷ یا ۲۸ رجب کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ مدینہ سے نکلے اور تیزی سے سفر کر کے جمعہ ۳ یا ۴ شعبان کو مکہ مکرمہ پہنچے۔ یہاں آپ چار مہینے چار دن (۷ ذی الحجہ ۶۰ ھ تک) مقیم رہے اور اس دوران حالات پر غور وفکر کرتے رہے۔ ①

حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے بیعت کیے بغیر مدینہ سے نکل جانے کی خبر سے یزید کی تشویش بڑھ گئی۔ اس نے بیعت لینے میں ناکامی کی ساری ذمہ داری ولید بن عتبہ پر ڈال کر اسے معزول کر دیا۔ اس کی جگہ عمرو بن سعید الاشدق کا تقرر کیا جو سختی میں مشہور اور منہ پھٹ تھا اور اسی وجہ سے ''اشدق'' کہلاتا تھا۔ ② اس نے آتے ہی مسجدِ نبوی کے منبر پر قسم کھا کر مکہ معظمہ پر چڑھائی کا عزم ظاہر کیا جہاں یہ حضرات پناہ لیے ہوئے تھے۔ ③

بعض حضرات کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ یزید پوری طرح طاقت رکھنے کے باجود بیعت نہ کرنے والے اکابر سے رعایت برتتا اور ان کی ''خطرناک سرگرمیوں'' کو نظر انداز کرتا رہا تھا۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو پھر یہ رعایت مکہ اور جزیرۃ العرب ہی میں محدود نہ رہتی۔ ولید بن عتبہ اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو معزول نہ کیا جاتا۔ کوفہ کی سرحد پر اور میدانِ کربلا میں بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے اعزاز واکرام کا برتاؤ کیا جاتا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مکہ پر دوبار فوج کشی نہ ہوتی۔ بات یہ تھی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مکہ پہنچنے کے بعد ایک ماہ تو نئے حاکم کے تقرر میں گزر گیا۔ ماہِ رمضان میں جب یزید کا بدمزاج نائب عمرو بن سعید اشدق حجاز میں تعینات ہوا تو وہ جانتا تھا کہ شوال میں موسمِ حج شروع ہو جائے گا اور حاجیوں کے قافلوں کی بھیڑ میں مکہ پر حملہ کرنا مشکل ہوگا۔ اس لیے اس نے ذوالحجہ گزرنے کا انتظار کیا۔ ④

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سفرِ کوفہ کا اصل مقصد:

مکہ پہنچنے کے کچھ عرصے بعد باہم صلاح ومشورے کے بعد حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما دونوں اس پر متفق ہو گئے کہ نظامِ حکومت کی اصلاح کی سعی کرنی چاہیے۔ ان کے سامنے وہ فرامینِ نبویہ بھی تھے جن میں برائی کو حسبِ قدرت ہاتھ یا زبان سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ⑤ اگرچہ اس راستے میں سخت خطرات بھی تھے اور ان حضرات کو پورا اندازہ تھا کہ یہ جان کی بازی ہے مگر ان دونوں حضرات کی فقاہت فیصلہ دے رہی تھی کہ جان پر کھیل کر عزیمت کی یہ راہ اختیار کرنا کم از کم ان کے حق میں واجب ہو چکا ہے کیوں کہ موروثی وشخصی نظامِ حکومت آگے چل کر جن مفاسد

---

① تاریخ الطبری: ۵ ص ۳۸۱؛ انساب الاشراف ۳ ص ۱۶۰

② تاریخ الطبری: ۵ ص ۳۴۳ ③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۲۳

④ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی جانتے تھے کہ ذوالحجہ کے فوراً بعد حملہ ضرور ہوگا، اسی لیے وہ ''یوم الترویۃ'' سے قبل مکہ سے کوفہ روانہ ہو گئے۔ (المحن لابی العرب، ص ۱۴۹) حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے عراق جانے کے بعد یزید کے حکم پر عمرو بن سعید اشدق نے مکہ مکرمہ پر فوج کشی کی تاکہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو بیعت نہ کرنے کی سزا دی جاسکے۔ (صحیح البخاری، ح: ۱۰۴؛ عمدۃ القاری: ۲ ص ۱۴۱؛ البدایۃ والنہایۃ، سنۃ: ۶۱ھ) اگر یہ مفروضہ مان لیا جائے کہ حکومت بیعت نہ کرنے والے اکابر کو رعایت دے رہی تھی تو اس فوج کشی کا کیا مطلب تھا؟

⑤ راجع الی: سنن الترمذی، باب ماجاء فی الامر بالمعروف والنہی عن المنکر؛ سنن ابن ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر

کا باعث بنے گا، ان کا سدباب شاید بعد میں ممکن نہ ہو سکے، پس سیاسی نظام کے بگاڑ کو درست کرنے کی کوشش ابھی سے ضروری ہے۔ چونکہ عالم اسلام میں کہیں اور سے کوئی آواز نہیں اٹھ رہی تھی اس لیے ان دونوں اکابر کی فقاہت نے فیصلہ دیا کہ جان پر کھیل کر عزیمت کی یہ راہ اختیار کرنا کم از کم ان پر واجب ہو چکا ہے بشرطیکہ فتنہ وفساد کی نوبت نہ آئے۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ رائے عامہ کو ہموار کر کے حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اہل حجاز سے تعاون کی بھرپور امید تھی اور وہ چاہتے تھے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی مکہ ہی میں رہیں مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کو اپنی جان سے زیادہ حرمین کا تقدس عزیز تھا جس کی خاطر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صبر وتحمل کا کوہ گراں بن کر جان دی تھی اور جس کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیارِ رسول کو چھوڑا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ مکہ پر یزید کے نائبین کی طرف سے حملہ ضرور ہوگا جیسا کہ عمرو بن سعید کے پہلے خطبے سے صاف عیاں تھا۔ ایسی صورتحال میں اہلِ مکہ بھی دفاع پر مجبور ہوتے اور نتیجہ مسلمانوں کی باہمی جھڑپ کی شکل میں نکلتا، یوں مقدس سرزمین خونِ مسلم سے داغ دار ہوتی لہٰذا حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ میں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

اہلِ کوفہ کے خطوط:

اس وقت صورتحال یہ تھی کہ ایک طرف حجاز کے لوگ یزید کو اکابر کے اتفاقِ رائے کے بغیر براجمان ہونے والے حکمران کے طور پر دیکھ رہے تھے اور اسے ایک ''بیعتِ شر'' سمجھ رہے تھے۔① اُدھر عراق کے لوگ بھی یزید کی حکومت سے خوش نہیں تھے۔ خود یزید کے بعض نائبین کا دلی رجحان بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرف تھا جیسا کہ کوفہ کے حاکم نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ برملا فرماتے تھے:

لَابْنُ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰہِ اَحَبُّ اِلَیْنَا مِنِ ابْنِ بِنْتِ بَحْدَل۔

''بحدل کے نواسے کی بہ نسبت ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے زیادہ محبوب ہیں۔''②

یاد رہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں بھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بعض اہل کوفہ کی جانب سے ایسے پیغامات ملتے رہے تھے کہ وہ ان کے اشارے پر فدا ہونے کو تیار ہیں، لہٰذا جلد از جلد کوفہ تشریف لا کر جانثاروں کو خدمت کا موقع دیں۔ تاہم حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان کی باتوں میں نہ آئے۔③ اب اسی قسم کے خطوط اور وفود مکہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس آرہے تھے۔④ ایک طرف حرمین کے تقدس کی پامالی کا خطرہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مکہ سے جانے پر مجبور کر رہا تھا، دوسری طرف اہلِ کوفہ کے پیغامات سے ظاہر تھا کہ وہاں ایک غیر منظم بغاوت برپا ہو کر کسی بڑے فتنے کو جنم دے سکتی

---

① جامع معمر بن راشد: باب اشراط الساعۃ

② المحن، ص ۱۵۰، عن الامام قاسم بن سلام عن الامام سحنون

③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۷۰/۳، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ، بسند صحیح

④ تاریخ الطبری ۵ ص ۳۹۱ بسند صحیح، ۵ ص ۳۴۷ بسند حسن

ہے۔ایسے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نزدیک مصلحت یہی تھی کہ کوفہ جا کر اس مجمع کو منظم کیا جاتا اور اس اجتماعی نظم وضبط کی طاقت کے ساتھ شرعی حدود کے مطابق نظامِ حکومت میں صالح تبدیلی کی کوشش کی جاتی۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا مشورہ:

مگر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ فی الحال مکہ ہی میں ٹھہرا جائے۔جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفہ جانا چاہتے ہیں تو وہ بے اختیار بولے: ”آپ کہاں جائیں گے؟ ان لوگوں کے پاس جنہوں نے آپ کے والد کو قتل کیا، آپ کے بھائی کا ساتھ نہ دیا۔“

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اگر میں اِدھر اُدھر قتل بھی کر دیا جاؤں تو یہ مجھے پسند ہے، مگر یہ گوارا نہیں کہ میری وجہ سے اس سرزمین کی عظمت پامال ہو۔“[1]

مذکورہ صحیح روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ حکومت انہیں ان کے موقف سے انحراف پر مجبور کرے گی، اپنی رائے پر ثابت قدمی کی پاداش میں انہیں قتل کا یقین تھا اور وہ جانتے تھے کہ اگر وہ مزید کچھ دن مکہ میں رہے تو یزید حرم شریف پر ضرور چڑھائی کرے گا جس کے نتیجے میں یہاں تلوار چل جائے گی۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو گوارا نہ تھا کہ حرم میں خونریزی ہو۔یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رکھی جائے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے عراق میں شہید ہونے کی حدیث خاندانِ نبوت میں مشہور تھی جس کے مطابق ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو گود میں لے کر روئے اور فرمایا: ”مجھے جبرئیل علیہ السلام نے بتایا کہ آپ کی اُمت انہیں مقام ”کربلاء“ میں شہید کرے گی۔“[2]

اس کے باوجود جب ہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عراق جانے پر مصر دیکھتے ہیں جبکہ وہ (نعوذ باللہ) کوئی نادان انسان نہ تھے، تو ماننا پڑتا ہے کہ ان کے سامنے کوئی اہم لائحہ عمل تھا جس کے لیے وہ جان کی بازی لگا رہے تھے۔

یزید کی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو دھمکی:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ میں ہی تھے کہ یزید نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو ایک تنبیہی خط بھیجا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے بنوہاشم سے بغاوت کا قوی خدشہ تھا۔یزید نے لکھا تھا:

”حسین رضی اللہ عنہ کے پاس مشرق کے لوگ آکر انہیں خلافت کی امید دلا رہے ہیں۔آپ حالات سے باخبر

---

① اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/۲۴۳ رجالہ ثقات، دار خضر، باسناد صحیح

ملحوظہ: یاد رہے کہ ابو مخنف کی روایت میں منقول ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بدنیتی کے ساتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مکہ سے کوفہ جانے پر رضامند کیا تھا تاکہ ان کے بعد مکہ میں وہ اپنی حکومت قائم کر لیں۔یہ روایت مذکورہ بالا صحیح روایت سے متعارض ہونے کے باعث بالکل مردود ہے۔

② عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم أَنَّ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: إِنَّ أُمَّتَكَ سَتَقْتُلُ هٰذَا (ای الحسین) بِأَرْضٍ يُقَالُ لَهَا: كَرْبَلَاءُ، فَتَنَاوَلَ جِبْرِيلُ مِنْ تُرْبَتِهَا فَأَرَاهَا النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم۔ قال الهيثمي: رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ بِأَسَانِيدَ، وَرِجَالُ أَحَدِهَا ثِقَاتٌ۔ (مجمع الزوائد، ح: ۱۵۱۱۶، ۱۵۱۱۷) وَعَنْ عَلِيٍّ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: قَامَ مِنْ عِنْدِي جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَبْلُ، فَحَدَّثَنِي أَنَّ الْحُسَيْنَ يُقْتَلُ بِشَطِّ الْفُرَاتِ۔ قال الهيثمي: رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَأَبُو يَعْلَى، وَالْبَزَّارُ، وَالطَّبَرَانِيُّ، وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ۔ (مجمع الزوائد، ح: ۱۵۱۱۲)

تجربہ کار انسان ہیں۔ اگر حسین رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا تو قرابت داری کے بندھن ٹوٹ جائیں گے۔ آپ خاندان کے بڑے اور معزز آدمی ہیں، ان کو اس شورش پسندی سے روکیں۔''①

اس مکتوب میں یزید کے لب و لہجے سے صاف ظاہر ہے کہ اسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اہل کوفہ سے رابطہ دیکھ کر یقین تھا کہ وہ آمادۂ بغاوت ہیں۔ دوسری طرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ یزید یا اس کے حکام ان کے موقف پر غور نہیں کریں گے بلکہ (بزعم خود) انہیں بغاوت کا مرتکب سمجھ کر قتل کرانے کی کوشش کریں گے، پس اس موقع پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید سے مل کر معاملہ سلجھانے کی کوشش نہیں کی اور عوام کے تعاون کے ذریعے تبدیلی لانے کی کوشش کو سودمند سمجھا۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ یزید سے بیعت کر لیتے تو اس اصلاحی کوشش اور فکر و تدبیر کا حق ختم ہو جاتا جبکہ آپ اس حق کو باقی رکھنا چاہتے تھے اور اس میں اُمت کی مصلحت تصور کرتے تھے۔

کوفہ کا سفر:

جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرات طلحہ و زبیر اور سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم عوامی حمایت کے ذریعے بلوائیوں پر قابو پانے بصرہ گئے تھے، اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی عوامی دباؤ کے ذریعے حکومت کی ساخت میں تبدیلی کرانا چاہتے تھے تاکہ خلافتِ راشدہ کا شورائی نظام دوبارہ بحال ہو جائے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جن لوگوں کی دعوت پر کوفہ جانا چاہتے تھے، ان میں ایک صحابی حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ اور بعض تابعین بھی تھے جبکہ بعض لوگ قبائل کے رؤساء تھے۔ ان کے علاوہ کچھ شر پسند، مفاد پرست اور سازشی لوگ بھی تھے جن کا لائحہ عمل غالباً یہ تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کسی طرح کوفہ کا رخ کر لیں اور حکومت کسی تدبر کا ثبوت دیے بغیر سخت کارروائی کر بیٹھے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کر دیے جائیں۔ بہرکیف خطوط بھیجنے والے نیک سیرت اہلِ کوفہ کو بلاثبوت اس سازش میں شریک نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب خطوط اور وفود کا تانتا بندھ جانے سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو محسوس ہوا کہ کوفہ جا کر آپ رضی اللہ عنہ کے نیک عزائم پورے ہو سکتے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ وہاں جانے کا سوچنے لگے مگر اس کا حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ آپ نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے پہلے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کو کوفہ روانہ کر دیا۔②

مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کی کوفہ آمد اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا حکیمانہ طرزِ عمل:

مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کوفہ پہنچ کر شہر کے ایک مخلص مسلمان ہانی بن عروہ رحمہ اللہ کے ہاں مہمان ہوئے۔ اہلِ کوفہ کی بڑی تعداد ان کے گرد جمع ہو گئی۔③ کوفہ کے حاکم حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بڑے عالم فاضل صحابی تھے۔ مسلم بن عقیل کی آمد اور ان کی سرگرمیوں سے واقف ہونے کے باوجود انہوں نے کوئی روک ٹوک نہ کی۔ کوفہ کے بعض سخت مزاج افسران نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی اس کشادہ روی پر تنقید کی اور انہیں کمزوری کا طعنہ دیا۔ انہوں نے فرمایا: ''اللہ کی

① تاریخ دمشق: ۱۴/ص ۲۱۰ ② تاریخ الطبری: ۵/ص ۳۹۱ بسند صحیح ③ تاریخ الطبری: ۵/ص ۳۹۱ بسند صحیح

اطاعت کی حدود میں رہ کر کمزور کہلانا مجھے پسند ہے، مگر یہ گوارا نہیں کہ اللہ کی نافرمانی کر کے طاقتور کہلاؤں۔'' ①

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے نزدیک مسلم بن عقیل رحمہ اللہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سرگرمیاں بغاوت نہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ حاکم تھے۔ ان کے پاس ساری اطلاعات پہنچ رہی ہوں گی۔ اگر حقیقت میں یہ کسی فتنہ و فساد کی تیاری ہوتی تو ان سے چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ یہ ایک اصلاحی تحریک ہے، اس پر روک ٹوک کو وہ اسلام کے دیے ہوئے اظہار ما فی الضمیر کے حق پر پابندی کے مترادف تصور کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مسلم بن عقیل رحمہ اللہ سے لوگوں کے ملنے ملانے پر کوئی قدغن نہ لگائی۔ مسلم بن عقیل رحمہ اللہ نے ان حالات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اطلاع بھیج دی کہ بارہ ہزار افراد بیعت کر چکے ہیں، آپ تشریف لے آئیں۔ ②

ابن زیاد کی کوفہ آمد اور مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کی شہادت:

مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کا مراسلہ مکہ پہنچنے تک کوفہ کے حالات بدل گئے جن سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ بے خبر رہے۔ ہوا یہ کہ کوفہ کے بعض شر پسند امراء نے مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کے متعلق حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی نرم خوئی کو ناپسند کیا اور یزید کو سارا حال نمک مرچ لگا کر لکھ بھیجا۔ اس نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے عبید اللہ بن زیاد کو بصرہ کے ساتھ کوفہ کی حکومت بھی دے دی۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ مسلم بن عقیل کو تلاش کرو، مل جائیں تو قتل کر ڈالو۔ ③

یزید کے اس حکم کے باعث عراق کے سارے معاملات ایسے بدترین شخص کے اختیار میں آ گئے جس کی افتادِ طبع کسی بھی سنگین ترین سانحے کو جنم دے سکتی تھی۔ عبید اللہ بن زیاد یزید کا حکم ملتے ہی بصرہ سے سیدھا کوفہ پہنچ گیا۔ مسلم بن عقیل رحمہ اللہ اس وقت شہر کے ایک ممتاز امیر ہانی بن عروہ رحمہ اللہ کے ہاں قیام پذیر تھے۔ عبید اللہ بن زیاد کو خبر مل گئی۔ اس نے ہانی رحمہ اللہ کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ جب انہوں نے مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کا پتہ نہ بتایا تو سخت زدو کوب کے بعد قلعے میں بند کر دیا۔ ④ اس کے بعد عبید اللہ بن زیاد نے مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کے خلاف کارروائی کرائی اور انہیں قتل کر کے لاش محل کی چھت سے نیچے پھینکوا دی۔ ہانی بن عروہ رحمہ اللہ کو بھی قتل کر دیا گیا۔ ⑤

اُدھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کا تسلی بخش خط پڑھ کر مع اہل و عیال کوفہ جانے کی تیاری کر چکے تھے۔ ⑥

صحابہ کرام کی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے شفقت:

جب آپ رضی اللہ عنہ مکہ سے کوفہ کے لیے نکلنے لگے تو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ملاقات کی۔ وہ بولے: ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟ ان لوگوں کے پاس جنہوں نے آپ کے والد کو قتل کیا، جنھوں نے آپ کے بھائی کو زخم لگایا۔ اگر میرے اور آپ کے لیے عیب کی بات نہ ہوتی تو میں آپ کو سر کے بالوں سے پکڑ کر روک لیتا۔''

---

① تاریخ الطبری: ۵ص ۳۴۸، بسند حسن ② تاریخ الطبری: ۵ص ۳۴۸، بسند حسن

③ تاریخ الطبری: ۵ص ۳۴۸ بسند حسن ④ تاریخ الطبری: ۵ص ۳۴۸ بسند حسن

⑤ تاریخ الطبری: ۵ص ۳۹۲ بسند صحیح، ۵ص ۳۵۰ بسند حسن ⑥ تاریخ دمشق: ۱۴ ص ۲۱۲

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے انہیں بھی وہی جواب دیا جو عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو دیا تھا۔ فرمایا:

''کسی اور جگہ قتل ہو جانا مجھے اللہ اور رسول کے مقدس شہروں میں خون ریزی برپا ہو جانے سے زیادہ عزیز ہے۔'' ①

عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''تقدیر کی بات کہ حسین رضی اللہ عنہ نے جلدی کر دی ورنہ اگر میں ان تک پہنچ جاتا تو ان کو نکلنے نہ دیتا۔ سوائے اس کے کہ وہ مجھے لاچار کر دیتے۔'' ②

ان صحابہ کرام کے کلام میں کہیں بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ نہیں کہا گیا کہ وہ کوئی گناہ کرنے جا رہے تھے، اس لیے انہیں ٹھہر جانا چاہیے۔ بلکہ ان سب کے کلام سے صاف جھلکتا ہے کہ انہیں اہلِ عراق کی ثابت قدمی پر یقین نہ تھا اور اسی بنا پر انہیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اصلاحی تحریک کی کامیابی مشکل اور ان کی جان خطرے میں نظر آتی تھی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ عزیمت کے راستے پر:

اتنے برگزیدہ حضرات اور مخلص احباب کے منع کرنے کے باوجود حضرت حسین رضی اللہ عنہ عراق جانے پر مصر تھے۔ در حقیقت ان کے کوفہ جائے بغیر وہاں کے بے چین لوگوں کو شرعی سیاست کے دھارے میں لانے اور سیاسی اصلاح احوال کی کوئی صورت نہیں تھی۔ بلاشبہ دیگر صحابہ کے مشورے کے مطابق فتنے کے اس زمانے میں آپ رضی اللہ عنہ گھر میں چپ چاپ بیٹھے رہتے تو شرعاً آپ رضی اللہ عنہ کے لیے یہ رخصت نکلتی تھی۔ مگر آپ کو عضوِ معطل بن کر بیٹھے رہنا گوارا نہ تھا اور آپ رضی اللہ عنہ کے اپنے فقہ و اجتہاد کے مطابق کم از کم آپ رضی اللہ عنہ پر عزیمت کی راہ اختیار کرنا واجب تھا۔

یزید کا ابن زیاد سے رابطہ:

یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوفہ روانگی کی خبر مل چکی تھی۔ اس نے ابن زیاد کو درج ذیل پیغام بھیجا:

''مجھے خبر ملی ہے کہ حسین کوفہ کی طرف آ رہے ہیں۔ حسین کے معاملے میں سارے زمانوں میں تمہارے زمانے کو، سارے شہروں میں سے تمہارے شہر کو اور سارے حکام میں سے تم کو امتحان آ پڑا ہے۔ ایسے ہی امتحانات میں پڑ کر لوگ ترقی پاتے ہیں یا غلاموں کی طرح پست درجہ ہو جاتے ہیں۔'' ③

چنانچہ ابن زیاد نے پوری کوشش کی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ کی صورتحال سے بالکل بے خبر رکھا جائے۔ اس نے تمام شاہراہوں پر اتنی سخت ناکہ بندی کرائی کہ کوئی شخص یہ علاقے عبور کر کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک نہ پہنچ سکا۔ مسلم بن عقیل رحمہ اللہ ۸ ذوالحجہ کو قتل کیے گئے تھے اور اس سے ایک دن پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ سے نکلے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ کوفہ میں اب حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نہیں، سخت گیر عبید اللہ بن زیاد مسلط ہے۔ ④

حضرت حسین رضی اللہ عنہ واپسی پر آمادہ:

آخر کار عراق کی سرحد کے قریب آپ رضی اللہ عنہ کو خبر ملی کہ کوفہ کے نئے حاکم ابن زیاد نے مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کو قتل کرا دیا

① مصنف ابی ابی شیبۃ، ح: ۳۷۳۶۴، بسند صحیح ② تاریخ دمشق: ۲۰۳/۱۴؛ البدایۃ والنہایۃ: ۴۹۷/۱۱
③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۵/۳، بسند جید ④ تاریخ الطبری: ۵ ص ۳۹۲، عن حصین بن عبد الرحمن، بسند صحیح

ہے۔① آپ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ اب اصل مقصد یعنی سیاسی نظام کی اصلاح جو عوام کی حمایت پر موقوف تھا، حاصل نہ ہوگا اور عبیداللہ بن زیاد بلاوجہ آپ کو باغی سمجھ کر مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ جیسے سلوک کا نشانہ بنائے گا۔ اس لیے آپ کو یہی بہتر لگا کہ واپس حجاز چلے جائیں۔ مگر جب آپ رضی اللہ عنہ نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کے بھائیوں نے، جو آپ کے ہمراہ تھے، جوش میں آکر کہا: ''اللہ کی قسم! ہم جب تک مسلم کے خون کا بدلہ نہ لیں گے، واپس نہیں جائیں گے چاہے خود سب قتل ہوجائیں۔'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہارے بغیر جینے کا کیا لطف۔''②

آپ کچھ آگے کوفہ کی انتظامی سرحد تک پہنچ گئے جہاں عبیداللہ بن زیاد کے حکم سے پہرے لگائے گئے تھے۔ یہیں ابن زیاد کے سالار حر بن یزید سے ملاقات ہوئی جو ایک شریف آدمی تھا۔ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خیر خواہی کی۔ پوچھا: ''کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟'' جب آپ نے کوفہ کا ارادہ بتایا تو حر نے سختی سے منع کیا اور کہا:

''واپس چلے جائیے وہاں آپ کے لیے خیر کی کوئی امید نہیں۔''③

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اِقدام خروج نہ تھا:

ان حالات میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تا کہ اُسے گفت وشنید کے ذریعے اسلامی شورائیت کی طرف لانے کی کوشش کرلی جائے۔ اگر ایسا ہوجاتا تو یزید کے لامحدود اختیارات میں کمی آجاتی اور بہت سے مفاسد کا راستہ بند ہوجاتا۔ یہ فیصلہ اتنا اٹل تھا کہ آپ بہر صورت اس پر عمل پیرا ہو گئے اور شام کا راستہ اختیار کر لیا۔④ لائحہ عمل میں تبدیلی کی وجہ ہمارے بعض اکابر کے مطابق یہ تھی کہ ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جان لیا تھا کہ اب یزید کی حکومت قائم و مستحکم ہوچکی ہے اور مسئلے کی نوعیت بدل چکی ہے، چوں کہ آپ جانتے تھے کہ ایک قائم شدہ حکومت کو ختم کرنے کی کوشش خروج کے زمرے میں آتی ہے، لہٰذا آپ نے شرعی حدود کے مطابق متبادل راستے کو ترجیح دی کہ شاید روبرو مذاکرات سے مقصد حاصل ہوجائے۔''⑤

تاہم اگر یزید کی حکومت کو پہلے دن سے قائم مان لیا جائے، تب بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جدوجہد پر شرعاً خروج کا اطلاق نہیں ہوسکتا کیوں کہ فقہی تعریف کے مطابق خروج تب ثابت ہوتا ہے جب دو شرائط پائی جائیں: اوّل: حکمران کی اطاعت نہ کرنا۔ دوئم: کسی علاقے پر عسکری کنٹرول ہونا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جدوجہد میں ایک دن کے لیے بھی کسی جگہ پر عسکری کنٹرول ثابت نہیں، حتیٰ کہ مسلم بن عقیل رحمہ اللہ کے ہاتھ پر ہزارہا افراد کی بیعت کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں شہر پر قابض ہونے کی ہدایت نہیں بھیجی تھی اور نہ ایسا کوئی قبضہ فی الواقع ہوا تھا۔ الغرض یہ خروج نہیں بلکہ اعلیٰ مقاصد کے لیے شروع کی گئی ایک سیاسی و اصلاحی تحریک تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ کے کوفہ جانے کا مقصد حصولِ اقتدار نہیں بلکہ

---

① تاریخ الطبری: ۵ص ۳۸۹ بسند حسن ② تاریخ الطبری: ۵ص ۳۸۹، بسند حسن

③ تاریخ الطبری: ۵ص ۳۸۹ بسند حسن ④ تاریخ الطبری: ۵ص ۳۹۲ بسند صحیح

⑤ احسن الفتاوی: جلد ششم، رسالہ ذب الجہول عن سبط الرسول ﷺ؛ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق: ص ۱۲۷

نظام کی اصلاح تھا۔ کوفہ میں عقیدت مندوں کو جمع کر کے آپ یہی کرنا چاہتے تھے۔ مگر اب نئی صورتحال میں آپ کے نزدیک آخری صورت یزید سے براہ راست بات کرنا رہ گئی تھی۔ چنانچہ آپ دمشق کے راستے پر روانہ ہو گئے۔ ①

میدانِ کربلا میں

عبید اللہ بن زیاد چاہتا تو قافلۂ حسینی کو شام کی طرف جانے دیتا مگر اس نے ضد اور غرور کی بناء پر قافلے کو کربلا میں رکوا کر اصرار کیا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یہیں گرفتاری دے کر اس کے پاس کوفہ حاضر ہوں۔ اس نے جس طرح مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کو مجبور اور لاچار بنا کر قتل کیا تھا اسی قسم کا سلوک وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی کرنے کی ٹھانے ہوا تھا تاکہ لوگ حکومت سے خائف رہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے شروع سے سرحدی سپاہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ قافلہ حسینی کو حراست میں لے کر سیدھا کوفے لے آئیں مگر اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ دمشق کا رخ کر چکے تھے اور کوفہ کی فوج کا افسر حُر بن یزید طبعی نرمی اور شرافت کی وجہ سے اب تک آپ کو گرفتار کرنے سے گریزاں تھا۔

اس صورت حال سے ابن زیاد سٹپٹا گیا۔ اس نے عمر بن سعد کو ''رَے'' (تہران) کی صوبہ داری کے وعدے کے ساتھ یہ مہم سونپ دی کہ وہ جا کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے نمٹ لے، یعنی انہیں کسی امان کے وعدے کے بغیر غیر مشروط طور پر گرفتار کر کے کوفہ لے آئے اور اگر وہ خود کو حوالے نہ کریں تو انہیں قتل کر دے۔ ② عمر بن سعد نے رات بھر کی مہلت مانگی اور رات بھر سوچتا رہا۔ صبح آ کر اس نے آمادگی ظاہر کی اور لشکر لے کر نکل چڑا ③ جو چار ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ ④ آخر اس کے ہراول دستوں نے اس وقت قافلہ اہلِ بیت کو جا لیا جب وہ کوفہ سے تقریباً ۴۵ میل دور ''الطف'' کے میدان ''کربلا'' کے قریب سے گزر رہا تھا۔ یہیں قافلے کو گھیر لیا گیا۔ ⑤ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے قافلے کو گھرتا دیکھ کر اس جگہ کا نام پوچھا تو بتایا گیا: ''کربلاء'' آپ رضی اللہ عنہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا: یہ ارضِ کرب وبلاء ہے۔'' ⑥ یعنی آپ رضی اللہ عنہ کو فرمانِ نبوی کی بناء پر اسی جگہ اپنی شہادت کا یقین ہو گیا تھا۔

یہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی افسرانِ فوج: عمر بن سعد، شمر بن ذی الجوشن اور حُصین بن نمیر سے بات چیت ہوئی۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنی شہادت کا مقام آنکھوں کے سامنے دیکھنے کے باوجود اُمت کے خیر خواہ تھے اور ان لوگوں کو بدبختی کی انتہاء سے بچانا چاہتے تھے، لہٰذا آپ نے ان کے سامنے تین صورتیں رکھیں: ❶ جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس جانے دیا جائے۔ ❷ یزید سے ملاقات کا موقع دیا جائے۔ ❸ کسی سرحد کی طرف نکل جانے دیا جائے۔

عمر بن سعد مان گیا۔ اس نے ابن زیاد کو اطلاع دی مگر اس نے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ حسین رضی اللہ عنہ سے غیر مشروط طور

---

① تاریخ الطبری: ۵ص ۳۹۲ عن حصین بسند صحیح ② طبقات ابن سعد: ۱۲۸/۵، ط صادر
③ تاریخ الطبری: ۵ص ۳۸۹ بسند حسن
④ تاریخ الطبری: ۵ص ۴۱۰؛ تاریخ الاسلام للذهبی: ۵ص ۱۱، ت تدمری؛ البدایة والنهایة: ۶ص ۲۶۰، ط دار ہجر
⑤ تاریخ الطبری: ۵ص ۳۹۲ عن حصین بسند صحیح ⑥ الآحاد والمثانی، ح: ۳۲۳، رجالہ ثقات او موثقون

پر بیعت لو۔ یہ بات آپ رضی اللہ عنہ کے مشن اور غیرت کے خلاف تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”واللہ! ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔“ ①

بات چیت ختم ہو جانے کے بعد بھی عمر بن سعد جنگ کو ٹالنا چاہتا تھا مگر عبید اللہ بن زیاد کوفہ میں بیٹھ کر پل پل کی خبریں لے رہا تھا۔ اس نے جویریہ بن بدر تمیمی کو یہ حکم دے کر بھیج دیا کہ عمر بن سعد کو کہو فوراً حسین اور ان کے ساتھیوں سے لڑائی شروع کرے ورنہ اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔ عمر بن سعد نے یہ دھمکی سنی تو جلدی جلدی ہتھیار پہنے اور جنگ شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ عمر بن سعد کی فوج کے ایک شخص عمرو بن خالد طُھَوِی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تیر چلایا۔ یہ گویا جنگ کا پیش خیمہ تھا۔ تیر آپ کے دونوں شانوں کے درمیان جسم میں پیوست ہو گیا۔ ②

اس دوران کوفہ کی گھڑسوار فوج کے سالار حُر بن یزید کا ضمیر جاگ اٹھا۔ فوج کو جنگ پر تیار دیکھ کر اس نے دیگر افسران کو ملامت کرتے ہوئے کہا: ”کیا تم حسین رضی اللہ عنہ کی درخواست قبول نہیں کرو گے؟ اللہ کی قسم! اگر ایسی درخواست ترکستان اور دیلم کے کفار بھی تم سے کرتے تو اسے مسترد کرنا جائز نہ ہوتا۔“ مگر ان افسران پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تب حُر نے اپنے گھوڑے کا رخ پھیرا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ③ اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ سو (۱۰۰) کے قریب افراد تھے۔ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پانچ بیٹے اور بنو ہاشم کے سولہ افراد تھے۔ ④ عمر بن سعد کے سپاہی تلواریں سونتے تیار تھے۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ آگے بڑھیں اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں سے جنگ کریں۔ ⑤ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے قافلہ بنو ہاشم کی خیمہ گاہ پر نیزہ لے کر حملہ کرنے والا یہی عمر بن سعد تھا۔ ⑥ اس کے بعد عام لڑائی شروع ہو گئی۔ ⑦

آخر کار اس خونریز لڑائی میں سرکاری افواج کے ہاتھوں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تمام ساتھی قتل ہو گئے۔ ان میں دس سے زیادہ نوجوان ان کے گھر کے تھے۔ ایک تیر آکر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس معصوم بچے کو لگا جو ان کی گود میں تھا۔ حسین رضی اللہ عنہ اس کا خون پونچھتے جاتے اور کہتے جاتے: ”اے اللہ! ہمارے اور ان کے درمیان تو ہی انصاف کر، انہوں نے ہمیں اس لیے بلایا کہ ہماری مدد کریں اور اب یہ ہم لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔“ ⑧

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ یہ لوگ نہ صرف انہیں قتل کر کے رہیں گے بلکہ انہیں بے لباس کرنے میں بھی توقف نہیں کریں گے۔ آپ نے گھر والوں سے کہا: ”مجھے ایسا معمولی کپڑا دے دو جسے چھیننا کوئی پسند نہ کرے،

① تاریخ الطبری: ۵ص ۳۳۹ بسند حسن، ۳۹۲ بسند صحیح

② تاریخ الطبری: ۵ص ۳۹۲ بسند صحیح ③ تاریخ الطبری: ۵ص ۳۹۲ بسند صحیح

④ تاریخ الطبری: ۵ص ۳۹۲ بسند صحیح ⑤ تاریخ الطبری: ۵/ ۳۹۳ عن خضین بسند صحیح

⑥ أن الحسین لما نزل کربلاء فأول من طعن في سرادقه عمر بن سعد۔ (التاریخ الاوسط للبخاری: ۱ص ۱۵۰)

⑦ اہم تنبیہ: ان روایات سے ثابت ہے کہ کوفی لشکر نے جنگ چھیڑی تھی، پہلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تیر چلایا گیا۔ پھر عمر بن سعد نے نیزہ لے کر عام حملے کا آغاز کیا۔ محمود عباسی نے مستشرقین کے من گھڑت بیانات کا حوالہ دے کر بے بنیاد دعویٰ کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر کے خود جنگ چھیڑی تھی۔ (خلافت معاویہ و یزید: ص ۲۳۹، ۲۴۰) مذکورہ روایات اس بے بنیاد دعوے کی تردید کے لیے کافی ہیں۔

⑧ تاریخ الطبری ۵ص ۳۸۹، بسند حسن

اسے میں لباس کے نیچے پہن لوں گا کہ کہیں میں عریاں نہ کر دیا جاؤں۔“ خواتین نے ایک پرانی چادر دے دی، آپ نے اسے پھاڑ کر لباس کے نیچے پہن لیا۔ پھر تلوار لے کر نکلے۔ کچھ دیر کشت وخون کا ہنگامہ برپا رہا۔ آخر کار حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی بڑی دلیری سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ قاتلوں نے اس چادر کے سوا آپ کے باقی کپڑے اتار لیے اور سر مبارک کو تن سے جدا کر دیا۔ ① انا للہ وانا الیہ راجعون

معرکۂ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ۷۲ افراد شہید ہوئے جن کے سر قلم کر دیے گئے۔ ان میں سے ”۱۸“ افراد بنو ہاشم کے تھے۔ عمر بن سعد کی فوج کے ۸۸ آدمی مارے گئے تھے۔ ② قاتل سنان بن انس، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر لے کر کوفہ کے قصر امارت پہنچا اور عبید اللہ بن زیاد کو خوشخبری دیتے ہوئے یہ فخریہ اشعار پڑھے:

اَوْقِرْ رِكَابِيْ فِضَّةً وَّذَهَبًا... فَإِنِّيْ قَتَلْتُ الْمَلِكَ الْمُحَجَّبَا

”میرے اونٹوں کو سونے چاندی سے بھر دے، کہ میں نے اس بادشاہ کو قتل کر ڈالا جو پردے میں رہتا تھا۔“

قَتَلْتُ خَيْرَ النَّاسِ أُمًّا وَّ اَبًا ... وَخَيْرَهُمْ اِنْ يُنْسَبُوْنَ نَسَبًا

”میں نے دنیا کے بہترین والدین کی اولاد کو قتل کیا، جو نام و نسب کے شمار کے وقت سب سے اعلیٰ شمار ہوتا تھا۔“③

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر مبارک کو ایک طشت میں رکھ کر عبید اللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بالوں میں خضاب لگا ہوا تھا۔ ④ سنگ دل ابن زیاد نے چھڑی سے ان کے بالوں کو کریدتے ہوئے کہا: ”دیکھو! ابو عبد اللہ کے بالوں میں سفیدی آ گئی۔“⑤ پھر چھڑی کو ہونٹوں پر رکھ کر طنزیہ انداز میں کہا: ”دہن تو بڑا خوبصورت ہے۔“

اس وقت کوفہ کے بزرگ اور شرفاء مجلس میں موجود تھے۔ ان میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ بول اٹھے: ”واللہ! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں بوسے دیتے دیکھا ہے جہاں تم نے چھڑی رکھی ہے۔“⑥

قافلے میں شامل خانوادۂ اہل بیت کے تمام مرد شہید کر دیے گئے تھے۔ صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے علی بن حسین رحمہ اللہ (جو زین العابدین کے لقب سے مشہور ہوئے) اس لیے زندہ رہ گئے تھے کہ وہ بیمار تھے اور لڑائی کے لیے خیمے سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ جب وہ قافلے کی خواتین کے ساتھ کوفہ پہنچے تو ابن زیاد نے سپاہیوں کو حکم دیا: ”اسے بھی قتل کر دو۔“ ان کی پھوپھی زینب بنت علی بڑی جرأت مند خاتون تھیں۔ وہ زین العابدین رحمہ اللہ سے لپٹ گئیں اور بولیں: ”جب تک مجھے قتل نہ کر دو، اسے نہیں مار سکتے۔“ عبید اللہ بن زیاد نرم پڑ گیا اور انہیں چھوڑ دیا۔

پھر اس نے قافلہ حسینی کا سامان سفر تیار کر کے انہیں یزید کے پاس دمشق بھیج دیا۔ ⑦ قافلۂ حسینی کچھ دنوں تک یزید کے ہاں رہا۔ اس نے بھی اس سانحے پر افسوس کا اظہار کیا اور کچھ دنوں بعد اہل بیت کی مدینہ منورہ واپسی کا انتظام کر دیا۔⑧

---

① المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۱۷/۳، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ؛ تاریخ الطبری: ۳۸۹/۵، ۳۹۰، بسند حسن
② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۴، ۲۳۵؛ البدایہ والنھایہ: ۱۱ ص ۵۵۱، ۵۵۲ ③ تاریخ الطبری: ۵ ص ۳۸۹۔ بسند حسن
④ صحیح البخاری، ح: ۳۷۴۸، کتاب المناقب، مناقب الحسن والحسین ⑤ تاریخ الطبری: ۵ ص ۳۹۳
⑥ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۲۵/۳ ⑦ تاریخ الطبری: ۵ ص ۳۹۰۔ بسند حسن ⑧ تاریخ الطبری: ۵ ص ۴۶۲

واقعہ کربلا سے متعلق مشہور تفصیلات کی کیا حیثیت ہے؟

واقعۂ کربلا کے بارے میں عام طور پر بیان کی جانے والی تفصیلات زیادہ تر ابومخنف کی ''مقتل الحسین'' سے منقول ہیں، اس لیے ان کی اسنادی حیثیت بہت کمزور ہے۔ ان میں سے جو باتیں قرآن وسنت اور اصولِ دین سے متصادم ہوں، وہ یقیناً قابلِ تردید ہیں۔ ان میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو اہلِ بیت اور سادات کی شان کے خلاف ہیں۔ انہیں بھی نہیں ماننا چاہیے۔ کچھ چیزیں خلافِ عقل ہیں اور عام طور پر ممکن نہیں ہوا کرتیں۔ انہیں بھی ترک کرنا چاہیے۔

ان سے ہٹ کر جو دیگر تفصیلات ہیں مثلاً فلاں تاریخ کو فلاں جگہ قیام ہوا، فلاں فلاں لوگ ملنے آئے۔ ان سے یہ یہ باتیں ہوئیں، انہیں قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جن باتوں سے اہلِ بیت کی مظلومیت اور سرکاری فوج کے ظلم و زیادتی کا پتا چلتا ہو ان کا یکسر انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب صحیح روایات سے سرکاری فوج کے ہاتھوں حضرت حسین رضی اللہ عنہ سمیت اہلِ بیت کے جوانوں کا قتل ثابت ہے تو اس کے بعد باقی مظالم بھی بعید از قیاس نہیں رہتے۔ مگر چونکہ اس مواد کی سند پختہ نہیں، اس لیے ہم اسے قطعی نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے یہ سب ہوا ہو، اور ممکن ہے کسی نے مبالغے کے طور پر کچھ باتیں بڑھالی ہوں۔ ہمارے بعض اکابر مثلاً حضرت قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ (بانی دارالعلوم کراچی) نے سند کی کمزوری کے باوجود ان تفاصیل کو نقل کیا ہے۔ ان سے پہلے ایسا ہی حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اور حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جب صحیح روایات سے نفسِ واقعہ ثابت ہے تو اس سے مطابقت رکھنے والے ضعیف مواد کو لینے کی گنجائش بھی نکل آتی ہے۔

سانحۂ کربلا کی ذمہ داری کس پر:

واقعۂ کربلا کا تفصیل سے جائزہ لینے سے واضح ہوتا ہے اس کے ذمہ دار متعدد لوگ تھے۔ ان میں سے کسی کی سازش، کسی کی نادانی، کسی کی بزدلی، کسی کی ضد اور کسی کے جوشِ انتقام نے حالات کو یہاں تک پہنچایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آل واولاد کا پاک خون بڑی بے دردی سے بہادیا گیا۔ ذیل میں ہم ان ذمہ داروں کا مختصراً ذکر کرتے ہیں۔

عراقی جنہوں نے مدد نہ کی: سانحۂ کربلا کی ذمہ داری عراق کے ان شہریوں پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو وعدے کرکے بلایا مگر ان میں سے کچھ شروع ہی سے سازشی اور فریبی تھے اور کچھ غیر مستقل مزاجی اور بزدلی کے باعث کچھ کرنے کی ہمت نہ کر پائے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو فرمایا:

''اللہ ان لوگوں کو ہلاک کرے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دھوکا دیا۔ ان پر اللہ کی لعنت ہو۔''①

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کسی عراقی نے احرام کی حالت میں مچھر کے خون کر دینے کا مسئلہ پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے حاضرین سے کہا: ''اسے دیکھو تو سہی! مجھ سے مچھر کے خون کا مسئلہ پوچھ رہا ہے جبکہ ان لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند کو

① فضائل الصحابہ لاحمد بن حنبل، ح: ۱۳۹۲؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۸/۳ بسند صحیح

قتل کیا ہے اور میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ دونوں (حسن وحسین) دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔ [1]

مگر یہاں پر یہ یاد رہے کہ صحابہ کرام کی اس لعنت ملامت میں عراق کا حاکم ابن زیاد، عراق کا سپہ سالار عمر بن سعد، وہ عراقی جو سرکاری فوج میں بھرتی ہو کر اہلِ بیت پر حملہ آور ہوئے اور وہ سازشی شہری جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا کر پھر ابن زیاد سے مرعوب ہو گئے یا وہ شہری جو شروع ہی سے بدنیت یا سازشی تھے، سبھی شامل ہیں۔

بعض لوگ صحابہ کرام کی اس مذمت وملامت کا مصداق صرف کوفہ کے شہریوں کو قرار دے کر کوفہ کا انتظام سنبھالے ہوئے یزید کے اُمراء اور افسران وسپاہ کو بے قصور باور کرتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی جلسے میں علماء بیان جاری کریں: ''ہم اہلِ فلسطین پر اسرائیلیوں کے مظالم کی مذمت کرتے ہیں۔'' تو کوئی احمق اس سے یہ استدلال کرے کہ تمام جرم اسرائیلی شہریوں کا ہے جبکہ صہیونی حکومت اور فوج بے قصور ہے کیوں کہ علماء نے اسرائیلیوں کی مذمت کی ہے، صہیونی حکومت یا صہیونی افسران وسپاہ کی صراحت نہیں کی۔

عمر بن سعد: عمر بن سعد بھی اس سانحے کا بڑا ذمہ دار تھا کیوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر حملہ آور فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی۔ اگرچہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف کسی کارروائی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا مگر عبید اللہ بن زیاد کی دھمکیوں اور ''رَے'' کی صوبہ داری کے لالچ نے اسے اس مہم پر آمادہ کر دیا۔

عبید اللہ بن زیاد: عبید اللہ بن زیاد نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ایک باغی مجرم کی حیثیت دی اور کسی احتیاط اور رعایت کا مظاہرہ کیے بغیر ان کے خلاف کارروائی کا حکم دیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر دیکھ کر بھی اس کا دل نہ پسیجا بلکہ اس کے تاثرات ایسے تھے جیسے کوئی روز کا معمول انجام دیا گیا ہو۔ اس ظلم میں سب سے گھناؤنا کردار اسی کا ہے۔

یزید بن معاویہ: یزید اس سانحے کے وقت حکومت کے مقتدر ترین عہدے پر تھا۔ اس سانحے پر بس اظہارِ غم ہی کیا، عبید اللہ بن زیاد اور کوفہ کے حکام کو برا بھلا کہنے کے سوا کچھ نہ کیا، ان میں سے کسی کو سزا دینا تو درکنار نمائشی طور پر معطل تک نہ کیا۔ درحقیقت یزید کی طرف سے دیے گئے اعتماد اور اختیار نے ہی ابن زیاد کو حوصلہ بخشا کہ وہ اتنا گھناؤنا کام کرے کہ جس کی کوئی تلافی ممکن نہ تھی۔ پھر یہ بھی ثابت ہے کہ اس جرم عظیم کے بعد ابن زیاد کے گمان کے عین مطابق یزید نے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کی نہ باز پرس۔ پس یزید کو اس سانحے سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی عظیم تھی:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی عظیم تھی کیوں کہ صدیوں کے تجربات تواتر کے ساتھ ثابت کرتے آئے ہیں کہ اُمت کے لیے وسیع البنیاد شورائیت اور غیر موروثی حکمرانی کا وہی ماحول بہتر تھا جو خلافتِ راشدہ کا مایۂ امتیاز تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جدوجہد کا مقصد اسی معیار کی بازیافت تھا۔ اس محور سے انحراف یزید کے دور میں شروع ہوا اور بعد میں بتدریج بڑھتا گیا۔ یوں حکمرانوں کی مطلق العنانی اور موروثی طرزِ سیاست نے بڑے بڑے فتنوں اور تباہ کاریوں کو جنم دیا۔

[1] صحیح البخاری، ح: ۵۹۹۴، کتاب الادب، باب رحمة الولد وتقبیله

سانحہ کربلا، اسباقِ تاریخ:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سانحۂ شہادت سے جہاں دل صدمے سے پارہ پارہ ہوتے ہیں وہاں قضا وقدر اور تکوینی حکمتوں کا عقیدہ ہمیں صبر و برداشت کا سبق دیتا ہے۔ اس حادثے کے پس پردہ کیا حکمتیں تھیں؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ تاہم غور وفکر سے چند حکمتیں بہت واضح دکھائی دیتی ہیں۔

① اللہ جانتا تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کو کچھ لوگ مافوق الفطرت ہستیاں گمان کرلیں گے، انہیں غیب دان، حاجت روا اور مشکل کشا ماننے لگیں گے، واقعۂ کربلا ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے ایک دلیل بن سکتا ہے کہ اگر حسین رضی اللہ عنہ غیب دان، حاجت روا اور مشکل کشا ہوتے تو اس طرح مظلومانہ حالت میں شہید نہ کردیے جاتے بلکہ ان کے ایک اشارے سے تمام معاملات حل ہو جاتے۔

② حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس جدوجہد کا ہر ورق انسان کو ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی مفادات کے لیے کھڑے ہونے، خطرات مول لینے اور جان کی بازی لگانے کا لازوال درس دیتا ہے۔

③ یہ سانحہ ماتم کا نہیں صبر وتحمل کا سبق سکھاتا ہے۔ ناقابلِ برداشت مصائب اور ناگہانی آفات کے وقت سوچ لینا چاہیے کہ اللہ کے امر اور تقدیر کے سامنے حسین رضی اللہ عنہ جیسے عالی مرتبہ انسان کو شہید ہونا پڑا، تو ہم کیا چیز ہیں۔

❀❀❀

سانحۂ حرّہ۔ اہل مدینہ کا یزید کے خلاف خروج

سانحۂ کربلا کے بعد عالم اسلام میں پھیلنے والی بے چینی کی لہر کا زیادہ زور حجاز میں تھا۔ جہاں ایک طرف مکہ مکرمہ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسے معرکہ آزما قائد اب تک یزید کی بیعت سے کنارہ کش تھے اور دوسری طرف اہلِ مدینہ جو خانوادۂ رسول کے عاشق تھے، اس حادثے پر سکتے کے عالم میں تھے۔ ان کی اکثریت نے شروع ہی سے یزید کی خلافت کو دلی رغبت سے قبول نہیں کیا تھا۔ اور اب حادثۂ کربلا نے ان کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ دیا تھا۔

اُدھر یزید اپنی متاثر شدہ ساکھ بحال کرنے کی پوری سعی کر رہا تھا۔ اسی لیے اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کو شام مدعو کر کے ان کا خوب اعزاز واکرام کیا۔ ① اسی مقصد کے لیے ۶۳ھ کے آغاز میں یزید نے مدینہ کے حاکم عثمان بن محمد کو حکم دیا کہ وہ مقامی شرفاء اور عمائد کا ایک وفد شام بھیج دے۔ ② حکم پر عمل ہوا اور اہلِ مدینہ کے کئی بزرگ شام پہنچ کر یزید کے مہمان بنے۔ ان میں عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن حنظلہ، معقل بن سنان رضی اللہ عنہم،

① انساب الاشراف: ۲۷۷/۳، ۲۷۸، ط دار الفکر
② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ۲۳۶

عبداللہ بن عمرو بن حزم، منذر بن زبیر بن عوام، عباس بن سہل بن سعد اور عثمان بن عطاء رحمہم اللہ نمایاں تھے۔ یزید نے ان حضرات کی بڑی خاطر مدارات کی اور عطایا و ہدایا دے کر رخصت کیا۔ ①

اس اعزاز و اکرام کے باوجود شام کے دورے کے بعد مدینہ کے اکابر یزید سے سخت متنفر ہو کر واپس آئے اور آتے ہی یزید کے خلاف خروج کا اعلان کر دیا۔ دراصل یہ حضرات شام سے یہ تاثر لے کر واپس آئے تھے کہ یزید نماز ترک کرنے اور مے نوشی جیسے بعض کبیرہ گناہوں میں ملوث ہے۔ ②

یہ حقیقت متواتر طور پر ثابت ہے کہ ان حضرات نے یزید کے خلاف خروج کیا اور اس کی حکومت گرانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی۔ اس سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ کم از کم خروج کرنے والے صحابہ اور تابعین کو یزید کے بعض سنگین برائیوں میں ملوث ہونے کا یقین تھا اور ان حضرات کے نزدیک فاسق کی حکمرانی قبول کرنا جائز نہ تھا بلکہ اس کے خلاف مسلح جدوجہد ضروری تھی۔ غالباً ان کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا:

مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ۔

''تم میں سے جو کوئی کسی گناہ کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ کی طاقت سے روک دے۔'' ③

اگرچہ صحابہ اور تابعین کی بڑی تعداد یزید کے خلاف کسی تحریک میں شامل ہونے سے گریزاں رہی مگر اس کی وجہ یزید کی حمایت یا اس کی محبت و عقیدت نہیں بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات تھے جن میں حکمران کے ذاتی فسق و فجور کی وجہ سے اس کے خلاف بغاوت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ④ ان ارشاداتِ نبویہ کی بناء پر جمہور اُمت کا مسلک یہ رہا ہے کہ حکمران چاہے فاسق و فاجر ہو مگر جب تک کھلم کھلا کفر کا مرتکب نہ ہو، اس کی بیعت نہ توڑی جائے، ہاں غیر شرعی کاموں میں اس کی اطاعت نہ کی جائے۔ ⑤ یزید کا فسق و فجور مشہور ہو جانے سے، امت کی تاریخ میں ایسا پہلا موقع آیا جب مسلمانوں کو اس قضیے سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ شاید اس میں اللہ کی تکوینی حکمت یہ تھی کہ ان مسائل میں عظیم ہستیوں کا طرزِ عمل تا قیامت رہنمائی کا کام دیتا رہے۔ اسی لیے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے تحریک کے روحِ رواں عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ کو یزید کے خلاف خروج سے منع کیا۔ اور اپنے بیٹوں اور خادموں کو بھی اس کش مکش سے الگ رہنے کی تلقین کی۔ ⑥

سکوت کا راستہ اختیار کرنے والے اکثریتی طبقے میں خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت زین العابدین رحمہ اللہ بھی شامل تھے جو مدینہ میں رہتے ہوئے بھی خروج میں نہ شریک ہوئے۔ ⑦ تاہم حضرت معقل بن سنان رضی اللہ عنہ، حضرت

---

① تاریخ دمشق: ۲۶/۲۵۸، ۲۵۹؛ انساب الاشراف: ۵/۳۳۰؛ تاریخ الطبری: ۵/۴۸۰

② دلائل النبوۃ بیہقی ۶ ص ۴۷۳؛ خلیفہ بن خیاط ۲۳۷، تاریخ الاسلام ذہبی ۵ ص ۲۷۳؛ البدایہ والنہایہ: ۱۱ ص ۶۵۳

③ صحیح مسلم، ح: ۱۸۶؛ سنن ابی داؤد، ح: ۴۳۴۰؛ سنن ابن ماجہ، ح: ۴۰۱۳؛ مسند ابی یعلی، ح: ۱۰۰۹

④ صحیح مسلم: ۱۸۵۵، ۱۸۵۴

⑤ ولا نری الخروج علی أئمتنا وولاۃ أمورنا، وإن جاروا، ولا ندعو علیھم، ولا ننزع یدا من طاعتھم۔ (العقیدۃ الطحاویۃ: ص ۶۸)

⑥ صحیح مسلم، ح: ۳۸۹۹؛ صحیح البخاری، ح: ۷۱۱۱ ⑦ سیر اعلام النبلاء: ۴ ص ۳۸۶ تا ۳۹۰

عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابرِ مدینہ بھی اپنی جگہ دلائل رکھتے تھے۔ ان کے اجتہاد کے مطابق حکمران ذاتی فسق کی وجہ سے معزول کر دیے جانے کے قابل ہوتا تھا۔ ایسے حکمران کے خلاف خروج کو بعض علماء جائز اور بعض واجب کہتے ہیں۔ ① (اگرچہ جمہور علمائے اُمت عام حالات میں فاسق حکمران کے خلاف ترکِ خروج کے قائل ہیں۔)

اکابرِ مدینہ نے طے کیا کہ وہ حکومت کو مہاجرین و انصار کی رضامندی اور شورائیت کے اصول پر چلائیں گے نہ کہ موروثی نظام پر۔ اہلِ مدینہ نے ایک شہری حکومت ترتیب دی جس میں عام مہاجرین کی کمان معقل بن سنان رضی اللہ عنہ کو سونپی گئی۔ قریش کے لیے عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا گیا۔ انصار عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت آ گئے۔ ②

عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ نے بڑی شدت کے ساتھ لوگوں کو اہلِ شام سے لڑائی پر ابھارا اور بیعت لی کہ لڑتے لڑتے مر جائیں گے لیکن لڑائی سے فرار نہ ہوں گے۔ اس طرح گویا فنا و بقا کے معرکے کی تیاری کر لی گئی۔ ③

اُدھر یزید نے یہ سن کر جارحانہ انداز اختیار کیا اور فیصلہ کیا کہ پہلے مدینہ منورہ اور اس کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مکہ معظمہ پر لشکر کشی کی جائے گی۔ دمشق میں موجود عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ اور صخر بن عبید مدنی رحمہ اللہ جیسے بزرگوں نے پرزور سفارش کی کہ یہ مہم ترک کر دی جائے مگر یزید نے ارادہ نہ بدلا۔ ④ حرمین شریفین پر حملہ کرنے کا سوچتے ہی ہر کسی کا دل کانپ اٹھتا تھا اس لیے یزید کی تاکید کے باوجود اس کے امراء میں سے کوئی بھی اس مہم کے لیے تیار نہ ہوا۔ ⑤ آخر عبیداللہ بن زیاد کو اس فوج کی قیادت کا حکم بھیجا گیا مگر اس جیسے شقی القلب نے بھی کہہ دیا: ''میں اس فاسق کی خاطر ان دونوں کاموں کو جمع نہ کروں گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کو قتل بھی میں ہی کروں اور بیت اللہ پر حملہ بھی میں ہی کروں۔'' ⑥ آخر یزید نے مسلم بن عقبہ جیسے سخت مزاج آدمی کو یہ مہم سونپی۔ ⑦ یزید نے اسے تاکید کی:

''تین دن تک اہلِ مدینہ کو اطاعت کی دعوت دینا، پھر بھی نہ مانیں تو لڑنا۔'' ⑧

شامی فوج کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ ⑨ دوسری طرف مدینہ منورہ میں لڑنے والے صرف دو ہزار سرفروش تھے۔ ⑩

جنگِ حرّہ (ذوالحجہ ۶۳ھ):

مدینہ کے مشرق و مغرب میں جھلسے ہوئے ٹیلوں کے سلسلے کو ''حرّہ'' کہا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں آتش فشاں لاوے کے ابلنے سے یہ علاقہ جھلس گیا تھا۔ اس لیے یہ جگہ ''حرّہ'' کہلاتی تھی۔ ⑪ اہلِ مدینہ نے غزوۂ خندق کی طرز پر خندقیں کھود کر شہر کو محفوظ کر لیا تھا تاکہ محاصرانہ طویل لڑائی لڑی جا سکے۔ ⑫ تاہم مشرقی سمت سے حرّۂ واقم کا علاقہ کھلا تھا۔

---

① شرح عقائد نسفی ۲۱۰ ② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۶

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۶ بسند صحیح ④ تاریخ دمشق: ۲۳ ص ۲۷۴؛ طبقات ابن سعد: ۵/ ۱۳۵ ط صادر

⑤ تاریخ الطبری: ۵ ص ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵

⑥ ''لَا أَجْمَعُهُمَا لِلْفَاسِقِ أَبَدًا! أَقْتُلُ ابْنَ بِنْتِ رَسُولِ اللہِ ﷺ، وَأَغْزُو الْبَیْتَ؟'' (تاریخ الطبری: ۵ ص ۳۸۳)

⑦ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۷، ۲۳۸ ⑧ تاریخ الطبری: ۵: ص ۳۸۴، ۳۸۵

⑨ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۳۷، ۲۳۸ ⑩ طبقات ابن سعد: ۵/ ۱۳۶، ط صادر

⑪ معجم البلدان: ۲ ص ۲۴۹ ⑫ تاریخ الطبری ۵ ص ۴۹۵، بسند صحیح

اہل مدینہ لشکرِ شام کو روکنے کے لیے یہیں جمع ہوئے تھے۔ شامی سپاہی اسی سمت سے مدینہ کے سامنے پہنچے اور یہاں نہایت شدید جنگ ہوئی جس میں انجام کار شامی لشکر غالب رہا۔ ① یہ سانحہ ۲۷ ذوالحجہ ۶۳ھ کو پیش آیا۔ ②

اہل مدینہ کے کتنے افراد جاں بحق ہوئے:

حرہ کے سانحے نے ایک آتشیں بگولے کی طرح مہاجرین وانصار کے گلستان کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ایک عمدہ روایت کے مطابق: ''حرہ کے مقتولین سات سو افراد تھے جو قرآن مجید کے حافظ وقاری تھے۔'' ③

یاد رہے کہ واقدی نے عورتوں اور بچوں کو ملا کر مقتولین کی کل تعداد دس ہزار شمار کی ہے۔ ④ مگر یہ روایت واقدی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اسی طرح خون کی ندیاں بہہ کر مسجد نبوی بلکہ روضۂ اطہر تک پہنچنے کی روایات جو بہت مشہور ہیں، محض من گھڑت ہیں۔ بہرکیف واقعۂ حرہ اسلامی تاریخ کا وہ عظیم سانحہ تھا جس میں مہاجرین وانصار کی آل اولاد کا ایک بہت بڑا اور نہایت گراں قدر حصہ یک لخت فنا ہو گیا۔

شامی لشکر کے اہل مدینہ پر مظالم:

اگر اہل شام کی زور آزمائی صرف میدان جنگ میں مقابلے پر آنے والوں تک ہی محدود رہتی تو شاید اس کی گنجائش نکالی جا سکتی اور کہا جا سکتا کہ وہ بزعمِ خود ایک مسلم حکمران کے خلاف بغاوت کو کچل رہے تھے، مگر المیہ یہ تھا کہ فتح کے بعد مسلم بن عقبہ کی کمان میں شامی سپاہی تین دن تک شہر میں لوٹ مار کرتے رہے۔ ⑤ انہی مظالم کی بناء پر اسلاف مسلم بن عقبہ کو ''مُسرِف بن عقبہ'' کہا کرتے تھے۔ ⑥ ایسے لوگوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا بسند صحیح منقول ہے:

اَللّٰهُمَّ مَنْ ظَلَمَ أَہْلَ الْمَدِينَةِ، وَأَخَافَهُمْ فَأَخِفْهُ، وَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ صَرْفٌ وَلَا عَدْلٌ۔

''اے اللہ! جس نے اہلِ مدینہ پر ظلم کیا اور انہیں ڈرایا، اسے تو خوفزدہ کر، اور اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو، اس کا کوئی عمل اور کفارہ قبول نہ ہو۔'' ⑦

تین دن تک مسجدِ نبوی میں اذان واقامت کہنے والا کوئی نہ تھا، فقط سعید بن مسیب رحمہ اللہ مسجد میں پڑے رہتے تھے، جب نماز کا وقت ہوتا تو روضۂ اطہر سے ایک ہلکا سا ترنم سنائی دیتا۔ ⑧ جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ جو لڑائی میں شامل نہ تھے، ان کے گھر کو بھی لوٹا گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ایک اونٹ خرید کر انہیں قیمت میں جو دراہم یا

---

① خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۸؛ تاریخ دمشق: ۲۷ص ۴۳۰

② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۴۵ تا ۲۵۰

③ المعرفۃ والتاریخ: ۳/۳۲۵، ط الرسالۃ؛ تاریخ دمشق: ۵۴/۱۸۳؛ تاریخ الاسلام للذہبی: ۵/۳۰

④ المحن: ص ۱۸۳؛ وفاء الوفاء ۱ص ۱۳۲ ⑤ طبقات ابن سعد: ۵/۳۸، ط صادر، باسناد صحیح متصل

⑥ دلائل النبوۃ للبیہقی: ۶/۴۷۵، ط العلمیۃ؛ سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۲۳، ط الرسالۃ

⑦ مجمع الزوائد، ح: ۵۸۲۳، قال الہیثمی، رجالہ رجال الصحیح؛ المعجم الکبیر: ۱۳/۹۲، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ، باسناد حسن

⑧ سنن الدارمی: ۱/۲۲۷، ط دار المغنی۔ قال المحقق الدارانی: رجالہ ثقات

دینار دیے تھے، ان میں سے کچھ ان کے پاس اب تک تبرک کے طور پر محفوظ تھے مگر اس سانحے میں شامیوں نے ان سے یہ متاعِ عزیز بھی لوٹ لی۔ ① اس سانحے کے دن یہی جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے دو بیٹوں: محمد اور عبدالرحمن کا سہارا لیے جا رہے تھے کہ اچانک انہیں ایک پتھر سے ٹھوکر لگی، تو وہ یکدم بولے: ''ہلاک ہو وہ شخص جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دہشت زدہ کیا۔'' صاحبزادے بولے: ''ابا جان کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دہشت زدہ کر سکتا ہے؟''

صحابیٔ رسول نے اپنے دونوں پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے جس نے اس انصار کے قبیلے کو دہشت زدہ کیا، اس نے میرے ان دونوں (پہلوؤں) کے درمیان کی شے (دل) کو دہشت زدہ کیا۔'' ②

اگرچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت زین العابدین رحمہ اللہ اور کئی اکابر مع متعلقین محفوظ رہے تاہم عمومی طور پر اتنی لوٹ مار ہوئی کہ قحط پڑ گیا اور لوگ مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ صحابہ کرام نے انہیں اہلِ مدینہ کے لیے شفاعتِ نبویہ کی بشارت سنائی تاکہ وہ نقلِ مکانی سے رک جائیں۔ ③

یزید کے مداح بے سود تاویلات کے ذریعے کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح مدینہ منورہ کی بے حرمتی اور لوٹ مار کے الزام سے یزید کو بچا لیں مگر اسلاف کا موقف بالکل واضح ہے کہ اس ظلم کی ذمہ داری یزید پر ہی عائد ہوتی ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''هُوَ الَّذِیْ فَعَلَ بِالْمَدِیْنَةِ مَا فَعَلَ۔'' (اسی یزید نے تو مدینہ میں وہ سب کچھ کیا تھا۔) پوچھا گیا: اس نے کیا کیا تھا؟ فرمایا: ''نَهَبَهَا۔'' (اس نے مدینہ کو لوٹا۔) ④ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یزید نے مدینہ والوں کی طرف ایک لشکر بھیجا اور اسے حکم دیا کہ اگر وہ لوگ تین دن تک اطاعت کا اظہار نہ کریں تو تلوار کے زور پر مدینہ میں داخل ہو اور اسے تین دن تک لوٹے۔'' ⑤

مسلم بن عقبہ کا زبردستی بیعت لینا:

فتح کے بعد مسلم بن عقبہ نے مدینہ منورہ میں داخل ہو کر لوگوں سے یزید کی اطاعت پر بیعت لی اور اس کارروائی میں بڑی سختی کی۔ لوگوں کو جمع کر کے اعلان کیا: ''اس بات پر بیعت کرو کہ تم یزید بن معاویہ کے غلام ہو۔ وہ تمہارے گھروں اور جان و مال کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے گا۔'' ⑥ عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ کو شامیوں نے اسی بناء پر قتل کر دیا کہ انہوں نے مذکورہ الفاظ پر بیعت کرنے کی بجائے ''کتاب اللہ اور سنت پر بیعت کرتا ہوں۔'' کے الفاظ کہے تھے۔ ⑦

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا جو اس وقت تک حیات تھیں اس جبری بیعت کو ''بیعتِ ضلالت'' قرار دیتی تھیں۔ ⑧

❁❁❁

① صحیح البخاری، ح: ۲۶۰۳، کتاب الهبة، باب الهبة المقبوضة وغیر المقبوضة
② مسند ابی داؤد طیالسی، ح: ۱۸۶۷، باسناد حسن؛ مسند احمد، ح: ۱۳۸۱۸، باسناد صحیح
③ صحیح مسلم، ح: ۳۳۰۵، ۳۳۱۱_ کتاب الحج ④ السنة للخلال، ح: ۸۳۵ باسناد صحیح، ط دار الرایة
⑤ لبعث الیهم جیشا وامره اذا لم یطیعوه بعد ثلاث ان یدخلها بالسیف ویبیحها ثلاثا۔ (مجموع الفتاوی: ۳/۴۱۲)
⑥ تاریخ خلیفة، ص ۲۳۹ بسند صحیح؛ انساب الاشراف: ۵/۳۳۵ بسند صحیح؛ تاریخ الطبری: ۵/۴۹۵ بسند صحیح
⑦ تاریخ خلیفه بن خیاط: ص ۲۳۹ بسند صحیح ⑧ [illegible]

سانحۂ حصارِ کعبہ

(صفر ۶۴ھ)

ان تمام حوادث کے دوران حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں مسجد الحرام کی چار دیواری میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ کم از کم کائنات کے اس مقدس ترین گوشے میں وہ مامون رہیں گے۔ مکہ معظمہ میں سال کے چار ماہ حاجیوں اور باقی ایام میں عمرہ کے زائرین اور عبادت گزاروں کا ہجوم رہنے کی وجہ سے بھی یہ امید کی جاسکتی تھی کہ حکومت خواہ مخواہ یہاں کوئی مسلح کارروائی کرنے کی کوشش کر کے بدنامی مول نہیں لے گی۔ چنانچہ انہوں نے اپنا لقب ''العائذ باللہ'' اور ''عائذ بیتِ اللہ'' (اللہ کے گھر میں پناہ لینے والا) رکھ لیا۔①

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا اٹل موقف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے سے یہی تھا کہ اُمت میں نظامِ اقتدار موروثی نہیں شورائی ہونا چاہیے جس میں مرکزی کردار مہاجرین و انصار اور اُمت کے افضل ترین لوگوں کا ہو۔ یہی موقف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا رہا تھا۔ یزید نے تخت پر بیٹھنے کے بعد جب حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو بیعت پر مجبور کرنے کی کوشش کی تو ان حضرات کو فوری طور پر مدینہ چھوڑنا پڑا۔② جب وہ مکہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو یزید نے ولید بن عتبہ کو اس کوتاہی کا ذمہ دار سمجھتے ہوئے برطرف کر دیا اور عمرو بن سعید کا تقرر کیا۔③

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو مکہ آنے کے بعد بھی بنوامیہ کے حکام کی طرف سے مسلح کارروائی کے خدشات ضرور لاحق تھے۔④

اس کشیدہ فضا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اہل عراق کی حمایت کے ذریعے نظامِ حکومت کی اصلاح کی کوشش میں کامیابی کی امید لیے عراق روانہ ہوئے مگر کربلا میں گھیر کر شہید کر دیے گئے۔ اس کے کچھ عرصے بعد یزید کے حکم سے اس کے نئے حاکم حجاز عمرو بن سعید نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مکہ پر لشکر کشی کی۔ اس وقت ایک صحابی ابوشریح رضی اللہ عنہ نے عمرو بن سعید کو منع کرتے ہوئے کہا:

''یا امیر! اگر اجازت ہو تو ایک حدیث سناؤں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بذاتِ خود کانوں سے سنی، آنکھوں سے دیکھی اور دل میں اسے محفوظ رکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مکہ کو اللہ نے محترم بنادیا ہے۔ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے کے لیے جائز نہیں کہ یہاں خون بہائے بلکہ یہاں کا درخت تک اکھاڑے۔''

ابوشریح رضی اللہ عنہ کی اس سلیقہ آمیز گفتگو اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں عمرو بن سعید نے بڑی سختی سے کہا:

---

① تاریخ دمشق ۲۸/ص ۲۰۸؛ انساب الاشراف ۲/ص ۱۰۳ عن عوانہ

② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۳

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۳

④ اخبار مکۃ للفاکہی: ۲/۲۳۲ بسند صحیح، ط دار خضر

''ابوشریح! میں تم سے زیادہ جانتا ہوں کہ مکہ کسی گناہ گار، کسی مفرور قاتل اور کسی مفرور مجرم کو نہیں بچا سکتا۔''①

عمرو بن سعید کا لشکر مکہ پہنچا تو مقامی لوگ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مصاحب حضرت عبداللہ بن صفوان کی قیادت میں جمع ہوگئے اور مقابلے میں بڑی پامردی دکھائی۔ آخر کار عمرو بن سعید کا لشکر ناکام واپس آیا۔②

عمرو بن سعید کے ناکام حملے کے بعد یزید نے یکدم لچک دار رویہ اپنا لیا اور وفد بھیج کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پیش کش کی کہ وہ بیعت کرلیں تو انہیں پورے حجاز کی ولایت دے دی جائے گی۔ اس کے علاوہ اگر وہ اپنے خاندان کے کسی اور فرد کو کہیں کا حاکم مقرر کرانا چاہتے ہیں تو جہاں وہ کہیں گے اس کا تقرر کر دیا جائے گا۔ اگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا مقصد حکومت حاصل کرنا ہوتا تو ان کے لیے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہ تھا مگر انہوں نے یہ پیش کش مسترد کردی۔③

وجہ یہ تھی کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ایک اصول کی بنیاد پر حکومت سے اختلاف کر رہے تھے۔ ان کا یزید سے بیعت نہ کرنا اپنے اجتہاد اور فتوے کی رو سے تھا اور اس وقت نہ صرف یہ کہ بیعت سے احتراز کا اصل سبب یعنی خلافت کا ملوکیت میں ڈھلنا سامنے تھا بلکہ کربلا کے المیے سے حکام کی اہلیت کی قلعی بھی کھل چکی تھی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ یزید کے فسق و فجور کی خبریں عام ہو رہی تھیں اور اہل مدینہ کا خروج انہی برائیوں کی شہرت کی وجہ سے ہوا تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اقدامات سے ظاہر ہے کہ وہ فاسق حکمران کو بزور قوت برطرف کرنے کی کوشش واجب تصور کرتے تھے اور انہیں یزید کے فسق و فجور کی خبروں پر یقین تھا۔ اس لیے یزید کی حکومت کا حصہ بننا ان کے نزدیک جائز نہ تھا۔④

---

①صحیح البخاری، ح: ۴۲۹۵

فائدہ: علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ عمرو بن سعید کے اس قول پر تبصرہ فرماتے ہیں: ''میں کہتا ہوں کہ عمرو بن سعید کا قول حق بات سے باطل معنی مراد لینے کی نوع سے ہے، کیوں کہ اس کا مصداق عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہرگز نہیں تھے، بلکہ اس کا اطلاق خود عمرو بن سعید اور یزید پر ہوتا ہے۔''

قولہ: ان الحرم لا یعیذ عاصیا، قلت: ہو من باب کلمۃ حق ارید بہا الباطل، فانہ لا یصدق علی ابن الزبیر اصلا، بل یصدق علیہ وعلی یزید۔ (فیض الباری: ۱ ص ۲۸۸، ط دار الکتب العلمیۃ)

اقوال بعض اسلاف واکابر بابت کردار یزید:

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ: کان قبیح الآثار فی الإسلام۔ ''یزید نے تاریخ اسلام میں بدنما آثار چھوڑے۔'' (جمھرۃ انساب العرب: ص ۱۱۲)

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ: ظہر فسق یزید عند الکافۃ من أہل عصرہ۔ ''یزید کے زمانے کے تمام لوگوں پر اس کا فسق ظاہر ہو چکا تھا۔'' (تاریخ ابن خلدون: ۱ ص ۲۶۹، مقدمۃ، ط دار الفکر)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: و کان منہمکا فی لذاتہ و مقتہ أہل الفضل بسبب قتلہ الحسین ثم بسبب وقعۃ الحرۃ۔ ''یزید نفسانی لذات کی تکمیل میں منہمک رہتا تھا۔ اہل علم و فضل نے اس کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرانے اور پھر سانحۂ حرہ کے باعث اس سے نفرت کی ہے۔'' (تعجیل المنفعۃ: ۲ ص ۳۷۸، ط دار البشائر)

علامہ ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ: فہو فاسق شریر سکیر جائر۔ ''وہ فاسق، شریر، نشہ باز اور ظالم تھا۔'' (الصواعق المحرقۃ: ۲/۶۳۲)

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ: ''یزید بدبخت فاسقوں کے زمرے میں سے ہے۔'' (مکتوبات مجدد الف ثانی: ۲ ص ۱۹۱، دفتر اول مکتوب نمبر ۲۵۱)

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ: ''یزید فاسق تھا اور فاسق کی ولایت (انعقاد حکومت) مختلف فیہ ہے۔'' (امداد الفتاویٰ: ۴/۴۶۵، ط دار العلوم کراچی)

②تاریخ الطبری: ۵ ص ۳۴۳ تا ۳۴۷

③تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۲ ④تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۲

یزید کو اپنی پیش کش کے مسترد کیے جانے کے بعد سخت غصہ آیا۔ اس نے طیش میں آکر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تذلیل کا فیصلہ کرلیا اور قسم کھائی کہ اب وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت اسی وقت قبول کرے گا جب وہ ہاتھوں میں ہتھکڑی اور گلے میں طوق پہنا کر لائے جائیں گے۔ ①

یزید کے مشیر اسے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سخت سلوک سے روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ یزید کے بیٹے معاویہ نے بھی منع کیا اور کہا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ایسی ذلت کبھی قبول نہیں کریں گے۔ معاویہ نے اپنی مدد کے لیے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے بھی سفارش کروائی مگر یزید کا فیصلہ اٹل تھا۔ ② اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھا:

"میں تمہاری چاندی کی زنجیر، سونے کی بیڑیاں اور چاندی کی ہتھکڑیاں بھیج رہا ہوں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ تم یہ پہن کر میرے پاس آؤ گے۔" ③

یزید کے سفیر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ملے اور یہ پیغام سنایا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس ذلت کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور فرمایا: "اللہ اس کی قسم پوری نہ ہونے دے۔" پھر یہ اشعار پڑھے:

إِنِّي لَمِنْ نَبْعَةٍ صُمٍّ مَكَاسِرُهَا إِذَا تَنَاوَحَتِ الْقَصْبَاءُ وَالْعُشَرُ

"میں وہ شاخ ہوں جو جھکانے میں بہت سخت ہے چاہے بڑے بڑے درخت جھک جائیں۔"

وَلَا أَلِينُ لِغَيْرِ الْحَقِّ أَسْأَلُهُ حَتَّى يَلِينَ لِضِرْسِ الْمَاضِغِ الْحَجَرُ

"میں جس حق کا سوالی ہوں اس کے بغیر نرم نہیں پڑ سکتا چاہے چبانے والے کی ڈاڑھ میں پتھر نرم پڑ جائے۔"

یہ کہہ کر فرمایا: "اللہ کی قسم! عزت کے ساتھ تلوار کا وار سہہ لینا، ذلت کے ساتھ کوڑے کھانے سے بہتر ہے۔" ④

آخر میں فرمایا: "اللہ کی قسم! میں کبھی یزید کی بیعت کروں گا نہ اس کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہوں گا۔" ⑤

اس جواب سے یزید کا بغض اور طیش مزید بڑھ گیا اور اس کے حکم سے حرہ کی لڑائی کے بعد مسلم بن عقبہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف کارروائی کے لیے مکہ کی طرف کوچ کیا۔ مگر وہ بیمار تھا اور عمر رسیدہ بھی۔ راستے میں مرض کی شدت بہت بڑھ گئی اور بچنے کی امید نہ رہی۔ سات محرم کو وہ اَبواء کے قریب ہلاک ہوگیا۔ ⑥ مرنے سے پہلے اس نے یزید کی ہدایت کے مطابق حصین بن نمیر کو بلا کر اپنی جگہ لشکر کا امیر مقرر کردیا۔ ⑦ حصین بن نمیر ۲۶ محرم ۶۴ھ کو شامی لشکر کے ساتھ مکہ پہنچ گیا۔ ⑧ تقریباً دو ہفتوں تک بات چیت کے بعد اتوار ۱۳ صفر ۶۴ھ کو جھڑپوں کا آغاز ہوگیا۔ ⑨

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۲؛ مجمع الزوائد، ح: ۱۲۰۸۳

② طبقات ابن سعد، متمم الصحابۃ طبقہ خامسہ: ۲/ ۴۳، ۴۴ ③ تاریخ دمشق: ۲۸/ ص ۲۰۹ بسند صحیح

④ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳/ ۹۲ باسناد حسن ⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۲۵۱؛ تاریخ الطبری: ۵/ ۴۷۲ بسند جید

⑥ طبقات ابن سعد، جزء متمم الصحابۃ الطبقۃ الخامسۃ: ۲/ ۶۷؛ تاریخ الطبری: ۵/ ۴۹۶

⑦ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۵ ⑧ طبقات ابن سعد، جزء متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۲/ ۶۷؛ الکامل فی التاریخ: ۳/ ۲۲۱

⑨ انساب الاشراف: ۵/ ۳۳۷، ط دار الفکر بسند حسن

حصین بن نمیر رفتہ رفتہ گھیرا تنگ کرتا گیا۔ ربیع الاول ۶۴ھ کا چاند طلوع ہوا تو وہ مسجد الحرام کی قریبی پہاڑیوں کوہ ابو قُبَیس اور کوہِ قُعَیقَعان پر قابض ہو چکا تھا۔ یہاں سے اس نے منجنیق کے ذریعے محصورین پر سنگ باری شروع کی جو اتنی شدید تھی کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کا کوئی ساتھی طواف کرنے کعبہ کے قریب نہیں آسکتے تھے۔ اس دوران عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے قریبی ساتھی اور صحابی حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سنگ باری کی زد میں آکر شہید ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت مصعب رحمہ اللہ بھی کام آئے۔ ①

کعبہ شریف کی آتش زدگی:

مسلسل پتھر گرنے سے کعبہ شریف کی عمارت شکستہ ہو گئی۔ پھر ایک دن جب آندھی چل رہی تھی، شامی فوج کے ایک سپاہی نے اپنے نیزے کو آگ لگا کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خیمے کا نشانہ لیا۔ خیمہ جلنے لگا تو ہوا کے تیز جھونکوں نے شعلوں کا رخ کعبہ کی طرف کر دیا۔ پہلے غلافِ کعبہ سوختہ ہوا، پھر کعبہ کی عمارت نے جو اینٹوں کے علاوہ ساج کی لکڑی سے بنی تھی، آگ پکڑ لی۔ ② یہ حادثہ ہفتہ ۵ ربیع الاول کو وقوع پزیر ہوا۔ ③

اس کے چند دن بعد ۱۴ ربیع الاول ۶۴ھ کو ۳۸ سالہ یزید بن معاویہ ۳ سال ۷ ماہ ۲۲ دن کی حکومت کے بعد دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس وقت وہ "حوارین" میں مقیم تھا۔ اس کے لڑکے معاویہ بن یزید نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ④

یزید کے دور کی عسکری مہمات پر ایک نظر:

یزید کے دور میں سرحدوں پر اسلامی افواج تعینات رہیں، بعض جگہ انہوں نے پیش قدمی کی، بعض مقامات پر پیچھے ہٹیں، بعض جگہ بغاوتوں کی سرکوبی کی۔ سرحدوں پر اکثر وہی جرنیل تھے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں تھے۔ ان میں جنادہ بن امیہ، منذر بن جارود، سنان بن سلمہ، مسلمہ بن مخلد، عقبہ بن نافع، زہیر بن القیس اور ابوالمہاجر دینار رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے سیاسی انقلابات سے قطع نظر اپنے اپنے مفوضہ اہداف پر توجہ مرکوز رکھی۔

یزید کے دور میں عقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے افریقی قبائل کے خلاف فوج کشی کی اور دشمنوں کو کچلتے ہوئے "تاھَرت" تک یلغار کی جہاں رومیوں اور افریقی بربروں کا لشکر جرار اکٹھا تھا۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا۔ پھر وہ مراکش کو فتح کرتے ہوئے بحرِ اوقیانوس تک پہنچ گئے اور سمندر میں گھوڑا ڈال کر والہانہ انداز میں کہا:

"الٰہی! اگر یہ سمندر حائل نہ ہوتا تو جہاں تک زمین ملتی جہاد کرتا چلا جاتا۔ یا اللہ! تو جانتا ہے ہم کسی غرور و سرکشی کی بناء پر یہاں تک نہیں آئے۔ ہم اسی مقصد کے لیے نکلے ہیں جو تیرے بندے ذوالقرنین کو مطلوب تھا کہ صرف تیری عبادت کی جائے اور تیرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ یا اللہ! ہم کفر کے مخالف اور اسلام

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۶۳۳؛ المحن، ص ۲۰۳؛ طبقات ابن سعد متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۲/۶۷

② المحن: ص ۲۰۳، ۲۰۴؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۲

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۵ ④ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۵

کے محافظ ہیں۔ پس تو ہمارا حامی بن جا، ہمارے خلاف نہ ہو۔"

یہ دعا کرتے ہوئے عقبہ بن نافع واپس ہوئے مگر اس دوران افریقی قبائل کے ایک اچانک حملے میں وہ اپنی تقریباً پوری فوج سمیت شہید ہو گئے اور نہ صرف تمام مفتوحہ علاقے ہاتھ سے نکل گئے بلکہ افریقی قبائل پیش قدمی کرتے ہوئے "قیروان" تک پہنچ گئے۔ یہ واقعہ عین انہی دنوں کا ہے جب یزید کی ایک فوج مدینہ پر حملہ کر رہی تھی۔ ①

خراسان اور بجستان کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں کابل تک فتح کیا جا چکا تھا۔ یزید نے یہ تمام علاقہ عبیداللہ بن زیاد کے بھائی سلم بن زیاد کی ولایت میں دے دیا جس نے بجستان (جنوبی وسطی افغانستان) کی حکومت اپنے دوسرے بھائی یزید بن زیاد کو دے دی۔ اس نے کابل کی حکومت اپنے تیسرے بھائی عبیدہ بن زیاد کو سونپ دی۔

مگر آلِ زیاد کی یہ حکومت بالکل ناکام رہی اور کچھ ہی دن بعد اہلِ کابل نے بغاوت کر کے عبیدہ بن زیاد کو قیدی بنا لیا۔ یزید بن زیاد نے بھائی کی بازیابی کے لیے ایک لشکر بھیجا جسے اہلِ کابل نے شکست فاش دے دی۔ مسلمان بڑی تعداد میں شہید ہوئے جن میں خود یزید بن زیاد کے علاوہ عثمان بن آدم، یزید بن عبداللہ بن ابی ملیکہ اور صلہ بن اشیمؒ جیسے نامور رجالِ کار بھی شامل تھے۔ اولادِ زیاد کو اپنی ساکھ بچانا مشکل ہو گیا اور سلم بن زیاد نے طلحہ بن عبداللہ (طلحۃ الطلحات) کو بجستان کا والی بنا دیا۔ طلحہ بن عبداللہ نے اہلِ کابل کو پانچ لاکھ دراہم کا فدیہ دے کر عبیدہ کو رہا کرایا۔

کچھ مدت بعد طلحہ کی وفات ہو گئی اور بنو یشکر کے ایک شخص کو بجستان کا والی بنایا گیا۔ اس نے ایسی نالائقی کا مظاہرہ کیا کہ علاقے سے مضری قبائل کو جلاوطن کر دیا جس کی بناء پر عرب قبائل کے مابین تعصب بھڑک اٹھا۔ اس صورتحال سے کابل کے مجوسی بادشاہ رتبیل کو مزید تقویت ملی۔ ②

وسطِ ایشیا کے محاذ پر دورِ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ میں مسلمان سمرقند، بخارا، نسف اور بیکند سمیت ماوراء النہر کا اکثر علاقہ فتح کر چکے تھے۔ مگر مقامی سرداروں کی بغاوت کے باعث یزید کے دور میں والیِ خراسان سلم بن زیاد نے یہاں از سرِ نو فوج کشی کی۔ اہلِ سمرقند اور اہلِ خوارزم نے مال دے کر صلح کر لی جبکہ خُجَنْدَہ کے محاذ پر مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ ③

۶۲ھ میں عبداللہ بن اسد بن کرز نے قیساریہ کی سمت حملہ کیا۔ اسی سال موسم گرما کے جہاد میں حصین بن نمیر نے سوریا پر چڑھائی کی۔ اسی سال عبیداللہ بن زیاد نے منذر بن جارود کو قندابیل کے محاذ پر تعینات کیا۔ منذر اس مہم میں فوت ہو گئے، ان کے بیٹے نے مہم جاری رکھی اور قندابیل پر قبضہ کر لیا۔ عبیداللہ بن زیاد نے اس کے بعد سنان بن سلمہ کو موقان کی مہم پر روانہ کیا۔ یزید بن معاویہ نے اس محاذ پر عبدالرحمٰن بن یزید ہلالی کو بھیجا۔ ④

---

① مختصر تاریخ دمشق: ۱۷/۱۱۱، ۱۱۲؛ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۱/۲۳؛ الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصی: ۱/۱۳۵ تا ۱۴۰؛ الکامل فی التاریخ، سن ۶۲ھ، ۶۳ھ

② الکامل فی التاریخ: ۳ص ۱۹۹؛ تاریخ الطبری سنۃ ۶۱ھ؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط: ص ۲۳۶، ۲۵۰، ۲۵۱

③ الکامل فی التاریخ: ۳ص ۱۹۸، ۱۹۹؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۶

④ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۳۵، ۲۳۶؛ الکامل فی التاریخ ۶۱ ہجری

تاہم یزید کے دور میں ایسی کوئی فتح نہیں ہوئی جس کا تاریخ میں اہم کردار ہو۔ زیادہ تر انہی شہروں پر دوبارہ حملے ہوئے جنہیں مسلمان پہلے فتح کر چکے تھے اور وہاں بغاوت ہوگئی تھی۔ ہاں عقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے ایک وسیع علاقہ فتح کرلیا تھا مگر یزید کی خلافت کے آخری سال میں نہ صرف وہ سارا علاقہ ہاتھ سے نکل گیا بلکہ کفار مزید آگے بڑھ کر قیروان پر بھی قابض ہوگئے جو افریقہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی چھاؤنی تھی۔

مجموعی طور پر یزید کے دور میں دولتِ امویہ کے رقبے میں اضافہ نہیں، بلکہ واضح کمی ہوئی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں افریقہ میں دولتِ اُمویہ کی حدود قیروان سے آگے قرطاجنہ تک وسیع ہو چکی تھیں۔ یزید کے دور کے اختتام پر افریقی قبائل نہ صرف قرطاجنہ بلکہ قیروان پر بھی قابض ہو چکے تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں خراسان و بجستان میں دولتِ امویہ کا دائرہ کابل تک وسیع تھا۔ دورِ یزیدی میں کابل کا نہایت اہم صوبہ ہاتھ سے نکل گیا۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ یزید نے یورپ پر فوج کشی ملتوی کردی۔ اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی کہا:

"معاویہ رضی اللہ عنہ تمھیں سمندری مہمات کے لیے بھیجا کرتے تھے، میں نہیں بھیجوں گا۔ وہ موسم سرما میں بھی روم کی سرحدوں پر لشکر تعینات رکھتے تھے، میں موسم سرما میں کسی کو وہاں تعینات نہیں کروں گا۔"①

حالانکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یزید اور اپنے رفقاء کو آخری وصیت یہ تھی:

"اہلِ روم کا گلا گھونٹ ڈالو؛ کیوں کہ تم ان کے ذریعے دوسری اقوام پر قابو پا سکو گے۔"②

رومیوں پر حملوں کے لیے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جزیرۂ روڈس کو بڑی مشکل سے فتح کر کے ایک بڑی چھاؤنی میں تبدیل کیا تھا مگر یزید نے تخت نشین ہو کر وہاں سے مجاہدین کو واپس بلایا جبکہ وہاں مسلمانوں کے قدم گڑ چکے تھے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے آخری ایام میں مجاہدین کو وہاں جمے رہنے کی خاص تاکید کر چکے تھے۔③

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام نے قبرص کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں بڑی قربانیاں دے کر فتح کیا تھا مگر یزید نے خلیفہ بنتے ہی وہاں سے بھی بلا وجہ فوج واپس بلالی۔④ روڈس اور قبرص سے انخلاء کا فیصلہ سخت نقصان دہ ثابت ہوا کیوں کہ یہ انتہائی اہم عسکری مقام تھے۔ اہلِ قبرص سے تو ایک معاہدے کے تحت تعلقات رہے مگر روڈس سے مسلمانوں کے نکلتے ہی یونانیوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد ایک ہزار سال تک مختلف مسلم حکمران اس پر قبضے کی کوشش کرتے رہے مگر ناکام رہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں عثمانی سلاطین نے اسے بڑی مشکل سے فتح کیا مگر دو صدیوں بعد یونانیوں نے پھر اسے چھین لیا۔ اگر یزید اس محاذ کو اہمیت دیتا اور یہاں سے انخلاء نہ کراتا تو پہلی صدی ہجری میں روڈس مسلم شہر بن گیا ہوتا اور اسے چھاؤنی بنا کر یورپ کی فتح مسلمانوں کے لیے آسان ہو جاتی۔

❁❁❁

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۱/۶۰۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۳/۲۳۷ بسند حسن، ط الرسالۃ

② "شُدُّوا خِنَاقَ الرُّومِ، فَإِنَّكُمْ تَضْبِطُونَ بِذَلِكَ غَيْرَهُمْ مِنَ الْأُمَمِ." (تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۳۰)

③ المعرفۃ والتاریخ: ۳/۳۲۳ ط الرسالۃ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱ ص ۲۵۹ ④ فتوح البلدان، ص ۱۵۳، ط الہلال

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عراق کا سفر کیوں کیا؟ ان کا موقف کیا تھا؟

❷ جن صحابہ کرام نے یزید کی بیعت کر لی تھی، ان کا نظریہ کیا تھا؟

❸ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو یزید نے کوفہ کی امارت سے برطرف کیوں کیا؟

❹ بعض صحابہ کرام حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عراق جانے سے کیوں منع کر رہے تھے؟

❺ سانحۂ کربلا کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

❻ کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تحریک پر خروج کا اطلاق ہوتا ہے؟

❼ سانحۂ حرہ کیسے پیش آیا؟ مسلم بن عقبہ نے اہلِ مدینہ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

❽ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو یزید نے کیا پیش کش کی اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسے کیوں ٹھکرایا؟

❾ یزید کے دور کی عسکری مہمات سے عالمِ اسلام کے رقبے میں کتنا اضافہ ہوا؟

عملی کام:

❁ ایک چارٹ پر اہلِ بیت کے مناقب سے متعلقہ تین احادیثِ نبویہ خوش خط لکھ کر آویزاں کریں۔

❁ مدینہ منورہ کا نقشہ دیکھ کر جنگِ حرہ کے مقام کی نشاندہی کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ یزید کی شخصیت اہلِ سنت کی نظر میں......از حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ

❁ ناصبیت تحقیق کے بھیس میں......از حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ

❁ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ (مجموعۂ مضامینِ اکابر) مطبوعہ ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، ملتان

❁ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ وسیّدنا حسین رضی اللہ عنہ......از حضرت قاضی اطہر مبارکپوری رحمہ اللہ

(اہم گزارش: محمود احمد عباسی امروہوی کا پھیلایا ہوا فتنۂ ناصبیت اس زمانے میں طلبہ وفضلائے مدارس کو بُری طرح متاثر کر رہا ہے اور انہیں اسلاف کی علمی تراث اور اکابر کے مسلک سے بیگانہ کر کے گمراہی کی طرف لے جا رہا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ مذکورہ کتب کا اہتمام سے مطالعہ کیا جائے جن سے اس فتنے کی حقیقت بخوبی سمجھ آسکتی ہے۔)

تیسرا باب

خلافتِ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

رجب ۶۴ھ.......تا....... جمادی الاولیٰ ۷۳ھ

مارچ ۶۸۴ء.......تا.......اکتوبر ۶۹۲ء

تعارف:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اسلامی تاریخ کے ممتاز خلفاء میں سے ایک تھے۔ ان کی سیرت بہترین اور ان کا کردار اعلیٰ تھا۔ ان کا تمام دور خوارج، بنومروان اور مختار ثقفی جیسے فتنوں سے نبرد آزمائی میں گزرا۔ ان کی زندگی اور شہادت ہمیں ہمت و حوصلے اور استقلال و استقامت کا سبق دیتی ہے۔

اہداف و مقاصد:

اس باب کو پڑھ کر ان شاء اللہ آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1. حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب، نظریے اور تحریک سے آگاہ ہو سکیں۔
2. ان کی خلافت کے ثبوت کو شرعی دلائل کے ساتھ سمجھ سکیں۔
3. ان کے خلاف اہلِ شام کی باغیانہ تحریک اور حجاج بن یوسف کے حملے کے پسِ منظر کو جان سکیں۔
4. ان کی جرأت و عزیمت، قربانی اور سانحۂ شہادت سے روشناس ہو سکیں۔

(یونٹ:2.2)

خلافتِ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

فضائل ومناقب:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے نواسے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے لختِ جگر تھے۔ آپ کی والدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی بہن تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کے نانا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بالاتفاق پوری اُمت کے افضل ترین فرد تھے۔ آپ کی خالہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ وحبیبہ تھیں۔ آپ کی والدہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بالکل شروع میں اسلام لانے والی خواتین میں شامل تھیں۔ آپ کے والد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ اور ان چھ صحابہ کرام کی مجلسِ شوریٰ میں شامل تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کے چناؤ کے لیے تشکیل دی تھی۔ یہ چھ حضرات خلفائے راشدین کے بعد اُمت کے افضل ترین فرد شمار ہوتے تھے۔ الغرض آپ کو جو نسبتیں حاصل تھیں، ان میں سے ہر ایک قابلِ رشک تھی۔ ①

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہجرت کے پہلے سال پیدا ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لعابِ دہن اور کھجور کی گھٹی دی اور برکت کی دعا فرمائی۔ اس زمانے میں یہودیوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ جادوٹونے کے ذریعے مسلمانوں میں لڑکوں کی پیدائش مسدود کر چکے ہیں۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت سے ان کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہو گیا جس سے مسلمانوں کو بے حد خوشی ہوئی۔ ②

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کو بیعت نہیں فرماتے تھے مگر جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے والد کے کہنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کے لیے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے انہیں بیعت فرمالیا۔ ان کے ساتھ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ، عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ اور کئی دوسرے بچوں کو بھی لایا گیا تھا۔ باقی بچے تو جھجک رہے تھے مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے، جن کی عمر سات یا آٹھ سال تھی، آگے بڑھ کر بیعت کرلی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: ''آخر ہے ناں اپنے باپ کا بیٹا۔'' ③

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بچپن سے بڑے بہادر اور قیادت کی صلاحیتوں سے آراستہ تھے۔ ایک بار لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر بچوں کو ڈرانے کے لیے زور کی چیخ ماری، بچے ڈر کر بھاگے مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے الٹے پاؤں پیچھے ہٹتے ہوئے ساتھیوں کو پکارا: ''بھائیو! مجھے امیر بنا کر اس شخص پر حملہ کردو۔''

① البدایہ والنہایہ ۱۲ ص ۱۹۳ ؛ سیر اعلام النبلاء ۳ ص ۳۷۰

② صحیح البخاری، ح: ۵۳۶۹، کتاب العقیقۃ، باب تسمیۃ المولود؛ ۳۹۰۹ ③ البدایہ والنہایہ: ۱۲ ص ۱۸۸

ایک بار گلی میں کھیل رہے تھے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا۔ اس وقت وہ خلیفہ تھے۔ بچے مرعوب ہو کر ادھر ادھر کھسک گئے مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وہیں کھڑے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا بات ہے تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہیں بھاگے۔'' جواب دیا: ''امیر المؤمنین! نہ تو میں نے کوئی جرم کیا ہے جو آپ سے ڈروں اور نہ ہی راستہ ایسا تنگ ہے کہ میں ہٹ کر اسے آپ کے لیے کشادہ کروں۔''①

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ صرف ۱۳ یا ۱۴ سال کی عمر میں دورِ صحابہ کی سب سے بڑی لڑائی جنگِ یرموک میں شریک ہوئے تھے۔ آپ اپنے والد زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ جب رومی پسپا ہو کر بھاگتے تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ان کے زخمیوں کو ٹھکانے لگاتے۔②

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ افریقہ فتح کرنے والے لشکر میں شامل تھے۔ آپ کی حیرت انگیز تدبیر کی وجہ سے ۲۰ ہزار مسلمان، ایک لاکھ بیس ہزار کفار پر غالب آگئے۔ آپ نے اس لڑائی میں خود چند سواروں کے ساتھ حملہ کر کے افریقی بادشاہ جرجیر کو قتل کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف باغیوں کی کارروائی روکنے کے لیے آپ نے جان کی بازی لگائی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں آپ رضی اللہ عنہ نے جہادِ قُسطَنطِینیّہ میں بھی شرکت کی۔③

ان کے بھائی عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے تھے: ''میں نے اپنے والد اور خالہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو کسی کے لیے اتنی دعائیں کرتا نہیں دیکھا جتنی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے لیے۔'' وہ یہ بھی کہتے ہیں: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے والد ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے زیادہ محبت عبداللہ بن زبیر سے تھی۔''④

زہد و عبادت میں اپنی مثال آپ تھے۔ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو دنیا کی ہر چیز سے ذہنی و قلبی رشتہ کٹ جاتا۔ نوافل میں طویل طویل رکعتیں پڑھتے۔ قیام کے دوران بدن کو ذرا بھی حرکت نہیں ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے لکڑی گاڑ دی گئی ہو۔ بعض اوقات اتنا لمبا سجدہ کرتے کہ چڑیاں آ کر پشت پر بیٹھ جاتیں۔⑤

مکہ کے محاصرے کے دوران جب منجنیقوں سے پتھر برس رہے تھے، تب بھی آپ کے اطمینان اور یکسوئی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ ایک بار منجنیق کا پتھر مسجد الحرام کے ایک بالا خانے پر لگا جس سے ایک ٹکڑا اڑ کر ان کے حلق اور داڑھی کے درمیان سے گزر گیا۔ تب بھی یہ پورے انہماک سے نماز میں مشغول رہے، جسم کو جنبش تک نہ ہوئی۔⑥

مشہور تھا کہ تین چیزوں میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں: عبادت میں، دلیری میں اور قوت بیان میں۔⑦

آپ کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرتا تھا اس لیے آپ ''حمامۃ المسجد'' (مسجد کے کبوتر) کے لقب سے مشہور تھے۔⑧

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خصوصی توجہ اور تربیت نے آپ کو حدیث و فقہ کا بحرِ ذخار بنا دیا تھا۔ اُمت کے

---

① تاریخ دمشق: ۲۸ص ۱۶۵
② السنن الکبری للبیہقی، ح: ۱۸۱۶۷؛ صحیح البخاری، ح: ۳۹۷۵، کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل
③ البدایہ والنہایہ: ۱۲ص ۱۸۷ ④ سیر اعلام النبلاء: ۳ص ۳۶۷ ⑤ البدایہ والنہایہ: ۱۱ص ۱۸۹
⑥ تاریخ دمشق: ۲۸ص ۱۷۳ ⑦ البدایہ والنہایہ: ۱۱ص ۱۹۳ ⑧ سیر اعلام النبلاء: ۳ص ۳۶۷

بہت سے فقہاء ومحدثین آپ کے شاگرد تھے جن میں آپ کی بھتیجی فاطمہ بنت منذر بن زبیر، بھائی عروہ بن الزبیر اور بھتیجے ہشام بن عروہ بھی شامل تھے۔ ① اس دور میں کہا جاتا تھا کہ عبداللہ نام کے چار حضرات فقہ میں سب سے بلند پایہ ہیں: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ۔ ②

سیاسی وانتظامی معاملات اور دنیاوی امور میں بھی آپ نہایت ہوشیار اور زیرک تھے۔ آپ کے پاس مختلف قبائل اور نسلوں کے غلام تھے جو الگ الگ زبانیں بولتے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہر ایک سے اس کی مادری زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ ان کی رفاقت میں رہنے والے ایک صاحب عمر بن قیس کہتے ہیں: ''میں جب انہیں دنیاوی معاملات میں مشغول دیکھتا تو (ہر فن میں ان کی مہارت دیکھ کر) محسوس ہوتا کہ انہیں اللہ سے کوئی تعلق نہیں اور جب آخرت کے متعلق ان کی حالت دیکھتا تو لگتا تھا کہ وہ پلک جھپکنے کے برابر بھی دنیا میں مشغول نہیں ہوتے۔'' ③

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے:

''وہ کتاب اللہ کے حافظ وقاری، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پابند، اللہ کے اطاعت گزار اور اللہ کے خوف سے گرمیوں میں (نفلی) روزے رکھنے والے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواری کے فرزند ہیں۔ ان کی والدہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں۔ ان کی خالہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تھیں جو اللہ کے حبیب کی چہیتی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ تھیں۔ ان کی قدر و قیمت کو وہی نظر انداز کر سکتا ہے جسے اللہ نے بصیرت سے محروم کر دیا ہو۔'' ④

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ان کا شمار صغار صحابہ میں ہوتا ہے مگر وہ علم، شرف، جہاد اور عبادت میں بہت بڑے تھے۔'' پھر فرماتے ہیں: '' وہ اپنے زمانہ میں قریش کے شہ سوار تھے اور ان کے جنگی کارنامے مشہور ہیں۔'' ⑤

دورِ خلافت:

ربیع الاوّل ۶۴ھ میں یزید بن معاویہ کی وفات ہوئی اور اس کا بیٹا معاویہ تخت نشین ہوا مگر اس نے کچھ ہی دن حکومت کی اور ۲ ربیع الآخر کو فوت ہو گیا۔ اس کی وصیت تھی کہ اُمت کے معاملات مسلمانوں کی باہم رضامندی اور شورائیت پر چھوڑ دیے جائیں۔ اس وقت عالم اسلام کی صورت حال یہ تھی کہ کچھ متعصب گروہوں کے سوا تقریباً تمام صحابہ کرام، تابعین، نیک وصالح لوگ اور عوام کے نزدیک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہی قیادت کے مستحق تھے۔

معاویہ بن یزید کی موت کی خبر ملنے پر شامی جرنیل حصین بن نمیر نے جو مکہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، جنگ ختم کر دی اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ اگر وہ شام چلے چلیں تو وہاں ان کی بیعت کی فضا بن جائے گی۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳/ص ۳۶۴ ② سیر اعلام النبلاء: ۳/ص ۳۶۷ ③ البدایہ والنہایہ: ۱۱/ص ۲۰۴

④ صحیح البخاری، ح: ۴۶۶۴، ۴۶۶۶؛ مستدرک حاکم، ح: ۶۳۳۱؛ حلیۃ الاولیاء: ۱/۳۳۳

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۳/۳۶۳، ۳۶۴

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے مشیروں سے رائے مانگی تو وہ بولے: ”کیا آپ اللہ کے حرم اور اس کی امان کو ترک کر دیں گے جہاں اللہ نے آپ کی نصرت کی ہے، اس کی بجائے آپ ایسے لوگوں سے مدد لیں گے جنہوں نے بیت اللہ پر حملہ کیا؟“ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے حُصین کو پیغام بھیج دیا: ”میرے ساتھی شام جانے پر آمادہ نہیں ہیں۔“ ①

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کا حُصین پر عدم اعتماد ایک فطری سی بات تھی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے یہ ساتھی تعداد میں دو ہزار بھی نہ تھے۔ اگر اس پیش کش کے پس پردہ کوئی فریب ہوتا تو شام جا کر سب کے سب مارے جاتے۔

ایک جعلی روایت:

تاریخ طبری میں ہے:

”حُصین نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پیش کش کی کہ وہ اس کے ساتھ شام چلے جائیں، شامی فوج اس کے ساتھ ہے اور وہاں بھی سب لوگ ان سے بیعت کر لیں گے۔ شرط یہ ہے کہ باہم خون ریزی میں اب تک جو لوگ مارے گئے ہیں ان کا خون معاف کر دیا جائے۔ یہ سن کر ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے چیختے ہوئے کہا: ”میں بھلا یہ خون معاف کر دوں! میں تو ایک ایک کے بدلے تمہارے دس دس کو قتل کر کے بھی چین سے نہ بیٹھوں گا۔“

حُصین آہستہ گفتگو کر رہا تھا، بولا: ”آپ کو جو شخص سیاست دان، مہذب اور دانش مند سمجھتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ میں نرمی سے بات کر رہا ہوں اور آپ چیخ کر جواب دے رہے ہیں۔ میں خلافت پیش کر رہا ہوں، آپ قتل و غارت کی بات کر رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ساتھیوں سمیت لوٹ گیا۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ بعد میں شرمندہ ہوئے اور اسے یہیں بیعت کرنے کا کہا مگر خود شام جانے پر پھر بھی تیار نہ ہوئے۔ پس حُصین بھی واپس نہ آیا۔“ ②

یہ روایت بالکل جھوٹی ہے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر طعن کے لیے گھڑی گئی ہے۔ اس کا راوی ہشام کلبی رافضی ہے، پس سند کے لحاظ سے یہ بالکل ساقط ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جیسے عالم فاضل اور خداترس صحابی ایک کے بدلے دس سے بھی زیادہ جانیں لینے پر تلے ہوں!!

عبیداللہ بن زیاد کی ہوسِ اقتدار:

اُدھر دمشق کے تخت کو خالی دیکھ کر عراق کے ظالم و جابر حاکم عبیداللہ بن زیاد نے بصرہ اور کوفہ والوں سے بیعت لینے کی کوشش شروع کر دی۔ عوام پہلے ہی اس کی سخت گیری سے پریشان تھے اس لیے کوئی بھی اس سے بیعت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ بہت سوں نے نمائشی طور پر اس کی بیعت کر لی مگر موقع پاتے ہی وہ دوسروں کو ساتھ ملا کر اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ③ عبیداللہ بن زیاد یہ دیکھ کر جمادی الآخرہ ۶۴ھ میں روپوش ہو گیا۔ مگر شہر میں ہنگامے رُکنے میں نہ آئے۔ لوگوں نے قصرِ امارت میں گھس کر اسے لوٹ لیا۔ ④

① انساب الاشراف: ۳۵۱/۵، ط دار الفکر ② تاریخ الطبری: ۵۰۱/۵، ۵۰۲
③ تاریخ الطبری: ۵/ص ۵۰۳ تا ۵۰۵؛ انساب الاشراف ۳۱۹/۵ باسناد جید، ط دار الفکر ④ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۸

خراسان سمیت مشرق کے تمام صوبوں کو کوفہ اور بصرہ سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ یہاں کے سیاسی بحران سے خراسان میں بھی ہل چل مچ گئی۔ مقامی سرداروں نے اموی عمال کو نکال دیا۔ ہر علاقے پر خود مختار قسمت آزما قابض ہو گئے اور آپس میں تلواریں چلنے لگیں۔ ①

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا منصبِ خلافت سنبھالنا:

ان حالات میں اُمت کے لیے بلا تاخیر ایک سربراہ کی تقرری نہایت ضروری ہو گئی تھی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ عمائد عرب کے اصرار کے باوجود اب تک اپنی خلافت کی دعوت دینے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے مگر اب پیش آمدہ منظرنامے نے انہیں مجبور کر دیا چنانچہ ۹ رجب ۶۴ھ کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مکہ معظمہ میں اُمتِ مسلمہ کے نئے خلیفہ کے طور پر عوام و خواص سے بیعت لے لی۔ ② بیعت میں وعدہ کیا گیا تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ انہیں قرآن و سنت اور خلفائے راشدین کے راستے پر چلائیں گے۔ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے فرزند مُصعَب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبید اللہ سب سے پہلے بیعت کرنے والوں میں تھے۔ ③

اس کے ساتھ ہی ان کے نمائندے بیعت لینے حجاز، شام اور عراق روانہ ہو گئے۔ اہل مدینہ پہلے ہی ان کے گرویدہ تھے۔ مصر کے لوگوں نے بھی بیعت کر لی۔ عراق والوں نے اپنے ہاں کی ہنگامہ آرائی سے تنگ آکر خود ہی رابطہ کیا تھا کہ ان کے لیے کوئی امیر مقرر کر دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خادمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ منصب سونپ دیا۔ اس طرح عراق بھی خلافتِ زبیریہ کے تحت آ گیا۔ ④

دمشق میں صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے زبردست حامی تھے اور چاہتے تھے کہ بنوامیہ کے امراء ہل کر ان سے بیعت کر لیں۔ لوگوں نے ان کی پکار پر لبیک کہا اور بیعت کر لی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کی کوششوں کا علم ہوا تو انہی کو شام کا امیر مقرر کر دیا۔ ⑤ شام کے دوسرے مرکزی شہر حمص کے والی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے بھی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی۔ فقط اردن کے والی حسان بن مالک نے جو یزید کا ماموں زاد تھا، بیعت سے گریز کیا۔ اس کے ساتھ بنوامیہ کے کچھ متعصب لوگوں نے بھی بیعت نہیں کی تھی جن میں عبید اللہ بن زیاد، مروان بن الحکم اور عمرو بن سعید الاشدق نمایاں تھے۔ بہر حال حجاز، عراق، شام اور مصر میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت ہو گئی۔ اس طرح ان کی خلافت کے شرعی طور پر انعقاد میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ ⑥

❁❁❁

---

① تاریخ الطبری: ۵ص ۵۳۶، بسند حسن ② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۸

③ انساب الاشراف: ۵ص ۳۵۲ ④ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۹، تاریخ الطبری: ۵ص ۵۳۰ تا ۵۳۲

⑤ تاریخ الاسلام للذہبی: ۲۶۷/۵، بسند حسن؛ طبقات ابن سعد، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۲۰۱/۲، ۲۰۲؛ انساب الاشراف: ۲۵۸/۶، ط دار الفکر

⑥ تاریخ الطبری: ۵۳۱/۵؛ تاریخ خلیفۃ، ص ۲۵۹

مروان بن الحکم کی بغاوت

ان دنوں مروان بن الحکم شام میں تھا۔ وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو غالب دیکھ کر با دلِ نخواستہ ان کی بیعت کے لیے حجاز روانہ ہو گیا مگر راستے میں اسے عبیداللہ بن زیاد ملا جو اپنے خلاف لوگوں کے اشتعال سے گھبرا کر دمشق جا رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مروان عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت پر تیار ہے تو اسے شرم دلاتے ہوئے بولا: ''تم قریش کے سردار اور بنو عبدِ مناف کے بزرگ ہو۔ بھلا تم ابن زبیر سے بیعت کرو گے؟ واللہ! تم اس سے زیادہ خلافت کے حق دار ہو۔'' مروان نے پوچھا: ''پھر تم بتاؤ کیا کروں؟'' عبیداللہ بن زیاد بولا: ''تم واپس چلو اور اپنی خلافت کی دعوت دو۔''

مگر مسئلہ یہ تھا کہ بنوامیہ کے کچھ لوگ یزید کے دوسرے لڑکے خالد بن یزید کو خلیفہ دیکھنا چاہتے تھے۔ عمرو بن سعید نے اس کا حل بتاتے ہوئے کہا: ''آپ یزید کی بیوہ اُمّ خالد سے شادی کرلیں اور خالد کو اپنی کفالت میں لے لیں۔''

مروان کو یہ منصوبہ پسند آ گیا۔ وہ عمرو بن سعید اور عبیداللہ بن زیاد کے ساتھ شام واپس چلا آیا اور ''تدمُر'' میں ٹھہر گیا تاکہ حالات کی رفتار دیکھ کر کوئی قدم اٹھائے۔ عبیداللہ بن زیاد سیدھا دمشق جا پہنچا تاکہ ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کو فریب دے کر خلافتِ زبیریہ کی جڑیں کاٹ ڈالے۔ ①

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب افسانہ:

شاہ معین الدین ندوی مرحوم نے اپنی تاریخ میں دعویٰ کیا ہے کہ مروان کو خلافت کے دعوے پر ابھارنے میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ایک غلطی کا بڑا دخل تھا۔ وہ ''ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی ایک سیاسی غلطی'' کا عنوان لگا کر اس کے تحت لکھتے ہیں:

''اس وقت تقریباً کل دنیائے اسلام میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت مسلم ہو گئی تھی کہ عین اس وقت انہوں نے ایک فاش غلطی کی کہ بنواُمیہ کی اکھڑی ہوئی حکومت پھر قائم ہو گئی۔ یاد ہوگا کہ انہوں نے مکہ اور مدینہ سے بنوامیہ کو نکلوا دیا تھا لیکن واقعہ حرہ کے بعد یہ لوگ پھر لوٹ آئے تھے۔ یزید کی موت کے بعد ان کی ہمت اتنی پست ہو چکی تھی کہ مروان بن حکم اموی تک جو مدینہ کا حاکم تھا، ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر بیعت کے لیے آمادہ ہو گیا تھا لیکن ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو بنوامیہ سے اتنی نفرت تھی کہ انہوں نے انجام کو سوچے بغیر کل بنی امیہ کو بھی جس میں مروان اور اس کا لڑکا عبدالملک بھی تھا، مدینہ سے نکلوا دیا۔ اس وقت عبدالملک چیچک میں مبتلا تھا، اس لیے مروان کے لیے مدینہ چھوڑنا مشکل تھا لیکن ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک لمحہ کے لیے بھی نکنے نہ دیا اور مروان کو اسی حالت میں عبدالملک کو لے کر نکل جانا پڑا۔ بعد میں ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو اس غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے اس کی تلاش میں آدمی دوڑائے لیکن وہ نکل چکے تھے۔ اس واقعہ نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور بنی امیہ دونوں کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ اگر

① طبقات ابن سعد، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۲/۲۰۲؛ تاریخ الاسلام، ذہبی: ۵/۱۳۳، ۱۳۵؛ تاریخ دمشق: ۱۸/۲۳۸؛ انساب الاشراف: ۶/۲۶۳، ط دار الفکر

اس وقت بنوامیہ کو ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے روک لیا ہوتا تو پھر ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔'' ①

مروان کے مدینہ سے اخراج کا یہی واقعہ ڈاکٹر حمید الدین نے ''تاریخ اسلام'' (مطبوعہ فیروزسنز) میں نقل کیا ہے اور اسی قسم کا تبصرہ کیا ہے جیسا شاہ معین الدین ندوی مرحوم نے۔ مگر ان دونوں حضرات نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ من گھڑت قصہ نقل کرنے والا مؤرخ یعقوبی شیعہ ہے ② اور اس نے روایت کی کوئی سند نقل نہیں کی۔ جبکہ اصح ما فی الباب حسن روایت بتاتی ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلافت سنبھالتے وقت مروان اپنے کنبے سمیت شام میں تھا۔ ③

جنگِ مَرج راہط۔ شام سے خلافتِ زبیریہ کا خاتمہ:

عبیداللہ بن زیاد نے ایک طرف مروان کو خلافت کے دعوے پر آمادہ کیا اور دوسری طرف دمشق پہنچ کر ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ سے دوستی کا ڈھونگ رچاتا رہا اور انہیں مروان سے لڑنے پر ابھارا۔ حضرت ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ اس وقت دمشق جیسے محفوظ شہر میں تھے، وہاں ان کو زیر کرنا مشکل تھا۔ عبیداللہ بن زیاد نے انہیں کہا کہ جب تک بنوامیہ کی قوت کو پاش پاش نہ کر دیا جائے، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا:

''جو آپ کی طرح کا عظیم مقصد لے کر اٹھے وہ شہروں اور قلعوں میں نہیں بیٹھتا بلکہ باہر نکل کر گھڑسوار جمع کرتا ہے۔ دمشق سے نکلئے اور اپنے لشکر تیار کر لیجیے۔'' اس بات نے ضحاک رضی اللہ عنہ کی حمیت پر چوٹ لگائی اور وہ فوج سمیت شہر سے نکل کر ''مرج راہط'' میں خیمہ زن ہو گئے۔ اب ابن زیاد نے مروان کو لکھا:

''لوگوں کو اپنی خلافت کی دعوت دو اور ضحاک کی طرف لپکو، وہ تمہارے سامنے کھلے میدان میں آ گیا ہے۔''

مروان عبیداللہ بن زیاد کے اشارے کا منتظر تھا اور یزید کی بیوہ سے شادی کر کے خاندانی تعصب کی بنیاد پر ایک بڑے مجمعے کو اپنے گرد اکٹھا کر چکا تھا۔ ④ اُدھر اُردن میں یزید کا ماموں زاد حسان بن مالک بغاوت کے شعلے بھڑکا چکا تھا۔ اس نے لوگوں کو مشتعل کر کے ان سے پوچھا تھا: ''تم عبداللہ بن زبیر اور مقتولینِ حرّہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

لوگوں نے آوازیں لگائیں: ''عبداللہ بن زبیر منافق ہے۔ مقتولینِ حرّہ جہنمی ہیں۔''

پھر حسان نے پوچھا: ''حرّہ میں قتل ہونے والے شامیوں اور یزید کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

لوگ چلّائے: ''یزید جنتی ہے۔ ہمارے مقتولین بھی جنتی ہیں۔'' حسان بن مالک نے کہا: ''اگر یزید حق پر تھا تو آج بھی اسی کے پیروکار حق پر ہیں۔ اگر عبداللہ بن زبیر کل باطل پر تھا تو آج بھی وہ اہلِ باطل میں سے ہے۔''

لوگوں نے کہا: ''سچ کہتے ہو۔'' اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنے کے لیے حسان کی بیعت کر لی۔ ⑤

---

① تاریخ اسلام، از شاہ معین الدین ندوی: ۱ ص ۳۸۱، بحوالہ یعقوبی: ۲ ص ۳۰۴

② قال الاستاذ العمری: شیعی امامی۔ (عصر الخلافۃ الراشدۃ: ص ۱۹)

③ طبقات ابن سعد، جزء متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۲/۹۸ تا ۲۰۵؛ تاریخ الاسلام للذھبی تدمری: ۵/۱۳۳

④ طبقات ابن سعد، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۲/۲۰۲ تا ۲۰۴؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/۱۳۵، ۱۳۶؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۶۰ ⑤ انساب الاشراف: ۶/۲۶۴، ط دار الفکر

اب یہ سارے منحرف امراء جابیہ کے مقام پر جمع ہوئے۔ان کا موقف تھا: ''حکومت تو ہم اہل شام کے پاس چلی آرہی تھی، یہ حجاز میں کیوں منتقل ہوگئی۔ہم اسے کبھی قبول نہیں کریں گے۔''①

جابیہ میں ہونے والے اجتماع میں بعض لوگوں کی رائے تھی کہ اگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر اتفاق نہیں ہو رہا تو ان کی جگہ اُمت مسلمہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پر متحد ہوسکتی ہے مگر روح بن زنباع نے فوراً کھڑے ہو کر کہا:

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل اپنی جگہ مگر وہ کمزور آدمی ہے اور اُمت مسلمہ کا قائد کمزور شخص نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک عبداللہ بن زبیر کا تعلق ہے، اگر چہ وہ اسماء بنت ابی بکر کا بیٹا ہے مگر وہ منافق ہے۔اس نے دو خلفاء: یزید اور اس کے بیٹے معاویہ سے بغاوت کی، خون ریزی کی، مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کیا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کی قیادت ایسے منافق کو نہیں دی جاسکتی۔جہاں تک مروان بن حکم کا تعلق ہے، اسلام میں کوئی رخنہ ایسا واقع نہیں ہوا، جسے جناب مروان نے پُر نہ کیا ہو۔انہوں نے امیر المؤمنین عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پر حملے والے دن ان کے دفاع میں لڑائی کی، انہوں نے جنگِ جمل میں علی بن ابی طالب سے لڑائی کی، یہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے طلحہ کو قتل کر کے عثمان رضی اللہ عنہ کا انتقام لیا۔تو کیا ہم چھوٹے سے بیعت کرلیں اور بڑے کو چھوڑ دیں؟''②

حسان بن مالک نے کہا: ''میری بھی یہی رائے ہے۔مجھے گوارا نہیں کہ خلافت ابن زبیر کے پاس جائے اور اہلِ بیت (بنواُمیہ) سے چھن جائے۔مروان قریش کے بڑے اور عمر رسیدہ فرد ہیں۔خلیفہ مظلوم عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا زاد ہیں۔سب سے پہلے قصاصِ عثمان کا مطالبہ اٹھانے والے ہیں۔عثمان رضی اللہ عنہ کی میراث انہی کا حق ہے۔یہ ابن زبیر سے کہیں بہتر ہیں، جو بے دین ہے، جس نے خلافت سے سرکشی کی، جس نے کھلم کھلا اللہ کی نافرمانی کی۔''③

اس کے بعد اتفاق رائے سے مروان نے خلافت کا دعویٰ کر دیا۔یہ ذوالقعدہ ۶۴ھ کا واقعہ ہے۔عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد کو اس وقت چار ماہ گزر چکے تھے۔

اب مروان لشکر لے کر مرج راہط پہنچا جہاں ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ اپنے لشکر سمیت پہلے سے موجود تھے۔اُدھر عبید اللہ بن زیاد بھی خلافتِ زبیریہ کی حمایت کا ڈھونگ ختم کر کے دمشق سے نکلا اور مرج راہط میں مروان کے شانہ بشانہ آکھڑا ہوا۔اس دوران منصوبے کے مطابق دمشق میں بنوامیہ کے حامی یزید بن ابی نمس نے بغاوت کر دی اور ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کے نائب کو شہر سے نکال دیا۔آخر کار ذوالحجہ ۶۴ھ میں جھڑپیں شروع ہوگئیں مگر بیس دن تک کوئی نتیجہ نہ نکلا۔تب ابن زیاد نے مروان سے کہا: ''یہ جنگ ہم دھوکے ہی سے جیت سکتے ہیں۔'' اس کے مشورے پر مروان نے حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ کو جنگ بندی اور مذاکرات کی دعوت دی۔حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی مان گئے۔ان کو امید ہوگئی کہ مروان اور بنوامیہ اب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلیں گے۔ان کی بے فکری کے دوران

---

① تاریخ دمشق: ۲۳۸/۱۸

② انساب الاشراف: ۲۶۷/۶، ط دار الفکر ③ انساب الاشراف: ۲۶۰/۶، ط دار الفکر

ایک شب مروان نے زوردار حملہ کر دیا۔ زبیری لشکر میں افراتفری مچ گئی۔ تاہم حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سمیت بے جگری سے لڑے۔ ان کا قبیلہ بنوقیس اپنے پرچم کے ساتھ آخری دم تک ڈٹا رہا۔ مگر آخر کار علم بردار قتل ہوا۔ حضرت ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ بھی شہید ہو گئے اور ان کا لشکر منتشر ہو گیا۔①

اس جنگ میں حضرت ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کے قبیلے بنوقیس کی بڑی افرادی قوت تہ تیغ ہو گئی تھی۔ یہ قبیلہ شام میں خلافتِ زبیریہ کا سب سے بڑا مددگار تھا۔ اس لیے جہاں جہاں شکست کی خبر پہنچی وہاں سے زبیریوں کے قدم اکھڑ گئے۔ مروان کی فوج نے فتح کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حامیوں کو چن چن کر قتل کیا اور اس میں جلیل القدر صحابہ تک کا لحاظ نہ کیا۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ضحاک رضی اللہ عنہ کی شکست کی خبر سن کر اہل و عیال سمیت نقل مکانی کر رہے تھے کہ بنوامیہ کے حامیوں نے تعاقب کر کے انہیں قتل کر دیا اور ان کا کٹا ہوا سر ان کی اہلیہ نائلہ کی جھولی میں ڈال دیا۔ ان کی صاحبزادی اُمِ ابان نے فخر کے ساتھ کہا: ''میں اس کی زیادہ حق دار ہوں۔'' قاتلوں نے سر اُٹھا کر ان کی گود میں پھینک دیا۔ اس خونریزی کے بعد پورا شام مروانی باغیوں کے قبضے میں آ گیا۔②

شکست کی وجوہ:

مرج راہط میں زبیریوں کی شکست کی اہم وجوہ یہ تھیں:

❶ حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ کو بروقت مدد نہیں پہنچ سکی تھی۔

❷ حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ نے دشمن پر اعتماد کر لیا کہ وہ دغابازی نہیں کرے گا۔

❸ پایۂ تخت دمشق کو بچانے پر کما حقہ' توجہ نہ دی گئی اور وہاں مروان کے حامی قابض ہو گئے۔ اس طرح سرکاری خزانہ باغیوں کی تقویت کے لیے استعمال ہوا۔

معرکہ مرج راہط پر تبصرہ:

معرکہ ''مرج راہط'' کے نتیجے میں اُمتِ مسلمہ جہاں ضحاک بن قیس اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ اور سینکڑوں جلیل القدر تابعین سے محروم ہوئی وہاں یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ چند متعصب اصحابِ شمشیر کسی بھی صورت میں کوچۂ اقتدار سے الگ ہونا برداشت نہیں کر سکتے، چاہے اُمت انہیں حکمران دیکھنا پسند نہ کرے۔ یہ سوچ شرعاً و اخلاقاً بالکل ناجائز تھی، کیوں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ رجب ۶۴ھ میں مسلمانوں کے متفقہ خلیفہ بن چکے تھے۔ ان کی بیعت بالکل ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم جیسی تھی جس میں کسی پر کوئی جبر و اکراہ نہیں کیا گیا اور تلوار استعمال نہیں کی گئی تھی بلکہ معاملہ مسلمانوں کی رضامندی اور شورائیت سے طے پایا تھا اور مسلمانوں

① طبقات ابن سعد، متمم الصحابۃ، الطبقۃ الخامسۃ: ۲/۲۰۲ تا ۲۰۴؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/۱۳۵، ۱۳۶؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۶۰

② تاریخ الطبری: ۵/۵۳۱؛ انساب الاشراف، بلاذری: ۶/۲۶۹ تا ۲۸۳، ۲۷۵، ط دار الفکر؛ سیر اعلام النبلاء: ۳/۴۱۲، ط الرسالۃ؛ طبقات ابن سعد، متمم الصحابۃ: ۲/۲۰۴ تا ۲۰۷؛ طبقات ابن سعد ۶/۵۳، ط صادر

کے پانچوں بڑے سیاسی مراکز: حجاز، کوفہ، بصرہ، دمشق اور مصر کے اکثر امراء نے کسی دباؤ، خوف اور مجبوری کے بغیر محض اُمت کے وسیع تر مفاد کو دیکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کو خلیفہ مان لیا تھا جو اس دور میں اکابر صحابہ کی یادگار تھا اور جس کے علم وفضل، دیانت، تقویٰ، شجاعت اور سیادت میں کوئی شک وشبہ نہ تھا۔ جب امتِ مسلمہ اپنا فیصلہ دے چکی تو اس کے چار ماہ بعد عبیداللہ بن زیاد کے یاد دلانے پر شام کے کچھ امرائے عساکر اور بنوامیہ کے چند سیاست دانوں کو اچانک خیال آیا کہ اقتدار تو ان کی میراث ہے، یہ کسی اور کو کیسے مل سکتا ہے۔ چنانچہ مروان نے خلافت کا دعویٰ کیا تو اموی جرنیلوں نے اس کی بیعت کرنے کے بعد کہا: ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے یہ خلافت ہم سے باہر نہ جانے نہ دی۔''①

اس میں شک نہیں کہ درجنوں اموی شرفاء اور شامی امراء نصف صدی سے کلیدی عہدوں پر تھے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ اقتدار ان کا موروثی حق بن گیا ہے اور اب کسی دوسرے گروہ یا قبیلے والے اقتدار سنبھالنے کے قابل نہیں۔

مروان کا شام اور مصر پر قبضہ، بنواُمیہ کی مروانی شاخ کا دورِ اقتدار:

مرج راہط کے میدان میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے حامیوں کو شکست دے کر مروان بن الحکم نے بنوامیہ کی ایک نئی حکومت قائم کر دی۔ مگر اب یہ حکومت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی نہیں، حکم بن ابی العاص کی نسل سے تھی۔ اگرچہ جابیہ میں بنوامیہ کے ذوالقعدہ ۶۴ھ میں منعقد ہونے والے اجتماع میں مروان بن الحکم کے بعد خالد بن یزید اور اس کے بعد عمرو بن سعید کو ولی عہد مقرر کر دیا گیا تھا مگر مروان نے حکومت پر گرفت مضبوط کرتے ہی ہوسِ اقتدار اور عہد شکنی کی ایک نئی روایت قائم کرتے ہوئے خالد بن یزید اور عمرو بن سعید کی ولی عہدی منسوخ کر دی اور اپنے بیٹے عبدالملک اور اس کے بعد دوسرے بیٹے عبدالعزیز کو ولی عہد مقرر کر دیا۔②

اس طرح موروثی حکمرانی کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ ذوالقعدہ ۶۴ھ میں خلافت کا دعویٰ کرنے کے بعد مروان کو زندگی کے صرف نو ماہ مزید مل سکے۔ محرم ۶۵ھ میں اس نے مرج راہط کی جنگ جیتی۔ پھر شام کے دیگر علاقوں پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد اس نے مصر پر حملے کا منصوبہ بنایا اور وہاں کے شرفاء سے خفیہ ساز باز کر کے دارالحکومت فسطاط پر چڑھائی کر دی اور کچھ مدت کے محاصرے کے بعد جمادی الآخرہ ۶۵ھ میں اس پر قبضہ کر لیا۔③

اس کے بعد مروان نے حجاز پر قبضے کے لیے لشکر بھیجا مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ''ربذہ'' کے مقام پر اس کی پیش قدمی روک دی۔ یکم رمضان ۶۵ھ کو دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں مروان کی فوج کو شکستِ فاش ہوئی۔④ اس شکست کی خبر دمشق پہنچنے سے پہلے ۶۳ سالہ مروان بن الحکم ۳ رمضان ۶۵ھ کو دنیا سے رخصت ہو گیا۔⑤

مروان بن الحکم راویانِ حدیث میں شمار ہوتا ہے اور فقہ سے بھی اسے اچھی مناسبت تھی۔ مگر میدانِ سیاست کے جرائم نے اسے داغ دار کر دیا۔ تاریخ میں اس کی پہچان یہی رہ گئی کہ وہ دولتِ مروانیہ کا بانی تھا۔

---

① انساب الاشراف ۲ ص ۲۶۰ ② تاریخ الطبری: ۵ ص ۲۰۵

③ تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/ ۳۲ ④ تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/ ۳۳ ⑤ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۶۲

مروان بن حکم کے کردار پر ایک نظر:

آج کل کچھ حضرات مروان بن الحکم کو ایک صحابی، اُمت کے محسن، ایک مظلوم شخصیت اور ایک عظیم رہنما قرار دینے پر مصر ہیں۔ اس نظریے پر انہیں اتنا اصرار ہے کہ اس کے برخلاف کو وہ سبائیت اور رافضیت قرار دیتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ہمارے اسلاف مروان کے بارے میں کیا فرماتے ہیں:

امام بخاری، علامہ ابن عبدالبر، امام نووی، حافظ ابن حجر، علامہ عینی، ملا علی قاری رحمہم اللہ اور اس موضوع پر کلام کرنے والے تقریباً تمام جلیل القدر محدثین اور شارحینِ حدیث نے مروان کے صحابی ہونے کی صاف الفاظ میں نفی کی ہے۔①

اسلافِ اُمت مروان کی نیک سیرتی کے بھی قائل نہیں رہے۔ چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ نے مروان کو ناقابلِ تحسین کام کرنے والوں میں شمار کیا ہے۔② امام اوزاعی رحمہ اللہ نے اسے اُمت کے شریر لوگوں میں سے قرار دیا ہے۔③

امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ کی پناہ کہ ہم مروان یا اس جیسوں کی روایت سے استدلال کریں۔''④

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کے کچھ کام ہلاکت خیز تھے۔''⑤ دوسری جگہ مروان کے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کی صحیح روایت نقل کر کے کہتے ہیں: ''حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا قاتل گناہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتل (ابن ملجم) ہی کی طرح ہے۔''⑥ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ مروان کو توہینِ صحابہ کا مرتکب قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب مروان مدینہ کا والی بنا تو وہ جمعہ کو منبر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا کرتا تھا۔''⑦

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مروان کو ناصبی (مروانی) فرقے کا بانی قرار دیا ہے۔⑧ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مروان اور اس کے پیروکاروں کا فسق و فجور سورج سے زیادہ روشن ہے۔''⑨

رہی یہ بات کہ اگر مروان کا کردار ایسا تھا تو پھر بخاری اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں اس کی روایات کیوں ہیں، تو یاد رکھیے کہ محدثین کے نزدیک بدعتی کی روایت کو بعض شرائط کے تحت (مثلاً اس کی روایت اس کے مذہب کی تائید نہ کر رہی ہو) لیا جا سکتا ہے۔ اس لیے محدثین نے اُن شرائط کے تحت جو بدعتی سے روایت لینے میں ملحوظ ہوتی ہیں،

---

① تحفة التحصيل في ذكر رواة المراسيل لابن العراقي: ١ص ٢٩٨؛ الاستذكار لابن عبدالبر: ٥ص ٢٣٩؛ تهذيب الاسماء واللغات للنووي: ٢ص ٨٧؛ تقريب التهذيب، تر: ٦٥٦٧؛ عمدة القاري: ١١ص ٣؛ شرح الشفا للقاري: ١ص ٣٢٨

② قال: "وقد صلّى أصحاب النبي خلف من لا يحمدون فعاله" ثم ذكر مروان في نظيره۔ (كتاب الام للشافعي: ١ص ١٨٥)

③ قال: "نرى ابامسلم ومروان فانهما كانا من شرار هذه الامة۔" (شرح اصول اعتقاد اهل السنة للالكائي: ٦ص ١٥٠١)

④ عائذ بالله ان نحتج بخبر رواه مروان وذووه۔ (صحيح ابن حبان: ٣ص ٢٩٧)

⑤ وله اعمال موبقة۔ (ميزان الاعتدال: ٣ص ٨٩)

⑥ قاتل طلحة في الوزر بمنزلة قاتل علي۔ (سير اعلام النبلاء: ١ص ٣٦)

⑦ كان يسب عليا كل جمعة على المنبر۔ (البداية والنهاية: ١١ص ٧١٢)

⑧ تحفہ اثنا عشریہ اردو: ص ١٣٩، ١٤٠، مطبوعہ دار الاشاعت کراچی

⑨ فسق مروان واتباعه اظهر من الشمس۔ (الكوكب الدري: ١ص ١١٣، باب الوضوء من مس الذكر)

ہیں، مختلف بدعتی فرقوں کے راویوں سے روایات لی ہیں مثلاً قدیم شیعہ، خوارج، نواصب، قدریہ، مرجئہ اور معتزلہ۔ مروان کی گمراہی بھی حدِ بدعت تک تھی نہ کہ حدِ کفر تک۔ پس اس کی روایت بھی انہی شرائط کے مطابق لی گئی ہے۔ ①

مروان کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے بطورِ تقابل شیعی رُواۃ میں اَشتر نخعی کی مثال ملحوظ رہے جو مروان کی طرح صحابہ کے دور کا آدمی تھا اور اس کا کردار بھی مروان کی طرح فتنہ انگیز تھا۔ اس کے باوجود متعدد کتبِ حدیث میں اس سے روایات لی گئی ہیں۔ ② اسی طرح بخاری میں عمران بن حطان کی روایات بھی ہیں جو خوارج کا رئیس تھا۔ یہ بتانے کا مقصد صحیح بخاری، صحیح مسلم و دیگر کتبِ حدیث کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنا نہیں بلکہ مقصد یہ بتانا ہے کہ کتبِ حدیث کی روایات اور اس کے راویوں میں فرقِ مراتب موجود ہے اور ان میں بدعتی راوی بھی یقیناً ہیں۔ جس توجیہ کے تحت ان بدعتی راویوں کی روایت لی گئی ہے، وہی مروان کے لیے بھی تھی۔ جس طرح فقط روایت لینے سے ان بدعتی راویوں سے بدعت کا الزام ختم نہیں ہوسکتا، اسی طرح مروان کی روایت لینے سے اس کے دامن کے داغ بھی نہیں دھل سکتے۔

حاصلِ بحث یہ ہوا کہ: مروان بن الحکم صحابی ہرگز نہیں تھا۔ اس میں علم وفضل اور عبادت گزاری جیسی کچھ خوبیاں تھیں مگر اس کے جرائم خوبیوں پر بھاری تھے، چنانچہ شرعی خلیفہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کر کے فتنہ وفساد کا دروازہ کھولنا اور اُمت میں موروثی حکومتوں کا سلسلہ شروع کرنا اسی کے کارنامے ہیں۔ حجاج بن یوسف جیسے ظالموں کے ہاتھوں متعدد صحابہ کرام، بیسیوں تابعینِ عظام اور ہزار ہا لوگوں کے سفاکانہ قتل کے واقعات بھی اسی کی قائم کردہ حکومت کے کھاتے میں جاتے ہیں۔ نیز فدک پر قبضہ کر کے حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی ایک سنت کو پامال کرنے کا داغ بھی اسی کے دامن پر ہے۔ عشرۂ مبشرہ میں سے حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کے خون سے اسی کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ بدعتی فرقے ''مروانی ناصبی'' کا بانی بھی یہی شخص تھا۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما اور ان کی آل سے اور اسی طرح حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں اور ان کے مقابلے میں یزید اور حجاج بن یوسف جیسے ظالموں کی حمایت اور وکالت کرتے ہیں۔

پس صحابہ کرام اور اہلِ بیتِ عظام سے محبت کرنے والا کوئی شخص مروان بن الحکم سے محبت نہیں کرسکتا۔

❁❁❁

---

① چنانچہ صحیح بخاری میں سلمۃ بن کہیل کی دس، عوف بن ابی جمیلہ کی ۲۶ اور عبیداللہ بن موسیٰ کی ۳۳ روایات ہیں، علاوہ ازیں امام بخاری نے عبدالعزیز بن سیاہ، یحییٰ بن یعلی کوفی اور عبدالملک بن اعین سے بھی اکا دکا روایات لی ہیں۔ یہ سب حضرات شیعہ راوی تھے۔ اسی طرح صحیح مسلم میں سلمۃ بن کہیل کی ۱۹، ہشام بن سعد کی ۸، جعفر بن سلیمان کی ۱۳، اور عبیداللہ بن موسیٰ کی ۲۴ روایات ہیں، علاوہ ازیں امام مسلم نے سلیمان بن قرم، علی بن زید بن جدعان، عوف بن ابی جمیلہ، عبدالعزیز بن سیاہ اور یحییٰ بن یعلی کوفی سے بھی کہیں کہیں روایت لی ہے۔ یہ سب شیعہ راوی ہیں یا ان پر تشیع کا الزام لگایا ہے۔ ان میں سے عبیداللہ بن موسیٰ کا تشیع اتنا سخت تھا کہ وہ معاویہ نامی کسی شخص کو اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ "لم یدع احدا اسمہ معاویۃ یدخل دارہ۔" (سیر اعلام النبلاء: ۹/۵۵۶) ایسے راویوں کی روایات محدثین نے خاص شرائط کے تحت لی ہیں۔ فلا محلّ للاشکال۔

② تہذیب الکمال: ۱۲۷/۲۷

مختار ثقفی کا فتنہ

انہی دنوں عالم اسلام کے سیاسی اُفق پر ایک عیار شخص مختار بن ابو عبید ثقفی کا ظہور ہوا۔ اس کے والد ابو عبید بن مسعود ثقفی ایک بہادر مجاہد تھے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں عراق کی سرحدوں پر اسلامی افواج کی قیادت کرتے ہوئے ''جنگ جسر'' میں شہید ہوئے تھے۔ مختار علم وفضل اور دیانت وتقوی سے بالکل خالی تھا مگر اپنی چرب زبانی، ہوشیاری اور عیاری کے بل بوتے پر قبیلہ بنو ثقیف کے صف اول کے نوجوانوں میں شمار ہوتا رہا۔ ①

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور یزید کی کش مکش کے دوران یہ قسمت آزمانے مکہ آ گیا اور حصین بن نمیر کے خلاف مزاحمت میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ اس کا خاص حربہ یہ تھا کہ اکابرِ اُمت کے پاس اٹھتا بیٹھا اور خود کو ان حضرات کا مقرب مشہور کر کے لوگوں کی عقیدت ومحبت بٹورتا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے علاوہ اس کا محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے پاس بھی آنا جانا تھا۔ وہ بہت دانا انسان تھے اس لیے اس کی مکاری کو تاڑ گئے تھے۔ لہٰذا اس سے محتاط رہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شروع میں اس سے مروت برتتے رہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت قائم ہو گئی تو کچھ مدت بعد یہ ان سے عراق جانے کی اجازت مانگنے لگا اور یقین دلایا کہ وہاں اس کی موجودگی خلافت زبیریہ کے لیے بہت مفید ہوگی۔ ②

تحریک توابین:

ان دنوں کوفہ میں حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ نامی ایک بزرگ صحابی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریک کو ''حرکۃ التوابین'' (توبہ کرنے والوں کی تحریک) کا نام دیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اعانت میں کوتاہی پر توبہ واستغفار کرتے ہوئے ان کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانا یا خود لڑتے لڑتے مرجانا اس تحریک کا ہدف تھا۔ ③

یاد رہے کہ بعض جدید قلم کاروں نے حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا یہ کہہ کر انکار کیا ہے کہ کوئی صحابی باغیوں اور بدعقیدہ شیعوں کی قیادت نہیں کر سکتا مگر یہ دلیل بے جا ہے کیوں کہ حرکۃ التوابین باغی تحریک نہ تھی بلکہ شرعی خلیفہ کی حمایت کے ساتھ شامی باغیوں کے خلاف صف آرا تھی۔ نیز اس میں شامل شیعانِ علی کی اکثریت بدعقیدہ نہ تھی مگر چوں کہ یہ ایک سیاسی جماعت تھی لہٰذا سبائی ٹولے کے افراد بھی ان میں گھلے ملے تھے۔ بہر کیف پہلی صدی ہجری کے اواخر تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حمایتی شیعانِ علی (نہ کہ سبائی ٹولی) کی اکثریت اعتقادی لحاظ سے جمہور اُمت کے ساتھ تھی۔ ان میں نامور محدثین بھی تھے جن سے صحاحِ ستہ کے مؤلفین نے بکثرت روایات لی ہیں۔

① سیر اعلام النبلاء: ۳/ص ۵۴۰

② طبقات ابن سعد: ۹۸/۵، ط صادر ③ تاریخ الطبری: ۵/ص ۵۵۲ تا ۵۶۰

مختار کوفہ میں:

مختار نے کوفہ پہنچ کر اپنے فن کذب بیانی سے کام لیا اور کہنا شروع کیا: ''میں مہدیٔ زمانہ محمد بن حنفیہ کی طرف سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے اپنا وزیر، امین اور معتمد خاص بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے۔''

اس طرح کے دعوؤں کے ذریعے اس نے حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا، یوں شیعان علی کے دو گروہ بن گئے۔ اکثریت حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی اور اقلیت مختار کے گرد۔ ①

اُدھر حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو لے کر اہل شام سے لڑنے نکل کھڑے ہوئے۔ عین موقع پر بہت سے رضا کاروں نے ساتھ جانے سے پہلو تہی کی، پھر بھی حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ چار ہزار رضا کاروں کے ساتھ شام کی سرحد ''عین الوردہ'' پر پہنچ گئے جہاں ۲۶ ربیع الآخر ۶۵ھ کو شامی لشکر سے جنگ شروع ہوئی۔ تین دن کی نبرد آزمائی کے بعد شامی غالب آ گئے اور حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ اپنے اکثر ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔ ②

حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کی عمر ۹۳ برس تھی۔ ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت کردہ مرفوع احادیث صحیح بخاری میں منقول ہیں۔ ③

توابین کی شکست کی وجوہ:

توابین کی شکست کی وجوہ درج ذیل ہیں:

❶ توابین نے پوری تیاری نہیں کی تھی۔ ان کی تعداد صرف چار ہزار تھی جبکہ شامی بیس ہزار کے لگ بھگ تھے۔

❷ میدان جنگ شام کے قریب اور کوفہ سے دور تھا۔ توابین کو کمک ملنا مشکل اور اہل شام کے لیے آسان تھا۔

❸ حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ کو نہ تو خود جنگوں کا زیادہ تجربہ تھا نہ ان کی فوج میں کوئی نامور کماندار تھا جبکہ دوسری طرف حصین بن نمیر جیسا تجربہ کار سپہ سالار تھا جس کی پشت پر عبید اللہ بن زیاد جیسا ہوشیار اور عیار انسان تھا۔

مختار کا عروج:

حضرت سلیمان بن صُرَد رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مختار ثقفی کو اپنے گرد لوگ جمع کرنے کے لیے کھلا میدان مل گیا۔ وہ محمد بن حنفیہ کو مہدی اور خود کو ان کا نائب کہتا تھا۔ اس نے اپنی حمایت میں محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کی ایک تحریر بھی گھڑ لی تھی مگر کچھ لوگوں کو اس کے دعوے پر شک تھا لہٰذا انہوں نے تصدیق کے لیے ایک وفد محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے پاس حجاز بھیج دیا۔ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے مختار کو اپنا نائب تو قرار نہ دیا، بس یہ فرمایا:

''میں چاہتا ہوں کہ اللہ اپنی مخلوق میں سے جس کے ذریعے چاہے ہمارے دشمنوں سے بدلہ لے۔''

① تاریخ الطبری: ۵ص ۵۷۰، ۵۶۱
② تاریخ الطبری: ۵ص ۵۸۳ تا ۶۰۵؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۵ص ۳۶ تا ۳۸؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۵ ھجری
③ صحیح البخاری، ح: ۳۲۸۲، ۶۱۱۰، ۶۰۴۸

وفد نے واپس آکر اپنے طور پر محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے کلمات کا حاصل مطلب یہ بیان کیا: ''محمد بن حنفیہ نے ہمیں مختار کی نصرت کا حکم دیا ہے۔'' یوں مختار کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ①

کوفہ میں مختار کی سرگرمیاں بڑھتی دیکھ کر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے وہاں حضرت عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ کو نیا حاکم مقرر کردیا اور تاکید کی کہ عام لوگوں سے نرمی اور مشکوک افراد سے سختی کا معاملہ کرنا۔ ②

اس دوران مختار کے گرد لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی جن کی مدد سے اس نے ۱۴ ربیع الاول ۶۶ھ کو کوفہ میں بغاوت کرکے حاکم حضرت عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ کو بے دخل کردیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بہت سے وفادار مزاحمت کرتے ہوئے قتل ہوگئے۔ ③

کچھ مدت بعد مختار نے کوفہ میں اعلان کیا: ''جو قاتلین حسین یہاں چھپے ہوئے ہیں، لوگ ان کے نام بتائیں، انہیں تلاش کریں اور قتل کریں۔ جب تک میں زمین کو ان سے پاک نہ کردوں مجھ پر کھانا پینا حرام ہے۔''

اس اعلان پر قاتلین حسین رضی اللہ عنہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لایا گیا۔ مختار نے کسی کو زندہ جلا دیا، کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تڑپتا چھوڑ دیا، کسی کو تیروں سے چھلنی کرادیا۔ شمر بن ذی الجوشن بصرہ کی طرف بھاگ نکلا تھا مگر مختار کے آدمیوں نے اسے ڈھونڈ کر قتل کردیا۔ خولی بن یزید نے سر مبارک کاٹا تھا، اس کے گھر پر چھاپہ مارا گیا تو وہ ٹوکرے کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ مختار نے اسے زندہ جلا دیا۔ قاتلانہ وار کرنے والا ایک اور مجرم سنان بن انس ہاتھ نہ آیا تو اس کا گھر منہدم کردیا گیا۔ عمر بن سعد کو جان کی امان کی جھوٹی تسلی دے کر بلوایا اور پھر اس کا سر قلم کرا کے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے پاس مدینہ بھجوا دیا۔ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ④

۶۷ھ کے اوائل میں مختار نے اپنے سالار ابراہیم کو سات ہزار کا لشکر دے کر شامیوں سے مقابلے کے لیے بھیجا۔ اُدھر سے عبیداللہ بن زیاد ایک لشکر لے کر نکلا۔ چوں کہ عبیداللہ بن زیاد اپنے ظلم وستم اور خاص کر سانحۂ کربلا کا سب سے بڑا مجرم ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی شدید نفرت کا ہدف بنا ہوا تھا اس لیے اہل عراق ناقابل بیان جوش وخروش سے لڑے۔ آخر عبیداللہ بن زیاد مارا گیا اور شامی لاشوں کے ڈھیر چھوڑتے ہوئے پسپا ہوگئے۔ ابراہیم نے عبیداللہ کا کٹا ہوا سر مختار کے پاس کوفہ بھیج دیا۔ ⑤

امام ترمذی رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ مختار کے سامنے جب ابن زیاد کا سر رکھا گیا تو اچانک ایک سانپ آیا اور تین بار ابن زیاد کی ناک میں گھسا، ہر بار کچھ دیر اندر رہ کر منہ سے نکل گیا۔ ⑥ یہ تھا اس ظالم شخص کا عبرت ناک انجام۔

---

① تاریخ الطبری: ۶ص ۱۳، ۱۴

② تاریخ الطبری: ۶ص ۱۰، ۱۱

③ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۶۶ ہجری

④ البدایہ والنہایہ ۱۲ص ۲۱، تاریخ الطبری ۶: ص ۵۲ تا ۵۵

⑤ البدایہ والنہایہ: ۱۲ص ۳۵ تا ۳۸ ⑥ سنن الترمذی، ح: ۳۷۸۰، بسند حسن صحیح

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور مختار میں کشیدگی:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کچھ مدت تک مختار کو ڈھیل دیتے رہے تھے تا کہ وہ شامیوں کی باغیانہ حکومت کو زک پہنچاتا رہے مگر رفتہ رفتہ مختار کے گمراہ کن دعوے اس حد تک پہنچ گئے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کر دیا اور کہنے لگا کہ اس پر جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آتے ہیں۔ چنانچہ اب اسے مزید مہلت دینا ممکن نہ رہا۔ ① مختار کے جھوٹے دعووں کی بناء پر سمجھ دار مسلمان شروع سے مختار کو "کذاب" کہا کرتے تھے۔ سیدہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا اس زمانے میں یہ فرمانِ نبوی سنایا کرتی تھیں: "اِنَّ فِیْ ثَقِیْفَ کَذَّاباً وَ مُبِیْراً۔"

"بے شک بنوثقیف میں ایک شخص بڑا جھوٹا پیدا ہوگا اور ایک بڑا سفاک شخص ظاہر ہوگا۔" ②

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا اور اس دور کے اکابر کا یہی خیال تھا کہ بنوثقیف کا کذاب یہی مختار ثقفی ہے۔ اس لیے مختار کا لقب اس کی زندگی میں ہی کذاب مشہور ہوگیا تھا۔ لہٰذا وہ خود تقاریر میں کہا کرتا تھا:

"اگر میں آلِ محمد کا انتقام نہ لوں تو میں ویسا ہی کذاب ہوں جیسا مجھے لوگ پکارتے ہیں۔" ③

اُدھر مختار تقاریر کر کے اپنے مریدوں کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف ابھار رہا تھا اور حجاز پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کھل کر اس کی فوج کشی کی حمایت کریں، چنانچہ اس نے محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کو اس بارے میں ایک مراسلہ بھیجا۔ مگر محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ اس کذاب کی چال میں نہ آئے اور جوابی خط میں لکھا:

"میرے نزدیک محبوب ترین کام اللہ کی اطاعت ہے۔ تم ظاہر و باطن میں اللہ کے فرماں بردار بن جاؤ اور یاد رکھو کہ اگر مجھے لڑنا ہوتا تو لوگ تیزی سے میرے گرد جمع ہو جاتے۔ میرے مددگار بکثرت ہیں۔ مگر میں خود ان سے گوشہ نشین ہو کر بیٹھا ہوں اور صبر و تحمل کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ اللہ میرے لیے فیصلہ فرما دے۔ وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

پھر آپ نے مختار کے سفیر کو کہا: "مختار سے کہو اللہ سے ڈرے اور خون ریزی بند کرے۔" ④

مختار کی چال ناکام ہوئی اور اسے حجاز پر قبضہ کرنا مشکل محسوس ہوا تو اس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو دھوکہ دینے کے لیے انہیں خط بھیجا:

"میں نے کوفہ کو مرکز بنا لیا ہے۔ اگر آپ مجھے یہاں حکومت کا موقع دیتے رہیں اور ایک لاکھ درہم بھیج دیں تو میں شام پر حملہ کر کے آپ کے مخالفین کا کام تمام کر سکتا ہوں۔"

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ یہ پڑھ کر بولے:

① البدایہ والنہایہ: ۱۲ ص ۲۲۲ تا ۲۲۳، سیر اعلام النبلاء: ۵ ص ۵۳۹، ۵۴۱
② صحیح مسلم، ح: ۲۶۶۰
③ تاریخ الطبری: ۶ ص ۵۷
④ تاریخ الطبری: ۶ ص ۷۲، البدایہ والنہایہ: ۱۲ ص ۳۳

”بنو ثقیف کے اس کذاب اور میرے درمیان فریب کا معاملہ آخر کب تک چلے گا۔“

پھر آپ نے مختار کی پیش کش مسترد کرتے ہوئے اسے واضح الفاظ میں لکھ بھیجا:

”اللہ کی قسم! میں تجھے ایک درہم بھی نہیں دوں گا۔“ ①

مصعب بن زبیر رحمہ اللہ اور مختار کا مقابلہ (۶۷ھ):

اب مختار اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے درمیان کھلی جنگ کا آغاز ہو گیا اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس مہم کے لیے اپنے بھائی مصعب بن زبیر رحمہ اللہ کو بصرہ کا حاکم مقرر کر دیا جو عرب کے نامور شہسوار اور سخاوت میں یکتائے زمانہ تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں حکم دیا کہ مختار کی سرکوبی کریں۔ ②

مصعب بن زبیر رحمہ اللہ بصرہ پہنچے تو مختار نے ان کے عزائم کا اندازہ لگاتے ہوئے بیس ہزار کا لشکر بصرہ پر حملے کے لیے روانہ کر دیا۔ مصعب بن زبیر رحمہ اللہ نے ”مَذار“ کے میدان میں مختار کے لشکر کا مقابلہ کیا، گھمسان کی جنگ ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبید اللہ رحمہ اللہ مصعب رحمہ اللہ کے پرچم تلے لڑتے ہوئے یہیں شہید ہوئے۔ ③

آخر کار مختار کی فوج شکست کھا کر کوفہ کی طرف پسپا ہو گئی۔ مصعب بن زبیر رحمہ اللہ بھی تعاقب کرتے ہوئے کوفہ پہنچ گئے۔ مختار مجبور ہو کر خود میدان میں نکلا تاہم اسے شکست ہوئی اور مصعب رحمہ اللہ کے جانبازوں نے کوفہ پر قبضہ کر لیا۔

مختار کچھ دنوں تک قصرِ امارت میں محصور ہو کر لڑتا رہا۔ جب خوراک ختم ہو گئی تو وہ تلوار سونت کر کچھ ساتھیوں کے ساتھ باہر نکلا اور لڑتے لڑتے مارا گیا۔ اس آخری جھڑپ سے کچھ دیر پہلے اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تھا:

”میں بھی عرب ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ابن زبیر نے حجاز پر، نجدہ خارجی نے یمامہ پر اور عبدالملک بن مروان نے شام پر قبضہ جما لیا ہے تو میں نے سوچا عرب ہونے کے لحاظ سے میں بھی ان سے کم نہیں۔ اس لیے میں نے بھی شہروں پر قبضہ کر لیا۔“

یوں مختار نے اقرار کر لیا کہ اس کا اصل ہدف اقتدار کا حصول تھا اور سب کچھ اس نے اسی مقصد کے لیے کیا۔

مصعب رحمہ اللہ قصرِ امارت میں داخل ہوئے تو مختار کا سر کاٹ کر ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ یہ ۱۴ رمضان ۶۷ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت مختار کی عمر ۶۷ برس تھی۔ ④ مختار کی بدکرداری اور بدعقیدگی کے باوجود اس کے ہاتھوں قاتلینِ حسین رضی اللہ عنہ کا قتل ہونا بظاہر عجیب لگتا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اس الجھن کو حل کر دیتا ہے: ”اِنَّ اللّٰهَ یُؤَیِّدُ هٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ۔“ (بلاشبہ اللہ اس دین کی مدد برے آدمی کے ہاتھوں بھی کرا دیتا ہے۔) ⑤

---

① انساب الاشراف: ۶ ص ۴۴۷ ② سیر اعلام النبلاء: ۳ ص ۱۴۱

③ تاریخ الطبری: ۵/ ۹۰ تا ۱۰۰؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲/ ۵۵ تا ۶۲؛ معجم البلدان، المذار

ملحوظہ: یہ عبید اللہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اہلیہ لیلیٰ بنت مسعود کے بطن سے تھے۔ (طبقات ابن سعد: ۵ ص ۱۱۷)

④ تاریخ الطبری: ۵/ ۱۰۰ تا ۱۱۰؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/ ۷۱، ۷۲ ⑤ صحیح البخاری، ح: ۳۰۶۲

خلافتِ زبیریہ کے لیے بڑھتی ہوئی مشکلات

خوارج کی شورش:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں ایک اور بہت بڑی قوت ان کے مدمقابل تھی۔ یہ خارجی گروہ تھا جو حجاز میں نجد و یمامہ سے بحرین تک اور عراق میں کوفہ و بصرہ سے فارس کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا۔

خوارج بنوامیہ کے بھی حریف تھے اور اہلِ بیت کے بھی۔ ان کے نزدیک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے عقیدت رکھنے والے سب لوگ گمراہ تھے جنہیں قتل کردینا واجب تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف شامیوں کی لشکر کشی کے ابتدائی زمانے میں خارجی سردار نافع بن ازرق نے یہ سمجھ کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا تھا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سمیت تمام اموی خلفاء کے مخالف ہوں گے مگر جب ان کے پوچھنے پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے واضح کیا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی محبت وعقیدت سے سرشار ہیں تو خوارج بپھر گئے اور ان کا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔[1]

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کی شورش اور بغاوتوں کا مسلسل سامنا رہا۔ جوں ہی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے حکومت سنبھالی خوارج ان کے مقابلے پر نکل آئے۔ اس وقت ان کے دو گروہ بن چکے تھے۔ ان کے سردار نافع بن ازرق نے عراق جا کر اپنا جتھا بنالیا۔ باقی خوارج یمامہ میں ابوطالوت نامی سردار کے تحت سرگرم ہوگئے۔ ابوطالوت نے ۶۵ھ میں جزیرۃ العرب کے قافلوں پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا۔ خوارج کے ہاں حکمران ایک عام آدمی ہی ہوتا تھا جسے وہ ذرا سی بات پر تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۶۶ھ میں ابوطالوت کو برطرف کر کے اپنے ایک ہوشیار جنگجو نجدہ بن عامر کو سربراہ بنالیا جس نے ۶۷ھ میں بحرین اور یمامہ پر قبضہ کرلیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ عراق کی مہمات اور شامی حکومت سے کش مکش میں اتنے مشغول تھے کہ نجدہ کی کارروائیوں کی کوئی روک تھام نہ کر سکے۔ ۶۹ھ میں نجدہ کی قوت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اس نے باقاعدہ ایک سربراہ مملکت کی طرح ۸۶۰ افراد کے ساتھ الگ پرچم لے کر حج بیت اللہ کیا۔ خوش قسمتی سے ۷۰ھ میں نجدہ کی جماعت میں پھوٹ پڑگئی۔ کئی خارجی امراء اس کے مخالف ہوگئے اور آخر نجدہ بھاگ کر روپوش ہوگیا۔ خارجیوں نے عبداللہ بن فدیک نامی ایک شخص کو اپنا قائد بنالیا اور نجدہ کا کھوج لگا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔[2]

اُدھر عراق میں بھی خوارج سرگرم تھے۔ اہلِ بصرہ سے ان کی کئی جنگیں ہوئیں۔ عراقی خوارج کے اس گروہ کا بانی نافع بن ازرق تھا اس لیے اس گروہ کو "الازارقہ" کہا جاتا تھا۔ نافع ۶۵ھ میں اہل بصرہ سے ایک جنگ میں مارا گیا

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۳؛ انساب الاشراف: ۳۱۷/۵، دار الفکر

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۵ھ؛ تاریخ الطبری: سنۃ ۶۵ھ تا ۷۲ھ

مگر گروہ باقی رہا۔ ان جنگوں میں بصرہ کے پانچ سپہ سالار قتل ہوئے جبکہ خوارج کے بھی پانچ سردار مارے گئے۔ ①
آخر میں عراق کے نامور سپہ سالار مہلب بن ابی صفرہ کو ایک لشکر کے ساتھ اس مہم پر بھیجا گیا۔ انہوں نے کئی معرکوں کے بعد جس میں فریقین کا بھاری مالی نقصان ہوا، خوارج کو بصرہ اور مضافات سے مار بھگایا۔ خوارج کے چار ہزار ۸ سو افراد مارے گئے اور وہ پسپا ہو کر فارس کی طرف چلے گئے۔ یہ ۶۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد کچھ مدت کے لیے خوارج کی شورش تھم گئی اور تین سال تک امن رہا۔ ②

۶۷ھ میں مختار ثقفی کے قتل کے بعد مہلب بن ابی صفرہ کو آذربائی جان اور الجزیرہ میں تعینات کر دیا گیا۔ اس لیے خوارج نے موقع پا کر اس شدت سے باغیانہ کارروائیاں شروع کیں کہ پورے عراق میں حکومت ہل کر رہ گئی۔ آخر مہلب بن ابی صفرہ کو دوبارہ یہ مہم سونپی گئی۔ وہ آٹھ ماہ تک خوارج سے برسرِ پیکار رہے اور انہیں خاصا نقصان پہنچایا۔ ③

دمشق کا نیا حکمران عبدالملک:

اُدھر مروان کی موت کے بعد دمشق کے تخت پر اس کا اکتیس سالہ بیٹا عبدالملک براجمان ہو چکا تھا۔ وہ ایک عالم فاضل اور نہایت ہوشیار شخص تھا۔ سیاسی تعصب کے باعث وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو شرعی خلیفہ ماننے پر تیار نہ تھا اور ہر قیمت پر ان کی حکومت ختم کرنا چاہتا تھا۔ ④ اس نے پہلے عراق سے زبیری خلافت کے خاتمے کا منصوبہ ترتیب دیا اور پہلا قدم اس نے یہ اٹھایا کہ ۷۰ھ میں رومیوں سے جن کے حملے کا اکثر دھڑکا لگا رہتا تھا، ہر ہفتے ایک ہزار دینار کی ادائیگی منظور کر کے صلح کر لی۔ ⑤ اس کے بعد اس نے خفیہ پیغام رسانی کے ذریعے مصعب بن زبیر رحمہ اللہ کے جرنیلوں سے ساز باز شروع کر دی اور عہدوں اور دولت کا لالچ دے کر ان میں سے بہت سوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

اُدھر عراق میں طاعون کی وہ وبا پھوٹی جو "طاعونِ جارف" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ہونے والی ہلاکتوں نے بھی عراقیوں کی قوت کو سخت نقصان پہنچایا۔ جو افواج زیرِ کمان تھیں ان کا بڑا حصہ فارس کے خارجیوں سے مقابلے کے لیے مشرق میں جھونکنا پڑ رہا تھا۔ مصعب رحمہ اللہ کو اپنے امراء کی غداری کی ٹن گن بھی مل گئی تھی اور ان سے خدشہ الگ تھا۔ یوں مصعب بن زبیر رحمہ اللہ کے لیے حالات بحران کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

عبدالملک نے عراقی فوج کو غداری پر تیار کرنے کے بعد ایک لشکر جرار لے کر دمشق سے عراق کا رخ کیا اور ۷۲ھ میں دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر واقع عراق کے سرحدی گاؤں "مسکن" میں آ کر ڈیرے ڈال دیے۔ ⑥ افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس وقت مصعب رحمہ اللہ کے سپہ سالار ابراہیم بن مالک کے سوا تمام بڑے افسران اپنی وفاداریاں عبدالملک کو فروخت کر چکے تھے۔ جنگ سے پہلے مصعب بن زبیر رحمہ اللہ نے گہری نظروں سے دائیں بائیں سپاہیوں اور

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۵۶، ۲۵۷؛ تاریخ الطبری: ۵ص ۶۱۳ تا ۶۱۵ ② تاریخ الطبری: ۵ص ۶۱۵ تا ۶۱۹
③ تاریخ الطبری: ۶ص ۱۱۹ تا ۱۲۷ ④ سیر اعلام النبلاء: ۴ص ۲۴۸
⑤ تاریخ الطبری: ۶ص ۱۵۰ (یعنی ماہانہ بارہ لاکھ ڈالر سے زائد رقم) ⑥ تاریخ الطبری: ۶ص ۱۵۰ تا ۱۶۲

افسران کے چہروں کو دیکھا اور نوشتۂ دیوار پڑھ لیا۔ آپ کی نگاہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے فرزند عروہ رحمہ اللہ پر پڑی تو ان کو بلا کر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا واقعۂ شہادت سنا۔ جب عروہ رحمہ اللہ نے بتایا کہ ابن زیاد کی طرف سے غیر مشروط گرفتاری پر اصرار کے جواب میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے موت کو ترجیح دی تھی، تو مصعب رحمہ اللہ نے سواری کو ایڑ لگا کر یہ شعر پڑھا:

إِنَّ الْأُلَىٰ بِالطَّفِّ مِنْ آلِ هَاشِمٍ تَآسَوْا فَسَنُّوا لِلْكِرَامِ التَّآسِيَا

"بے شک مقامِ طف (کربلا) میں بنی ہاشم نے ایک روایت قائم کردی اور شریفوں کے لیے راستہ طے کردیا۔"①

طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی تو مصعب بن زبیر رحمہ اللہ نے اپنے سپہ سالار ابراہیم بن مالک کو شامی ہراول پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دیا۔ ابراہیم نے زوردار حملہ کیا جس سے عبدالملک کے بھائی محمد بن مروان کے قدم اکھڑ گئے۔②

مگر خود ابراہیم بن مالک کو بھی زندہ واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ اب مصعب نے یکے بعد دیگرے اپنے متعدد سالاروں کو ابراہیم کی جگہ لینے اور حملہ جاری رکھنے کا حکم دیا مگر کسی نے تعمیل نہ کی۔ مصعب رحمہ اللہ سمجھ گئے کہ انجام قریب ہے۔ ایسے میں ان کے کسی ہمدرد نے مشورہ دیا: "آپ کسی قلعے میں مورچہ بند ہوجائیں۔"

مگر مصعب رحمہ اللہ اپنا اسلحہ پہن کر یہ اشعار پڑھتے ہوئے بقیہ ساتھیوں کے ساتھ میدان کارزار میں کود گئے:

عَلَامَ تَقُوْلُ السَّيْفُ يُثْقِلُ عَاتِقِيْ إِذَا أَنَا لَمْ أَرْكَبْ بِهِ الْمَرْكَبَ الصَّعْبَا

(تم کیوں کہتے ہو کہ تلوار میرے کندھے کو بوجھل کر رہی ہے جبکہ میں اسے لے کر میدانِ کارزار میں نہیں اترا۔)

سَأَحْمِيْكُمْ حَتّٰى أَمُوْتَ وَ مَنْ يَمُتْ كَرِيْمًا فَلَا لَوْمٌ عَلَيْهِ وَلَا عَتْبَا

(میں تمہاری حفاظت مرتے دم تک کروں گا۔ اور جو عزت سے مرے اس پر کوئی الزام ہے نہ ملامت۔)

عبدالملک کی مصعب رحمہ اللہ سے پرانی دوستی تھی لہٰذا وہ انہیں زندہ بچانا چاہتا تھا۔ اس نے محمد بن مروان کو بھیج کر انہیں امان کی پیش کش کی۔ مصعب رحمہ اللہ نے کہا: "مجھ جیسا انسان معرکے سے فاتح بن کر واپس ہوتا ہے یا مغلوب ہوکر۔"③

مصعب بن زبیر رحمہ اللہ دیر تک نہایت پامردی سے لڑتے رہے۔ آخر کار دشمن نے انہیں تیروں کا نشانہ بنا کر چھلنی کردیا۔ پھر مختار کذاب کے ایک مرید زائدہ بن قدامہ نے "ہائے مختار کا انتقام" کہہ کر نیزہ ان کے جسم میں اتار دیا اور ایک شخص نے تلوار سے ان کا سر قلم کردیا۔ عبدالملک کو مصعب رحمہ اللہ کے قتل کی اطلاع ملی تو بولا: "میری اور ان کی دوستی بہت گہری اور پرانی تھی مگر سیاست بے وفا چیز ہے۔ مصعب! تمہارے جیسا بیٹا پھر کسی ماں کو کہاں نصیب ہوگا۔"④

کوفہ کا قصرِ امارت......سروں کی نمائش گاہ:

اس سانحے کے ایک راوی عبدالملک بن عمیر کہتے ہیں:

"میں نے زندگی میں عجیب ترین بات یہ دیکھی کہ ایک بار میں کوفہ کے قصر امارت میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ

① تاریخ دمشق: ۵۸ص ۲۴۰ ② تاریخ الطبری: ۶ص ۱۵۷
③ تاریخ الطبری: ۶ص ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹ ④ البدایہ والنہایہ: ۱۲ص ۱۳۰

عبید اللہ بن زیاد اس تخت پر براجمان ہے اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ کا کٹا ہوا سر ایک ڈھال پر اسے پیش کیا جا رہا ہے۔ کچھ زمانے بعد اسی جگہ یہ منظر دیکھا کہ مختار ثقفی تخت پر بیٹھا ہے اور عبید اللہ بن زیاد کا سر قلم کر کے اس کے پاس لایا گیا۔ کچھ مدت بعد اسی عمارت میں دیکھا کہ مختار ثقفی کا سر کاٹ کر مصعب بن زبیر کو دیا گیا اور پھر اسی جگہ اسی تخت پر عبد الملک کو دیکھا اور مصعب بن زبیر کا سر اس کے سامنے رکھا تھا۔"①

قتل ہوتے وقت مصعب بن زبیر رحمہ اللہ کی عمر ۴۰ یا ۴۵ سال تھی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سکینہ، ان کے نکاح میں تھیں۔ وہ بڑے بہادر، فیاض اور بلند ہمت انسان تھے۔ امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"میں نے مصعب سے بڑھ کر کوئی حاکم نہیں دیکھا جس پر انتشار کے دور میں اُمت جمع ہو سکتی۔ وہ ماتحت حکام کے محبوب تھے۔ سختی کی جگہ سختی اور نرمی کی جگہ نرمی برتنے والے تھے۔"②

عبد الملک کے غلبے کی وجوہ:

مصعب بن زبیر رحمہ اللہ کے خلاف عبد الملک کی فتح کی اہم وجوہ یہ تھیں:

1. اکثر عراقی امراء بکنے والے اور غدار تھے جنہیں عبد الملک اپنے ساتھ ملا چکا تھا۔
2. مصعب رحمہ اللہ جرأت میں بے مثال تھے مگر منصوبہ بندی میں عبد الملک کے ہم پلہ نہ تھے۔
3. مصعب رحمہ اللہ کے وفادار افسران خوارج سے برسرِ پیکار ہونے کے باعث ان کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔
4. مختار کذاب کے بعض عقیدت مند افسران جو اپنا بغض چھپائے ہوئے تھے، اس جنگ میں شریک تھے اور انہی کے ہاتھوں مصعب بن زبیر رحمہ اللہ نے جامِ شہادت نوش کیا۔

عراق میں عبد الملک کے نئے انتظامات:

فتح کے بعد عبد الملک نے پورے عراق و فارس میں اپنے عمال مقرر کر دیے۔ کوفہ میں اپنے بھائی بشر بن مروان اور بصرہ میں خالد بن عبد اللہ کو حاکم مقرر کر دیا۔③

تاہم خراسان کے والی عبد اللہ بن خازم رحمہ اللہ نے عبد الملک کی بیعت سے صاف انکار کر دیا۔ عبد الملک نے ان کے افسران کو لالچ دے کر خراسان میں بغاوت برپا کرا دی۔ جس کے نتیجے میں عبد اللہ بن خازم رحمہ اللہ مرو کے قریب ان باغیوں سے لڑتے ہوئے قتل ہو گئے۔ یوں خراسان بھی عبد الملک کے زیرِ نگیں آ گیا۔④

مصعب رحمہ اللہ کی شہادت پر عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا تاریخی خطبہ:

مصعب بن زبیر رحمہ اللہ کے قتل کی خبر مکہ پہنچی تو عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بہت غم گین ہوئے اور اپنے خطبے میں فرمایا:

"جس بات نے ہمیں غمزدہ کیا وہ یہ ہے کہ ایک گہرا دوست بچھڑ گیا جس کی جدائی پر غم ہوا ہی کرتا ہے مگر عقل مند

① تاریخ دمشق: ۵۸ ص ۲۳۴، ۲۳۵ ② تاریخ دمشق: ۵۸ ص ۲۳۹، ۲۵۰
③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۶۸ ④ تاریخ الطبری: ۶ ص ۱۷۶، ۱۷۷

انسان اس کے بعد صبر کا سہارا لے لیتا ہے۔ جس بات نے ہمیں خوش کیا وہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں مصعب کا قتل شہادت ہے۔ اس میں ان کے اور ہمارے لیے اللہ نے خیر رکھی ہے۔

سنو! عراقیوں نے جو نفاق اور غداری کے عادی ہیں ان کو دشمنوں کے حوالے کر دیا بلکہ ایک اونٹ کی قیمت سے بھی کم میں بیچ ڈالا۔ پھر مصعب شہید کر دیے گئے۔ مگر وہ شہید ہو گئے تو کیا ہوا۔ ان کے باپ (زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ) ان کے بھائی، چچا، ماموں سب شہید ہی تو ہوئے تھے۔ یہ سب بہترین صالح لوگ تھے۔ اگر آج مجھے مصعب کی شہادت کا دکھ پہنچا ہے تو اس سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اپنے سامنے دیکھنے کا صدمہ بھی جھیل چکا ہوں۔ اپنے باپ زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ بھی دیکھ چکا ہوں۔ مصعب میرے جواں ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ اللہ کی قسم! ہم ناگہانی موت مرنے والے لوگ نہیں۔ ہم تو لڑ بھڑ کر نیزوں سے قتل ہوتے اور تلواروں کے سائے میں مرتے ہیں۔ یاد رکھنا! دنیا ایک ایسے بادشاہ کی طرف سے دی ہوئی ادھار چیز ہے جس کی بادشاہی کو زوال نہیں۔ لہٰذا اگر دنیا میرے پاس آئے تو میں اسے کسی شریر مغرور شخص کی طرح نہیں لوں گا اور اگر وہ میرے ہاتھ سے نکل جائے تو میں کسی کم عقل بدحواس آدمی کی طرح اس پر گریہ وزاری نہیں کروں گا۔''①

اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے ایک انصاری کے ہاتھ اہل عراق کو مراسلہ بھیج کر انہیں دوبارہ مرکز خلافت کی اطاعت کی دعوت دی مگر وہاں عبدالملک کے نائب بشر بن مروان کو پتا چل گیا اور اس نے ان انصاری کو پکڑ کر قتل کر ڈالا۔②

عبدالملک کی حجاز میں دخل اندازی:

مصعب بن زبیر رحمہ اللہ کا قتل حجاز سے بھی خلافت زبیریہ کے سقوط کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ مدینہ منورہ پر بنو مروان کے جرنیل طارق بن عمرو کا تسلط ہو گیا جس نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نائب کو وہاں سے نکال دیا۔③

اس کے بعد عبدالملک نے امرائے شام کو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف مکہ پر لشکر کشی کے لیے ابھارا۔ تاہم حرم شریف کے تقدس کے خیال سے اکثر امراء اس مہم سے کتراتے دکھائی دیے۔④

حجاج بن یوسف کا ظہور:

ایسے میں بنو ثقیف کے ایک نوجوان حجاج بن یوسف نے خود کو اس مہم کے لیے پیش کر دیا۔ وہ ماہر قاری، فصاحت و بلاغت میں یکتا اور فن حرب میں ماہر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت سنگ دل اور بے رحم تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ مصر کے قاضی سُلَیم بن عتر رحمہ اللہ نے جو بڑے انصاف پسند، عابد و زاہد اور متقی انسان تھے، حجاج کے والد سے درخواست کی کہ وہ انہیں اس منصب سے معزول کرا دے۔ حجاج کے باپ کو قاضی کی یہ خدا خوفی، پرہیزگاری اور مناصب سے بے رغبتی بہت اچھی لگی اور اپنے بیٹے سے تعریف کے پیرائے میں ان کی بزرگی کا ذکر کر دیا۔

---

① تاریخ دمشق ۵۸: ص ۲۳۶ تا ۲۳۸ ② انساب الاشراف: ۷ص ۱۳۸

③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۲۶۸ ④ البدایہ والنہایہ: ۱۲ص ۱۶۳

حجاج بھڑک اٹھا اور بولا: ''ایسے لوگ ہماری حکومت کے لیے سب سے زیادہ ضرر رساں ہیں۔ انہیں دیکھ کر لوگ ابوبکر اور عمر کو یاد کرتے اور ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، پھر حکمران کی اطاعت سے بدکتے اور بغاوت کرتے ہیں۔ بخدا مجھے اختیار ملا تو اس قاضی اور اس جیسوں کو قتل کر کے رہوں گا۔'' باپ نے کہا: ''بیٹا لگتا ہے خدا نے تجھے بدنصیب ہی پیدا کیا ہے۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کے باپ کا اندازہ بالکل درست تھا۔''①

جب حجاج نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو نمٹانے کے لیے خود کو پیش کیا تو عبدالملک نے یہ مہم اسی کو سونپ دی۔②

حجاج بن یوسف کا مکہ پر حملہ:

جمادی الآخرہ ۷۲ھ میں حجاج لشکر لے کر نکلا اور ماہ شعبان میں طائف پہنچ گیا جہاں اس کا قبیلہ بنوثقیف اس کی مدد کے لیے موجود تھا۔ شوال ۷۲ھ میں حجاج اپنی فوج قہر خیز کے ساتھ طائف سے نکلا اور یکم ذوالقعدہ کو اس نے مکہ کا محاصرہ کر لیا۔③ اہل شام کے پاس افرادی قوت اور خوراک ورسد کی کوئی کمی نہیں تھی جبکہ اہل مکہ کی تعداد بھی کم تھی اور ان کے پاس اناج بھی محدود تھا۔ حجاج محاصرے کو طویل کرتا جا رہا تھا تاکہ اہل شہر بھوک پیاس سے عاجز آ کر سر تسلیم خم کر دیں۔④ بہر کیف اہل مکہ کی مزاحمت دم توڑتی چلی گئی۔ حجاج کا لشکر ان کو دھکیلتے ہوئے آخر کار مسجد الحرام کے آس پاس کی پہاڑیوں پر قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا۔⑤

حجاج نے یہاں منجنیقوں کو نصب کرا کے مسجد الحرام پر سنگ باری شروع کرا دی جہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے جانباز ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے۔ اسی دوران حج کے ایام شروع ہو گئے اور لوگ دور دور سے مکہ میں جمع ہونے لگے۔ حج کے لیے آنے والے حضرت عبداللہ بن عمر، ابوسعید خدری اور سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہم جیسے اکابر کی سفارش پر حجاج نے عارضی طور پر جنگ روک دی مگر حج کے فوراً بعد محاصرے اور سنگ باری کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔⑥

نئے ہجری سال ۷۳ھ کا آغاز ہوا تو جنگ جاری تھی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اس سنگ باری کے دوران نماز پورے اطمینان سے صحن کعبہ میں ادا کرتے تھے۔ پتھر ان کے آس پاس آ کر گرتے مگر انہیں ذرا بھی پروا نہ ہوتی تھی۔ مسجد الحرام کے راستوں پر فریقین میں جھڑپیں جاری رہیں۔ شامی لشکر کو انتظار تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے گوداموں میں اناج کے ذخائر ختم ہو جائیں مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خوراک کو بہت احتیاط سے ضرورت کے مطابق تقسیم کر رہے تھے۔⑦

بہر کیف مزید چار ماہ گزرنے پر خوراک کے ذخائر ختم ہو گئے اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھی بھوک سے نڈھال ہونے لگے۔⑧ چوں کہ بظاہر اب فتح کی کوئی امید باقی نہیں تھی اس لیے ان کے اکثر ساتھیوں نے جان بچانے کی صورت پر غور شروع کر دیا۔ بعض نے مکہ سے خفیہ طور پر کسی اور محفوظ مقام پر جانے کا مشورہ دیا۔ آپ نے فرمایا:

---

① البدایہ والنہایہ: ۱۲ ص ۱۱۵ ② المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۲/۱۳ باسناد حسن متصل؛ اخبار مکۃ للفاکہی: ۳۳۷/۲
③ تاریخ الطبری: ۶ ص ۱۷۴، ۱۷۵ ④ البدایہ والنہایہ: ۱۲ ص ۱۷۸ ⑤ المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۲/۱۳ باسناد حسن متصل
⑥ اخبار مکۃ للفاکہی: ۳۷۳/۲؛ انساب الاشراف: ۱۱۹/۷؛ والبدایۃ والنہایۃ: ۱۶۵/۱۲، ۱۷۸؛ تاریخ الطبری: ۱۸۷/۶
⑦ انساب الاشراف: ۷ ص ۱۲۱ ⑧ البدایہ والنہایہ: ۱۲ ص ۱۷۸

’’تب تو میں اسلامی تاریخ کا بدترین سربراہ کہلاؤں گا، جس نے قوم کو لڑایا۔ جب وہ مارے گئے تو ان کی لاشیں چھوڑ کر خود بھاگ گیا۔‘‘ کسی نے رائے دی کہ آپ کعبے کے اندر داخل ہو جائیں۔ فرمایا: ’’کعبے کا اندرونی حصہ حجاج کے نزدیک اس کے بیرونی حصے ہی کی طرح ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بل میں چھپی لومڑی کی طرح پکڑا جاؤں۔ میں تلوار سے لڑتے لڑتے مروں گا۔‘‘①

اُدھر حجاج کی جانب سے اعلان کرایا جارہا تھا: ’’لوگو! خود کو کیوں ہلاک کرتے ہو۔ جو محاصرے سے نکل کر ہمارے پاس آجائے وہ مامون ہے۔‘‘② عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی ساتھیوں کو اجازت دے دی کہ جو چاہے حجاج سے امان حاصل کر کے اس کے پاس چلا جائے۔ یوں تقریباً دس ہزار افراد حجاج کے پاس آگئے۔③

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شرعی و اخلاقی لحاظ سے غلطی پر تھے اور یہ جنگ ان کی ضد کی وجہ سے لڑی جارہی تھی، اگر وہ غلطی پر نہ ہوتے تو اس وقت اکیلے دکھائی نہ دیتے۔ ان لوگوں کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ راہِ حق میں بعض اوقات آزمائش اتنی سخت ہو جاتی ہے کہ اکثر لوگ عزیمت کے معیار پر پورے نہیں اتر پاتے اور رخصت پر عمل کرتے ہیں۔ گنتی کے اِکا دُکا افراد ہی جان کی پرواہ کیے بغیر سچے موقف پر ڈٹے رہتے ہیں۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ انہی تاریخی ہستیوں میں ایک ہیں جن کے موقف کی صداقت سورج کی طرح روشن اور واضح تھی۔ ان کا ساتھ چھوڑنے والے اپنی جگہ معذور تھے کہ وہ شکست کو سامنے دیکھ رہے تھے اور ان کی مزید مزاحمت کا مطلب قتل ہونے کے سوا کچھ نہ تھا مگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نواسا اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بھانجا کسی باطل طاقت کے سامنے سر جھکانا نہیں جانتا تھا۔

❀❀❀

سانحۂ شہادتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

پیر ۱۶ جمادی الاولیٰ ۷۳ھ کا سورج ڈوبا اور اندھیرا چھاتے ہی حجاج بن یوسف مسجد الحرام پر آخری حملے کی تیاری کرنے لگا۔④ ۱۷ جمادی الاولیٰ کی صبح شامی سپاہی وادی میں اتر کر مسجد الحرام کو گھیر چکے تھے۔ ہر دروازے پر پانچ پانچ سو سپاہی کھڑے کر دیے گئے تھے تاکہ موقع پاتے ہی اندر گھس کر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پر قابو پالیا جائے۔⑤ ادھر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پوری رات نوافل پڑھتے رہے تھے۔⑥

نمازِ فجر سے پہلے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی والدہ محترمہ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس گئے جو مسجد الحرام سے متصل ایک مکان میں قیام پذیر تھیں۔ ان کی عمر اب سو سال ہو چکی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے والدہ محترمہ سے عرض کیا: ’’بس مٹھی بھر

---

① انساب الاشراف: ۷/۱۲۷؛ المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۳/۹۲ باسناد حسن

② تاریخ الطبری: ۶ ص ۱۸۸

③ انساب الاشراف: ۷/۱۳۹؛ تاریخ الطبری: ۶/۱۸۸؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/۱۷۹؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۵/۳۳۵

④ انساب الاشراف: ۷/۱۳۳ ⑤ تاریخ الطبری: ۶ ص ۱۹۰ ⑥ تاریخ الطبری: ۶/۱۹۱

آدمی رہ گئے ہیں جن کی مزاحمت تھوڑی دیر کی مہمان ہے۔ دوسری طرف دشمن آمادہ ہے کہ میں جو مانگوں وہ دے دے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟''

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی نے کہا: ''میرے بچے! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم حق وصداقت پر ہو اور اسی کی دعوت دیتے ہو تو اس پر جمے رہو۔ کیوں کہ اسی کی خاطر تمہارے ساتھیوں نے جانیں دی ہیں۔ اور اگر تمہاری یہ جدوجہد دنیا حاصل کرنے کے لیے تھی تو تم بدترین انسان ہو۔ کیوں کہ تم نے خود کو بھی ہلاکت میں ڈالا اور جو لوگ تمہاری خاطر مارے گئے ان کا خون بھی رائیگاں گیا اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ میں ہوں تو حق وصداقت پر مگر چوں کہ میرے ساتھی دشمنوں سے جا ملے ہیں اس لیے میں بھی کمزور پڑ گیا ہوں تو بیٹا! یہ شریفوں اور اللہ والوں کی سوچ نہیں۔ تم دنیا میں ہمیشہ تو نہیں رہو گے۔ ایسے وقت میں لڑ کر مر جانا بہتر ہے۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے والدہ محترمہ کے یہ حوصلہ افزا کلمات سن کر ان کے سر کو چوما اور فرمایا:

''اللہ کی قسم! میری سوچ بھی یہی تھی لیکن میں نے یہ چاہا کہ آپ کی رائے بھی معلوم کرلوں۔ آپ نے میرے ارادے کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔ امی جان! آپ دیکھ لیجیے گا، آج میں شہید کر دیا جاؤں گا۔ آپ غم سے بے حال نہ ہویے گا۔ معاملہ اللہ کے سپرد کر دیجیے گا۔ کیوں کہ آپ کے بیٹے نے شعوری طور پر کوئی گناہ نہیں کیا۔ کبھی بے حیائی کا مرتکب نہیں ہوا، اللہ کے حکم سے تجاوز نہیں کیا، کسی کو امان دے کر بدعہدی نہیں کی، کسی مسلمان یا ذمی پر ظلم نہیں کیا، کسی ماتحت عہدے دار کی زیادتی کو گوارا نہیں کیا، اللہ کی رضا پر کسی چیز کو ترجیح نہیں دی۔''

پھر فرمایا: ''الٰہی! تو مجھے خوب جانتا ہے کہ میں نے یہ کلمات اپنی تعریف کے لیے نہیں بلکہ امی کو تسلی دینے کے لیے کہے ہیں۔'' اس کے بعد ماں سے دعاؤں کی درخواست کی۔

وہ بولیں: ''یا اللہ! تو اس کی لمبی راتوں میں شب بیداری، مدینہ اور مکہ کی تپتی دوپہروں میں روزہ داری، عبادت میں آہ وبکا اور ماں باپ کی خدمت کی وجہ سے اس پر رحم فرما۔ اس کا معاملہ میں نے تیرے سپرد کر دیا ہے۔ جو تیرا فیصلہ ہے اس پر میں خوش ہوں۔ پس میرے بچے عبداللہ کی وجہ سے مجھے صبر وشکر کرنے والوں کا ثواب عطا فرما۔'' پھر فرمایا: ''ذرا میرے اور قریب آؤ، میں تمہیں رخصت کروں۔'' یہ کہہ کر بیٹے کو بوسہ دیا اور گلے سے لگالیا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ململ کے کرتے کے نیچے زرہ پہن رکھی تھی۔ ماں نے اس کی سختی محسوس کی تو کہا: ''جان پر کھیلنے والے یہ نہیں پہنا کرتے۔ ایسا لباس پہن کر جاؤ جس میں آدمی چست اور بہادر دکھائی دے۔''

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فوراً زرہ اتار دی اور آستینیں چڑھالیں۔ بہادر ماں نے انہیں یہ کہتے ہوئے رخصت کیا: ''صبر کرنا۔ خدا کی قسم! تمہارے باپ ابوبکر صدیق اور زبیر ہیں اور تمہاری دادی صفیہ بنت عبدالمطلب ہیں۔''①

① تاریخ الطبری: ۶ص ۱۸۸ تا ۱۹۰؛ البدایہ والنہایہ ۱۲ ص ۱۸۰، ۱۸۱

صبح صادق ہوئی تو آپ نے نمازِ فجر پڑھائی اور نہایت اطمینان سے سورۃ القلم کی تلاوت کی۔ سلام پھیر کر آپ اپنے جاں نثار ساتھیوں کی طرف مڑے۔ سب زرہوں میں ملبوس تھے۔ خودوں اور عماموں سے چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''رات میں نے خواب دیکھا کہ آسمان کا دروازہ کھلا اور میں اس میں داخل ہو گیا۔ واللہ! میں دنیا سے اکتا چکا ہوں۔ عمر ۷۲ سال ہو گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج میں شہید ہو جاؤں گا۔ الٰہی! میں تجھ سے ملاقات پسند کرتا ہوں، تو بھی مجھ سے ملنا پسند کرلے۔ دوستو! تلواروں کی ضرب سے نہ ڈرنا۔ اپنی شمشیروں کی حفاظت چہروں کی طرح کرو کہ شمشیریں چھن جانے سے آدمی لاچار عورت کی طرح رہ جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے مدمقابل کی طرف متوجہ رہے۔ میری پروانہ کرنا۔ مت پوچھنا کہ میں کہاں ہوں۔ میں سب سے آگے رہوں گا۔''①

صبح کا اجالا پھیلتے ہی معرکہ شروع ہو گیا۔ شامی سپاہیوں نے مسجد الحرام کے مختلف دروازوں سے اندر گھسنے کوشش کی مگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے جاں نثار ہر دروازے پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ڈٹے ہوئے تھے۔ کچھ مسجد کی چھت سے اینٹیں برسا کر حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مسجد کے صحن میں دونوں ہاتھوں میں شمشیریں سونتے تیار کھڑے تھے۔ سب سے پہلے ایک حبشی مسجد الحرام میں گھسا تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے تلوار سے اس کا پاؤں زخمی کر دیا۔ پھر اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی پے در پے وار کر کے مسجد سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔②

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جس دروازے کا رخ کرتے وہاں حریف سپاہیوں کی شامت آجاتی اور وہ الٹے پاؤں واپس بھاگتے۔③ حجاج بن یوسف نے دیکھا کہ اس کے سپاہی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مٹھی بھر ساتھیوں پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہو رہے تو وہ غضبناک ہو کر خود پیدل دوڑا آیا اور اپنے سپاہیوں کو مسجد کی طرف ہانکا، ساتھ ہی اپنے پرچم بردار کو آگے بڑھانے لگا۔ ادھر سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے علم بردار کو آگے بڑھایا اور دشمن پر شدید حملہ کر کے اسے پسپا کر دیا۔④ تاہم شامی سپاہیوں کے حملوں کا سلسلہ جاری رہا اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھی ایک ایک کر کے کٹتے گئے۔ جب تک یہ لوگ باقی تھے، آپ رضی اللہ عنہ ہر دروازے پر جا کر دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیتے رہے مگر جب سب شہید ہو گئے تو دشمنوں نے بیک وقت ہر طرف سے اندر داخل ہو کر آپ کو رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان گھیر لیا۔⑤

اس دوران آپ کے ماتھے پر ایک اینٹ آکر لگی⑥ اور آپ کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ رزمیہ شعر پڑھا:

فَلَسْنَا عَلَى الْأَعْقَابِ تَدْمَىٰ كُلُومُنَا ‌ ‌ وَلٰكِنْ عَلَى الْأَقْدَامِ تَقْطُرُ الدِّمَا

''ہم وہ نہیں کہ جن کے زخموں کا خون ایڑیوں پر گرے، ہمارا خون قدموں پر آکر گرتا ہے۔''⑦

---

① تاریخ الطبری: ۱۹۱/۶؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۸۳/۱۲، واخرج الطبرانی ھذہ الخطبۃ مختصرا باسناد حسن (المعجم الکبیر: ۹۲/۱۳)

② تاریخ الطبری: ۶ ص ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰

③ المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۲/۱۳ باسناد حسن؛ حلیۃ الاولیاء: ۳۳۱/۱ باسناد حسن ④ تاریخ الطبری: ۶ ص ۱۹۰

⑤ انساب الاشراف: ۷ ص ۱۲۵ ⑥ حلیۃ الاولیاء: ۱ ص ۳۳۲

⑦ المعجم الکبیر: ۹۲/۱۳ باسناد حسن؛ حلیۃ الاولیاء: ۳۳۱/۱ باسناد حسن؛ تاریخ الطبری: ۶ ص ۱۹۲

آپ پر غشی طاری ہونے لگی اور آپ لڑکھڑا کر گر گئے۔ زبانِ مبارک سے یہ نکلا:

اَسْمَاءُ اِنْ قُتِلْتُ لَا تَبْکِیْنِیْ لَمْ یَبْقَ اِلَّا حَسَبِیْ وَ دِیْنِیْ

(اسماء! اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو مجھ پر مت رونا کہ میری عالی نسبی اور میرے دین کے سوا کچھ باقی رہنے والا نہیں)

وَصَارِمٌ لَانَتْ بِہٖ یَمِیْنِیْ ①

اور سوائے اس تلوار کے جسے میرا دایاں ہاتھ با آسانی چلاتا ہے۔

آپ نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ممکن نہ ہوا۔ ایک شامی سپاہی نے آپ کو بے بس دیکھ کر حملہ کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ بائیں کہنی کے بل ذرا اُٹھے اور دائیں ہاتھ سے تلوار کا وار کر کے حملہ آور کے دونوں پاؤں کاٹ ڈالے۔ اتنے میں بہت سے حریف سپاہی آپ رضی اللہ عنہ پر پل پڑے۔ آپ اس حالت میں بھی جب تک کچھ رمق باقی رہی، تلوار چلاتے رہے۔ ②

جب آپ رضی اللہ عنہ بے دم ہو گئے تو دو شامی غلاموں نے آگے بڑھ کر سرِ مبارک قلم کر ڈالا۔ ③

آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو جاں نثار شہید ہوئے ان میں آپ کے بیٹے عروہ، بھائی حمزہ، بھتیجے معاویہ بن منذر، عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے بیٹے عمارۃ، صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کے فرزند عبداللہ اور عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ ④

حضرت عبداللہ بن مطیع رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن صفوان رحمہ اللہ کے سر بھی کاٹے گئے اور شام بھیج دیے گئے۔ ⑤

لاش کی بے حرمتی۔ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے تاثرات:

حجاج بن یوسف نے آپ کی نعش ورثاء کے حوالے نہ کی بلکہ ''کداء'' کی گھاٹی پر ایک کھمبا نصب کر کے لاش کو اس پر الٹا لٹکا دیا۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لاڈلے کی نعش کداء کی گھاٹی پر لٹکی رہی۔ قریشی شرفاء سمیت لوگ جوق در جوق یہ دردناک منظر دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ⑥ تیسرے دن سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا یہاں تشریف لائیں۔ یہ منظرِ دل فگار بھی اس صبر پیکر خاتون کا حوصلہ پست نہ کر سکا۔ بے ساختہ فرمایا: ''ابھی تک اس شہ سوار کے اترنے کا وقت نہیں آیا؟'' ⑦

حجاج بن یوسف کو یہ جملہ پہنچا تو غصے سے بے حال ہو گیا۔ فوراً آدمی دوڑایا کہ اسماء رضی اللہ عنہا کو لے آؤ۔

ابوبکر کی بیٹی نے اس ذلت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حجاج نے دوبارہ آدمی بھیجا اور کہلوایا: ''تم خود آتی ہو تو ٹھیک۔ ورنہ میں ایسے آدمیوں کو بھیجوں گا جو تجھے بالوں سے گھسیٹ کر لائیں گے۔''

---

① حلیۃ الاولیاء: ۳۲۳/۱؛ مجمع الزوائد، ح: ۱۲۰۸۵

② البدایہ والنہایہ: ۱۲ ص ۱۸۳

③ المعجم الکبیر: ۹۲/۱۳ باسناد حسن؛ حلیۃ الاولیاء: ۳۳۱/۱ باسناد حسن؛ مجمع الزوائد: ۲۵۵/۷

④ انساب الاشراف، بلاذری: ۱۳۳/۷

⑤ اخبار مکۃ للفاکھی: ۳۳۹/۲ باسناد صحیح

⑥ صحیح مسلم، ح: ۶۶۶۰، باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا؛ مسند احمد، ح: ۲۶۹۷۳، ورجالہ کلھم ثقات

⑦ ''اَمَا آنَ لِھٰذَا الرَّاکِبِ اَنْ یَّنْزِلَ؟'' (حلیۃ الاولیاء: ۳۳۱/۱ باسناد صحیح)

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے جواب میں کہلوا دیا: ''ہاں انہی کو بھیجو جو بالوں سے گھسیٹ کرلے جائیں۔''

حجاج طیش سے بل کھاتا ہوا خود تیزی سے چلتا ہوا ان کے پاس آیا اور بولا: ''دیکھا ناں میں نے تیرے گمراہ بیٹے کا کیا حشر کیا۔'' سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''میں نے تو بس یہی دیکھا کہ تو نے اس کی دنیا برباد کی اور اس نے تیری آخرت۔'' اس دوٹوک جواب نے حجاج جیسے زبان آور کو گنگ کر دیا۔ اسے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے پھر فرمایا: ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو اُسے دو دوپٹے والی کی اولاد کہہ کر عار دلاتا تھا۔ ہاں اللہ کی قسم! میں دو دوپٹے والی ہوں مگر تو مجھے کون سے دوپٹے کی شرم دلا سکتا ہے۔ اس دوپٹے کی جس میں کھانا باندھ کر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس لے جایا کرتی تھی جب وہ غار میں روپوش تھے؟ یا اس دوپٹے کی جو ہر شریف عورت گھر کے کام کاج کی وجہ سے باندھا کرتی ہے؟'' سچائی کے اس نشتر نے حجاج کو اندر سے کاٹ ڈالا۔ عرب کا یہ سب سے بڑا مقرر بمشکل اتنا کہہ پایا: ''یہ منافق تھا۔'' اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''منافق نہیں روزہ دار، تہجد گزار اور نیکوکار تھا۔''

حجاج سے اب بھی کوئی جواب نہ بن پڑا۔ زچ ہو کر کہا: ''بڑھیا! جا چلی جا، تیرا دماغ خراب ہے۔''

بولیں: ''اللہ کی قسم! میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔ مجھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد خوب یاد ہے کہ بنوثقیف سے ایک کذاب ظاہر ہوگا اور ایک مبیر (خونخوار)۔ کذاب کو تو ہم نے دیکھ لیا تھا اور خون خوار تو ہی ہے۔''

حجاج سٹ پٹا گیا اور یہ کہتے ہوئے مڑ گیا: ''میں خون خوار ہوں مگر منافقوں کا خون خوار۔''

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا بولیں: ''نہیں بلکہ منافقوں کا سردار۔''[1]

بیٹے کی شہادت کے پانچویں یا دسویں دن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بھی دنیائے فانی سے رحلت فرما گئیں۔[2] ایک دن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنی اونٹنی پر سوار اس گھاٹی سے گزرے جہاں شہید کی لاش لٹکائی گئی تھی تو بے اختیار گویا ہوئے:

''السلام علیک ابا خبیب! اللہ تم پر رحمت کرے، دیکھو! اللہ گواہ ہے میں نے (بطورِ شفقت) تمہیں اس (پُرخطر راستے) سے منع کیا تھا۔ اللہ کی قسم! جہاں تک میں جانتا ہوں تم بلاشبہ بہت روزے رکھنے والے، بکثرت نوافل پڑھنے والے اور بہت صلہ رحمی کرنے والے انسان تھے۔ اللہ کی قسم! جس اُمت کا بدترین آدمی تم جیسا ہو وہ اُمت خیر ہی خیر ہوگی۔''[3]

مطلب یہ تھا کہ تمہارے قاتل تم جیسے نیک انسان کو بدترین قرار دے رہے ہیں۔ پس اگر اُمتِ محمدیہ کے بُرے کہلانے والے تم جیسے فرشتہ صفت ہوتے ہیں تو اُمت کے نیک کہلانے والے لوگ کس درجے کے ہوں گے!!

حجاج بن یوسف نے شہید کی لاش کو توہین و تذلیل کے لیے لٹکایا تھا مگر جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی خواہش کے

---

① صحیح مسلم، ح: ۲۶۶۰، باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا؛ مسند احمد، ح: ۲۶۹۷۳؛ حلیۃ الاولیاء: ۱ ص ۳۳۳

② تاریخ الطبری: ۶ ص ۱۹۰

③ صحیح مسلم، ح: ۲۶۶۰، باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا

برعکس حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جیسی ہستی وہاں کھڑی ہو کر شہید کی تعریف وتوصیف کر رہی ہے تو لاش کو کھمبے سے اُتروایا اور ورثاء کے حوالے کرنے کی بجائے یہودیوں کے قبرستان میں پھینکوا دیا۔ ①

نمازِ جنازہ اور کفن دفن کی اجازت اس کے بعد بھی نہیں دی گئی۔ یہ انسانیت کی پامالی کی انتہا تھی۔

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کی عبدالملک سے ملاقات:

اس دوران حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بھائی عروہ بن زبیر رحمہ اللہ دن رات سفر کر کے دمشق پہنچے اور عبدالملک سے نعش کی تجہیز وتکفین کی اجازت لی۔ عبدالملک نے حجاج کو حکم بھیج دیا کہ نعش کو ورثاء کے حوالے کر دو۔ عروہ رحمہ اللہ ایک ماہ کے سفر کے بعد گھر واپس پہنچے تو نعش ان کے حوالے کی گئی۔ انہوں نے نمازِ جنازہ پڑھ کر نعش کو حجون کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ شہید کی قبر سے ایک مدت تک مشک کی خوشبو آتی رہی جو حق وباطل میں فرق کا کھلا ثبوت تھی۔ ②

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق اور امرائے شام باغی تھے:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے دور کے برحق خلیفہ تھے اور ان کے خلاف صف آراء شامی امراء بلاشک وشبہ باغی تھے۔ جمہور علمائے اُمّت کا مسلک یہی ہے۔ امام ابن حزم الظاہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”مروان نے امیر المؤمنین عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا اور خلافت کا دعویٰ کیا۔“ ③

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سیرت ذکر کرنے سے قبل یہ عنوان لگایا ہے:

” ترجمة امیرالمؤمنین عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ“ ④

پھر لکھتے ہیں: ”ان کی بیعت ۶۴ھ میں مکمل ہو گئی تھی اور لوگوں کو ان کے دور میں خیر نصیب تھی۔“ ⑤

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تقریباً بیس (۲۰) صفحات میں ان کے مناقب نقل کیے ہیں، اس دوران فرماتے ہیں:

---

① فَبَلَغَ الْحَجَّاجَ مَوْقِفُ عَبْدِاللہِ وَقَوْلُهُ، فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ، فَأُنْزِلَ عَنْ جِذْعِهِ، فَأُلْقِيَ فِي قُبُورِ الْيَهُودِ۔ (صحیح مسلم، ح: ۲۶۶۰)

ملحوظہ: کچھ لوگ صحیح مسلم کی اس روایت کو جھٹلانے کے لیے شوشہ اٹھاتے ہیں کہ مکہ میں یہود آباد ہی نہ تھے تو ان کا قبرستان کہاں سے آیا؟ اس بارے میں عرض ہے کہ اول تو مسلم کی روایت بذاتِ خود سب سے قوی دلیل ہے کہ پہلی صدی ہجری تک یہود کی کچھ قبریں وہاں تھیں (چاہے بعد میں شہر کی وسعت کے باعث مٹ گئی ہوں۔) نیز کتب سیرت سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ قبل از بعثت مکہ میں بعض یہودی تاجر رہتے تھے۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ يَهُودِيٌّ قَدْ سَكَنَ مَكَّةَ يَتَّجِرُ بِهَا، فَلَمَّا كَانَتِ اللَّيْلَةُ الَّتِي وُلِدَ فِيهَا رَسُولُ اللہِ ﷺ قَالَ فِي مَجْلِسٍ مِنْ قُرَيْشٍ: يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ، هَلْ وُلِدَ فِيكُمُ اللَّيْلَةَ مَوْلُودٌ؟ (دلائل النبوة للبیهقی: ۱ ص ۱۰۸)

ابن جوزی نے بھی ”قبورِ یہود“ کی تشریح میں وضاحت کی ہے کہ یہود قدیم زمانے میں حجاز کے مختلف شہروں میں آباد تھے۔ وَأُلْقِيَ فِي مَقَابِرِ الْيَهُودِ، كَانَ الْيَهُودُ قَدِيمًا قَدْ سَكَنُوا الْحِجَازَ... فَكَانَ ذَلِكَ أَوَّلَ سُكْنَى الْيَهُودِ الْحِجَازَ۔ (کشف المشکل من حدیث الصحیحین: ۴ ص ۳۵۸، ۳۵۷) ملا علی قاری نے بھی وضاحت کی ہے کہ مکہ میں یہود کی قبور تھیں جو یا تو مکہ کے یہودی باشندوں کی تھیں یا باہر سے وادیٔ مکہ میں آکر فوت ہونے والے یہودیوں کی تھیں۔ قال القاری: أَيْ: فِي مَوْضِعِ قُبُورِهِمْ مِنْ سُكَّانِ مَكَّةَ، أَوْ مِنْ وَادِيهَا مِنْ غَيْرِ أَهْلِهَا۔ (مرقاة المفاتیح: ۹ ص ۳۸۷۳) لہٰذا یہ اعتراض بالکل بے جا ہے کہ مکہ میں قبورِ یہود کہاں سے آگئیں۔

② البدایہ والنہایہ ۱۲ ص ۲۱۱؛ انساب الاشراف: ۱۳۱/۷ ③ جمہرة انساب العرب لابن حزم، ص ۸۷

④ البدایة والنهایة: ۱۸۶/۱۲ ⑤ البدایة والنهایة: ۱۸۷/۱۲، ط دار هجر

''وہ عالم تھے، عبادت گزار تھے، بارُعب اور باوقار تھے، بکثرت صوم وصلوٰۃ کے عادی تھے۔ شدید خشوع والے تھے۔ سیاست میں نہایت مضبوط تھے۔''①

آخر میں فرماتے ہیں: ''وہ صفاتِ حمیدہ کے مالک تھے، ان کا حکومت کے لیے کھڑا ہونا اللہ عزّوجل کے لیے تھا۔ پھر معاویہ بن یزید کی موت کے بعد تولامحالہ وہی خلیفہ تھے۔ وہ مروان بن حکم سے بہتر تھے جس نے ان کی خلافت پر اجماعیت قائم ہونے، ہر سمت ان کی بیعت ہو جانے اور ان کی حکومت منتظم ہو جانے کے بعد ان سے نزاع کیا۔''②

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اہلِ حق کا مذہب یہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مظلوم تھے۔ حجاج اور اس کے ساتھی ان کے خلاف بغاوت کے مرتکب تھے۔''③

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور پر ایک نظر:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا عہدِ حکومت صحابہ کی حکمرانی کا آخری باب تھا۔ انہوں نے اسلام کی تاریخ میں پہلی بار مکہ کو دارالخلافہ بنایا اور یوں مذہبی حیثیت کے ساتھ ساتھ اسے سیاسی اہمیت بھی بخشی۔ خانہ کعبہ کو بنیادِ ابراہیمی کے مطابق تعمیر کرنا ان کا مشہور کارنامہ ہے۔ مکہ کے پہلے محاصرے میں جو یزید کے دور میں شروع ہوا تھا، منجنیقوں کی سنگ باری اور پھر آتش زدگی نے کعبہ کو خستہ وشکستہ کر دیا تھا۔ مسند خلافت سنبھالتے ہی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے ضروری سمجھا کہ کعبہ کو دوبارہ تعمیر کیا جائے۔ انہوں نے اپنی خالہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنا تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کو بنیادِ ابراہیمی کے مطابق تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا یعنی حجر و حطیم کا حصہ جو قریش نے کعبہ سے باہر چھوڑ دیا تھا، اسے کعبہ کی چار دیواری کے اندر لے لیا جائے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارادے پر عمل اس لیے نہیں کیا کہ نومسلم قریشی کعبہ کی توڑ پھوڑ سے کسی غلط فہمی یا بداعتقادی کا شکار نہ ہو جائیں۔④ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسی حدیث کے مطابق کعبہ کو ازسرِنو تعمیر کرایا اور حطیم کو چار دیواری میں لے آئے۔ مگر مکہ کی دوسری جنگ میں سنگ باری نے کعبہ کی عمارت کو دوبارہ شکستہ کر دیا۔ جنگ کے خاتمے پر جب عبدالملک نے حجاج بن یوسف کو حجاز کا حاکم بنایا تو اس نے کعبہ کو منہدم کرا کے دوبارہ قریش کے نقشے کے مطابق بنوا دیا۔ تب سے آج تک کعبہ انہی بنیادوں پر قائم چلا آ رہا ہے۔⑤

عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے دور میں کعبہ کو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے نقشے کے مطابق تعمیر کرنے کا ارادہ کیا مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے منع کر دیا اور فرمایا: ''کعبہ کو حکمرانوں کا کھلونا مت بنایئے کہ جو چاہے اسے بدل دے۔ اس طرح اس کی عظمت وہیبت دلوں سے نکل جائے گی۔'' چنانچہ ہارون الرشید اپنے ارادے سے باز آ گیا۔⑥

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/ ۲۰۳

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/ ۲۰۶ ③ شرح مسلم للنووی، ح: ۲۵۳۵

④ صحیح مسلم، ح: ۳۳۰۸، ۳۳۱۰، کتاب الحج، باب نقض الکعبۃ، صحیح البخاری، ح: ۱۲۶، کتاب العلم

⑤ صحیح مسلم، ح: ۳۳۱، ۳۳۰۸، ۳۳۰۹، کتاب الحج، باب نقض الکعبۃ، البدایہ والنہایہ: ۱ ص ۶۹۲

⑥ شفاء الغرام باخبار بلد الحرام لابی طیب الفاسی: ۱ ص ۱۳۶

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ رعایا کے حق میں نہایت مہربان اور سخی تھے۔ قحط سالی میں نابغہ بن جعدہ شاعر نے آکر فریاد کی تو آپ نے سات اونٹنیاں، ایک اونٹ اور گندم، جو، کھجور اور کپڑے دے کر رخصت کیا۔ ①

۷۰ھ میں ان کے بھائی مصعب رحمہ اللہ نے ۲۰ ہزار بکریاں اور ایک ایک ہزار اونٹ قربان کر کے اہل حجاز میں تقسیم کیے۔ یہ اہتمام عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سرپرستی میں ہوا تھا۔ ②

خلافتِ زبیریہ کے سقوط کے اسباب:

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت آٹھ سال دس ماہ قائم رہی۔ اس کے سقوط کے پس پردہ جو ظاہری اسباب نظر آتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

① عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا دور فتنوں سے بھرپور تھا۔ خوارج، مختار ثقفی اور ان سے بڑھ کر اہل شام ان کے سخت مخالف تھے۔ ان کی ساری توانائی اور قوت بیک وقت ان حریفوں سے نمٹنے میں صرف ہوتی رہی۔

② نئے دور کی سیاست قبائل کے امراء کو خوش کرنے اور ان کا دل جیتنے کے ساتھ چلنے لگی تھی جس کے لیے آپ رضی اللہ عنہ کے مخالفین کھلا خرچ کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ دورِ خلفائے راشدین جیسی سیاست اور جہاں بانی برت رہے تھے جسے اس دور کے سیاسی زعماء قبول کرنے سے گریزاں تھے۔ اس کی بجائے انہیں اہل شام کی لین دین پر مبنی سیاست پسند تھی۔

③ مرکز سے صوبوں کو فوجی کمک میسر نہیں آتی تھی بلکہ خود مرکز کو عراق سے کمک منگوانا پڑتی تھی کیوں کہ حجاز ایسا پیداواری خطہ نہ تھا کہ وہاں پندرہ بیس ہزار سپاہی رکھے جاسکتے۔ اس لیے حجاز کی حفاظت کے لیے کوئی بڑی فوج نہ تھی۔ خلافتِ زبیریہ کی چھاؤنیاں عراق میں تھیں جس کے سرنگوں ہوتے ہی حجاز بھی جلد ہی ہاتھ سے نکل گیا۔

④ مکہ باقی عالم اسلام سے الگ تھلگ تھا جس کی وجہ سے یہاں نقل و حمل، خوراک و رسد، مواصلات و اطلاعات و خبر رسانی سمیت تمام امور دیر سے انجام پاتے تھے۔ حریف یہی کام جلد کر کے سبقت لے جاتا تھا۔

⑤ عراق میں مختار کے مریدوں نے اندرونی طور پر ایک نیا مخالف گروہ تیار کر دیا تھا، یہ لوگ عبدالملک کے دست و بازو بن گئے اور مصعب بن زبیر رحمہ اللہ کی شہادت اور عراق کی تسخیر آسان ہوگئی جس کے بعد حجاز بھی جلد مسخر ہوگیا۔

❀❀❀

① تاریخ دمشق: ۲۸ ص ۱۹۲

② البدایہ والنہایہ: ۱۲ ص ۱۳۰؛ تاریخ الطبری: ۶ ص ۱۵۰

عہدِ صحابہ کی حکمرانی اور بعد کی سیاست وحکمرانی کا موازنہ

خلافت زبیریہ کے خاتمے پر جو درحقیقت صحابہ کرام کی قیادت کے مبارک دور کا اختتام تھا، ہم ذرا رک کر گزشتہ چالیس برس کے حالات کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔ تاریخ کا یہ دور ۳۴ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش سے شروع ہوا اور ۷۳ھ میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم ہوا۔

اس چالیس سالہ زمانے میں ہمیں پانچ حکمران صحابہ: یعنی حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسن بن علی، حضرت امیر معاویہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم مختلف ادوار میں مسلمانوں کی قیادت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان حضرات کا طرزِ سیاست، مختلف اوقات میں ان کے فیصلے، حالات سے نبرد آزما ہونے میں ان کی حکمت و فراست، غیر منصوص سیاسی مسائل کے لیے ان کی فقاہت اور قوتِ استنباط، مخالفین سے معاملات میں ان کی حزم و احتیاط، یہ تمام چیزیں ہمارے لیے رہنما قواعد وضوابط مہیا کرتی ہیں۔ بعد کے فقہاء اور ائمہ مجتہدین نے قرآن وحدیث کے بعد صحابہ کرام کے انہی آثار کو سامنے رکھتے ہوئے شرعی مسائل خصوصاً سیاستِ اسلامیہ کے آداب اور اصول مرتب کیے ہیں۔ مسلمانوں نے جب بھی ان آداب اور اقدار کی پیروی کی وہ دنیا میں سربلند رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے اہل چھ بہترین آدمیوں میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے نام سرفہرست رکھے تھے اور چھ افراد پر مشتمل انتقالِ اقتدار کی بااختیار کمیٹی مقرر کردی تھی جس کی مشاورت کے بعد اُمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر متفق ہوگئی اور کوئی فتنہ پیدا نہ ہوا۔

شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہلِ مدینہ نے باہمی مشورے سے خلیفہ مقرر کرلیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جانشین نہیں بنایا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد عراق کے اہل حل وعقد نے انہی کو منتخب کیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد، تحفظات اور بعض غلط فہمیوں کی بناء پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی مگر ابتداء اپنی خلافت کا دعویٰ بھی نہیں کیا، اگرچہ تحکیم کی ناکامی کے بعد اپنی حکمرانی کی بیعت لینا شروع کردی تھی۔ بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیاسی اختلاف کے باوجود ان کا احترام برقرار رکھا اور اس طرح ایک بااصول حزبِ مخالف کا قابل تقلید نمونہ پیش کیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے پر شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی خلافت کا اعلان کردیا۔ ایسے میں کشت وخون سے بچنے کے لیے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے عظیم ایثار کا مظاہرہ کرکے اقتدار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا۔ تلوار چلنے کی نوبت نہیں آئی اور انتقالِ اقتدار پرامن طریقے سے ہی ہوا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے امن وامان کو برقرار رکھنے کے لیے پوری نیک نیتی سے یزید کو ولی عہد بنادیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے موروثی نظامِ حکومت کے اثرات اسلامی سیاست میں داخل ہوجانے کے خطرے کے پیشِ نظر اس فیصلے پر سخت تنقید کی۔ تاہم جنگ

وجدل کی راہ سے گریز کیا۔

یزید کے دور اقتدار میں آراء کا یہ اختلاف پھیل گیا اور خانہ جنگی کا ماحول بننے لگا۔ تاہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے آخری عمل سے یہی ظاہر ہوا کہ وہ انتقال اقتدار یا نظام کی اصلاح تلوار کے بل بوتے پر نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے اہل کوفہ کو توقع کے خلاف اربابِ اقتدار سے مغلوب دیکھنے کے بعد انہوں نے خود بھی یزید سے مل کر گفت وشنید کے ذریعے معاملات طے کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا جسے عبید اللہ بن زیاد نے انجام پذیر نہ ہونے دیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے فتوے کی بناء پر یزید کی بیعت میں توقف ضرور کیا مگر خود خلافت کا اعلان نہیں کیا اور اُمت کو باہم خانہ جنگی میں ملوث ہونے سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اگرچہ یزید نے رعایت برتے بغیر ان کے خلاف لشکر کشی کرائی جو بے نتیجہ رہی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بیٹے کو جانشین بنانے کا جو منفرد فیصلہ کیا تھا وہ ایک انتظامی تجربہ یا ''ٹیسٹ کیس'' تھا۔ شرعی لحاظ سے یہ فیصلہ جواز کی حد کے اندر رہی تھا۔ عملی طور پر اس کے مثبت یا منفی ہونے کا یقینی فیصلہ بعد کے نتائج دیکھ کر ہی کیا جاسکتا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے ممکن نہ تھا کہ اپنی وفات کے بعد نافذ ہونے والے اس تجربے کے نتائج کو خود دیکھ سکتے اور اس کو زمینی حقائق کے لحاظ سے برمحل یا ناموزوں قرار دے پاتے۔ مگر ان کی طرف سے یہ کام ان کے پوتے معاویہ بن یزید نے کردکھایا اور اپنے والد یزید کے دور کی بدامنی اور ناکام سیاست کو دیکھ کر اس نے موروثی نظام کو ''پونے چار سالہ ٹیسٹ کیس'' پر ہی ختم کردینے کا فیصلہ کیا اور نظام اقتدار پھر سے اُمت کی شورائیت کے سپرد کردیا۔ مصر سے خراسان تک پوری اُمت نے بلا توقف اس نادر موقع سے فائدہ اٹھایا اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مان لیا۔ اس خلافت کے لیے کوئی فوج کشی ہوئی نہ کسی کو خریدا گیا، ہر جگہ رضا ورغبت سے بیعت ہوئی۔

مگر افسوس کہ اس موقع پر بنوامیہ اور امرائے شام میں سے بعض سیاست دانوں نے تاریخی بدتدبیری کا ثبوت دیتے ہوئے اس خلافت کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور مروان کی قیادت میں معاملے کو بزورِ شمشیر حل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

یہ اسلامی سیاست کے اصولِ شورائیت سے انحراف تھا۔ ایک طرف عبداللہ بن زبیر، نعمان بن بشیر اور ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہم سمیت جمہور اُمت تھی اور دوسری طرف مروان، عبید اللہ بن زیاد اور عمرو بن سعید جیسے چند امراء۔ اگر یہ لوگ خلافتِ زبیریہ کے ماتحت ہوجاتے تو اسلام کی تاریخ کا رخ کچھ اور ہوتا اور فتوحات وخوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہوجاتا مگر ان کی غلط سوچ کے نتیجے میں وہ خانہ جنگی شروع ہوئی جو بظاہر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت تک چلی مگر درحقیقت وہ آج تک چلی آرہی ہے کیوں کہ رائے عامہ اور عوامی رضا کو نظر انداز کرکے تلوار کے ذریعے سے حکومت چھیننا اور بزورِ قوت ان پر راج کرنا دورِ جاہلیت کا وطیرہ تھا جسے نا اہل اصحابِ شمشیر دُہراتے رہے اور یوں اُمتِ مسلمہ اُس مثالی نظام حکومت کی طرف نہ لوٹ سکی جس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی اور خلفائے راشدین نے اس کی نشو ونما کی۔

دورِ صحابہ کی سیاسی کشمکش کا خلاصہ

دورِ صحابہ کی سیاسی کشمکش اور اس میں قابلِ احترام ہستیوں کی شمولیت کی توجیہات پر ہم ہر جگہ تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ قارئین کے سامنے ایک بار پھر اسے خلاصے کے طور پر بیان کر دیتے ہیں:

❁ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اٹھنے والی تحریک سازشی عناصر کی کارستانی تھی، خونِ مسلم کا احترام اور مدینہ منورہ کی حرمت برقرار رکھنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے از خود مقابلے سے احتراز کیا اور وصیتِ نبوی کے مطابق خلافت سے سبک دوش نہ ہوئے۔ آخرکار باغیوں نے انہیں شہید کر ڈالا۔

❁ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان کے خاتمے کے لیے بصرہ گئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے اتحاد کا اعلان ہو چکا تھا کہ عبداللہ بن سبا کی سازش نے دونوں جماعتوں کو لڑا دیا۔ یہ لڑائی غلط فہمی اور سازش کا نتیجہ تھی جس پر دونوں طرف کی قیادت کو عمر بھر افسوس رہا۔

❁ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو قبول کرنے میں توقف بعض اجتہادی اختلافات، بعض غلط فہمیوں اور اہل شام کی رائے عامہ کے دباؤ کے باعث تھا جو قصاص عثمان کے لیے بے تاب تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا حق دار مانتے تھے۔ بیعت میں توقف صرف قصاص لینے تک تھا۔

جمہور اہل سنت کے نزدیک یہ توقف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خطائے اجتہادی تھی جس میں وہ نیک نیت اور ماجور تھے۔ تاہم اس کا سیاسی نقصان ہو کر رہا کہ عراق اور دمشق دو متحارب طاقتوں کی شکل میں صفین میں ٹکرائے۔ جانی اتلاف کے بعد دونوں قائدین نے جنگ بندی کر لی مگر مذاکرات کا سلسلہ "تحکیم دومۃ الجندل" پر بلا نتیجہ ختم ہو گیا۔ کچھ مدت کی سرحدی جھڑپوں کے بعد فریقین نے سرحدوں کے احترام کا معاہدہ کر لیا۔

❁ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جانشین حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ حکومت کے بعد اُمت کے مفاد کے پیشِ نظر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت سپرد کر دی اور اگلے ۲۰ سال تک اُمت متحد اور مامون رہی۔

❁ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نیک نیتی کے ساتھ یزید کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا مگر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلے۔ جمہور اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ خطائے اجتہادی تھی۔

❁ یزید نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وصیتوں کو یکسر نظر انداز کر کے فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔ اس کی حکمرانی قومی المیوں، سیاسی بحرانوں، ظلم و ستم اور رعایا کی ناراضی کا سبب بنی مگر ان اقدامات سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کوئی تعلق نہ تھا کیوں کہ وہ غیب دان نہ تھے۔ یہ سب ان کی وفات کے بعد ہوا تھا۔

❁ حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی اور یزید کے دورِ حکومت میں نکتۂ اعتراض یہ تھا کہ موروثی حکومت اسلامی شورائی روح کے خلاف ہے۔ اس لیے ان حضرات کا مخلصانہ اجتہاد اور فتویٰ یہ

تھا کہ نظامِ حکومت کی اصلاح کر کے اسے دوبارہ خلافتِ راشدہ کے طرز پر لے جانا چاہیے۔

❁ حضرت حسین رضی اللہ عنہ موروثی طرزِ حکومت کے جڑیں پکڑنے کا خطرہ محسوس کر کے اصلاحِ احوال کی کوشش کے لیے سرگرم ہوئے مگر یزید کے عمال کے ظلم وستم کا نشانہ بن گئے۔

❁ یزید حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے بیعت لینے پر مصر تھا حالانکہ مصلحت یہ تھی کہ وہ انہیں عزت واکرام کے ساتھ ان کے فتوے اور ضمیر کے فیصلے کے مطابق زندگی گزارنے دیتا۔

❁ یزید نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ جیسے دور اندیش، معاملہ فہم اور تجربہ کار لوگوں کی جگہ عبید اللہ بن زیاد، عمرو بن سعید اور مسلم بن عقبہ جیسے سخت گیر حکام کو آزمایا اور معاملات کی باگ ڈور انہی کے حوالے کر دی۔ ان لوگوں کے ہاتھوں کربلا، مدینہ اور مکہ میں قتل وغارت کا بازار گرم ہوا جس کی ذمہ داری سے یزید کسی طرح بری نہیں ہو سکتا۔

❁ یزید نے ان حکام کے مظالم اور زیادتیوں پر پس پشت مذمتی فقرے کہہ دینے سے زیادہ کچھ نہ کیا۔

شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم، یزید کے اس طرزِ عمل کے متعلق رقم طراز ہیں:

"اس کی یہ غلطی ناقابلِ انکار ہے کہ اس نے عبید اللہ بن زیاد کو اس سنگین جرم پر کوئی سزا نہیں دی۔"[1]

اس طرزِ عمل کے باعث حکومت بدنام ہوئی اور حکمران بھی۔ اور ہر طرف فساد اور بدامنی کا دور دورہ ہو گیا۔

❁ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک افضل صورت وہی تھی جس کے داعی حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما تھے، یعنی شورائیت پر مبنی غیر موروثی نظامِ حکومت، مگر ان کے خیال میں موجودہ نظام کو کسی انقلاب یا خروج کے ذریعے تبدیل کرنے کی کوشش سے مزید مفاسد اور فتنے کھڑے ہونے کا خطرہ تھا۔ اس لیے افتراقِ اُمت سے بچنے کے لیے موجودہ حکومت کو برداشت کرنا ہی "اَھْوَنُ الْبَلِیَّتَیْن" تھا۔

❁ یزید کے فسق وفجور پر یقین کرتے ہوئے اہلِ مدینہ نے اس کے خلاف خروج کیا۔ ان کے فقہی مسلک کے مطابق فاسق حکمران کو معزول کرنا واجب تھا۔ ان کے سامنے وہ احادیث تھیں جن میں گناہوں کو ہاتھ کی طاقت سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اکابرِ مدینہ اپنے فیصلے میں مجتہد تھے اس لیے ان کی جدوجہد پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔

❁ یزید سے منسوب کفریہ اعمال غیر معتبر راویوں سے منقول ہیں۔ البتہ اکثر مؤرخین وشارحینِ حدیث یزید کے خلیفہ بننے کے بعد شربِ خمر اور ترکِ صلوٰۃ میں مبتلا ہونے کے قائل ہیں۔ یوں اس کا فسق ثابت ہے۔

❁ اُمت کی اکثریت نے ظالم حکام کے خلاف مسلح جدوجہد سے احتراز کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی وجہ سے جن میں فاسق حکام کی بیعت توڑنے سے منع کیا گیا ہے، یزید اور بعد کے ظالم حکام کی بیعت برقرار رکھی۔

❁ کربلا، مدینہ اور مکہ میں جو کچھ ہوا، وہ یزید کے ظلم وستم کے ثبوت کے لیے بہت کافی ہے اور چونکہ ظلم وستم فسق وفجور کی بدترین قسم ہے، لہٰذا یزید کے فسق کے لیے کسی اور دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے یزید

---

[1] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق: ص ۱۱۵

کے مظالم ہی سے اس کے فسق پر استدلال کر کے اس سے روایت حدیث لینے کو ممنوع قرار دیا۔ ①

❁ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا موقف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مطابق تھا۔ طویل مدت تک حرم میں پناہ گزین رہنے کے باوجود انہوں نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔ یزید کے بیٹے معاویہ کے بعد جب عالم اسلام میں کوئی خلیفہ نہ تھا، تمام عالم اسلام میں عوام وخواص کی اکثریت نے ان سے بیعت خلافت کر لی۔

❁ مروان اور اس کے بیٹے عبدالملک نے اس شرعی خلافت کو قبول نہ کیا اور شام پر قابض ہو کر بزور شمشیر اپنی خاندانی خلافت قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور آخر کار خلافت زبیریہ کا خاتمہ کر دیا۔

❁ قرون اولیٰ کے صحیح الایمان قائدین کے مابین سیاسی کش مکش کے علاوہ خوارج اور سبائی گماشتوں اور مختار ثقفی جیسے لوگوں سے تقریباً ہر حکمران کو واسطہ پڑتا رہا۔ ان کی سرکوبی کے لیے جو بھی کوششیں ہوئیں ان کے برحق ہونے میں کوئی شک نہیں۔

❁❁❁

① السنۃ لابی بکر بن الخلال، ج:۵، ۸۴۵ باسناد صحیح

مشق

سوالات کے جوابات دیجئے:

❶ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب پر بیس سطری نوٹ لکھئے۔
❷ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت کیوں سنبھالا؟ اسباب و علل پر روشنی ڈالیے۔
❸ جابیہ کے اجتماع اور جنگِ مرجِ راہط کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟
❹ مروان بن حکم شام اور مصر پر قبضہ کرنے میں کیسے کامیاب ہوا؟
❺ مختار ثقفی کون تھا؟ اس نے مسلمانوں کو کس طرح گمراہ کیا اور اس کا انجام کیا ہوا؟
❻ عبدالملک بن مروان نے مصعب بن زبیر رحمہ اللہ کے خلاف فیصلہ کن جنگ سے قبل کیا انتظامات کیے؟
❼ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے شہادت سے قبل اپنی والدہ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے کیا گفتگو کی؟
❽ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خانہ کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کرانے میں کونسے فرمانِ نبوی کو ملحوظ رکھا؟

عملی کام:

❁ طلبہ باہم مباحثہ کریں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حکومت شرعی خلافت تھی یا نہیں۔
❁ جزیرۃ العرب، عراق اور ایران کا نقشہ دیکھئے اور خلافتِ زبیریہ کی حدودِ اربعہ کو واضح کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ سیرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، از طالب ہاشمی مرحوم
❁ خلافة امیرالمؤمنین عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، از دکتور علی محمد الصلابی
❁ البدایة والنهایة، سنة ۶۴ھ تا ۷۳ھ، مع ترجمة امیرالمؤمنین عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ

❁❁❁

چوتھا باب

عہدِ بنو مروان

۷۳ ہجری تا ۱۳۲ ہجری
۶۹۲ عیسوی تا ۷۴۹ عیسوی

تعارف:

مروان بن حکم (بن ابی العاص بن اُمیہ) بنواُمیہ کے رؤساء میں سے تھا۔ اس نے شام میں الگ حکومت قائم کی جسے اس کے بیٹے عبدالملک نے مستحکم کیا۔ یہ حکومت تقریباً پچاس سال قائم رہی۔ اس دور میں سندھ، وسطِ ایشیا اور اسپین جیسے وسیع علاقے اسلامی قلمرو کا حصہ بنے۔ عظیم خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی اسی خاندان سے تھے۔

اغراض و مقاصد:

اس باب کو پڑھ کر آپ ان شاء اس قابل ہو جائیں گے کہ:

① بنواُمیہ کی مروانی شاخ کے فرمانرواؤں کے ضروری حالات سے آگاہ ہو سکیں۔ ② بنو مروان کے دور میں سندھ، اَندُلس اور وسطِ ایشیا کی فتوحات سے واقف ہوں۔ ③ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی سیرت اور ان کی اصلاحی کوششوں سے سبق حاصل کر سکیں۔ ④ بنو مروان کے خلاف اٹھنے والی بنو ہاشم کی تحریک کے خدوخال کو سمجھ سکیں ⑤ بنو مروان کے زوال کی وجوہ سے واقف ہو سکیں۔

(یونٹ:2.3)

عبدالملک بن مروان

جمادی الاولیٰ ۷۳ھ......تا......شوال ۸۶ھ
اکتوبر ۶۹۲ء......تا......اکتوبر ۷۰۵ء

مروان بن حکم شام اور مصر میں اپنی آزاد حکومت قائم کرنے کے بعد رمضان ۶۵ھ میں فوت ہوگیا تھا۔ وہ صرف نو ماہ حکمرانی کر سکا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک تخت نشین ہوا جس نے چند سال بعد عراق پر بھی قبضہ کرلیا اور ۷۳ھ میں اس کے نائب حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے حجاز پر بھی قبضہ کرلیا۔ اب عبدالملک کا دور دور تک کوئی مدمقابل نہیں تھا لہٰذا ہر جگہ عوام و خواص نے اس کی بیعت کرلی تھی۔

اسلام نے راہ نمائی کی ہے کہ مسلمان ایسی صورت حال کا کس طرح سامنا کریں گے۔ قرآن و سنت اور عقل و نقل کے دلائل سے استفادہ کرتے ہوئے فقہائے اُمت نے یہ ضابطہ طے کیا ہے کہ جو حاکم مسلمانوں کی رضا کے بغیر بزور شمشیر ان پر مسلط ہو جائے اسے خلیفہ یا امام مان لیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ چاہے مظالم کا مرتکب بھی ہو مگر اس کی زیادتیوں پر صبر اور جائز امور میں اس کی اطاعت کی جائے گی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''اکثر علماء کا موقف یہ ہے کہ ظالم حاکم کی اطاعت پر صبر کرنا، اس کے خلاف خروج سے بہتر ہے؛ اس لیے کہ اس کے مقابلے اور بغاوت کی صورت میں امن کی جگہ خوف، خون ریزی، نادان لوگوں کی دست درازی، مسلمانوں پر تاخت و تاراج اور زمین میں فساد کا خدشہ ہے۔'' ①

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنا کہ اگلے دور میں ظالم امراء مسلط ہوں گے تو عرض کیا: ''کیا ہم ان سے مقابلہ نہ کریں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں جب تک وہ نماز قائم رکھیں۔'' ② اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور اسی طرح محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ جیسے حضرات نے بھی جو سیاسی قضیوں سے لاتعلق تھے، عبدالملک کی بیعت کرلی۔ ③

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت:

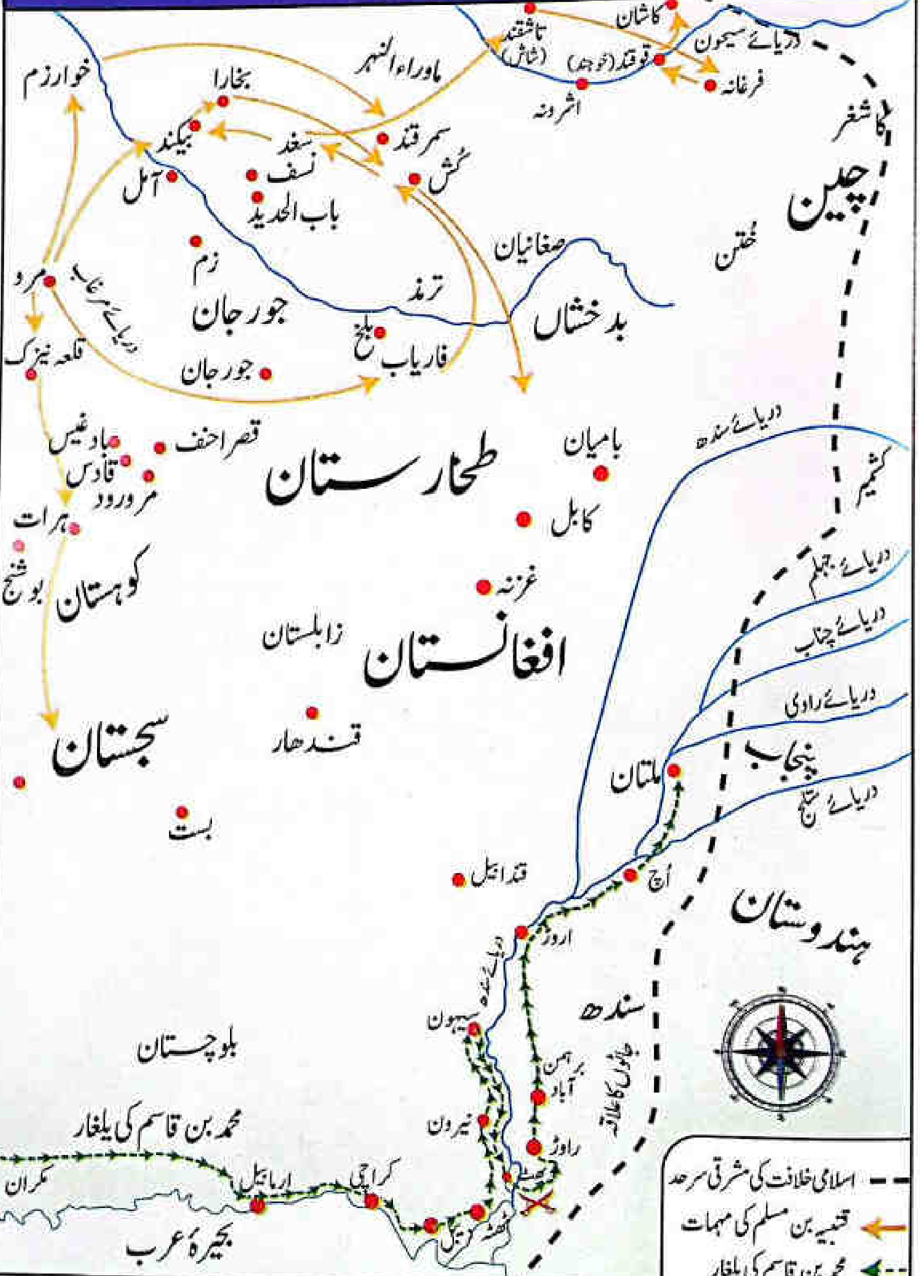
عبدالملک کی خلافت کے آغاز میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا۔ انہیں حجاج کی طرف سے قتل کی دھمکی ملی تھی۔ ہوا یہ کہ ایک دن حجاج نے تقریر میں کہا: ''عبداللہ بن زبیر نے کلام اللہ کو بدل دیا۔'' یہ سن کر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فوراً بولے: ''اللہ کے دشمن! تو نے جھوٹ کہا، بلکہ تو نے حرم شریف کا احترام پامال کر ڈالا، بیت اللہ کو تباہ کیا۔''

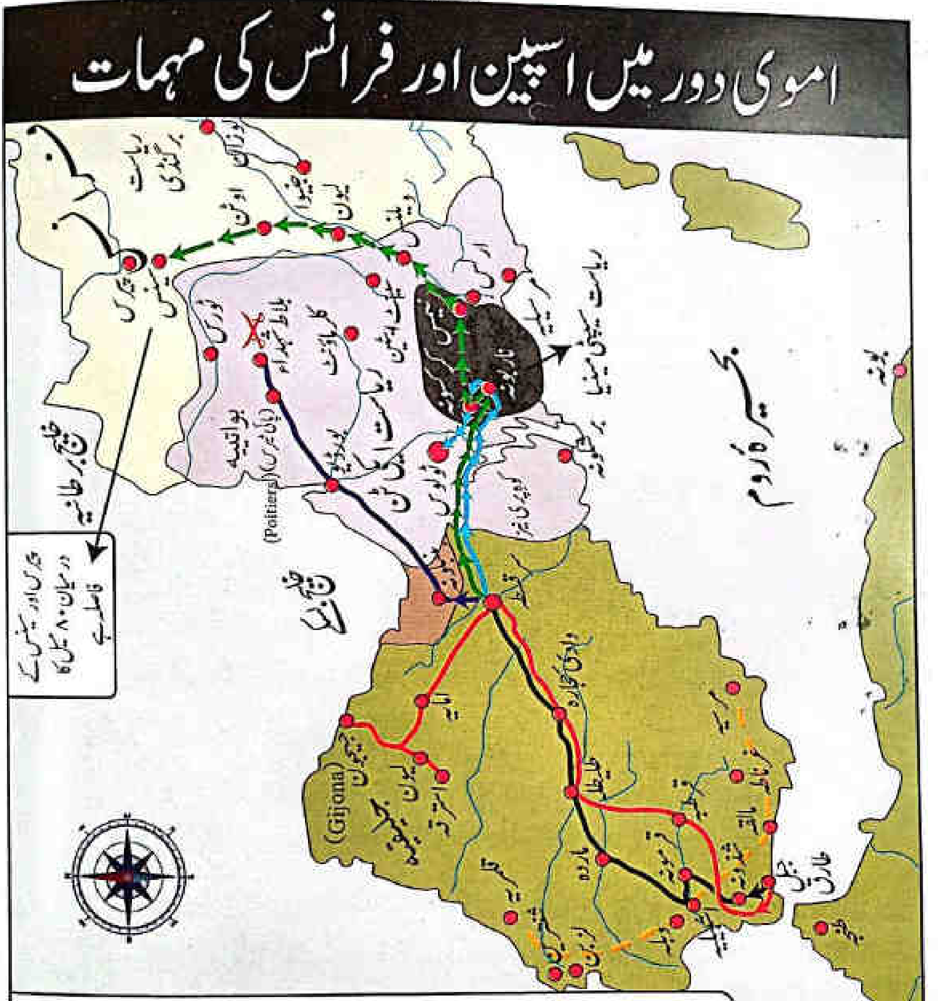
---

① تفسیر القرطبی: ۱۰۹/۲، ط دار الکتب المصریۃ ② صحیح مسلم، ح: ۴۹۱۰، کتاب الامارۃ، باب خیار الائمۃ وشرارھم
③ صحیح البخاری، ح: ۷۲۰۵، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس؛ طبقات ابن سعد: ۱۱۰/۵، ط دار صادر

فتوحات خلافت امویہ ولید بن عبد الملک کے دور میں

۹۰-۹۵ ہجری




اموی دور میں اسپین اور فرانس کی مہمات
بحر روم
بحر ظلمات
(بحر اوقیانوس)
(Gijona)
(Poitiers)
طارق بن زیاد: اسپین کی مہم (۹۲ھ۔۷۱۱ء) خلیفہ ولید کے دور میں
موسیٰ بن نصیر: اسپین کی مہم (۹۳ھ۔۷۱۲ء) خلیفہ ولید کے دور میں
عبدالعزیز بن موسیٰ: اسپین کی مہم (۹۳ھ۔۷۱۲ء) خلیفہ ولید کے دور میں
سمح بن مالک: فرانس کی مہم (۱۰۳ھ۔۷۲۱ء) خلیفہ یزید بن عبدالملک کے دور میں
عنبسہ بن سحیم: فرانس کی مہم (۱۰۳ھ۔۷۲۱ء ..... ۱۰۷ھ۔۷۲۶ء) خلیفہ یزید بن عبدالملک اور ہشام بن عبدالملک کے دور میں
عبدالرحمن بن الغافقی: فرانس کی مہم (۱۱۳ھ۔۷۳۲ء) خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دور میں
وادیٔ لوار میں معرکہ بلاط الشہداء
۱۵ شعبان ۱۱۴ھ ..... ۹ اکتوبر ۷۳۲ء

حجاج بولا: ''تم سٹھیا گئے ہو۔ کوئی بعید نہیں کہ تمہاری گردن اڑا دی جائے اور بچے تمہاری لاش گھسیٹیں۔ ''①

اس کے کچھ دنوں بعد ذوالحجہ ۷۳ھ میں آپ رضی اللہ عنہ نے حج کیا۔ منیٰ میں شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ اونٹنی پر سوار تھے۔ حجاج بن یوسف کے کارندے یہاں اسلحہ تانے گھوم رہے تھے۔ انہی میں سے کسی کا نیزہ آپ رضی اللہ عنہ کے تلوے کو لگا اور اتنا خون بہا کہ پاؤں سواری کی رکاب سے چپک گیا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اسی حال میں مناسک پورے کیے۔②

حجاج بن یوسف عیادت کے لیے آیا تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم ہی نے مجھے قتل کرایا ہے۔'' حجاج نے پوچھا: ''وہ کیسے؟'' فرمایا: ''حرم کی حدود میں جہاں ہتھیار لے جانا حلال نہیں ہے وہاں اسلحہ اٹھانے کی اجازت تمہی نے دی، پس مجھے تمہارے ہی کسی آدمی کا ہتھیار لگ گیا۔''③

اسی زخم کے باعث عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ چند دن بعد یکم محرم ۷۴ھ کو ۸۴ سال کی عمر میں مکہ میں فوت ہو گئے۔ آپ نے دو ہزار چھ سو تیس (۲۶۳۰) احادیث کا ذخیرہ چھوڑا۔ چوں کہ آپ مکہ سے ہجرت کر چکے تھے اس لیے یہاں دفن ہونے سے غیرت آ رہی تھی۔ چنانچہ وفات سے پہلے وصیت کر دی تھی کہ مجھے حرم کی حدود سے باہر دفن کیا جائے مگر حجاج نہ مانا۔ نماز جنازہ اسی نے پڑھائی اور مکہ میں مہاجرین کے قبرستان ''مُحَصَّب'' میں دفن کرایا۔④

مؤرخین کے بقول حجاج ہی نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کرایا تھا۔ اس نے کسی کو متعین کیا تھا کہ موقع پا کر انہیں زہریلا نیزہ چبھو دے،⑤ ورنہ محض پاؤں پر زخم لگنے سے کسی کی موت واقع نہیں ہو جاتی۔

خوارج کی شورش

عبدالملک کی تخت نشینی کے بعد خوارج ایک نئے ولولے سے بنو مروان کے مقابلے پر نکل آئے تھے۔ ان کا جو گروہ بحرین میں ابوفُدَیک کی سرکردگی میں سراپا بغاوت چلا آ رہا تھا، اسے ۷۳ھ میں عبدالملک کے جرنیل عمر بن عبیداللہ نے دس ہزار فوج کے ساتھ حملہ کر کے خون ریز جنگ کے بعد کچل ڈالا اور ابوفُدَیک مارا گیا۔

تاہم خوارج کے بڑے گروہ ''ازارقہ'' نے پورے فارس اور عراق میں مسلسل غارت گری سے ہل چل مچا رکھی تھی اور اموی افواج کو جو عبدالعزیز بن عبداللہ کے زیر کمان تھیں، شکست دے ڈالی تھی۔ آخر عبدالملک نے مُہَلَّب بن ابی صفرہ کو یہ مہم سونپی جو خوارج سے جنگوں کا طویل تجربہ رکھتے تھے۔ مُہَلَّب فوج لے کر خوارج کے مقابلے کے لیے ''رامَہُرمُز'' کے محاذ پر روانہ ہوئے جہاں خوارج کا زور سب سے زیادہ تھا۔ مگر جنگ سے پہلے ہی کوفہ کے حاکم بشر بن مروان کی موت کی خبر آ گئی جسے سن کر اکثر فوج قیادت کی اجازت کے بغیر واپس چلی آئی۔⑥

---

① طبقات ابن سعد: ۴/۱۸۴، عن مسلم بن ابراهيم بسند صحيح

② صحيح البخاری، ح: ۹۶۶؛ طبقات ابن سعد: ۴/۱۸۵، ۱۸۶

③ صحيح البخاری، ح: ۹۶۶، ۹۶۷، كتاب الجمعة، باب مايكره من حمل السلاح في العيد والحرم؛ طبقات ابن سعد: ۴/۱۸۷

④ البداية والنهاية: ۱۲/۲۳۷، ۲۳۸؛ طبقات ابن سعد: ۴/۱۸۷، ط دار صادر

⑤ سير اعلام النبلاء: ۳/۲۳۰... قال المحشی، رجاله ثقات ⑥ تاريخ الطبری: ۶/۱۹۳ تا ۱۹۸

عراق میں حجاج بن یوسف کا تقرر اور کوفہ میں اس کا مشہور خطبہ:

یہ دیکھ کر عبدالملک نے عراق کے لیے اپنے سخت ترین افسر ۳۵ سالہ حجاج بن یوسف کو آزمایا اور اسے ۷۵ھ میں عراق کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔ وہ ماہ رمضان میں بارہ سواروں کے ساتھ کوفہ پہنچا، سیدھا جامع مسجد میں داخل ہوا اور اعلان کر کے عوام کو جمع کر لیا۔ منہ کو عمامے کے شملے سے ڈھانکے جب وہ منبر پر کھڑا ہوا تو کچھ دیر چپ رہا۔ بہت سے شریر لوگ ہاتھوں میں کنکر لیے نئے حاکم کی خاطر تواضع کے لیے تیار تھے۔ اچانک حجاج کی آواز نے سناٹے کو توڑ دیا:

أنَا ابْنُ جَلَا وَ طَلَّاعُ الثَّنَايَا مَتىٰ أَضَع العِمَامَةَ تَعْرِفُوْنِي

''میں اندھیروں کو چیر دینے والا آفتاب ہوں، گھاٹیاں عبور کرنے کا ماہر ہوں۔

جب میں عمامہ اتاروں گا تو تم مجھے پہچان لو گے۔''

یہ کہہ کر اس نے منہ سے نقاب ہٹا دیا۔ لوگ کانپ گئے اور ان کے ہاتھوں سے کنکریاں گر گئیں۔ اب حجاج نے ایک شعلہ بار تقریر کی اور کہا:

''لوگو! میں برائی سے اس کی حیثیت کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔ جو جیسا کرتا ہے ویسا سلوک کرتا ہوں۔ میں بہت سے سروں کو دیکھ رہا ہوں جن کے کٹنے کا وقت آچکا ہے۔ بہت سے عمامے اور ڈاڑھیاں خون سے رنگین ہونے کو ہیں۔ عراق کے لوگو! مجھے دبایا نہیں جا سکتا۔ میرا تقرر سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے۔ امیر المؤمنین نے اپنے ترکش کے سارے تیر نکال کر ان کی سختی کو جانچا اور جو سب سے سخت محسوس ہوا اسے تمہاری طرف چلایا۔

تم ایک طویل زمانے سے فتنہ وفساد اور سرکشی کے عادی چلے آرہے ہو مگر اب یاد رکھو! میں تمہاری کھال اس طرح ادھیڑ دوں گا جیسے درخت کی چھال اتاری جاتی ہے۔ تمہیں کانٹے دار جھاڑیوں کی طرح کاٹ ڈالوں گا۔ تمہیں اس طرح ماروں گا جیسے سرکش اونٹ کو پیٹا جاتا ہے۔ میں تلوار سے تمہاری اس طرح خبر لوں گا کہ تمہارے بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو جائیں گی۔ سنو! باغی جماعتوں سے دور رہو اور راہ راست پر آجاؤ۔ اگر باغی کامیاب ہو گئے تو نہ خراج وصول ہو گا نہ سرحدوں کی حفاظت ممکن ہو گی۔

اللہ کی قسم! جب میں کوئی وعدہ کرتا ہوں تو اسے پورا کرتا ہوں۔ کسی بات کا عزم کر لوں تو اسے کر کے چھوڑتا ہوں۔ جس باغیانہ انداز میں تم مُہَلَّب کا ساتھ چھوڑ کر آئے ہو، وہ مجھے معلوم ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تین دن بعد میں جس شخص کو بھی یہاں دیکھوں گا، اس کی گردن اڑا دوں گا اور جائیداد ضبط کر لوں گا۔''

اس تقریر نے لوگوں کے ہوش اڑا دیے۔ اس کے بعد حجاج نے اپنے نقیب کو حکم دیا کہ اہل کوفہ کے نام خلیفہ عبد الملک کا مراسلہ سرِعام سنائے۔ ابھی مراسلے کے ابتدائی الفاظ ''السلام علیکم'' ہی پڑھے گئے تھے کہ حجاج بن یوسف حاضرین پر برس پڑا اور بولا: ''امیر المؤمنین تمہیں سلام کہہ رہے ہیں اور تم جواب تک نہیں دیتے۔''

فضا یک دم ''وعلیکم السلام'' کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ حجاج نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں تمہیں ادب سکھا کر رہوں گا۔''

اس کے بعد خلیفہ کا خط سنایا گیا اور اہل کوفہ محاذ پر جانے کے لیے اس طرح دوڑے کہ شہر خالی ہو گیا۔ ①

قطری بن فجاءۃ خارجی کی سرکوبی:

حجاج کے حکم پر کوفہ کے ہزاروں رضا کار محاذ پر پہنچے تو مُہلّب نے انہیں لے کر ازارقی گروہ کے خوارج سے نبرد آزمائی شروع کی۔ اب ان کا سردار قطری بن فجاءۃ تھا۔ مُہلّب نے مختلف محاذوں پر ڈیڑھ سال تک ان کا متواتر تعاقب کیا مگر قطری بن فجاءۃ ہاتھ میں نہ آیا۔ تاہم ۷۷ھ میں قطری کے گروہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ حجاج بن یوسف نے یہ اطلاع ملتے ہی مُہلّب کو حریف پر فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا۔ مُہلّب نے کچھ دنوں تک توقف کیا اور خارجیوں کے گروہوں کو آپس میں لڑنے مرنے دیا۔ جب وہ لڑ بھڑ کر تھوڑے رہ گئے تو پہلے ایک گروہ کو کچلا اور پھر ۷۹ھ میں قطری کا تعاقب کرتے کرتے طبرستان پہنچ گیا جہاں قطری کی بچی کھچی جمعیت بھی کام آگئی اور وہ خود فرار ہونے کی کوشش میں پہاڑ کی ڈھلوان سے پھسل گیا اور لڑھکتے ہوئے نیچے جا گرا، اتنے میں سپاہیوں نے پہنچ کر قتل کر دیا۔ ②

عین انہی ایام میں خوارج کا ایک گروہ ''اَلصُّفْرِیَّۃ'' نمودار ہوا جس کا قائد شبیب بن یزید بن نعیم شیبانی تھا۔ اس نے مٹھی بھر افراد کے ساتھ سرکاری افواج کو پے در پے شکستیں دیں۔ آخر حجاج نے عتاب بن ورقاء کو ۵۰ ہزار کا لشکر جرار دے کر بھیجا۔ گویا عراق کی پوری طاقت جھونک ڈالی۔ ساباط کے قریب گھمسان کا رن پڑا۔ شبیب کے پاس صرف ایک ہزار جانباز تھے، مگر اس نے اتنے بڑے لشکر کو اس بری طرح شکست دی کہ سپہ سالار عتاب بھی مارا گیا۔ ③

آخر ۷۷ھ میں اہواز کے قریب دریا کے کنارے ہولناک معرکہ ہوا۔ دن بھر لڑائی کے باوجود مٹھی بھر خارجی ڈٹے رہے۔ شام کو جنگ عارضی طور پر رکی تو شبیب نے دریا پر کشتیوں کا پل بنوایا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر یہ پل عبور کرنے لگا تاکہ دریا کے پار دشمن سے محفوظ رہ کر ساتھیوں کو آرام دے۔ اچانک پل کے درمیان گھوڑا بدک گیا اور شبیب دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ یوں حجاج اور عبدالملک کو ایک سخت جان دشمن سے نجات ملی جو ہزار ڈیڑھ ہزار شہ سواروں کے ساتھ دو سال تک ان کے لیے دردِ سر بنا رہا۔ شبیب کے مقابلے میں کئی گنا افواج کی ہزیمت کی بڑی وجہ حجاج کا رویہ تھا۔ وہ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر جنگ پر بھیجتا تھا۔ ایسے میں ان کا رہا سہا جذبہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔ ④

افریقہ کی فتوحات:

ہم پڑھ چکے ہیں کہ یزید بن معاویہ کے آخری ایام میں افریقہ کے اکثر مفتوحہ علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ پھر جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت شروع ہوا تو اس کے آغاز ہی میں شام اور مصر پر مروان نے قبضہ کر لیا۔ مروان اور اس کے جانشین عبدالملک کی زیادہ توجہ خلافتِ زبیریہ کے خاتمے پر مرکوز رہی اس لیے افریقہ میں مزید فتوحات رُکی رہیں۔ تاہم پورے عالم اسلام کی زمام اقتدار سنبھالنے کے بعد عبدالملک نے ۷۴ھ میں حسان بن

① تاریخ الطبری: ۶/۲۰۲ تا ۲۰۶ ② تاریخ الطبری: ۶/۳۰۱ تا ۳۱۰

③ تاریخ الطبری: ۶/۲۱۹ تا ۲۲۶ ④ تاریخ الطبری: ۶/۲۶۸ تا ۲۸۳، ۷۶ھ تا ۷۷ھ

نعمان کی قیادت میں چالیس ہزار کا لشکر جرار افریقہ بھیجا۔ حسان بن نعمان نے بحیرۂ روم کے ساحلی شہر "قرطاجنۃ" کو مسخر کیا اور ۷۹ھ میں "کوہِ اُوراس" کے فلک بوس قلعوں کو فتح کر کے شمالی افریقہ پر مسلمانوں کا قبضہ مستحکم کر دیا۔ ①

عبدالرحمٰن بن اَشعث کا خروج:

خراسان میں مقامی آتش پرست سردار رُتبیل مسلمانوں کے لیے دردِ سر بنا ہوا تھا جس نے ۷۴ھ میں علمِ بغاوت بلند کر کے اسلامی لشکروں کو یکے بعد دیگرے شکستیں دیں۔ وہ مسلمانوں کے لیے راستہ چھوڑ کر افواج کو دائیں بائیں پھیلا دیتا تھا۔ جب مسلمان پیش قدمی کر کے تنگ گھاٹیوں میں آ جاتے تو وہ انہیں گھیر لیتا تھا۔ آخر ۸۰ھ میں حجاج بن یوسف نے عبدالرحمٰن بن اَشعث کو بیس ہزار سپاہ دے کر اس محاذ پر بھیجا۔ ابنِ اشعث نے سابقہ تجربات اور نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت محتاط پیش قدمی کی اور رُتبیل کے جال میں پھنسے بغیر خاصا علاقہ فتح کر لیا جبکہ باقی علاقے کی فتح کو احتیاطاً اگلے سال کے لیے ملتوی کر دیا۔ مگر حجاج بن یوسف اس حکمتِ عملی پر بھڑک اٹھا۔ اس نے ابنِ اَشعث کو حکم بھیجا کہ وہ فوراً مزید پیش قدمی کرے ورنہ فوج کی کمان چھوڑ دے۔ اس پر ابنِ اَشعث کو سخت صدمہ ہوا اور اس نے افسرانِ فوج کی تائید کے ساتھ حجاج کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ چوں کہ حجاج کے رویے اور بعض خلافِ شرع کاموں سے سبھی نالاں تھے اس لیے بکثرت علماء و قراء اور محدثین اس مہم میں شریک ہو گئے جن میں سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور امام شعبی رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ ② ان حضرات کے شرکت کے سبب کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> "قراء حضرات نے جو کہ حاملینِ قرآن اور صالحین تھے، عراق میں حجاج کے ظلم، نمازوں اور نمازِ جمعہ میں اس کی تاخیر کی وجہ سے خروج کیا تھا۔ یہ بنوامیہ کا غلط طریقہ تھا جیسا کہ اس کی خبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی کہ تم پر ایسے امراء مسلط ہوں گے جو نمازوں کو ضائع کریں گے۔" ③

بصرہ پر قبضہ۔ دَیرِ جماجم کا محاذ:

۸۱ھ میں عبدالرحمٰن بن اَشعث نے اپنے حریف رُتبیل سے صلح کر کے عراق کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ لشکر کا نعرہ "یَا ثَارَاتِ الصَّلٰوۃ" (ہائے نماز کا انتقام) تھا؛ کیوں کہ حجاج نمازوں میں اکثر دیر کرا دیتا تھا۔ ④ آخر تُستَر کے قریب ابنِ اَشعث کے لشکر اور حجاج کی فوج کے درمیان تصادم ہوا جس میں حجاج کی فوج کو شکست ہوئی۔ شکست کی خبر سن کر حجاج فوراً بصرہ سے بھاگ نکلا۔ عبدالرحمن بن اَشعث نے تعاقب کر کے ۱۰ ذوالحجہ ۸۱ھ کو شہر پر قبضہ کر لیا۔ ⑤

۸۲ھ کے آغاز سے وسط تک عبدالرحمٰن بن اَشعث اور حجاج کی فوجوں میں جھڑپیں اور لڑائیاں ہوتی رہیں۔ کبھی

---

① الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ: ۱۳۹/۱، ۱۵۰

② البدایۃ والنہایۃ: ۳۰۷/۱۲، ۳۰۸؛ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۸۱ ھجری

③ سیر اعلام النبلاء: ۳۰۶/۳؛ صحیح مسلم، ح: ۱۴۹۷، کتاب الصلوٰۃ، باب کراھیۃ تاخیر الصلوٰۃ عن وقتھا

④ الکامل فی التاریخ، سنۃ: ۸۱ھ؛ العبر فی خبر من غبر، سنۃ ۸۳ھ ⑤ تاریخ الطبری: ۳۳۰/۶؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۸۱

ایک جیتتا کبھی دوسرا۔ کوفہ اور بصرہ کبھی ایک کے قبضے میں آتے کبھی دوسرے کے۔ اس دوران بصرہ کے باہر فریقین میں دو بڑی لڑائیاں ہوئیں: ایک محرم کے آغاز میں "زاویہ" کے مقام پر۔ دوسری صفر کے آغاز میں "ظَہرُ المِربَد" کے میدان میں۔ ان میں فریقین کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ آخر میں حجاج کا پلہ بھاری رہا اور اس نے بصرہ واپس لے لیا۔

تاہم عبدالرحمٰن بن اَشعث باقی فوج کے ساتھ کوفہ پہنچ گیا۔ وہاں زبردست استقبال ہوا۔ اس کے حامی پہلے سے بھی زیادہ ہو گئے اور ان کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۸۳ھ کے آغاز میں عبدالرحمٰن بن اَشعث نے اس لشکر جرار کے ساتھ حجاج سے فیصلہ کن مقابلے کے لیے کوچ کیا۔ بصرہ سے حجاج بھی شامی سپاہیوں کو لے کر نکلا۔ ماہِ ربیع الاوّل میں حجاج نے "دیرِ قُرّہ" اور ابن اَشعث نے "دیرالجماجم" کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ جمادی الاولیٰ تک انفرادی مقابلوں اور جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۴ جمادی الآخرہ ۸۳ھ کو متحارب افواج کھلے میدان میں نکل آئیں۔ ایک نہایت خون ریز معرکہ ہوا جس میں انجام کار عراقیوں کی کثرت تعداد اور جوش و خروش پر شامیوں کی تنظیم، ثابت قدمی اور تجربہ کاری غالب آگئی۔ عراقی بڑی تعداد میں قتل ہوئے اور باقی منتشر ہو گئے۔

حجاج نے کوفہ پہنچ کر لوگوں سے بزورِ شمشیر بیعت لی، جس نے چوں چرا کی اسے قتل کر ڈالا۔ ادھر ابن اَشعث نے بصرہ پہنچ کر دوبارہ فوج مرتب کی۔ شعبان ۸۳ھ میں بصرہ کے شمال مشرق میں اہواز کے قریب دُجیل (مسکن) نامی مقام پر ایک بار پھر فریقین آمنے سامنے ہوئے۔ پندرہ روز کی زور آزمائی کے بعد آخر ابن اَشعث کو شکستِ فاش ہوئی۔ وہ فرار ہو کر خراسان چلا گیا اور رُتبیل کے پاس پناہ لی۔ حجاج بن یوسف اس کے درپے رہا۔ اس نے رُتبیل کو جنگ کی دھمکی دے کر ابن اَشعث کو پناہ دینے کے انجام سے ڈرایا۔ نیز سات برس کا خراج معاف کرنے اور جنگ بندی کا وعدہ کیا۔ آخر رُتبیل نے عبدالرحمٰن بن اَشعث کا سر قلم کر کے حجاج کے پاس بھیج دیا۔ یہ ۸۵ھ کا واقعہ ہے۔ ①

خروج کے احکام و شرائط پر فقہاء کا غور و فکر:

اس میں شک نہیں کہ دیرِ جماجم کے اکثر حریت پسند مخلص تھے، اللہ کے دین کو خالص خلافتِ راشدہ کے انداز میں نافذ کر کے نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا چاہتے تھے۔ ان شاء اللہ ان کے مقتولین کے ساتھ اللہ کے ہاں رحمت و مغفرت کا معاملہ ہوا ہوگا۔ تاریخ میں مرقوم ہے کہ ان میں سے بعض کی قبریں خوشبو سے مہکتی رہیں۔ ان کا یہ عمل بہادری و حمیت کے لحاظ سے قابل فخر ہے اسی لیے علمائے اسلام ان کے ناموں کے ساتھ "رحمہ اللہ" لگاتے ہیں۔ ان لوگوں کو مجرم قرار دینا درست نہیں بلکہ اسلاف کا کہنا ہے: "اہل جماجم اور اہل حرہ سے بہتر خروج کرنے والی جماعت کوئی نہیں۔" ②

مگر دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ اس خروج کا نتیجہ اُمت کے اجتماعی نقصان کی شکل میں نکلا اور اس میں جلیل القدر علماء و مشائخ کے قتل سے اُمت کا بہت بڑا علمی و روحانی سرمایہ ضائع ہوا۔ اس کے بعد فقہاء نے شرعی دلائل کی روشنی میں

① تاریخ الطبری: ۳۶۱/۶ تا ۳۶۳، ۳۹۳ تا ۳۸۹

② العلل و معرفۃ الرجال للامام احمد بروایۃ ابنہ عبداللہ: ۱۶۸/۳

یہ طے کیا کہ کسی حاکم کے ذاتی فسق یا ظلم کے باعث اس کے خلاف خروج جائز نہیں۔ ہاں اگر وہ کھلم کھلا کفر کا ارتکاب کرنے لگے یا فرائض وواجبات اور شعائرِ دینیہ کو مٹانے کے درپے ہوں، تو پھر اس کے خلاف خروج اس شرط کے ساتھ واجب ہوگا کہ کامیابی کے امکانات روشن ہوں اور پہلے سے زیادہ فساد پھیلنے کا خطرہ نہ ہو۔

صرف معتزلہ اور خوارج کا مذہب یہ رہا ہے کہ وہ ہر صورت میں فاسق حاکم کے خلاف خروج کو ضروری کہتے ہیں۔ [1]

❁❁❁

عبدالملک کے دور کے کچھ اہم مباحث

عبدالملک کی وفات:

شوال ۸۶ھ میں عبدالملک مرض الموت میں مبتلا ہوا اور کچھ دن بستر پر رہ کر ۱۵ رشوال ۸۶ھ کو ۶۰ سال کی عمر میں دنیا سے چل بسا۔ دِمشق میں تدفین ہوئی۔ [2] اس کی خلافت کی مدت ۱۳ سال ۵ ماہ ہے۔ نو سال (۶۴ھ تا ۷۳ھ) اس نے ایک باغی حکمران کی حیثیت سے گزارے تھے۔ اس مدت کو خلافت میں شمار کرنا شرعی اصول کے خلاف ہے۔

اولاد:

اولاد میں سولہ لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ لڑکوں میں ولید، سلیمان، یزید، ہشام اور مَسلَمہ مشہور ہوئے۔ لڑکیوں میں فاطمہ اس کی بڑی چہیتی تھی۔ عبدالملک نے اسے یمن کے قدیم بادشاہ ماریہ کی دو بالیوں کے علاوہ ایک نادر و نایاب موتی دیا تھا جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں تھی۔ یہی لڑکی بعد میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نکاح میں آئی۔ [3]

بیٹوں کے لیے ولی عہدی کی بیعت:

مروان نے عبدالملک کے بعد اس کے بھائی عبدالعزیز کو ولی عہدِ ثانی بنایا تھا مگر عبدالملک اپنے بیٹوں کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا۔ تقدیر نے اس کا ساتھ دیا اور ۸۵ھ میں عبدالعزیز کی وفات ہوگئی۔ [4] چنانچہ عبدالملک نے اپنے بیٹے ولید اور اس کے بعد سلیمان کے لیے ولی عہدی کی بیعت لے لی۔ [5] اس طرح موروثیت مسلمانوں کی حکمرانی کا ایسا جزو لازم بن گئی جسے بار بار سخت نقصانات اٹھانے کے باوجود نظام سیاست سے آخر تک جدا نہ کیا جا سکا۔

سعید بن مسیب رحمہ اللہ پر تشدد کی روایت:

شاہ معین الدین ندوی مرحوم نے اپنی "تاریخ اسلام" میں لکھا ہے کہ سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے ولی عہدی کی بیعت سے انکار کیا تو ہشام بن عبدالملک حاکم مدینہ نے ان پر بڑی سختیاں کیں، کوڑوں سے پٹوایا اور تشہیر کرا کے قید کر دیا۔ [6]

---

① الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۸/۳۱۷، ۳۱۸

② تاریخ الطبری: ۶/۳۱۸، ۳۱۹

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/۳۹۳، ۳۹۶ ④ تاریخ الطبری: ۶/۴۱۲، ۴۱۳

⑤ تاریخ الطبری: ۶/۴۱۶، ۴۱۷ ⑥ تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی: ۱/۴۲۲

اس بارے میں یہ ملحوظ رہے کہ یہ ظلم کرنے والا حاکم ہشام بن عبد الملک نہیں، ہشام بن اسماعیل تھا۔ شاہ معین الدین ندوی مرحوم سے فروگزاشت ہوئی ہے۔ طبری اور تمام تواریخ میں ہشام بن اسماعیل ہی لکھا ہے۔ ہشام بن عبد الملک جو بعد میں خلیفہ بنا، بڑا منصف مزاج اور بردبار انسان تھا۔

دوسری بات یہ کہ یہ واقعہ اس حد تک ثابت ہے کہ کوڑے لگائے گئے تھے۔ تشہیر کرانے اور قید میں ڈالنے کی بات کسی معتبر روایت میں نہیں۔ چونکہ اس واقعے کو واقدی جیسے ضعیف راویوں نے زیادہ تفصیل سے نقل کیا ہے؛ اس لیے غالباً یہ اضافی باتیں جو مبالغے پر مبنی ہیں، ضعیف راویوں کی طرف سے شامل کی گئی ہیں۔ واللہ اعلم

تیسری بات یہ ہے کہ عبدالملک نے اس سزا کو ناپسند کرکے حاکم کو ملامت آمیز خط لکھا تھا اور کہا تھا:

''سعید بن مسیب صلہ رحمی کے حق دار ہیں نہ کہ مار پیٹ کے۔ ان سے مخالفت کا کوئی اندیشہ نہیں۔''①

عبدالملک کی زندگی پر ایک تبصرہ

عبدالملک کی زندگی ہمیں تین حصوں میں بٹی دکھائی دیتی ہے: پہلا دور تو جوانی سے ۳۸ سال کی عمر تک کا ہے جس میں وہ ایک عالم، عابد اور مجاہد دکھائی دیتا ہے۔ اکثر تلاوت، ذکر، نوافل اور احادیث سننے سنانے میں مشغول رہتا تھا۔

عبدالملک کی زندگی کا دوسرا دور ۶۴ھ سے ۷۳ھ تک ہے جس میں وہ شام کا غیر قانونی حاکم تھا اور کسی بھی قیمت پر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شرعی خلافت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ ۷۰ھ میں جب رومیوں نے مسلمانوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عالم اسلام کی سرحدوں پر تاخت و تاراج شروع کی تو عبدالملک نے ہر ہفتے ایک ہزار دینار ادا کرنے کی پیش کش کرکے ان سے صلح کرلی تاکہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ڈٹ کر مقابلہ کیا جاسکے۔ یہ طرزِ عمل دورِ صحابہ کی سیاست کے برعکس تھا؛ کیوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایسے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صلح کرکے ان کے شانہ بشانہ عالم اسلام کے دفاع کے لیے لڑنے کے عزم کا اظہار کیا تھا جس سے مرعوب ہوکر قیصر پسپا ہوگیا تھا۔

عبدالملک کی رومیوں سے صلح کے بارے میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ اسلام کی تاریخ میں پہلی کمزوری تھی جو پیدا ہوئی۔ جس کا سبب صرف باہمی اختلاف تھا۔''②

تیسرا دور عبدالملک کی خلافت قائم ہونے کے بعد کا ہے۔

حلیہ اور علم وفضل:

عبدالملک میانہ قامت اور خوبصورت تھا۔ جسم بھاری تھا نہ دبلا پتلا۔ آنکھیں بڑی تھیں اور ناک ستواں۔ سر اور ڈاڑھی کے بال جلدی سفید ہوگئے تھے۔③

---

① تاریخ الطبری: ۴۱۷/۶

② العبر فی خبر من غبر: ۵۸/۱

③ البدایۃ والنہایۃ: ۳۷۸/۱۲

تعمیری وترقیاتی کارنامے

عبدالملک کو مسلسل شورشوں اور آزمائشوں سے سابقہ پڑتا رہا؛ اس لیے اسے تعمیری وترقیاتی کاموں کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔ اس کے باوجود اس کے کچھ کارنامے ناقابلِ فراموش ہیں۔

اِسلامی سکے کا اِجراء:

عالم اسلام میں اب تک ہر قسم کے سکے رائج تھے۔ اپنی کوئی خاص کرنسی نہیں تھی۔ حجاز، عراق اور شام کے دراہم اور دینار الگ الگ معیار کے تھے۔ ان میں رومی، فارسی اور مصری سکے بھی کثرت سے استعمال ہوتے تھے۔ وزن کے لحاظ سے ان کی قیمت کا اندازہ کرلیا جاتا تھا۔ عبدالملک پہلا حکمران ہے جس نے مسلمانوں کے الگ سکے کی ضرورت محسوس کی اور ۶۷ھ میں نیا سکہ متعارف کرایا۔ اس کام کو عملی شکل خالد بن یزید نے دی جو اسلامی تاریخ کا پہلا کیمیادان اور دھاتوں کی ڈھلائی کا ماہر تھا۔ اس نے دِمَشق میں پہلی اسلامی ٹکسال لگا کر نئے سکے ڈھالے۔ ①

دفتری نظام عربی زبان میں:

اب تک حساب کتاب کے معاملات میں اکثر فارسی اور رومی لوگوں سے کام لیا جاتا تھا۔ عبدالملک کو عرصے سے فکر تھی کہ کسی طرح سارا دفتری نظام عربی میں منتقل کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے لیے اسے پڑھنا، سمجھنا اور انجام دینا آسان ہو۔ چنانچہ سلیمان بن سعد کو یہ کام سونپا گیا جس نے تمام حساب کتاب کو عربی میں منتقل کرادیا۔ ②

بیت المقدس کی خدمت:

عبدالملک نے ٦٦ھ میں بیت المقدس میں صخرۂ مقدسہ پر وہ عظیم الشان گنبد تعمیر کرایا جو آج تک ہر زائر سے خراجِ تحسین وصول کررہا ہے۔ اس مبارک کام کے لیے وہ خود بے پناہ دولت لے کر معماروں اور ماہرین تعمیر کے ساتھ بیت المقدس پہنچا اور رجاء بن حَیْوَہ رحمہ اللہ کو یہ کام سونپ کر ہدایت کی کہ تعمیر پر کھلی رقم خرچ کی جائے۔

گنبد صخرہ کو ایک عمارت کی طرح تعمیر کیا گیا۔ اس کے چار دروازے بنائے گئے۔ چھت پر ساج کی لکڑی کے ٦٠ ہزار ٹکڑوں سے نقاشی کی گئی۔ ایک ہزار شمعوں سے روشنی کا انتظام کیا گیا۔ مسجدِ اقصیٰ کے احاطے کے لیے بیس دروازے بنائے گئے۔ اندر روشنی کے لیے پانچ ہزار قندیلیں نصب کی گئیں اور پچاس گنبد تعمیر کیے گئے۔ ③

نئے شہر:

عبدالملک کے دور میں کئی نئے شہر بسائے گئے اور قدیم اجاڑ شہروں کو دوبارہ آباد کیا گیا۔ آذربائی جان کے قدیم

---

① عیون الاخبار: ۲۹٦/۱، ط العلمیة؛ الاوائل للعسکری، ص ۲۵۳، ط دار البشیر؛ تاریخ طبری: ۲۵٦/٦
② تاریخ ابن خلدون (مقدمہ): ۳۰۳/۱، ۳۰۴؛ تاریخ دمشق: ۳۲۰/۲۲
③ البدایۃ والنھایۃ: ۳۳۳۱/۱۲

شہر بیلقان، اردبیل اور برذعہ اسلامی دور تک ویران ہو چکے تھے۔ عبدالملک کے دور میں انہیں دوبارہ آباد کیا گیا۔ اسی علاقے میں ''النشوی'' نامی ایک نیا شہر تعمیر کیا گیا۔ ① عبدالملک کے امیر حجاج بن یوسف نے عراق کا مشہور شہر ''واسط'' تعمیر کیا۔ اس کی فصیل، سرکاری عمارتوں اور جامع مسجد پر بے پناہ رقم خرچ کی گئی۔ چوں کہ یہ شہر کوفہ اور بصرہ کے وسط میں تھا؛ اس لیے اس کا نام واسط پڑ گیا۔ ②

خلاصہ کلام:

اگرچہ عبدالملک کی حکومت کا قیام ناجائز طور پر کشت وخون کے ذریعے ہوا تھا مگر بہر حال وہ ایک زبردست سیاست دان اور قابل انسان تھا۔ اگر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے محاذ آرائی، سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے قتل اور حجاج کے مظالم کے دھبے اس کے دامن پر نہ ہوتے تو بلاشبہ وہ دور تابعین کا ایک قابل رشک حکمران قرار پاتا۔

❁❁❁

① فتوح البلدان، ص ۲۰۳

② معجم البلدان: ۳۴۸/۵

ولید بن عبدالملک

شوال ۸۶ھ......تا ربیع الاول ۹۶ھ
اکتوبر ۷۰۵ء......تا......دسمبر ۷۱۴ء

عبدالملک بن مروان کا جانشین اس کا بڑا بیٹا ولید تھا جس کی ولادت ۵۰ھ میں ہوئی تھی۔ عبدالملک کو اس سے بہت محبت تھی، لہٰذا اسے اپنے پاس شہر میں رکھا جس کے باعث وہ خالص عربی نہ سیکھ پایا۔ عبدالملک کہا کرتا تھا: ''ولید کو ہماری محبت نے نقصان پہنچایا کہ ہم نے اسے عربی سیکھنے کے لیے دیہات میں نہیں بھیجا۔''[1] عبدالملک نے بعد میں اسے ایک گھر میں بند کر کے عربی کے ماہرین کے ذریعے عربی سکھانے کی بڑی کوشش کی مگر وہ ویسا کا ویسا رہا۔[2]

یہی وجہ تھی کہ ولید گفتگو میں صرف ونحو کی بکثرت غلطیاں کرتا تھا۔ ایک بار کوئی اعرابی فریاد لے کر آیا۔ ولید نے اس سے پوچھا: ''مَا شَانَکَ؟'' (ولید پوچھنا چاہتا تھا کہ تیرا مسئلہ کیا ہے؟ عربی قاعدے کے لحاظ سے یہاں شانُک نونِ مضموم کے ساتھ ہونا چاہیے۔ نونِ مفتوح کے باعث مطلب یہ ہو گیا کہ تجھے کس شے نے عیب دار بنایا۔)

اعرابی یہ سن کر ناراض سا ہو گیا اور بولا: ''اعوذ باللہ من الشین'' (میں عیب سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔)

یہ دیکھ کر ولید کے بھائی سلیمان نے اسے کہا: ''امیر المؤمنین کا مطلب ہے: مَا شَانُکَ؟ (تیرا مسئلہ کیا ہے؟)

اعرابی بولا: ''خَتَنِي ظَلَمَنِيْ'' (مجھ پر میرے داماد نے ظلم کیا ہے)

یہ سن کر ولید نے پوچھا: ''مَنْ خَتَنَكَ؟''

(قاعدے کے لحاظ سے یہاں خَتَنُكَ مضموم ہونا چاہیے۔ نونِ مفتوح سے مطلب ہو گیا کہ تیرا ختنہ کس نے کیا ہے؟)

یہ سن کر اعرابی نے سر جھکا لیا اور بولا: ''امیر المؤمنین ایسی بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کسی حجام نے کیا ہوگا۔''

مصاحب نے اسے سمجھایا کہ امیر المؤمنین کی مراد ہے: ''مَنْ خَتَنُكِ؟'' (تمہارا داماد کون ہے؟)

تب اعرابی نے اشارہ کر کے اپنے داماد کی پہچان کرائی۔[3]

① المنتظم: ۶ ص ۲۶۹
② المختصر فی اخبار البشر: ۱ ص ۱۹۹
③ المختصر فی اخبار البشر: ۱ ص ۱۹۹؛ المنتظم: ۶ ص ۲۶۹؛ العبر فی خبر من غبر: ۸۵/۱؛ تاریخ ابن الوردی: ۱ ص ۱۷۱

تاہم ولید بنو مروان کے ان خلفاء میں شمار ہوا جن کا دور "عہدِ زریں" کہلاتا ہے۔ اسے ایسے باصلاحیت اور ماہر سپہ سالار میسر آئے جو ایک زمانے میں بہت کم جمع ہوتے ہیں۔ ان میں محمد بن قاسم، قُتَیبہ بن مسلم، موسیٰ بن نُصَیر اور طارق بن زیاد نمایاں ہیں۔ ولید کا چھوٹا بھائی مَسلَمہ بن عبدالملک بھی اپنے زمانے کا مایہ ناز جرنیل تھا۔

قُتَیبہ بن مسلم الباہلی کی فتوحات:

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وسطِ ایشیا کے بہت سے چھوٹے بڑے سردار باج گزار بن گئے تھے مگر موقع ملتے ہی یہ لوگ بغاوت کر دیتے تھے لہٰذا یہاں مسلمانوں کے قدم جم نہیں سکے تھے۔ آخر کار ۸۵ھ میں عراق کے حاکم حجاج بن یوسف نے قُتَیبہ بن مسلم الباہلی کو خراسان کا حاکم مقرر کر کے وسطِ ایشیا کی مکمل تسخیر کی مہم سونپ دی۔ ۸۶ھ میں قُتَیبہ نے یہ مہم شروع کی اور دریائے آمو پار کر کے فرغانہ اور کاشان فتح کر لیے۔ ۸۷ھ میں قُتَیبہ نے بخارا کے نواحی شہر "بیکنْد" کو زبردست جنگ کے بعد فتح کیا۔ ۸۸ھ میں قُتَیبہ نے ایک بار پھر وسطِ ایشیا پر یلغار کی اور مختلف قبائل کو مسخر کیا۔ ①

چین کا خاقان قُتَیبہ کی فوج کشی کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے بھانجے "کورن غابون" کو دو لاکھ کے ٹڈی دل لشکر کے ساتھ قتیبہ کے لشکر کی پشت پر حملے کے لیے بھیج دیا۔ تاہم قُتَیبہ نے اس حملے کو ناکام بنا کر چینی افواج کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ ②

قتیبہ نے ۸۹ھ میں بخارا پر ایک آزمائشی حملہ کیا اور محاذ سے حجاج بن یوسف کو شہر کا پورا نقشہ بنوا کر بھیجا۔ اگلے سال مکمل تیاری کر کے بخارا کو گھیر لیا۔ اُدھر خاقانِ چین ترکوں کا ٹڈی دَل لیے اپنے بیٹے سمیت اہلِ بخارا کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ یہاں نہایت خونریز جنگیں ہوئیں جن میں آخر کار ترکوں کو پسپائی ہوئی۔ خاقان خود زخمی ہو کر فرار ہو گیا۔ ③

ان دنوں خراسانی سردار نیزک نے کابل، بلخ، فاریاب، طالقان اور جوزجان کے سرداروں کو ملا کر علمِ بغاوت بلند کر دیا تھا۔ قتیبہ بن مسلم نے نیشاپور سے بھاری کمک منگوا کر پہلے طالقان کے باغیوں کو تہہ تیغ کیا اور ۹۱ھ میں فاریاب، جوزجان اور بلخ کو یکے بعد دیگرے کسی خونریزی کے بغیر دوبارہ فتح کر لیا۔ نیزک درّہ خُلم عبور کر کے بغلان میں مورچہ بند ہو گیا اور درّے کو بند کر دیا مگر قُتَیبہ نے ایک خفیہ راستہ تلاش کر کے بغلان پر حملہ کر دیا۔ نیزک فرار ہو کر وادئ فرغانہ پہنچ گیا، تاہم قتیبہ نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور آخر کار اسے "درّہ کرز" میں گھیر کر دو ماہ کے محاصرے کے بعد گرفتار کر لیا اور اس کا سر قلم کر کے دمشق بھیج دیا۔ ④

۹۳ھ میں ولید بن عبدالملک کے حکم سے قُتَیبہ بن مسلم نے خوارزم پر فوج کشی کی۔ خوارزم شاہ اپنے بھائی خرزاد کی زیادتیوں سے تنگ آیا ہوا تھا۔ اس نے قُتَیبہ سے خفیہ خط و کتابت کر کے اس شرط پر مسلمانوں کی حلقہ بگوشی منظور کر لی کہ

① الکامل فی التاریخ، سنۃ: ۸۶ھ تا ۸۸ھ ② الکامل فی التاریخ، سنۃ ۸۸ھ

③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۹۰ھ ④ الکامل فی التاریخ، سنۃ: ۹۰ھ، ۹۱ھ

مسلمان اسے خرزاد سے نجات دلائیں گے۔ ساتھ ہی خوارزم شاہ نے اپنے امرائے فوج کو سمجھایا کہ مسلمانوں سے لڑنا بے سود ہے۔ یوں سرزمین خوارزم بغیر کسی کشت وخون کے اسلامی پرچم کے سائے تلے آ گئی۔ قُتَیبَہ نے خوارزم کی فتح کے بعد وعدے کے مطابق خوارزم شاہ کے بھائی خرزاد کا تعاقب کر کے اس کا خاتمہ کر دیا۔ ①

خوارزم کی فتح کے بعد قُتَیبَہ نے وسطِ ایشیا کے سب سے مضبوط عسکری مرکز سمرقند پر چڑھائی کی اور محاصرہ کر کے منجنیقوں سے سنگ باری کرائی۔ آخر شہر کی فصیل کا ایک حصہ ٹوٹ گیا۔ یہ دیکھ کر اہل سمرقند نے صلح کی درخواست کی۔ قُتَیبَہ بن مسلم نے درج ذیل شرائط پر یہ درخواست منظور کر لی:

① مقامی فوج سمرقند سے نکل جائے گی اور مسلمان فاتحانہ طور پر شہر میں داخل ہوں گے۔
② یہاں مسجد تعمیر کی جائے گی اور نمازِ جمعہ ادا ہوگی۔
③ اہل سمرقند ہر سال بارہ لاکھ دینار خراج ادا کریں گے۔
④ اہل سمرقند اس سال تیس ہزار گھڑ سوار مسلمانوں کی مدد کے لیے دیں گے۔

اس علاقے میں بُت پرستی عام تھی۔ قُتَیبَہ نے اس بدعقیدگی کو مٹانے کے لیے بُتوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پجاریوں کو معلوم ہوا تو بولے: ''ان بتوں کو گزند پہنچانے کی کوشش کرنے والا ہلاک ہو جاتا ہے۔'' قُتَیبَہ نے کوئی پروا نہ کی اور بُتوں کو آگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بُت پرستوں کے باطل معبود کوئلہ بن گئے۔ ②

اگلے سال ۹۴ھ میں اس مردِ مجاہد نے چین کی سرحد کے قریب واقع شاش (تاشقند) اور فرغانہ کو بھی فتح کر لیا۔ ③

وسطِ ایشیا میں بار بار ہونے والی بغاوتوں کو شہ دینے میں چین کے خاقان کا بڑا ہاتھ تھا لہٰذا قُتَیبَہ بن مسلم نے ۹۶ھ میں چین کی طرف پیش قدمی کی اور قسم کھائی کہ جب تک اسلامی لشکر بزورِ قوت چینی حکومت سے خراج وصول نہ کر لے، واپسی نہیں ہوگی۔ خاقانِ چین مرعوب ہو گیا اور اس نے خراج ادا کرنا قبول کر لیا۔ ان فتوحات نے پورے عالم اسلام میں قُتَیبَہ کی معرکہ دانی کی دھوم مچا دی۔ ④

فتح اَندلُس:

اَندلُس (اسپین) ایک جزیرہ نما ہے۔ اس کے مشرق اور جنوب میں بحیرۂ روم ہے۔ شمال مغرب اور جنوب مغرب میں بحرِ اوقیانوس (بحرِ ظلمات یا اٹلانٹک سی) ہے۔ مغرب میں اس کی سرحد پرتگال سے اور شمال میں فرانس سے جا ملتی ہے۔ ⑤ زمانہ قبل از مسیح سے اَندلُس پر رومیوں کی حکومت چلی آ رہی تھی مگر ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام کے پانچ صدیوں بعد وسطی اور مشرقی یورپ سے غیر متمدن گاتھ قوم کے طوفانی حملوں نے اَندلُس کی رومی سلطنت کے پرخچے اڑا دیے اور

① الکامل فی التاریخ، سنۃ: ۹۳ھ ② الکامل فی التاریخ، سنۃ ۹۳ھ
③ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۹۴ھ ④ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۹۶ھ
⑤ صفۃ جزیرۃ الاندلس: ۳۲/۱، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد اوّل، مادہ: اندلس

۵۰۰ء میں یہ ملک گاتھ قوم کے ہاتھ آ گیا۔ اس دورِ حکومت میں پادریوں کی اجارہ داری قائم ہوگئی اور وہ غیر نصرانی اقلیتوں پر ظلم ڈھانے لگے۔ گاتھ قوم کے آخری بادشاہ وٹیزا نے جب ان مظالم کو روکنے کا ارادہ کیا تو پادریوں نے سازشیں کر کے اسے معزول کرادیا اور ایک سخت گیر فوجی جرنیل راڈرک (Roderic) کو تختِ شاہی پر لا بٹھایا، جسے عرب مؤرخین ''لُذْرِیق'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ① اس زمانے میں افریقہ کے حاکم موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ تھے جن کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مراکش کے شہر طنجہ میں اپنے آزاد کردہ غلام طارق بن زیاد کو نائب مقرر کردیا تھا۔ ② طنجہ کے قریب ایک مضبوط قلعہ ''سَبْتَہ'' تھا جہاں اسپین کے بادشاہ راڈرک کا نائب کاؤنٹ جولین حکومت کرتا تھا۔ اس کی بیٹی فلورنڈا اسپین کے دارالحکومت طُلَیْطَلَہ (تولیڈو) میں راڈرک کے محل میں تعلیم و تربیت حاصل کررہی تھی۔ راڈرک ایک بے حیا اور عیاش انسان تھا۔ اس نے فلورنڈا کی عصمت پامال کردی۔ مظلوم لڑکی نے باپ کو خفیہ مراسلہ بھیج کر یہ خبر دی۔ اس پر کاؤنٹ جولین غصے سے بے تاب ہوگیا اور اس نے تہیہ کرلیا کہ عرب کے جانبازوں کو اسپین کا راستہ دکھا کر وہ راڈرک سے بدلہ لے گا۔ پہلے اس نے کسی بہانے بیٹی کو راڈرک کے محل سے نکالا اور پھر موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ سے رابطہ کر کے انہیں اسپین پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے اجازت لی اور بتایا کہ یہ بڑا سمندر نہیں، محض خلیج ہے اور اَندلُس کا ساحل سامنے دکھائی دیتا ہے۔ آخر ولید نے اس شرط پر اجازت دے دی کہ پہلے چھاپہ مار حملہ کر کے دشمن کی طاقت دیکھ لی جائے۔ موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے اجازت ملتے ہی رمضان ۹۱ھ میں اسپین کے ساحل پر چھاپہ مار حملے کرائے اور حالات کے سازگار ہونے کا اندازہ کرلیا۔ اگلے برس موسیٰ بن نُصَیر نے طارق بن زیاد کو تین سو عرب اور ۶ ہزار سات سو بربر سپاہیوں کے ساتھ کشتیوں پر اسپین روانہ کیا جن کی رہنمائی کے لیے کاؤنٹ جولین بھی ساتھ تھا۔ منگل ۵ رجب ۹۲ھ (۷۱۱ء) کو اسلامی لشکر اَندلُس کے ساحل پر ایک پہاڑ کے سامنے لنگر انداز ہوا۔ یہ پہاڑ بعد میں جبل الطارق کے نام سے مشہور ہوا۔ آج کل اسے جبرالٹر کہا جاتا ہے۔ ③

طارق بن زیاد نے چند روز جبل الطارق پر قیام کرنے کے بعد پہلے پہاڑ کے سامنے واقع شہر قَرْطَاجَنّہ (کارتیہ) اور پھر جزیرۃ الخضراء پر کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر قبضہ کرلیا۔ ''ڈیوک تھیوڈومر'' جو جنوبی اسپین کے ساحلی علاقوں کا حاکم تھا، لشکر تیار کر کے طارق کو روکنے نکلا مگر منہ کی کھائی اور الٹے پاؤں وسطی اسپین کی طرف پسپا ہوگیا۔ ساتھ ہی اس نے تیز رفتار قاصد کے ذریعے راڈرک کو یہ پیغام بھیجا: ''ہماری سرزمین پر ایسے لوگوں نے حملہ کیا ہے کہ ہم نہیں جانتے وہ آسمان سے نازل ہوئے ہیں یا زمین سے نکل آئے ہیں۔'' ④

---

① نفح الطیب: ۱/۱۳۷ تا ۱۴۰؛ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۹۲ھ

② البیان المغرب فی اخبار الأندلس و المغرب: ۱/۳۳؛ الاعلام للزرکلی: ۳/۲۱۷؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۶/۳۳۹

③ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۹۲ھ؛ نفح الطیب: ۱/۲۳۱، ۲۵۱ تا ۲۵۵؛ فتوح البلدان، ص ۲۲۸

ملحوظہ: طارق بن زیاد کا کشتیاں جلانے کا واقعہ بڑا مشہور ہے مگر ثابت نہیں۔ راقم نے تاریخ امت مسلمہ حصہ سوئم کے حواشی میں اس پر مختصر بحث کی ہے۔

④ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۹۲ھ؛ نفح الطیب: ۱/۲۳۰

مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع سن کر راڈرک نے فوج کی عام بھرتی کا اعلان کیا اور مذہب اور وطن کے نام پر اپنے بہت سے مخالفین اور گاتھ خاندان کے شہزادوں کو بھی ساتھ ملا کر ایک لاکھ سپاہی جمع کر لیے۔ یہ اطلاع ملنے پر موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے طارق کے لیے ۵ ہزار سپاہیوں کی کمک بھیج دی۔ یوں مجاہدین اسلام کی تعداد بارہ ہزار ہوگئی۔ ①

آخر دونوں فوجیں بحر محیط کے ساحل سے تقریباً سات میل دور ٹریس کی وادی میں (جسے وادیٔ لَکّہ یا گوڈالیٹ کہا جاتا ہے) فروکش ہوئیں۔ (دوسری رائے کے مطابق یہ جنگ جھیل لاجنڈا کے ساحل پر وادیٔ بکہ میں ہوئی تھی۔)

۲۷ رمضان المبارک ۹۲ھ (۱۹ جولائی ۷۱۱ء) کی تاریخی صبح کو فریقین میں تصادم شروع ہوا۔ پورے آٹھ روز تک جنگ بڑی شدت سے جاری رہی۔ ۵ شوال کو دونوں فریق لڑتے لڑتے نڈھال ہوگئے۔ ایسے میں طارق بن زیاد نے حریف کے قلب کی صفوں کو چیر کر راڈرک پر حملے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر راڈرک بدحواس ہو کر بھاگ نکلا۔ جنگ کے خاتمے پر دریائے گوڈالیٹ کے کنارے دلدل میں اس کا سفید گھوڑا اور شاہی لباس پایا گیا جس سے اندازہ ہوا کہ وہ دلدل میں غرق ہو چکا ہے۔ راڈرک کے فرار ہوتے ہی دشمن نے میدان خالی کر دیا۔ اس جنگ میں تین ہزار مسلمان شہید ہوئے جبکہ نصرانی مقتولین اَن گنت تھے۔ ②

اس فتح کے بعد طارق بن زیاد نے موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ سے پوچھے بغیر کاؤنٹ جولین کے مشورے پر لشکر کو کئی حصوں میں بانٹ کر الگ الگ سمتوں میں بھیجا۔ چنانچہ اس کے نائب مغیث رومی نے قرطبہ کے علاوہ جنوبی اندلس کے شہر "غرناطہ، البیرہ اور مالقہ" بھی فتح کر لیے۔ اس دوران موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ کی طرف سے طارق کو پیغام بھیجا گیا کہ قُرطُبَہ سے آگے یلغار مت کرنا مگر کاؤنٹ جولین نے طارق کو سمجھایا کہ اس وقت اَندَلُس کے سارے شہر خالی پڑے ہیں اور انہیں فتح کرنا بہت آسان ہے؛ اس لیے آپ فوراً طُلَیطُلَہ کی طرف بڑھیں۔ آخر ربیع الآخر ۹۳ھ میں طارق نے پیش قدمی کر کے اَندَلُس کے پایۂ تخت طُلَیطُلَہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ ③ طارق کی فوج مختلف شہروں کی فتح میں مشغولیت کے باعث بکھر چکی تھی؛ اس لیے خطرہ تھا کہ کہیں ہسپانوی بغاوت نہ کر دیں؛ لہٰذا طارق نے امیر موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ سے کمک طلب کی۔ امیر موسیٰ رحمہ اللہ اٹھارہ ہزار سپاہیوں کو لے کر خود اَندَلُس روانہ ہوگئے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے طارق بن زیاد کی فتوحات سے جلن کے باعث اَندَلُس کا رُخ کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ طارق کی طرح انہیں بھی شہرت ملے۔ یہ بعض راویوں کا قیاس تو ہو سکتا ہے، کوئی پختہ بات نہیں؛ کیوں کہ موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ نے اس سے قبل افریقہ میں جو فتوحات حاصل کی تھیں، وہ تاریخ میں ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی تھیں، پھر اَندَلُس کی بھی مہم انہی کی زیرِ نگرانی تھی، طارق بن زیاد کی حیثیت تو نائب کی تھی۔

① نفح الطیب: ۱/۲۳۲؛ الکامل فی التاریخ: ۴/۴۰

② الکامل فی التاریخ، سنۃ ۹۲ھ؛ نفح الطیب: ۱/۲۴۰، ۲۴۲، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰

③ نفح الطیب: ۱/۲۶۵؛ الکامل فی التاریخ: ۴/۳۱؛ فتوح البلدان، ص ۲۲۸

بالفرض موسیٰ بن نُصَیر رحمۃ اللہ علیہ کو حسد ہوتا تو طارق کی برطرفی کا فرمان جاری کرنا یا اندلس پہنچ کر ساری مہم کو اپنے ہاتھ میں لے لینا کیا مشکل تھا؟ مگر وادیٔ لَکّہ کے معرکے کے بعد پورے ایک سال تک موسیٰ بن نُصَیر رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا کچھ نہ کیا۔ بلکہ وہ اَندَلُس اس وقت گئے جب وسیع مفتوحہ علاقوں کا نظم و نسق سنبھالنے، باقی علاقے فتح کرنے اور پھر شمالی اَندَلُس سے فرانس میں داخل ہونے کے لیے بڑی تعداد میں افواج اور عملے کی ضرورت تھی۔ علامہ مقری کے بقول موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا ہدف یہ تھا کہ وہ اَندَلُس کو عبور کر کے پورے یورپ کو فتح کرتے ہوئے قُسطَنطِینیّہ پہنچ جائیں۔

رمضان ۹۳ھ میں موسیٰ بن نُصَیر رحمۃ اللہ علیہ اَندَلُس کے ساحل ''الجزیرۃ الخضراء'' پر اترے۔ انہوں نے مشرق کی طرف سے اپنی یورش کا آغاز کیا اور راستے کے شہروں: شَذُونہ، قَرمُونہ اور باجہ کو یکے بعد دیگرے فتح کرتے چلے گئے۔

اِشبیلیہ کو سخت محاصرے اور خونریز جنگ کے بعد مسخر کیا گیا۔ اس کے بعد اَندَلُس کے قدیم پایۂ تخت ''ماردہ'' کا محاصرہ بھی بہت طویل ثابت ہوا۔ آخر رمضان ۹۴ھ میں یہ شہر ایک معاہدے کے تحت فتح کر لیا گیا۔

اُدھر طُلَیطُلَہ کی فتح کے بعد طارق نے مزید پیش قدمی کی اور اَندَلُس کے شمال مغربی کوہستانی علاقوں: وادی الحجارۃ اور جبل الشارات تک فتح کا پرچم لہرا کر واپس طُلَیطُلَہ آ گئے۔ ذوالقعدہ ۹۴ھ میں موسیٰ کی افواج مشرقی اَندَلُس کو فتح کرتے ہوئے طُلَیطُلَہ سے ڈیڑھ سو کلومیٹر مغرب میں طَلَبِیرَہ پہنچ گئیں۔ طارق بن زیاد نے طُلَیطُلَہ سے طَلَبِیرَہ آکر اپنے امیر کی خدمت میں حاضری دی۔ موسیٰ بن نُصَیر رحمۃ اللہ علیہ نے ممانعت کے باوجود پیش قدمی کرنے پر طارق کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔ طارق نے اُف تک نہ کی اور کہا: ''میں آپ کا غلام ہوں، یہ فتوحات آپ ہی کے نام ہیں۔''

الغرض تابع داری کا مظاہرہ کر کے طارق نے اپنی لغزش کی ایسی تلافی کی کہ موسیٰ بن نُصَیر رحمۃ اللہ علیہ مطمئن ہو گئے۔ ①

کچھ دنوں بعد موسیٰ بن نُصَیر رحمۃ اللہ علیہ نے طارق کو ان فتوحات پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا: ''امیر المؤمنین ولید نے انعام کے طور پر تمہیں اَندَلُس میں اپنا نائب منتخب کر لیا ہے۔ اب تم یہاں کی نعمتوں سے خوب لطف اندوز ہوتے رہو۔''

مگر طارق نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہیں رکوں گا جب تک بحرِ ظلمات (بحر اوقیانوس) پہنچ کر اپنا گھوڑا اس میں نہ ڈال دوں۔'' اگلے چند ماہ میں موسیٰ بن نُصَیر رحمۃ اللہ علیہ اور طارق بن زیاد نے اپنی افواج شمالی اَندَلُس میں پھیلا دیں، موسیٰ نے صوبۂ سرقُسطہ اور طارق نے صوبۂ جلیقیہ فتح کر لیے۔ ایک سال کے اندر اندر مسلمان کوہِ البرت سے گزر کر فرانس کی سرحدوں میں داخل ہو گئے اور جنوبی فرانس کا شہر قَرقَشونہ فتح کر لیا۔ ②

---

① بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ موسیٰ نے طارق کو حکم عدولی پر کوڑے مارے اور سرعام بے عزتی کی، بعض نے لکھا ہے کہ سر منڈوا دیا اور کچھ دنوں تک قید میں رکھا۔ مگر یہ باتیں کسی معتبر حوالے سے ثابت نہیں ہو سکیں۔ اسی طرح مشہور ہے کہ طارق بن زیاد کو ایک شہر سے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہیرے جواہرات سے مرصع میز ملا تھا، طارق نے موسیٰ کو پیش کرنے سے پہلے اس کا ایک پایہ توڑ کر چھپا لیا۔ (الکامل فی التاریخ: ۴/ ۳۲) یہ ایک بے سند روایت ہے۔ دکتور عبدالرحمن علی نے ''التاریخ الاندلسی'' میں اس پر اچھی بحث کی ہے۔

② نفح الطیب: ۱/ ۲۴۴، ۲۶۹ تا ۲۸۹؛ تاریخ اندلس، مولانا ریاست علی ندوی، ص ۹۲، ۹۳ مع حواشی؛ التاریخ الأندلسی من الفتح الاسلامی الی سقوط غرناطۃ لدکتور عبدالرحمن علی، ص ۸۳، ۸۵، ۸۵ تا ۹۵؛ الکامل فی التاریخ: ۴/ ۳۱؛ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۲/ ۱۶؛ سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۵۰۰؛ فتوح البلدان، ص ۲۲۸

برصغیر میں مسلمانوں کی فتوحات

برصغیر ایک بہت بڑی دنیا تھی جس میں اندھادھند گھس جانا نقصان کا باعث ہوسکتا تھا؛ اس لیے یہاں مسلمانوں کی پیش قدمی بہت محتاط رہی۔ برصغیر میں سندھ کی مملکت شمالاً جنوباً بحیرۂ عرب سے ملتان تک اور شرقاً غرباً راجپوتانہ سے مکران تک پھیلی ہوئی تھی۔ بالائی سندھ کا مرکز ''اروڑ'' اور زیریں سندھ کا ''برہمن آباد'' تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں سندھ کے سپاہی ایران اور بلوچستان میں مسلمانوں سے برسرپیکار قوتوں کے اتحادی رہے؛ لہٰذا خلفائے اسلام سندھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے تاہم دورِ خلافتِ راشدہ میں سپاہِ اسلام کی بڑی تعداد خراسان، افریقہ اور سلطنتِ روما کی سرحدوں پر مصروف تھی اس لیے برصغیر پر یلغار کی حیثیت چھاپہ مار کارروائیوں کی سی رہی۔ مسلمانوں نے یہاں فتوحات حاصل کیں مگر کسی صوبے پر باقاعدہ قبضہ کرکے وہاں کے لوگوں پر جزیہ یا خراج مقرر نہیں کیا۔

ولید بن عبدالملک کے دور میں ایک ایسا سانحہ پیش آیا کہ مسلمانوں کو برصغیر میں مستقل حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس دور میں یہ علاقہ راجہ داہر کے زیرِ نگین تھا۔ اس کا باپ راجہ چچ مشہور جنگجو تھا جس نے کئی ریاستیں فتح کر کے ایک بہت بڑی سلطنت قائم کردی تھی۔ یہ لوگ برہمن تھے جب کہ ان کی رعایا میں بڑی تعداد بدھ مت کے پیروکاروں کی تھی۔ داہر ان پر ظلم وستم کرتا تھا جس کے باعث رعایا اس سے بہت نالاں تھی۔ ①

عرب تاجر برصغیر کے تجارتی مرکز سراندیپ (سری لنکا) میں بکثرت آتے جاتے تھے اور ان کے بعض خاندان مستقل طور پر یہاں آباد ہوگئے تھے۔ ولید بن عبدالملک کے دور میں ان میں سے کچھ تاجر وفات پاگئے تو ان کے اہلِ خانہ نے جن میں بڑی تعداد خواتین کی تھی، اپنے آبائی وطن واپس جانا چاہا۔ سری لنکا کے نیک دل راجہ نے کئی کشتیوں میں ان کے سفر کا انتظام کردیا اور خلیفہ ولید کے لیے بیش قیمت تحائف بھی ساتھ کردیے۔ سفر کے دوران جب یہ کشتیاں سندھ کے قریب سے گزریں تو مقامی قزاقوں نے انہیں لوٹ لیا اور خواتین کو گرفتار کرلیا۔ تاہم چند خوش قسمت مسلمان جان بچا کر فرار ہوگئے اور حجاج بن یوسف کو یہ ماجرا سنایا۔ اس نے فوراً راجہ داہر کو مراسلہ بھیجا کہ ان قیدیوں کو آزاد کردیا جائے اور لوٹا ہوا مال واسباب واپس دیا جائے مگر داہر نے اس مراسلے کی کوئی پروا نہ کی اور بات کو ٹالتے ہوئے جھوٹ موٹ کہہ دیا: ''یہ کام سمندری ڈاکوؤں کا ہے۔ ان پر ہمارا بس نہیں چلتا۔'' ②

آخر حجاج نے دربارِ خلافت سے سندھ پر حملے کی اجازت طلب کی اور منظوری ملتے ہی پہلے بلوچستان کے حاکم عبیداللہ بن نبہان اور پھر اپنے دوسرے جرنیل بدیل بن طہفہ کو یکے بعد دیگرے سندھ بھیجا مگر یہ دونوں وہاں جنگوں

① فتح نامۂ سندھ (المعروف بہ چچ نامہ) از علی بن حامد بن ابی بکر الکوفی، ص ۵۰ تا ۵۵؛ تاریخ سندھ از عبدالحلیم شرر، ص ۴۳؛ تاریخ سندھ از میر معصوم شاہ بھکری، ص ۱۸

② چچ نامہ، ص ۸۹، ۹۰

میں شہید ہو گئے اور مسلمانوں کو پسپائی ہوئی۔ آخر حجاج نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے برصغیر میں ایک بڑی مہم شروع کرنے کی اجازت لے کر دارالخلافہ سے چھ ہزار شامی سپاہیوں کی کمک منگوائی اور اس مہم کی قیادت کے لیے بصرہ کے سابق حاکم قاسم بن محمد کے نوجوان بیٹے محمد بن القاسم کا انتخاب کیا۔ حجاج بن یوسف نے لشکر کو تمام آلات اور ضروری سامان کے ساتھ تیار کیا۔ اس میں ''عروس'' نامی منجنیق بھی تھی جسے پانچ سو آدمی مل کر چلاتے تھے۔

محمد بن قاسم نے ۹۱ھ میں کوچ کیا اور حجاج کی ہدایت کے مطابق شیراز پہنچ کر انتظار کیا۔ جب دِمشق سے بھیجا جانے والا عسکری ساز و سامان آ گیا تو اسے کشتیوں کے ذریعے دَیبل کی طرف روانہ کیا اور خود خشکی کے راستے مکران کا رخ کیا جو اس زمانے میں برصغیر کے ساتھ عالم اسلام کی آخری سرحد تھی۔ مکران میں چند دن کی تیاری کے بعد لشکرِ اسلام ''پنج گور'' اور ''بیلہ'' (لس بیلہ) کو مسخر کر کے محرم ۹۲ھ (نومبر ۷۱۱ء) کے آغاز میں جمعہ کے دن دَیبل پہنچ گیا۔ سفری انتظامات اتنے مربوط تھے کہ اسی دن سمندر کے راستے بحری فوج بھی ساز و سامان اور قلعہ شکن آلات کے ساتھ پہنچی۔ دَیبل کی تجارتی اور عسکری اہمیت بہت زیادہ تھی اس لیے مسلمان طویل محاصرے کی تیاری کرنے لگے۔ خیمہ گاہ تیار ہوتے ہی محمد بن قاسم نے منجنیقوں کو نصب کرایا اور شہر پر سنگ باری شروع کر دی۔ شہر والے محصور ہو کر مزاحمت کرتے رہے۔ اس شہر کے درمیان مندر کا فلک بوس گنبد میلوں دور سے دکھائی دیتا تھا جس پر ایک سرخ رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ شہر والوں کا عقیدہ تھا کہ جب تک یہ جھنڈا نہیں گرتا انہیں شکست نہیں ہو سکتی۔ محمد بن قاسم کو یہ اطلاع ملی تو منجنیق اندازوں کو مندر کا جھنڈا گرانے کا حکم دیا۔ آخر عروس کا پتھر مندر کے گنبد کو جا کر لگا۔ گنبد کے ٹوٹتے اور جھنڈے کے گرتے ہی دَیبل کے بت پرستوں کو شکست کا یقین ہو گیا۔ اُدھر محمد بن قاسم کا اشارہ پاتے ہی مسلمانوں نے بھی فیصلہ کن حملہ کر دیا اور زبردست کشت و خون کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔ دَیبل کے مفرور سپاہی راجہ داہر کے پاس چلے گئے اور اسے شکست کا حال سنایا۔ محمد بن قاسم نے شہر پر قبضہ کرنے کے بعد مقامی لوگوں سے بہت اچھا سلوک کیا۔ چار ہزار مسلمانوں کو یہاں آباد کر کے برصغیر میں پہلی مسلم آبادی کی داغ بیل ڈالی اور اس خطے کی پہلی مسجد تعمیر کرائی۔

دَیبل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کے مغربی علاقوں پر قبضہ مستحکم کرنا ضروری سمجھا تاکہ دریا عبور کرتے وقت پشت سے کسی حملے کا خدشہ نہ ہو۔ چنانچہ لشکرِ اسلام نے کچھ ہی مدت میں نیرون کوٹ (حیدر آباد) سے سیوستان (سیہون شریف) تک تمام علاقہ فتح کر لیا۔

اس دوران حجاج کا پیغام پہنچا کہ مسلمان فوراً واپس پلٹیں اور دریائے سندھ کو ڈیلٹائی علاقے سے عبور کریں۔ محمد بن قاسم نے حکم کی تعمیل کی اور واپس آ کر پورے انتظامات کے ساتھ ''بھٹ'' کے مقام سے دریا کے مرکزی دھارے کو عبور کر لیا۔ یہاں سے لشکرِ اسلام ''راوڑ'' کی طرف روانہ ہوا جہاں راجہ داہر اپنی ٹڈی دل افواج کے ساتھ فیصلہ کن مقابلے کے لیے موجود تھا۔ پہلی صف میں خوفناک ہاتھیوں کا غول تھا۔ داہر خود لشکر کے پیچھے ایک سفید ہاتھی پر سوار تھا۔ اس کے گرد باندیوں کا جھرمٹ تھا جو اسے مورچھل سے پنکھا جھل رہی تھیں۔ رمضان ۹۳ھ میں یہاں جھڑپیں شروع ہوئیں اور آخر

۱۰ رمضان (۲ جولائی ۷۱۲ء) کو فیصلہ کن معرکہ ہوا جس میں فریقین نے اپنی جان لڑادی۔ ہاتھیوں کا غول مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہورہا تھا۔ راجہ داہر خود ہاتھی پر سوار فوج کو لڑا رہا تھا۔ اس کے پاس ایک تیز دھار چکر تھا جسے گھما کر وہ قریب آنے والے ہر دشمن کا سر الگ کر دیتا تھا تاہم مسلمان پیش قدمی کرتے ہوئے اس کی خیمہ گاہ تک پہنچ گئے۔ اب محمد بن قاسم کے حکم سے داہر کے ہاتھی پر آتشیں تیر پھینکے گئے جن سے گھبرا کر راجہ داہر کا ہاتھی الٹے پاؤں بھاگا اور اپنی خیمہ گاہ کے پیچھے واقع جھیل میں گھس کر بیٹھ گیا۔ فیل بان نے بڑی مشکل سے اسے اٹھایا مگر ہاتھی نے میدان جنگ کا رخ نہ کیا اور قلعہ رَاوڑ کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ راجہ داہر ہاتھی سے اتر گیا اور پا پیادہ لڑتا رہا۔ اس دوران کسی مجاہد نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ راجہ کے مرنے کے بعد اس کی فوج بھی تتر بتر ہوگئی۔

راجہ داہر کی باقی ماندہ فوج رَاوڑ کے قلعے میں تھی جہاں شاہی خاندان کی رانی مائین جنگ کی تیاری کر رہی تھی۔ محمد بن قاسم نے بلا تاخیر یلغار کر کے رَاوڑ کا محاصرہ کرلیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد قلعے کو فتح کرلیا۔ مسلمانوں کو قلعے میں داخل ہوتا دیکھ کر رانی نے اپنی کنیزوں سمیت خود کو آگ کے الاؤ میں ڈال کر خود کشی کرلی۔

ان فتوحات کے باوجود محمد بن قاسم کو فکر لاحق تھی کہ گرفتار شدہ عرب خواتین اب تک بازیاب نہیں ہوسکی تھیں۔ ادھر راجہ داہر کا وزیر ''سی ساکر'' کسی طرح محمد بن قاسم کی خوشنودی چاہتا تھا۔ وہ ان عرب خواتین کو لے کر مسلمانوں کے پاس آگیا۔ یہ دیکھ کر محمد بن قاسم نے سی ساکر کو بڑی عزت دی اور اسے سندھ کا وزیر بنا دیا۔

راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ اب بھی اپنی حکومت کو قائم رکھنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ اس نے برہمن آباد کو مرکز بنا کر نئی افواج مرتب کرلی تھیں۔ چنانچہ محمد بن قاسم نے برہمن آباد کا رخ کیا۔ جے سنگھ خائف ہو کر شہر سے فرار ہوگیا اور محمد بن قاسم کی فوج نے برہمن آباد کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک طویل جنگ کے بعد شہریوں نے محمد بن قاسم کے ساتھ صلح کا فیصلہ کرلیا اور ان کے تعاون سے یہ شہر بھی زیرِ نگین ہوگیا۔ راجہ داہر کی ایک بیوی رانی لاڈی یہاں مقیم تھی۔ اس نے اسلام قبول کرلیا اور محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کی اجازت سے اس سے نکاح کرلیا۔

راجہ داہر کا چھوٹا لڑکا گوپی اب بھی پرچار کر رہا تھا کہ راجہ داہر زندہ ہے اور تازہ افواج تیار کرنے کے لیے ہندوستان گیا ہوا ہے۔ اس طرح اس نے پایۂ تخت اُروڑ میں ہزاروں سپاہی جمع کر لیے تھے۔ (یاد رہے کہ ''رَاوڑ'' اور ''اُروڑ'' دو الگ الگ شہر تھے۔) محمد بن قاسم نے یہ خبریں سن کر اُروڑ کا رُخ کیا۔ یہاں رانی لاڈی نے فصیل کے سامنے جا کر اہل شہر کو یقین دلایا کہ داہر مر چکا ہے۔ اہل شہر شروع میں نہ مانے اور گوپی کی قیادت میں برابر لڑتے رہے۔ مگر کچھ دنوں بعد گوپی فرار ہوگیا اور اہل شہر نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ بدھ کے صنم کدے کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ محمد بن قاسم نے اہل علم سے مشورہ کر کے صنم کدے کو کلیسا اور آتش کدے کے حکم میں شمار کیا اور اسے باقی رہنے دیا۔

کچھ عرصے بعد محمد بن قاسم نے شمال کی طرف پیش قدمی کی اور مختلف قلعوں کو فتح کرتے ہوئے ملتان پہنچ کر دم لیا جو اس زمانے میں بدھ مت کے پیروکاروں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں کے راجہ گور سنگھ کی طاقت کا دور دور تک شہرہ تھا۔

محمد بن قاسم کے ملتان پہنچتے ہی زوردار معرکے شروع ہو گئے۔ یہ مہم بہت مشکل ثابت ہوئی۔ محاصرہ طویل ہوا تو مسلمان سواری کے جانور ذبح کر کے کھانے پر مجبور ہو گئے۔ قریب تھا کہ فوج بے حال ہو کر واپسی پر مجبور ہو جاتی کہ ایک مقامی شخص نے مسلمانوں کو فصیل کے کمزور حصوں کا پتا بتا دیا۔ محمد بن قاسم نے فوراً منجنیقوں سے ان حصوں پر سنگ باری شروع کرا دی۔ آخر فصیل ٹوٹ گئی اور مسلمان حملہ کر کے شہر پر قابض ہو گئے۔

حجاج بن یوسف نے اس مہم پر چھ کروڑ درہم خرچ کیے تھے۔ جب مال غنیمت کے ساتھ راجہ داہر کا سر اس کے سامنے رکھا گیا تو اس نے مال غنیمت کو شمار کرایا، وہ بارہ کروڑ درہم کے برابر نکلا۔ حجاج نے بے ساختہ کہا:

''ہم نے اپنا انتقام بھی لے لیا اور داہر کا سر بھی۔ اور جتنا خرچ کیا اللہ نے اس سے دوگنا عطا فرما دیا۔''

محمد بن قاسم کی مہمات ولید بن عبد الملک کی وفات تک جاری رہیں اور اسلامی افواج وسطی ہندوستان میں یلغار کرتے ہوئے قنوج تک پہنچ گئیں۔ اس دوران ولید بن عبد الملک کی وفات ہوگئی اور نئے خلیفہ سلیمان بن عبد الملک نے محمد بن قاسم کو معزول کر دیا۔ محمد بن قاسم کے حسنِ سلوک اور کرم نوازی نے مقامی لوگوں کے دل جیت لیے تھے؛ اس لیے یہاں بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ جو لوگ بت پرستی پر قائم تھے وہ بھی محمد بن قاسم سے محبت کرتے تھے لہٰذا اس کی واپسی پر وہ بہت غم گین ہوئے۔ بعض بت خانوں میں پجاریوں نے محمد بن قاسم کے مجسمے بنا کر رکھ لیے۔ ①

حجاج بن یوسف کی وفات:

ولید بن عبد الملک کے دور میں ۲۷ رمضان ۹۵ ہجری کو عراق کے حاکم حجاج بن یوسف کا ۵۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ بنو مروان کی حکومت کو مستحکم کرنے میں اس کا بہت بڑا کردار تھا۔ سندھ اور وسطِ ایشیا کی فتوحات بھی اسی کے عزم اور منصوبہ بندی کا نتیجہ تھیں۔ قرآن مجید سے بے حد شغف رکھتا تھا اور پابندی سے تلاوت کیا کرتا تھا۔

پورے عراق کا حاکم ہونے کے باوجود اس کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ اس کا تمام اثاثہ قرآن مجید کا ایک نسخہ، ایک تلوار، ایک گھوڑے اور ایک سو (۱۰۰) زرہوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان زرہوں کے بارے میں وہ وصیت کر چکا تھا کہ ایک تہائی ملک کی اندرونی شورشوں کی سرکوبی کے لیے اور دو تہائی بیرون ملک جہاد میں استعمال کی جائیں۔ ②

سعید بن جُبَیر رحمہ اللہ کی شہادت:

وفات سے کچھ مدت پہلے حجاج نے مشہور تابعی سعید بن جُبَیر رحمہ اللہ کو قتل کرایا تھا۔ سعید بن جُبَیر حجاج کے خلاف عبد الرحمٰن بن اشعث کے خروج میں شریک رہے تھے، شکست کے بعد وہ بارہ سال تک روپوش رہے۔ آخر مکہ کے حاکم خالد بن عبد اللہ قسری نے انہیں گرفتار کر لیا اور عبد الملک کے حکم کے مطابق حجاج کے پاس بھیج دیا۔ حجاج نے ان

① چچ نامہ، علی بن حامد الکوفی، ص ۹۳ تا ۲۳۱؛ فتوح البلدان، ص ۱۳۱ تا ۲۲۰، ۱۴۳ تا ۲۲۳؛ الکامل فی التاریخ: ۱۸/۳ تا ۲۰، ۲۳؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۲۸۸، تاریخ الاسلام للذہبی، سنۃ: ۸۳ھ؛ تاریخ سندھ از میر معصوم شاہ بھکری، ص ۲۳ تا ۲۹؛ تاریخ ابن خلدون: ۷۶/۳

② البدایۃ والنہایۃ: ۵۱۱/۱۲، ۵۳۹، ۵۵۲

سے سختی سے باز پرس کی اور پوچھا: ''کیا تم نے بغاوت کر کے کفر کا ارتکاب نہیں کیا؟'' سعید بولے: ''نہیں، جب سے ایمان لایا ہوں، کبھی کفر نہیں کیا۔'' حجاج نے غصے سے کہا: ''دیکھنا اب میں تمہیں کس طرح زندگی کے بدلے جہنم رسید کرتا ہوں۔'' سعید بن جُبَیر رحمہ اللہ بولے: ''اگر میں جانتا کہ موت تمہارے اختیار میں ہے تو تمہی کو معبود بنالیتا۔''

حجاج تلملا کر بولا: ''بتاؤ میں تمہیں کس طرح قتل کروں؟''

سعید رحمہ اللہ نے اطمینان سے کہا: ''جس طرح اپنے لیے پسند کرو۔'' حجاج نے کہا: ''تیرے لیے ہلاکت ہو۔''

سعید رحمہ اللہ بولے: ''ہلاکت اس کے لیے ہے جو جنت سے محروم کر کے جہنم میں داخل کر دیا جائے۔''

آخر کار حجاج نے جلاد کو حکم دیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ سزائے موت کے لیے باہر لائے گئے تو ہنس پڑے۔ حجاج کو پتا چلا تو پھر بلایا اور پوچھا: ''تم کس بات پر ہنسے؟''

سعید رحمہ اللہ بولے: ''تمہاری اللہ کے بارے میں جرأت دیکھ کر اور اللہ تعالیٰ کے حلم پر۔''

قتل سے پہلے انہوں نے دعا کی: ''یا اللہ! میرے بعد اسے کسی پر ظلم کی مہلت نہ دینا۔''

آخر کار ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ راجعون۔ یہ دردناک واقعہ ۹۵ ہجری کا ہے۔

سعید بن جُبَیر رحمہ اللہ کی عمر ۵۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ اپنے دور میں صف اول کے عابد و زاہد اور فقیہ و محدث تھے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے تھے: ''اس زمانے میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو علوم میں ان کا محتاج نہ ہو۔''

سعید بن جُبَیر رحمہ اللہ کے قتل کی اطلاع سے عالم اسلام کے علمی و روحانی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کو معلوم ہوا تو دعا کی: ''اے اللہ! اے ظالموں کی کمر توڑنے والے! حجاج کی کمر توڑ دے۔''

حجاج بن یوسف اس واقعے کے چند دن بعد شدید بیمار پڑ گیا۔ طبیبوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ شکم میں کیڑے پڑ چکے ہیں۔ مرض کا اثر دماغ پر بھی ہوا اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ جب بھی آنکھ لگتی تو دیکھتا کہ سعید بن جبیر رحمہ اللہ اس کا گریبان پکڑ کر پوچھ رہے ہیں: ''اللہ کے دشمن! مجھے کیوں قتل کیا؟'' حجاج ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور کہتا: ''میرا سعید سے کیا لینا دینا، مجھے ان سے کیا سروکار۔'' اسی حال میں کچھ دنوں بعد اس کی موت واقع ہوگئی۔ ①

حجاج بن یوسف کے کردار کا محاکمہ:

حجاج ایک ماہر جنگجو مگر جابر اور متلوّن مزاج شخص تھا۔ بنو مروان کی انتہائی وفاداری اور سخت گیری و خود رائی اس کے سب سے نمایاں اوصاف تھے۔ اس کے نزدیک حکومت کی اطاعت نمازوں کی طرح فرض عین تھی اور وہ اس سے سرتابی کرنے والے کو فرض کا منکر شمار کرتا اور اسے کافر و واجب القتل سمجھتا تھا۔ وہ بغاوت کو کفر کہتا اور باغی قیدیوں سے مطالبہ کرتا کہ اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کرو۔ جو اس سے ہچکچاتا قتل کر دیا جاتا۔ ② امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں ثقہ

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/۳۶۵ تا ۳۷۰؛ المحن، ص ۲۳۳ تا ۲۳۶؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۳۰۷

② تہذیب التہذیب: ۲/۲۱۰، ط دکن

محدثین کے سلسلۂ سند سے نقل کیا ہے کہ حجاج بن یوسف نے ایک لاکھ بیس ہزار افراد کو گرفتاری کے بعد قتل کرایا تھا۔ ①

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حجاج ایک ظالم انسان تھا۔ ''صحیح البخاری'' میں ہے کہ لوگوں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حجاج کے سلوک کی شکایت کی تو انہوں نے صبر کی تلقین کی اور فرمایا: ''میں نے تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تم پر کوئی زمانہ ایسا نہ آئے گا کہ اگلا زمانہ اُس سے زیادہ برا نہ ہو، یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو۔'' ②

صحابہ اور صحابیات بھی اس کے شر سے محفوظ نہ تھے۔ جیسا کہ اس کا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کرانا، اس کارنامے پر فخر کرنا، ان کی لاش کو الٹا لٹکانا اور سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا کے ساتھ شدید گستاخی کرنا صحیح روایات میں ہے۔ ③

حجاج حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ذکر بڑی نفرت سے یوں کیا کرتا تھا:

''افسوس ہے ہذیل کے غلام پر! وہ سمجھتا تھا کہ وہ اللہ کا قرآن پڑھتا رہا۔ نہیں وہ تو عرب بدوؤں کے رجز یہ اشعار پڑھتا رہا۔ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ نازل نہیں کیا تھا۔'' ④

حجاج یہ بھی کہتا تھا: ''اگر میں عبداللہ بن مسعود کو پالیتا تو انہیں قتل کر کے چھوڑتا۔'' ⑤ یہ غصہ اس لیے تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت بعض جگہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قرأت سے مختلف تھی۔

ایک بار اس نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کو جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سے ربذہ میں رہائش پذیر تھے، یوں ڈانٹا: ''اکوع کے بیٹے! تو الٹے پاؤں دین سے ہٹ گیا، دیہاتی بن گیا۔'' وہ شائستگی سے بولے:

''نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیہات میں رہنے کی اجازت دی تھی۔'' ⑥

حجاج مجتہد بن کر احادیث سے خود ہی مسائل کا استخراج کرتا تھا۔ ایک بار اس نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کچھ لوگ اسلام ظاہر کر کے مدینہ آئے اور بیماری کی شکایت کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں صدقے کے اونٹوں کا دودھ پینے چراگاہ میں بھیج دیا۔ وہاں وہ مرتد ہو گئے اور چراگاہ کے نگران کو قتل کر کے بھاگ نکلے مگر صحابہ نے انہیں گرفتار کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھیں پھوڑ کر ہاتھ پاؤں کٹوا کر انہیں قتل کیا۔ یہ سن کر حجاج مسلمانوں پر ایسی سزائیں جاری کرنے پر فخر کرنے لگا اور کہنے لگا: ''ہمیں انس نے بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی نافرمانی پر ہاتھ پاؤں کٹواتے اور آنکھیں پھوڑتے تھے۔ تو کیا ہم اللہ کی نافرمانی پر ایسی سزائیں نہ دیں؟'' ⑦

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو حجاج کی یہ جاہلانہ باتیں معلوم ہوئیں تو انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے معلوم کیا کہ انہوں نے حجاج کو کون سی حدیث سنائی تھی۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے حدیث دہرائی تو حضرت عمر بن

---

① سنن الترمذی، ح: ۲۲۲۰، باب ماجاء فی ثقیف کذاب و مبیر ② صحیح البخاری، ح: ۷۰۶۸، کتاب الفتن

③ صحیح مسلم، ح: ۶۶۶۰؛ مسند احمد، ح: ۲۶۹۷۳ ④ سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۴۳، اسنادہ صحیح

⑤ الاشراف فی منازل الاشراف، ص ۱۳۵، اسنادہ متصل صحیح

⑥ صحیح البخاری، ح: ۷۰۸۷؛ صحیح مسلم، ح: ۴۹۳۲، کتاب الامارۃ، باب تحریم رجوع المهاجر الی استیطان وطنه

⑦ مستخرج ابی عوانة: ۸۳/۴، ط دار المعرفة بیروت

عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا: ''کاش! آپ حجاج کو یہ حدیث نہ سناتے۔ وہ لوگ (جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سخت سزا جاری کی تھی) مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے تھے اور مدینہ کی چراگاہ پر لوٹ مار کے مرتکب ہوئے تھے۔ مگر حجاج نے اس حدیث کی بنیاد پر ان لوگوں کا خون حلال سمجھ لیا جو اسلام سے خارج نہ ہوئے اور مشرکین میں شامل نہ تھے۔''①

حضرت انس رضی اللہ عنہ خود فرماتے تھے: ''میں کسی بات پر اتنا نادم نہیں ہوا جتنا حجاج کو یہ حدیث سنا کر نادم ہوں۔''②

حجاج بسا اوقات عوامی اجتماعات کے مواقع پر نمازوں کو تاخیر سے پڑھاتا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''میں نماز کے سوا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی کوئی شے باقی نہ دیکھتا تھا مگر اب نماز بھی ضائع ہونے لگی۔''③

ایک بار حجاج کے نماز میں تاخیر کرنے سے تنگ آ کر انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے اسے تنبیہ کا ارادہ کیا مگر ساتھیوں نے ان کی جان کے خوف سے انہیں منع کر دیا۔ آخر وہ سواری پر بیٹھ کر یہ کہتے ہوئے گھر واپس چل دیے:

''اب تو کلمۂ شہادت کے سوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔''④

حجاج کو اللہ کی بے پایاں رحمت، مغفرت اور تھوڑے عمل پر زیادہ ثواب کی حدیثوں پر شک ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کے خیال میں شب قدر کی احادیث مشکوک تھیں۔⑤

وہ اہل مدینہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک سمجھتا تھا، لہٰذا مدینہ کے جس بھی شہری پر اسے شک ہوا، اس کے جسم پر گرم سیسے سے داغ لگوائے جو غلامی کی علامت ہوا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت سہل بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ کو بھی نہ بخشا اور انہیں بلوا کر کہا: ''تم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کیوں نہ کی؟'' وہ بولے: ''میں نے مدد کی تھی۔'' حجاج نے کہا: ''جھوٹ بولتے ہو۔'' اور ان کی گردن پر داغ لگوا دیا۔ اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو بلوا کر ان کے ہاتھ پر داغ لگوایا۔ حجاج کوفہ گیا تو وہاں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی گردن پر بھی داغ لگوایا۔⑥

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بدکلامی بھی کی اور کہا: ''او گندے آدمی! ہر فتنے میں سرگرداں! کبھی علی کے ساتھ، کبھی ابن زبیر کے ساتھ، کبھی ابن اشعث کے ساتھ۔ اللہ کی قسم! تجھے جڑ سے اکھاڑ کر گوہ کی طرح گھسیٹوں گا۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ بھلا کرے، کون مراد ہے؟'' حجاج نے کہا: ''ارے بہرے! تُو ہی مراد ہے۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ اناللہ پڑھتے ہوئے لوٹ گئے اور فرمایا: ''اپنے بچوں کا خیال نہ ہوتا تو ایسا جواب دیتا کہ وہ گنگ ہو جاتا۔''⑦

حجاج حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آل تسلیم نہیں کرتا تھا۔ امام یحییٰ بن یعمر رحمہ اللہ نے اس موضوع پر بحث میں اسے لاجواب کر دیا۔ حجاج نے ناراض ہو کر انہیں جلاوطن کر دیا۔⑧

① المعجم الاوسط، ح:۲۳۷۷، ط دار الحرمین
② فتح الباری: ۱۳۲/۱۰
③ صحیح البخاری، ح: ۵۲۹، ۵۳۰ ④ فتح الباری: ۱۳/۲
⑤ مصنف عبدالرزاق، ح: ۷۷۰۱ ⑥ تاریخ الطبری: ۱۹۵/۶
⑦ المعجم الکبیر للطبرانی: ۲۳۷/۱، ط مکتبۃ ابن تیمیۃ ⑧ السنن الکبریٰ للبیہقی، ح: ۱۱۹۲۸

ان تمام عیوب کے باوجود وہ کفار کے مقابلے میں شمشیرِ بے نیام تھا۔ سندھ کی فتح اس کا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ قرآن مجید سے اسے بے حد شغف تھا۔ بکثرت تلاوت کرتا تھا اور قرآن مجید کو رسم عثمانی کے مطابق عام کرنے کا زبردست داعی تھا۔ ایک روایت کے مطابق قرآن مجید کے حروف پر نقطے لگوانے میں اس کا بھی حصہ ہے۔ ①

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس میں زبردست شجاعت بھی تھی اور اس کی تلوار میں خون ریزی بھی۔ وہ معمولی شبے پر انسانی جانوں کے قتل جیسے فعل کا ارتکاب بکثرت کر گزرتا تھا حالاں کہ اللہ نے اس اقدام کو ناحق بالکل حرام قرار دیا ہے۔ وہ اپنے خیال میں زیاد کے مشابہ بنتا تھا اور زیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشابہ بننے کی کوشش کرتا تھا جب کہ یہ لوگ اس پائے کے بالکل نہیں تھے۔'' ②

❁❁❁

ولید کے تعمیری و ترقیاتی کارنامے

ولید بن عبدالملک کا دور تعمیر و ترقی کے لحاظ سے قابلِ رشک تھا۔ اس نے پورے عالم اسلام میں راستوں کو ہموار اور بہتر بنایا، تمام شہروں کی جامع مساجد کی توسیع اور تعمیرِ نو کرائی، جا بجا نہروں کی کھدائی کا منصوبہ شروع کرایا۔ ③

وہ پہلا حکمران تھا جس نے شاہراہوں پر ہر ایک میل کے بعد علامتی تختیاں (سنگِ میل) نصب کرائیں۔ اس نے پہلی بار مملکت میں حفظانِ صحت کا شعبہ قائم کیا اور جگہ جگہ شفاخانے اور ہسپتال کھلوائے۔ وہ پہلا حکمران تھا جس نے نابیناؤں کی رہنمائی اور معذور شہریوں کی دیکھ بھال کے لیے خدمت گاروں کا تقرر کیا اور ان کے لیے ماہانہ امدادی رقوم مختص کیں۔ گداگری کا پیشہ ممنوع قرار دیا اور تمام ضرورت مندوں کے لیے سرکاری اخراجات جاری کر دیے۔ ماہ رمضان میں سرکاری طور پر مساجد میں افطار کا انتظام شروع کرایا۔ ④

جامع اُموی دمشق:

جامع مسجدِ دِمَشق کی تعمیر ولید بن عبدالملک کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس مسجد کی بنیاد حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے

---

① وفیات الاعیان: ۲/ ۳۲ ط دار صادر ...... یاد رہے کہ یہ ایک بے سند روایت ہے جسے اس امکان کے تحت قبول کیا گیا ہے کہ بدترین مسلمان سے بھی کوئی خیر صادر ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کو لے کر اگر کوئی حجاج کی ان سیاہ کاریوں کو جو ذخیرۂ حدیث کی صحیح روایات سے ثابت ہیں، جھٹلانے لگے تو یہ محض تعصب ہوگا۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ قرآن پر اعراب لگانے کا کام سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تلمیذ ابوالاسود الدؤلی رحمہ اللہ نے کیا تھا۔ پھر ان کے دو تلامذہ: امام نصر بن عاصم رحمہ اللہ اور امام یحییٰ بن یعمر رحمہ اللہ نے حجاج کی فرمائش پر رسمِ قرآنی میں کچھ نقاط کا اضافہ کیا تھا۔ حجاج کا اس کام میں اگر حصہ تھا تو اسی قدر تھا۔ نیز رسمِ قرآنی میں ترقی کا کام بعد میں بھی ہوتا رہا اور عباسی دور میں تکمیل تک پہنچا جس میں امام خلیل بن احمد فراہیدی رحمہ اللہ کا عظیم حصہ تھا۔ (النقط لابی عمرو الدانی (م ۴۴۴ھ): ص ۱۲۹ ط مکتبۃ الکلیات قاھرہ؛ سیر اعلام النبلاء: ۴ص ۳۴۲؛ معجم الادباء للحموی: ۳ ص ۲۷۴۹)

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/ ۵۱۰ ③ کتاب العیون والحدائق (جزء الولید بن عبد الملک) لابن مسکویہ، ص ۳

④ تاریخ الطبری: ۶/ ۴۹۶، ۴۹۷؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۶۸ ط نزار؛ تاریخ یعقوبی: ص ۲۲۷

رکھی تھی۔ ولید کے دور تک نمازیوں کی کثرت کے باعث مسجد بہت تنگ ہوگئی تھی۔ اس سے متصل ایک چرچ تھا جسے نصرانی بیچنے پر تیار نہ تھے۔ ولید نے خطیر رقم کے عوض چرچ ان سے خرید کر مسجد کو ازسرِ نو تعمیر کرایا۔ نئی تعمیر میں بیس ہزار افراد سما سکتے تھے۔ پوری عمارت سنگِ مرمر کی تھی۔ دروازوں پر سونے کے پانی کا ملمع تھا۔ عمارت کی چھت میں ساج کی لکڑی استعمال کی گئی تھی جو سرما میں گرم اور گرما میں ٹھنڈی رہتی تھی۔ تعمیری سامان ہندوستان، فارس اور مراکش تک سے منگوایا گیا تھا۔ روشنی کے لیے سینکڑوں قندیلیں لگائی گئی تھیں۔ تعمیر ۸۷ھ میں شروع ہوئی اور پانچ سال بعد نماز کا آغاز ہوگیا۔ بارہ ہزار مزدوروں اور معماروں نے اس میں حصہ لیا۔ اس پر ۵۶ لاکھ دینار خرچ ہوئے تھے۔ یہ رقم آج کل کے ایک ارب ۴۷ کروڑ ڈالر سے زائد ہے۔ ①

مسجدِ نبوی کی جدید تعمیر اور توسیع:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد مسجدِ نبوی میں کوئی توسیع نہیں ہوئی تھی لہٰذا ولید کے دور تک مسجد نمازیوں اور زائرین کے لیے تنگ پڑنے لگی تھی۔ آخر ولید کے حکم سے مدینہ کے حاکم حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ۸۸ھ میں مسجدِ نبوی کی تعمیرِ نو کا کام شروع کرایا۔ اُمہات المؤمنین اور پڑوسیوں کے مکانات مسجد میں شامل کرلیے گئے، یوں مسجد کا طول و عرض تین تین سو فٹ ہوگیا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے غیر معمولی توجہ سے اس منصوبے پر کام کیا اور ولید نے اس پر بے پناہ مالی وسائل خرچ کیے۔ صرف قبلہ رخ دیوار کی نقاشی اور سجاوٹ پر ۴۵ ہزار دینار (تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈالر) صرف ہوئے۔ منصوبہ تین سال میں مکمل ہوا۔ ۹۱ھ میں ولید خود مدینہ آیا اور تعمیری کام کی خوب تعریف کی۔ ②

ولید بن عبدالملک کی وفات:

۱۵ ربیع الاول ۹۶ھ کو خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہوگیا۔ عمر ۵۱ سال تھی۔ نو سال پانچ ماہ حکومت کی تھی۔ ذاتی زندگی میں وہ نیک و صالح انسان تھا۔ سرکاری مصروفیات کے ہجوم میں بھی روزانہ دس پارے تلاوت کرنا اس کا معمول تھا۔ اپنے بھائیوں سے بڑی محبت کرتا اور ان کے حقوق کا پورا خیال رکھتا تھا۔ ③

❁❁❁

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۵۶۵/۱۲ تا ۵۷۵؛ مروج الذہب: ۳۶۵/۳، ۳۶۶؛ احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم للمقدسی، ص ۱۵۷ تا ۱۵۹؛ مسالک الابصار للعمری: ۱۸/۳ تا ۵۱؛ تاریخ دمشق: ۲۶۱/۲

فائدہ: اس مسجد کے مینار پر قیامت کے قریب نمازِ فجر کی اقامت کے دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔ وہ دو فرشتوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے مینار پر اتریں گے اور مسلمانوں کی قیادت کرتے ہوئے دجال کو قتل کریں گے۔ (صحیح مسلم، ح: ۷۵۶۰، الفتن و اشراط الساعۃ، باب ذکر الدجال) حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غالباً یہ نزول مسجد کے شرقی مینار پر ہوگا۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۸ ص ۳۲۲، ط دار ھجر)

② تاریخ الطبری: ۳۳۵/۶، ۳۳۶؛ وفاء الوفاء: ۹۳/۲، ۹۴، ۹۷؛ العیون والحدائق، ص ۱۱؛ تاریخ الطبری: ۳۳۶/۶

③ العبر فی خبر من غبر: ۸۶/۱؛ دول الاسلام للذہبی: ۸۳/۱؛ تاریخ یعقوبی: ۲۲۷؛ مروج الذہب للمسعودی: ۳۷۳/۳

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
❷ دیرِ جماجم کے معرکے کا حال لکھیے اور بتائیے کہ علماء وفقہاء نے عبدالرحمن بن اشعث کا ساتھ کیوں دیا تھا؟
❸ ولید بن عبدالملک کے دور میں سندھ کی فتح کا حال قلم بند کیجیے۔
❹ اندلس کس طرح فتح ہوا؟ مختصراً تحریر کیجیے۔
❺ قتیبہ بن مسلم الباہلی کی فتوحات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
❻ ان عنوانات میں کسی ایک پر مختصر نوٹ لکھیے: (۱) جامع اُموی دمشق کی تعمیر (۲) مسجدِ نبوی کی تعمیرِ نو اور توسیع
❼ کتبِ حدیث اور کتبِ تاریخ کی معتمد روایات کی روشنی میں حجاج بن یوسف کے کردار کا محاکمہ فرمائیے۔
❽ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ کون تھے؟ حجاج بن یوسف انہیں کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟ ان کی آخری دُعا کیا تھی؟

عملی کام:

❁ نقشے پر بصرہ اور اس کے نواح میں اس مقام کی نشاندہی کریں جہاں "دیرِ جماجم" کا معرکہ ہوا۔
❁ جامع اُموی دمشق کی چند تصاویر جمع کر کے اپنی بیاض میں لگائیے۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ تاریخ سندھ، از علامہ ابوظفر ندوی مرحوم
❁ قادۃ فتح الاندلس، از محمود شیث خطاب
❁ البدایۃ والنہایۃ، سنہ ۷۳ھ تا ۹۶ھ

(یونٹ: 2.4)

سلیمان بن عبدالملک

ربیع الاوّل ۹۶ھ......تا......صفر ۹۹ھ

دسمبر ۷۱۴ء......تا......اکتوبر ۷۱۷ء

ولید کے دور میں امرائے بنو مروان کے دو گروہ بن چکے تھے: ایک گروہ سخت گیر جرنیلی مزاج کا تھا جس میں ولید کے ساتھ حجاج، حکم بن ایوب، یزید بن ابی مسلم اور دیگر ہم خیال امراء شامل تھے۔ دوسرا گروہ نرم مزاج امراء کا تھا جن میں سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز اور رجاء بن حَیوۃ رحمہما اللہ پیش پیش تھے۔ پہلے گروہ کا ذوق یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ علاقے فتح کیے جائیں اور حکومت مخالف ہر عنصر کو کچل دیا جائے۔ دوسرے گروہ کی سوچ یہ تھی کہ فتوحات سے زیادہ مملکت کے استحکام پر توجہ دی جائے اور لطف و کرم سے عوام کے دلوں کو جیتا جائے۔ یہ خلیج ولید کے آخری ایام تک گہری ہو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حجاج کے مظالم کی شکایت ولید بن عبدالملک سے کی تو ولید نے حجاج کی طرف داری کرتے ہوئے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو مدینہ کی امارت سے معزول کر دیا۔ ①

اس کے ساتھ ہی ولید اپنے بھائی سلیمان کو جو عبدالملک کی وصیت کے مطابق دوسرا ولی عہد تھا، معزول کر کے اس کی جگہ اپنے بیٹے عبدالعزیز کو جانشین بنانے پر غور کرنے لگا۔ حجاج بن یوسف اور قُتَیبہ بن مسلم اس بارے میں خلیفہ کے ہم خیال تھے مگر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے یہ کہہ کر اس رائے کی مخالفت کی کہ (عبدالملک کے دور میں) ہم سے سلیمان کی ولی عہدی کا عہد لے لیا گیا تھا۔ اس پر ولید کو اتنا غصہ آیا کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو ایک کوٹھری میں بند کر کے اوپر سے مٹی کا پلستر کرا دیا۔ آخر گھر کی بعض خواتین کی سفارش پر تین دن بعد انہیں آزاد کیا گیا، اس وقت وہ مرنے کے قریب ہو چکے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی مزاحمت کے باعث سلیمان کی معزولی کا منصوبہ ملتوی ہو گیا۔ اُدھر حجاج فوت ہو گیا اور جلد ہی ولید بھی وفات پا گیا۔ چنانچہ عبدالملک کی قدیم وصیت کے مطابق سلیمان خلیفہ بن گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ولید اور اس کے جرنیل اسے معزول کرنے پر آمادہ تھے لہٰذا وہ ولید کے وفادار امراء سے خطرہ محسوس کرنے لگا۔ ②

① تاریخ الطبری: ۳۸۱/۶، ۳۸۲... دوسری روایت کے مطابق عمر بن عبدالعزیزؒ نے ولید کے حکم پر ایک سخت سزا کا نفاذ کرنے کے بعد خود نادم ہو کر خود استعفیٰ دیا تھا۔ تطبیق یوں ممکن ہے کہ ولید نے معزولی کا حکم روانہ کیا تھا مگر اسے وصول کرنے سے قبل عمر بن عبدالعزیزؒ خود استعفیٰ دے چکے تھے۔

② تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی، ص ۵۱۹؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲۱۳/۱۲؛ تاریخ دمشق: ۳۶۹/۳۶

اس وقت مشرق میں قُتَیبَہ بن مسلم کی فوج چین کی سرحد پر تھی۔ محمد بن قاسم نے ملتان کو مسخر کرنے کے بعد راجپوتانہ پر یلغار شروع کر دی تھی جبکہ اندلس کے حاکم موسیٰ بن نُصَیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے منصوبے کے مطابق پہلے فرانس اور پھر پورے یورپ کو زیرِ نگین کر کے مغرب کی طرف سے قُسطَنطِینِیّہ پر حملے کا عزم کیا ہوا تھا۔ مگر سلیمان کو شبہ ہوا کہ کہیں یہ جرنیل سابق خلیفہ سے وابستگی کی بناء پر بغاوت کر کے خود مختار حکومتیں نہ بنا لیں۔ چنانچہ اس نے فی الفور ان امراء اور سپہ سالاروں کو معزول کرنا شروع کر دیا جو حجاج بن یوسف کے مقرب یا ولید کے خاص وفادار تھے۔

قُتَیبَہ بن مسلم کا قتل:

سلیمان بن عبدالملک کے خدشات بعض جرنیلوں کے بارے میں درست ثابت ہوئے۔ چین کی سرحدوں پر لشکر کشی کرنے والے فاتح قُتَیبَہ بن مسلم نے سلیمان کے تخت نشین ہوتے ہی دربارِ خلافت میں مراسلہ لکھ بھیجا کہ اگر مجھے معزول کیا گیا تو میں بغاوت کر دوں گا۔ سلیمان نے تحمل سے کام لیتے ہوئے جواب میں قُتَیبَہ کو عہدے کی بحالی کا اطمینان دلایا۔ مگر قُتَیبَہ کو مرکزِ خلافت سے اس قدر بدگمانی تھی کہ خلیفہ کا جواب ملنے سے پہلے ہی بغاوت کا اعلان کر دیا اور اپنے حامیوں کو خلیفہ سے لڑنے پر ابھارا۔ کچھ سرداروں نے بات مان لی اور کچھ نے خلیفہ سے وفاداری باقی رکھنے پر اصرار کیا۔ اس طرح قُتَیبَہ کی فوج میں پھوٹ پڑ گئی اور باہم جنگ کی نوبت آ گئی۔

قُتَیبَہ کے حامی کم اور خلیفہ کے وفادار زیادہ تھے؛ اس لیے لڑائی میں قُتَیبَہ کو شکست ہوئی۔ خلیفہ کے وفادار افسران نے قُتَیبَہ کا سر قلم کر کے دِمَشق بھیج دیا۔ یوں عالمِ اسلام کا یہ نہایت قابل جرنیل امورِ سیاست میں غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنوں کے ہاتھوں ایک دردناک انجام کو پہنچا۔ یہ واقعہ سلیمان کی خلافت کے پہلے سال یعنی ۹۶ھ کا ہے۔ [۱]

محمد بن قاسم کے قتل کا سانحہ:

کچھ مدت بعد سلیمان بن عبدالملک نے محمد بن قاسم کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ جب یہ حکم نامہ سندھ پہنچا تو محمد بن قاسم کا لشکر راجپوتانہ کے مرکز ''قنوج'' پر حملہ کرنے والا تھا۔ [۲]

محمد بن قاسم نے خود کو سلیمان کی طرف سے بھیجے گئے نئے حاکم یزید بن ابی کبشہ کے حوالے کر دیا جس نے اس مردِ میدان کو زنجیروں میں جکڑ کر عراق بھیج دیا۔ عراق کا نیا حاکم صالح بن عبدالرحمن، حجاج بن یوسف اور اس کے وفاداروں کا سخت مخالف تھا کیوں کہ اس کے بھائی کو جو خارجی گروہ سے تعلق رکھتا تھا، حجاج نے قتل کرا دیا تھا۔ اس لیے صالح بن عبدالرحمٰن اپنے بھائی کا انتقام محمد بن قاسم سے لینے پر تل گیا۔ اس نے محمد بن قاسم کو واسط کے جیل خانے میں ڈال کر ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔ سخت اذیتیں سہتے ہوئے ۹۸ھ میں محمد بن قاسم کی وفات ہو گئی۔ یوں ایک نہایت قابل سپہ سالار اپنوں کی ناقدری کی نذر ہو گیا۔ [۳]

---

① تاریخ الطبری: ۶/۵۰۶ تا ۵۲۲؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۹۶ھ

② چچ نامہ، ص ۲۴۱ تا ۲۴۳ ③ الکامل فی التاریخ: ۳/۲۲، ۲۳؛ چچ نامہ، ص ۲۴۵؛ فتوح البلدان، ص ۴۲۴

موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ سے سلوک:

اَندَلُس کے فاتح موسیٰ بن نُصَیر اور طارق بن زیاد کو بھی خلیفہ ولید کا معتمد ہونے کی وجہ سے مشکوک سمجھا گیا۔ ان دونوں کو سابق خلیفہ نے اپنے آخری ایام میں دمشق بلالیا تھا۔ موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ مالِ غنیمت کے انبار لادے دارالخلافہ پہنچے تو خلیفہ ولید کو شدید علیل پایا۔ خلیفہ نے ان کا غیر معمولی اعزاز واکرام کیا۔ کچھ دنوں بعد ولید کی وفات ہوگئی اور سلیمان نے مسند نشین ہوتے ہی موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ کو معزول کردیا۔ ①

سلیمان کو موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ سے کچھ مدت تک بداعتمادی رہی مگر بعد میں تمام غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور موسیٰ رحمہ اللہ کو دربارِ خلافت میں مصاحب بنالیا گیا۔ قُسطَنطِینیّہ پر حملے کے لیے سلیمان نے موسیٰ رحمہ اللہ سے بطورِ خاص مشورہ لیا۔ نیز اس نے اَندَلُس کا انتظام موسیٰ رحمہ اللہ کے بیٹے اور اس کے نائب عبدالعزیز کے پاس رہنے دیا۔ ②

بعض روایات میں ہے کہ سلیمان نے موسیٰ رحمہ اللہ کو قید وبند اور ذلت ونکبت میں مبتلا رکھا اور بھاری جرمانہ عائد کیا جسے وہ ادا نہ کرسکے اور اسی تباہ حالی میں ان کا انتقال ہوگیا مگر یہ روایات معتبر نہیں۔ دیگر روایات کے مطابق موسیٰ رحمہ اللہ نے مالِ غنیمت میں سے افسران اور سپاہ پر جو رقم ضابطے سے ہٹ کر خرچ کی تھی، اس کے باعث سلیمان نے ان کا احتساب کیا اور پوچھ گچھ کے دوران سلیمان نے انہیں بے عزت کرنے کی قسم کھالی جسے پورا کرنے کے لیے انہیں چند گھنٹے دھوپ میں رکھا، ان پر غشی طاری ہوئی تو سلیمان کو اپنی حرکت پر ندامت ہوئی۔ اس کے بعد وہ آخر تک موسیٰ رحمہ اللہ کی قدر ومنزلت کرتا رہا۔ اس دوران موسیٰ رحمہ اللہ نے دس لاکھ دینار کی خطیر رقم ادا کرکے اپنا حساب صاف کردیا۔ ③

۹۷ھ میں سلیمان بن عبدالملک حج کے لیے روانہ ہوا تو موسیٰ بن نُصَیر رحمہ اللہ کو بھی ہمراہ لے لیا۔ مدینہ منورہ پہنچ کر موسیٰ رحمہ اللہ کی وفات ہوگئی اور وہیں تدفین ہوئی۔ ④

طارق بن زیاد کی گوشہ نشینی:

طارق بن زیاد کو اَندَلُس سے واپسی کے بعد کسی بڑی فوجی مہم پر نہیں بھیجا گیا۔ سلیمان بن عبدالملک کو طارق سے کوئی ناراضی نہ تھی بلکہ بعض روایات کے مطابق وہ اس معرکہ آزما سالار کو دوبارہ اَندَلُس بھیجنا چاہتا تھا مگر نامعلوم وجوہ سے اس ارادے پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ طارق کی بقیہ زندگی گمنامی میں گزری۔ ⑤

مؤرخین کہتے ہیں کہ اگر سلیمان ان فاتحین پر بھروسہ کرتا اور ان کی مہمات جاری رہتیں تو دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۲۳۰/۱۲؛ التاریخ الأندلسی، ص ۱۲۶، ۱۲۷

② البیان المغرب: ۲۰/۲، ۲۱؛ سیر اعلام النبلاء: ۴۹۹/۴

③ البیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۲۰/۲، ۲۱؛ التاریخ الأندلسی، ص ۱۲۶، ۱۲۷

④ التاریخ الأندلسی، ص ۱۲۷، ۱۲۸

⑤ نفح الطیب: ۱۳/۳

اندلس کے نائب حکمران عبدالعزیز کا قتل:

موسیٰ رحمہ اللہ اندلس سے واپسی پر اپنے بیٹے عبدالعزیز کو نائب بنا کر آئے تھے۔ عبدالعزیز نے اندلس کے سابق بادشاہ راڈرک کی بیٹی سے نکاح کر لیا تھا جو اپنے مذہب نصرانیت پر قائم تھی۔ عبدالعزیز اس بیوی کی بڑی دلداری کرتا تھا۔ اس کی فرمائش پر کبھی کبھار گھر میں یورپی حکمرانوں جیسا تاج پہن لیا کرتا تھا۔ افسرانِ فوج کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ ساتھ ہی یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ بیوی کی محبت میں نصرانی ہو گیا ہے۔ چنانچہ مشتعل سپاہیوں نے حملہ کر کے عبدالعزیز کو قتل کر ڈالا۔ اس وقت وہ مسجد میں نمازِ فجر کی امامت کر رہا تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس افواہ کو پھیلانے میں خلیفہ کا ہاتھ تھا مگر اس کی کوئی پختہ روایت موجود نہیں۔ بہر حال یہ طے ہے کہ عبدالعزیز نیک سیرت اور دین دار آدمی تھا، تہجد کا پابند اور کثرت سے نفلی روزے رکھنے کا عادی تھا۔ اس کا قتل بہر حال کسی غلط فہمی یا سازش کے تحت ہوا تھا۔ ①

سلیمان کے عہد کی اصلاحات:

گزشتہ بعض خلفاء کے ظالم مشہور ہو جانے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ حجاج بن یوسف اور اس جیسے بعض حاکم اور ان کے ماتحت جب ظلم کیا کرتے تھے تو خلفاء کی طرف سے ان زیادتیوں کے ازالے کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ اس لیے یہ خلفاء خود بھی ظلم میں ملوث سمجھے جاتے تھے۔ سلیمان نے اس صورتحال کا تدارک کیا اور تخت نشین ہوتے ہی مظالم کا ازالہ شروع کر دیا۔ جلاوطن لوگوں کو واپسی کی اجازت دی۔ شک وشبہے کی بناء پر قید کیے لوگوں کو آزاد کر دیا۔ حکام اور افسران کا احتساب کیا مگر اس سلسلے میں بعض جگہ ظالم حکام کے بے قصور ماتحت بھی اس دار و گیر کی زد میں آ گئے جیسا کہ حجاج سے تعلق رکھنے کی بناء پر محمد بن قاسم جیسا فاتح زیرِ عتاب آ گیا۔ سلیمان نے کچھ مذہبی اصلاحات بھی کیں۔ حاکم نمازوں میں تاخیر کرنے لگے تھے۔ سلیمان نے انہیں مستحب اوقات میں نمازوں کی تاکید کی۔ ②

مسجد الحرام میں پانی کی قلت دور کرنے کے لیے اس نے "کوہِ ثبیر" کے دامن میں سنگِ مرمر کا ایک بہت بڑا تالاب بنوایا جس میں پہاڑی چشموں کا پانی جمع ہوتا تھا۔ پھر تالاب کا پانی پائپ لائن کے ذریعے مسجد الحرام کے صحن میں جا پہنچتا تھا جہاں سنگِ مرمر کا ایک اور چھوٹا تالاب تھا جس میں پانی فوارے کی شکل میں ابلتا تھا۔ اس فوارے کی وجہ سے مکہ میں میٹھے پانی کی افراط ہو گئی اور مسجد الحرام کی خوبصورتی بھی بڑھ گئی۔ ③

سلیمان بن عبدالملک کے عہد کی فتوحات:

سلیمان نے ۹۷ھ میں خراسان میں یزید بن مُہلّب کو تعینات کیا جو مشہور جرنیل مُہلّب بن ابی صفرہ کا بیٹا تھا۔ یزید بن مُہلّب نے بحیرۂ کیسپین کے گرد آباد شورش پسند کافر اقوام سے جہاد کر کے انہیں مسخر کیا۔ آخر کار "طبرستان" کے حاکم نے بھاری رقم دے کر یزید سے صلح کر لی۔ اس کے بعد یزید نے دشوار گزار پہاڑی دروں سے گزر کر جرجان کو فتح

① الکامل فی التاریخ، سنہ ۹۷ھ ② تاریخ الخلفاء، ص ۱۲۹، ط نزار ③ تاریخ یعقوبی، ص ۳۲۸

کیا اور اسے از سرِ نو تعمیر کر کے یہاں مسلمانوں کو آباد کیا۔ یہ مہم ۹۸ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ ①

ان دنوں بازنطینی سلطنت سخت داخلی انتشار سے گزر رہی تھی۔ قیصر جسٹنین دوئم کے دور سے جو خانہ جنگی شروع ہوئی تھی وہ موجودہ قیصر "تھیڈوس سوئم" کے دورِ حکومت میں بھی جاری تھی؛ ② اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ۹۸ھ میں سلیمان بن عبدالملک زبردست تیاریوں کے ساتھ قسطنطینیہ پر لشکر کشی کے لیے خود روانہ ہوا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز، رجاء بن حَیوَہ اور بنوامیہ کے دیگر شہزادے اور نامور امراء بھی ہم رکاب تھے۔ فوج کشی بحری اور بری دونوں جانب سے تھی۔

سلیمان خود ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقے "دابق" کو چھاؤنی بنا کر وہیں ٹھہر گیا جبکہ اس کا بھائی مَسلمہ جو ایک نامور جرنیل تھا، آگے روانہ ہو کر قسطنطینیہ پر حملہ آور ہوا۔ مگر جلد ہی موسمِ سرما شروع ہو گیا اور خلافِ معمول بہت زیادہ برف باری ہونے لگی جس سے رسد مسدود ہو گئی اور سپاہی غذا کی کمی کا شکار ہو گئے۔ ہزاروں بیمار اور سینکڑوں فوت ہو گئے۔ مَسلمہ نے باربار قاصد بھیج کر سلیمان سے واپسی کی اجازت طلب کی مگر سلیمان نے اجازت نہ دی۔

آخر کار برف باری کے باعث لشکر سے رابطہ بالکل منقطع ہو گیا۔ اِدھر سلیمان کا وقتِ اجل آن پہنچا اور اسے اپنے جانشین کی فکر ہوئی۔ اس کا جوان لڑکا داؤد محاذِ جنگ پر گیا تھا مگر معلوم نہیں وہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ باقی بچے چھوٹے تھے۔ ان حالات میں سلیمان کی نگاہِ انتخاب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ پر پڑی۔ اس نے رجاء بن حَیوَہ رحمہ اللہ سے مشورہ لیا۔ انہوں نے کہا: "وہ بڑے عالم فاضل اور نیک مسلمان ہیں۔" سلیمان نے کہا: "اللہ کی قسم! میرا بھی یہی خیال ہے لیکن اگر میں عبدالملک کی اولاد کو بالکل نظر انداز کر کے انہیں خلیفہ بنادوں تو یہ لوگ ان کی حکومت قائم نہیں رہنے دیں گے؛ اس لیے عمر کو خلیفہ اور یزید بن عبدالملک کو ان کا ولی عہد نامزد کر دیتا ہوں۔ اس طرح خاندان کے لوگ مطمئن ہو کر عمر کی خلافت مان لیں گے۔" رجاء رحمہ اللہ نے تائید کی۔ ③ سلیمان نے فوراً اپنے ہاتھ سے یہ وصیت نامہ لکھ دیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یہ تحریر اللہ کے بندے سلیمان بن عبدالملک امیر المؤمنین کی طرف سے عمر بن عبدالعزیز کے لیے ہے۔

میں نے تمہیں اپنے بعد خلیفہ بنایا اور تمہارے بعد یزید بن عبدالملک کو۔ مسلمانو! کہنا سننا، اور تابع داری کرنا۔

اللہ سے ڈرتے رہنا۔ آپس میں اختلاف نہ کرنا ورنہ اغیار تمہاری جانب حریصانہ نگاہیں ڈالنے لگیں گے۔"

سلیمان نے وصیت نامے کو مہر بند کر کے رجاء کے حوالے کر دیا اور تاکید کی کہ وہ خاندان کے عمائد کو جمع کریں اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا نام ظاہر کیے بغیر ان سے نامزد کیے گئے خلیفہ کے لیے بیعت لے لیں۔

رجاء رحمہ اللہ نے اسی وقت جا کر شاہی خاندان کے عمائد اور امرائے فوج سے اگلے خلیفہ کی بیعت لے لی۔ سب نے بیعت کر لی۔ اس کے کچھ دیر بعد پینتالیس سالہ سلیمان بن عبدالملک کی روح پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ ۲۰ صفر ۹۹ھ کا ہے۔

① المنتظم لابن جوزی: سنہ ۹۷ھ، ۹۸ھ ② الکامل فی التاریخ: ۱ ص ۳۰۵ ③ الکامل فی التاریخ، سنہ ۹۹ھ

رجاء رحمہ اللہ نے مصلحت کے طور پر اس خبر کو پوشیدہ رکھا۔ مرحوم خلیفہ کی لاش کو تکیوں کے سہارے بٹھا دیا گیا اور ایک ہوشیار خادم کو ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد امراء کے اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ خلیفہ اپنے جانشین کے لیے اپنے سامنے بھی بیعت لینا چاہتے ہیں۔ سب لوگ ایک ایک کر کے سلیمان کے خیمے میں گئے۔ ہر شخص خیمے کے دروازے پر کھڑا ہو کر سلام عرض کرتا۔ خادم یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ خلیفہ بیماری کی وجہ سے جواب دینے سے قاصر ہے، اس کی طرف سے خود جواب دیتا اور پھر کہتا: "امیر المؤمنین چاہتے ہیں کہ آپ ولی عہد کی بیعت واطاعت پر قائم رہیں۔"

ہر امیر اور شہزادہ اس کا وعدہ کر کے لوٹ جاتا۔ اس طرح عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی بیعت کا مرحلہ تکمیل کو پہنچا۔ ①

سلیمان کے دور پر ایک نظر:

سلیمان کا شمار بنو مروان کے نیک سیرت خلفاء میں ہوتا ہے۔ چونکہ اس نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جیسے شخص کو جانشین بنایا تھا؛ اس لیے علماء اسے "مفتاح الخیر" (بھلائی کی چابی) کہہ کر یاد کرتے رہے۔ اس نے معمولی قصور یا شک وشبہے کی بناء پر بند کیے جانے والے لوگوں کو آزاد کرنے کا حکم دیا تو اکثر قید خانے خالی ہو گئے۔ عوام اس کی نرم دلی اور سخاوت کے باعث اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ آخرت کی باتوں پر زار و قطار رو پڑنا اس کی عادت تھی۔ ②

امام ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے تھے:

"اللہ سلیمان بن عبدالملک پر رحمت کرے۔ اس کے دور کا آغاز بھی خیر کے ساتھ ہوا اور اختتام بھی۔ آغاز نمازوں کی بروقت ادائیگی کے احیاء سے ہوا اور اختتام عمر بن عبدالعزیز کی ولی عہدی پر۔"③

❁❁❁

① سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۳۳؛ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۹۹ھ
② البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/ ۶۳۳ تا ۶۳۶؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۶۹، ۱۷۰؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۹۹ھ
③ مختصر تاریخ دمشق: ۱۰/ ص ۱۷۵

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ

صفر ۹۹ھ......تا......رجب ۱۰۱ھ

ستمبر ۷۱۷ء......تا......فروری ۷۲۰ء

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلافتِ بنو مروان کے بانی مروان بن الحکم کے پوتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پڑنواسے تھے۔ بنو مروان اور فاروقی خاندان کا یہ ملاپ ان دنوں ہوا تھا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دودھ میں پانی ملانے کی ممانعت کی تھی۔ وہ ایک رات گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز آئی، کوئی عورت کہہ رہی تھی: ''بیٹی! صبح ہونے والی ہے، دودھ میں پانی ملادے۔'' لڑکی نے جواب دیا: ''اماں! آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المؤمنین نے اس سے منع کردیا ہے۔''

ماں کی آواز آئی: ''امیر المؤمنین اس وقت کہاں ہیں، انہیں بھلا کیا خبر؟''

بیٹی نے جواب دیا: ''امیر المؤمنین کو چاہے خبر نہ ہو، اللہ تو دیکھ رہا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس گھر کو نگاہ میں رکھا اور اپنے بیٹے عاصم رحمہ اللہ کو اس لڑکی سے نکاح کی ترغیب دیتے ہوئے کہا: ''تم اس لڑکی کو نکاح کا پیام دو۔ مجھے امید ہے کہ اس سے ایسا جوان پیدا ہوگا جو سارے عرب پر حکومت کرے گا۔''

عاصم رحمہ اللہ نے اس سے نکاح کرلیا۔ اس خاتون سے اُمّ عاصم پیدا ہوئیں جن کا نکاح مروان بن الحکم کے بیٹے عبدالعزیز سے ہوا۔ عبدالعزیز اکیس سال تک مصر کے حاکم رہے۔ ۶۳ھ میں ان کے ہاں عمر کی ولادت ہوئی۔ ①

تعلیم و تربیت:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی پرورش اور تعلیم و تربیت بڑی خوشحالی میں ہوئی۔ بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ کرلیا۔ بارہ تیرہ سال کے ہوئے تو والد نے انہیں تعلیم و تربیت کے لیے مدینہ منورہ بھیج دیا اور مشہور محدث صالح بن کیسان رحمہ اللہ کو ان کا اتالیق مقرر کیا۔ ان کے اساتذہ میں عروہ بن زبیر اور سعید بن مسیب رحمہما اللہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے شہرِ نبوی کے عمر رسیدہ صحابہ: سہل بن سعد، سائب بن یزید اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم سے بھی حدیثِ نبوی سماعت کی۔

---

① سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۲۳، ۲۴؛ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی، ص ۹

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا رنگ گندمی، چہرہ حسین اور ستواں، ڈاڑھی خوبصورت اور جسم توانا وسڈول تھا، البتہ خلافت کے بعد سخت مجاہدے کی وجہ سے آپ دبلے پتلے ہو گئے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ①

دولت کی ریل پیل کی وجہ سے ان کی زندگی شہزادوں کی سی تھی۔ قیمتی لباس اور عمدہ خوشبوئیں استعمال کیا کرتے تھے۔ جس گلی سے گزر جاتے وہ دیر تک مہکتی رہتی۔ جو لباس ایک بار استعمال کر لیتے، دوبارہ اس کی باری نہ آتی۔ ②

ولید بن عبدالملک نے اپنے دور میں انہیں مدینہ منورہ کا حاکم بنا دیا تھا۔ اس دوران انہوں نے ایک اچھے حاکم کا کردار پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے ذہن میں شروع سے حکومتِ اسلامیہ کا وہ نقشہ جاگزیں تھا جو خلفائے راشدین کے دور میں دکھائی دیتا تھا۔ وہ شخصی حکومت کے حق میں نہ تھے اور حکومت میں عالم فاضل مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ شراکت اور شورائیت کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حاکم کا عہدہ سنبھالتے ہی انہوں نے مدینہ منورہ کے علماء وفقہاء کو بلا کر کہا: ''میں نے آپ حضرات کو ایسے کام کے لیے زحمت دی ہے کہ اس میں میرا ہاتھ بٹانے سے آپ کو ثواب ملے گا۔ آپ حق کے حمایتی قرار پائیں گے۔ میں کوئی کام آپ کی رائے اور مشورے کے بغیر انجام نہیں دوں گا۔ جب آپ کسی کو ظلم کرتا دیکھیں یا آپ کو کسی کے ظلم کی خبر ملے تو آپ مجھے ضرور اطلاع دیجیے۔'' ان علماء میں قاسم بن محمد، عروۃ بن الزبیر، سالم بن عبداللہ بن عمر، ابوبکر بن عمرو بن حزم اور سعید بن مسیب رحمہم اللہ جیسے اساطینِ علم شامل تھے۔ ③

دو جھنجھوڑ دینے والے واقعات:

مدینہ کی اس حکومت کے دوران دو واقعات ایسے پیش آئے جنہوں نے آپ کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ ایک بار آپ نے ایک شخص کو کسی جرم کی بناء پر جیل میں ڈال دیا۔ جس قدر سزا کا وہ مستحق تھا، اتنی مدت گزر گئی، تب بھی آپ نے اسے آزاد نہ کیا۔ آپ کا خادمِ خاص ''مزاحم'' ایک متقی انسان تھا جو اکثر آپ کو اچھی رائے دیتا تھا۔ اس نے قیدی کی سفارش کرتے ہوئے اسے آزاد کر دینے کا مشورہ دیا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مجرم سے بہت ناراض تھے؛ اس لیے سفارش رد کر دی۔ تب مزاحم نے سارے آداب بالائے طاق رکھ کر کہا:

''عمر! میں آپ کو اس رات سے ڈراتا ہوں جو قیامت پر جا کر ختم ہوگی۔ جس کی صبح کو یومِ حشر قائم ہوگا۔''

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کہا کرتے تھے: ''مزاحم کے الفاظ نے گویا میری آنکھوں سے پردے ہٹا دیے۔'' ④

دوسرا واقعہ ۹۳ھ میں پیش آیا جس نے ان کے دل کو مروجہ سیاسی نظام اور انتظامی ڈھانچے سے بدل کر دیا۔ یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے خبیب رحمہ اللہ کا سزا کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو جانا تھا۔ خبیب رحمہ اللہ کی کسی حرکت سے طیش میں آ کر خلیفہ ولید نے حکم دیا تھا کہ انہیں سو کوڑے مار کر سر پر یخ بستہ پانی کی مشک چھوڑی جائے اور

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۱۶،۱۱۵/۵ ② سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی، ص ۳۱؛ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۲۶

③ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی، ص ۳۱؛ سیرۃ عمر لابن عبدالحکم، ص ۲۷؛ طبقات ابن سعد متمم التابعین، ص ۱۲۵

④ تاریخ دمشق: ۳۷۶،۳۷۵/۵۷

سخت سردی میں مسجد کے باہر کھڑا رکھا جائے۔ عمر بن عبدالعزیز نے یہ سزا تو جاری کر دی، مگر اس تشدد سے خبیب رحمہ اللہ کی حالت غیر ہوگئی اور وہ بستر پر پڑ گئے۔ عمر بن عبدالعزیز کو اب فکر لاحق ہوئی۔ برابر ان کی تیمارداری کرتے رہے۔

تاہم خبیب رحمہ اللہ جانبر نہ ہوسکے اور خالقِ حقیقی سے جاملے۔ ایک شخص یہ افسوس ناک خبر لے کر قصرِ امارت پہنچا، دیکھا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بے چینی کے عالم میں اٹھ اٹھ کر بیٹھتے اور بیٹھ بیٹھ کر اٹھتے ہیں۔ اس شخص کو دیکھتے ہی عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے پوچھا: ''مریض کا کیا حال ہے؟'' جواب ملا: ''دنیا سے رخصت ہوگیا۔'' عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ یہ سنتے ہی چکرا کر زمین پر گر پڑے۔ چند لمحوں کی غشی کے بعد "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھتے ہوئے اٹھے اور حکومت سے استعفیٰ دے دیا۔ ① عمر بھر وہ خود کو خبیب رحمہ اللہ کی موت کا ذمہ دار سمجھ کر آخرت کی جواب دہی سے خوف زدہ رہے۔ کوئی بڑے بڑے کارناموں پر ان کی تعریف کرتا تو فرماتے: ''جو خبیب کے ساتھ کیا اس کا کیا ہوگا۔'' ②

سلیمان بن عبدالملک کے مشیر کی حیثیت سے:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور سلیمان بن عبدالملک چچازاد بھی تھے اور ہم ذوق و ہم مزاج بھی؛ اس لیے باہم بے تکلفی تھی۔ دونوں عبادت گزار اور خدا ترس تھے۔ سلیمان طبیعت کے لحاظ سے آسائش پسند، خوش خوراک اور زیب و زینت کا دل دادہ تھا۔ عمر بن عبدالعزیز بھی اس زمانے میں اللہ کی نعمتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے عادی تھے۔ عمر بن عبدالعزیز میں تدبّر اور فکرِ آخرت کا مادّہ زیادہ تھا؛ اس لیے گاہے گاہے سلیمان کو نصیحتیں کرتے رہتے تھے۔ سلیمان کے خلیفہ بننے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ سلیمان آپ کی نصیحتوں کو اکثر بلا چوں چراں مان لیتا تھا۔ آپ بھی نصیحت میں حکمت اور موقع محل کا لحاظ رکھا کرتے تھے۔ ③ بعض علماء کا قول ہے: ''سلیمان کی خلافت گویا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت تھی۔ جب سلیمان کسی کام کا ارادہ کرتا تو کہتا: ''ابو حفص! آپ کیا کہتے ہیں؟'' ④ اسی بناء پر سلیمان نے وفات سے کچھ دیر پہلے رجاء بن حیوۃ رحمہ اللہ کے مشورے کے ساتھ خلافت کے لیے آپ کا نام طے کر دیا تھا۔ ⑤

دورِ خلافت

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت ۲۲ صفر ۹۹ھ کو ایشیائے کوچک کے علاقے ''دابق'' کے معسکر میں عمل میں آئی خلافت کی ذمہ داری سر پر پڑتے ہی آپ کے دل کی دنیا بدل گئی۔ آپ کے احساسِ ذمہ داری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ رحمہ اللہ سلیمان کی تدفین سے فارغ ہو کر بڑے غمزدہ تھے۔ لوگ حیران تھے کہ اتنی بڑی حکومت مل جانے پر خوش ہونے کی بجائے مغموم ہیں۔ اس رنج و غم کا سبب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''مشرق سے مغرب تک

① عمر بن عبدالعزیز مدینہ کی امارت سے مستعفی ہو کر دمشق آ گئے تھے اور ولید کی موت تک وہاں مشیر کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔

② تاریخ الطبری: ۱/ ۴۸۲؛ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی، ص ۴۳، ۴۴

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/ ۶۳۳ تا ۶۳۶؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۶۹، طنزاز

④ تاریخ ابی زرعۃ الدمشقی: ص ۱۹۳، ۱۹۴

⑤ الکامل فی التاریخ، سنۃ: ۹۹ھ

پھیلی ہوئی اس سلطنت کا ایک بھی شخص ایسا نہیں جس کا حق اس کے کہے بغیر مجھ پر لازم نہ ہوگیا ہو۔" ①

تین فوری احکام:

خلیفہ بنتے ہی آپ رحمہ اللہ نے فی الفور تین مراسلے لکھے: پہلا مسلمہ بن عبدالملک کے لیے تھا جو قسطنطینیہ کے محاذ پر اسلامی فوج کا سپہ سالار تھا۔ کئی ماہ کی مہم جوئی کے باوجود یہ شہر فتح نہیں ہوسکا تھا جس پر غضب ناک ہوکر سلیمان نے قسم کھائی تھی کہ وہ مرتے دم تک اس فوج کو واپس نہیں آنے دے گا۔ اب وہاں مسلمان موسم کی شدت اور رسد کے مسدود ہوجانے کے باعث جاں بلب تھے۔ اس لیے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فوراً فوج کو واپسی کی اجازت دے دی۔

آپ رحمہ اللہ نے دوسرے مراسلے میں مصر کے حاکم اسامہ بن زید تنوخی کی برطرفی اور گرفتاری کا حکم جاری کیا۔ یہ شخص بڑا بے رحم تھا اور معمولی جرائم اور شکوک وشبہات پر ملزموں کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیتا تھا۔ لوگ اس کی سخت گیری سے تنگ تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حکم جاری کیا کہ اسے گرفتار کرکے ہر فوجی چھاؤنی کے قید خانے میں ایک ایک سال رکھا جائے۔ اسے ہتھکڑی اور بیڑی لگی رہے۔ صرف نمازوں کی ادائیگی کے لیے اسے کھولا جائے۔

تیسرا حکم نامہ افریقہ کے حاکم یزید بن ابی مسلم کی برطرفی کا تھا۔ یہ بھی ایک بدکردار انسان تھا، خدا رسیدہ ہونے کا ڈھونگ رچاتا اور رعایا پر ظلم کرتا تھا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ سخت سزائیں جاری کرنے کے احکام کے ساتھ ساتھ تسبیح پڑھتا رہتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو گوارا نہ ہوا کہ اپنے اختیار کے تحت ایسے لوگوں کو حکومت میں باقی رکھیں۔ ②

سرکاری مراعات واعزازات قبول کرنے سے انکار:

اس کام سے فارغ ہوئے تو آپ رحمہ اللہ کی خدمت میں شاندار شاہی سواریاں لائی گئیں مگر آپ نے استعمال کرنے سے انکار کرکے انہیں بیت المال میں داخل کردیا۔ قیام گاہ پر پہنچ کر قالین اور بستر تک بیت المال میں جمع کرادیے۔ ③

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی دنیا سے یہ بے رغبتی دیکھ کر امرائے مملکت نے انہیں لبھانے کی آخری چال چلی اور حضرت عمر رحمہ اللہ کے سامنے وہ باندیاں پیش کیں جو عالمِ اسلام کی حسین ترین لڑکیاں تھیں۔ امراء کو جہاں بھی ایسی کسی باندی کا پتا چلتا وہ اس کے مالک پر دباؤ ڈال کر اسے خرید کر ہی چھوڑتے۔ وہ فروخت نہ کرتا تو جبراً چھین لیتے۔ پھر یہ باندیاں خلیفہ کو خوش کرکے اپنا مرتبہ اونچا کرانے کے لیے خاص خاص مواقع پر پیش کی جاتیں۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے سامنے یہ باندیاں سامنے آئیں تو آپ رحمہ اللہ نے ہر ایک سے اس کا اور اس کے اصل مالک کا (جس پر دباؤ ڈال کر اسے حاصل کیا گیا تھا) نام پوچھا۔ ان میں سے بیشتر دور دراز کے شہروں اور علاقوں کی تھیں۔ آپ رحمہ اللہ نے ہر باندی کو اس کے اصل مالک کے پاس روانہ کردیا۔ یہ دیکھ کر سب کو یقین ہوگیا کہ یہ شخص کسی قسم کی لچک کا قائل نہیں۔ ④

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۲/ ۶۹۰، الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۰۱ھ

② سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۳۶، ۳۷

③ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۳۸؛ اخبار ابی حفص عمر لابی بکر محمد بن الحسین الآجری، ص ۵۵، ۵۶

④ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۳۸، ۳۹

اس دور کی حکومتی اور معاشرتی خرابیاں

خلفائے بنوامیہ میں سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت بڑا کامیاب تھا مگر بعد میں تدریجاً کمزوریاں پیدا ہوئیں اور بڑھتی رہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت فتوحات، استحکام اور مسلمانوں کے سیاسی عروج کے لحاظ سے قابلِ رشک تھی۔ ہاں اگر گزشتہ ادوار کی بہ نسبت کوئی بڑی تبدیلی آئی تھی تو یہ کہ انہوں نے مجلسِ شوریٰ کو شام کے عمائد اور مملکت کے اصحابِ سیف میں محدود کر دیا تھا؛ کیوں کہ وہ بدلتے ہوئے حالات میں قومی یک جہتی اور فتنہ وفساد سے حفاظت کے لیے اس کو ضروری سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے محدود شورائیت کے ساتھ یزید کی ولی عہدی طے کر دی تھی۔ اپنے اس فیصلے میں وہ بالکل نیک نیت اور مخلص تھے۔ تاہم ان کے جانشین یزید کے دور میں کمزوریوں کی ابتداء ہو گئی تھی جن کی ذمہ داری یزید ہی کے سر ہے؛ کیوں کہ اگر وہ اپنے والد ماجد کی وصیتوں پر عمل کرتے ہوئے خود رائی سے اجتناب اور اکابر وافاضل کے مشوروں پر عمل کا التزام کرتا تو اس کا دورِ حکومت باعثِ فتن نہ بنتا۔ یزید کے عہدِ حکومت میں شورائیت محدود تر ہوئی اور خود رائی پر اصرار بڑھ گیا۔ تاریخ میں کوئی ہلکی سی جھلک بھی نہیں ملتی کہ حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ سیاسی اختلاف کے حل کے لیے یزید نے شورائیت کا اہتمام کیا ہو۔ اس دور میں نائبین اور جرنیلوں کے اختیارات حد سے متجاوز ہو گئے اور ان کے مظالم اور زیادتیوں کو قانون سے بالاتر تصور کر لیا گیا۔ عبیداللہ بن زیاد، عمر بن سعد اور شمر بن ذی الجوشن حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے پورے قافلے کے قتل کے براہِ راست ذمہ دار تھے مگر ان میں سے کسی سے بھی برائے نام بھی کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔

مسلمانوں پر بزورِ شمشیر حکومت کرنے کی ذہنیت عبدالملک بن مروان کے دور میں نقطۂ عروج پر پہنچ گئی جس کے کھلے مظاہرے حجاج بن یوسف کی بیس سالہ حکومت کے دوران دکھائی دیتے رہے۔ مسلمانوں کے جائز اور محبوب خلیفہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اسی سفاک کی نذر ہوئے اور ان کی لاش کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے برتا گیا تھا۔

عبدالملک کے دور میں معاملات کی باگ ڈور پوری طرح ایک گھرانے کے ہاتھ میں آ چکی تھی اور حکمران کی اللہ اور بندوں کے سامنے جوابدہی کا وہ تصور جو خلافتِ راشدہ کا طرۂ امتیاز تھا، فراموش کر دیا گیا تھا؛ اس لیے خلافت پر شخصی حکمرانی کی چھاپ گہری ہوتی چلی گئی اور اس میں بادشاہت اور ملوکیت کے عجمی خدوخال واضح ہوتے چلے گئے۔

اہلِ بیت کے بارے میں بدکلامی:

اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی برائی عمالِ حکومت میں سیاسی تعصب کی پیدا ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے ایک طرف یزید، مروان اور عبدالملک کے فضائل ومناقب پر زور دیا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بنوامیہ کا حریف قرار دے کر ان پر بے محابا طعن وتشنیع کی جاتی تھی تاکہ لوگ اہلِ بیت اور سادات کرام کی

طرف مائل نہ ہوں۔ بعض اموی حکام سب وشتم کی اپنی ناپاک حرکت کے بارے میں خود یہ اعتراف کرتے تھے کہ ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ لوگ سادات کی جگہ ہمیں حکمرانی کا اہل سمجھیں۔ ایک بار مروان بن الحکم نے امام زین العابدین رحمہ اللہ سے کہا: ''ہمارے آقا (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا دفاع کرنے والا آپ کے آقا (حضرت علی رضی اللہ عنہ) سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔'' یہ سن کر امام زین العابدین رحمہ اللہ نے پوچھا: ''پھر تم کیوں انہیں منبروں پر ہدفِ طعن بناتے ہو؟'' مروان نے کہا: ''ہماری حکومت اس کے بغیر نہیں چلتی۔''①

یزید نے محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ کے سامنے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل پر جہاں اپنے رنج وغم کا اظہار کیا، وہیں یہ کہہ کر ان پر طعن بھی کیا: ''بے شک حسین نے مجھ پر ظلم کیا اور مجھ سے قطع رحمی کی۔'' ساتھ ہی یہ بھی کہا: ''میرا خیال ہے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم حسین کی عیب جوئی کرتے ہیں اور ان کی مذمت کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! ہم ایسا اس لیے نہیں کرتے کہ آپ (ساداتِ کرام) محبوب اور معزز نہ رہیں، بلکہ ہم تو لوگوں کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم ہرگز یہ برداشت نہیں کرتے کہ کوئی اس اقتدار میں ہم سے تنازعہ کرے جس کے لیے اللہ نے ہمیں چن لیا ہے اور یہ منصب ہمارے لیے خاص کر دیا ہے۔''②

یہی نہیں بلکہ بعض گستاخ حکام برملا لعنت ملامت کرتے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیتے تھے۔ چنانچہ مدینہ کے ایک مروانی حاکم نے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے فرمائش کی کہ وہ کم از کم حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعنت ہی کر دیں۔ (نعوذ باللہ) حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان کر کے اس حاکم کی توقع کو خاک میں ملا دیا۔③

بعض بدعات:

حکام سیاسی فوائد کے لیے بدعات ایجاد کرنے لگے تھے۔ وہ خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص کرتے تھے؛ اسی لیے بعض لوگ خطبے سے اٹھ کر چلے جاتے تھے۔ اس پر بعض حکام نے خطبے کو نمازِ عید سے قبل کرنے کی بدعت شروع کر دی تا کہ لوگوں کو خواہی نخواہی یہ سمع خراشی جھیلنا پڑے۔④ یہ تقاریر بعض اوقات اس قدر طویل ہوتیں کہ نمازوں کے قضا ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا۔⑤ حکام یہ چاہتے تھے کہ ان کی تقاریر میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں اور انہیں حکومتی کارگزاری اور خلفاء کی مدح وستائش دیر تک سنائی جائے۔ اگر کوئی بے چارا اُٹھ کر حاکم کو یاد دلا دیتا کہ نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے تو اسے عبرت ناک سزا دی جاتی تھی۔⑥ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے محدثین کی قوی اسناد سے متعدد مروانی حکام کی مثالیں دی ہیں جو خطبوں کو طویل کر کے نماز کو قضا ہونے کے قریب کر دیتے تھے لہٰذا مجمع میں موجود بعض صحابہ وتابعین اشاروں سے نمازیں ادا کرتے تھے؛ کیوں کہ اگر وہ قیام اور رکوع وسجود کے ساتھ نماز پڑھتے تو حکام اسے مخالفت تصور کر کے قتل یا قید وبند کی سزا دیتے تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اسی لیے حجاج کے پیچھے نماز ترک کر دی تھی۔⑦

---

① انساب الاشراف: ۱۸۳/۲، ط دار الفکر؛ تاریخ دمشق: ۴۳۸/۳۲

② انساب الاشراف: ۲۷۷/۳ ③ صحیح البخاری، ح: ۳۷۰۳؛ صحیح مسلم، ح: ۶۳۸۲، فضائل الصحابۃ

④ المبسوط للسرخسی: ۳۷/۲ ⑤ صحیح البخاری، ح: ۵۳۰، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب تضییع الصلوٰۃ عن وقتہا

⑥ مسند ابی یعلی: ۵۳۶/۲، ط دار المامون ... قال المحقق: رجالہ رجال الصحیح ⑦ فتح الباری: ۱۴/۲

مروان کا بیٹا بشر جو عراق کا حاکم تھا، سامعین کو متوجہ رکھنے کے لیے جمعہ وعیدین کے خطبے میں ہاتھوں کو خوب حرکت دیتا تھا۔ آخر ایک دن عمارہ بن رُؤیبہ رضی اللہ عنہ کو کہنا پڑا: ''اللہ ان ہاتھوں کا بُرا کرے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فقط انگشتِ شہادت سے اشارہ کرتے دیکھا تھا۔''①

بعض اُموی حکام اہلِ مدینہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں ملوث سمجھتے تھے؛ اس لیے اہلِ مدینہ سے انہیں ویسی محبت نہ تھی جو ایک مسلمان کے دل میں ہونی چاہیے، اس تعصب کا سرِ عام مظاہرہ اس طرح ہوتا تھا کہ مروان بن الحکم خطبے میں مکہ کے فضائل تو نقل کرتا مگر مدینہ اور اہلِ مدینہ کے فضائل کو قصداً بیان نہ کرتا، حالانکہ وہ عالم آدمی تھا۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے ایک بار اس حرکت پر ٹوکا تو کہنے لگا: ''ہاں (مدینہ کی فضیلت کے متعلق) کچھ سنا تو ہے۔''②

بیت المال سے وصول کیا جانے والا خرچ ضرورت کے درجے سے بڑھ کر عیش وتنعم کی حد میں داخل ہو چکا تھا۔ نصیحت کرنے والوں کو بعض اوقات جھڑکیاں سننا پڑتی تھیں۔ نامور محدث ابووائل رحمہ اللہ کچھ مدت تک عراق کے امیر عبیداللہ بن زیاد کے خزانچی رہے تھے۔ ایک بار ان کے پاس سرکاری کارندہ رقعہ لے کر آیا کہ باورچی خانے کے لیے آٹھ سو درہم دے دیے جائیں۔ ابووائل رحمہ اللہ عبیداللہ بن زیاد کے پاس گئے اور اسے سمجھایا کہ کھانے پینے پر اس قدر فضول خرچی نہیں ہونی چاہیے۔ عبیداللہ بن زیاد نے بگڑ کر انہیں اسی وقت ملازمت سے فارغ کر دیا۔③

شخصی حکومت کے تصورات نے حکام کی ذہنیت یہ بنادی تھی کہ لوگوں پر سرکار کی اطاعت فرضِ عین ہے اور جو ایسا نہ کرے اسے کڑی سے کڑی سزا دی جاسکتی ہے؛ اسی لیے حجاج بن یوسف کہا کرتا تھا:

''اللہ کی قسم! اگر میں لوگوں کو مسجد کے ایک دروازے سے نکلنے کا کہوں اور وہ دوسرے دروازے سے نکلیں تو میرے لیے ان کا خون بھی حلال ہے اور مال بھی۔''④

جاگیروں کی دوڑ، اقرباپروری اور عیش وتنعم:

شہزادوں اور امراء میں بڑی بڑی جاگیریں حاصل کرنے اور اس کے لیے جائز وناجائز کی پرواہ نہ کرنے کا رجحان بھی عام تھا۔ دباؤ اور اثر ورسوخ کی بناء پر کچھ حاصل کر لینا اور اپنوں کو بے جا نوازنا ایک عام سی بات تھی۔ رشوت ستانی کا مرض بھی سرکاری عمال میں پیدا ہو چکا تھا۔ حکمران خاندان کی املاک، جائیدادوں، دولت اور عیش وتنعم کے ساز و سامان میں بہت بڑا حصہ ایسا تھا جو ناجائز ذرائع پر مشتمل تھا اور جس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہ تھی۔

حکام کی زندگیوں کی ان خامیوں اور کمزوریوں کے اثرات پورے معاشرے پر پڑ رہے تھے؛ اس لیے عوام میں بھی خرابیاں اور بداعمالیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ یہ بُرائیاں عقائد سے لے کر اعمال اور مزاج تک کو محیط ہو رہی تھی۔

اگر مجموعی طور پر ان تمام خرابیوں کا خلاصہ نکالا جائے تو پانچ چیزیں ہوں گی:

---

① صحیح مسلم، ح: ۲۰۵۳، کتاب الجمعۃ، باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ ② صحیح مسلم، ح: ۳۳۸۲، باب فضل المدینۃ
③ سیر اعلام النبلاء: ۱۶۶/۴ ④ سنن ابی داؤد، ح: ۴۶۴۵، بسند صحیح

① سیاسی نظام کا شورائیت پر استوار نہ ہونا ② بدعنوانی ③ مظالم
④ اخلاقی واعتقادی کمزوریاں ⑤ بدعات اور گناہوں کا بڑھتا ہوا رجحان

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مسندِ خلافت سنبھالتے ہی ان تمام مفاسد سے نمٹنے کے لیے کمر کس لی۔

❁❁❁

اصلاحات اور احتساب

آپ رحمہ اللہ نے اصلاح کا کام سب سے پہلے اپنی ذات اور اپنے گھر سے شروع کیا۔ وہ تمام شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ ختم کر دیے جو پہلے حکمرانوں نے عجمی بادشاہوں سے متاثر ہو کر شروع کر دیے تھے۔ اس کی جگہ وہ سادہ اور فقیرانہ رہن سہن اختیار کیا جو خلفائے راشدین کا تھا۔ اس وقت آپ کی موروثی جاگیریں بہت بڑی تھیں جن کی سالانہ آمدن ۴۰ ہزار دینار تھی، آپ رحمہ اللہ نے یک لخت اپنی وہ تمام جائیدادیں اور جاگیریں واپس کر دیں جو مشکوک طریقے سے وراثت میں ملی تھیں۔ صرف چار سو دینار سالانہ آمدن کی وہ مختصر سی جائیداد اپنے پاس رہنے دی جو کسی شک وشبہ سے پاک تھی۔ اپنی اہلیہ کے زیورات اور زر وجواہر بھی بیت المال میں داخل کر دیے۔ عیش وتعیش کا اپنا ذاتی سامان، قالین، پردے، قیمتی لباس، عطریات اور غلام تک فروخت کر کے قیمت بیت المال میں جمع کرا دی۔ ①

پھر آپ رحمہ اللہ نے اہلِ خاندان کو جمع کر کے اعلان کیا کہ ناجائز یا مشکوک ذرائع سے حاصل کردہ ہر جاگیر واپس کی جائے گی اور اُمت کی دولت اسے لوٹائی جائے گی۔ خاندان کے لوگوں کی برہمی کے باوجود آپ نے یہ کر کے دکھایا اور اپنی اور اپنے خاندان کی تمام مشکوک جائیدادیں واپس کر دیں۔ ②

اس کے بعد آپؒ دوسرے امراء کے احتساب کی طرف متوجہ ہوئے اور اعلان کیا کہ حکمران خاندان کے کسی بھی فرد کے خلاف کسی کا کوئی دعویٰ ہو تو وہ اسے پیش کرے۔ بہت سے لوگوں نے حاضر ہو کر مختلف حکام، امراء اور شہزادوں کے خلاف دعویٰ ثابت کر دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا بھی لحاظ نہ کیا۔ دوسرے شہروں کے حکام کے نام تاکیدی احکام بھیج کر ہر جگہ غصب شدہ املاک اور چیزیں حق داروں کو واپس دلوانا شروع کر دیں۔ ③

فدک کا مسئلہ:

فدک کی زمین کا مسئلہ بھی آپ نے بڑی اہمیت سے حل کیا۔ اس زمین کی آمدن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان کی ضروریات میں خرچ کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفائے راشدین نے اس شرعی حکم کے تحت کہ انبیائے کرام کے ترکے میں وراثت جاری نہیں ہو سکتی، فدک کو اہلِ بیت میں تقسیم نہ فرمایا بلکہ سرکاری زمین قرار دے کر اس

① سنن ابی داؤد، ح: ۲۹۷۲، کتاب الخراج، باب فی صفایا؛ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۵۸؛ اخبار ابی حفص، ص ۵۷
② سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی، ص ۱۲۷ ③ طبقات ابن سعد: ۲۵۲/۵

کا اختیار اپنے پاس رکھا، تاہم اس کی آمدن اسی طرح خاندانِ نبوت پر خرچ فرماتے رہے مگر مروان بن حکم نے اپنے دور میں فدک کو اپنی ملکیت بنالیا۔ پھر یہ زمین وراثت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حصے میں آگئی۔ آپ رحمہ اللہ نے فدک کی سابقہ حیثیت بحال کردی اور اس کی آمدن دورِ خلافتِ راشدہ کی طرح بنوہاشم کے لیے مخصوص کردی۔ ①

خاندان کا دباؤ مسترد:

مروانی شہزادے اس صورتحال سے بڑے پریشان تھے۔ انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی پھوپھی فاطمہ بنت مروان کو ان کے پاس بھیجا جن کا وہ بڑا احترام کرتے تھے۔ پھوپھی نے کہا: ''اہلِ خاندان تمہارے خلاف باتیں کررہے ہیں۔ ڈر ہے کہ کسی دن تمہارے خلاف اٹھ کھڑے نہ ہوں۔'' آپؒ نے فرمایا: ''قیامت سے بڑھ کر کسی اور چیز سے ڈروں تو اللہ کرے اس چیز سے محفوظ نہ رہوں۔'' پھوپھی یہ سن کر واپس لوٹ گئیں اور کنبے والوں سے کہا:

''یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے خاندان سے لڑکی بیاہ لائے تو لڑکا اپنے نانا پر چلا گیا۔'' ②

پکڑ دھکڑ کی سیاست کا خاتمہ:

بنومروان کے دور میں حکومت مخالف سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے شک کی بنیاد پر لوگوں کو پکڑنا، زدوکوب کرنا اور ماورائے قانون قتل کردینا حاکم کا حق سمجھا جاتا تھا۔ آپؒ نے اس طرزِ عمل کو بالکل تبدیل کردیا۔ سخت گیر افسران کو معزول کرکے نیک، متقی اور ہمدرد افراد کا تقرر کیا۔ تاکیدی احکام بھیجے کہ کسی مسلم یا غیر مسلم شہری کو شک کی بنیاد پر گرفتار یا زدوکوب نہ کیا جائے۔ کسی کو قتل کرنے یا ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا مجھ سے پوچھے بغیر نہ دی جائے۔ ③

سزاؤں میں احتیاط اور نرمی:

موصل میں ایک امیر یحییٰ غسانی کی تقرری ہوئی۔ اس شہر میں چوروں اور ڈاکوؤں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ امراء کی عام ذہنیت کے مطابق یحییٰ غسانی کا بھی یہی خیال تھا کہ جب تک لوگوں کو شک کی بنیاد پر گرفتار نہیں کیا جائے گا، یہ وارداتیں بند نہیں ہوسکتیں۔ اس نے بذریعۂ مراسلہ آپؒ سے دریافت کیا: ''کیا میں لوگوں کو شبے کی بنیاد پر گرفتار اور الزام کی بنیاد پر زدوکوب کرسکتا ہوں؟ یا صرف ثبوت کی بنیاد پر انہیں پکڑوں اور سنت کے مطابق معاملہ کروں؟''

آپ رحمہ اللہ نے جواب میں لکھا: ''صرف شرعی ثبوت ملنے پر سنت کے مطابق کارروائی کرو۔ اگر شرعی قانون کی پیروی سے لوگوں کی اصلاح نہیں ہوتی تو اللہ ان کی اصلاح نہ کرے۔'' اس ہدایت پر عمل کرنے سے موصل میں ایسا امن قائم ہوا کہ وہاں چوری اور نقب زنی کی وارداتیں پورے ملک میں سب سے کم شرح پر آگئیں۔ ④

ایک بار خراسان کے والی نے لکھا: ''یہاں کے لوگوں کا رویہ بہت بگڑا ہوا ہے۔ انہیں تلوار اور کوڑے کے سوا کوئی

---

① وانی اشهد كم انی رددتها علی ما كانت يعنی علی عهد رسول الله ﷺ وابی بكر وعمر۔ (سنن ابی داؤد، ح: ۲۹۷۲، كتاب الخراج؛ مشكوٰة المصابيح، ح: ۴۰۶۳، باب الفئ، الفصل الثالث؛ سيرة عمر بن عبدالعزيز لابن عبدالحكم، ص ۵۸)

② سيرة عمر بن عبدالعزيز لابن جوزی، ص ۱۱۷؛ البداية والنهاية: سنة ۱۰۱ھ

③ تاريخ الطبری: ۲۸۳/۴ ④ انساب الاشراف: ۱۴۷/۸

چیز درست نہیں کر سکتی۔ اگر امیر المؤمنین مناسب سمجھیں تو اس کی اجازت دے دیں۔''

آپ رحمہ اللہ نے جواب میں لکھا: ''تمہارا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ان لوگوں کو تلوار اور کوڑے کے سوا کوئی چیز صحیح نہیں کر سکتی۔ ان کو عدل وانصاف اور حق کی ادائیگی درست کر سکتی ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس کو عام کرو۔''①

ظالم افسران کا محاسبہ اور مؤاخذہ:

آپ رحمہ اللہ نے ان تمام افسران کا کڑا احتساب کیا جن سے عوام تنگ آئے ہوئے تھے۔ حجاج بن یوسف کے خاندان ''بنو عقیل'' کو جس کے افسران سخت گیری میں مشہور تھے، عراق سے جلاوطن کر کے یمن بھیج دیا۔②

خالد بن ریان، خلیفہ ولید کا مصاحب خاص تھا۔ پوری مملکت پر اس کا دبدبہ طاری تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اسے معزول کر کے دعا کی: ''الٰہی! میں نے اسے گرایا ہے، تو اسے اٹھنے نہ دے۔'' اس کے بعد وہ بالکل گم نام ہو گیا۔③

عوام سے رابطہ:

آپ رحمہ اللہ نے عوام پر چھائی سرکاری ہیبت دور کر کے حکام تک ان کی رسائی کو آسان بنایا۔ ہر صوبے کے حکام کو خطوط لکھے کہ عوام کو اپنے تک پہنچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جائیں۔ افسران کی شکایات پہنچانے یا حکومت کو اچھی تجاویز دینے کی حوصلہ افزائی کی۔ ہر سال حج کے موقع پر اعلان کیا جاتا کہ جو شخص کسی حاکم کے ظلم کی اطلاع یا کوئی اچھا مشورہ دے گا اسے ایک سو سے تین سو دینار تک انعام دیا جائے گا۔④

آپ رحمہ اللہ متوسط طبقے کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے۔ شہروں کے مرکزی حکام کا تقرر آپ خود فرماتے تھے اور انہیں حکم دیتے تھے کہ اپنے افسروں اور مشیروں کا انتخاب متوسط طبقے سے کریں۔ آپ فرماتے تھے:

''یہ بہترین لوگ ہیں۔ حق کا دامن نہیں چھوڑتے اور باطل کی طرف مائل نہیں ہوتے۔''⑤

ٹیکس معاف:

آپؒ کی سیرت وکردار اور ان کے نائبین کے اخلاق سے متاثر ہو کر غیر مسلم شہری (ذمی) بڑی تعداد میں مسلمان ہونے لگے تھے۔ ان پر عائد شرعی ٹیکس ''جزیہ'' حکومت کی آمدن کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ ذمیوں کی تعداد کم ہونے سے جزیے کی شرح بھی تیزی سے گھٹنے لگی جس پر بعض صوبوں کے اُمراء کو تشویش تھی مگر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس پر خوش تھے۔ ایک حاکم نے سرکاری خزانہ خالی ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا تو آپ نے جواب دیا: ''مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیہ کی رقم بند ہو جانے کی وجہ سے) ہم اور تم کھیتوں میں ہل چلا کر اپنا پیٹ بھریں۔''⑥

---

① سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۰۶ ② سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی، ص ۱۰۹

③ سیرۃ عمر لابن عبدالحکم، ص ۳۰

④ سیرۃ عمر لابن عبدالحکم، ص ۱۲۱، ۱۲۲؛ سیرۃ عمر لابن جوزی، ص ۹۰ (یعنی تیس ہزار سے نوے ہزار ڈالر سے زائد رقم بنتی ہے)

⑤ سیرۃ عمر لابن عبدالحکم، ص ۱۳۶

⑥ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی، ص ۱۱۹، ۱۲۰؛ حلیۃ الاولیاء: ۵/۳۰۵ ط السعادۃ

یمن کے غیر مسلموں سے خراج کی ایک مقدار طے چلی آرہی تھی چاہے فصل زیادہ ہوتی یا کم۔ آپ کو معلوم ہوا تو اس سے منع کر کے حکم دیا کہ فصل کے لحاظ سے خراج عائد کیا جائے۔ اگر پورے یمن سے ایک مٹھی اناج وصول ہو تو میں اس پر راضی ہوں۔ ① آپؒ فرماتے تھے: ”حضرت محمد ﷺ ہادی و رہنما بنا کر بھیجے گئے تھے نہ کہ ٹیکس وصول کرنے والے۔“ ②

آپؒ نے شرعی محاصل کے سوا گزشتہ دور میں رائج ٹیکسوں کی تمام اقسام موقوف کر دیں، بری اور بحری تجارت کو آزاد کر دیا، کسٹم ڈیوٹی معاف کر دی اور ہر طرح کی پابندیاں اٹھا دیں۔ ③ گزشتہ مروانی خلفاء کے دور میں شاہراہوں پر چنگی خانے قائم تھے اور تجارتی قافلوں سے ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے تمام چنگی خانے ختم کر دیے۔ فلسطین کے ساحل پر بحری تجارت سے ٹیکس وصول کرنے والا ایک بڑا چنگی خانہ تھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے فلسطین کے حاکم کو حکم دیا کہ اپنے ہاں کے چنگی خانے کو مسمار کر دو اور اس کی باقیات سمندر میں غرق کر دو۔ ④

حکمران خاندان کے تجارت میں حصہ لینے پر پابندی:

بنو مروان کے بہت سے لوگ تجارت میں سرمایہ لگا کر ہر طرف چھا رہے تھے۔ بظاہر یہ ناجائز کام نہ تھا مگر آپ نے اس پر پابندی عائد کر دی، ⑤ کیوں کہ تاجر حکام عموماً خود غرض ہوتے ہیں اور عوامی مفاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

خطبوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعن طعن کی بندش:

بنو مروان کے بعض حکام جمعہ و عیدین کے خطبوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعن طعن کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس پر سختی سے پابندی عائد کر دی ⑥ اور اس کی جگہ یہ آیت کریمہ پڑھنے کا رواج ڈالا: ⑦

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝

(بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم فرماتے ہیں اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں۔) ⑧

علوم کی اشاعت و حفاظت:

آپؒ علم دین کی اشاعت کا زبردست ولولہ رکھتے تھے۔ اس زمانے تک حدیث کو لکھ کر جمع کرنے کا رواج کم تھا اور اکثر محدثین حافظے پر اعتماد کرتے تھے۔ آپؒ نے یہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہ شاید اگلی نسلوں کے حافظے اتنے قوی نہ ہوں، محدثین اور علماء کو تاکید کی کہ وہ احادیث کو تحریری طور پر جمع کریں۔ محدث ابوبکر بن حزمؒ کو آپ نے مدینہ کا والی مقرر کیا تھا۔ انہیں اور ابن شہاب زہریؒ کو خاص طور پر اس عظیم علمی خدمت کی طرف متوجہ کیا اور لکھا

---

① سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۰۸ ② کتاب الخراج لامام ابو یوسف، ص ۱۴۴، ط المکتبۃ الازہریۃ

③ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۴۱، ۸۳ ④ طبقات ابن سعد: ۵/۲۹۲؛ سیرۃ عمر لابن جوزی، ص ۱۱۳

⑤ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۸۷ ⑥ طبقات ابن سعد: ۵/۲۹۳

⑦ العاشر من مشیخۃ البغدادیۃ لابی طاہر السلفی، ص ۶۲ ⑧ سورۃ النحل، آیت: ۹۰

کہ اگر ایسا نہ ہوا تو مجھے خدشہ ہے کہ علماء کی اس نسل کے ختم ہوتے ہی سنتِ نبویہ بھی دنیا سے مٹ جائے۔ ①

آپؒ نے "سیرتِ نبویہ" کو ایک مستقل علم کی شکل میں مدون کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس دور میں سیرت کو "علم مغازی" کہا جاتا تھا جس کے سب سے بڑے ماہر عاصم بن عمر بن قتادہ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپؒ کے حکم سے انہوں نے دمشق کی جامع اموی میں مغازی، سیرتِ نبویہ اور مناقبِ صحابہ کا درس دینا شروع کیا۔ ②

دین کی دعوت:

دین کی دعوت کو آپ رحمۃ اللہ علیہ خلافتِ اسلامیہ کی اہم ذمہ داری سمجھتے تھے؛ اس لیے آپ رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں اندرونی طور پر اسلام کا عملی نفاذ کیا، وہاں بیرونی دنیا کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ ہندوستان کے سات راجاؤں کو آپ کی طرف سے دعوتی خطوط گئے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کی ترغیب دینے کے ساتھ ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو انہی کو ان کی سلطنتوں پر حکمران باقی رکھا جائے گا اور ان کے حقوق اور فرائض وہی ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کے ہیں۔ ان راجاؤں کو آپؒ کی سیرت کی خبریں مل چکی تھیں؛ اس لیے ان سب نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے نام عربوں جیسے رکھ لیے۔ اسی طرح آپؒ کی دعوت پر حبشہ میں بھی قبائل مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ③

مراکش میں بربر قبائل کی بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ آپؒ کے نائب اسماعیل بن عبداللہ نے وہاں بڑے عدل وانصاف کا مظاہرہ کیا جس سے بربر قبائل بہت متاثر ہوئے۔ اسماعیل بن عبداللہ انہیں اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے سرداروں کے نام خود ایک مراسلہ لکھ کر دعوتِ اسلام دی۔ اس کے نتیجے میں وہاں بربر قبائل جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ④

وسطِ ایشیا میں مسلمان فتوحات حاصل کر چکے تھے مگر وہاں اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں کے قبائلی عمائد کو بھی دعوتی خطوط لکھے۔ جو لوگ اسلام لائے ان کا خراج معاف کر دیا گیا۔ ⑤

❁❁❁

خلیفہ کی سادہ اور زاہدانہ زندگی

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفہ بننے کے بعد ذاتی زندگی میں اس قدر زہد و قناعت اور سادگی اختیار کی جس کی مثال دوسرے حکمرانوں میں تو کجا، فقیروں اور درویشوں کے ہاں ملنا بھی مشکل ہے۔

ایک دن آپ رحمۃ اللہ علیہ گھر تشریف لائے تو آپ کی بچیاں منہ پر ہاتھ رکھ کر آپ سے بات کرنے لگیں۔ پوچھا تو

---

① صحیح البخاری، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم؛ جامع بیان العلم لابن عبدالبر، ح: ۲۳۸

② تهذیب التهذیب: ۵/۵۳، ۵۴، ترجمة: عاصم بن عمر

③ فتوح البلدان، ص ۴۲۵

④ فتوح البلدان، ص ۲۲۸، ۲۲۹ ⑤ فتوح البلدان، ص ۴۱۱

معلوم ہوا کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا، سب نے کچے پیاز کھا کر گزارا کیا ہے۔ آپؒ نے یہ دیکھ کر روتے ہوئے فرمایا:

''میری بیٹیو! کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تم اچھے اچھے کھانے کھایا کرو مگر تمہارا باپ جہنم میں جائے۔''

آپ رحمۃ اللہ علیہ کے کھانے پینے کا معمول بہت سادہ تھا۔ گھر والے جو میسر ہوتا، پکا کر ایک برتن میں ڈھانک کر رکھ دیتے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے کاموں سے فراغت کے لیے درمیان میں کچھ وقت ملتا تو آ کر نوش فرما لیتے۔ ①

لباس میں سادگی:

لباس میں اس قدر سادگی تھی کہ جو مل جاتا پہن لیتے۔ بصرہ کے ایک پارچہ فروش ریاح بن عبیدہ کا بیان ہے کہ میں ان کے لیے کپڑا لایا کرتا تھا۔ جب وہ شہزادے تھے اور مدینہ میں قیام پذیر تھے تو میں ان کے لیے دس دینار کا بہترین ریشمی جبہ لے کر آیا۔ وہ اس پر ہاتھ پھیر کر بولے: ''مجھے یہ کھردرا لگتا ہے!'' پھر جب وہ خلیفہ بن گئے تو انہوں نے مجھ سے ایک ادنی جبہ منگوایا جس کی قیمت ایک دینار تھی اور اسے ٹٹول کر کہا: ''واہ! یہ کتنا نرم ہے۔''

میں نے کہا: ''عجیب بات ہے۔ کل آپ کو عمدہ ریشم بھی کھردری لگتی تھی اور آج اون نرم لگ رہا ہے۔''

فرمانے لگے: ''وہ بھی ایک حالت تھی اور یہ بھی ایک حالت ہے۔'' ②

اپنے کام اپنے ہاتھ سے:

چھوٹے چھوٹے کام بلا تکلف خود ہی کر لیتے تھے۔ ایک رات آپ کام کر رہے تھے کہ چراغ گل ہو گیا۔ آپؒ اٹھے اور اسے دوبارہ جلانے لگے۔ کسی نے کہا: ''آپ نے کیوں زحمت کی، ہم کر دیتے۔''

آپ نے فرمایا: ''جب میں اٹھا تھا تب بھی عمر بن عبدالعزیز تھا۔ جب بیٹھا ہوں تب بھی وہی ہوں۔'' ③

سرکاری اخراجات میں احتیاط:

احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بیت المال کی رقم سے خریدی گئی شمع صرف سرکاری کاموں ہی کے وقت جلائی جاتی۔ اگر کبھی سرکاری گفتگو کے دوران کوئی شخص ذاتی موضوعات پر بات کرنے لگتا تو آپ سرکاری شمع گل کر کے فوراً ذاتی شمع جلاتے، پھر اس سے بات چیت کرتے۔ ④ آپ رحمۃ اللہ علیہ کا غلام کئی دنوں تک بیت المال کے باورچی خانے سے وضو کا پانی گرم کر کے لاتا رہا۔ آپ کو معلوم ہوا تو مزاحم سے کہا: ''اتنی مقدار پانی گرم کر کے دیکھو کہ کتنا ایندھن خرچ ہوتا ہے۔ پھر اندازہ لگاؤ کہ ان تمام دنوں میں کتنا ایندھن خرچ ہوا ہوگا۔ اتنا ایندھن خرید کے بیت المال میں جمع کرا دو۔'' ⑤

دوسروں کو زہد و قناعت کا سبق:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا سالا مَسلَمَہ بن عبدالملک کھانے پینے میں بڑا فضول خرچ تھا۔ آپؒ نے اس کی

---

① سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۴۳، ۵۴

② المعرفۃ والتاریخ: ۱/ ۵۶۹ ③ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۴۴

④ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۳۷ ⑤ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۴۵

اصلاح کرنے کے لیے ایک دن اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ وہ آیا تو آپؒ نے جان بوجھ کر کھانا بہت دیر سے منگوایا۔ کھانا آیا تو وہ صرف دال روٹی پر مشتمل تھا۔ تب تک بھوک سے مُسلِمَہ کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اُس نے تیز بھوک کی وجہ سے خوب رغبت سے کھایا۔ جب وہ سیر ہو گیا تو آپؒ نے خصوصی لذیذ کھانے منگوائے۔ مُسلِمَہ نے انہیں دیکھ کر کہا: ''اب تو ایک لقمے کی گنجائش بھی نہیں۔'' آپؒ نے فرمایا: ''جب پیٹ اس طرح بھی بھر سکتا ہے تو پھر کھانے میں ایسے تکلفات کر کے جہنم میں جانے کی کیا ضرورت۔'' مُسلِمَہ کو بات سمجھ آگئی اور اس نے اپنی اصلاح کر لی۔ ①

فکر مندی کی انتہاء:

گھر میں آپؒ کی فکر اور کڑھن کا کیا حال ہوتا تھا! آپؒ کی اہلیہ فرماتی ہیں کہ میں ان کے کمرے میں گئی تو دیکھا مصلے پر بیٹھے رو رہے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا:

''میں نے امتِ محمدیہ کے معاملات اپنے ذمہ لے لیے۔ سوچتا ہوں کوئی بھوکا فقیر ہے، کوئی بے سہارا مریض ہے، کوئی مظلوم و مجبور ہے، کوئی مجاہد ہے، کوئی بے وطن قیدی ہے، کوئی بوڑھا ضعیف اور کوئی عیال دار مفلس ہے۔ میرا رب قیامت کے دن پوچھے گا کہ مَیں نے ان کے لیے کیا کیا؟ حضرت محمد ﷺ میرے مقابل مدعی ہوں گے۔ ڈر ہے کہ مقدمہ میرے خلاف ثابت نہ ہو۔ پس خود پر ترس کھا کر رو رہا ہوں۔'' ②

آخری ایام اور بنو مروان کی مخالفت

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ایک گلے بندھے نظام کے اندر سربراہِ حکومت بنے تھے۔ اس نظام کو توڑنا ان کے بس میں نہ تھا؛ کیوں کہ اموی شہزادوں کی طرف سے بغاوت کا خدشہ تھا۔ ③ ایک بار کچھ شہزادوں نے آپ کے اصلاحی اقدامات پر تنقید کی تو آپؒ نے غصے میں آ کر کہا: ''بنو مروان کو ذبح ہونا ہوگا۔ اور یہ ذبح میرے ہاتھ سے ہوگا۔'' ④

''بنو مروان کے ذبح'' سے آپ کی مراد یہ تھی کہ خلافت کو بنو مروان سے نکال کر مسلمانوں کی شوریٰ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ایک بار بنو مروان جمع ہو کر آپ پر طعنہ زنی کرنے لگے تو آپ نے یہ بات کھل کر کہہ دی اور فرمایا:

''اللہ کی قسم! اگر تم لوگ دوبارہ اس طرح جمع ہوئے تو میں اپنی سواری لے کر سیدھا مدینہ منورہ چلا جاؤں گا اور خلافت کو شوریٰ کے حوالے کر دوں گا۔ سربراہی کا اہل شخص میری نظر میں ہے یعنی قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق۔'' ⑤

اہلِ خاندان کے رویے کو دیکھ کر ایک دن خطبہ جمعہ میں آپؒ نے دعا فرمائی: ''الٰہی! میں ان سے اکتا گیا ہوں اور یہ لوگ مجھ سے۔ تو مجھے ان سے راحت دے دے اور انہیں مجھ سے۔'' اس کے بعد آپ کو اگلا جمعہ نصیب نہ ہوا۔ ⑥

---

① سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۴۹

② الکامل فی التاریخ: ۳/۱۱۹

③ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۵۷ ④ طبقات ابن سعد: ۵/۳۴۴، ط صادر

⑤ طبقات ابن سعد: ۵/۳۴۳، ط صادر ⑥ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۹۹

خوارج سے مناظرہ اور آپ کی طلبِ مہلت:

آپ رحمہ اللہ کی وفات سے کچھ دن پہلے عراق میں بُسطام نامی ایک خارجی نے جو ”شَوذَب“ کے لقب سے مشہور تھا، مٹھی بھر آدمی جمع کر کے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ آپؒ نے اسے مذاکرات کی دعوت دی۔ بُسطام نے دو نمائندے بھیج دیے۔ آپ نے نصوصِ شرعیہ اور تاریخ و آثار کی روشنی میں ان سے گفتگو کی۔ وہ لاجواب ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے اپنے نظریے سے توبہ کر لی۔ دوسرے نے کہا: ”میں اپنی قوم کے پاس جا کر ان کی رائے لے لوں۔“ آخر میں انہوں نے کہا: ”آپ اپنے بعد یزید بن عبدالملک کو خلیفہ کے طور پر برقرار رکھ رہے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟“ آپؒ نے فرمایا: ”یہ میری نہیں، سلیمان کی طرف سے طے شدہ بات ہے۔“ انہوں نے کہا: ”اگر آپ کو کوئی امانت سونپی جائے اور آپ وہ کسی نااہل کے پاس رکھوا دیں تو کیا آپ امانت کا حق ادا کرنے والے شمار ہوں گے؟“ آپ سوچ میں پڑ گئے اور فرمایا: ”اچھا مجھے تین دن کی مہلت دے دو۔“ خوارج کو رخصت کر کے آپ بار بار کہتے رہے:

”یزید کے معاملے نے مجھے ہلاک کر ڈالا۔ اس (خارجی) کی دلیل سے میں ہار گیا۔ أَسْتَغْفِرُ اللهَ۔“ ①

سانحۂ وفات:

آپ ملوکیت سے مشابہ خلافت کو حقیقی شورائی خلافت میں ڈھالنے کے لیے سوچ رہے تھے کہ اچانک بیمار پڑ گئے اور چند دن بعد آپ کی وفات ہو گئی۔ یہ واقعہ ۲۰ رجب ۱۰۱ھ کا ہے۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔

ایک رائے یہ ہے کہ بیماری طبعی تھی۔ فکرِ آخرت اور خشیتِ الٰہیہ سے آپ کی جان گھل گئی تھی۔ ② دوسری رائے یہ ہے کہ آپ کو خاندان والوں نے زہر دیا تھا تاکہ خلافت خاندان سے باہر جانے کی نوبت نہ آئے۔ ③

جس طرح یہ قضیہ دبا دیا گیا اور کوئی تفتیش نہیں کی گئی اور جس طرح بنو مروان آپ سے نالاں تھے، اس سے اس جرم میں ان کے ملوث ہونے کا امکان پختہ ہو جاتا ہے۔

آخری لمحات اور وصیت:

وقتِ رحلت قریب دیکھ کر آپؒ نے ولی عہد یزید بن عبدالملک کے نام وصیت نامہ لکھوایا جس میں اسے تاکید کی:

”تمہیں تقویٰ اختیار کرنا چاہیے اور رعایا کا خیال رکھنا چاہیے۔ میری طرح تم بھی تھوڑے ہی دن زندہ رہو گے۔ یہاں تک کہ اس ذات سے جا ملو گے جو باریک بین اور خبردار ہے۔ غفلت میں کوئی ایسی لغزش ہونے سے بچتے رہنا جس کی تم تلافی نہ کر سکو۔“ ④

---

① تاریخ الطبری: ۵۵۶/۶؛ الکامل فی التاریخ: ۱۰۳/۴؛ سنۃ ۱۰۰ھ؛ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۱۲ تا ۱۱۵

② حلیۃ الاولیاء: ۳۴۳/۵

③ تاریخ الطبری: ۵۵۶/۶

④ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۱۰۷؛ سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی، ص ۳۱۸

اصلاحات کا معاشرے پر اثر

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اصلاحات سے بظاہر ایسا لگتا تھا کہ خزانہ خالی، حکومتی گرفت کمزور اور سربراہ کا رعب ودبدبہ زائل ہوجائے گا مگر ہوا اس کے برعکس۔ آپؒ کی اصلاحات کے اثرات پہلے ہی سال دکھائی دینے لگے۔

اندرونی شورشیں ختم:

پورے ملک میں کہیں اندرونی شورشوں کا نام ونشان نہ رہا۔ خوارج جو گزشتہ نصف صدی سے پورے عالم اسلام کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے تھے، آپؒ کا طرزِ سیاست دیکھ کر جمع ہوئے اور طے کیا کہ اس حکمران سے لڑنا ہمارے لیے کسی بھی طور پر جائز نہیں۔ ①

زکوٰۃ کے حق دار نایاب ہوگئے:

لوگ اتنے خوشحال ہوئے کہ دو سال کے اندر غریب لوگ متوسط طبقے میں شامل ہوگئے۔ یحییٰ بن سعید کو افریقہ کا حاکم مقرر کیا گیا (جو دنیا کا سب سے غریب براعظم شمار ہوتا آیا ہے)۔ یحییٰ بن سعید زکوٰۃ وصول کرنے کے بعد جب مستحق افراد کی تلاش میں نکلے تو ایک فرد بھی نہ ملا۔ آخر انہوں نے زکوٰۃ کی رقم سے غلام خرید خرید کر آزاد کیے۔ ②

لوگوں کے مزاج اور رجحانات میں تبدیلی:

لوگوں کے رجحانات اور انداز واطوار بھی بدلنے لگے۔ اس دور کا ایک راوی کہتا ہے کہ ولید کے زمانے میں لوگ جمع ہوتے تو عمارتوں اور طرزِ تعمیر کا ذکر ہوتا تھا؛ کیوں کہ ولید تعمیراتی کاموں کا شوقین تھا۔ سلیمان کے زمانے میں لوگوں کی مجالس میں کھانے پینے، لذتوں اور باندیوں کی باتیں ہوتیں کہ سلیمان ان نعمتوں سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہونے کا قائل تھا۔ مگر عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں نیکی، عبادت، تقویٰ اور خیر کے کاموں کا ذکر زیادہ ہوتا۔ جہاں کچھ لوگ جمع ہوتے تو آپس میں پوچھتے: ”تم نے کل کتنی تلاوت کی۔ قرآن مجید کب ختم کروگے۔ روزے کتنے رکھے۔“ ③

سرکاری آمدن میں اضافہ ہوگیا:

عجیب بات یہ ہے کہ ناجائز اور مشکوک ذرائع آمدن پر پابندی عائد کرنے اور عوام کی فلاح وبہبود پر بے دریغ خرچ کرنے کے باوجود سرکاری خزانے میں رقم کم نہیں ہوئی بلکہ بعض صوبوں میں آمدن پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی۔ عراق کی محصولات کی مقدار حجاج بن یوسف کے دور کے مقابلے میں چار گنا زیادہ ہوچکی تھی؛ اس لیے آپ فرمایا کرتے تھے: ”حجاج کو دین کا سلیقہ تھا نہ دنیا کا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں عراق کا خراج بارہ کروڑ اسی لاکھ تھا مگر حجاج اپنے مظالم کے باوجود عراق سے دو کروڑ اسی لاکھ سے زیادہ وصول نہ کرسکا اور میرے زمانے میں کسی ظلم وزیادتی کے بغیر یہ

---

① اخبار ابی حفص، ص ۶۲، ۶۳

② سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم، ص ۲۵ ③ تاریخ الطبری: ۳۹۷/۶؛ تجارب الامم لابن مسکویہ: ۳۲۲/۲

رقم بارہ کروڑ چالیس لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔"[1]

عمر بن عبدالعزیز کی محبوبیت ومقبولیت، ایک لمحۂ فکریہ:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا کمال یہ تھا کہ ان کے عدل اور نیک سیرتی نے اندرونِ ملک شیعانِ علی، ناصبیوں اور خارجیوں سمیت تمام گروہی اختلافات کو مٹا ڈالا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب مسلمان بھائی بھائی دکھائی دینے لگے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز سب کے محبوب اور سب کے نزدیک مقبول تھے۔

آج بھی عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حسنِ کردار کی سبھی گواہی دیتے ہیں اور سبھی ان کا ادب واحترام کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ غیر مسلم بھی ان کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ لمحۂ فکریہ ہے کہ آخر اسلامی احکام واقدار کے مکمل پابند انسانوں کو اتنی عزت کیسے نصیب ہوتی ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین اور حضرت علی المرتضیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو غیر جانب دار غیر مسلم مؤرخین بھی خراجِ عقیدت کیوں پیش کرتے ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات حقیقی اور پختہ مسلمان تھے جبکہ ہم نام کے مسلمان ہیں، لہٰذا غیر تو کیا، اپنے بھی ہم سے تنگ ہیں۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بعد:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اپنی زندگی میں بھی خاندانِ بنوامیہ میں نہایت ممتاز اور نیک نام تھے اور وفات کے بعد قابلِ احترام رہے۔ ان کے بعد بنومروان کے جتنے بھی حکمران آئے، وہ اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ اس خانوادے میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتی جلتی ایک مثال پیدا ہوئی۔ تاہم بعد کے مروانی حکمران عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نقشِ راہ پر قدم بقدم نہ چلے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا تعلق رعایا کے ساتھ ایسا تھا جیسے شفیق باپ کا بیٹے کے متعلق۔ مگر بنومروان کے دیگر عمائد میں رعایا کے لیے جذبۂ خیر خواہی اور ایثار وقربانی کا ولولہ ایسا نہ تھا۔

❀❀❀

[1] روضة الأخبار المنتخب من ربيع الابرار، ص ۷۹؛ معجم البلدان: ۳/ ۲۷۳؛ المنتظم لابن الجوزي: ۳/ ۲۱۰

مشق

سوالات کے جوابات دیجئے:

① سلیمان بن عبدالملک کے دور میں کونسے نامور فاتحین کو معزول کیا گیا؟ ان کی معزولی کے اسباب وعلل کیا تھے؟
② سلیمان بن عبدالملک کو "مفتاح الخیر" کیوں کہا جاتا تھا؟
③ سلیمان بن عبدالملک کے دور میں قُسطَنطِینیّہ کی مہم کی مختصر رُوداد بیان کر کے بتائیے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟
④ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی زندگی میں انقلاب کیسے آیا؟
⑤ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے خلیفہ بن کر سب سے پہلے کیا اقدامات کیے؟
⑥ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے قبل رائج ہونے والی حکومتی اور معاشرتی خرابیوں پر نوٹ لکھیے۔
⑦ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں اسلام کی دعوت غیر مسلموں میں کیسے عام ہوئی؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔
⑧ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اہم اصلاحات اور معاشرے پر ان کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔

عملی کام:

❁ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی جس صفت سے آپ زیادہ متاثر ہوں، اسے ساتھیوں کے سامنے بیان کریں۔
❁ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے چند اقوال خوش خط لکھ کر انہیں درسگاہ میں آویزاں کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ سیرت عمر بن عبدالعزیز، از علامہ ابن الحکم رحمہ اللہ، ترجمہ از حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ
❁ سیرت عمر بن عبدالعزیز، از مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم
❁ عمر بن عبدالعزیز معالم التجدید والاصلاح علیٰ مناهج النبوة، از دکتور علی محمد الصلابی

❁❁❁

(یونٹ: 2.5)

یزید بن عبدالملک (یزید ثانی)

رجب ۱۰۱ھ......تا......شعبان ۱۰۵ھ

فروری ۷۲۰ء......تا......جنوری ۷۲۴ء

سلیمان کی وصیت کے مطابق عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بعد یزید مسندِ خلافت پر بیٹھا جو عبدالملک کا تیسرا بیٹا تھا۔ بنواُمیہ میں یزید نامی یہ دوسرا خلیفہ تھا؛ لہٰذا اسے "یزید ثانی" بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اصلاحات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر ویسا حوصلہ اور تحمل اس میں نہ تھا؛ چنانچہ وہ ان کی پوری طرح پیروی نہ کر پایا۔

اندرونی خطرات:

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے آخری ایام میں خوارج اٹھ کھڑے ہوئے تھے مگر حکومت سے ان کے مذاکرات چل رہے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی وفات کی اطلاع ملتے ہی خوارج سرکاری افواج سے برسرِ پیکار ہوگئے۔ شروع میں وہ غالب رہے مگر آخر میں مَسلَمہ بن عبدالملک نے دمشق سے ایک بڑی فوج لا کر انہیں پسپا کر دیا۔[1]

دوسرا فتنہ نامور جرنیل یزید بن مُہلَّب کا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اسے مالِ غنیمت کے حساب میں گڑبڑ کرنے پر قید کر دیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی وفات کے بعد وہ فرار ہوگیا اور بغاوت کر کے عراق پر جہاں اس کے بھائیوں کا بڑا اثر ورسوخ تھا، قابض ہوگیا۔ آخر کار یزید ثانی نے مَسلَمہ بن عبدالملک کو اس پر قابو پانے کے لیے بھیجا۔ جنگ میں یزید بن مُہلَّب کو شکست ہوئی۔ وہ خود مارا گیا اور اس کے بھائیوں نے فرار ہو کر بلوچستان کے شہر قندابیل میں پناہ لی تاہم یزید ثانی نے تعاقب کرا کے سب کو قتل کرا دیا۔[2]

تیسرا خطرہ وسطِ ایشیا میں ترکوں کی بغاوت کا تھا جس کے پیچھے اس بار بھی خاقان چین کا ہاتھ تھا۔ یزید ثانی کی طرف سے بھیجے گئے سالار اس پر پوری طرح قابو نہ پاسکے تو یزید ثانی نے ۱۰۳ھ میں یہاں سعید بن ہُبَیرہ جیسے تجربہ کار امیر کو تعینات کیا جس نے پے در پے جنگیں لڑ کر صُغد، کش اور نَسَف سمیت ماوراء النہر کے تمام مخدوش علاقوں پر قابو پا لیا۔[3]

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۰۱ھ

② تاریخ الطبری: ۶/۵۸۳ تا ۶۰۵ ③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۰۳ھ ، ۱۰۴ھ

چوتھا خطرہ بحیرۂ خزر (کیسپین سی) کے ساتھ آباد مقبوضہ علاقوں میں شورش ابھرنے کا تھا۔ یہ نہایت فلک بوس پہاڑوں کا پرخطر علاقہ تھا جس میں مہم جوئی بہت مشکل تھی۔ یزید ثانی نے جراح بن عبداللہ کو آرمینیا کا حاکم مقرر کر کے یہ مہم اس کے سپرد کی۔ جراح نے جاں توڑ لڑائیوں کے بعد باغیوں کو کچل دیا اور پورے علاقے میں امن وامان قائم ہوگیا۔ ①

یزید ثانی کے دور میں اندلس کی فوج سمح بن مالک رحمہ اللہ کی قیادت میں جبال البرت (کوہ پری نیز) کو عبور کر کے فرانس میں داخل ہوگئی اور ریاست ''سپٹی مینیا'' کو مسخر کرلیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ریاست ''ایکی ٹن'' کے پایہ تخت ''ٹولوس'' کا محاصرہ کرلیا تاہم اس کے حاکم ڈیوک آف ایکی ٹن نے حملہ کر کے مسلمانوں کو پسپا کر دیا۔ سمح بن مالک رحمہ اللہ اس جنگ میں شدید زخمی ہوگئے تھے۔ چنانچہ لشکر نائب سالار عبدالرحمٰن الغافقی رحمہ اللہ کی قیادت میں واپس ہوکر کوہِ پری نیز پر خیمہ زن ہوگیا۔

کچھ مدت بعد اَندَلُس کے نئے حاکم عَنْبَسَہ بن سُحَیم نے دوبارہ فوج کشی کر کے پہلے ''کرسون'' اور ''سپٹی مینیا'' اور پھر دریائے رہون کے پار وسطی فرانس کی ریاستوں ''لیانس''، ''برگنڈی'' اور ''اوٹن'' کو زیرِ نگین کرلیا۔ تاہم فرانسیسیوں کے جوابی چھاپہ مار حملوں میں امیر عَنْبَسَہ زخمی ہوگئے اور مسلمان پسپا ہوکر ''ناربونہ'' آگئے۔ ②

انہی دنوں یزید ثانی نے ۲۵ شعبان ۱۰۵ھ کو تپ دق (ٹی بی) کے مرض میں مبتلا ہوکر وفات پائی۔ عمر ۳۴ سال تھی۔ چار سال ایک ماہ تک حکومت کی۔ اس نے اپنے بھائی ہشام اور پھر اپنے بیٹے ولید کو بالترتیب جانشین مقرر کر دیا تھا۔ ③

سیرت وکردار:

یزید ثانی کی سیرت وکردار کے بارے میں کئی مشکوک روایات مشہور ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یزید ثانی نے چالیس دن تک عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی پیروی کی، اس کے بعد چالیس بوڑھوں نے اس کے سامنے گواہی دی کہ اللہ نے خلفاء سے حساب کتاب معاف کر رکھا ہے۔ یہ سن کر یزید نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اصلاحات منسوخ کر کے سابقہ حکام کا طرز اختیار کرلیا۔ یہ روایت قابلِ قبول نہیں۔ ایسا ہوتا تو علمِ اسماء الرجال میں یزید ثانی پر سخت جرح منقول ہوتی مگر اس کے برعکس امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ یزید بن عبدالملک سے حدیث کی روایت کو جائز قرار دیتے تھے۔ ④

ہاں یہ درست ہے کہ کارکردگی کے لحاظ سے وہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ جیسی احتیاط وامانت کا مظاہرہ نہ کر پایا۔ ظاہر ہے عزیمت پر چلنے والے لوگ کم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی جواز کی حدود میں رہے تو اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

❀❀❀

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۰۳ھ
② عنبسہ بن سحیم نے انہی زخموں کے باعث سن ۱۰۷ ہجری میں وفات پائی۔ (دولۃ الاسلام فی الاندلس جلد ۱ صفحہ ۸۲)
③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/۱۳
④ المنتخب من علل الخلال از ابن قدامہ، ص ۲۳۷

ہشام بن عبدالملک

شعبان ۱۰۵ھ......تا......ربیع الآخر ۱۲۵ھ

فروری ۷۲۴ء......تا......فروری ۷۴۳ء

ہشام بن عبدالملک عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین سپاہی بھی تھا۔ وہ مملکت کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے کوشاں رہا اور مہمات وفتوحات کے لیے افواج مسلسل نکلتی رہیں۔ بنو مروان میں اس کا دور سب سے طویل رہا۔

جہادِ سندھ:

راجا داہر کے بیٹے جے سنگھ نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہشام کے زمانے میں وہ باغی ہو گیا جس میں کچھ کوتاہی مسلمانوں کے رویے کی بھی تھی۔ بہر کیف سندھ کے حاکم جنید بن عبدالرحمن نے جے سنگھ کو شکست فاش دے کر گرفتار کر لیا اور پھر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد جنید نے افواج کو راجھستان، رَن کچھ اور گجرات تک پھیلا دیا۔ نیز مارواڑ، اجین اور مالوہ سمیت بہت بڑا علاقہ اسلامی عمل داری میں شامل ہو گیا۔①

جنید کو ۱۱۱ھ میں خراسان بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد بعض نااہل نائبین کی وجہ سے سندھ کے حالات قابو میں نہ رہ سکے اور چند ہی برسوں میں یہاں کے اکثر مفتوحہ علاقے باغیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ آخر حکم بن عوانہ نامی ایک افسر نے آکر محمد بن قاسم کے بیٹے عَمرو بن محمد کی مدد سے یہاں کچھ علاقے دوبارہ فتح کیے اور دریائے سندھ کے مشرق میں مسلمانوں کا ایک محفوظ شہر ''منصورہ'' آباد کیا جو آگے چل کر سندھ میں مسلمانوں کا مرکز بنا۔②

مہماتِ ترکستان:

ترکستان (وسطِ ایشیا) میں اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ چین کا ہر خاقان یہاں اپنے اثر و رسوخ کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا تھا؛ اس لیے یہاں بار بار بغاوتیں ہوتی تھیں۔ ۱۰۹ھ میں ہشام بن عبدالملک نے اَشرَس بن عبداللہ کو یہاں کا حاکم مقرر کیا جس کی کوششوں سے بکثرت مقامی لوگ مسلمان ہوئے مگر ان نومسلموں سے جزیہ معاف نہ کیا گیا جس سے بداعتمادی پھیلی۔ کئی سرکاری امراء بھی حکومت کے اس اقدام پر معترض تھے۔ جب حکومت نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو یہ امراء نومسلم لوگوں کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ اس طرح ترکستان میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔③

---

① الکامل فی التاریخ: ۱۷۶/۳؛ فتوح البلدان، ص ۴۲۵

② فتوح البلدان، ص ۴۲۶، ۴۲۷

③ تاریخ الطبری: ۵۶،۵۳/۷

جب سرکاری افواج مقابلے کے لیے نکلیں تو باغی سرداروں نے خاقانِ چین سے امداد طلب کی۔ وہ اپنی فوجیں لے کر آن پہنچا اور تقریباً پورے ماوراء النہر پر قابض ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اشرس اپنے مستقر ''مَرْو'' سے نکلا۔ اس کی خراسان اور ماوراء النہر میں خاقان سے کئی جنگیں ہوئیں۔ آخر کار ایک صلح نامے کے تحت فریقین اپنے اپنے علاقوں کی طرف لوٹ گئے۔ ہشام بن عبدالملک اس سے مطمئن نہ ہوا اور اس نے اشرس بن عبداللہ کو معزول کر کے ۱۱۱ھ میں سندھ کے حاکم جنید بن عبدالرحمن کو یہاں تعینات کر دیا جس نے ''مرو'' پہنچتے ہی افواج کو منظم کیا اور آمو دریا عبور کر کے باغیوں اور خاقان سے جنگ چھیڑ دی۔ خاقان کی افواج کو شکست ہوئی اور اس کا چچازاد بھائی گرفتار کر لیا گیا۔ ①

تاہم اگلے سال باغیوں نے خاقان کی مدد سے پھر سر اٹھایا۔ پہلے ''تخار'' میں بغاوت ہوئی۔ جنید وہاں جا کر برسرِ پیکار ہوا تو باغیوں نے ''سمرقند'' کو گھیر لیا۔ جنید ''تخار'' کے محاذ کو چھوڑ کر سمرقند روانہ ہوا مگر راستے میں خاقان کا لشکر سامنے آ گیا۔ جنید نے دو دن تک خاقان کی فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا تاہم آخر میں اس کا پلہ کمزور پڑنے لگا۔ آخر جنید نے قاصد بھیج کر حاکمِ سمرقند سَوْرَہ بن حُر کو پیغام دیا: ''ہم صرف دو دن کی مسافت پر خاقان سے نبرد آزما ہیں۔ تم فوج لے کر نہر کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے حریف کی پشت پر حملہ کر دو تو ہم جنگ جیت سکتے ہیں۔''

یہ پیغام ملتے ہی سَوْرَہ بن حُر سمرقند کی بارہ ہزار فوج کو لے کر نکل پڑا مگر ایک غلط راستہ اختیار کرنے کے باعث یہ فوج ترکوں کے گھیرے میں آ گئی اور سَوْرَہ بن حُر سمیت اکثر مسلمان شہید ہو گئے۔ جنید کو یہ اطلاع ملی تو اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا مگر خاقان کی فوج نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا۔ آخر جنید نے سر پر کفن باندھ لیا اور نہایت شدت کی جنگ شروع ہو گئی۔ سپاہی لڑتے لڑتے اتنے نڈھال ہو گئے کہ تلواروں کی ضربوں میں کوئی زور نہ رہا۔ آخر لوگ تلواریں پھینک کر خالی ہاتھ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونے لگے۔ جمعے کے دن شروع ہونے والی یہ لڑائی ہفتے کی دوپہر تک جاری رہی۔ مسلمانوں کی گھڑسوار فوج تقریباً ساری ہی کٹ گئی۔ جنید نے باقی ماندہ پیادہ سپاہیوں کو منظم کیا اور ترکوں کی صفیں الٹتے ہوئے گھیرے سے نکل گیا اور سمرقند میں داخل ہو کر قلعہ بندی کر لی۔ ساتھ ہی ہشام بن عبدالملک کو مراسلہ لکھ کر کمک طلب کی۔ ہشام نے بیس ہزار سپاہی بھیج دیے جس سے قلعہ بند مسلمانوں کی ہمت بڑھ گئی۔ ادھر خاقان نے یہ حال دیکھ کر سمرقند کو چھوڑ دیا اور بخارا کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔

جنید فی الفور خاقان کے تعاقب میں نکل پڑا اور آخر اسے جا لیا۔ یکم رمضان ۱۱۲ھ کو فریقین میں ٹکراؤ ہوا۔ اس جنگ میں خاقان کے بہت سے سپاہی مارے گئے اور وہ چین کی طرف واپس ہو گیا۔ جنید بن عبدالرحمن ۱۱۶ھ تک وسطِ ایشیا کا حاکم رہا۔ اس کے بعد اسے معزول کر دیا گیا۔ معزولی کے چند دنوں بعد ہی اس مردِ مجاہد کا انتقال ہو گیا۔

۱۱۹ھ میں خاقانِ چین نے ایک بار پھر وسطِ ایشیا میں مداخلت کی۔ دریائے آمو کے پار اس کا مقابلہ خراسان کے

① تاریخ الطبری: ۶۸/۷، ۶۹

نئے حاکم اسد بن عبداللہ قسری سے ہوا۔ خاقان کو یہاں پھر شکستِ فاش ہوئی اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔

اگلے سال اس نے پھر یلغار کی مگر اس دوران اس کا اپنے معتمد سردار ''کُورصُول'' سے جھگڑا ہو گیا۔ بات اتنی بڑھی کہ اس سردار نے بغاوت کر دی۔ ایک شب اس نے اچانک حملہ کر کے خاقان کو قتل کر ڈالا۔

''کُورصُول'' بہت معرکہ آزما سردار تھا اور ۷۲ جنگیں لڑ چکا تھا؛ اس لیے ترکوں نے اسی کو اپنا ''خاقان'' بنالیا۔

اس دوران وسطِ ایشیا میں نصر بن سَیّار نامی نئے حاکم کا تقرر ہوا۔ اس نے ہر شعبے کو ترقی دی۔ خلیفہ سے اجازت لے کر نومسلموں سے جزیہ لینا بند کرایا۔ خراج اور محصولات کی بدعنوانیوں کو دور کیا۔ مظالم کی تحقیقات کرا کے عوام کو فوری انصاف فراہم کیا۔ اس طرح نومسلموں کی شکایات دور ہو گئیں اور وہ بغاوتوں کا حصہ بننے سے باز آ گئے۔

اس کے بعد اس نے نئے خاقان ''کُورصُول'' سے نمٹنے کی تیاری کی اور اس کے مقبوضہ علاقوں پر مختلف سمتوں سے فوج کشی شروع کی۔ کُورصُول خود مقابلے پر نکلا۔ دریائے شاش کے پاس فریقین میں ہولناک تصادم ہوا۔ اس لڑائی میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ آخر کار ''کُورصُول'' گرفتار ہو گیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ ترکوں نے دب کر صلح کر لی۔ ہشام کو یہ خبر ملی تو وہ سجدے میں گر گیا۔ اس طرح ایک طویل عرصے بعد ترکستان میں امن وامان قائم ہوا۔①

گرجستان اور آرمینیا کا جہاد:

۱۰۶ھ میں جرّاح بن عبداللہ حکمی نے بحیرۂ کیسپین کے ساحلوں پر آرمینیا اور بلادِ خزر پر یلغار کر کے لان کے سرکش قبائل کو سرنگوں کیا۔ ۱۱۲ھ میں خاقانِ ترکستان کے بیٹے کی قیادت میں قبائل نے پھر بغاوت کی اور آذربائیجان کے شہر اَردبیل کو گھیر لیا۔ جرّاح بن عبداللہ نے محاصرہ توڑنے کے لیے حملہ کیا اور دورانِ جنگ ۲۲ رمضان ۱۱۲ھ کو شہادت پائی۔ باغیوں نے اَردبیل پر قبضہ کر کے ہزاروں مسلمانوں کو قیدی بنالیا۔ موصل کے مضافات بھی ان کی زد میں آ گئے۔ یہ اطلاعات سن کر ہشام بن عبدالملک نے جرّاح کی جگہ سعید بن عمرو حَرَشی کو بھیجا۔ خاقان کا بیٹا تاخت و تاراج کر کے واپس ہو چکا تھا۔ حَرَشی نے تعاقب کر کے اس کی خیمہ گاہ پر شب خون مارنے کا سلسلہ شروع کر دیا جس سے باغی پسپا ہو گئے اور بہت سے مسلمان قیدیوں کو آزاد کرا لیا گیا جن میں جرّاح بن عبداللہ کے اہل وعیال بھی تھے۔

خاقان کا بیٹا غضب ناک ہو کر پلٹا اور اب کھلے میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی مگر اسے شکستِ فاش ہوئی مسلمانوں نے دریائے اُرس تک اس کا تعاقب کر کے تمام مالِ غنیمت اور قیدیوں کو بازیاب کرا لیا۔ کچھ دنوں بعد خاقان کے بیٹے نے دریائے بَیْلَقان کے کنارے دوبارہ صف بندی کر لی مگر مسلمانوں نے دشمن کی صفوں کو توڑ کر انہیں اتنا پیچھے دھکیلا کہ ان کی اکثریت دریا میں غرق ہو گئی۔②

۱۰۷ھ میں اسد بن عبداللہ نے گرجستان پر حملہ کیا مگر رسد کی کمی کے باعث ناکام رہا۔ ۱۱۰ھ میں مَسلَمہ بن عبدالملک

---

① تاریخ الطبری: ۷/۱۲۳،۸۴

② تاریخ خلیفہ ابن خیاط، ص ۳۴۲،۳۴۰

نے یہاں فوج کشی کی۔ درّہ باب پر شدید بارش اور کیچڑ کی حالت میں تین ہفتوں تک جنگ جاری رہی۔ اس جنگ کو ''غزوۃ الطین'' کہا جاتا ہے۔ آخر ۲۳ جمادی الآخرہ ۱۱۰ھ کو مَسلَمہ نے حریف کو مار بھگایا۔ شوال ۱۱۲ھ میں مَسلَمہ نے برف باری کے موسم میں پھر یلغار کر کے کئی قلعے اور شہر فتح کر لیے اور درۂ باب پر ایک قلعہ تعمیر کرا کے ترکوں کا راستہ بند کر دیا۔ یہ مہمات ۱۱۳ھ تک جاری رہیں۔ [1]

رومیوں سے معرکے:

ہشام بن عبدالملک نے سردی اور گرمی میں جہادِ روم کے لیے الگ الگ افواج بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس دور میں مَسلَمہ بن عبدالملک نے رومیوں پر مسلمانوں کی سابقہ ہیبت پھر سے طاری کر دی۔ [2]

۱۱۴ھ میں ہشام کے بیٹے معاویہ نے ایک جہادی مہم میں رومی سپہ سالار قسطنطین کو زندہ گرفتار کر لیا۔ اسی سال ہشام کے چچا زاد مروان بن محمد نے روس کی سرحدوں پر حملہ کیا۔ آرمینیا، گرجستان، سرحداتِ روس اور بلادِ خزر میں اس کی مہمات ۱۲۱ھ تک جاری رہیں۔ [3]

۱۱۵ھ میں عبیدہ بن عبدالرحمٰن نے جزیرہ صِقِلّیہ (سسلی) پر حملہ کیا جو ناکام رہا۔ اگلے سال دوبارہ حملے میں پھر شکست ہوئی اور بڑے بڑے افسران گرفتار ہو گئے جنہیں بھاری زرِ فدیہ دے کر آزاد کرایا گیا۔ [4]

۱۲۲ھ میں حبیب بن ابی فہرہ نامی نے صِقِلّیہ پر ایک بڑا حملہ کیا اور یہاں کے پایۂ تخت سرقوسہ کو فتح کر لیا مگر دیگر شہروں کی فتح سے قبل افریقہ میں بربروں نے بغاوت کر دی جس کی وجہ سے حبیب کو واپس بلا لیا گیا۔ [5]

بربروں کی بغاوت:

طنجہ کے حاکم عمر بن عبداللہ المرادی نے نومسلم بربروں پر ناجائز ٹیکس عائد کر دیے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بربر بددل ہو کر خوارج کے نظریات کو قبول کرنے لگے۔ رمضان ۱۲۲ھ میں انہوں نے اعلانِ بغاوت کر دیا اور طنجہ پر قبضہ کر کے عربوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ افریقہ کے حاکم ابن حبحاب نے اس فتنے کو کچلنے کی مہم خالد بن حبیب فہری کے سپرد کی مگر ذوالحجہ ۱۲۲ھ میں دریائے گدر کے کنارے ایک خونریز معرکے میں اسے شکست ہوئی اور عربوں کے بڑے بڑے شرفاء کام آئے؛ اس لیے اس معرکے کو ''معرکۂ اشراف'' کہا جاتا ہے۔

ہشام بن عبدالملک کو یہ اطلاعات ملیں تو اس نے ۱۲۳ھ میں کلثوم بن عیاض کو تیس ہزار سپاہی دے کر بھیجا اور مصر، تیونس اور لیبیا کے حکام کو بھی اس فوج کی مدد کا حکم دیا۔ یوں لشکر کی تعداد ۷۰ ہزار ہو گئی۔ طنجہ کے قریب فریقین میں خونریز جنگ ہوئی جس میں ایک تہائی سرکاری فوج تہ تیغ ہو گئی۔ سپہ سالار کلثوم بن عیاض سمیت بڑے بڑے

---

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۳۴۳ تا ۳۴۶

② تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۳۱۶ تا ۳۵۵ ③ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۳۴۵

④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۳۴۷ ⑤ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۲۲ھ

افسران قتل ہوگئے۔ بربر مراکش سے آگے بڑھ کر الجزائر اور لیبیا پر بھی قابض ہوگئے۔

اب ہشام نے قسم کھائی کہ وہ اس فتنے کو مٹا کر دم لے گا چاہے اسے اپنی اولاد سمیت نکلنا پڑے۔ اس نے حنظلہ بن صفوان کو مزید تیس ہزار فوج دے کر روانہ کیا۔ حنظلہ نے تیونس پہنچ کر قیروان کو مرکز بنایا؛ اُدھر تین لاکھ بربروں نے قیروان کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ علماء نے اس موقعے پر جہاد کی ترغیب دے کر سپاہیوں کا لہو گرمایا اور عرب خواتین نے اپنی عصمت کی دہائی دے کر سب کی غیرت کو جھنجھوڑا۔ جنگ شروع ہوئی تو عرب جان پر کھیل گئے۔ آخر بربروں کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ دو لاکھ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔①

جہادِ فرانس:

ہشام بن عبدالملک نے نامور جرنیل عبدالرحمن الغافقی رحمہ اللہ کو اَندلُس کا حاکم مقرر کیا۔ انہوں نے ۱۱۴ھ میں آٹھ ہزار سپاہی لے کر فرانس کا رخ کیا۔ اس زمانے میں فرانس کے جنوب میں گاتھ خاندان کا ڈیوک آف ایکی ٹن حکمران تھا جبکہ وسطی اور شمالی علاقوں میں ''میرو ونجی'' خاندان کی بادشاہت تھی، جس میں بادشاہ برائے نام تھا اور عملاً سپہ سالار ''چارلس مارٹل'' کا حکم چلتا تھا۔ یہ دونوں ریاستیں باہم اختلافات کا شکار تھیں۔

عبدالرحمن الغافقی رحمہ اللہ نے پہلے ڈیوک کی ریاست پر حملہ کیا اور بورڈیو کی بندرگاہ کو بھی فتح کرلیا۔ پھر شمال کا رخ کیا اور دریائے ڈاردون کے کنارے ڈیوک کو شکستِ فاش دے کر ''پائی ٹیرس'' پر قبضہ کرلیا جہاں ''سینٹ ہالاری'' کا مشہور زمانہ گرجا تھا۔ اس کے بعد مسلمان ''تورس'' کی طرف بڑھے۔ ڈیوک آف ایکی ٹن نے یہ دیکھ کر چارلس مارٹل سے صلح کرلی۔ مارٹل نے فرانس، جرمنی اور پرتگال کو بھی اتحادی بنالیا اور یہ لشکرِ جرار ''تورس'' کی وادیوں میں پہنچا جہاں اسلامی لشکر خیمہ زن تھا۔ دشمن کی بے پناہ افرادی قوت کے بالمقابل آٹھ ہزار مسلمان کسی شمار میں نہ تھے مگر عبدالرحمن الغافقی رحمہ اللہ نے بڑی ہمت سے جنگ لڑی اور دوسرے دن مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ اس دوران ہزاروں مجاہدین شہید ہوگئے مگر مسلمانوں نے میدانِ جنگ سے منہ نہ پھیرا۔ رات کو وہ منظم انداز میں خاموشی سے شمالی اندلس کی طرف نکل گئے اور دشمن تعاقب کی ہمت نہ کرسکا۔ یہ ۱۵ شعبان ۱۱۴ھ (۱۹ اکتوبر ۷۳۲ء) کا واقعہ ہے۔

چارلس کو اس کارنامے کی وجہ سے ''مارٹل'' یعنی ''ہتھوڑے'' کا لقب ملا۔ یورپی مؤرخین کے مطابق اگر اتحادیوں کو شکست ہوجاتی تو فرانس سمیت متعدد یورپی ممالک دوسری صدی ہجری میں اسلامی خلافت کا حصہ بن چکے ہوتے۔ عبدالرحمن الغافقی رحمہ اللہ اور ہزاروں مجاہدین کی شہادت گاہ ''بلاط الشہداء'' کے نام سے مشہور ہے۔②

اَندلُس کا استحکام اور ترقی:

۱۱۶ھ میں اَندلُس پر عقبہ بن حجاج کا تقرر ہوا جس نے شاہراہوں کی حفاظت کے لیے گھڑسوار پولیس کا محکمہ قائم کیا،

① تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۳۵۳ تا ۳۵۶؛ الکامل فی التاریخ: سنہ ۱۱۷ھ؛ الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصیٰ: ۱/ص ۱۶۳ تا ۱۷۰۔

② التاریخ الأندلسی، ص ۱۹۳ تا ۲۰۳؛ نفح الطیب: ۱/۲۸۶ تا ۲۹۰؛ دولۃ الاسلام فی الاندلس للشیخ عبداللہ عنان: ۱/۹۲ تا ۱۱۱

ہر بستی میں عدالتیں قائم کیں، نئی مساجد اور مدارس کی بنیاد رکھی۔ خائن افسران کو برطرف کر دیا۔ اس طرح اندلس کا شمار امن وامان اور ترقی کے لحاظ سے عالمِ اسلام کے مثالی صوبوں میں ہونے لگا۔ ①

عرب قبائل کی باہمی عصبیت میں اضافہ:

یزید بن عبدالملک کے زمانے سے عرب قبائل میں مضری اور یمانی کی بنیاد پر افتراق پیدا ہونے لگا تھا۔ ہشام نے کوشش کی کہ حکومتی عہدوں کے حوالے سے ان دونوں قبائل میں توازن رکھے۔ مگر بات نہ بن سکی اور یہ تعصب بڑھتا چلا گیا۔ ہشام کے بعد آنے والے خلفاء نے بھی اس کا کوئی مناسب حل نہ نکالا جس کا نتیجہ آگے چل کر یہ نکلا کہ عربوں کی سطوت وہیبت ماند پڑ گئی اور اسلامی سیاست کی زمام اہلِ عجم کے ہاتھ میں آگئی۔

زید بن علی رحمہ اللہ کا خروج اور قتل:

ہشام کے دور کا ایک الم ناک واقعہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے زید بن علی رحمہ اللہ کا خروج تھا جو حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے صاحبزادے اور حضرت محمد باقر رحمہ اللہ کے بھائی تھے۔ بڑے فقیہ، متقی اور عابد وزاہد تھے۔ انہوں نے کوفہ کے بعض امراء کی طرف سے تعاون کی یقین دہانی پر ۱۲۲ھ میں خلیفہ ہشام کے خلاف خروج کیا جو ناکام رہا اور زید بن علی رحمہ اللہ اس کوشش میں جان کی بازی ہار گئے۔ ②

ہشام بن عبدالملک کی وفات:

ہشام بن عبدالملک بیمار ہو کر ۶ ربیع الآخر ۱۲۵ھ کو دنیا سے رخصت ہوا۔ عمر ۵۵ سال تھی۔ اس کی خلافت کا زمانہ تقریباً انیس سال آٹھ ماہ تھا۔ اس کا قیام دمشق کی بجائے کچھ فاصلے پر "رُصافہ" نامی شہر میں تھا۔ قبر بھی وہیں ہے۔ ③

سیرت وخصوصیات:

ہشام بن عبدالملک ذاتی طور پر نہایت شریف، بہادر، نیک اور پرہیز گار انسان تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کی سیرت پر عمل کی کوشش کرتا تھا۔ طبیعت میں حلم اور بردباری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک بار کسی نے اس کو کھری کھری سنا ڈالیں تو جواب میں صرف اتنا کہا: "اپنے حکمران کو ایسا کہنا مناسب نہیں۔"

ایک شخص کو ایسے ہی موقع پر جواب دیا: "مجھے ایسا کہہ رہے ہو حالانکہ میں تمہارا خلیفہ ہوں۔" اس کے زیادہ سے زیادہ غصے کا اظہار جو منقول ہے، وہ یہ ہے کہ کسی شخص پر غضب ناک ہو کر کہا: "چپ ہو جاؤ، ورنہ ایک کوڑا ماروں گا۔"

ہشام بہت کم کسی کو ڈانٹتا تھا۔ ایک بار کسی پر غصہ آگیا اور کچھ نازیبا الفاظ کہہ دیے۔ وہ شخص بولا: "خلیفۃ اللہ ہو کر اس قسم کے الفاظ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" ہشام یہ سن کر سخت نادم ہوا، بولا: "مجھ سے بدلہ لے لو۔"

وہ بولا: "کیا ایسے الفاظ کہہ کر میں بھی تمہارے جیسا احمق بنوں؟" ہشام بولا: "اچھا اس کا تاوان لے لو۔"

① الکامل فی التاریخ: ۳/۲۳۳؛ والبیان المغرب فی اخبار الاندلس والمغرب: ۲/۲۹، ۱/۱۱۳، ۱۱۴

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۲۲ھ ③ تاریخ الطبری: ۷/۲۰۰ تا ۲۰۲

معاف کر دو۔"

وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا تو ہشام نے کہا: "اچھا پھر اللہ کے لیے معاف کر دو۔"

وہ بولا: "ہاں اللہ کے لیے معاف ہے۔" ہشام نے کہا: "اللہ کی قسم! آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔"

وہ اولاد کی تادیب پر پوری توجہ دیتا تھا۔ ایک بار اس کا ایک بیٹا نماز جمعہ میں نہ آیا۔ ہشام نے پوچھا تو بولا: "سواری نہیں ملی۔" ہشام نے کہا: "کیا پیدل نہیں جا سکتے تھے؟" یہ کہہ کر ایک سال تک اس کی سواری پر پابندی لگا دی۔

گانے بجانے سے احتراز کرتا تھا اور اس میں ملوث لوگوں کو مناسب سزا دیتا تھا۔ ایک بار موسیقی کا عادی کوئی بوڑھا پکڑ کر لایا گیا۔ ہشام نے کہا: "اس کا طنبورہ اسی کے سر پر مار کر توڑ دو۔"

حکم کی تعمیل ہوئی اور وہ بوڑھا رونے لگا۔ ہشام کے خادم نے اسے کہا: "اب چپ ہو جاؤ، صبر کرو۔"

وہ بولا: "پٹائی پر نہیں، اس ناقدری پر رو رہا ہوں کہ خلیفہ نے بربط کو طنبورہ کہا۔"①

بزرگوں سے ربط رکھتا تھا۔ ایک بار ابو حازم رحمہ اللہ سے پوچھا: "اس اقتدار کے ہوتے ہوئے نجات کا راستہ کیا ہے؟" وہ بولے: "کسی شے کو اسی وقت لو جب کہ اس کا لینا حلال ہو۔ اسی مصرف پر خرچ کرو جو برحق ہو۔" ہشام نے کہا: "اس کی مکمل پابندی کی طاقت بھلا کون رکھ سکتا ہے۔" ابو حازم رحمہ اللہ بولے: "جو جہنم سے بھاگنا چاہتا ہو۔"②

ہشام بیت المال کی آمدن و خرچ میں بے حد احتیاط کرتا تھا۔ آمدن و خرچ سے متعلق ہر چیز کا حساب تاریخ وار رجسٹروں میں مندرج کرواتا تھا۔ یہ ریکارڈ اتنا درست تھا کہ جب یہ عباسی خلفاء کے ہاتھ لگا تو ان کے ماہرین نے اسے چیک کر کے اعتراف کیا کہ ہشام کے دور جیسا صاف و شفاف مالی حساب کتاب کہیں اور نہیں دیکھا گیا۔③

اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ بیت المال کی آمدن میں کوئی ناجائز رقم شامل نہ ہونے پائے، اس نے حکم دیا تھا کہ محاصل کی رقم اس وقت تک قبول نہیں کی جائے جب تک چالیس آدمی گواہی نہ دیں کہ یہ رقم بالکل جائز اور حلال ہے۔④

خلاصۂ کلام:

ہشام کا دور فتوحات اور تعمیراتی و ترقیاتی کاموں کے لحاظ سے قابلِ تعریف تھا۔ تاہم اس دور میں چہار سو بغاوتیں بھی ہوتی رہیں۔ بعض مقامات پر صوبے داروں کا نومسلم باشندوں سے نامناسب سلوک بھی اشتعال کی وجہ بنا۔ بہرکیف ہشام نے باغیوں کو ہر جگہ دبا کر مملکتِ اسلامیہ کو متحد رکھا۔ دوسری طرف بغاوتوں کا تسلسل یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ فضا بنو مروان کے خلاف ہوتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہشام کے بعد جب اقتدار کمزور حکمرانوں کو ملا تو بنو مروان کی حکومت اس تیزی سے زوال کا شکار ہوئی کہ سات سال کے اندر اندر اس کی بساط اُلٹ گئی۔

❁❁❁

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۱۵۱ تا ۱۵۷

② المعرفۃ والتاریخ: ۱/۶۷۹

③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۲۵ ھ

④ تاریخ الخلفاء، ص ۱۸۵، ط نزار

ولید بن یزید بن عبد الملک (ولیدِ ثانی)

ربیع الآخر ۱۲۵ھ......تا......جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ

فروری ۷۴۳ء......تا......اپریل ۷۴۴ء

ہشام کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا ولید بن یزید خلیفہ بن گیا۔ بنو مروان میں ولید نامی یہ دوسرا خلیفہ تھا؛ اس لیے اسے ''ولیدِ ثانی'' کہا جاتا ہے۔ اس کی عیاشی اور بدکرداری کے سبب بعض مؤرخین اسے ''ولیدِ فاسق'' بھی کہتے ہیں۔ اس کا باپ یزید بن عبد الملک ۱۰۵ھ میں اپنی وفات سے پہلے بالترتیب پہلے اپنے بھائی ہشام اور پھر بیٹے ولید کے لیے خلافت طے کر گیا تھا۔ اس وقت ولید تقریباً پندرہ سال کا تھا۔ اس نے اپنے چچا ہشام کی خلافت کو دل سے قبول نہ کیا اور امورِ سلطنت سے کوئی سروکار نہ رکھا بلکہ عیش و مستی میں منہمک ہو گیا۔ ہشام نے اس کی اصلاح کی بڑی کوشش کی مگر ولید نہ سدھرا بلکہ چچا سے مزید نفرت کرنے لگا۔ ہشام کے مصاحب امام زہری رحمہ اللہ زور دیتے رہے کہ اس نالائق لڑکے کی ولی عہدی منسوخ کر دی جائے۔ مگر اس سے پہلے ہشام کی وفات ہو گئی اور ولید خلیفہ بن گیا۔

اس نے اپنے چچا سے اظہارِ نفرت کرتے ہوئے اس کے تمام قابلِ اعتماد امراء کو برطرف کر دیا اور نااہل اور خوشامدی لوگوں کو اہم عہدے سونپ دیے۔ اپنے بعد اپنے دو بیٹوں کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کر دیا۔

مزید یہ کہ اس نے یمانی قبائل کو نظر انداز کر کے مضری عربوں کو حد سے زیادہ نوازنا شروع کر دیا جس کے باعث عرب قبائل کی باہمی عصبیت مزید بھڑک اٹھی۔ یوں مملکت کا نظام تہہ و بالا ہونے کے اسباب پورے ہو گئے۔ [1]

آخر یمانی قبائل نے ولیدِ ثانی کے چچازاد بھائی، یزید بن ولید کے ہاتھ پر بیعت کر کے حکومت کا تختہ الٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ یزید بن ولید اپنے دو اڑھائی سو خاص آدمیوں کے ساتھ دمشق پہنچا۔ ایک شب اس نے چالیس افراد کے ساتھ جامع اموی میں نمازِ عشاء ادا کی۔ اس مسجد کی محراب سے ایک دروازہ قصرِ خلافت میں کھلتا تھا جس سے خلیفہ کی آمد و رفت ہوا کرتی تھی۔ تمام نمازیوں کے چلے جانے کے بعد یزید بن ولید نے مسجد کے چوکیداروں کو حراست میں لے لیا اور محراب کی سمت کا دروازہ توڑ کر محل میں گھس گیا۔ سرکاری خزانے اور محل پر قبضہ کر لیا گیا۔

[1] البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۲۰ تا ۱۶۶؛ سیر اعلام النبلاء: ۵/۳۷۱؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۲۶ھ

ولید نے موت سامنے دیکھی تو کہنے لگا:

''جس طرح عثمان رضی اللہ عنہ تلاوت کرتے ہوئے شہید ہوئے، میں اسی طرح مرنا چاہتا ہوں۔''

یہ کہہ کر قرآن مجید کھولا اور تلاوت میں مصروف ہو گیا۔ اسی دوران باغیوں نے اندر آ کر اسے مار ڈالا۔ یہ واقعہ ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ کا ہے۔ ولید ثانی کا دورِ اقتدار ایک سال تین ماہ بنتا ہے۔ اس کی عمر ۳۶ سال تھی۔ ①

ولیدِ ثانی کی نااہلی اور فسق و فجور پر مؤرخین کا اتفاق ہے۔ مگر وہ روایات درست نہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اس نے کعبہ کی چھت پر بیٹھ کر مے نوشی کا ارادہ کیا تھا، قرآن مجید کی توہین کی تھی اور کفریہ اشعار کہے تھے۔ ہاں وہ عملی طور پر گیا گزرا تھا مگر اعتقادی طور پر شریعتِ محمدیہ ہی کو راہِ نجات مانتا تھا۔ اس کے ایک فرمان میں تحریر تھا:

''اللہ اسے ہلاک کرے جو گمراہ اور سرکش ہو کر نیکی و تقویٰ کا راستہ چھوڑ دے۔ جو بھی صورتحال پیش آئے اس میں اللہ کی اطاعت کو لازم پکڑو۔'' ②

وہ اپنے ہم نشینوں سے کہا کرتا تھا: ''موسیقی کا شوق شہوت کو بڑھاتا اور شراب جیسا اثر کرتا ہے۔ اگر تمہیں موسیقی سے واسطہ رکھنا ہے تو پھر عورتوں سے دور رہو؛ کیوں کہ گانا زنا کا منتر ہے۔ میرے نزدیک موسیقی پیاس کی شدت میں پانی سے زیادہ لذیذ ہے مگر اس کے باوجود میں یہی کہہ رہا ہوں؛ کیوں کہ حق بات اس لائق ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے۔'' ③

عباسی دور کے خلیفہ مہدی کے سامنے کسی نے ولیدِ ثانی کو زندیق اور کافر کہا تو مجلس میں موجود ایک فقیہ ابوعلاثہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: ''امیر المؤمنین! مجھے ولید کے ایک دوست نے جو اس کی نجی محفلوں میں شریک رہتا تھا، بتایا ہے کہ ولید پینے پلانے اور لہو و لعب میں مشغولیت کے باوجود نماز کا وقت آتے ہی لباس تبدیل کرتا اور اچھی طرح وضو کر کے نماز ادا کرتا۔'' یہ سن کر مہدی نے اس گواہی کو قبول کیا اور کہا: ''اللہ آپ کو برکت دے۔'' ④

برائیوں کے ساتھ اس میں سخاوت کی خوبی نمایاں تھی۔ اس نے سپاہیوں اور سرکاری ملازموں کی تنخواہیں بڑھا دی تھیں۔ محتاجوں، معذوروں اور اپاہجوں کی دیکھ بھال پر خوب خرچ کرتا تھا۔ ⑤ خود بھی قادر الکلام شاعر تھا اور شعراء کو بڑھ چڑھ کر انعامات دیا کرتا تھا۔ ⑥

❁❁❁

① تاریخ الطبری: ۲۳۶/۷؛ سیر اعلام النبلاء: ۳۷۳/۵؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۲۶ھ

② تاریخ الطبری: ۲۲۱/۷

③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۲۶ھ

④ الکامل فی التاریخ: سنۃ: ۱۲۶ھ

⑤ الکامل فی التاریخ: ۲۸۸/۴ سنۃ: ۱۲۵ھ

⑥ مروج الذہب: ۵۲/۳، ۵۳؛ الفخری فی الآداب السلطانیۃ لابن الطقطقی، ص ۱۳۳، ط دار القلم بیروت

یزید بن ولید بن عبدالملک (یزیدِ ثالث)

جمادی الآخرہ ۱۲۶ھ......تا......ذوالحجہ ۱۲۶ھ

اپریل ۷۴۴ء......تا......اکتوبر ۷۴۴ء

یزید بن ولید نیک سیرت اور کفایت شعار تھا۔ اس نے ولید کے رائج کردہ اسراف کو ختم کر دیا اور تنخواہیں کم کر دیں، اسی وجہ سے مخالفین اسے ''یزید ناقص'' کہنے لگے۔ اس کا نام بنواُمیہ کے عادل خلفاء میں شمار کیا جاتا ہے۔①

اس کی حکمتِ عملی اس کی پہلی تقریر سے ظاہر ہے جس میں اس نے کہا تھا:

''میں اس وقت تک نہ کوئی نئی عمارت بنواؤں گا، نہ نئی نہر کھدواؤں گا جب تک سرحدوں کی حفاظت کے انتظامات اور ضرورت مندوں کی حاجات پوری نہ ہو جائیں۔ میں اپنا دروازہ ضرورت مندوں کے لیے کبھی بند نہیں کروں گا۔ تمہارا وظیفہ اور راشن تمہیں حسبِ معمول ملتا رہے گا۔ حقوق کے لحاظ سے دور اور قریب والوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ جو کچھ میں نے کہا اگر اس پر عمل کرتا رہوں تو میری اطاعت تم پر لازم ہے۔ اگر ایسا نہ کروں تو تم مجھے معزول کر دو۔ اگر کوئی نیک و صالح آدمی ان باتوں کی پابندی کا وعدہ کرے اور تم اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہو تو میں سب سے پہلے اس سے بیعت کروں گا۔''②

یزید ثالث یمانی قبائل کے ذریعے برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اُدھر ولید جو اپنے دورِ اقتدار میں بدنام تھا، قتل ہونے کے بعد مظلوم بن گیا اور اکثر قریشی اور اموی عمائد نئے حکمران کے خلاف ہو گئے۔ حمص، فلسطین اور اُردن میں بغاوتیں ہوئیں جنہیں بمشکل دبایا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد الجزیرہ کے اموی حاکم مروان بن محمد نے بغاوت کر دی۔ یزید ثالث نے موصل اور آذربائی جان کی حکومت پیش کر کے اسے دوبارہ وفاداری پر آمادہ کیا۔ یزیدِ ثالث کو صرف چھ مہینے تک حکومت کا موقع ملا۔ وہ طاعون کے مرض میں مبتلا ہوا اور ۲۰ ذوالحجہ ۱۲۶ھ کو وفات پا گیا۔ اس کی عمر ۴۶ سال تھی۔③

✿✿✿

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/ ۱۹۱، ۱۹۲ ② الفخری فی الآداب السلطانیۃ لابن الطقطقی، ص ۱۳۲

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/ ۱۹۱، ۱۹۲؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۲۶ھ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۱۸۹، ط نزار

اِبراہیم بن ولید بن عبدالملک

ذوالحجہ ۱۲۶ھ......تا......صفر ۱۲۷ھ
اکتوبر ۷۴۴ء......تا......دسمبر ۷۴۴ء

یزید ثالث کے بعد اس کا بھائی ابراہیم تخت نشین ہوا۔ تاہم اس کی خلافت برائے نام ہی تھی۔ اس کے خلیفہ بنتے ہی الجزیرہ کے حاکم مروان بن محمد نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ ولید ثانی کے بیٹوں کو رہا کیا جائے جنہیں یزید ثالث نے گرفتار کیا تھا۔ یہ مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور مروان نے افواج لے کر شام پر چڑھائی کر دی۔ ابراہیم نے سلیمان بن ہشام کو ایک لاکھ سپاہی دے کر مقابلے کے لیے بھیجا۔ صفر ۱۲۷ھ میں فریقین نبرد آزما ہوئے، آخر سرکاری افواج کو شکست ہوئی۔ اس دوران شامی امراء نے ایک حماقت یہ کی کہ ولید ثانی کے گرفتار شدہ دونوں بیٹوں کو قتل کر دیا تا کہ مستقبل میں ان میں سے کسی کے خلیفہ بننے کا امکان نہ رہے۔

ادھر مروان یلغار کرتا ہوا دمشق پہنچ گیا۔ ابراہیم شہر سے فرار ہو گیا۔ مروان نے آسانی سے پایہ تخت پر قبضہ کر لیا۔ ۱۴ صفر ۱۲۷ھ کو ابراہیم کی معزولی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کی حکومت دو ماہ بھی پورے نہ کر سکی۔ مروان نے ابراہیم کو تخت سے ہٹانے پر اکتفا کیا اور اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی۔ ①

❀❀❀

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۲۶ھ، ۱۲۷ھ؛ تاریخ الخلفاء: ص ۱۸۹

مروان بن محمد بن مروان (مروانِ ثانی)

صفر ۱۲۷ھ......تا......ذوالحجہ ۱۳۲ھ

دسمبر ۷۴۴ء......تا......اگست ۷۵۰ء

مروان بن محمد (مروانِ ثانی) ایک پختہ عمر، جہاں دیدہ اور بہادر انسان تھا۔ اس نے پانچ سال دس ماہ تک حکومت کی۔ اس کی سخت کوشی اور جفاکشی کی وجہ سے لوگ اسے حمار (گدھے) سے تشبیہ دینے لگے جبکہ مخالفین نے اس لفظ کو طنزاً اس کے نام کا حصہ بنادیا۔ مروان نے نہایت پُرآشوب دور میں حکومت سنبھالی اور سلطنت کی بقا کی ان تھک کوشش کی مگر کچھ نہ بنا۔ آخرکار مروان بن محمد پر بنوامیہ کی سیادت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس زوال سلطنت کی چار بڑی وجوہ تھیں:

① اندرونی بغاوتیں اور شورشیں جو سرکش امراء اور خوارج کی شکل میں ابھر رہی تھیں۔

② یمانی اور مضری قبائل کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی جو خانہ جنگی کی شکل اختیار کر رہی تھی۔

③ خود خاندانِ بنوامیہ اور امرائے بنومروان کے مابین اختلافات اور عدمِ اعتماد کا ماحول۔

④ بنوہاشم کی خفیہ دعوت جو ملک کو ایک انقلاب کی طرف لے جارہی تھی۔

اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کا خلاصہ یہ ہے: ❶ سب سے پہلے مروان کو شام کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل مروان مضری قبائل کا حامی تھا جبکہ شام میں یمانی قبائل کی کثرت تھی۔ انہوں نے شام کے مختلف شہروں میں اس کی بیعت سے انکار کردیا۔ مروان نے ہر جگہ فوج کشی کر کے ان باغیوں کو بزورِ شمشیر سرنگوں کیا۔

❷ کچھ عرصے بعد یہ باغی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے لڑکے سلیمان کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی تعداد ۷۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ مروان نے خساف کے مقام پر ایک قہرانگیز جنگ لڑ کر انہیں پسپا کیا۔[1]

❸ کچھ مدت بعد عراق میں ضحاک بن قیس نامی ایک بڑے معرکہ آزما خارجی سردار نے بغاوت کردی اور کوفہ پر قابض ہوگیا۔ کئی ماہ تک وہ سرکاری افواج کے لیے دردِ سر بنا رہا۔ آخر میں وہ فتح یاب ہوتا ہوا شام کی طرف بڑھا۔ حرّان کے مقام پر مروان نے خود اس کا سامنا کیا۔ اس لڑائی میں ضحاک مارا گیا اور اس کا باقی لشکر دو تین چھوٹی چھوٹی جنگوں کے بعد عراق کی طرف پسپا ہوگیا۔ مروان کے جرنیلوں نے ان کا تعاقب کیا اور عراق میں ہر

① الکامل فی التاریخ: ۳/۲۳۹، سنہ ۱۲۷ھ

جگہ انہیں تہہ تیغ کر کے ان کا صفایا کر دیا۔

❷ کچھ مدت بعد ایک اور خارجی سردار ابوحمزہ مکہ معظمہ پر قابض ہو گیا اور پھر مدینہ منورہ کی طرف بڑھا۔ اہلِ مدینہ نے باہر آ کر اس کا مقابلہ کیا مگر ایسی شکست کھائی کہ مدینہ کا شاید ہی کوئی گھر مقتولین سے خالی رہا ہو۔ ابوحمزہ مدینہ پر قبضہ کر کے شام کی طرف بڑھا۔ مروان نے اس کی پیش قدمی روکنے کے لیے چار ہزار سپاہی روانہ کیے جنہوں نے ابوحمزہ کو شکست دے کر حجاز کو ان کے وجود سے پاک کر دیا۔ اس کارروائی میں ابوحمزہ بھی مارا گیا۔ خوارج سے یہ لڑائیاں مروان کی تخت نشینی کے ساتھ شروع ہوئیں اور تین سال سے زائد عرصے تک جاری رہیں۔ مگر ان تمام شورشوں سے بڑا خطرہ جس نے بنو مروان کی جڑوں کو کاٹ ڈالا، بنو ہاشم کی تحریک تھی۔ ①

بنو ہاشم کی انقلابی دعوت:

دوسری صدی ہجری کے آغاز میں شیعانِ علی میں اندرونی طور پر گروہ بندی ہو چکی تھی جو کچھ اس طرح تھی:

❶ ایک گروہ زید بن علی رحمہ اللہ کا عقیدت مند تھا۔

❷ ایک گروہ ان کے بھائی محمد باقر رحمہ اللہ کا حلقہ بگوش تھا جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سگے پوتے تھے۔

❸ ایک گروہ شعوری یا غیر شعوری طور پر سبائی تحریک کا مہرہ تھا۔ یہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سمیت گزشتہ تمام خلفاء کو ظالم قرار دیتا تھا۔ اس گروہ کے لوگ شیعانِ علی میں گھل مل کر انہیں بار بار بغاوت پر اکساتے تھے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے زید بن علی رحمہ اللہ کی بنو امیہ کے خلاف تحریک کی وجہ یہ ہوئی کہ ان دنوں کوفہ کے حاکم خالد بن عبداللہ قسری کو معزول کر کے اس کا احتساب کیا جا رہا تھا۔ اس نے خود کو بچانے کے لیے حضرت زید بن علی رحمہ اللہ پر بدعنوانی اور غبن کا الزام لگا دیا۔ خلیفہ ہشام نے یہ سن کر تحقیق کے لیے زید بن علی رحمہ اللہ کو دمشق بلا لیا اور پوچھ گچھ میں کچھ سخت کلامی کی جس سے زید بن علی رحمہ اللہ رنجیدہ ہوئے۔ بہرکیف ان کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا اور انہوں نے حلف اٹھا کر اپنی برأت ظاہر کر دی۔ اب ہشام نے انہیں کوفہ بھیج کر وہاں کے نئے حاکم یوسف بن عمر کو لکھا: ''انہوں نے اپنی برأت پر قسمیں کھائی ہیں جن کا میں نے یقین کر لیا ہے۔ میں انہیں تمہارے پاس بھیج رہا ہوں ۔انہیں خالد بن عبداللہ کے سامنے بٹھاؤ تاکہ یہ اس کے منہ پر اس کو جھٹلا سکیں۔'' ②

زید بن علی رحمہ اللہ کوفہ پہنچے تو وہاں مکمل طور پر ثابت ہو گیا کہ الزامات جھوٹے ہیں۔ یوسف بن عمر نے خالد بن عبداللہ کو لعنت ملامت کی اور ان حضرات کو بری قرار دے دیا۔ حضرت زید بن علی رحمہ اللہ اس کے بعد چند ہفتے کوفہ میں رہے۔ اس دوران شیعانِ علی ان سے ملتے رہے اور حکومتی رویے کی سخت مذمت کرتے ہوئے اپنی جانی و مالی خدمات پیش کر کے یقین دلاتے رہے کہ وہ حکم دیں تو مروانی حکومت کا تختہ الٹنا کوئی مشکل نہیں۔ ③

① الکامل فی التاریخ: ۳۳۱/۴ تا ۳۵۸، سنۃ ۱۲۷ھ تا ۱۳۰ھ

② تاریخ دمشق: ۴۶۶/۱۹، ۴۶۷ ③ تاریخ الطبری: ۱۶۶/۷، ۱۶۷، ۱۶۸

اکثر شیعانِ علی نے یہ پیش کش غیر مشروط طور پر کی تھی تاہم غالی شیعوں نے کہا: "ہم آپ کی مدد کے لیے اس شرط پر تیار ہیں کہ آپ حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر سب وشتم کریں۔" حضرت زید بن علی رحمہ اللہ نے فرمایا: "نہیں بلکہ میں تو ان سے محبت کرتا ہوں۔" انتہاپسند شیعہ عناصر تلملا اٹھے اور یہ کہتے ہوئے الگ ہوگئے: "اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے تو ہم آپ سے رفض (بیزاری) ظاہر کرتے ہیں۔" اس دن سے انتہاپسند شیعوں کو روافض کہا جانے لگا اور انہیں باقی شیعانِ علی سے الگ ہونا پڑا۔ اب شیعانِ علی میں تین واضح جماعتیں بن گئیں: ❶ روافض ❷ زیدیہ ❸ شیعانِ بنوفاطمہ یا علوی

① حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے بغض وعداوت رکھنے والا گروہ "روافض" کے نام سے مشہور ہوا۔

② شیعانِ علی کے جو لوگ حضرت زید رحمہ اللہ کے ہم مسلک اور ان کی مسلح جدوجہد کے حامی رہے وہ "زیدیہ" کے نام سے جانے گئے۔ اہلِ سنت سے ان کا بڑا اختلاف دو مسائل میں ہے: پہلا یہ کہ زیدیہ فاسق اور ظالم حکام کے خلاف خروج کو واجب مانتے ہیں، اہلِ سنت کا مسلک یہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ زیدیہ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے افضل ہیں۔ اہلِ سنت کے نزدیک ان کا مقام حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کے بعد ہے۔

③ شیعانِ علی کی تیسری جماعت وہ تھی جو حضرت باقر رحمہ اللہ اور ان کے بعد حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ کے ساتھ وابستہ رہی اور حکومت کے خلاف خروج میں شریک نہ ہوئی۔ یہ حضرات شیعان بنوفاطمہ یا علوی کہلاتے تھے۔ یہ بھی روافض سے نہایت بیزار تھے۔ اور تمام خلفائے راشدین کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ ①

بہرکیف کچھ دن کوفہ میں گزار کر زید بن علی رحمہ اللہ مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ شیعانِ علی ان کے پیچھے پیچھے آئے اور ایک بار پھر ان سے ملاقات کر کے بڑے اصرار کے ساتھ خروج پر آمادہ کرنے لگے۔ ②

تقدیر کی بات کہ زید بن علی رحمہ اللہ ان کی باتوں پر یقین کر کے خروج پر کمربستہ ہوگئے۔ کوفہ میں چالیس ہزار افراد نے ان سے بیعت کرلی۔ تاہم شہر کے دور اندیش حضرات نے انہیں اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ③

آخر زید بن علی رحمہ اللہ نے اہلِ کوفہ کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے خروج کا اعلان کردیا۔ مگر جب وہ مسلح ہوکر حکومت کے مقابلے میں نکلے تو ان کے ساتھیوں کی تعداد ایک ہزار بھی نہ تھی۔ سرکاری فوج نے آسانی سے ان پر قابو پالیا۔ زید بن علی رحمہ اللہ اس جھڑپ کے دوران لڑتے لڑتے قتل ہوگئے۔ یہ واقعہ ۱۲۲ھ کا ہے۔ ④

زید بن علی کے بعد ان کے صاحبزادے یحییٰ حکومت کی گرفت سے بچنے کے لیے خراسان چلے گئے اور کوشش کی کہ ایک بار پھر بنوہاشم کے حامیوں کو اپنے گرد جمع کریں مگر خراسان کے حاکم نصر بن سیار نے انہیں گرفتار کر کے قتل کرادیا۔ ⑤

اسی زمانے میں کچھ لوگوں نے بنوعباس کے خلاف شورشوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی الگ تحریکیں شروع کردیں

---

① سیر اعلام النبلاء: ۳۹۰/۵؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰۷/۱۳

② تاریخ دمشق: ۴۷۸/۹ ③ تاریخ الطبری: ۱۶۹/۷

④ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۳۵۳ ⑤ انساب الاشراف: ۴۳۷/۱

جن میں حارث بن سُرَیج کا نام بہت مشہور ہے۔ اس نے ۱۱۶ھ میں عدل وانصاف کے قیام اور شریعت کے نفاذ کے عنوان سے تحریک شروع کی اور کچھ عرصہ خراسان کے بعض اضلاع پر قابض بھی رہا۔ آخر میں خراسان کے حاکم نصر بن سَیّار نے اس کا زور توڑ دیا اور ۱۲۸ھ میں وہ مرو کے قریب مارا گیا۔ ①

تحریکِ بنو عباس

اسی زمانے میں بنو ہاشم کی عباسی شاخ خفیہ طور پر میدانِ عمل میں اتر کر زیرِ زمین سرگرم تھی۔ اس تحریک کے بانی محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس تھے۔ ان کے والد علی رحمہ اللہ سیاسی کش مکش سے الگ تھلگ رہے، خلفائے بنوامیہ نے انہیں دِمَشق کے مضافاتی گاؤں ''حُمَیْمَہ'' کے آس پاس جاگیر دے دی تھی؛ پس وہ حجاز سے اسی گاؤں میں آگئے تھے۔ ② وہ اکثر اوقات مسجد میں گزارتے، روزانہ پانچ سو نوافل پڑھتے۔ مسافروں کی میزبانی کرتے، غریبوں پر خوب خرچ کرتے۔ خلفاء سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ کبھی کبھی دِمَشق جا کر خلفاء سے ملاقات کرتے تھے۔

پہلی صدی ہجری کے اختتام پر انہی علی بن عبداللہ کے بیٹے یعنی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن علی نے خفیہ طور پر اسی گاؤں سے حکومت مخالف تحریک شروع کی۔ محمد بن علی عباسی کو یہ راہ دِکھانے والے صاحب محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ کے چھوٹے بیٹے عبداللہ ابو ہاشم تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بنو مروان کے خلاف خفیہ انقلابی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ کوفہ کے شیعانِ علی اکثر ان کے پاس آتے جاتے تھے اور انہیں انقلاب کے لیے اکساتے تھے۔ سادات کے دیگر اکابر ان کی سرگرمیوں کو پسند نہیں کرتے تھے؛ اس لیے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے زید رحمہ اللہ نے خلیفہ ولید کو جا کر اس خفیہ تحریک کا بتا دیا۔ ولید بن عبدالملک نے ابو ہاشم کو قید کر دیا۔ پھر عون بن محمد بن حنفیہ اور حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کی سفارش پر چھوڑ دیا۔ غرض بنو ہاشم میں عبداللہ ابو ہاشم وہ پہلے شخص ثابت ہوئے جنہوں نے بنوامیہ کے خلاف ایک انقلابی تحریک کے تصور کو وجود بخشا۔ عبداللہ ابو ہاشم کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی؛ اس لیے ۹۸ھ میں وفات پاتے ہوئے انہوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے محمد بن علی کو اس انقلابی تحریک کی قیادت سونپ دی۔ ③

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اس تحریک کا شیعوں کے عقیدۂ امامت سے دور دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ بالفرض ایسا ہوتا اور فاطمی سادات کا عقیدہ بھی یہی ہوتا تو وہی اس تحریک کی قیادت کرتے۔ مگر ایسا بالکل نہیں ہوا۔ بلکہ یہ واضح ہے کہ اس دور کے فاطمی سادات میں سے زیادہ تر سیاست میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ علمی، ایمانی، اخلاقی اور روحانی خدمات میں مشغول تھے۔ ان حضرات کے اپنے اقوال سے ثابت ہے کہ وہ عقائد ونظریات میں جمہور علمائے اُمت کے ہم نوا تھے۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے بعض حضرات نظام میں تبدیلی اور سادات کی حکومت کے خواہاں تھے اور

---

① الکامل فی التاریخ، سنۃ ۱۱۶ھ، ۱۱۷ھ، ۱۲۷ھ، ۱۲۸ھ؛ المنتظم لابن الجوزی: ۱۶۹/۷

② سیر اعلام النبلاء: ۲۸۵/۵

③ انساب الاشراف: ۸۰،۷۹،۷۵/۳؛ اخبار الدولۃ العباسیۃ، ص ۱۳۱، ۱۷۳ تا ۱۷۶؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۲۹/۴

حکومت کو خلافتِ راشدہ کے طرز پر دیکھنا چاہتے تھے اور ان کے خیال میں یہ ذمہ داری سادات بہتر انجام دے سکتے تھے۔ نیز بنوامیہ کے دور میں ہونے والے واقعۂ کربلا اور اس جیسے بعض سانحوں کی خراشیں ان کے دلوں پر باقی تھیں؛ اس لیے کچھ حضرات حکومت سے طبعی طور پر نالاں تھے، تاہم اس تاثر اور سوچ کے باجود بزرگانِ بنوہاشم کی اکثریت عملی طور پر کسی بھی حکومت مخالف سرگرمی میں ملوث نہیں رہی۔ اس کی بڑی وجہ غالباً یہی تھی کہ دیگر علماء کی طرح ان کے نزدیک بھی وہ شرائط پوری نہیں ہو رہی تھیں جن کے پیشِ نظر خروج واجب ہوتا ہے۔ تاہم انقلابی تحریک چلانے والے بنوہاشم کی سوچ کچھ الگ تھی۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ اہلِ بیت کی خلافت، شریعت کا کوئی اصولِ موضوعہ ہرگز نہیں بلکہ شریعت میں خاندانی حکمرانی اور موروثیت کوئی پسندیدہ چیز بھی نہیں لیکن دوسری طرف وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ بنومروان نے اپنے خاندان کی موروثی حکومت کو ایک اصولِ موضوعہ بنا دیا ہے اور عوام بھی شاہی طرز کے اس اصول کے عادی ہوگئے ہیں۔ ان حالات میں ان حضرات کا یہ سوچنا ایک طبعی بات تھی کہ اگر بدلتے ہوئے حالات میں حکومت کا معیار موروثی ونسبی شرافت ہی مان لیا گیا ہے تو پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان امرِ خلافت کا زیادہ حق دار ہے جو ہر حکمران خاندان سے کہیں افضل واشرف ہے۔ یہ بات نہ صرف ان حضرات کے ذہنوں میں تھی بلکہ کبھی اُمتی دو اور دو چار کی طرح اس حقیقت کو بدیہی طور پر سمجھتے اور محسوس کرتے تھے۔ اگر خلفائے بنومروان لوگوں کے جسموں پر حکومت کرتے تھے تو ساداتِ کرام کی حکومت دلوں پر تھی، اسی لیے حافظ ذہبی رحمہ اللہ حضرت زین العابدین رحمہ اللہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان کی شان بڑی عجیب تھی اور اللہ کی قسم! وہ اسی لائق تھے اور اپنی شرافت، سیادت، علم، للّٰہیت اور کمالِ عقل کی وجہ سے امامتِ عظمیٰ کے حق دار تھے۔"[1]

معاشرے میں ساداتِ کرام کی اس محبوبیت ومقبولیت اور توقیر وتعظیم کے علاوہ سانحۂ کربلا، وقعۂ حرہ، حصارِ کعبہ اور شہادتِ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے لے کر حجاج بن یوسف کے مظالم اور محمد بن قاسم کی اذیت ناک موت تک کتنے ہی واقعات اور سانحے ایسے گزرے تھے جن کی وجہ سے عوام کی اچھی خاصی تعداد حکومت سے بددل تھی۔ اگرچہ ہر حکمران ایسے سانحوں کا ذمہ دار نہ تھا مگر یہ بات ذہنوں میں رچ بس گئی تھی کہ بنوامیہ ایک سیاسی گروہ کی حیثیت سے ناکام ہوگئے ہیں اور اب انہیں ہٹا کر دوسری جماعت کو اقتدار کا موقع دینا چاہیے۔ سبائی اس انقلاب سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے درپے تھے۔ ان کے پروپیگنڈے نے اس تاثر کو مزید شدت سے پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ان پہلوؤں کے پیشِ نظر بنوہاشم کے یہ قائدین بہرصورت خروج کرنا چاہتے تھے۔ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ موجودہ طرزِ حکومت میں آنے والا بگاڑ فقط وعظ ونصیحت، حکمران کی اصلاح یا حاکم کی تبدیلی سے ختم نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے کوئی انقلاب لا کر پورے خاندانی نظام کو یکسر تبدیل کرنا ہوگا۔ ان کے خیال میں خروج کے جواز کے لیے حکام کا ظالم یا فاسق ہونا کوئی ضروری نہ تھا۔ بلکہ گزشتہ حکام کے مظالم کی بنیاد پر موجودہ حکومت کا تختہ الٹ دینا بالکل جائز تھا؛ کیوں

[1] سیر اعلام النبلاء: ۳۹۸/۴

کہ یہ سب ایک ہی خاندان کے حکمران ہونے کی حیثیت سے ایک ہی سیاسی گروہ تھے جس کی حکمتِ عملی یکساں تھیں۔ غالباً ان حضرات کو قوی امید تھی کہ اگر حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلائی جائے تو عوام ان کا بھرپور ساتھ دیں گے اور کسی بڑے خون خرابے کے بغیر ان کی حکومت بن جائے گی۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

''آلِ عباس سے لوگ محبت کرتے تھے، اسی طرح آلِ علی سے بھی محبت کرتے تھے۔ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل سے محبت اور آلِ مروان سے نفرت کی وجہ سے چاہتے تھے کہ حکومت ان (بنوہاشم) کو مل جائے۔ ایک زمانے تک لوگ اسی حالت پر رہے، یہاں تک کہ اس کے اسباب مہیا ہو گئے اور ان کی حکومت آ گئی جو خراسان سے ظاہر ہوئی۔''[1]

محمد بن علی عباسی کی تحریک:

محمد بن علی نے عبداللہ ابوہاشم کی نیابت میں انقلابی تحریک کو پروان چڑھایا۔ انہوں نے دِمشق کے قریبی دیہات ''حُمَیْمَہ'' ہی کو جہاں ان کی رہائش تھی، خفیہ مرکز بنایا۔ بظاہر ان کا سارا وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ یہاں ان کا موروثی باغ تھا جس میں پانچ سو درخت لگے تھے۔ محمد بن علی روزانہ ہر درخت کے نیچے دو رکعت نفل ادا کرتے تھے۔[2]

۱۰۲ھ میں انہوں نے بنوہاشم کی حکومت قائم کرنے کے لیے خفیہ تحریک کا باقاعدہ آغاز کیا اور اپنے خاص مریدوں کو اس مقصد کے لیے خراسان بھیجا۔ جب وہاں ستر افراد ہم خیال بن گئے تو ان میں سے بارہ کو ''داعی'' مقرر کر دیا گیا۔ ہر داعی کے تیار کردہ لوگوں میں سے بارہ نقیب منتخب ہوئے۔ ہر نقیب کے ماتحت ۷۰ عامل کام کرنے لگے۔ ان میں سے کوئی بھی ''امام'' سے واقف نہ تھا۔ امام کے نائب کو ''داعی الدعاۃ'' کا نام دیا گیا۔ جن لوگوں سے ''امام'' کے لیے بیعت لی گئی ان کی فہرستیں بنائی گئیں۔ بیعت کرنے والوں کے ذمے تھا کہ وہ اپنی آمدن کا پانچواں حصہ (بیس فیصد) سالانہ ''امام'' کو دیں۔ داعیوں کی وساطت سے یہ رقم امام کو پہنچتی تھی جسے تحریک کی ضروریات پر خرچ کیا جاتا تھا حکومت کے ڈر سے رکنیت سازی کا کام بہت احتیاط سے ہو رہا تھا۔ اس بات کو خفیہ رکھا گیا کہ بیعت کس شخص کے لیے لی جا رہی ہے تاکہ اگر حکومت کسی داعی کو گرفتار کر بھی لے تو تحریک کے پیشوا کے خلاف کوئی گواہی نہ مل سکے۔[3]

محمد بن علی نے سب سے زیادہ توجہ خراسان اور اس کے بعد عراق پر دی جہاں بہت سے لوگ عجمی تعصب کے باعث عربوں کے اقتدار سے متنفر تھے۔ ان لوگوں نے یہ سوچ کر کہ نئے حکومتی نظام میں عجمیوں کو معقول حصہ ملے گا، اس تحریک میں بہت دلچسپی لی۔ انقلابیوں کا شعار (خاص نعرہ) ''الرضا من آل محمد'' (آلِ محمد پر اعتماد) تھا۔ ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل و اولاد کی قیادت ہر مسلمان کے لیے طبعی طور پر ایک محبوب چیز ہے؛ اس لیے لوگ تیزی

---

① سیر اعلام النبلاء: ۵۸/۶

② انساب الاشراف: ۸۷/۳

③ انساب الاشراف: ۸۷/۳؛ اخبار الدولۃ العباسیۃ، ص ۱۹۱، ۲۱۹ تا ۲۲۲؛ تاریخ ابن خلدون: ۲۱۷/۳؛ الاعلام زرکلی: ۲۷۱/۶؛ التاریخ الاسلامی، محمود شاکر: ۳۱/۵ تا ۳۳

سے اس سے متفق ہوتے چلے گئے۔ محمد بن علی نے شیعانِ علی کے تمام گروہوں کو اپنے ساتھ منسلک رکھنے کے لیے ایک ماہر سیاست دان کی طرح اسلام کے سیاسی نظریات اور گزشتہ شخصیات کے بارے میں اپنی رائے کو مبہم کر رکھا۔ انہوں نے سیاسی مصلحت کے تحت ''خلیفہ'' اور ''خلافت'' کی جگہ ''امام'' اور ''امامت'' کی اصطلاحات استعمال کیں، اسی طرح یہ پرچار بھی کیا کہ بنوہاشم کی موجودگی میں کسی اور کو امامت کا حق نہیں؛ لہٰذا بنوامیہ کے بھی حکام ظالم اور غاصب چلے آتے ہیں۔ اسی بناء پر محمد بن علی کے داعی بنوامیہ اور بنومروان کے مظالم اور برائیاں بیان کر کے عوام کو اشتعال دلاتے رہے۔ اس مقصد کے لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث کو خاص طور سے بیان کیا جانے لگا۔ اس طرح سبائیوں سمیت شیعانِ علی کے تمام گروہ ان کے ساتھ رہے مگر حکومت قائم کرنے کے بعد عباسیوں نے شیعی عقیدۂ امامت کی جگہ خلیفہ اور خلافت کی اصطلاحات استعمال کیں۔ دراصل امام اور امامت کا چرچا ایک سیاسی حکمتِ عملی تھی تا کہ روافض سمیت ہر گروہ اس میں حصہ لے اور سمجھے کہ اس دعوت کے پیچھے ایک عبقری ''امام'' موجود ہے۔ ①

مگر سیاسی مفاد کے لیے دینی تعبیرات میں ترامیم، حدودِ شرع سے تجاوز اور ماتحتوں کو تھوڑے سے نظریاتی انحراف کی گنجائش دینے کے نتائج بڑے خطرناک نکلے اور نچلے طبقے نے بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ بعض داعیوں نے سیاسی حربے کے طور پر تاریخی روایات میں کچھ اضافے کر لیے اور نہ صرف اموی دور میں پیش آنے والے سانحوں اور ان کے حکام کی برائیوں میں بھی مبالغہ آرائی کی بلکہ کچھ احادیث بھی از خود گھڑ لیں۔ خصوصاً متشدد شیعانِ علی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلفائے ثلاثہ سے افضل ہونے کی جعلی احادیث مشتہر کر دیں اور بہت سے لوگوں نے تیزی سے یہ عقیدہ قبول کر لیا۔ اس دور کے مشہور محدث امام اعمش رحمہ اللہ (م ۱۴۷ھ) فرماتے تھے: ''مجھے توقع نہ تھی کہ میں ایسے زمانے تک زندہ رہوں گا جس میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فوقیت دی جانے لگے گی۔'' ②

غرض بنوعباس نے وقتی مصلحتوں اور سیاسی اغراض کے لیے بعض دینی اقدار کو نظر انداز کرنا گوارا کر لیا۔ یوں نظام حکومت کی جن خرابیوں کے سدباب کا دعویٰ کر کے وہ کھڑے ہوئے تھے، پہلے دن سے وہ خود ان میں مبتلا ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عباسی تحریک میں فقہاء و محدثین اور مصلحین کی نمائندگی دکھائی نہیں دیتی اور اسی لیے ان عباسی قائدین کو فقط سیاست دان سمجھا گیا اور علماء نے ان کا ذکر ''رحمہ اللہ'' یا ''حضرت'' جیسے آداب کے ساتھ نہیں کیا۔

حکام کی طرف سے عباسی داعیوں کی پکڑ دھکڑ:

ایک مدت تک امویوں کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ ان کے پایۂ تخت کے قریبی گاؤں سے ایک تحریک نکل کر پورے ملک میں پھیل چکی ہے مگر آخر کار انہیں سُن گُن مل گئی اور انہوں نے ہر طرف جاسوس پھیلا کر گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ عراق کے حاکم خالد بن عبداللہ قسری نے بہت سختی برتی۔ کوئی بھی عباسی داعی اس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ عموماً

① اخبار الدولۃ العباسیۃ، ص ۱۸۰ تا ۲۰۰؛ انساب الاشراف: ۳/۸۰ تا ۸۷
② المعرفۃ والتاریخ للفسوی: ۲/۷۶۳، ط موسسۃ الرسالۃ

اس کی گردن اڑا دیتا۔ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے جو دو تین سو کوڑے کھا کر چھوٹ جاتے۔

۱۲۵ھ میں ۷۰ سالہ محمد بن علی نے وفات پائی۔ اس سے قبل انہوں نے اپنے بیٹے ابراہیم کو جانشین مقرر کر دیا تھا۔ ابراہیم نے تحریک کو مزید منظم کیا اور عراق، خراسان، مصر اور حجاز سمیت ہر صوبے کے مستقل ذمہ دار مقرر کر دیے۔ ①

❁❁❁

ابومسلم خراسانی اور عباسی تحریک کا غلبہ

اس دوران ابراہیم کو ابومسلم خراسانی جیسا زیرک اور وفادار نوجوان مل گیا جس کی زباں آوری اور مکر وفریب میں نے چند ہی سالوں میں پامیر کی چوٹیوں سے لے کر دجلہ کے ساحل تک لوگوں کو بنوامیہ کے خلاف کھڑا کر دیا۔ ایرانی النسل ابومسلم خراسانی کا اصل نام عبدالرحمن بن مسلم تھا۔ ۱۰۰ھ میں اصفہان میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ۱۲۰ھ میں محمد بن علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کا معتمدِ خاص بنا۔ ان کی وفات کے بعد ۱۲۵ھ میں ابراہیم کا دستِ راست بنا۔ ۱۲۸ھ میں وہ خراسان کا داعی مقرر ہو کر وہاں پہنچا اور بہت جلد ہزاروں لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔ ②

ہشام بن عبدالملک کے بعد دو سال میں تین خلفاء تبدیل ہوئے جس سے صوبے داروں میں خودسری اور لاپرواہی پیدا ہوگئی۔ ساتھ ہی عرب قبائل کی باہمی عصبیت عروج پر پہنچ گئی۔ حد یہ ہے کہ دارالخلافہ دِمشق میں بھی یمانی اور مضری ایک دوسرے کے ساتھ نماز پڑھنے کے روادار نہ رہے۔ شہر کی ہر مسجد میں دو محرابیں قائم کر لی گئیں، جامع اُموی میں یمانی اور مضری قبائل کے دو امام دو منبروں پر الگ الگ خطبے دیتے تھے اور الگ الگ امامت کراتے تھے۔ ③

اُدھر خراسان میں یمانی قبائل نے جُدَیع بن علی کرمانی کے گرد جمع ہو کر حاکم نصر بن سَیّار کے خلاف بغاوت کر دی جبکہ مضری قبائل نصر بن سیار کے گرد جمع ہو گئے۔ نصر بن سَیّار نے جُدَیع بن علی کرمانی کو دھوکے سے بلا کر قتل کرایا تو باغی قبائل مقتول کے بیٹے علی بن جُدَیع کی قیادت میں جمع ہو گئے اور خانہ جنگی کی آگ مزید بھڑک اٹھی۔ ابومسلم خراسانی اس دوران فریقین میں سے ہر ایک کو اپنی حمایت کا یقین دلاتا رہا۔ جب کئی ماہ کی خانہ جنگی سے نصر بن سیار کی قوت شکستہ ہوگئی تو ابومسلم علی بن جدیع سے اتحاد کر کے حکومت کے مقابلے پر آ گیا۔ نصر بن سیار کو اس وقت کمک کی ضرورت تھی۔ اس نے کئی مراسلے دمشق بھیجے مگر اسے کوئی مدد نہ ملی کیوں کہ مروان بن محمد خوارج سے برسرِ پیکار تھا۔ ④

اس دوران مروان کے جاسوسوں نے ابومسلم کا ایک خط اور اس کے جواب میں ابراہیم عباسی کا مراسلہ پکڑ لیا۔ اس خط وکتابت میں خراسان میں تعینات تمام عرب سرداروں اور سپاہیوں کو قتل کر دینے کا عندیہ بھی تھا۔ مروان بن محمد نے

---

① انساب الاشراف: ۳/۸۰ تا ۱۱۷

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۳۳۲؛ سیر اعلام النبلاء: ۶/۴۹ ③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۲۵۹

④ تاریخ الطبری: ۷/۳۵۳ تا ۳۷۱؛ الکامل فی التاریخ: ۳/۳۵۸ تا ۳۶۰؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۲۴۳ تا ۲۴۷

یہ پختہ ثبوت ہاتھ لگتے ہی ابراہیم عباسی کو گرفتار کر کے عباسی تحریک کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ ابراہیم نے لاعلمی ظاہر کی۔ مروان نے وہ خطوط پیش کر دیے۔ ابراہیم کے پاس کوئی جواب نہ رہا۔ مروان نے ابراہیم عباسی کو قتل کرا دیا۔ ①

تاہم اس کے باوجود بنوعباس کی تحریک رُکنے میں نہ آئی۔ دراصل انہوں نے عام مسلمانوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ ہم خاندانِ رسالت کے افراد ہیں؛ اس لیے پوری طرح کتاب وسنت کے مطابق حکومت کریں گے۔ تحریک کے نعرے ''الرضا من آل محمد'' کا مطلب یہی تھا۔ تحریک کے دوران ''خاندانِ رسالت'' کا مفہوم عام تھا اور بنوعباس یا بنوفاطمہ کا امتیاز نہ تھا۔ بنوعباس تنہا اس تحریک میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے؛ اس لیے انہوں نے بڑی ہوشیاری سے بنوفاطمہ کے کچھ بزرگوں کو اپنے ساتھ رکھا جن میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے پوتے عبداللہ بن حسن اور ان کے فرزند محمد بن عبداللہ نمایاں تھے جنہیں ان کی نیکی اور پرہیزگاری کے باعث ''نفسِ زکیہ'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

اس دوران اگلے خلیفہ کا کوئی تعین نہ تھا کہ وہ بنوہاشم کے کس خاندان سے ہوگا؛ اس لیے علوی اور فاطمی خاندان کے عقیدت مند بھی اس امید پر کام کر رہے تھے کہ خلافت اولادِ علی کو ملے گی۔ یوں تحریک کو ہر طبقے کی حمایت حاصل رہی۔ جب مروان بن محمد کے دور میں بنوامیہ کی حکومت چند دنوں کی مہمان دکھائی دینے لگی تو ۱۳۰ھ کے ایام حج کے دوران مکہ معظمہ میں بنوہاشم کے سیاسی قائدین کا خفیہ اجلاس ہوا جس میں سفاح کا بڑا بھائی ابوجعفر منصور بھی شامل تھا۔ اس مجلس میں یہ طے کیا گیا کہ کامیابی کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے محمد بن عبداللہ نفس زکیہ کو خلیفہ مانا جائے گا۔ ②

تاہم عباسی خانوادے کے بعض داعی پیش بندی کے طور پر ایسی مشکوک روایات بھی مشتہر کر رہے تھے جن سے عباسیوں کی فوقیت ثابت ہو۔ مثلاً: مشہور کیا گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو خبر دی تھی کہ ایک دن خلافت ان کی اولاد میں آ کر رہے گی۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ روایت درست نہیں۔'' ③

ابنِ ہُبیرہ کا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر ظلم:

مروان بن محمد نے عباسیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت پر قابو پانے کے لیے عراق میں ابنِ ہُبیرہ (یزید بن عمر) کا تقرر کیا مگر وہ اپنی شجاعت اور سخاوت کے باوجود معاملات کو نہ سنبھال سکا اور ظلم وستم پر اُتر آیا۔ عراق کے سب سے بڑے فقیہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کے ظلم کا شکار ہوئے اور انہیں حاکم کے حکم سے سر تا پا پر کوڑے لگائے گئے۔ اس کے بعد امام صاحب کوفہ چھوڑ کر حجاز چلے گئے اور اُموی حکومت کے خاتمے تک زیادہ تر وہیں قیام پذیر رہے۔ ④

ابوالعباس سَفّاح کا ظہور:

ابراہیم کے دو بھائی تھے: ابوالعباس سَفّاح اور ابوجعفر منصور۔ ابراہیم کے قتل ہوتے ہی یہ دونوں شام سے فرار ہو کر

① تاریخ الطبری: ۷/۴۳۵ تا ۴۳۷؛ انساب الاشراف: ۴/۱۲۱، ۱۲۲

② تاریخ ابن خلدون: ۳/۲۳۵، ۲۳۶؛ تجارب الامم وتعاقب الھمم لابن مسکویہ: ۳/۳۷۹

③ سیر اعلام النبلاء: ۶/۵۸ ④ ابوحنیفۃ، حیاتہ وعصرہ، شیخ محمد ابوزہرہ مرحوم: ص ۳۰ تا ۳۲

عراق پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے کوفہ میں اپنے حامیوں کے پاس پناہ لی۔ ادھر سے ابومسلم خراسانی آن پہنچا۔ اس مجلسِ مشاورت میں ابوالعباس سفّاح کو عباسی تحریک کا نیا امام مان لیا گیا۔ سفّاح نے قیادت سنبھالتے ہی ابومسلم کو یہ حکم دے کر دوبارہ خراسان بھیجا کہ ایک مقررہ تاریخ میں پورے خراسان کے عباسی رضا کار منظرِ عام پر آجائیں۔ مقررہ تاریخ کو سرحداتِ فارس سے خراسان کی آخری حدود تک ہر شہر کے عباسی رضا کار سیاہ لباس پہنے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر حاکمِ خراسان نصر بن سیار بھونچکا رہ گیا اور جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ مگر ابومسلم کے پاس اب ایک لاکھ سے زائد جنگجو تھے۔ نصر بن سیار مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور فرار ہوگیا۔ ابومسلم نے کسی مشکل کے بغیر مرو پر قبضہ کرلیا اور پھر سمرقند سے عراق تک ہر شہر میں اپنے حاکم مقرر کردیے۔ ابومسلم عربوں سے دلی دشمنی رکھتا تھا؛ اس لیے جب وہ طاقت میں خودکفیل ہوگیا تو اس نے خراسان میں مقیم عربوں کو قتل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، یہاں تک کہ اپنے اتحادی عرب سردار علی بن جُدَیع کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا۔①

اُدھر مروان بن محمد خوارج کی بغاوت کو دبانے میں مصروف تھا۔ اس دوران پورے خراسان اور ایران وعراق پر ابومسلم کا قبضہ مکمل ہوچکا تھا۔

مروان نے آخری کوشش کے طور پر الجزیرہ اور شام کی تمام افواج جمع کرکے موصل کے قریب دریائے زاب کے کنارے خیمہ گاہ لگائی جس میں ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی تھے۔ ادھر سے سفّاح کا چچا عبداللہ بن علی مقابلے پر آیا۔ ایک خونریز جنگ کے بعد مروان کو شکست ہوئی اور اس کے ہزاروں سپاہی دریا کی نذر ہوگئے جن میں صرف اموی امراء اور شہزادوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی۔ انہی میں ولید بن عبدالملک کا بیٹا سابق خلیفہ ابراہیم بھی تھا۔ یہ واقعہ ۱۱ جمادی الآخرہ ۱۳۲ھ کا ہے۔②

مروان شکست کھا کر پہلے موصل اور پھر شام پہنچا مگر ہر شہر میں بغاوت پھوٹ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر مروان مصر چلا گیا۔ ادھر رمضان ۱۳۲ھ میں عبداللہ بن علی نے کسی دشواری کے بغیر دِمشق کو فتح کرلیا۔ اس نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے سوا، تمام اُموی خلفاء کی قبریں کھدوا ڈالیں اور ان کی بچی کھچی ہڈیوں کو جمع کرکے نذرِ آتش کردیا۔ پھر وہ بنوامیہ کے لگ بھگ اَسّی شہزادوں اور عمائد کو جان کی امان دے کر نہر ابی فطرُس کے کنارے لے گیا اور انہیں بندھوا دیا۔ پھر اس کے اشارے پر خراسانی مکوں، لاتوں اور لاٹھیوں سے ان پر ٹوٹ پڑے یہاں تک کہ ان میں سے کوئی زندہ نہ بچا۔③

مروان کو مصر میں یہ اطلاع ملی تو وہ افریقہ میں پناہ لینے نکل کھڑا ہوا۔ مگر عباسی سپاہی اس کے تعاقب میں تھے۔ مروان بوصیر نامی قصبے کے کسی گرجے میں آرام کے لیے ٹھہرا ہوا تھا کہ عباسی سپاہی وہاں پہنچ گئے اور اسے وہیں قتل

① تاریخ الطبری: ۷/۷۷۳ تا ۳۸۸؛ الکامل فی التاریخ: ۴/۳۶۰ تا ۳۶۹

② البدایۃ والنھایۃ: ۱۳/۲۵۳ تا ۲۵۶؛ تاریخ الطبری سنۃ ۱۳۲ھ؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۴۰۳

③ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۴۰۰ تا ۴۰۳؛ الکامل فی التاریخ: ۵/۱۸، ۱۹؛ انساب الاشراف للبلاذری: ۴/۱۰۲، ۹/۳۳۱

کر دیا۔ یہ واقعہ ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۲ھ کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تین براعظموں میں پھیلی ہوئی دولتِ اُمویہ کا خاتمہ ہوگیا۔
مروان بن محمد کی عمر ۵۸ سال تھی، اس نے پانچ سال دس ماہ حکومت کی جس میں اسے ایک دن بھی چین کا نہیں ملا۔ ①

بنوسفیان و بنومروان کے دور پر ایک نگاہ:

بنوامیہ کی حکومت لگ بھگ ۸۳ سال تک رہی۔ چوبیس سال تک اقتدار بنوامیہ کی سفیانی شاخ کے پاس رہا جس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، یزید اور معاویہ بن یزید خلیفہ ہوئے۔ بنومروان کی حکومت ۷۳ھ سے ۱۳۲ھ تک تقریباً ۵۹ سال رہی جس میں عبدالملک، ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور دیگر خلفاء سمیت کل دس حکمران گزرے۔

فتوحات کے لحاظ سے بنوامیہ کے بعد ان کی ہم پلہ کوئی اسلامی حکومت کہیں قائم نہیں ہوسکی۔ صرف ولید بن عبدالملک کے دور کی فتوحات دیکھی جائیں تو بنوعباس اپنے پانچ صد سالہ دور میں اس کا نصف علاقہ بھی فتح نہیں کرسکے۔ علوم وفنون اور ترقیاتی کاموں کے لحاظ سے بھی یہ نہایت شاندار دور تھا جیسا کہ مختلف خلفاء کے حالات کے تحت ان کے کارناموں کی بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں۔ تاہم بہت سے اموی خلفاء سیاسی مصالح اور بالخصوص اقتدار کی خاطر شریعتِ مطہرہ کی پابندیوں کو جب چاہتے توڑ دیتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پورے اُموی دور میں اعلیٰ حکام سے لے کر عام افسران تک بھی اسلام کے بہترین نظامِ حیات ہونے کے قائل تھے اور ملک کا قانون اسلامی ہی تھا مگر عموماً حکمران سیاسی مفاد کے لیے جائز یا ناجائز کی پروا نہیں کرتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اس مزاج کی اصلاح پر کمربستہ رہے، ان کی مساعی کا اثر بعد کے چند خلفاء میں واضح دکھائی دیتا ہے۔ تاہم عباسی تحریک کا مقابلہ وہ بھی نہ کرسکے اور دیکھتے ہی دیکھتے دولتِ اُمویہ کا قصرِ رفیع زمیں بوس ہوگیا۔

دولتِ بنوامیہ (بنوسفیان و بنومروان) کے زوال کے اسباب:

عام خیال ہے کہ بنوامیہ کی عظیم الشان حکومت کا زوال ولیدِ ثانی کی تخت نشینی کے ساتھ شروع ہوا تھا مگر درحقیقت اس کی شکستگی کے اصل اسباب بہت پہلے پیدا ہوچکے تھے۔ ذیل میں ہم ان اسباب پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں:

① اس زوال کا بنیادی سبب بادشاہت سے ملتا جلتا خاندانی اور موروثی طرزِ حکومت اختیار کرنا تھا۔ اس سے دوسرے قبیلوں اور خاندانوں میں حسد اور عداوت کے جذبات پیدا ہوئے اور حکومت مخالف تحریکوں کو تقویت ملی۔

② خاندان کے اندر انتقالِ اقتدار کے لیے بھی کوئی مربوط لائحہ عمل نہیں طے کیا گیا۔ کم عمر لڑکے جن کی قابلیت کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا، ولی عہد بنادیے جاتے تھے۔ ولی عہد اگر نالائق ثابت ہوتا تب بھی اقتدار اسی کو ملتا۔

③ یکے بعد دیگرے ایک سے زائد ولی عہد بنانے کا رواج بھی پڑ گیا۔ اس سے خود خاندان میں پھوٹ پڑنے لگی؛ کیوں کہ پہلا ولی عہد حکمران بننے کے بعد عموماً دوسرے کو برطرف کر کے اپنی اولاد کو ولی عہد بنانا چاہتا اور محروم کیا جانے والا ولی عہد بغاوت پر آمادہ ہوجاتا اور کچھ امراء اس کے حمایتی بن جاتے۔

① تاریخ خلیفہ ابن خیاط، ص ۳۰۰ تا ۳۰۴؛ انساب الاشراف: ۹/ ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۷؛ الکامل فی التاریخ: ۵/ ۸ تا ۲۰

④ بنوامیہ کے بعض حکمرانوں کے غلط سیاسی اقدامات اور مظالم نے بھی عوام کو حکومت سے متنفر کیا۔ خصوصاً یزید کے دور میں وقوع پذیر ہونے والے سانحۂ کربلا، وقعہ حرہ اور حجاج بن یوسف کے ہاتھوں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور سعید بن جُبیر رحمہ اللہ جیسے بزرگوں کی شہادت نے علماء، فقہاء اور بزرگانِ اُمت کی بڑی تعداد کو حکومت سے بددل کر دیا تھا۔ بنوعباس مظالم کے ازالے، انصاف کی فراہمی اور ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا منشور لے کر کھڑے ہوئے تھے؛ اس لیے لوگوں نے اس پرکشش نعرے پر لبیک کہا۔

⑤ بعض خلفاء جیسے یزید بن معاویہ اور ولید ثانی کے فسق و فجور نے بھی عوام و خواص کو حکومت سے بے زار کیا۔

⑥ بدعقیدہ جماعتوں خصوصاً سبائیہ اور خوارج نے خلافتِ بنوامیہ کو سخت نقصانات سے دوچار کیا۔ خوارج کھلے عام لڑ کر حکومت کو مختلف نازک ترین مواقع پر شدید آزمائشوں سے دوچار کرتے رہے۔ سبائیہ شیعانِ علی کو استعمال کر کے اندرونِ خانہ حکومت مخالف جذبات بھڑکاتے اور لوگوں کو حکام سے متنفر کرتے رہے۔

⑦ بنوامیہ نے خالص عربوں کی حکومت قائم کی تھی۔ اس کی حکمت چاہے کچھ بھی ہو مگر اس سے عجمی لوگوں میں احساسِ محرومی کا پیدا ہونا فطری بات تھی؛ اس لیے انہوں نے حکومت کی تبدیلی کا خیر مقدم کیا اور بنوعباس کا ساتھ دیا۔

⑧ بنوامیہ کی عربی حکومت یمانی اور مضری قبائل کے اتحاد کے بل بوتے پر قائم تھی۔ جب یہ قبائل باہم دست و گریباں ہوئے تو عالمِ اسلام سے بنوامیہ کی بساط آناً فاناً لپٹ گئی۔

بنوعباس کی کامیابی کی وجوہات:

بنوامیہ کے خلاف بنوعباس کی کامیابی کی اہم وجوہ درج ذیل ہیں:

① بنوعباس نے بنوامیہ کے خلاف ہونے والی متعدد ناکام بغاوتوں کا بغور مشاہدہ کیا اور ان کی غلطیوں سے بچ کر الگ انداز میں اپنی دعوت خفیہ طور پر چلائی۔

② عباسی قائدین میں حزم و احتیاط، معاملہ فہمی اور دور اندیشی کی صفات خاندانی طور پر موجود تھیں؛ اس لیے انہوں نے حکومت کے دورِ عروج میں اپنی تحریک کو پوشیدہ رکھا اور مکمل تیاری تک اپنی قوت کو ایک بار بھی ضایع نہیں کیا۔

③ بنوعباس نے خروج کے لیے مناسب ترین وقت کا انتظار کیا اور راست اقدام اس وقت کیا جب حکومت اندرونی خانہ جنگیوں سے بالکل کمزور ہو چکی تھی اور کوئی مزید دھچکا سہنے کے قابل نہ تھی۔

④ بنوعباس نے تحریک کے لیے عوامی نفسیات کا مطالعہ کیا اور ''دعوتِ آلِ محمد'' جیسے نہایت مؤثر نعرے مقرر کیے۔

⑤ بنوامیہ کی حکومت میں عجمیوں کو کلیدی عہدوں سے دور رکھا گیا تھا۔ بنوعباس نے انہی کو خوش کن وعدوں سے گرویدہ بنا کر اپنے ساتھ ملایا اور ان کی قوت کو کامیابی سے استعمال کیا۔

⑥ بنوعباس کی تنظیم سازی بہت بھرپور اور مربوط تھی۔ راست اقدام سے پہلے وہ اندرونی سطح پر نفوذ کر چکے تھے اور عوام اور حکومت کے درمیان ربط وضبط کی جڑیں کاٹ کر ایک غیر اعلانیہ متوازی حکومت بنا چکے تھے۔

⑦ بنوعباس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے باعث شرافتِ نسبی میں بنوامیہ سے بہت بڑھ کر تھے؛ اس لیے جب عام لوگوں کے سامنے دو خاندانی حکومتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کا سوال آیا تو انہوں نے ہاشمیوں کو ترجیح دی۔

⑧ بنوعباس نے اپنی تحریک کے دوران خبر رسانی کا نظام بہت فعال بنایا تھا، انہیں حکام کے عزائم کی پل پل خبر ملتی رہتی تھی جبکہ بنوامیہ کے آخری حکمرانوں نے اس شعبے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ یوں آخر میں ان کے پاس بحران سے نمٹنے کا وقت ہی نہ رہا۔

❁❁❁

جدول

عہدِ بنوامیہ مع خلافتِ زبیریہ

نمبر	حکمران	دورِ حکومت	کردار	خاص انقلاب
۱	حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ	۴۱ھ تا ۶۰ھ ۶۶۱ء تا ۶۸۰ء	صحابی	اموی خلافت کا قیام
۲	یزید بن معاویہ	۶۰ھ تا ۶۴ھ ۶۸۰ء تا ۶۸۳ء	ظالم و فاسق	سانحہ کربلا، سانحہ حرہ
۳	معاویہ بن یزید	۶۴ھ ۶۸۳ء	نیک سیرت	چالیس دن کے بعد حکومت شوریٰ کے حوالے
۴	عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ	۶۴ھ تا ۷۳ھ ۶۸۴ء تا ۶۹۲ء	صحابی	شرعی خلیفہ جنہیں بنومروان کی بغاوت کا سامنا رہا۔
۵	مروان بن حکم	۶۴ھ تا ۶۵ھ ۶۸۴ء تا ۶۸۵ء	عالم فاضل مگر بعض قبیح کاموں میں ملوث	عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شرعی خلافت کے بالمقابل شام میں امویوں کی باغی حکومت قائم کی
۶	عبدالملک بن مروان	۷۳ھ تا ۸۶ھ ۶۹۲ء تا ۷۰۵ء	عالم فاضل، باصلاحیت، مدبر، سخت گیر	عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت ختم کر کے عالم اسلام پر قبضہ کیا۔ حجاج بن یوسف کا عروج
۷	ولید بن عبدالملک	۸۶ھ تا ۹۶ھ ۷۰۵ء تا ۷۱۴ء	جفاکش، فاتح، سخت گیر	سندھ، وسط ایشیا اور اندلس کی فتح

۸	سلیمان بن عبدالملک	۹۶ھ تا ۹۹ھ ۷۱۴ء تا ۷۱۷ء	نیک سیرت، سیاسی سوجھ بوجھ میں کمزور	فتوحات کا سلسلہ رک گیا۔
۹	عمر بن عبدالعزیز	۹۹ھ تا ۱۰۱ھ ۷۱۷ء تا ۷۲۰ء	خلافتِ راشدہ کا عکس	احیائے شریعت اور مظالم کا احتساب
۱۰	یزید بن عبدالملک	۱۰۱ھ تا ۱۰۵ھ ۷۲۰ء تا ۷۲۳ء	متوسط	بنوعباس کی خفیہ تحریک شروع، خوارج اور ترکوں کی بغاوتیں
۱۱	ہشام بن عبدالملک	۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ ۷۲۳ء تا ۷۴۳ء	نیک سیرت، مجاہد	زید بن علی کا خروج۔ فرانس کا جہاد۔ ترکوں پر فتح
۱۲	ولید بن یزید بن عبدالملک	۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ ۷۴۳ء تا ۷۴۴ء	فاسق وفاجر	زوال کا آغاز
۱۳	یزید ثالث	جمادی الآخرہ تا ذو الحجہ ۱۲۶ھ اپریل تا اکتوبر ۷۴۴ء	نیک سیرت	بہت مختصر مگر اچھی حکومت
۱۴	ابراہیم بن ولید	ذوالحجہ ۱۲۶ھ تا صفر ۱۲۷ھ اکتوبر تا دسمبر ۷۴۴ء	برائے نام حکومت	حکومت تیزی سے روبہ زوال
۱۵	مروان بن محمد	۱۲۷ھ تا ۱۳۲ھ دسمبر ۷۴۴ء تا اگست ۷۵۰ء	نیک سیرت، بہادر	آخری اموی حکمران۔ بنوعباس کا علانیہ خروج۔ مروانیوں کو شکستِ فاش

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ یزید بن عبدالملک کے دور کی اہم عسکری مہمات پر روشنی ڈالیے۔
❷ ہشام بن عبدالملک کے دور میں فرانس میں ہونے والے جہاد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
❸ ہشام بن عبدالملک کے اخلاق و کردار پر نوٹ تحریر کریں۔
❹ بنو مروان کے زوال کے حوالے سے ولید بن یزید کے دورِ حکومت کو آپ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟
❺ عباسی تحریک پر ایک مختصر مگر جامع نوٹ تحریر کیجیے۔
❻ ابو مسلم خراسانی کون تھا اور عباسی تحریک کی اثر انگیزی میں اس کا کردار کیا رہا؟
❼ مروان بن محمد کو عباسیوں کے مقابلے میں کیوں شکست ہوئی؟
❽ بنو مروان کے زوال کے اسباب کیا تھے؟

عملی کام:

❁ نقشے پر دریائے زاب کو تلاش کریں جہاں بنو مروان کے آخری حکمران مروان بن محمد کو شکست ہوئی تھی۔
❁ ایک چارٹ بنا کر خلفائے بنو مروان میں سے ہر ایک کے دورِ حکومت کی ابتداء و انتہاء کو واضح کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ تاریخ ابن خلدون...... علامہ عبدالرحمن ابن خلدون رحمہ اللہ (دولتِ اُمویہ)
❁ تاریخ الخلفاء...... امام سیوطی رحمہ اللہ (عبدالملک بن مروان تا مروان بن محمد)
❁ البدایۃ والنہایۃ...... حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (سنہ ۱۰۱ھ تا ۱۲۵ھ کے حالات)

❁❁❁

پانچواں باب

عہدِ اُموی میں تہذیب وتمدن اور معاشرہ

تعارف:

اُموی (سفیانی ومروانی) دور میں اسلامی تہذیب وتمدن کو نئی وسعتیں ملیں۔ رعایا کی ترقی کے لیے بہت سے کام ہوئے۔ اسلامی معاشرہ میں نئی اقوام شامل ہوئیں اور مسلمان اسلامی علوم کے علاوہ شعر و شاعری، ادب، تاریخ، کیمیا اور دیگر فنون اور صنائع کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔

اہداف:

اس باب کو پڑھ کر آپ ان شاء اللہ اس قابل ہوجائیں گے کہ:
① ۴۱ھ سے ۱۳۲ھ تک طویل دور کے حکومتی نظم ونسق اور ترقیاتی کاموں سے آگاہ ہوسکیں۔ ② اس دور میں علوم وفنون کے میدانوں میں ہونے والی پیش رفت سے آشنا ہوسکیں۔ ③ اس دور کی معاشرتی وثقافتی سرگرمیوں سے واقف ہوسکیں۔ ④ اس دور کی اعتقادی ونظریاتی گروہ بندی کے بارے میں جان سکیں جس سے متعدد فرقوں کی بنیاد پڑی۔ ⑤ اس زمانے کے مختلف معاشرتی طبقات سے آگاہ ہوسکیں۔

(یونٹ:2.6)

عہدِ اُموی میں تہذیب وتمدن اور معاشرہ

اموی دور میں خلفائے راشدین کے دور کی سادگی تدریجاً کم ہوتی گئی اور نسبتاً آسائش اور سہولیات پر مبنی تمدن عام ہوگیا۔ نظام حکومت اور معاشرت میں بھی متعدد تبدیلیاں آئیں۔ علوم وفنون کے میدان میں بھی پیش قدمی ہوئی اور مختلف نظریات کے ٹکراؤ سے گروہ بندی کی شکلیں بھی پیدا ہوئیں۔ ذیل میں ان امور کا مختصراً جائزہ لیا جارہا ہے۔

نظمِ حکومت

اُموی دور میں فتوحات کی کثرت نے نظام حکومت کو بہت پھیلادیا اور دوسری قوموں سے طرح طرح کے معاملات بھی شروع ہوئے۔ ایسے میں ضرورت کے تحت نئے ادارے قائم کیے گئے اور نیا نظم ونسق وجود میں آیا۔

صوبوں کی تقسیم:

اموی دور میں عالم اسلام پانچ صوبوں میں منقسم تھا:

1. حجاز، یمن اور جزیرۃ العرب کے وسطی علاقے
2. مصر
3. شمالی افریقہ
4. اندلس
5. عراق

عراق سب سے بڑا صوبہ تھا۔ لہٰذا اسے تین اضلاع میں تقسیم کیا گیا تھا:

(الف) عراقِ عرب: اس کا مرکز بصرہ تھا۔ عرب سے متصل عراقی شہروں کے علاوہ عمان اور بحرین بھی اس کے ماتحت تھے۔

(ب) عراقِ عجم: اس کا مرکز کوفہ تھا۔ ایران اور سجستان (جنوبی افغانستان) اس کے زیرِ انتظام تھے۔ کوفہ کے حاکم کا ایک نائب خراسان کے شہر مَرْو میں رہ کر خراسان اور وسطِ ایشیا کا انتظام سنبھالتا تھا۔ دوسرا نائب بلوچستان، سندھ اور پنجاب کے علاقوں پر حکومت کرتا تھا۔

(ج) الجزیرہ: اس صوبے میں الجزیرہ کے علاوہ آرمینیا، آذربائی جان اور ایشیائے کوچک کے علاقے شامل تھے۔

مالیات اور محصولات:

بنواُمیہ کے دور میں حکومتی آمدن بے پناہ تھی اور سرکاری خزانے بھرے ہوئے تھے۔ ذرائعِ آمدن درج ذیل تھے:

❶ خمس: یہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ ہوتا تھا جو بیت المال میں جمع کرایا جاتا تھا جبکہ چار حصے فتح میں شریک سپاہیوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔

❷ زکوٰۃ: ہر صاحبِ نصاب مسلمان سال میں ایک بار اپنے اموال سے ایک طے شدہ حصہ ادا کرتا تھا جسے مستحقین پر خرچ کیا جاتا تھا۔ اس پر شرعی استحقاق مفلسوں، مسافروں، مجاہدوں، طالب علموں، آزادی چاہنے والے غلاموں اور قرض ادا کرنے کی سکت نہ رکھنے والے مجبور لوگوں کا تھا۔

❸ عشر: زرعی شعبے سے پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ وصول کیا جاتا تھا جسے عشر کہا جاتا تھا۔

❹ عشور: مالِ تجارت لے کر گزرنے والوں سے سرکاری چنگی خانہ ایک مخصوص رقم وصول کرتا تھا۔ اس کی شرح مسلم اور غیر مسلم کے لیے الگ الگ تھی۔

❺ خراج: خراج کی مد میں مفتوحہ علاقوں کے غیر مسلم کاشت کاروں سے ان کی زرعی پیداوار کا نصف لیا جاتا تھا۔

❻ جزیہ: غیر مسلم رعایا جنہیں ذمّی کہا جاتا تھا، سالانہ ایک معمولی رقم ادا کرتے تھے جس کے بدلے انہیں فوجی خدمات سے مستثنیٰ رکھا جاتا تھا اور ان کی جان و مال اور عزت کی حفاظت حکومت کے ذمے ہوتی تھی۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، مفلسوں، معذوروں اور بیماروں کو مستثنیٰ رکھا جاتا تھا۔

❼ باج: یہ رقم ان حکمرانوں پر مقرر کی جاتی تھی جو مسلمانوں سے شکست کھا کر صلح کا معاہدہ کر لیتے تھے اور اس کے بدلے ہر سال باہم طے کی گئی رقم ادا کیا کرتے تھے۔ اسے ”خراج“ بھی کہا جاتا تھا۔ ①

آمدن کی مذکورہ سات اقسام اسلامی شریعت کے مطابق تھیں مگر بنو مروان کے دور میں غیر شرعی ذرائع آمدن بھی اختیار کیے جانے لگے۔ مثلاً ذمّیوں پر لازم تھا کہ وہ اپنے تہواروں کے موقع پر افسران کو تحائف دیں اور جب سرکاری عملہ گزرے تو وہ اس کے کھانے پینے کے انتظامات کریں۔ اسی طرح عبدالملک اور ولید کے زمانے میں نو مسلم لوگوں پر بھی جزیہ واجب کر دیا گیا جبکہ شرعاً یہ فقط غیر مسلموں پر عائد کیا جا سکتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے دور میں ان ناجائز ذرائعِ آمدن پر پابندی لگا دی مگر بعد کے خلفاء نے ان میں سے بعض ذرائع کو دوبارہ اختیار کر لیا۔ ②

شعائرِ خلافت:

بنو اُمیہ کے دور میں شعائرِ خلافت مندرجہ ذیل تھے: ❶ عصائے نبوی ❷ ردائے نبوی

عصائے نبوی رسول اللہ ﷺ کی لاٹھی تھی جو گزشتہ خلفاء سے منتقل ہوتی آ رہی تھی۔ ③

ردائے نبوی، حضور اکرم ﷺ کی وہ چادرِ مبارک تھی جو آپ ﷺ نے حضرت کعب بن زُہیر رضی اللہ عنہ کا قصیدہ سن کر

---

① الخراج للقاضی ابی یوسف؛ الاموال للقاسم بن سلام؛ الخراج و صنعۃ الکتابۃ لابی الفرج قدامۃ بن جعفر

② سیرۃ عمر بن عبدالعزیز لابن عبدالحکم: ص ۱۳۱؛ فتوح مصر و مغرب: ص ۱۸۲؛ تاریخ الطبری: ۶ ص ۳۸۱

③ شرح صحیح البخاری لابن بطال: ۹ ص ۳۶۳؛ عمدۃ القاری: ۲۲ ص ۲۲۲

انہیں عطا کی تھی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اسے چالیس ہزار درہم میں خرید لیا۔ اس کے بعد یہ چادرِ مبارک ہر خلیفہ کے پاس علامتِ خلافت کے طور پر منتقل ہوتی رہی۔ ①

مہرِ خلافت:

خلفائے بنواُمیہ میں سے ہر ایک نے اپنے لیے الگ مہر بنوائی تھی اور اس پر مختلف الفاظ نقش کرائے تھے مثلاً:

- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مُہر کا نقش: ''لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' تھا۔
- عبدالملک بن مروان کی مُہر کا نقش: ''آمَنْتُ بِاللّٰهِ مُخْلِصاً'' تھا۔
- حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی مُہر کا نقش: ''لِكُلِّ عَمَلٍ ثَوَاب'' تھا۔
- ہشام بن عبدالملک کی مُہر کا نقش: ''اَلْحُكْمُ لِلْحَكِيْمِ'' تھا۔
- مروان بن محمد کی مُہر کا نقش: ''فَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ'' تھا۔ ②

سرکاری لباس:

بنواُمیہ کا سرکاری لباس سبز تھا۔ ③

دفتری زبان عربی:

بنومروان سے قبل مالیات اور محصولات کا نظام فارسی اور رُومی زبانوں میں تھا اور انہیں غیر مسلم منشی انجام دیا کرتے تھے۔ عبدالملک کے دور میں محصولات کے تمام نظام کو عربی میں منتقل کر کے مسلمان منشیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ④

موروثیت اور ولی عہدی:

خاندان سے باہر ولی عہدی کی مثال خلافتِ راشدہ میں موجود تھی یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جانشین بنانا مگر اس وقت موروثی حکومت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ بنواُمیہ کے عہد میں اس کا آغاز ہوا اور پھر موروثی جانشینی نظامِ حکومت کا جزو لاینفک بن گئی۔ عبدالملک کے دور میں بیک وقت بالترتیب کئی کئی ولی عہدوں کی تقرری کا آغاز ہوا۔ آگے چل کر تقریباً تمام حکمرانوں نے اسی طرز کی پیروی کی۔

سکہ سازی:

اُموی دور سے پہلے عالمِ اسلام کا اپنا کوئی سکہ نہ تھا۔ عبدالملک بن مروان نے پہلی بار اپنے سکے جاری کیے اور اس مقصد کے لیے پہلی بار مسلمانوں کی ٹکسال قائم ہوئی جس کے انتظامات خالد بن یزید کے ہاتھ میں تھے۔ ⑤

ڈاک کا نظام:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خبروں کی وصولی اور احکام کی ترسیل وتشہیر کے لیے ''دیوان البرید'' کے نام سے ایک مستقل

① المختصر فی اخبار البشر: ۱ص ۱۳۸
② التنبیہ والاشراف: ص ۲۶۲، ۲۷۳، ۲۷۶، ۲۷۹، ۲۸۳ ③ مآثر الانافة فی معالم الخلافة: ۲ص ۲۳۵، ۲۳۶
④ تاریخ دمشق: ۲۲ص ۳۲۰ ⑤ تاریخ الطبری: ۶ص ۲۵۶

محکمہ قائم کیا تھا۔ ہشام بن عبدالملک کے دور میں یہ محکمہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ مشرق و مغرب کی خبریں بہت کم وقت میں دمشق پہنچ جایا کرتی تھیں۔ ①

کتابت وانشاء:

اموی دور میں ہر امیر اپنے ساتھ ایک کاتب رکھتا تھا۔ مگر اس کے لیے فقط خوش نویس ہونا کافی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ انشاء پردازی میں بھی مہارت لازمی تھی۔ چنانچہ وہ خوش نویس جو اچھا مضمون باندھ سکتے تھے، اموی درباروں کا لازمہ بن گئے۔ بنوامیہ کی دولتِ سفیانیہ میں کاتب غیر مسلم بھی ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنی قدیم زبانوں میں اپنے اپنے صوبوں کا حساب کتاب اور ریکارڈ رکھا کرتے تھے مگر بنو مروان کی حکومت آئی تو عبدالملک نے عربی کو سرکاری زبان قرار دے دیا۔ یوں کتابت، انشاء، حساب کتاب اور ریکارڈ سازی کا شعبہ تمام تر عربی میں ہوگیا۔ ②

خلیفہ کے حکم کے مطابق خطوط نویسی کا شعبہ "رسائل الخلیفہ" کہلاتا تھا اور مراسلات کی کتابت کرنے والے کو "کاتب الرسائل" یا "کاتب دیوان الرسائل" کہا جاتا تھا۔ ③

اس دور میں نامور کاتب اور انشاء پرداز پیدا ہوئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کاتبوں میں عبید بن اوس غسانی، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے کاتبوں میں لیث بن ابی رقیہ، ہشام بن عبدالملک کے کاتبوں میں سالم مولیٰ سعید اور مروان بن محمد کے کاتبوں میں عبدالحمید بن یحییٰ نمایاں رہے۔ ④

مالی معاملات اور حسابات کی لکھت پڑھت کے لیے ایک الگ کاتب ہوتا تھا جسے "کاتب الخراج" کہا جاتا تھا۔ اس عہدے پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید کے دور میں سرجون بن منصور رومی مقرر تھا۔ ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عہد میں سلیمان بن سعد خشنی نمایاں کاتب رہا۔ ⑤

دیوان الجند والخراج وبیوت الاموال والخزائن:

یہ دفتری محکمہ تھا جس میں افواج کے اخراجات، سلطنت کی آمدن وخرچ، بیت المال کے انتظامات اور محفوظ شدہ ذخائر کے حسابات وغیرہ کیے جاتے تھے۔ ⑥

دیوانِ خاتم:

اس محکمے کا مقصد خلیفہ کے احکامات اور پیغامات کو "مہر بند" کرنا تھا۔ بعد میں اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا:

❶ خاتم الخلافہ ❷ الخاتم الصغیر

"خاتم الخلافہ" کا کام خاص خلیفہ کی دستاویزات کو مہر بند کرنا تھا جبکہ "الخاتم الصغیر" کے تحت معمول کے سرکاری

---

① الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ: ۲ص ۲۵۷ ② تاریخ ابن خلدون (مقدمہ): ۱ص ۳۰۳، ۳۰۴؛ تاریخ دمشق: ۲۲ص ۳۲۰
③ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص۳۰۸ ④ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص۲۲۸، ۳۱۹، ۳۶۲؛ تاریخ الطبری: ۶ص ۱۸۲
⑤ تاریخ الطبری: ۶ص ۱۸۰، ۱۸۱ ⑥ تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص۳۰۸

رقعہ جات کو "مُہر بند" کیا جاتا تھا۔ ①

امارتِ حج:

امارتِ حج کا شعبہ خلفائے راشدین کے دور سے تھا۔ ہر سال خلیفہ کی جانب سے حج کے انتظامات کے لیے ایک امیر کا تقرر ہوتا تھا جس کی نگرانی میں یہ عظیم الشان عبادت ادا کی جاتی تھی۔ ②

تعمیراتی کام:

اُموی دور میں بہت سی شاندار عمارتیں قائم ہوئیں، مساجد کی تعمیر وتوسیع کا کام بکثرت ہوا، بند اور پُل تعمیر کیے گئے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دِمشق میں عالی شان قصرِ امارت تعمیر کرایا جسے سبز گنبد کے باعث "الخضراء" کہا جاتا تھا۔ اکثر اُموی خلفاء کا قیام یہیں رہا اور یہیں دربار لگتا۔ ③ اسی دور میں بصرہ کے حاکم زیاد بن ابی سفیان نے بصرہ کی جامع مسجد کو چونے اور ساگوان کی لکڑی سے از سرِ نو تعمیر کیا، اسی طرح قصرِ امارت کی بھی تجدید کی۔ ④

عبدالملک نے بیت المقدس میں گنبدِ صخرہ تعمیر کرایا۔ بارش کے موسم میں وادیٔ مکہ اور مسجد الحرام زیرِ آب آجاتے تھے۔ عبدالملک نے اردگرد کے نالوں پر بند باندھ کر اس خطرے کو دور کردیا۔ ⑤

ولید بن عبدالملک نے خطیر اخراجات کے ذریعے دمشق میں جامع اُموی تعمیر کرائی۔ ⑥ ولید کے حکم سے مدینہ کے حاکم حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مسجدِ نبوی کو از سرِ نو تعمیر کرایا۔ ⑦ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ ہوئے تو ان کے حکم سے اَندلس میں قرطبہ میں دریائے وادی الکبیر پر ایک عظیم الشان پُل قائم کیا گیا۔ ⑧

نئے شہروں کی تعمیر:

اُموی دور میں متعدد شہر آباد کیے گئے۔ حجاج بن یوسف نے بصرہ اور کوفہ کے درمیان نیا شہر "واسط" آباد کیا۔ ⑨

سلیمان بن عبدالملک نے دمشق سے کچھ دور "رَملہ" کی داغ بیل ڈالی اور اسے اپنا پایۂ تخت بنایا۔ ⑩

عبدالعزیز بن مروان نے مصر میں "حلوان" نامی ایک نیا شہر آباد کر کے اسے صوبائی مرکز بنادیا۔ ⑪

زراعت:

اُموی دور میں زراعت بہت بہتر تھی اور حکومت آب پاشی کی سہولتیں مہیا کرتی تھی۔ حاکمِ بصرہ زیاد کے حکم پر حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے ایک نہر نکالی جس سے شہریوں اور زرعی زمینوں کو میٹھا پانی فراہم ہونے لگا۔ اسے نہرِ معقل کہا جاتا تھا۔ عبدالملک کے بیٹے سعید نے اپنی جاگیر کے جنگلات کو صاف کرا کے اسے ایک نئی نہر سے قابلِ کاشت

① تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۳۰۸ ② تاریخ خلیفہ بن خیاط: ص ۳۰۸ ③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۱ ص ۱۳۷، ط دار ھجر
④ فتوح البلدان: ص ۳۴۸ ⑤ البدایۃ والنہایۃ: ۱۲ ص ۱۳۱ تا ۱۳۳؛ اخبار مکۃ للازرقی: ۲ ص ۱۶۷
⑥ البدایۃ والنہایۃ: ۱۲ ص ۵۶۵ تا ۵۹۰ ⑦ وفاء الوفاء: ۲ ص ۹۳ تا ۹۷
⑧ نفح الطیب: ۱ ص ۴۸۰ ⑨ فتوح البلدان: ص ۲۸۳
⑩ فتوح البلدان: ص ۱۳۵ ⑪ معجم البلدان: ۲ ص ۲۹۲۔ یہ حلوان وہ نہیں جو عراق میں ہے، یہ مصر میں تھا۔

بنایا۔حجاج بن یوسف نے انبار کی ایک ایسی نہر کی کھدائی مکمل کرائی جس کا آغاز حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کرایا تھا مگر ایک پہاڑ کی سخت چٹانوں کے باعث کام رُک گیا تھا۔حجاج نے مزدوروں کو خطیر معاوضہ دے کر ان چٹانوں کو کٹوایا اور نہر مکمل کرائی۔اس کے علاوہ حجاج نے''صین'' نامی نئی نہر بھی کھدوائی۔نیز''نیل''اور''زابی'' نامی دو نئی نہریں نکلوا کر درمیانی علاقے میں زراعت کرائی۔خالد بن عبداللہ قسری جب عراق کا حاکم بنا تو اس نے بھی نئی نہریں نکلوانے پر توجہ دی۔بشار بن مسلم باہلی کی نکالی ہوئی نہر اسی کے نام پر''نہر بشار'' کہلاتی تھی۔عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بیٹے عبداللہ نے عراق کی امارت کے دور میں ایک نہر کھدوائی جس پر تین لاکھ دراہم سے زیادہ خرچ آیا،اس کے باوجود عبداللہ کا کہنا تھا کہ اگر عراق کا پورا بجٹ اس پر لگ جاتا تو بھی میں دریغ نہ کرتا۔بلال بن ابی بردہ نے بصرہ کے قریب نہر نکال کر اس کے کناروں پر دکانیں تعمیر کرائیں۔یہ نہر''نہرِ بلال'' کے نام سے مشہور ہوئی۔[1]

❁❁❁

اُموی دور میں علوم اسلامیہ

مسلمانوں میں علوم وفنون کی نمایاں ترقی اگرچہ عباسی دور سے شروع ہوئی اور ہر فن کی امہات الکتب اسی دور میں مدون ہوئیں،نیز دوسری اقوام کے علوم وفنون کی طرف توجہ بھی عباسی دور میں ہوئی۔مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اموی دور میں علوم وفنون سے بے اعتنائی برتی گئی بلکہ اس دور میں عالم اسلام عظیم الشان اصحابِ علم وفضل سے آباد تھا اور دینی علوم کے چرچے گھر گھر تھے۔ہاں اس دور میں سائنسی علوم وفنون پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی جس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

① اموی دور خلافتِ راشدہ سے قریب تر تھا جس کے اثرات علمی حلقوں میں باقی تھے۔خلافتِ راشدہ میں زیادہ تر توجہ دینی علوم کی طرف تھی اور اشد ضرورت کے بغیر غیر اقوام کے علوم وفنون سے استفادہ نہیں کیا جاتا تھا،اسی طرح اموی دور میں بھی اصحابِ علم وفضل کی توجہات زیادہ تر دینی علوم کی طرف رہیں کیوں کہ اُموی دور کے بیشتر جلیل القدر ائمہ نے دورِ خلافتِ راشدہ کے ماحول،مزاج،اہداف،ترجیحات اور معیارِ زندگی کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔

② دورِ خلافتِ راشدہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی قومی خصوصیات کو محفوظ رکھنے کے لیے انہیں غیر مسلموں میں خلط ملط ہونے سے روکے رکھا۔اسی طرح بنوامیہ نے عربوں کی قومی صفات برقرار رکھنے کے لیے انہیں عجمیوں میں ضم ہوجانے سے بچانے کی کوشش کی اور عرب وعجم کا امتیاز باقی رکھا۔اس لیے مسلمان اس دور میں ان اقوام کے علوم وفنون سے بھی زیادہ واقف نہ ہوسکے۔

③ بنوامیہ نے عجمیوں کو سیاست سے باہر رکھا اور تمام اہم عہدے عربوں کے لیے خاص رکھے۔اس لیے عام مسلمانوں کا دیگر اقوام سے زیادہ میل ملاپ نہ ہوسکا اور معاشرتی وتمدنی افادے واستفادے کی راہیں محدود رہیں۔اس

① فتوح البلدان: ص ۱۸۰، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۸۳، ۳۴۸، ۳۵۱، ۳۵۹

کے برعکس بنوعباس کی حکومت کا قیام ہی اہلِ عجم کے تعاون سے ہوا تھا۔اس لیے ان کے دور میں عجمی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی درآمد کے لیے دروازے کھل گئے۔ ①

اُموی دور کے تہذیب وتمدن کے مختلف پہلوؤں پر بات شروع کرتے ہوئے ہم پہلے زمانہ جاہلیت، دورِ رسالت دورِ خلافتِ راشدہ کے حوالے سے بھی کچھ اشارات دیں گے تاکہ تہذیب وتمدن کا ایک تسلسل سامنے رہے۔البتہ ہم تفصیل میں جانے سے گریز کریں گے کیوں کہ عہدِ خلافتِ راشدہ کی خصوصیات، اس دور کے اندازِ سیاست اور علوم وفنون کے مظاہر پر ہم دورِ خلافتِ راشدہ کے تحت بقدرِ ضرورت گفتگو کر چکے ہیں۔

قرآن مجید اور علم قراآت:

تمام علوم کا سرچشمہ ہونے کے ناطے قرآن مجید پر مسلمانوں کی شروع سے زیادہ توجہ تھی۔اُموی دور میں بھی قرآن مجید کے حفظ، تجوید اور قراآت کا علم زوروں پر تھا۔قرآن مجید کا نزول عرب کے مختلف قبائل کے لہجے اور طرزِ ادا کے مطابق ہوا ہے تاکہ کسی کو اس کی تلاوت میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔متنوع لہجوں اور طرزِ ادا کے علم کو"علم قراآت" کہا جاتا ہے جس کے ماہرین صحابہ میں حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابودرداء، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت سالم مولیٰ حذیفہ رضی اللہ عنہم نمایاں تھے۔

دورِ تابعین میں مغیرہ بن ابی شہاب، حطان بن عبداللہ رقاشی، اسود بن یزید نخعی، علقمہ بن قیس، ابوعبدالرحمن السلمی، ابوالاسود الدؤلی، عبداللہ بن عیاش بن ابی ربیعہ، عمران بن تیم (ابورجاء العطاردی) اور ابوالعالیہ الریاحی رحمہم اللہ نامور قراء تھے جن سے فنِ قرأت آگے چلا۔جن سات ائمہ کی قراآت کو"قراآتِ متواترہ" مانا گیا ہے، ان میں سے اکثر اموی دور کے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے اموی اور عباسی دونوں ادوار کو پایا۔ان ائمہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

1. امام نافع بن عبدالرحمن المدنی رحمہ اللہ (م ۱۶۹ھ)
2. امام ابن کثیر مکی رحمہ اللہ (م ۱۲۰ھ)
3. امام ابوعمرو البصری رحمہ اللہ ۱۵۴ھ)
4. امام ابن عامر شامی رحمہ اللہ ۱۱۸ھ)
5. امام عاصم کوفی رحمہ اللہ ۱۲۷ھ)
6. امام حمزہ بن حبیب کوفی رحمہ اللہ ۱۵۶ھ)
7. امام کسائی رحمہ اللہ ۱۸۹ھ) ②

اموی دور میں علوم القرآن پر تصنیفی کام بھی ہوا۔عبداللہ بن عامر رحمہ اللہ (م ۱۱۸ھ) نے"المقطوع والموصول" اور ابوعمرو بن العلاء رحمہ اللہ نے"الوقف والابتداء" جیسی کتب بھی لکھیں۔ ③

① تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی: حصہ دوئم: ص ۲۹۵، ۲۹۶

② القراآت المتواترہ واثرھا فی الرسم القرآنی: ص ۵۹ تا ۶۹ _محمد حبش، دار الفکر دمشق: ۱۹۹۹ء

③ الدولۃ الامویۃ، للدکتور حمدی شاھین: ص ۴۵۲

قرآنِ مجید کے حروف پر نقطے اور اعراب لگانے کا کام بھی اس دور میں آگے بڑھا۔ اگرچہ اس کام کی ابتداء حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تلمیذِ رشید حضرت ابوالاسود دؤلی رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۹ھ) نے کی تھی اور زبر، زیر، پیش اور تنوین کی علامات مقرر کی تھیں۔ اُموی دور میں حضرت ابوالاسود دؤلی رحمۃ اللہ علیہ کے دو تلامذہ: امام نصر بن عاصم رحمۃ اللہ علیہ (م ۸۹ھ) اور امام یحییٰ بن یعمر رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۰ھ) نے قرآنِ مجید کے حروف پر نقطے لگائے۔ ①

ابواحمد العسکری رحمۃ اللہ علیہ کے بقول ان علماء نے یہ کام عبدالملک کے عہد میں حجاج بن یوسف کی فرمائش پر کیا تھا۔ ②

تفسیر:

قرآن مجید کے نزول کے ساتھ ہی علمِ تفسیر بھی وجود میں آگیا تھا۔ صحابہ کرام کو عربی دان ہونے کے باوجود قرآن مجید کی بعض آیات کا حقیقی مفہوم سمجھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کرنا پڑتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضاحتی جوابات قرآن مجید کی اوّلین تفسیر تھے۔ دورِ صحابہ میں حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم قرآن مجید کے سب سے بڑے مفسر سمجھے جاتے تھے۔ اموی دور میں انہی کے تلامذہ نے تفسیر کے ائمہ کی حیثیت حاصل کی جن میں حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد بن جبر، حضرت قتادۃ بن دعامہ سدوسی، حضرت ضحاک بن مزاحم، محمد بن کعب القرظی اور حضرت حسن بصری رحمہم اللہ مشہور ہیں۔ ان حضرات کی طرف کچھ تفاسیر بھی منسوب ہیں مگر یہ مکمل تفاسیر نہیں بلکہ خاص خاص آیات اور مشکل مقامات کی وضاحت پر مشتمل اقوال ہیں جنہیں بعد میں یکجا کر دیا گیا۔ ③

حدیث:

صحابہ کرام میں درجنوں حضرات احادیث کے بحرِ ذخار تھے۔ ان حضرات سے استفادہ کرنے والے تابعینِ کرام اموی دور میں بکثرت تھے۔ نیز تبع تابعین کی بھی ایک بہت بڑی تعداد اسی دور میں احادیث جمع کرنے میں مشغول تھی۔ حضرت سعید بن جبیر، حضرت سعید بن مسیب، حضرت عطاء بن ابی رباح، حضرت عکرمہ، حضرت نافع مولیٰ ابن عمر، حضرت علقمہ بن قیس، حضرت قتادہ بن دعامہ اور امام مکحول رحمہم اللہ جیسے حفاظِ حدیث اسی دور میں گزرے ہیں۔

یہ حضرات حدیث نقل کرنے میں ہر ممکن احتیاط کرتے تھے اور الفاظ میں خلط ملط کا شبہ نہیں رہنے دیتے تھے۔

---

① النقط لابی عمرو الدانی (م ۴۴۴ھ): ص ۱۲۹ ط مکتبۃ الکلیات قاہرہ؛ سیر اعلام النبلاء: ۴ص ۴۴۲؛ معجم الادباء للحموی: ۴ ص ۹ ۲۷۴

② التصحیف للعسکری: ص ۱۳؛ وفیات الاعیان: ۲ص ۳۲

ملحوظہ: قرآن مجید میں نقاط لگوانے کی نسبت حجاج بن یوسف کی طرف فقط العسکری کی روایت میں ملتی ہے جو چوتھی صدی ہجری کے عالم ہیں۔ ان سے پہلے یہ روایت کسی نے نقل نہیں کی اور العسکری نے بھی اسے کسی سند کے بغیر "رُوِیَ" کے صیغہ مجہول سے نقل کیا ہے، اس لیے اس کی اسنادی حیثیت کچھ بھی نہیں، تاہم عقلاً ایسا ہونا بعید نہیں کیوں کہ حجاج بن یوسف خود بھی قاری تھا اور قرآن کی حفاظت واشاعت کا بہت ذوق رکھتا تھا۔

ملحوظہ: نقطے لگانے والے امام یحییٰ بن یعمر حجاج بن یوسف کے عتاب سے نہ بچ سکے کیوں کہ حجاج حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو آلِ رسول نہیں مانتا تھا۔ امام موصوف نے اس موضوع پر بحث کر کے حجاج کو تنگ کر دیا تو اس نے ناراض ہو کر انہیں جلاوطن کر دیا۔ (السنن الکبری للبیہقی، ح ۱۱۹۲)

③ طبقات المفسرین للادنہ وی، فصل اول و دوئم، ط مکتبۃ العلوم والحکم؛ تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی: ۲ص ۳۱۰

یہی وجہ تھی کہ بہت سے ائمہ حدیث نے متعدد مواقع پر حدیث نقل کرنے سے انکار کیا۔ بعض ائمہ حدیث نے حدیث کے وہ املائی مجموعے جو انہوں نے خود نقل کیے تھے، کسی روایت میں کمی بیشی ہو جانے کے خوف سے تلف کر دیے تھے۔ بعض بزرگ روایت میں احتیاط کی بناء پر کم سے کم اور انتہائی مصدقہ احادیث ہی نقل کرتے تھے۔

امام شعبی رحمہ اللہ ایک دور تک بلا تکلف بکثرت روایات نقل کرتے رہے مگر بعد کا ماحول دیکھ کر فقط متفقہ روایات نقل کرنے پر اکتفا کرنے لگے۔ فرماتے تھے: ''گزشتہ لوگ کثرتِ روایت کو بُرا سمجھتے تھے۔ جو حقیقت مجھ پر واضح ہوئی اگر پہلے کھل جاتی تو فقط متفقہ روایات ہی نقل کرتا۔''①

حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ روایات کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہیں کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا: کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث نہیں پہنچی؟ کہنے لگے: ''کیوں نہیں۔ مگر میرے لیے آسان ہے کہ میں حدیث کی نسبت حضرت عمر، حضرت عبداللہ (رضی اللہ عنہما)، حضرت علقمہ اور حضرت اسود (رحمہما اللہ) کی طرف کروں۔''②

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تابعینِ کرام نے امانتِ نبوت کو اُمت تک پہنچایا ہی نہیں۔ یہ مثالیں فقط یہ بتاتی ہیں کہ نقلِ حدیث میں کس قدر احتیاط کی جاتی تھی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو صحابہ کرام کے بعد تابعین اور تبع تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت نے احادیث کی حفاظت واشاعت کا کام پوری تندہی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ کیا۔ یہ روایات فقط حدیث کے حلقوں کے ذریعے سینہ بسینہ ہی نقل نہیں ہوئیں بلکہ صحابہ وتابعین میں سے متعدد حضرات نے حدیث کے املائی مجموعے بھی تیار کر لیے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا ایک مجموعہ تھا جسے ''صحیفہ صادقہ'' کہا جاتا تھا۔③

حجر بن عدی رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنی ہوئی احادیث کو ایک صحیفے میں نقل کیا تھا جو گھر کے طاقچے میں ہر وقت سامنے رہتا تھا۔④ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے عبدالرحمن المسعودی کے پاس ان کی احادیث کا مجموعہ تھا۔⑤ سلیمان بن قیس یشکری رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے سنی ہوئی احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔⑥ خلاس بن عمرو رحمہ اللہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس میں حضرت علی اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کی روایات تھیں۔⑦

امام زہری رحمہ اللہ نے خلیفہ ہشام کی فرمائش پر چارسو احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کرایا تھا۔⑧ حضرت ہمام بن منبہ رحمہ اللہ کا صحیفہ بہت مشہور ہے جس میں انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنی ہوئی احادیث کو جمع کیا تھا۔⑨

① تذکرة الحفاظ للذھبی: ۱ ص ۶۵
② طبقات ابن سعد: ۶ ص ۲۷۲
③ طبقات ابن سعد: ۷ ص ۴۹۳
④ طبقات ابن سعد: ۶ ص ۲۲۰ ⑤ تہذیب التہذیب: ۶ ص ۲۱۱
⑥ تہذیب التہذیب: ۴ ص ۲۱۵ ⑦ طبقات ابن سعد: ۷ ص ۱۴۹
⑧ تہذیب التہذیب: ۹ ص ۴۴۹ ⑨ سیر اعلام النبلاء: ۵ ص ۳۱۱

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے بھی ایک صحیفہ مرتب کیا تھا۔ [1] ہشام بن عروہ رحمہ اللہ نے فقہی روایات کی کئی کتب مدون کی تھیں مگر ''وقعہ حرہ'' کے موقع پر ان کتب کو نذرِ آتش کر دیا۔ بعد میں عمر بھر ان کتب کے تلف ہونے پر افسوس کرتے رہے۔ [2] ابن جریج رحمہ اللہ نے ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کی روایات کا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ [3]

امام اوزاعی رحمہ اللہ کے پاس امام یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کی روایات کا صحیفہ تھا۔ [4] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی مرویات کو ان کے آزاد کردہ غلام کریب بن ابی مسلم رحمہ اللہ نے اس قدر اہتمام سے مختلف مجموعوں میں نقل کیا تھا کہ ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ اہلِ علم حسبِ ضرورت ان سے یہ مجموعے لے جاتے تھے۔ [5]

احادیث کی حفاظت واشاعت میں اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا کردار نہایت اہم ہے جن کی ہدایت پر حدیث کے مجموعے ایک سرکاری مہم کے طور پر جمع کیے گئے۔ [6] امام زہری رحمہ اللہ کے پاس روایات کے لکھے ہوئے اوراق کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ انہیں باربرداری کے جانوروں پر لادا جاتا تھا۔ [7]

امام اوزاعی رحمہ اللہ کی روایات بھی لکھی جاتی تھیں جو اس قدر تھیں کہ لکھنے والے ان کا احاطہ کرنے سے قاصر تھے۔ [8]

یہ مجموعے بعد میں مدوّن کی گئی جامع کتبِ حدیث میں شامل ہو گئے، اس لیے انہیں الگ سے نقل کرتے رہنے کی ضرورت نہ رہی، چنانچہ یہ دنیا سے ناپید ہو گئے تاہم ان کی روایات محفوظ چلی آ رہی ہیں۔ بلاشبہ کتبِ حدیث کا بہت بڑا حصہ اسی مواد پر مشتمل ہے جو ان نوشتوں میں تھا۔

فقہ:

اس دور میں بڑے بڑے فقہاء پیدا ہوئے جن میں سے بعض سرکاری عہدوں پر بھی فائز ہوئے اور بعض کو خلفاء کا قرب بھی حاصل رہا۔ شریح بن الحارث رحمہ اللہ خلفائے راشدین اور پھر بنوامیہ کے دور میں کوفہ کے قاضی رہے۔ قبیصہ بن ذؤیب رحمہ اللہ عبدالملک کے کاتب اور معتمد تھے۔ امام ابراہیم نخعی، امام مکحول، امام حماد بن ابی سلیمان، امام ابوالزناد عبداللہ بن ذکوان اور امام ربیعۃ الرائے رحمہم اللہ اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ [9]

اس زمانے کے بعض علماء نے فقہ پر کتب بھی تحریر کیں۔ امام مکحول رحمہ اللہ (م ۱۱۶ھ) نے ''کتاب السنن'' اور ''کتاب المسائل'' تالیف کیں۔ [10] امام زہری رحمہ اللہ کے فتاویٰ تین جلدوں میں جمع کیے گئے تھے۔ [11]

---

(1) المحدث الفاصل بین الراوی والواعی للرامہرمزی: ص ۲۷۹

(2) الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۵ص ۱۷۹، صادر، اسنادہ صحیح

(3) المحدث الفاصل بین الراوی والواعی للرامہرمزی: ص ۳۳۰

(4) المحدث الفاصل بین الراوی والواعی للرامہرمزی: ص ۳۳۷

(5) تقیید العلم للخطیب بغدادی: ص ۱۳۶

(6) توضیح الافکار لمعانی تنقیح الانظار: ۲ص ۲۱۸ (7) المعرفۃ والتاریخ: ۱ص ۶۷۹

(8) سیر اعلام النبلاء: ۷ص ۱۱۵ (9) الدولۃ الامویۃ لدکتور حمدی شاہین: ص ۴۵۲

(10) ہدیۃ العارفین للبابانی: ۲ص ۴۷۰ (11) اعلام الموقعین: ۱ص ۱۹

مغازی وسیرت:

صحابہ کرام سیرتِ نبویہ اور مغازی کے واقعات بڑے شوق سے سنتے اور سناتے تھے۔ان کی یہی روایات آگے چل کر ایک مستقل علم کی شکل اختیار کر گئیں جس کے ماہرین ''سیرت نگار'' کہلائے۔کہا جاتا ہے کہ سیرت پر پہلی کتاب حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے لکھی تھی۔اسی طرح حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے بھی سیرت پر مواد جمع کیا تھا۔ ①

امام معمر بن راشد رحمہ اللہ (م ۱۵۴ھ) نے بھی مغازی پر ایک کتاب تالیف کی تھی۔ ② تاہم جس شخصیت نے سیرت نگاری کو باقاعدہ ایک شکل دی،وہ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ ۱۵۱ھ) تھے۔اگرچہ ان کی وفات بنوعباس کے ابتدائی دور میں ہوئی مگر ان کے کارناموں کا اصل زمانہ اُموی دور کا ہے۔ان کی ''السیرۃ النبویۃ'' اپنے فن پر پہلی کتاب ہے جس نے علم سیرت کو دیگر علوم سے جدا کر دیا اور اسی پر بعد میں علم سیرت اور علم تاریخ کی عمارت تعمیر ہوئی۔ ③

تاریخ:

عربوں میں اگرچہ فنِ تاریخ باضابطہ شکل میں متعارف نہ تھا مگر وہ اپنے ماضی کے تاریخی واقعات کو بڑی دلچسپی سے سنتے سناتے اور یاد رکھتے تھے۔مکہ پر قریش کے تسلط،زمزم کی بازیافت،مکہ پر ابرہہ کی چڑھائی،جنگِ فجار،حلف الفضول،قریش کے ہاتھوں تعمیرِ کعبہ اور عرب کی قدیم حکومتوں اور جنگوں کے حالات انہی سینہ بسینہ روایات میں محفوظ تھے،ان کے ماہر ''اخباری'' کہلاتے تھے۔بعد میں مسلم مؤرخین نے بہت سے واقعات نقل کرنے میں ان پر اعتماد کیا۔ ④ اموی دور میں علمِ تاریخ کو مزید ترقی ہوئی۔اموی حکومت کے بانی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ روزانہ عشاء کے بعد عرب کی جنگوں،سلاطینِ عجم کے حالات اور ان کی سیاست اور قدیم اقوام کے عروج وزوال کے قصے بڑی دلچسپی سے سنا کرتے تھے۔ ⑤ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مصاحب عبید بن شریہ (م ۶۷ھ) نے اخبار الماضیین،کتاب الامثال اور کتاب الملوک جیسی کتب تالیف کیں۔ ⑥

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ (م ۱۱۴ھ) نے سلاطینِ حمیر کے حالات پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ ⑦ عوانہ بن الحکم رحمہ اللہ (م ۱۴۷ھ) نے ''کتاب التاریخ'' اور ''سیرۃ معاویۃ وبنی امیۃ'' تحریر کیں۔ ⑧ ہشام بن عبدالملک نے اپنے دور میں اہلِ فارس کی تاریخ کو عربی میں ترجمہ کرایا تھا۔مؤرخ مسعودی نے اس کتاب کا نسخہ دیکھا تھا جس پر جمادی الاولیٰ ۱۱۳ھ کی تاریخ درج تھی۔اس میں قدیم شاہانِ فارس کی رنگین تصاویر بھی نقش کی گئی تھیں۔ ⑨

قتادہ بن دعامہ رحمہ اللہ اس دور کے نمایاں ماہرینِ تاریخ میں شمار ہوتے تھے۔ ⑩

① کشف الظنون: ۲ ص ۱۷۴۳ ② الفہرست لابن ندیم: ص ۱۲۳
③ الاعلام للزرکلی: ص ۲۸ ④ تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی: حصہ دوئم: ص ۲۹۸
⑤ مروج الذہب: ۳ ص ۲۲۲ ⑥ الفہرست لابن ندیم: ص ۱۱۸ ⑦ شذرات الذہب: ۲ ص ۷۳
⑧ ھدیۃ العارفین: ص ۸۰۳ ⑨ التنبیہ والاشراف للمسعودی: ص ۹۳ ⑩ سیر اعلام النبلاء: ۵ ص ۲۷۷

علمی حلقے اور تعلیمی مراکز:

صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں مدارس کا باقاعدہ نظام نہیں تھا۔ البتہ علمی حلقے جابجا لگتے تھے۔ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین میں سے سینکڑوں حضرات ایسے تھے جو اپنی مساجد یا گھروں میں علمی مجالس آراستہ کرتے تھے اور لوگ دور دور سے آکر ان میں شرکت کرتے تھے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حلقے میں تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، شعر، ادب اور انشاء سمیت متنوع علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ①

سعید بن جبیر رحمہ اللہ (م ۹۵ھ) کا بھی بہت بڑا حلقہ تھا جس سے امام زہری، امام اعمش، کلثوم بن جبر، مالک بن دینار، سماک بن حرب اور میمون بن مہران رحمہم اللہ جیسے محدثین مستفید ہوئے۔ ② کہا جاتا تھا کہ دنیائے اسلام میں کوئی ایسا نہیں جو ان کے علم کا محتاج نہ ہو۔ ③ عالم اسلام کا سب سے بڑا علمی مرکز مدینہ تھا جہاں مسجدِ نبوی محدثین سے آباد رہتی تھی۔ زید بن اسلم مدنی ۱۳۶ھ رحمہ اللہ کے حلقے میں طلبہ کے علاوہ بیک وقت چالیس فقہاء دیکھے گئے تھے۔ ④

محمد بن عجلان رحمہ اللہ (م ۱۴۸ھ) کا مسجدِ نبوی میں عظیم حلقہ لگتا تھا۔ ⑤ یہیں امام ربیعۃ الرائی رحمہ اللہ (م ۱۳۶ھ) کا حلقہ بھی تھا جس میں طلبہ کے علاوہ شرفاء اور عمائد شہر بھی شریک ہوتے تھے۔ امام مالک، امام اوزاعی، شعبہ، یحییٰ بن سعید، سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک اور سفیان بن عیینہ رحمہم اللہ اس عظیم الشان حلقۂ درس کے تلامذہ رہے۔ ⑥ ابوالزناد عبدالرحمن بن ذکوان رحمہ اللہ (م ۱۳۱ھ) کے گرد بیک وقت فقہ، شاعری اور دیگر علوم وفنون کے طلبہ جمع رہتے تھے۔ ⑦

بصرہ میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ۱۱۰ھ) کے حلقے کی کوئی مثال نہ تھی۔ ⑧ کوفہ میں سب سے بڑا حلقہ امام عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کا تھا جس میں صحابہ کرام بھی شریک ہوتے تھے۔ کوفہ میں امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ (م ۹۵ھ) کا حلقۂ درس بھی بہت مشہور تھا۔ ⑨

کتب خانے:

دنیا کی متمدن قوموں میں کتب خانوں کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا تھا۔ مسلمانوں نے جب شام فتح کیا تو رومیوں کے بعض کتب خانے بھی ان کے ہاتھ لگے، ⑩ مگر قدیم عربوں میں کتب خانوں کا کوئی رواج نہ تھا بلکہ حافظہ ہی کتب خانے کا کام دیتا تھا۔ اسلامی دور میں بھی پہلی صدی ہجری تک کتب خانے قائم نہ ہوئے تھے۔ ہاں بہت سے علماء اپنے پاس نوشتوں کا ذخیرہ رکھتے تھے۔ ابوعمرو بن العلاء (م ۱۵۴ھ) کا گھر چھت تک اوراق سے بھرا رہتا تھا۔ ⑪ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک اچھی اچھی کتابیں لکھوانے اور محفوظ کرنے کا شوقین تھا۔ ⑫

① اسد الغابۃ: ۳ ص ۲۹۱ ② سیر اعلام النبلاء: ۴ ص ۳۲۳
③ تذکرۃ الحفاظ: ا ص ۶۱ ④ تذکرۃ الحفاظ: ا ص ۱۰۰
⑤ تذکرۃ الحفاظ: ا ص ۲۵ ⑥ سیر اعلام النبلاء: ۶ ص ۸۹ تا ۹۱
⑦ تذکرۃ الحفاظ للذہبی: ا ص ۱۰۱ ⑧ تذکرۃ الحفاظ: ا ص ۵۷ ⑨ تذکرۃ الحفاظ: ا ص ۵۹
⑩ فتوح الشام للواقدی: ا ص ۲۴۳ ⑪ سیر اعلام النبلاء: ۶ ص ۴۰۸ ⑫ تہذیب التہذیب: ۹ ص ۴۴۵

اُموی دور میں فنونِ ثقافت

شعروادب:

عرب فطرتاً شاعرانہ طبیعت رکھتے تھے اور زمانہ جاہلیت میں ذوقِ شعرگوئی عروج پر تھا، تاہم دورِ رسالت مآب ﷺ اور عہدِ خلفائے راشدین میں شاعری سے دلچسپی کے باوجود اس فن کے ویسے چرچے نہ تھے جیسے پہلے تھے کیوں کہ قرآن مجید کے اعجاز اور دل پذیری نے شاعری کے سورج کو گہنا دیا تھا۔ بہرحال اُموی دور میں ایک بار پھر شاعری کو ترقی ہوئی۔ اسلامی دور کی شاعری کے کئی آفتاب و ماہتاب عہدِ اموی سے تعلق رکھتے ہیں جن میں جریر بن عطیہ تمیمی (م ۱۱۰ھ) فرزدق (م ۱۱۰ھ)، ذوالرمہ (م ۱۱۷ھ) اور ابراہیم ابن ہرمہ (۱۵۰ھ) مشہور ہیں۔ اگرچہ بنوامیہ نے عربوں کی زبان، ادب اور خصوصیات کو محفوظ رکھا مگر عرب کے ریگزاروں سے نکل کر عراق اور شام جیسے سرسبز و شاداب علاقوں میں آباد ہونے کے باعث شاعری میں تنوع پیدا ہوگیا۔ قدیم عرب شعراء کا کلام سادہ صحرائی زندگی کا عکاس تھا جبکہ اموی دور کی شاعری میں شہری تمدن کی نزاکتیں، باغ و بہار کے لطافتیں اور حسن کی رعنائیاں پوری طرح جلوہ گر ہیں۔

اموی دور میں مختلف سیاسی گروہ بندیوں میں اضافہ ہوا جن میں سے بعض نے فرقوں کی شکل اختیار کرلی۔ شعراء بھی کسی نہ کسی گروہ سے وابستہ ہوتے تھے پس ان کی شاعری فریقِ مخالف کے لیے تیغ بے نیام ہوتی تھی۔ اس کش مکش نے شاعری کو دوآتشہ کردیا۔ ابراہیم بن ہرمہ (م ۱۵۰ھ) اور فرزدق علویوں کے حامی تھے۔ ① نصرانی شاعر اخطل نے امویوں کی مدح سرائی میں شہرت حاصل کی۔ ② مروان بن ابی حفصہ، مسکین دارمی (م ۸۹ھ) اور اعشیٰ ربیعہ (عبداللہ بن خارجہ بن حبیب) امویوں کے مداح تھے۔ ③ جریر بن عطیہ نے خلفائے بنواُمیہ کی تعریف و توصیف میں وہ رنگ آمیزیاں پیدا کیں کہ سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ کسی معمولی فرد کے بارے میں ایسا قصیدہ کہتا تھا کہ لوگ اسے ہفت اقلیم کا بادشاہ تصور کرنے لگتے۔ اس کا باپ نہایت بخیل تھا جو اپنی بکری کا دودھ اس خوف سے نہ دوہتا تھا کہ اس کی آواز سن کر پڑوسی دودھ نہ مانگ لیں، چنانچہ وہ بکری کے تھن سے منہ لگا کر دودھ پی لیتا تھا مگر ایسے کم ظرف شخص کی تعریف میں جریر نے ایسا شاندار قصیدہ پڑھا کہ اَتی شعراء کو قصائد کے مقابلے میں شکست دے دی۔ ④

چونکہ جریر بنواُمیہ کا قصیدہ گو تھا چنانچہ اس نے یزید بن معاویہ کی مدح و ستائش میں بھی ایسا زور لگایا کہ ممدوح کو تدبر، سخاوت اور قوتِ ایمانی میں مثالی شخصیت بنا دیا۔ ⑤ دوسری طرف طِرِماح بن حکیم (م ۱۲۵ھ) اور عمران بن حِطّان

---

① سیر اعلام النبلاء: ۶ص ۲۰۷، ۳ص ۵۹۰
② سیر اعلام النبلاء: ۳ص ۵۸۹
③ طبقات الشعراء لابن المعتز العباسی (م ۲۹۶ھ): ص ۳۳، ط دار المعارف قاہرہ؛ الاعلام زرکلی: ۳ص ۱۰۶، ۴ص ۸۳
④ صبح الاعشیٰ فی صناعة الانشاء: ۱ص ۴۳۶
⑤ الموازنة لابی القاسم الآمدی م ۳۷۰ھ: ص ۱۰۰ ط دار المعارف مصر؛ سیر اعلام النبلاء: ۳ص ۵۹۰

خوارج کے قصیدہ گو تھے۔[1] جبکہ نعیم بن مسعود شیبانی، عمر بن معمر ذہلی اور سُوید بن منجوف سدوسی خلافتِ زبیریہ کے مدح خوان تھے۔[2] بعض شعراء اس کش مکش سے الگ رہے مثلاً احوص (م ۱۰۱ھ) اور ایمن بن خُریم (م ۸۰ھ)۔[3]

اُموی دور میں شاعروں کی قدردانی بہت تھی مگر اظہارِ رائے کی آزادی اتنی بھی نہ تھیں کہ لوگوں کی عزتیں پامال ہونے لگیں، اسی لیے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے احوص کو جسے ہجو گوئی میں کمال حاصل تھا اور کسی کی عزت اس سے محفوظ نہ تھی، شہر بدر کر دیا تھا۔[4] عرب شعراء نہایت حساس اور عموماً عاشق مزاج ہوتے تھے، لہٰذا بعض اوقات فتنۂ عشقِ مجازی میں پڑ جاتے تھے۔ ذُوالرُّمہ جس کی حزنیہ وعشقیہ شاعری دورِ جاہلیت کی یاد تازہ کرتی تھی، قبیلہ منقر کی ایک لڑکی "مَیَّہ" اور ایک خانہ بدوش لڑکی "خرقاء" کے عشق میں مبتلا تھا۔ اس کے دیوان میں ان معشوقاؤں کا ذکر بکثرت ہے۔[5]

فنِ خطابت:

اموی دور میں فنِ خطابت کو مزید ترقی ہوئی۔ عرب کے سب سے بڑے خطیب سحبان بن وائل کا قیام دمشق میں تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں اس کی آمد و رفت ہوتی تھی اور اس کی سحر انگیز خطابت سے حاضرینِ محفل محظوظ ہوا کرتے تھے۔[6] حجاج بن یوسف اور طارق بن زیاد اپنے دور کے مشہور خطیب تھے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ پر وعظ گوئی کے کمالات کی انتہاء تھی، ان کے مواعظ فکرِ آخرت اور علم وحکمت کے مضامین سے لبریز ہوتے تھے۔[7]

لغت:

تابعین نے فنِ لغت پر خاص توجہ دی اور قرآن کی تفسیر کے لیے اسے لازمی قرار دیا۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے تھے:

"اگر میرے پاس کوئی ایسا شخص آئے جو لغتِ عرب میں مہارت کے بغیر قرآن کی تفسیر کرتا ہے، تو میں اسے عبرت کا نمونہ بنادوں۔"[8]

ابوعمرو بن العلاء رحمہ اللہ (م ۱۵۴ھ) اس دور کے سب سے بڑے ماہرِ لغت شمار ہوتے تھے۔[9] قتادہ بن دعامہ رحمہ اللہ محدث اور فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ لغت میں بھی غیر معمولی مقام رکھتے تھے۔[10] اگرچہ ان اصحابِ لغت کا جمع کردہ مواد ان کی کسی تصنیف کی شکل میں محفوظ نہیں مگر طلبہ ان کے علم کو حفظ کر کے استفادہ کرتے رہے اور بعد میں لغت پر

---

① الاعلام للزرکلی: ۳ص ۲۲۵؛ سیر اعلام النبلاء: ۴ص ۲۱۴

② تاریخ دمشق: ۲۵۵/۲۸ تا ۲۵۷

③ سیر اعلام النبلاء: ج ۴ص ۵۹۳، ج ۲ص ۳۵

④ سیر اعلام النبلاء: ۴ص ۵۹۳...... ایک قول یہ بھی ہے کہ احوص نے اپنی کسی غزل میں عاتکہ بنت یزید کا ذکر عاشقانہ پیرائے میں یوں کیا تھا:

یَا بَیْتَ عَاتِکَةَ الَّذِی اَتَعَزَّلُ... حَذَرَ الْعِدَی وَبِهِ الْفُؤَادُ مُوَکَّلُ ۞ اِنِّی لَاَمْنَحُکَ الصُّدُوْدَ وَاِنَّنِی... قَسَمًا اِلَیْکَ مَعَ الصُّدُوْدِ لَاَمْیَلُ

اس بناء پر سلیمان بن عبدالملک نے اسے شہر بدر کر دیا تھا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴ص ۵۹۳)

⑤ وفیات الاعیان: ۴ص ۱۰ تا ۱۳ ⑥ تاریخ دمشق: ۲۰ص ۱۴۳؛ الاعلام للزرکلی: ۳ص ۷۹

⑦ نفح الطیب: ۱ص ۲۳۰، ۲۳۱؛ تاریخ الطبری: ۶ص ۲۰۲؛ معجم الادباء: ۵ص ۲۱۱۳ ⑧ شعب الایمان للبیہقی، ح: ۲۰۹۰

⑨ سیر اعلام النبلاء: ۶ص ۴۰۸ ⑩ سیر اعلام النبلاء: ۵ص ۲۷۷

لکھی گئی کتب میں یہی مواد بہت کام آیا۔ ①

انساب:

چونکہ بنواُمیہ کی حکومت عرب قبائل کی تنظیم کے ساتھ قائم تھی، اس لیے اس دور میں انسابِ عرب کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ اور حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ اس دور کے مشہور ماہرینِ انساب تھے۔ ان کے علاوہ شیعہ مؤرخ محمد بن سائب کلبی کو علم الانساب میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ عباسی دور میں علم الانساب پر جو کتب لکھی گئیں، ان کا دارومدار اُموی دور کے انہی ماہرینِ انساب کی روایات پر تھا۔ ② قتادہ بن دعامہ رحمہ اللہ اس دور کے ماہرین انساب میں غیر معمولی مقام رکھتے تھے۔ ③

صنعت وحرفت:

مسلمانوں نے عملِ کیمیا اور دھاتوں کی ڈھلائی پر بھی توجہ دی جس کا آغاز خالد بن یزید نے کیا۔ خالد نے ایک رومی سے کیمیا اور طب کے علوم سیکھ کر انہیں تین رسائل کی شکل میں عربی میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ اس نے اسکندریہ کے حکماء کو بلا کر یونانی اور قبطی زبانوں میں لکھی گئی حکمت کی کئی کتب کا عربی میں ترجمہ کرایا جن میں حکیم جالینوس کی طبی کتب بھی شامل تھیں۔ نیز اس نے فلکیات، دھاتی آلات کی ڈھلائی اور مختلف صنعتوں پر لکھی گئی کتب کے بھی عربی تراجم کرائے۔ ④

طب وحکمت اور کیمیا:

فارس اور یونان کے بعض طبیبوں کے شاگرد زمانۂ جاہلیت سے جزیرۃ العرب میں علاج معالجہ کیا کرتے تھے۔ ⑤

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مصاحبین میں نصرانی طبیب ابنِ اثال کا نام ملتا ہے جو مفرد اور مرکب ادویات کا ماہر تھا۔ ⑥

عبدالملک بن مروان کے دور کا سب سے مشہور طبیب ایک مجوسی ''برمک'' تھا جس سے اُموی شہزادے علاج کراتے تھے۔ عباسی دور میں اسی برمک کی اولاد برامکہ کہلائی اور وزارت کے عہدے پر رہی۔ ⑦

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے کوشش کی کہ علمِ طب مسلمان خود حاصل کریں۔ خوش قسمتی سے اس دور کا ایک نامور نصرانی طبیب ''ابن ابجر'' حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ آپ رحمہ اللہ نے ابن ابجر کو پہلے انطاکیہ اور پھر حران بھیج کر طبی تعلیم کے حلقے لگوائے اور اس علم کو عام کیا۔ ⑧

❀❀❀

① تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی: حصہ دونم: ص ۳۱۶

② تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی: حصہ دونم: ص ۳۱۵

③ سیر اعلام النبلاء: ۵ ص ۲۷۷ ④ الدولۃ الامویۃ لدکتور حمدی شاھین: ص ۴۵۹

⑤ الاصابہ: ا ص ۲۸۸ ⑥ عیون الانباء فی طبقات الاطباء: ص ۱۷۱

⑦ الکامل فی التاریخ: ۸۲ھ، تاریخ الطبری: ۶ ص ۳۲۵، ۳۲۶ ⑧ عیون الانباء فی طبقات الاطباء: ص ۱۷۱

عہدِ اُموی میں معاشرہ

خلافتِ اُمویہ خالص عرب حکومت تھی جو محمدی انقلاب سے مسخر ہونے والے شرق وغرب کی مالک بن گئی تھی۔ فقط نصف صدی پہلے عربوں کا حال وہ تھا جو اس دور کے مشہور تابعی حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان کیا ہے:

''یہ عرب قبائل سب سے زیادہ مسکین، معاش میں سب سے بدحال، سب سے زیادہ گمراہ، سب سے زیادہ بے لباس، سب سے زیادہ بھوکے تھے۔ وہ دو شیروں یعنی فارس اور روم کے خوف سے کسی بل میں دُبکے ہوئے تھے۔ ان کے علاقے میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر رشک کیا جا سکے۔ ان میں سے زندہ رہنے والے بدبختی کی زندگی جی رہے تھے اور مرنے والے سیدھا جہنم میں جاتے تھے۔ انہیں کھایا جاتا تھا، وہ خود کھانے کے قابل نہ تھے۔ اللہ کی قسم! آج ہم روئے زمین کی کسی قوم کو نہیں جانتے جو ان جیسی کم نصیب اور پست ہوئی ہو۔ یہاں تک کہ اللہ نے اسلام کی دولت دی اور تمہیں اس کے باعث قرآن مجید کا وارث بنایا، تمہارے لیے جہاد کو مشروع کیا۔ تمہیں رزق میں وسعت دی اور تمہیں لوگوں کی گردنوں کا مالک بنا دیا۔ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو، یہ اللہ نے اسلام ہی کی بدولت دیا ہے۔ پس اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو، کہ تمہارا رب شکر گزار بندوں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

دولتِ بنواُمیہ عربوں کے اس قدیم تمدن کی پوری طرح امین تھی جو صدہا برس سے صحرائے عرب میں نشو ونما پاتا آیا تھا۔ اُموی حکومت عربوں کے قبائلی نظام پر استوار تھی جس کی ساخت میں غالب حصہ قریش کا تھا جو حجاز کے قبیلہ مضر کی شاخ تھے۔ مضر کی اور بھی متعدد شاخیں عالم اسلام میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مضر کے بالمقابل عربوں کا دوسرا بڑا قبیلہ ربیعہ کا تھا جس کا تعلق یمن سے تھا اور اس کی درجنوں شاخیں عراق، شام اور حجاز میں موجود تھیں۔ مضر اور ربیعہ کے مابین قدیم رقابت چلی آتی تھی۔ جب تک ایمانی رشتہ مضبوط رہا، یہ تعصب دبا رہا مگر جب ایمانی رشتے کمزور پڑے تو یہ عداوت ابھرنے لگی یہاں تک خانہ جنگی نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے کر بنواُمیہ کی بساط لپیٹ دی۔

طبقاتی تقسیم

اسلامی نظام ہندوؤں اور رومیوں جیسی مستقل طبقاتی تقسیم اور ذات پات کے بندھنوں سے کوسوں دور ہے، اس لیے باقی قوموں کی بہ نسبت مسلم معاشرے میں بھائی چارے، اُخوت اور ہمدردی کے جذبات ہمیشہ زیادہ رہے۔

خلفائے راشدین کے دور میں یہ معیارات اپنے عروج پر تھے یہاں تک کہ حاکم ومحکوم میں بھی کوئی فرق نہ تھا مگر اُموی دور میں رفتہ رفتہ طبقاتی فرق واضح ہونے لگا۔ اس دور کے مسلم معاشرے کو ہم پانچ طبقات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

[1] تفسیر الطبری: ۵ص ۶۵۹، سورۂ آل عمران: آیت ۱۰۳

❶ حکمران طبقہ ❷ عام مسلمان ❸ ذمی ❹ غلام اور باندیاں ❺ موالی

① حکمران طبقہ:

خلیفہ، اس کے بھائی، اولاد اور اعزہ واقارب حکمران طبقے کے اعلیٰ درجے میں شامل تھے۔ غیر اُموی جرنیل اور افسران اس طبقے کے درجہ دوئم میں شمار ہوتے تھے۔ یہ سب نسلاً عرب تھے، سپہ گری اور شجاعت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس لیے ان سے ٹکرانے کا حوصلہ بہت کم لوگ کر سکتے تھے۔ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں ان سے خائف تھیں۔ مملکت کی خوشحالی کے باعث محصولات سے ہونے والی آمدن زائد از ضرورت تھی؛ اس لیے عموماً حکمران طبقہ بہت فارغ البالی کی زندگی گزارتا تھا۔ حکام سرحدوں کی حفاظت اور فتوحات کے لیے پُر جوش اور ترقیاتی کاموں کے لیے مستعد رہتے تھے مگر بعض اوقات طاقت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ظلم وزیادتی کے مرتکب بھی ہوا کرتے تھے جیسا کہ سانحۂ کربلا سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت اور سعید بن مُسَیب رحمہ اللہ سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تک کو تشدد کا نشانہ بنانے جیسی، بہت سی مثالیں اسی دورِ حکومت کی ہیں۔

② عام مسلمان:

یہ تاجروں، کسانوں، سپاہیوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے جو خوشحال معاشرے میں اچھی گزر بسر کر رہے تھے۔ انہیں سرکاری وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ ان کے جوان عسکری خدمات میں شریک ہوتے تھے جس کے باعث انہیں تنخواہیں اور مالِ غنیمت میں حصہ بھی ملتا تھا۔ وہ ٹیکسوں سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔

③ ذمی:

مسلم معاشرے کے غیر مسلم افراد ذمّی کہلاتے تھے۔ وہ عسکری خدمات سے مستثنیٰ ہوتے تھے اور ان کی جان ومال کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہوتی تھی جس کے عوض وہ سالانہ ایک ٹیکس ادا کرتے تھے جسے جزیہ کہا جاتا تھا۔

④ غلام اور باندیاں:

زمانۂ قدیم سے دنیا میں جنگی قیدیوں کو غلام اور باندیاں بنانے کا رواج تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں بھی یہ طبقہ موجود تھا۔ بنواُمیہ کے زمانے میں فتوحات کے باعث ان میں مزید اضافہ ہوا۔ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے۔ چونکہ شریعت میں غلاموں کو آزاد کرنے کا بڑا ثواب ہے، اس لیے لوگ بکثرت غلاموں اور باندیوں کو آزاد بھی کرتے تھے۔

⑤ موالی:

موالی وہ لوگ تھے جو خود یا ان کے باپ دادا غلام بننے کے بعد آزاد ہوئے۔ اُموی دور میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ موالی کی تین قسمیں تھیں:

❶ جن کا عربوں سے عتاق کا تعلق تھا (یعنی وہ کسی عرب خاندان کے آزاد کردہ تھے۔) انہیں "موالیٔ عتاقہ" کہا جاتا تھا۔

③ جن کا عربوں سے موالاۃ (باہمی تعاون) کا معاہدہ تھا، انہیں ''موالیٔ موالاۃ'' کہا جاتا تھا۔
④ عام موالی جن کا کسی عرب خاندان سے ''موالاۃ'' یا ''عتاق'' کا تعلق نہ تھا اور وہ اپنی مدد آپ کے تحت گزارا کرتے تھے۔ جہاں ان کا بس جواب دے جاتا، وہاں وہ مکمل طور پر حکومت کے رحم وکرم پر ہوتے تھے۔

پہلی دو قسموں کے موالی اپنے کفیلوں کی سرپرستی کے باعث بہتر حالت میں تھے۔ ان میں ایک طرف نافع مولی ابن عمر، عکرمہ مولی ابن عباس، حسن البصری اور مکحول رحمۃ اللہ علیہم جیسے علماء وفقہاء کا شہرہ تھا اور دوسری طرف طارق بن زیاد جیسے فوجی افسران کی دھوم تھی۔ موالی سپاہیوں کا بنوامیہ کی حکومت کے قیام واستحکام اور فتوحات میں بھی اہم کردار تھا۔

مگر عام موالی کو بنومروان نے نظر انداز کر رکھا تھا۔ انہیں وہ وظائف نہیں دیے جاتے تھے جو عام مسلمانوں کو ملا کرتے تھے۔ بلکہ ان پر یہ کہہ کر جزیہ لاگو رکھا جاتا تھا کہ یہ لوگ جزیے سے بچنے کے لیے اسلام لائے ہیں۔①

اسی لیے عام موالی اُموی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی بناء پر وہ حجاج بن یوسف کے خلاف ابن اشعث کے خروج میں شریک ہوئے اور عباسی تحریک کی کامیابی میں بھی ان کا بڑا حصہ تھا۔

اعتقادی ونظریاتی تقسیم

مسلم معاشرے میں نظریاتی تقسیم کا بیج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور ابن سبا کی تحریک کی شکل میں لگایا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں اس نے شیعانِ علی اور شیعانِ عثمان کے دو متحارب سیاسی طبقات کی شکل اختیار کرلی۔ حضرت حسن اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی صلح کے بعد امن قائم ہوگیا مگر عہدِ یزید میں پیش آنے والے سانحوں نے دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکا دیا اور اس کے بعد فرقہ بندی کا سلسلہ رُکنے میں نہ آیا۔ اکثر فرقے بنیادی طور پر مشاجرات میں متشددانہ آراء قائم کرنے کے باعث وجود میں آئے۔ اس لیے پہلے مشاجرات میں شامل فریقین کا تعارف ضروری ہے۔

شیعانِ علی اور شیعانِ عثمان:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان تمام پیروکاروں کو ''شیعانِ علی'' کہا جاتا تھا جو ایک سیاسی جماعت کے طور پر ان کے حامی تھے۔ ان میں متعدد صحابہ کرام اور سینکڑوں جلیل القدر تابعین بھی شامل تھے۔ یہ سب اسی عقیدے پر قائم تھے جو قرآن وسنت سے ثابت ہے اور جس کی تعلیم حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمیشہ دیتے رہے۔ ان میں سے کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کی بکثرت احادیث دیکھ کر ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھتے تھے۔ جبکہ ان کی بہت بڑی تعداد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل مانتی تھی جو جمہور علماء کا قول ہے۔

① تاریخ الطبری: ۳۸۱/۶؛ المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار (الخطط المقریزی) ۱۴۷/۱

دوسری طرف وہ صحابہ وتابعین جو قصاصِ عثمان کے لیے اٹھے تھے، شیعانِ عثمان، عثمانی یا شیعانِ معاویہ کہلاتے تھے۔ جس طرح شیعانِ علی میں سے صحابہ اور کبار تابعین کا عقیدہ اور تقویٰ شک وشبہے سے بالاتر ہے، اسی طرح عثمانی حضرات میں شامل صحابہ کرام اور تابعین عظام بھی ایسے ہی تھے۔ ①

شیعانِ علی اور شیعانِ عثمان کے اکثر حضرات بعد میں بھی قرآن وسنت کے کامل پیروکار رہے اور سابقہ اختلاف کو ایک مناسب حد میں رکھ کر ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے۔ نیز بہت سے اموی اور ہاشمی اکابر باہمی احترام، ہدایا کے تبادلے، رشتے ناتوں اور میل ملاپ کے ذریعے تعصب وتشدد کی اس فضا کے خاتمے کے لیے کوشاں رہے۔

مگر کچھ لوگ مشاجرات کی ابحاث میں شدت اختیار کر کے راہِ اعتدال سے منحرف ہو گئے اور آخر کار ملت کے عمومی دھارے سے الگ ہو گئے۔ ایسی اکثر ابحاث کا اہم ترین سوال یہ تھا اگر مشاجرات میں ہم برحق تھے تو دوسرے فریق کو کیا کہیں گے؟ اور اگر ہم نے ناحق خون خرابے میں ہاتھ رنگے تھے تو ہماری حیثیت کیا ہے؟ قرآن کی اس آیت کا کیا مطلب ہوگا جس میں کہا گیا ہے: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا۔

(اور جو کوئی بھی کسی مومن کو قتل کرے جان بوجھ کر تو اس کا بدلہ ہے جہنم، اس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔) ②

اہلِ سنت کا اس بارے میں مسلک یہ ہے کہ مشاجرات میں قتل وقتال ''قتلِ عمد'' نہیں، ''قتلِ خطا'' تھا کیوں کہ فریقین میں سے ہر ایک اپنے کو برسرِ حق اور اپنے مخالف کو غلطی پر سمجھ کر یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ اس سے لڑنا جائز ہے۔ ③

مگر متشدد لوگوں نے اس سوال کو لے کر طرح طرح کی موشگافیاں کیں اور درجِ ذیل فرقے پیدا ہو گئے:

① شیعہ:

شیعانِ علی چونکہ خود کو حق پر کہتے تھے؛ اس لیے ان کے متشدد لوگوں نے طے کر دیا کہ جمل اور صفین کی جنگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین ناحق قتل عمد کے مرتکب ہوئے تھے؛ اس لیے وہ نہ صرف گناہِ کبیرہ کے مرتکب تھے بلکہ آیتِ مذکورہ کے مطابق جہنمی بھی تھے، ان سے منقول کوئی بھی حدیث قابلِ قبول نہیں۔ یہ تشیع میں تشدد کا پہلا قدم تھا۔

پھر چونکہ سبائی گروہ شیعانِ علی میں گھل مل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا پرچار کر رہا تھا؛ لہٰذا متشدد شیعوں نے اس بات کو بھی اپنا عقیدہ بنا لیا۔ شیعانِ علی میں راہِ اعتدال سے ہٹنے والے تین قسم کے لوگ تھے:

① تفضیلیہ: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تمام صحابہ سے افضل مانتے تھے مگر کسی صحابی پر لعن طعن نہیں کرتے تھے۔

② سبائی: یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصی اور سب صحابہ سے افضل مانتے تھے۔ نیز حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم اور ان کے حامیوں سے ''تبرّا'' (اظہارِ بیزاری) کرتے اور انہیں ظالم وغاصب وکافر کہتے تھے لہٰذا

① منہاج السنۃ: ۱/۱۸۵

② سورۃ النساء، آیت: ۹۳

③ اہلِ سنت والجماعت از علامہ سید سلیمان ندوی: ص ۳۰، ۳۱

یہ "تبرائی" کہلائے اور چونکہ یہ ابن سبا کے شاگرد تھے لہٰذا "سبائی" بھی کہلائے۔ بعد میں ظاہر ہونے والے رافضی فرقے مثلاً اثنا عشریہ اور اسماعلیہ وغیرہ اسی گروہ کی پیداوار تھے۔

③ شیعہ غلاۃ (انتہائی بدعقیدہ): یہ عبداللہ بن سبا کے خصوصی مرید تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا، خالق اور رازق کہتے تھے۔ انتہائی غلو کے باعث انہیں "شیعہ غلاۃ" کہا جاتا تھا۔

ان متشدد شیعوں سے امتیاز کے لیے صحیح العقیدہ شیعوں کو شیعہ مخلصین، شیعہ متقدمین یا شیعہ اولیٰ کہا جانے لگا۔

دوسری صدی ہجری کے آخر تک متشدد شیعوں کی اکثریت جن نئے نظریات کی حامل بنی ان کا خلاصہ یہ ہے:

❁ "امامت" ایک مخصوص منصب ہے جو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تفویض ہوا تھا، وہ امام اور وصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ وہ اُمت میں سب سے افضل تھے۔ ان کے مخالفین کا حشر کفار کے ساتھ ہوگا۔

❁ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد کے سوا امامت کسی کا حق نہیں۔

❁ امام معصوم اور مفترض الطاعۃ ہوتا ہے، اس کی تابعداری اسی طرح فرض ہے جیسے نبی کی۔

شیعہ متقدمین اور شیعہ تفضیلیہ کو چھوڑ کر اہلِ تشیع کے باقی سب گروہ ان عقائد پر متفق تھے۔ ①

② نواصب یا مروانی:

شیعانِ عثمان میں شامل متعصب لوگ تحریکِ قصاصِ عثمان کی مخالفت کرنے والے یا اس سے تعلق نہ رکھنے والے ہر شخص کے ایمان کو مشکوک سمجھتے تھے۔ انہوں نے اس معاملے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی صف میں شامل جلیل القدر صحابہ کی بھی رعایت نہ کی۔ ان کے نزدیک مشاجرات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ خطا کار تھے۔ ان کے انتہا پسند لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتلِ عمد کا مجرم، ظالم اور گناہ گار مانتے تھے۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایسا ثابت کرنے کے لیے پروپیگنڈے کی ضرورت تھی لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت کی تنقیص بھی اس جماعت کا شعار بن گیا۔ ایسے لوگ "آل مروان" یا "مروانی" کہلائے ② کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تبرا کرنے میں مروان بن الحکم سب سے نمایاں تھا۔ ③

بعد میں اس سوچ کے حامل لوگ "نواصب" کہلانے لگے۔ علماء فرماتے ہیں:

"اَلنَّصْبُ بُغْضُ عَلِيٍّ۔" (ناصبیت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنا ہے۔) ④

وَاَهْلُ النَّصْبِ الْمُتَدَيِّنُوْنَ بِبُغْضِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ۔ (ناصبی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کو دینداری سمجھتے ہیں۔) ⑤

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ناصبیوں کی پہچان یوں کراتے ہیں:

① مختصر التحفة الاثنی عشریة، ص ۳ تا ۱۰؛ الملل والنحل للشہرستانی: ۱/ ۱۰ تا ۱۲۱
② صحیح مسلم، ح: ۲۳۸۲
③ انساب الاشراف: ۲ ص ۱۸۴؛ التاریخ الکبیر لابن ابی خیثمہ، السفر الثالث: ۲ ص ۴۷
④ مصطلحات فی کتب العقائد: ص ۱۲۵ ⑤ توضیح المقاصد شرح الکافیہ: ص ۴۸۲

"نواصب دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی جنگوں میں برحق نہ تھے۔"①

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ناصبیوں کی علامات کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"ناصبی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فاسق قرار دیتے ہیں کہ وہ ظالم اور دنیا کے طالب تھے انہوں نے خلافت اپنے لیے طلب کی اور اس کی خاطر تلوار چلائی اور اس بات پر ہزاروں مسلمان مروا دیے۔"②

آگے چل کر یہ لوگ ہر اُموی کو معصوم ثابت کرنے پر تُل گئے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں یزید اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حجاج اور عبدالملک کو برحق کہنے لگے۔ اس طرح وہ شیعوں کی ضد بن کر رہ گئے۔ جس شخصیت کی شیعہ تعریف کرتے، یہ اس کی کردار کشی پر اُتر آتے چاہے وہ صحابی ہی کیوں نہ ہو۔ جسے شیعہ بُرا سمجھتے، یہ اسے اپنا ممدوح بنا لیتے، چاہے وہ کتنا ہی ظالم ہو۔③

③ خوارج:

شیعوں اور ناصبیوں کی اعتقادی کش مکش کے درمیان خوارج نے اپنے طور پر یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ جمل اور صفین وغیرہ میں اہلِ عراق اور اہلِ شام نے قتلِ عمد کیا تھا جو گناہِ کبیرہ ہے، لہٰذا دونوں ہی فریق مجرم تھے۔ اور چونکہ قرآن نے قتلِ عمد کے مرتکب کو جہنمی کہا ہے؛ لہٰذا فریقین جہنمی بھی ہیں اور ان میں سے کسی کی حمایت کرنے والے گمراہ ہیں۔

پھر انہوں نے آگے بڑھ کر کہا کہ چونکہ ہمیشہ جہنم میں رہنا کافروں کی سزا ہے؛ اس لیے یہ لوگ کافر بھی ہیں۔ اگلے مرحلے میں انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ صرف قتلِ عمد نہیں بلکہ ہر گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر اور پکا جہنمی ہے۔

خوارج کے نظریات قرآن کے ظاہر سے ماخوذ تھے۔ سنت اور فقہ سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ متشددانہ مزاج کی وجہ سے وہ ہر حکومت سے برسرِ پیکار رہے اور حکمرانوں نے بھی ان کی بار بار سرکوبی کی۔ ان کے اہم عقائد یہ تھے:

- اسلامی احکام کا ماٴخذ فقط قرآن مجید ہے۔ حدیث اور اجماع نہیں۔
- حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما برحق تھے۔
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کی ابتداء میں برحق تھے مگر آخر میں ظالم ہو گئے۔ ان کا قتل درست تھا۔
- حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے ٹھیک تھے، جب انہوں نے غیر اللہ کا فیصلہ ماننے پر رضامندی ظاہر کی تو گمراہ ہو گئے۔
- جنگِ جمل اور جنگِ صفین کے فریقین اور تحکیم میں شریک تمام لوگ گناہ گار تھے۔
- گناہِ کبیرہ کفر ہے۔
- عام مسلمان کافر ہیں؛ کیوں کہ وہ گناہوں سے پاک نہیں اور وہ حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔

---

① النَّواصِب الزَّاعِمِيْنَ أَنَّ عَلِيًّا لَمْ يَكُنْ مُصِيبًا فِي حُرُوبِهِ۔ (فتح الباری: ۱/۵۳۳)

② منہاج السنۃ: ۲/۵۹

③ اتحاف السائل بما فی الطحاویۃ من المسائل: ۱۳/۳۵

❁ حاکمیت صرف اللہ کے لیے خاص ہے۔ بندوں کا بنایا ہوا کوئی قانون یا ضابطہ قابلِ قبول نہیں۔
❁ خلیفہ کا قریشی ہونا شرط نہیں۔ کسی بھی رنگ ونسل کا آدمی خلیفہ بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ نیک وصالح ہو۔
❁ خلیفہ تقویٰ سے ذرا بھی منحرف ہو تو اسے معزول کرنا یا اس کے خلاف تلوار اٹھانا فرض ہے۔ ①

④ مُرجِئہ:

صحابہ کرام کے دور کی سیاسی کش مکش میں بہت سے صحابہ وتابعین غیر جانب دار رہے تھے۔ یہ حضرات فریقین میں سے کسی کو برا نہیں کہتے تھے بلکہ تمام اکابر کا احترام کرتے تھے اور سب کو کامل الایمان مانتے تھے۔

اُموی دور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے حسن بن محمد بن حنفیہ نے غیر جانبداری کو مستقل نظریہ بنالیا اور اپنے ایک رسالے میں لکھا کہ ہم مشاجراتِ صحابہ سے لاتعلقی اختیار کرتے ہیں اور کسی فریق سے وابستگی ظاہر نہیں کرتے۔ ②

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کے بقول ان کا مذہب یہ تھا کہ ''فتنے میں باہم قتال کرنے والی دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کے مخطی یا مصیب ہونے کا قطعی طور پر فیصلہ نہ کیا جائے اور ان کا معاملہ مؤخر کر دیا جائے۔'' یہ عقیدہ رکھنے والے لوگ ''مرجئہ اولیٰ'' کہلاتے تھے۔ حسن بن محمد کا موقف بس اسی قدر تھا۔ ③

مگر آگے چل کر ان کے پیروکاروں نے خوارج کی ضد میں بات کو بہت بڑھا دیا اور کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ مشاجرات میں قتلِ ناحق کرنے والے جہنمی نہیں بلکہ مسلمان تھے، لہٰذا ثابت ہوا کہ جہنم سے نجات کے لیے گناہوں سے بچنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ جس نے کلمہ پڑھا ہو وہ بڑے سے بڑے گناہ کر کے بھی سیدھا جنت میں جائے گا۔ مرجئہ کے خیالات سے فسق وفجور کے راستے کھل گئے۔ لوگ لوٹ مار، ظلم اور قتلِ ناحق میں بے باک ہونے لگے۔ ④

⑤ معتزلہ:

خوارج اور مرجئہ کی ضد بحثی کے درمیان کچھ لوگوں نے ایک نئی بات یہ نکالی کہ گناہِ کبیرہ کرنے والا مؤمن تو نہیں رہ سکتا مگر وہ کافر بھی نہیں ہوتا بلکہ ایمان اور کفر کے درمیان ہوتا ہے۔ اس نظریے کے بانی بصرہ کے دو جید علماء: واصل بن عطاء (۸۰ھ۔ ۱۳۱ھ) اور عَمرو بن عبید (م ۱۴۵ھ) تھے۔ ایک دن حسن بصری رحمہ اللہ کے حلقے میں کسی نے سوال اٹھایا:

''خوارج کی جماعت کبیرہ گناہ کرنے والوں کو کافر قرار دیتی ہے، اور جماعتِ مرجئہ کبیرہ گناہ کرنے والوں کے

---

① الفرق بین الفرق، للامام عبدالقاهر الاسفرائنی: ۱/۵۵ تا ۸۳؛ الملل والنحل للشهرستانی: ۱/۱۱۴ تا ۱۳۷؛ اہل سنت والجماعۃ از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم: ص ۳۲

② تاریخ الاسلام للذهبی: ۶/۳۳۱، ۳۳۲؛ تاریخ دمشق: ۱۳/۳۸۰، ۳۸۱؛ اہل سنت والجماعۃ از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم: ص ۳۲

③ کان یری عدم القطع علی إحدی الطائفتین المقتتلین فی الفتنة بکونه مخطئا او مصیبا و کان یری انه یرجیء الأمر فیهما۔ (تهذیب التهذیب: ۲/۳۲۱) تاہم جمہور اہلِ سنت والجماعت کا مذہب سلفاً وخلفاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصویب کا رہا ہے جیسا کہ کتبِ عقائد میں واضح ہے۔

④ الملل والنحل للشهرستانی: ۱/۱۳۹ تا ۱۴۵

لیے "ارجاء" کی قائل ہے اور کہتی ہے کہ جس طرح کفر کے ساتھ نیکی نفع نہیں دیتی اسی طرح ایمان کے ساتھ گناہ کوئی نقصان نہیں دیتا۔ تو ہم کیا عقیدہ رکھیں؟" اس پر واصل بن عطاء نے کھڑے ہو کر کہا: "کبیرہ گناہ کرنے والا نہ تو علی الاطلاق کافر ہے، نہ ہی وہ علی الاطلاق مؤمن ہے۔ بلکہ وہ دونوں کے بیچ میں ہے، نہ مؤمن ہے نہ کافر۔" واصل کی یہ باتیں سن کر حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: "اِعْتَزَلَ عَنَّا وَاصِلٌ۔" (واصل ہم سے الگ ہو گیا ہے۔) چنانچہ یہ لوگ "معتزلہ" کہلانے لگے۔ یہ لوگ خود کو "اصحاب العدل والتوحید" کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ عمل صالح کے بغیر ایمان قطعاً مقبول نہیں اور ایسا کلمہ گو مؤمن اور کافر کے درمیانی درجے پر ہے۔

معتزلہ نے مشاجراتِ صحابہ کو بھی موضوعِ بحث بنایا۔ عمرو بن عبید کے نزدیک جنگِ جمل اور صفین میں شریک دونوں فریق فاسق تھے کیوں کہ انہوں نے ناحق خون بہایا تھا۔ واصل بن عطاء کی رائے تھی کہ کوئی ایک فریق فاسق تھا مگر یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کون سا فریق تھا۔ ①

⑥ جبریہ:

اُموی دور میں اہلِ شام اور اہلِ عراق کے درمیان نظریاتی تصادم جاری تھا۔ اہلِ شام کا کمزور ترین پہلو بدنامی کے وہ داغ تھے جو کربلا، واقعۂ حرہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت جیسے سانحوں کی شکل میں ان کے دامن پر لگے تھے۔ یہ داغ دھونے کے لیے کچھ شامی عقل پرستوں نے "جبر" کا نظریہ پیش کیا جس کا حاصل یہ تھا کہ تقدیر کے سامنے انسان بالکل مجبورِ محض ہے لہٰذا جمل، صفین، کربلا، واقعۂ حرہ وغیرہ کی ذمہ داری کسی انسان پر عائد نہیں ہوتی۔ یہ فرقہ جبریہ کہلایا۔ اس فرقے کا کہنا تھا کہ انسان تقدیر کا اس قدر پابند ہے کہ اس کے اختیار میں کچھ ہے ہی نہیں۔ ②

⑦ قدریہ:

شامی عقل پرستوں کی تردید کے لیے سوسن (سَنْسُوَيْہ) نامی ایک نومسلم عراقی نے آواز بلند کی اور کہا کہ تقدیر کوئی چیز نہیں بلکہ انسان پوری طرح بااختیار اور اپنے تمام اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ سوسن کے بعد مَعبد جہنی اور غیلان نامی دو شخص اس نظریے کو پھیلانے میں سرگرم رہے۔ یہ تقدیر کے منکر لوگ "قدریہ" کہلائے۔ ③

⑧ جہمیہ:

جہمی مذہب کا اصل بانی طالوت نامی ایک یہودی تھا جس نے یہ عقیدہ پیش کیا کہ اللہ ہر جگہ اور ہر چیز میں بذاتِ خود موجود ہے۔ اس کے شاگرد بیان بن سمعان نے یہ باتیں آگے پھیلائیں۔ دِمشق کے ایک شخص جعد بن درہم نے ان

---

① مقالات الاسلامیین للاشعری: ۱/۲۱۳؛ الفصل فی الملل والاھواء والنحل لابن حزم: ۴/۱۳۸، ۱۳۹؛ الفرق بین الفرق: ص ۹۴ تا ۱۰۰؛ اہل سنت والجماعۃ از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم: ص ۳۲

② اعتقادات المسلمین والمشرکین للرازی: ۱/۲۸؛ اہل سنت والجماعت، علامہ سید سلیمان ندوی، ص ۳۳

③ الاعلام للزرکلی: ۷/۲۶۴، ۲۶۵؛ سیر اعلام النبلاء: ۴/۱۸۶، ۱۸۷؛ اہل سنت والجماعۃ از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم: ص ۳۴

عقائد کو نئے اضافوں کے ساتھ پیش کیا اور تمام فرقوں کے مابین کش مکش سے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے اصولِ دین تبدیل کر دیے اور ظاہر کیا کہ نصوص پر بھروسہ کر کے کوئی زیرِ بحث مسئلہ حل نہیں ہوسکتا؛ لہٰذا ہر بحث کو عقلی دلائل پر موقوف قرار دیا جائے یعنی جو چیز عقل کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔ اُمت میں یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے قرآن مجید کے مخلوق ہونے کی بحث چھیڑی۔ وہ ہر اس عقیدے کی نفی کرتا تھا جو عقل میں مشکل سے آتا ہو۔ اس کے شاگردوں میں سے جہم بن صفوان نے اس فرقے کو منظم شکل دی؛ اس لیے یہ فرقہ اسی کی طرف منسوب ہو کر جہمیہ کہلایا۔①

الغرض فرقہ بندیوں کے تمام سلسلوں کی اصل بنیاد آٹھ گروہ تھے:

① شیعہ ② خوارج ③ نواصب ④ مرجئہ

⑤ معتزلہ ⑥ جبریہ ⑦ قدریہ ⑧ جہمیہ

پہلے چار ایک دوسرے کی ضد میں، جبکہ آخری چار عقل پر حد سے زیادہ انحصار کر کے گمراہ ہوگئے۔

علاقوں کے لحاظ سے سیاسی و مذہبی میلانات:

اس زمانے میں مختلف علاقوں کے سیاسی مذہبی رجحانات کیا تھے؟ اس پر عباسی تحریک کے بانی محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کی درج ذیل ہدایت سے روشنی پڑتی ہے جو تحریک کے نقیبوں کو دی گئی تھی:

''کوفہ اور اس کے نواح میں زیادہ تر شیعانِ علی ہیں۔ اہلِ بصرہ زیادہ تر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیروکار ہیں جن کا مسلک دست درازی سے احتراز کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''مقتول بن جاؤ، قاتل مت بنو۔''

الجزیرہ کے لوگ سرکش خوارج ہیں۔ وہاں رومیوں جیسے دیہاتی بھی ہیں اور ایسے مسلمان بھی ہیں جو صفات میں نصرانیوں کے مشابہ ہیں۔ اہلِ شام بس آلِ ابوسفیان سے نسبت رکھتے ہیں اور بنو مروان کی اطاعت کرنا جانتے ہیں۔ ان کی ہم سے عداوت گہری اور جہالت پختہ ہے۔ جہاں تک اہلِ مکہ ومدینہ کا تعلق ہے، ان پر حضرت ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما کی محبت) کا غلبہ ہے۔ پس تم خراسان پر توجہ دو جہاں آبادی بکثرت اور شجاعت نمایاں ہے۔ وہ خالی الذہن اور صاف دل لوگ ہیں جو انتشار اور گروہ بندی سے بچے ہوئے ہیں۔''②

جھوٹی اور مبالغہ آمیز روایات کی تشہیر کے پیچھے فرقہ وارانہ جذبات:

جب مختلف گروہوں میں سیاسی کش مکش ہوتی ہے تو متشدد لوگ مخالف قیادت کے بارے میں خود ساختہ باتیں عام کر کے اپنے گروہ کی ساکھ کو مضبوط اور دوسرے کے وقار کو گرانے پر تُل جاتے ہیں۔ اہلِ عراق اور اہلِ شام کی کش مکش کو بڑھانے میں ایسے لوگ پوری طرح سرگرم رہے۔ سبائیوں اور مروانیوں کے علاوہ خوارج، قدری، جبری اور جہمی سب اس میں حصہ ڈالتے رہے۔ یوں مختلف فرقوں کی نشر کردہ بہت سی مبالغہ آمیز اور من گھڑت باتیں اگلی نسل کے

① تاریخ دمشق: ۹۹/۷۲، ۱۰۰؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳۸/۱۳، ۱۹۹؛ الوافی بالوفیات للصفدی: ۱۶۰/۱۱، ۱۶۱

② عیون الاخبار: ۱/ص ۳۰۳، ط العلمیۃ

ذخیرۂ روایات میں ضم ہو گئیں۔ ذخیرۂ حدیث میں مل جانے والی روایات کو محدثین نے اچھی طرح چھانٹ دیا جبکہ ذخیرۂ تاریخ میں محتاط مؤرخین نے سند درج کرنے کا اہتمام کیا تا کہ اہلِ نظر روایت کا درجہ سمجھ سکیں۔

اہلِ سنت والجماعت کا ممتاز گروہ:

مختلف الخیال شدت پسند گروہوں کی کش مکش کے درمیان اُمتِ مسلمہ کی اکثریت انہی عقائد ونظریات پر کار بند تھی جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھے اور جنہیں صحابہ کرام، تابعین اور علماء وفقہاء اپنے اپنے حلقوں میں بیان کرتے آرہے تھے۔ اکثر گمراہ فرقوں کا اصل استدلال جعلی روایات یا عقلی دلائل سے تھا۔ قرآن و سنت کی نصوص ان کے حق میں نہ جاتی تھیں۔ تاہم اہلِ باطل قرآن کا صاف انکار کرنے کی ہمت نہ کرتے تھے بلکہ آیات کی تاویلات کرتے تھے۔ جبکہ احادیث اور صحابہ کے اجماعی فیصلوں کا وہ کھل کر انکار کرتے تھے۔ پس اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان بڑا فرق یہ ظاہر ہوا کہ اہلِ حق:

❶ احادیث صحیحہ یعنی سنت کے پابند تھے۔

❷ اجماعِ صحابہ کو مانتے تھے۔

جبکہ اہلِ باطل:

① سنت کی جگہ جعلی روایات یا عقلیات کے اسیر تھے۔

② اجماع کی جگہ ہر معاملے میں من مانی تاویلات کرتے تھے۔

پس اپنے اور اہلِ باطل کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے کے لیے اُمتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم نے ایسا عنوان اختیار کیا جس سے امتیاز کی وجوہ واضح ہو جائیں۔ پس پہلی صدی ہجری میں ہی سنتِ مطہرہ پر عمل کرنے والے اور اجماع کو حجت ماننے والے: سُنَّۃ، اهل السُنَّة اور ''اهل السنة والجماعة'' کے القاب سے مشہور ہو گئے۔ شیعانِ علی اور شیعانِ عثمان کی بڑی تعداد نے جو سنتِ نبویہ اور اجماعِ صحابہ کو حجت سمجھتی تھی، اپنی سابقہ شناختیں مٹا دیں اور یہی نام پسند کر لیا۔ نیز غیر جانبدار طبقات نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہی لوگ ''سوادِ اعظم'' اور ''جمہور مسلمین'' کے عنوان سے معروف ہوئے۔①

❀❀❀

① مختصر التحفة الاثنی عشریة، ص ۱۳ تا ۱۰؛ اهل السنة والجماعة از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم

مشق

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ اُموی دور کے اہلِ علم کی قرآن مجید کی علمی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
❷ اُموی دور کے پانچ مشہور محدثین اور پانچ نامور فقہاء کا تعارف کرائیے۔
❸ اُموی عہد میں آمدن اور محصولات کے ذرائع کیا کیا تھے؟
❹ موالی کون تھے اور اُموی عہد میں ان کی کیا حیثیت تھی؟
❺ اُموی عہد میں فلاحی ورفاہی کاموں اور شہروں کی تعمیر وترقی پر مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
❻ اُموی دور میں زراعت اور طب کے شعبے میں کیا ترقی ہوئی؟
❼ خلافتِ راشدہ اور اُموی دور کے شعروادب میں کیا فرق تھا؟ اُموی دور کے پانچ نامور شعراء کون تھے؟
❽ مسلمان فرقوں میں کیسے تقسیم ہوئے اور ان میں سوادِ اعظم کے امتیازات کیا تھے؟

عملی کام:

❁ نقشہ دیکھیے اور اُموی دور میں حدیث وفقہ کے پانچ بڑے مراکز کی نشاندہی کیجیے۔
❁ اُموی دور کے دو منتخب شعراء کے پانچ پانچ اشعار مع ترجمہ خوش خط لکھیے۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ الخلافۃ الراشدۃ والدولۃ الامویۃ من فتح الباری: ترتیب، دکتور یحییٰ بن ابراھیم
❁ الفقہاء والخلافۃ فی عصر الاموی، دکتور حسین عطوان

❁❁❁

حصہ سوم

خلافتِ عباسیہ بغداد

۱۳۲ھ تا ۶۵۶ھ

(۷۴۹ء تا ۱۲۵۸ء)

کل مدت: ۵۲۴ سال

تبویب

پہلا باب:

دولتِ عباسیہ بغداد، دورِ تاسیس، استحکام، وعروج

دوسرا باب:

دولتِ عباسیہ بغداد، دورِ زوال

پہلا باب

دولتِ عباسیہ بغداد:

تاسیس، استحکام، عروج

ابوالعباس سفاح کی مسند نشینی سے متوکل کے قتل تک

(۱۳۲ھ تا ۲۴۷ھ) تقریباً ۱۱۵ سال

اہداف:

ان شاء اللہ یہ باب پڑھ کر آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

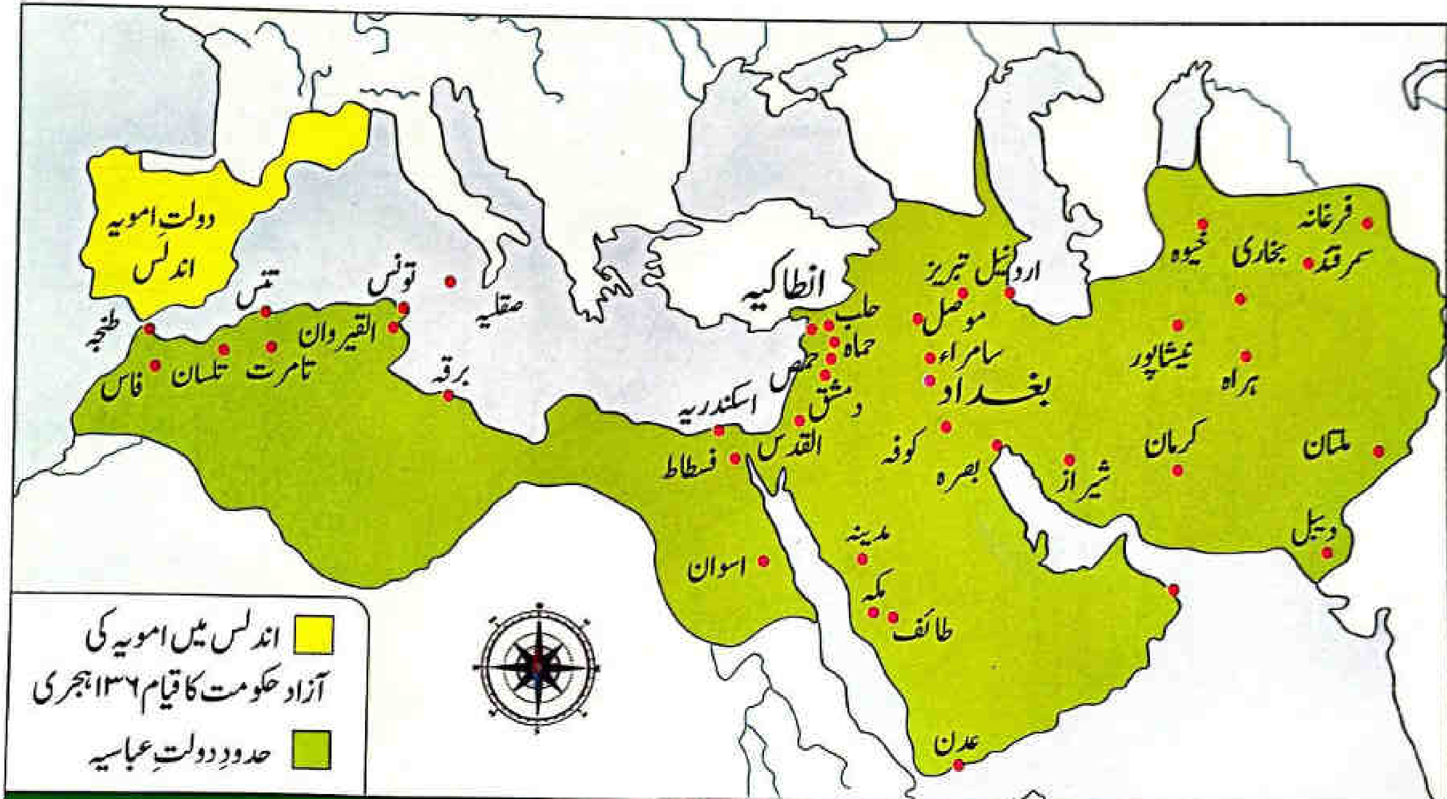
① دولتِ بنوعباس کے دورِ تاسیس اور دورِ استحکام کے حالات پر تبصرہ کر سکیں۔

② دولتِ عباسیہ کے دورِ عروج اور عہدِ زرّیں سے واقف ہو سکیں۔

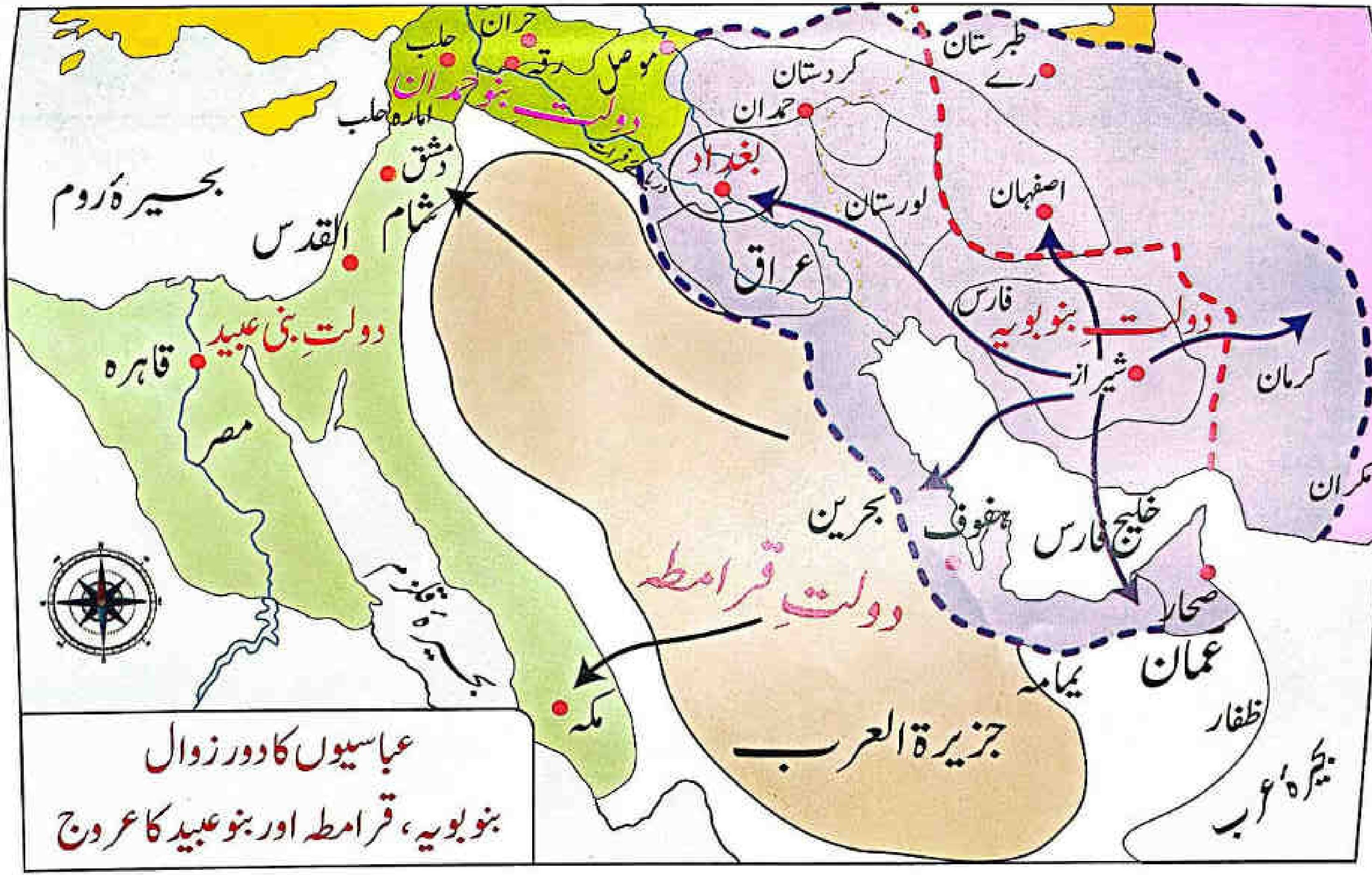
③ دولتِ عباسیہ میں فقہِ اسلامی کی تدوین سے اجمالاً متعارف ہو سکیں۔

④ منصور، مہدی اور ہارون الرشید جیسے نامور خلفاء کے کردار اور کارناموں سے آگاہ ہو سکیں۔

⑤ مامون الرشید، معتصم باللہ اور واثق باللہ کے دور میں پھیلنے والے فتنۂ اعتزال اور اس کے مقابلے میں علماء کی کاوشوں کو جان سکیں۔



خلافتِ عباسیہ کی حدود دورِ عروج میں



عباسیوں کا دور زوال
بنو بویہ، قرامطہ اور بنو عبید کا عروج

(یونٹ:2.7)

ابوالعباس سفّاح

عبداللہ بن محمد

ربیع الاوّل ۱۳۲ھ......تا......ذوالحجہ ۱۳۶ھ

اکتوبر ۷۴۹ء......تا......جون ۷۵۴ء

خلافتِ عباسیہ کے بانی سفّاح کا اصل نام عبداللہ بن محمد تھا۔ اُمت کی قیادت سنبھالتے وقت اس کی عمر چوبیس سال سے زائد نہ تھی۔ امام سیوطی رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وہ نہایت سخی انسان تھا۔ جو بھی وعدہ کرتا اسے پورا کرنے میں وقتِ مقررہ سے ذرا بھی دیر نہ کرتا۔ اپنی مجلس سے اٹھنے سے پہلے ضرورت پوری کرا دیتا۔"①

مگر امام سیوطی یہ بھی لکھتے ہیں:

"وہ خون بہانے میں بھی تیز تھا۔ اس کے نائبین نے بھی مشرق و مغرب میں اس کی پیروی کی۔"②

بنو مروان کی حکومت ختم کرتے ہی بنو عباس نے فاطمی بزرگوں سے کیا گیا یہ وعدہ فراموش کر دیا کہ ان کے نیک سیرت بزرگ محمد نفسِ زکیہ کو خلیفہ بنایا جائے گا۔ جمعہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۲ھ کو "کوفہ" میں ابوالعباس سفّاح کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔③ سفّاح نے اپنی پہلی تقریر میں مسلمانوں سے وعدہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ خاندان جس سے تمہیں خیر اور صلاح ملی ہے، اس سے کبھی ظلم اور فساد نہیں ملے گا۔"④

اس کے بعد سفّاح کے چچا داود بن علی نے خطاب کیا اور کہا: "ہم تمہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، ان کی آل کی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ضمانت دیتے ہیں کہ ہم معاشرے میں اللہ کے احکام کا نفاذ کریں گے، کتاب اللہ پر عمل پیرا ہوں گے اور عوام و خواص سبھی سے سیرتِ نبوی کے مطابق معاملہ کریں گے۔"

خطاب کے آخر میں اس نے کہا:

"یاد رکھنا! یہ اقتدار اب ہم سے کہیں جانے والا نہیں، یہاں تک کہ ہمارا آخری خلیفہ خود اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام

① تاریخ الخلفاء، ص ۱۹۲، طنزار ② تاریخ الخلفاء، ص ۱۹۳، طنزار

③ تاریخ الطبری: ۳۲۵/۷؛ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۳۰۹ ④ تاریخ الطبری: ۳۲۵/۷، ۳۲۶

کے سپرد نہ کر دے۔"①

مگر دُنیا جانتی ہے کہ آخر چند سو سال بعد بنوعباس کی خلافت بھی ختم ہوگئی اور وہ بھی انتہائی حسرت ناک انداز میں۔

انبار میں پایۂ تخت:

بنوعباس کے حامیوں کی زیادہ تعداد عراق اور خراسان میں تھی؛ لہٰذا سیاسی حکمتِ عملی کے تحت سَفّاح نے ۱۳۴ھ میں موجودہ بغداد سے ۶۸ کلومیٹر دور دریائے فرات کے شمال مشرق میں واقع شہر "انبار" کو اپنا پایۂ تخت بنالیا۔②

مظالم اور عہد شکنی:

اس میں شک نہیں کہ نئے حکمران خانوادے نے عوام کے ساتھ عدل وانصاف اور سخاوت وفیاضی کا سلوک کیا مگر دوسری طرف بنوامیہ کو بے دریغ انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ بہت سے شہزادوں، امراء اور سابق سرکاری افسران کو قتل کیا گیا۔ ان مظالم سے بچنے کے لیے بہت سے اموی گھرانوں کو فرار ہونا پڑا۔ مفرور اموی شہزادوں میں سے ایک عبدالرحمن الداخل تھا جس نے اندلس جا کر وہاں اموی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔③

مقتول شہزادوں اور امراء میں عبداللہ بن عبدالملک، اسحٰق بن عبداللہ، عبدالملک بن مروان کا پوتا عمر بن یزید اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پوتے عمر بن ابی سلمہ بھی شامل تھے۔ اسی طرح سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے پانچ پڑپوتے: عمران بن موسیٰ، ایوب بن موسیٰ، یحییٰ بن امیہ، اسماعیل بن امیہ اور عبداللہ بن عنبسہ قتل کیے گئے۔ عبداللہ بن عنبسہ کے دو بیٹے: عیاض اور محمد کا انجام بھی یہی ہوا۔ سزائے موت کی یہ کارروائیاں سَفّاح کے چچا عبداللہ بن علی اور داؤد بن علی کے ہاتھوں عمل میں آئیں۔④

تاہم بعض اموی امراء کو اعلیٰ عہدے دیے گئے مثلاً: یعقوب بن داؤد کو مہدی عباسی کے دور میں وزارت ملی۔ ربیع بن یونس اموی تین خلفاء: منصور، مہدی اور ہادی کے دور میں عباسیوں کا حاجب رہا۔ اس کا بیٹا فضل، ہارون اور مامون کے دور میں حاجب رہا۔ یوں سلطنت کا یہ مرکزی عہدہ تقریباً پون صدی تک اموی امراء کے پاس رہا۔⑤

دوسری طرف سفاح نے بنوامیہ کے کچھ ایسے امراء کو موقع پاتے ہی قتل کرا دیا جو صلح کر چکے تھے۔ ابن ہُبیرہ (یزید بن عمر) اموی اقتدار کا ستون تھا۔ وہ واسط میں قلعہ بند ہو کر عباسیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر مروان بن محمد کی موت کی خبر ملنے کے بعد اس کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اور اس نے سَفّاح کے بھائی منصور کے نمائندے حسن بن قَحطبہ سے مذاکرات کر کے ایک تحریری معاہدہ کر لیا جس میں اسے اللہ کے عہد ومیثاق کے ساتھ اطمینان دلایا گیا کہ وہ اور اس کی ہر چیز محفوظ رہے گی۔ یوں ابن ہُبیرہ عباسیوں کا حلقہ بگوش بن گیا مگر دو ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ منصور نے ابن ہُبَیرہ اور اس کے

---

① تاریخ الطبری: ۷/۴۲۵ تا ۴۲۷؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۳۲ھ ② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۳۴ھ

③ تاریخ الطبری: ۷/۴۴۳، ۴۵۹ ④ تاریخ خلیفہ بن خیاط، ص ۴۱۰

⑤ تاریخ الطبری: ۶/۱۸۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۷/۳۳۵؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۵۹۷

متعدد سرکردہ ساتھیوں کو دھوکے سے گرفتار کرلیا اور معاہدے کا لحاظ کیے بغیر سب کو قتل کرادیا۔ ①

عباسی تحریک کے وہ پکے جانثار بھی سَفّاح کی شمشیر سے نہ بچ پائے جن پر بعد میں شک ہوگیا۔ مثلاً ابوسلمہ خلال نامی ایک رئیس نے اس تحریک میں بے دریغ مال خرچ کیا تھا۔ سَفّاح نے اس کی خدمات کو دیکھ کر اسے وزیر بنالیا تھا۔ اس سے قبل خلفائے راشدین اور خلفائے بنواُمیہ کے ہاں وزیر کا عہدہ نہیں ہوتا تھا۔ پس ابوسلمہ خلال اسلامی تاریخ میں وزارت کا عہدہ پانے والا پہلا فرد تھا اور اس کا لقب ''وزیرِ آلِ محمد'' تھا۔ مگر ابوسلمہ دل ہی دل میں اس پر خفا تھا کہ بنوعباس نے بنوفاطمہ کو نظر انداز کر کے خلافِ معاہدہ اپنی حکومت قائم کی ہے۔ سَفّاح کو اس کے خیالات کا علم تھا چنانچہ ۱۳۲ھ میں اس کے حکم سے ابومسلم نے اپنے آدمی بھیج کر اس پرانے مددگار کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ②

بغاوتیں:

عباسیوں کے اس طرزِ عمل نے بہت جلد عوام کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ خراسان کے ایک باغی سردار شریک بن شیخ نے برملا کہا: ''ہم نے اس بات پر تو آلِ محمد کا ساتھ نہیں دیا تھا کہ وہ خونریزی کریں اور ناحق راہ اختیار کریں۔''

یہی وجہ تھی کہ سَفّاح کا اقتدار پوری طرح مستحکم ہونے سے پہلے ہی عالمِ اسلام میں خروج اور بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو سَفّاح کی موت کے بعد اس کے بھائی ابوجعفر منصور کے زمانے میں بھی جاری رہا۔

۱۳۲ میں پہلی بڑی بغاوت شام کے علاقے قِنَّسرین میں ہوئی۔ دوسری الجزیرہ میں ہوئی۔ تیسری مُوصل میں ہوئی۔ ۱۳۴ھ میں بسام بن ابراہیم نے خراسان، شیبان یشکری نے عمان اور منصور بن جمہور نے سندھ میں بغاوت کی، اگلے سال زیاد بن صالح نے وسطِ ایشیا میں خروج کیا۔ ہر شورش کا بنوعباس کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ شورش پسندوں کو تہس نہس کردیا جائے۔ چنانچہ ہر جگہ باغیوں کا زور توڑ کر انہیں نشانِ عبرت بنادیا گیا۔ ③

سَفّاح کی وفات:

سَفّاح چار سال نو ماہ حکومت کر کے چیچک کی بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۱ ذوالحجہ ۱۳۶ھ کو فوت ہوگیا۔ اس کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ اس کی حکومت کا زیادہ وقت بنوامیہ اور ان کے وفاداروں کو ختم کرنے میں گزرا۔ ④

طبیعت کے لحاظ سے جہاں ابوالعباس دشمنوں کے لیے شمشیرِ بے نیام تھا وہاں دوستوں کے لیے نہایت کشادہ دل بھی تھا۔ اسے شعر و ادب کا بہت اچھا ملکہ تھا۔ شعراء کو ساتھ بٹھا کر کلام سنتا اور انہیں خوب نوازتا۔ بنوہاشم کی فاطمی شاخ کے بزرگوں کو اس نے حکومت سے تو محروم رکھا تاہم ان پر بہت کھلے دل سے خرچ کرتا رہا تاکہ وہ مطمئن رہیں اور کسی

---

① تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۳۰۰ تا ۳۰۲؛ انساب الاشراف: ۱۳۵/۴ تا ۱۵۲؛ تاریخ الطبری: ۳۵۰/۷ تا ۳۵۵؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲۸۰/۱۳، ۲۸۱؛ الکامل فی التاریخ: ۲۹/۵ تا ۳۳

② تاریخ الطبری: ۳۴۹/۷، ۳۵۰؛ انساب الاشراف: ۱۵۴/۴ تا ۱۵۷؛ الکامل فی التاریخ: ۲۸/۵

③ تاریخ الطبری: ۴۴۳/۷؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲۷۶/۱۳، ۲۷۷، ۲۷۸؛ الکامل فی التاریخ: ۳۳/۵، ۳۴، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۵

④ البدایۃ والنہایۃ: ۲۹۴/۱۳

باغیانہ سرگرمی کی طرف مائل نہ ہوں۔ سفاح نے تعمیراتی کام بھی کرائے۔ کوفہ سے لے کر مکہ تک ہر منزل پر سنگِ میل نصب کرائے۔ رات کو سفر کرنے والوں کی سہولت کے لیے اس شاہراہ پر روشنی کے مینار بھی تعمیر کرائے گئے۔ ①

بعض بدعات کا ازالہ

اس میں شک نہیں کہ بنو عباس کی حکومت کا آغاز بھی کسی مثالی طریقے سے نہیں ہوا تھا مگر انہوں نے آتے ہی بعض مٹی ہوئی سنتوں کے احیاء سے متعلق ایسے اقدامات کیے جو قابلِ تعریف تھے، مثلاً: سنت یہ ہے کہ جمعہ وعیدین کا خطبہ کھڑے ہو کر دیا جائے۔ مگر بنو مروان اس کے برخلاف بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ ابو العباس سفاح نے اس بدعت کا خاتمہ کیا اور کھڑے ہو کر خطبہ دینے کی سنت زندہ کی۔ اس پر مسلمان بے حد مسرور ہوئے۔ ②

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور خلفائے راشدین کے تعامل کے مطابق عید الفطر اور عید الاضحی کی نمازوں کا خطبہ، نماز کے بعد ہوتا ہے مگر بنو مروان کے خلفاء اور امراء عیدین کا خطبہ نماز سے پہلے دے دیا کرتے تھے تاکہ مجمع کو چارو ناچار ان کی لمبی لمبی تقریریں سننا پڑیں۔ ③ اس بدعت کا آغاز مروان بن الحکم نے کیا تھا اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ جیسے فقہاء کے سمجھانے کے باوجود اس نے یہ بدعت ترک نہیں کی تھی بلکہ انہیں یہ طنزیہ جواب دیا تھا: ''تمہارا علم متروک ہو چکا ہے۔'' ④ بنو عباس نے اقتدار سنبھال کر بنو مروان کی اس پرانی بدعت کا خاتمہ کیا اور دوبارہ نمازِ عید کے بعد خطبہ دینے کی سنت جاری کر دی۔ ⑤

❁❁❁

① التاریخ الاسلامی العام، ص ۳۳۶ تا ۳۳۸؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۱۳۳ ہجری

② مسند الشافعی، ص ۲۶؛ صحیح مسلم، ح: ۲۰۳۸؛ مرآة الزمان فی تواریخ الاعیان لسبط ابن الجوزی: ۱۵/۱۲، ط الرسالة العالمیة

③ المحلی بالآثار لابن حزم: ۲۹۳/۳

④ صحیح البخاری، ح: ۹۵۶؛ صحیح مسلم، ح: ۲۰۹۰

⑤ سیر اعلام النبلاء: ۵۶/۹

ابوجعفر المنصور

عبداللہ بن محمد

ذوالحجہ ۱۳۶ھ......تا...... ذوالحجہ ۱۵۸ھ

جون ۷۵۴ء......تا......اکتوبر ۷۷۵ء

سفّاح کے بعد اس کا بڑا بھائی ابوجعفر المنصور ۴۱ سال کی عمر میں خلیفہ بنا۔ حکومت سنبھالتے ہی اسے اپنے چچا عبداللہ بن علی کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جس کا عباسیوں کی کامیابیوں میں بڑا ہاتھ تھا۔ سفّاح نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے بعد خلافت اسے سونپ کر جائے گا۔ مگر مرتے وقت اس نے خلافت کی وصیت اپنے بھائی منصور کے لیے کردی۔ چنانچہ منصور کی تخت نشینی کی خبر سنتے ہی عبداللہ بن علی لشکر جمع کر کے الجزیرہ کے علاقے حران میں خیمہ زن ہو گیا تاہم جلد ہی ابومسلم خراسانی نے اسے شکست دے دی۔ عبداللہ بن علی نو برس بعد جیل خانے میں فوت ہوا۔ ①

ابومسلم خراسانی کا انجام:

ابومسلم خراسانی نے اپنی سیاست اور ہوشیاری سے بنوعباس کی سلطنت کو وجود بخشا تھا اور اس کے مخالفین کو چن چن کر ختم کیا تھا؛ اس لیے وہ پوری سلطنت پر اپنی اجارہ داری سمجھتا تھا اور خلیفہ کو اپنا محتاج تصور کرتا تھا۔ وہ خراسان میں مقیم تھا اور وہاں من مانیاں کر رہا تھا۔ اس بناء پر منصور اور ابومسلم میں کشیدگی پیدا ہوگئی جو برابر بڑھتی گئی۔ آخر منصور نے سفیر بھیج کر ابومسلم کو منانے اور اپنے پاس بلانے کی کوشش کی اور طرح طرح کا مکروفریب استعمال کر کے آخر اسے مطمئن کر لیا۔ جب ابومسلم دارالخلافہ پہنچ کر قصرِ خلافت میں داخل ہوا تو منصور نے اسے خوب ڈانٹا اور پھر اسے قتل کرادیا۔ یہ واقعہ ۲۶ شعبان ۱۳۷ھ کا ہے۔ ابومسلم کی عمر ۳۸ سال تھی۔ ②

اعتقادی فتنے اور شورشیں:

بنواُمیہ کے آخری اور بنوعباس کے ابتدائی دور کے ہنگامہ خیز ماحول میں اعتقادی فتنوں کو پنپنے کے بہت مواقع

① البدایۃ والنہایۃ: ۳۰۲/۱۳، ۳۰۳ تا ۳۵۹، ۳۵۹ دار ہجر؛ انساب الاشراف: ۱۱۱/۳ تا ۱۱۳

② الکامل فی التاریخ: ۲۹/۵؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳۰۶/۱۳؛ تاریخ الطبری: ۳۸۲/۷ تا ۳۸۴؛ انساب الاشراف: ۲۰۳/۳، ۲۰۴

ملے۔ اس کش مکش میں عربی وعجمی منافرت بھی بڑھی اور بعض متشدد مزاج عجمی ادباء وشعراء نے عربوں کے خلاف نفرت پھیلانے کو اپنا مقصد بنالیا۔ یہ سرگرمیاں ''شعوبی تحریک'' کے نام سے موسوم ہوئیں۔ منافرت کی اس لہر کے پیچھے عجمی تعصب کے علاوہ نصرانیت اور رفض کے افکار بھی کارفرما ہوئے اور بڑھتے بڑھتے عرب سے تنفر نے عجمی زِندیقیت یعنی بے دینی کی شکل اختیار کر لی۔ ایسے بعض زندیقوں نے باغیانہ تحریکیں بھی برپا کیں۔ چنانچہ ابومسلم کے قتل کے چند ہفتوں بعد اس کا ایک مجوسی عقیدت مند سُنباذ اٹھا اور اصفہان سے رے (تہران) تک قابض ہوگیا۔ وہ عربوں کا سخت دشمن تھا، انہیں پکڑتا اور لاٹھیوں سے پٹوا کر قتل کرڈالتا۔ منصور نے سُنباذ کے خلاف دس ہزار سپاہی بھیجے۔ ہمدان کے قریب زبردست لڑائی ہوئی جس میں ساٹھ ہزار زندیق قتل ہوئے۔ سُنباذ گرفتار ہوا اور بعد میں قتل کردیا گیا۔ ①

کچھ مدت بعد ایک اور عجیب وغریب تحریک اسی علاقے سے ظاہر ہوئی جسے ''راوندی تحریک'' کہا جاتا تھا؛ کیوں کہ اس کا مرکز اصفہان کا ایک نواحی قصبہ ''راوند'' تھا۔ یہ لوگ خود کو ابومسلم خراسانی کا مرید کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ابومسلم قتل نہیں ہوا بلکہ جب اس پر تلوار کا وار کیا گیا تو وہ اسمِ اعظم کا ورد کرکے بچ گیا اور ایک کبوتر کی شکل میں اڑ گیا۔ اب عن قریب وہ واپس آئے گا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ابومسلم کے یہ مرید خلیفہ منصور کے سخت مخالف ہوتے مگر اس کے برعکس یہ منصور کو بھی ''مظہرِ خدا'' کہہ کر اس کی عبادت کی دعوت دیتے تھے۔ منصور نے ۱۴۱ھ میں ان کے خلاف سخت کارروائی کی اور ان کے بہت سے لوگ گرفتار کرلیے مگر ان بدعقیدہ لوگوں کی طاقت اتنی بڑھ چکی تھی کہ انہوں نے کوفہ کی جیل توڑ کر اپنے قیدیوں کو رہا کرالیا۔ منصور اس وقت وہیں قصرِ شاہی میں تھا۔ یہ لوگ اس کی خدائی کے نعرے لگاتے ہوئے محل کا طواف کرنے لگے۔ منصور تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ ان کے مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا اور خطرے کی زد میں آگیا۔ اس دوران معن بن زائدہ نامی ایک مفرور امیر نے اچانک آکر منصور کی مدد کی۔ آخر ان بدعقیدہ لوگوں کو شکست ہوئی اور تقریباً سبھی مارے گئے۔ ②

۱۵۰ھ میں خراسان میں ایک شخص استاذ سیس نمودار ہوا، اس نے کفریہ عقائد کا پرچار کرکے شاہراہوں پر قبضہ کرلیا اور لوٹ مار شروع کردی۔ بہت جلد اس نے تین لاکھ مسلح افراد جمع کرلیے اور بہت بڑے رقبے پر تسلط جمالیا۔ آخر منصور نے اپنے بیٹے مہدی کو اس کے مقابلے پر بھیجا۔ مہدی نے کئی جان توڑ معرکوں کے بعد استاذ سیس کو عبرت ناک شکست دی۔ اس جنگ میں ستر ہزار بدعقیدہ لوگ قتل اور چودہ ہزار گرفتار ہوئے۔ اس طرح یہ فتنہ ٹھنڈا ہوگیا۔ ③

افریقہ میں خوارج کا ظہور:

۱۵۳ھ میں افریقہ میں اباضی خوارج نے اتنی بڑی بغاوت کی کہ افریقہ کے اُمراء بے بس ہوگئے۔ یہ دیکھ کر ۱۵۴ھ

---

① المنتظم لابن جوزی: ۱۸۵/۸ بسنۃ ۱۵۵ھ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳۲۶/۱۳، ۳۲۷ص ۳۲۶، ۳۲۷؛ انساب الاشراف: ۳ص ۲۳۶، ۲۳۷

② البدایہ والنہایۃ: ۳۲۶/۱۳، ۳۲۷؛ انساب الاشراف: ۳۳۵/۳، ۳۳۶؛ تاریخ الطبری: ۸۳/۸ سنۃ ۱۵۸ھ

③ البدایہ والنہایۃ: ۳۱۳/۱۳

میں منصور شام پہنچا اور یزید بن ابی حاتم کی قیادت میں خوارج سے مقابلے کے لیے افریقہ میں لشکر بھیجے۔ آخر کار ۱۵۵ھ میں خوارج کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور افریقہ میں امن قائم ہو گیا۔ ①

فاطمی حضرات کا خروج:

منصور کو اپنے دورِ حکومت میں ایک بہت ہی نازک اور سخت ترین امتحان سے گزرنا پڑا۔ یہ بعض فاطمی حضرات کا خروج تھا جس سے عراق وحجاز میں زبردست ہل چل مچ گئی اور ایسا لگا کہ بنو عباس کی حکومت چند دنوں کی مہمان ہے۔

فاطمی خاندان کے ان بزرگوں نے اپنے عقیدت مندوں سمیت انقلاب میں بنو عباس کے شانہ بشانہ کام کیا تھا مگر جب خلافِ توقع حکومت کے تمام تر عہدوں پر عباسی براجمان ہو گئے اور بنو ہاشم کے دیگر خانوادوں کو نہ صرف بالکل محروم رکھا گیا بلکہ مستقبل کی حکومت بھی ایک ہی گھرانے کے لیے خاص کر لی گئی تو فاطمی حضرات کو بڑی مایوسی ہوئی۔

سفّاح کی نوازشوں کی وجہ سے فاطمی بزرگ اس سے خوش رہے۔ مگر منصور ویسا سخی تھا نہ کشادہ دل۔ اس نے فاطمیوں کو عطیات اور مالی نوازشوں میں بھی یاد نہ رکھا بلکہ انہیں اپنے اقتدار کے لیے خطرہ تصور کیا۔ ②

ان وجوہ سے فاطمی حضرات کی منصور سے ناراضی بڑھتی رہی۔ انہوں نے خفیہ طور پر لوگوں کو اپنی بیعت کی دعوت دینا شروع کر دی۔ اس تحریک کی قیادت اولادِ فاطمہ کے عمر رسیدہ بزرگ حضرت عبداللہ بن حسن رحمہ اللہ کے دو بیٹے کر رہے تھے۔ بڑے محمد بن عبداللہ تھے اور چھوٹے ابراہیم بن عبداللہ۔ دونوں علم وفضل، ورع وتقویٰ اور امانت ودیانت کے اعتبار سے مشہور تھے۔ خاص کر محمد بن عبداللہ کا حلقۂ اثر بہت بڑا تھا۔ ان کی پاکیزہ طبعی کی بناء پر انہیں "نفسِ زکیہ" کہا جاتا تھا۔ ان کے پیروکاروں کا کہنا تھا کہ تحریک کے دوران موجودہ خلیفہ منصور سمیت سادات کے تمام سیاسی قائدین نے نفسِ زکیہ کی خلافت پر اتفاق کیا تھا؛ لہٰذا کسی اور کا مسندِ خلافت پر بیٹھنا غداری اور ناقابلِ معافی جرم ہے۔

چونکہ خلافتِ عباسیہ کے دور میں ہونے والی خونریزی اور خلفاء کی بدعہدیوں اور اخلاقی اقدار کی متعدد بار خلاف ورزی نے اُمت کے ایک بڑے طبقے کو حکومت سے بددل کر رکھا تھا؛ اس لیے فاطمی حضرات کی یہ تحریک بہت تیزی سے پھیلی، خاص کر حجاز اور عراق میں ہزاروں افراد نے بیعت کر کے ان کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔

منصور کو اس تحریک کا جونہی علم ہوا، اس نے تحریک کے قائدین: نفسِ زکیہ اور ابراہیم کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔ یہ دونوں حجاز کے دیہی علاقے میں روپوش ہو گئے۔ ③ کبھی یہ حجاز میں ہوتے کبھی یمن یا عراق میں، کبھی کسی اور صوبے میں۔ چونکہ ان کی قدر ومنزلت ہر جگہ تھی؛ اس لیے انہیں پناہ ملتی رہی اور کوئی ان کی مخبری پر تیار نہ ہوا۔ منصور اس قضیے کو نمٹانے کے لیے خود حجاز پہنچا اور اپنے جاسوس علاقے میں پھیلا دیے مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ آخر اس نے نفسِ زکیہ کے بھائی حسن بن عبداللہ اور ان کے والد عبداللہ بن حسن رحمہ اللہ کو گرفتار کر لیا۔ کچھ مدت بعد عبداللہ بن حسن رحمہ اللہ

---

① العبر فی خبر من غبر: ۱/۱۶۷، ۱۷۰، ۱۷۲ ② البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۳۸۱؛ العبر فی خبر من غبر: ۱/۱۹۴

③ تاریخ الطبری: ۷/۵۶۱ تا ۵۶۳؛ انساب الاشراف: ۳/۸۳، ط دار الفکر

۹۲ سال کی عمر میں بحالتِ قید و بند فوت ہو گئے۔ اسی طرح حسن بن عبداللہ نے بھی جیل خانے میں دم توڑ دیا۔ ①

باپ اور بھائی کی موت کی اطلاع ملنے پر نفسِ زکیہ مزید تحمل نہ کر سکے اور ۲۷ جمادی الآخرہ ۱۴۵ھ کو مدینہ میں منظرِ عام پر آ کر خروج کا اعلان کر دیا اور کسی کشت و خون کے بغیر مدینہ اور مکہ پر ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ ②

منصور کو یہ خبر ملی تو اس نے نفسِ زکیہ کو لکھا: ''اگر تم توبہ کر لو اور ہماری پکڑ میں آنے سے پہلے پہلے اپنے موقف سے رجوع کر لو تو میں تمہیں، تمہاری اولاد، تمہارے بھائیوں، تمہارے خاندان اور تمہارے پیروکاروں کو جان و مال اور عزت کی امان دیتا ہوں۔'' ③ نفسِ زکیہ نے اس کے جواب میں ایک طویل مکتوب بھیجا جس کے آخر میں تھا:

''اگر تم ہماری اطاعت کر لو تو ہم تمہارے لیے ویسی ہی امان کی ضمانت دیتے ہیں، جیسی تم نے دی۔ بلاشبہ ہم وعدہ پورا کرنے میں زیادہ قابلِ اعتماد ہیں۔ تم ہمیں کون سی امان دے رہے ہو؟ ویسی جیسے تم نے ابن ہبیرہ کو دی؟ یا ویسی جیسی تم نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کو دی؟ یا وہ امان جو تم نے ابومسلم کو دی تھی؟'' ④

نفسِ زکیہ کے اس مکتوب میں بنو فاطمہ کی فضیلت کا ذکر بھی تھا۔ منصور اسے برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنے جوابی خط میں اپنے خاندان کی فضیلتوں پر طویل کلام کیا اور آخر میں تحریر کیا:

''پھر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو عبدالمطلب کی اولاد میں سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی زندہ نہ تھا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت انہی کی طرف منتقل ہوئی اور خلافت ان کی اولاد میں آ گئی۔ دنیا و آخرت کا کوئی شرف اور اعزاز ایسا نہیں جس کے وارث حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہوئے ہوں۔ وہ نہ ہوتے تو ابوطالب اور عقیل بھوکے مر جاتے۔ انہوں نے تمہاری آبرو رکھی۔ تمہاری کفالت کرتے رہے۔ عقیل قید ہوئے تو فدیہ دے کر انہیں چھڑایا۔ ہم نے زمانہ جاہلیت میں بھی تمہارے خاندان کی کفالت کی، تمہاری ناموس کی حفاظت کرتے رہے۔ ہم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کے وارث بھی بنے۔ تمہارا بدلہ بھی ہم نے لیا اور جس چیز کو تم حاصل نہ کر سکے اسے ہم نے حاصل کر کے دکھایا۔'' ⑤

الغرض فریقین نے طویل خط و کتابت کے ذریعے اپنے اپنے خاندانوں کی فضیلت ثابت کرنے کی پوری کوشش کی اور ہر ایک اس بات کا مدعی رہا کہ خاندانی شرف کی بناء پر خلافت کا اصل حق دار وہی ہے۔ اس خط و کتابت کے بعد منصور نے عیسیٰ بن موسیٰ کو نفسِ زکیہ کے خلاف کارروائی کے لیے چار ہزار سپاہی دے کر حجاز بھیج دیا۔ جنگ سے پہلے عیسیٰ بن موسیٰ نے نفسِ زکیہ کو امان کی پیش کش کی مگر انہوں نے قبول نہ کی۔ چنانچہ پندرہ رمضان کو فریقین میں جنگ شروع ہوئی۔ نفسِ زکیہ خود لڑائی میں شریک تھے اور انہیں یقین تھا کہ بہت سے عباسی افسران ان سے آملیں گے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ انجامِ کار نفسِ زکیہ نے دلیری سے لڑتے ہوئے جان کی بازی ہار دی۔ ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال

① انساب الاشراف: ۸۸/۳، ۸۹، ۹۱، ط دار الفکر ② انساب الاشراف: ۸۹/۳ تا ۹۳، ط دار الفکر
③ انساب الاشراف: ۹۵/۳؛ تاریخ الطبری، سنۃ: ۱۴۵ھ ④ انساب الاشراف: ۹۶/۳ تا ۹۸؛ تاریخ الطبری: سنۃ ۱۴۵ھ
⑤ انساب الاشراف: ۹۸/۳ تا ۱۰۲؛ تاریخ الطبری: سنۃ ۱۴۵ھ

تھی۔ان کا سر کاٹ کر منصور کے پاس بھیج دیا گیا۔ ①

نفسِ زکیہ کے چھوٹے بھائی ابراہیم بن عبداللہ اس وقت بصرہ میں روپوش تھے اور خفیہ طور پر تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔نفسِ زکیہ کے خروج کی اطلاع سن کر ابراہیم نے بصرہ پر قبضہ کر کے عباسی عملے کو باہر کر دیا۔جب نفسِ زکیہ کے قتل کی اطلاع آئی تو ان کے حامیوں میں مزید اشتعال پھیلا۔ان لوگوں نے کسکر،اَہواز اور واسط پر بھی قبضہ کر لیا۔ ②

منصور کی اکثر افواج دور دراز کے محاذوں پر مصروف تھیں۔مجبوراً اس نے فیصلہ کن جنگ کو حجاز جانے والی فوج کی واپسی تک ملتوی رکھا۔جب عیسیٰ بن موسیٰ حجاز کی مہم میں کامیاب ہو کر واپس آیا تو منصور نے اسی کو ابراہیم کی سرکوبی کی ذمہ داری سونپی۔عباسی فوجوں کی تیاری کی خبر ملتے ہی ابراہیم نے گیارہ ہزار رضا کاروں کے ساتھ بصرہ سے کوچ کر دیا۔کوفہ سے سولہ میل دور ''باخمریٰ'' کے مقام پر ابراہیم اور عیسیٰ کی افواج میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔اس جنگ میں ابراہیم کو ایک تیر آ کر لگا جس کا زخم ایسا کاری تھا کہ انہوں نے وہیں جان دے دی۔عباسی سپاہیوں نے سر اتار کر منصور کے پاس بھیج دیا۔یہ واقعہ ۲۵ ذوالقعدہ ۱۴۵ھ کا ہے۔ ③

بغاوت کے مرکزی قائدین کا خاتمہ کر کے ان کے دیگر حامیوں پر بھی جلد قابو پا لیا گیا۔سندھ تک ایسے افراد کا تعاقب کیا گیا۔جو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ تھے،انہیں گرفتار کر کے سزائے موت دی گئی۔البتہ جنہوں نے شورش کو خیر باد کہہ کر امان مانگی ان سے اچھا سلوک کیا گیا۔ ④

نفسِ زکیہ اور ابراہیم کے خروج کے مابعد اثرات:

نفسِ زکیہ اور ابراہیم کے خروج کا اختتام ویسا ہی ہوا جیسا زید بن علی رحمہ اللہ کی تحریک کا ہوا تھا۔بالفاظِ دیگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کا انجام شہدائے کربلا سے ذرا بھی مختلف نہ تھا۔ان میں سے بعض برسرِ میدان قتل ہوئے اور بعض جیل خانے کی دیواروں کے پیچھے دم توڑ گئے۔چاہے منصور ایک حکمران کی حیثیت سے اس تحریک کو کچلنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہو مگر اس اقدام کے باعث عباسی خاندان نے امویوں سے کہیں بڑھ کر بدنامی مول لی۔امویوں کو کوئی یہ طعنہ نہیں دے سکتا تھا کہ وہ سادات کی محبت کا نعرہ لگا کر حکومت میں آئے اور انہی کے خلاف تلوار سونتی۔مگر عباسی اس الزام سے محفوظ نہیں رہ سکے کہ جس گھرانے کی سیادت کا نعرہ لگا کر انہوں نے حکومت کی راہ ہموار کی،اقتدار حاصل کر کے،انہی کا خون بہانے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔پس عباسی خلافت کے ابھی پندرہ سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اس کے دامن پر بالکل ویسا ہی داغ لگ گیا جیسا اُموی خلافت کی قبا پر واقعۂ کربلا سے لگا تھا۔

یہ وہ نقطہ تھا جہاں اُمت کے ایک طبقے کا خلافتِ عباسیہ پر اعتماد ختم ہو گیا،خاص کر نفسِ زکیہ،ابراہیم اور ان کے

---

① نسب قریش للزبیری،ص ۵۵؛انساب الاشراف:۳/۱۰۳ تا ۱۰۵؛تاریخ الطبری:۷/۵۸۰ تا ۵۸۶

② انساب الاشراف:۳/۱۲۲ تا ۱۳۲؛تاریخ خلیفۃ بن خیاط،ص ۳۲۲

③ تاریخ الطبری:۷/۶۳۹ تا ۶۴۸؛انساب الاشراف:۳/۱۳۳؛الکامل فی التاریخ:سنۃ ۱۴۵ھ؛البدایۃ والنہایۃ:۱۳/۳۳۶

④ تاریخ الطبری:۷/۶۳۸،۶۳۹؛انساب الاشراف:۳/۱۳۱؛تاریخ بغداد:۱۳/۲۷،ط العلمیۃ

مکتبِ فکر کے لوگ عباسیوں سے بالکل مایوس ہو گئے۔ دن بدن ان کی مرکز گریز سوچ پختہ ہوتی گئی۔ ذہنی فاصلوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ سوچ نسل در نسل پرورش پاتی اور پھیلتی رہی۔ اس نفرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندرونِ خانہ سادات کے لیے الگ اقتدار کی سوچ مزید پروان چڑھتی رہی جس کے باعث لگ بھگ ایک صدی تک عباسی خلفاء کے خلاف بغاوت کی تحریکیں مسلسل ابھرتی رہیں۔ مرکزِ خلافت کے قریبی صوبوں میں ایسی کوششوں کو بے سود دیکھ کر کچھ سیاست دان دور دراز علاقوں میں ایسی تحریکوں کے بیج بونے لگے۔ جب تک عباسیوں کا عروج رہا، یہ تحریکیں دبی رہیں مگر جوں ہی ان کا زور ٹوٹا، بعض علویوں نے اپنے حامیوں کی مدد سے یمن میں دولتِ زیدیہ اور مراکش میں دولتِ ادارسہ قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اسی طرح کچھ طالع آزما سادات کا نام استعمال کر کے خالص رافضی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جیسا کہ بحرین میں قَرامِطہ، افریقہ میں بنو عبید اور ایران میں بنو بُوَیہ۔ یہ مرکز گریز تحریکیں عالمگیر خلافت کے ایک محدود دائرے میں سمٹ جانے کا اہم ترین سبب بنیں۔

جمہور سادات اور روافض کے عقائد کا فرق:

تیسری صدی ہجری میں ابھرنے والی خروج کی تحریکوں کے کچھ قائدین نے ہاشمی النسب نہ ہوتے ہوئے بھی صرف سیاسی مقاصد کے لیے اولادِ علی یا اولادِ فاطمہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ ان میں سے بعض متعصب رافضی تھے، ان کے عقائد جمہور سادات اور جمہور اُمت سے ہٹ کر تھے۔ بعض سادات کا خروج عموماً حکومتی مظالم کے ردِ عمل، کبھی کسی فقہی واجتہادی غلطی، کبھی حالات کو سمجھنے میں غلط فہمی اور بسا اوقات خالص سیاسی مقاصد کے تحت ہوا ہے۔ اس میں کسی نئے عقیدے و مذہب کو اپنانے کا دخل یا اسے رائج کرنے کا جذبہ کارفرما نہ تھا۔ ان سادات میں سے کوئی بھی خود کو امام معصوم نہیں کہلواتا تھا۔ یہ لفظ روافض نے اپنی تحریکوں کے دوران مشہور کیا تھا جس کے پیچھے امام کے مفترض الطاعۃ (جس کی پیروی فرض ہو) ہونے کا عقیدہ کارفرما تھا۔ حالانکہ ساداتِ کرام خود اس عقیدے کی تردید کرتے تھے۔ حضرت محمد باقر رحمہ اللہ کے سگے بھائی عمر بن علی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: "هَلْ فِيكُمْ أَهْلِ الْبَيْتِ إِنْسَانٌ مُفْتَرَضَةٌ طَاعَتُه؟"

(کیا آپ اہلِ بیت حضرات میں کوئی انسان ایسا ہے جس کی اطاعت فرض ہو؟)

انہوں نے جواب دیا: "لَا، وَاللهِ مَا هذَا فِينَا، مَنْ قَالَ هذَا فَهُوَ كَذَّابٌ۔"

(نہیں۔ اللہ کی قسم! ایسا کوئی نہیں۔ جو ایسا کہے وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔) ①

بیرونی ممالک اور منصور:

اُندلُس بنو امیہ کی خلافت کا ایک اہم حصہ رہا تھا جسے ولید بن عبدالملک کے دور میں موسیٰ بن نُصَیر اور طارق بن زیاد نے فتح کیا تھا۔ جب ۱۳۲ھ میں پہلا عباسی خلیفہ ابو العباس سَفّاح اموی خلافت کا خاتمہ کر کے برسرِ اقتدار آیا اور بنو امیہ

① نسب قریش للزبیری، ص ۶۲

کے لیے زمین تنگ ہوگئی تو اس افراتفری میں بنوامیہ کا ایک شہزادہ عبدالرحمن بن معاویہ جو اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا پوتا تھا، جان بچا کر افریقہ پہنچ گیا اور کئی سال روپوش رہا۔ اس وقت تک اَندلس میں بنوعباس کا قبضہ مستحکم نہیں ہوا تھا بلکہ وہاں بنوامیہ کے حامیوں کی خاصی تعداد موجود تھی؛ اس لیے عبدالرحمن بن معاویہ نے اَندلس کے بعض امراء سے خفیہ خط و کتابت کر کے انہیں اپنا حامی بنایا اور اس کے بعد ۱۳۸ھ (۷۵۵ء) میں عبدالرحمن بن معاویہ نے اَندلس پہنچ کر وہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ مقامی حاکم یوسف بن عبدالرحمن الفہری نے جو قُرطُبہ، طُلَیطلہ اور اِشبیلیہ کا حاکم تھا، اس کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ یوں عبدالرحمن بن معاویہ نے پورے اَندلس پر قبضہ کرلیا۔ منصور دیگر مہمات کے باعث اس وقت کچھ نہ کرسکا مگر موقع پاتے ہی اس نے ۱۴۶ھ (۷۶۳ء) میں افریقہ کے حاکم علاء بن مغیث کو عبدالرحمن کے مقابلے پر بھیج دیا تاہم عبدالرحمن نے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ عباسیوں کے لشکرِ جرار کو شکستِ فاش دی اور علاء بن مغیث سمیت کئی عباسی افسران کے کٹے ہوئے سر عباسی خلیفہ منصور کے پاس بھیج دیے جنہیں دیکھ کر منصور کے منہ سے بے ساختہ نکلا: ''اللہ کا شکر ہے کہ میرے اور عبدالرحمن کے درمیان سمندر حائل ہے۔''

اس کے بعد منصور کو خود تو اَندلس پر حملے کی جرأت نہیں ہوئی مگر وہ فرانس کے حکمران کو عبدالرحمن کے خلاف ابھارنے لگا۔ فرانس کا حکمران شارلیمین منصور کی طرف سے شہ ملنے پر جری ہوگیا اور لاکھوں سپاہی لے کر اَندلس پر چڑھ دوڑا۔ تاہم عبدالرحمن بن معاویہ نے اسے بھی مار بھگایا۔ اس کے بعد منصور نے اَندلس کا خیال چھوڑ دیا۔ ①

عالم اسلام کی سب سے بڑی حریف روم کی بازنطینی سلطنت تھی۔ منصور کی خلافت کے پہلے ہی سال ۱۳۷ھ میں قیصر قُسطَنطِین چہارم نے شام کے ساحل اور ایشیائے کوچک پر فوج کشی کی۔ اس مہم میں رومی ایشیائے کوچک کے علاقے مَلَطْیہ پر قابض بھی ہوگئے۔ منصور نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے صالح بن علی کو سرحدوں پر بھیجا۔ ادھر قُسطَنطِین چہارم نے ایک لاکھ فوج لے کر پیش قدمی کی۔ ۱۳۸ھ میں ایشیائے کوچک کے سرحدی علاقے ''دابِق'' کی وادی میں ایک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ قُسطَنطِین و شکستِ فاش ہوئی اور وہ پسپا ہو کر قُسطَنطِینیّہ لاگیا۔ مسلمانوں نے اپنا علاقہ واپس لے لیا تاہم رومی جاتے جاتے مَلَطْیہ کو تباہ کر گئے تھے۔

اس کے بعد منصور نے ہر سال موسم گرما میں یہاں تازہ دم افواج بھیجنے کا سلسلہ شروع کردیا۔ ہر سال بڑے بڑے جرنیلوں کی کمان میں رومیوں کے قلعوں پر حملے کیے جاتے۔ رومیوں کو اس کے بعد برسوں تک کسی حملے کی جرأت نہ ہوئی۔ بلکہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھ کر انہیں خطرہ لاحق رہا کہ کسی بھی وقت قُسطَنطِینیّہ پر حملہ ہوسکتا ہے۔

منصور کی وفات تک رومیوں کے خلاف جہاد جاری رہا۔ ۱۵۸ھ میں جب اس کا انتقال ہوا تو مَعیوف بن یحییٰ کی قیادت میں رومی سرحدوں پر چھاپہ مار کارروائیاں جاری تھیں۔ ②

① نفح الطیب: ۱/۳۲۷ تا ۳۳۲، العقد الفرید: ۵/۲۲۹، ۲۳۰

② تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۲۶ تا ۴۲۹

بغداد کی تعمیر:

منصور عباسی سے پہلے عباسی خلیفہ کا قیام کوفہ سے متصل نئی آبادی ''ہاشمیہ'' میں ہوتا تھا۔ وہاں فرقہ راوندیہ سے نبرد آزمائی کے بعد منصور نے اسے غیر محفوظ تصور کیا اور ایک نیا دار الخلافہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اسے مدائن کے جنوب میں دریائے دجلہ کے کنارے واقع ''بغداد'' نامی بستی موزوں لگی جو کسریٰ نے اپنے کسی خادم کو بطورِ جاگیر بخشی تھی اور اسی لیے اس کا نام ''باغ داذ'' (باغ عطا کیا) پڑ گیا تھا۔ اس کی آب و ہوا خوش گوار تھی اور ارد گرد نہروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ نیز فرات کی کئی نہریں یہاں تک آتی تھیں جن سے ایک وسیع علاقہ سیراب ہوتا تھا آخر کار ۱۴۵ھ میں یہاں تعمیری کام کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں مملکت کے نامی گرامی امراء اور علماء و فضلاء کو مدعو کیا گیا۔ شہر کی فصیل کی چوڑائی نیچے سے ۷۵ فٹ اور اوپر سے ۳۰ فٹ رکھی گئی۔ منصور تعمیری کام کے دوران ہی صفر ۱۴۶ھ میں ہاشمیہ سے بغداد منتقل ہو گیا۔ شہر کا نقشہ دائرہ نما تھا۔ فصیل کے چار دروازے تھے اور ہر دروازے سے دوسرے دروازے تک ایک میل کا فاصلہ تھا۔ قصرِ خلافت شہر کے بالکل وسط میں تھا۔ قصرِ خلافت کے گرد شہزادوں کے محلات، جامع مسجد، امراء و وزراء کی حویلیاں اور خدمت گار عملے کی رہائش گاہیں تھیں جن میں محافظ سپاہی، غلام اور خواجہ سرا سب کے الگ الگ محلّے تھے۔ خلیفہ کا محل جو سرکاری امور کا مرکزی دفتر بھی تھا، ''قصر الذہب'' کے نام سے مشہور ہوا۔

مشرق میں الگ سے ''معسکر'' (کینٹ ایریا) تعمیر کرایا جو ''رُصافہ'' کے نام سے موسوم ہوا۔ یہاں افسران اور سپاہیوں کے مکانات کے علاوہ گھڑ سواری اور فنون حرب کی مشق کے میدان تھے۔ اس کی جامع مسجد، فصیل اور خندق الگ تھی۔ تعمیری کام کی تکمیل ۱۴۹ھ میں ہوئی اور اس پر سرکاری خزانے سے دو کروڑ درہم (تقریباً پانچ کروڑ ۴۴ لاکھ ڈالر) خرچ ہوئے۔ شہر کا نام ''مدینۃ السلام'' (سلامتی کا شہر) رکھا گیا۔ مگر عام لوگ اسے خلافتِ اسلامیہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے ''مدینۃ الاسلام'' کہا کرتے تھے۔ جبکہ مؤرخین اسے ''جنۃ الارض'' اور ''قبۃ الاسلام'' کہہ کر یاد کرتے تھے۔

اگلے سالوں میں یہاں بے شمار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ سب سے بلند عمارت ''قبۃ الخضراء'' تھی جس کا سبز گنبد ۸۰ گز اونچا تھا اور میلوں دور سے دکھائی دیتا تھا۔ اسے ''شہر کا تاج'' اور ''بغداد کا پرچم'' بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں غیر ملکی سفیروں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ جب شہر بہت گنجان آباد ہو گیا تو خلفاء اور امراء نے اپنی رہائش گاہیں دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر بنالیں۔ یہاں نئے خلافتی محل کو ''قصر الخلد'' کہا جاتا تھا۔ شہر کی منڈیوں میں روزانہ درجنوں قافلے آتے اور سامانِ تجارت دوسرے شہروں کے لیے روانہ ہوتا۔ اس بھیڑ بھاڑ سے گزرگاہیں بند ہو جاتیں اور عام لوگوں کو بڑی دِقت ہوتی؛ اس لیے ۱۵۷ھ میں منصور نے تجارتی مراکز کے لیے شہر کے جنوب میں الگ علاقہ مخصوص کر دیا۔ تمام بازار وہاں منتقل کر دیے گئے۔ یہ علاقہ ''کرخ'' کے نام سے مشہور ہوا۔ ①

① تاریخ بغداد للخطیب بغدادی: ۱/۸۷ تا ۱۱۵؛ تاریخ الطبری: ۷/۶۱۴ تا ۶۱۸؛ کتاب البلدان للیعقوبی، ص ۵، ۱۳ تا ۵۵؛ معجم البلدان: مادہ بغداد

منصور عباسی کے دور میں تدوینِ فقہ:

منصور کے دور میں ایک طرف کوفہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ (۸۰ھ۔۱۵۰ھ) اور دوسری طرف مدینہ منورہ میں امام مالک بن انس رحمہ اللہ (۹۳ھ۔۱۷۹ھ) نے اسلامی فقہ کو مدوّن کر کے اُمت کی عظیم الشان خدمت انجام دی۔

اس زمانے میں فقہاء کے انفرادی فیصلوں سے متضاد فتاویٰ کا ایک ذخیرہ تو یقیناً جمع ہو رہا تھا مگر انفرادی و اجتماعی مسائل کا کوئی مرتب دستور موجود نہ تھا جس سے سب کی تشفی ہو جاتی۔ اس دور کا سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ قانون کو مدوّن کر کے اس انتشار کو دور کیا جاتا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو اس ضرورت کا پوری طرح احساس تھا اور ان کے معاصر دیگر علماء و فضلاء بھی اسے محسوس کر رہے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم لکھتے ہیں:

"ان کے ہم عصر ابن المقفع نے اپنے نظم و نسقی تجربے کے باعث ایک درد بھرے رسالے (الصحابۃ) میں حکومت کو توجہ دلائی ہے کہ قضاۃ ساختہ قانونِ نظائر، نیز فتاویٰ میں تضاد اور اختلافِ رائے کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ صحیح اسلامی حکم کا کسی مسئلے میں بھی پتا چلنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اور ضرورت ہے کہ مختلف اقوال کو کھنگال کر کسی کو ترجیح دی جائے اور خلیفہ کے حکم سے واجب التعمیل قرار دیا جایا کرے۔"①

مگر ظاہر ہے کہ اگر منصور ایسی کوئی تحقیقی مجلس قائم کر بھی دیتا تو اس کے فیصلوں کو دلی رغبت سے صرف وہی لوگ قبول کرتے جنہیں حکمران سے مذہبی عقیدت ہوتی حالانکہ ایسے لوگ بنو عباس میں تلاش کرنا بھی مشکل تھے۔

ایسے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے طور پر اس کمی کو پورا کرنے کی جدوجہد شروع کی اور تمام علوم و فنون کے ماہر علماء کے اشتراک سے ایک ایسا تحقیقی ادارہ قائم کیا جو پیش آمدہ شرعی مسائل کو ہر پہلو سے پوری سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ دیکھ کر اپنا فیصلہ دیتا تھا۔ اس مجلسِ علماء کے شرکاء میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے چالیس تلامذہ شامل تھے جو نہ صرف امام صاحب سے فقہ، افتاء اور استخراجِ مسائل کی تربیت لے چکے تھے بلکہ ان میں سے ہر ایک کسی علم و فن میں خاص ملکہ رکھتا تھا۔ یوں اس مجلس میں تفسیر و حدیث، تاریخ و سیرت، بلاغت و بیان، لغت و ادب، صرف و نحو، قیاس اور ریاضی سمیت ہر فن کے ماہرین شامل تھے۔② مجلسِ بحث کی کارروائی کے دوران امام صاحب رحمہ اللہ جو کلام کیا کرتے تھے، وہ ساتھ ساتھ لکھ لیا جاتا تھا اور امام صاحب رحمہ اللہ بعد میں تصحیح کے لیے اسے اہتمام کے ساتھ سنا کرتے تھے۔ ان ابحاث کو الگ الگ عنوانات کے تحت مرتب کرنے کا کام بھی امام صاحب رحمہ اللہ نے بڑی حد تک کرا دیا تھا۔③

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے "بین الاقوامی تعلقات" کو بھی ایک مستقل علم قرار دیا اور "کتاب السیر" کے مسائل پوری وضاحت سے قلم بند کرائے جن میں جنگ اور امن اور ممالک کے دوطرفہ تعلقات کے بارے میں احکام تھے۔

① امام ابوحنیفہ کی تدوینِ قانونِ اسلامی از ڈاکٹر حمید اللہ، ص ۴۳، ۴۴

② الجواهر المضیۃ: ۲/۲۱۲؛ مناقب ابی حنیفۃ مکی: ۲/۱۲۳

③ مناقب ابی حنیفۃ کردری: ۲/۱۰۹؛ مناقب ابی حنیفۃ موفق مکی: ۲/۱۳۶

تدوین فقہ کا یہ کام ۱۲۰ھ میں شروع ہوا، اور درمیان میں کوفہ سے غیر حاضری کے کچھ عرصے کو چھوڑ کر ۱۴۴ھ تک ۲۲ برس جاری رہا۔ اپنے تلامذہ اور ہم عصر علماء کی جماعت کے ساتھ امام صاحب ہر مسئلے کے لئے پہلے کتاب اللہ، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اس کے بعد آثار صحابہ اور آخر میں قیاس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ حدیث کی حیثیت (مثلاً: صحیح، حسن، ضعیف، متواتر، مشہور، خبر واحد وغیرہ) جانچنے کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ اس بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال سے پہلے آخری عمل کیا تھا۔ ۱۴۴ھ تک تیار شدہ فقہی دفعات کی تعداد ۸۳ ہزار تھی جن میں ۳۸ ہزار مسائل عبادات اور ۴۵ ہزار مسائل معاملات اور عقوبات سے متعلق تھے۔ ①

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایات کا مشہور ترین مجموعہ "کتاب الآثار" ہے جس کی اسناد صحت میں مؤطا مالک اور صحیح بخاری سے کم نہیں۔ اس میں عالم اسلام کے ہر علمی مرکز کے صحابہ اور تابعین سے روایات لی گئی ہیں۔ مؤطا مالک میں یہ خوبی نہیں ہے۔ یہ مجموعہ امام صاحب کی زندگی ہی میں اسلامی ممالک میں مشہور ہو گیا۔ اہل علم اور قاضیوں نے اس کی نقول محفوظ کیں اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کو جس انداز پر ترتیب دیا، آج تک فقہی کتب تقریباً اسی کے مطابق تالیف ہوتی آ رہی ہیں، یعنی پہلے عبادات یعنی طہارت، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج کے مسائل بیان کئے جاتے ہیں، اس کے بعد معاملات (نکاح وطلاق، بیع وشراء وغیرہ) کا ذکر ہوتا ہے پھر عقوبات (حدود، قصاص وغیرہ) کا تذکرہ اور آخر میں وصایا اور میراث کے مسائل آتے ہیں۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں:

> "امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم شرع کو مدوّن کیا اور اسے ابواب کی شکل میں پیش کیا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں انہی کی پیروی کی۔ اس شرف میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر کسی نے پہل نہ کی۔ صحابہ اور تابعین نے علم شریعت کو کتب اور ابواب میں مرتب نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے حافظے پر اعتماد کرتے تھے۔" ②

امام صاحب کی کاوشوں کے نتیجے میں شرعی احکام کا ایک مجموعہ محفوظ ہو گیا جس سے کام لے کر امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے "کتاب الخراج" اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں "الجامع الصغیر"، "الجامع الکبیر"، "السیر الصغیر"، "السیر الکبیر"، "المبسوط" اور "الحجۃ علی اہل المدینۃ" جیسی عظیم الشان تصانیف سامنے آئیں۔ جب یہ علمی ذخیرہ منظرِ عام پر آیا تو قاضی ومفتی، امراء اور خلفاء بھی اس سے مستفید ہونے لگے کیوں کہ ایک مدت سے اُمت کو ایسے کام کی ضرورت تھی۔

اسی دور میں حجاز کے سب سے بڑے فقیہ اور محدث امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے احادیثِ صحیحہ، آثارِ صحابہ اور تعاملِ اہلِ مدینہ کی روایات کو جمع کر کے فقہ اسلامی کی ایک مرتب کتاب "مؤطا" تالیف کی جو صحت ومعیار میں "کتاب الآثار" اور "صحیح بخاری ومسلم" سے کم نہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اُمت کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ مجموعہ اس انداز میں مرتب کیا کہ مدنی صحابہ کی بیشتر صحیح فقہی روایات ایک ترتیب کے ساتھ محفوظ ہو گئیں۔

① مناقب ابی حنیفۃ، کردری: ۲/۱۳۶؛ امام ابوحنیفہ کی قانون تدوین اسلامی از ڈاکٹر حمید اللہ، ص ۴۹

② تبییض الصحیفۃ بمناقب ابی حنیفۃ للامام جلال الدین السیوطی، ص ۱۱۹

جب مؤطا کی تکمیل ہو چکی اور اس عظیم علمی کارنامے کی شہرت حکومتی ایوانوں تک پہنچی تو خلیفہ منصور نے حج کے موقع پر امام مالک رحمہ اللہ سے ملاقات کر کے اس دینی خدمت کو بہت سراہا اور ساتھ ہی اسے پورے عالم اسلام میں نافذ کرنے کی پیش کش کی مگر امام مالک نے فرمایا: ''ہر علاقے کے لوگوں کو انہی کے (فقہی) علم پر رہنے دیں۔''①

یہ امام مالک رحمہ اللہ کی دور اندیشی، بے غرضی اور وسعتِ ظرفی تھی کہ حکومت کو اس اقدام سے منع کر دیا تاکہ اُمت کے لیے وسعت پیدا ہو اور اختلافِ علماء کا رحمت ہونا ثابت رہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر سرکاری عتاب اور ان کی وفات:

منصور کے دور میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ امام صاحب نے ابراہیم کے خروج کے موقع پر حکومتی طرزِ عمل کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں گرفتار کر کے منصور کے سامنے پیش کیا گیا۔② منصور نے انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا جسے امام صاحب رحمہ اللہ نے مسترد کر دیا۔ اس پر منصور نے انہیں جبراً بغداد کے تعمیری کام کی نگرانی پر لگا دیا۔③ عہدۂ قضا پیش کرنے کی وجہ یہ تھی کہ منصور کو خطرہ تھا کہ امام صاحب کی تنقید کہیں عوام میں شورش کا ذریعہ نہ بن جائے حالانکہ امام صاحب کا یہ مقصد نہ تھا۔ غالباً منصور کو حاسدین نے یقین دلا دیا تھا کہ امام صاحب باغیوں کے سرپرست ہیں۔ ایسے میں منصور کے نزدیک بہترین راستہ یہ تھا کہ امام صاحب عہدۂ قضا سنبھال لیں تاکہ اگر ان کی طرف باغیوں کی سرپرستی غلط طور پر منسوب کی گئی ہے تو اس کا ازالہ ہو جائے اور ان کی شخصیت کی سرکاری صف میں شمولیت سے حکومت کے پائے مضبوط ہوں۔ مگر سرکاری عہدہ قبول کرنا چونکہ امام صاحب کے اصولِ حیات کے خلاف تھا؛ اس لیے آپ نے انکار کر دیا۔ غالباً یہ انکار منصور کو یہ یقین دلانے کا سبب بنا ہوگا کہ ان کے متعلق بغاوت کی سرپرستی کی اطلاعات درست ہیں۔ چنانچہ اس نے انہیں حراست میں رکھا۔ اس دوران بغداد زیرِ تعمیر تھا۔ منصور نے امام صاحب کو وہاں تعمیری کام کی نگرانی اور خرچے کے حساب کتاب کا کام سونپا۔④

۱۴۹ھ میں بغداد کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس دوران امام صاحب رحمہ اللہ گھر آنے جانے کے لیے آزاد نہیں تھے بلکہ ان کا قیام جیل میں تھا۔ ۱۵۰ھ میں وہیں ان کی وفات ہوگئی۔ بعض روایات کے مطابق انہیں زہر دیا گیا تھا۔⑤

منصور کی قید میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی وفات ایک ایسا سانحہ تھا جس کا دھبہ منصور کے دامن سے کبھی مٹ نہ سکا۔

منصور کی وفات:

منصور کئی سال سے بدہضمی کے عارضے میں مبتلا تھا۔ ۱۵۸ھ میں حج کے لیے جاتے ہوئے راستے میں بیماری بہت بڑھ گئی۔ مکہ پہنچ کر حج سے تین دن پہلے چھ ذوالحجہ ۱۵۸ھ کو اس کا انتقال ہوگیا۔ گورستانِ مکہ ''جَنَّةُ الْمُعَلّٰی'' میں تدفین ہوئی۔ اس کی عمر ۶۴ سال تھی۔ وفات سے کچھ مدت پہلے وہ اپنے بیٹے مہدی کو جانشین نامزد کر چکا تھا۔

---

① الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم، ۱/ ۲۹ ② اخبار ابی حنیفة: ۱/ ۹۲، ۹۳ ③ تاریخ الطبری: ۷/ ۶۱۹

④ تاریخ الطبری: ۷/ ۶۱۹، سنة ۱۳۵ھ ⑤ اخبار ابی حنیفة: ۱/ ۹۲، ۹۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۶/ ۴۰۲

اس کے آخری الفاظ یہ تھے: ''الٰہی! اگرچہ میں نے بہت سی چیزوں میں تیری نافرمانی کی مگر تیری سب سے پسندیدہ چیز میں اطاعت کی، یعنی لا الٰہ الا اللہ کی سچے دل سے گواہی دی۔'' اس کی انگوٹھی پر نقش تھا: ''اَللّٰہُ ثِقَۃُ عَبْدُاللّٰہِ وَبِہٖ یُؤْمِنُ۔'' (عبداللہ کو اللہ ہی پر بھروسہ ہے اور اسی پر ایمان ہے۔)①

منصور کی سیرت پر ایک نظر:

منصور کی زندگی ایک حکمران کے طور پر سخت جدوجہد میں گزری۔ وہ آرام اور عیش پسندی سے کوسوں دور تھا۔ قصرِ خلافت میں اس کی رہائش ایک معمولی چہار دیواری میں تھی جس میں ایک کمرہ، ایک صحن اور ایک سائبان تھا۔ کمرے میں ایک بستر اور ایک لحاف اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ روزانہ رات کے آخری پہر بیدار ہو کر فجر کی اذان تک نوافل اور ذکر و تلاوت میں مشغول رہتا۔ نمازِ فجر سب کے ساتھ باجماعت ادا کرتا۔ اس کے فوراً بعد اس کا دربار لگ جاتا۔ ظہر تک دربار میں وفود سے ملاقاتوں، احکام کے اجراء اور دیگر سرکاری امور میں مصروف رہتا۔ نمازِ ظہر ادا کر کے گھر چلا جاتا اور کھانے سے فارغ ہو کر عصر تک آرام کرتا۔ نمازِ عصر کے بعد سے عشاء تک کا وقت خاندان کے لوگوں سے ملنے، ان کی ضروریات پوری کرنے، گھر والوں کی خیر خبر لینے اور غیر معمولی نوعیت کے کام انجام دینے میں گزرتا۔ عشاء کی نماز ادا کر کے وہ پورے ملک سے آنے والی ڈاک کا مطالعہ کرتا اور جواب لکھواتا۔ اس کے بعد کچھ دیر کسی کے ساتھ گپ شپ لگاتا اور آدھی رات سے پہلے سونے کے لیے لیٹ جاتا۔②

اس قدر گوناں گوں مصروفیات اور مہمات کے ساتھ اس نے اپنے دورِ خلافت میں پانچ بار حج کا سفر کیا۔ پہلا حج ۱۴۰ھ، دوسرا: ۱۴۴ھ، تیسرا: ۱۴۷ھ اور چوتھا: ۱۵۲ھ میں کیا۔ پانچویں سفر میں اس کی وفات ہوگئی۔

سیر و تفریح کو نہ خود پسند کرتا نہ اپنے کسی نائب کو اس کی اجازت دیتا۔ ایک بار کسی حاکم کے بارے میں اسے پتا چلا کہ وہ شکار کے لیے جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے کتے اور باز سدھا کر رکھے ہیں۔ منصور نے فوراً اسے معزول کر دیا اور اپنے حکم نامے میں سخت ملامت آمیز فقروں کے بعد اسے لکھا: ''ہم نے تمہیں مسلمانوں کی خدمات انجام دینے کے لیے رکھا ہے، جانوروں میں مشغولیت کے لیے نہیں۔''③

آلاتِ تعیش سے اس کی کنارہ کشی کا یہ عالم تھا کہ موسیقی کے مشہور آلات کے نام تک نہیں جانتا تھا۔ ایک دن اسے کہیں سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ ماجرا دریافت کیا تو کسی نے بتایا کہ ایک غلام طنبورہ بجا رہا ہے۔ منصور نے پوچھا: ''یہ طنبورہ کیا ہوتا ہے؟'' اس کے بعد وہ وہاں پہنچا جہاں غلام طنبورے سے دل بہلا رہا تھا۔ منصور نے حکم دیا کہ طنبورہ اسی کے سر پر مار کر توڑ ا جائے۔ اس کے بعد اس غلام کو بازار میں فروخت کرا دیا۔④

منصور کا کہنا تھا کہ حکمران کا تخت چار پایوں پر قائم رہتا ہے۔ ایک پایہ بھی کمزور ہو جائے تو حکومت کمزور پڑ جاتی

① تاریخ الطبری: ۸/۵۹؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۳۵۸، ۳۷۲ ② تاریخ الطبری: ۸ص ۶۳
③ تاریخ الطبری: ۸/۶۳، ۸۰؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۳۶۷ ④ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳ص ۳۶۷

ہے۔ پہلا پایہ عدلیہ ہے جو اللہ کی شریعت کے نفاذ میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے۔ دوسرا پایہ پولیس افسران ہیں جو کمزوروں کو زورآوروں کے مقابلے میں انصاف فراہم کریں۔ تیسرا پایہ محصولات کے افسران ہیں جو رعایا پر کسی زیادتی کے بغیر خراج وصول کریں۔ چوتھا پایہ خبر رساں عملہ ہے جو سب کی خبریں صحیح صحیح پہنچائے۔ ①

منصور سیاست کے بارے میں اپنے مخالفین تک سے استفادہ کرتا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے ایک اموی امیر کو گرفتار کرنے کے بعد اسے جان کی امان دیتے ہوئے پوچھا: ''بنوامیہ کی حکومت کے تاروپود کیسے بکھرے؟'' اس نے جواب دیا: ''خبر رسانی کے نظام سے لاپرواہی کی وجہ سے؟'' منصور نے پوچھا: ''اثاثوں کی کونسی قسم تھی جو مصیبت میں انہیں سب سے زیادہ کام آئی؟'' اس نے کہا: ''ہیرے جواہرات!'' منصور نے سوال کیا: ''ان سے آخر تک کس نے وفاداری نبھائی؟'' افسر نے کہا: ''ان کے آزاد کردہ غلاموں نے!!'' منصور کا ارادہ تھا کہ وہ خبر رسانی کے نظام پر اپنے خاندان کے لوگوں کو تعینات کرے گا مگر اس گفتگو کے بعد اس نے یہ شعبہ اپنے موالی کے حوالے کر دیا۔ ②

علم اور بخل:

منصور نے جوانی میں علمِ حدیث بڑی محنت سے شہر شہر گھوم کر حاصل کیا تھا۔ اس دوران اسے مفلسی اور ذلت کے ایسے تلخ تجربات ہوئے جس سے اس نے بہت سی چیزیں اصول کے طور پر گرہ سے باندھ لیں۔ ایک بار وہ کسی جگہ سرائے میں ٹھہرنے کے لیے داخل ہونے لگا تو اسے چوکیدار نے پکڑ لیا اور بولا: ''اندر گھسنے سے پہلے دو درہم نکالو۔'' منصور نے اُسے اپنی بہت سی فضیلتیں بتائیں کہ وہ بنوہاشم سے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی اولاد ہے، قرآن مجید کا حافظ وقاری اور فقہ اور مسائلِ میراث کا عالم ہے مگر چوکیدار نے کسی بات کو اہمیت نہ دی۔ اُس کی ایک ہی رٹ تھی: ''دو درہم نکالو۔'' آخر منصور نے اسے کسی طرح دو درہم ادا کیے اور ساتھ ہی طے کر لیا کہ وہ کبھی ایک درہم زائد خرچ نہ کرے گا اور خوب دولت جمع کرے گا۔ خلیفہ بننے کے بعد بھی ایک ایک پائی کا حساب رکھتا تھا اور ایک دھیلے کی فضول خرچی نہیں ہونے دیتا تھا۔ دھیلے کو عربی میں دانق کہتے ہیں، اس لیے لوگ منصور کو طنز کے طور پر ''دانقی'' کہا کرتے تھے۔ ③

علوم وفنون کی سرپرستی:

منصور کے دور میں بغداد علوم وفنون کا ایسا مرکز بنا جہاں ہر شعبے کے استاد جمع تھے۔ ان میں غیر ملکی زبانوں کے ماہرین بھی تھے۔ حکومت ان سب کی سرپرستی کرتی تھی۔ اس دور میں دیگر اقوام کی بعض مشہور کتب کے عربی میں تراجم ہوئے مثلاً حکیم اِبْنُ الْمُقَفَّع نے فارسی قصوں کی مشہور کتاب ''کلیلۃ ودمنۃ'' کو عربی میں ڈھالا۔ اسی طرح ہندوستان کی تاریخ پر ایک کتاب کا ترجمہ ''کتاب السند والہند'' کے نام سے کیا گیا۔ ریاضی میں اقلیدس کی مشہور تصنیف کا ترجمہ ہوا۔ اس دور کے مشہور طبیب حنین بن اسحق نے بقراط اور جالینوس کی بعض طبی کتب کو عربی کا جامہ پہنایا۔ ④

① تاریخ الطبری: ۸/ص ۶۷ ② تاریخ الطبری: ۸/ص ۸۰
③ تاریخ الخلفاء: ص ۱۹۵، ۱۹۶ ④ التاریخ الاسلامی العام لعلی ابراھیم حسن، ص ۳۵۵

منصور اور عبدالملک میں مشابہت:

منصور کئی اعتبار سے عبدالملک اموی سے خاصا مشابہ معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

① عبدالملک بھی بنو مروان کا دوسرا حکمران تھا۔ منصور بنو عباس کا دوسرا حکمران تھا۔

② عبدالملک بھی عالم فاضل اور حدیث کا ماہر تھا۔ منصور بھی عالم فاضل اور حدیث کا ماہر تھا۔

③ عبدالملک نے ہر مخالف قوت کو شکست دے کر بنو مروان کی ہچکولے کھاتی ہوئی حکومت کو قائم اور مستحکم کر دیا۔ منصور نے بھی ہر مخالف کو کچل کر بنو عباس کے پائے مضبوط کر دیے۔

④ عبدالملک کی افواج کا مقابلہ جلیل القدر اسلامی شخصیات سے ہوا جن میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن جُبیر رحمہ اللہ جیسی ہستیاں شامل تھیں۔
منصور کی افواج کا مقابلہ محمد نفسِ زکیہ اور ابراہیم جیسے ہاشمی بزرگوں سے ہوا۔

⑤ عبدالملک اتنا کفایت شعار تھا کہ بخیل مشہور ہو گیا تھا۔
منصور بھی کفایت شعاری اور خرچ میں حد درجے احتیاط کی وجہ سے بخیل مشہور تھا۔

⑥ عبدالملک نے پہلے شام کے باغی حکمران اور پھر خلیفہ کی حیثیت سے مجموعی طور پر ۲۱ سال حکومت کی۔
منصور نے ۲۲ سال حکومت کی۔

⑦ عبدالملک نے اپنے دستِ راست عَمرو بن سعید کو فریب دے کر پاس بلوایا اور پھر قتل کر دیا۔
منصور نے اپنے دستِ راست ابو مسلم خراسانی کو فریب دے کر پاس بلوایا اور پھر مار ڈالا۔

خلاصہ:

منصور نے پورے بائیس سال حکومت کی اور تمام باغیوں اور مخالفین کا قلع قمع کر کے عباسی خلافت کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ اس نے کسی کو حجاج بن یوسف کی طرح کسی صوبے کا مطلق العنان حاکم نہیں بننے دیا بلکہ اُمراء کے اختیارات محدود رکھے اور انہیں جلدی جلدی تبدیل کرتا رہا۔ اس نے خلیفہ کی روحانی حیثیت کو اجاگر کر کے مسلمانوں کو دلی طور پر مرکزِ خلافت کا وفادار بنانے کی کوشش بھی کی اور ایک حد تک اس میں کامیابی حاصل کی۔ وہ دولتِ عباسیہ کو ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کر گیا کہ تقریباً ایک صدی تک اسے گہن نہ لگ سکا اور بعد میں زوال کی حالت میں بھی وہ چار صدیوں تک قائم رہی۔

❀❀❀

المہدی بن منصور

محمد بن عبداللہ

ذوالحجہ ۱۵۸ھ......تا......محرم ۱۶۹ھ

اکتوبر ۷۷۵ء......تا......اگست ۷۸۵ء

منصور اپنے دورِ حکومت میں تمام مخالفین کا قلع قمع کر گیا تھا؛ اس لیے اس کے ولی عہد مہدی کو ایک مضبوط و مستحکم مملکت کی سربراہی نصیب ہوئی جس میں ہر طرف امن وامان تھا۔ وہ عالم فاضل اور علم نواز تھا۔ اس کے گرد علماء و فضلاء اور ادباء و شعراء کا ہجوم رہتا تھا۔ ابو العتاہیہ اور ابودُلامہ جیسے نامور شعراء اس کے ہم نشین تھے۔ وہ شرم وحیاء، مروت ورحم دلی اور عدل میں معروف تھا۔ لوگوں کی فریاد رسی کے لیے خود کھلی عدالت لگایا کرتا۔ مظلوم کو انصاف فراہم کرتا اور مظالم کی روک تھام کرتا۔ وہ عفو و درگزر کا عادی تھا۔ مصلح لوگوں کی غلطیوں ہی نہیں، مکاریوں سے بھی درگزر کر جاتا تھا۔ ایسا پرہیزگار تھا کہ نبیذ سے بھی بچتا تھا جبکہ امراء کے ہاں نبیذ نوشی معروف تھی۔ اس کے دور میں ہر طرف امن وامان تھا۔①

اُموی وہاشمی قیدیوں کی رہائی:

سفاح اور منصور کے دور میں محض شک کی بناء پر اُموی وہاشمی خاندان کے لوگوں کو جیلوں میں بھرا گیا تھا مگر مہدی نے جیل خانوں کے دروازے کھول دیے۔ خراسان کے نامور اموی امیر نصر بن سیّار کے کاتب داؤد کے لڑکے جیل میں تھے۔ مہدی نے انہیں آزاد کر دیا اور ان میں سے ایک قابل فرد یعقوب بن داؤد کو دولتِ عباسیہ کا وزیر بنا دیا۔ نفسِ زکیہ کے بھائی ابراہیم منصور کے خلاف جنگ میں قتل ہوئے تھے۔ ان کے بیٹے بھی جیل میں تھے۔ مہدی نے انہیں بھی رہا کر دیا اور ان میں سے حسن بن ابراہیم کو اپنا مقرب اور اپنا بھائی قرار دے دیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے ابو محمد حسن بن زید بھی منصور کے دور سے جیل میں تھے۔ مہدی نے انہیں رہا کر کے اپنا ہم نشین بنا لیا۔ اس حسن سلوک سے مہدی نے بنوامیہ اور بنوفاطمہ دونوں خانوادوں کے دل جیت لیے۔②

---

① تاریخ یعقوبی: ۲۷۰ تا ۲۷۳؛ المختصر فی اخبار البشر: ۲/۸تا ۱۰؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۰۱ تا ۲۰۶؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۵۴۴ سنۃ ۱۶۹ھ

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۶۶ھ؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۱۵۹ھ؛ العبر فی خبر من غبر: ۱/۱۹۳

رومیوں سے معرکے:

مہدی کے دور میں رومیوں کے خلاف جہاد جاری رہا۔ ۱۶۱ھ میں رومی جرنیل میخائیل پیٹرک نے شمالی شام اور ایشیائے کوچک کے ساحلوں پر دھاوا بول دیا اور کئی اہم چوکیوں پر قابض ہو گیا۔ عباس بن محمد اور سالم برنسی یکے بعد دیگرے اس کے مقابلے میں گئے مگر رومیوں کی تاخت وتاراج رکنے میں نہ آئی۔ ثمامہ بن ولید نے دابق تک فوج کشی کی مگر رومیوں کے آگے کوئی پیش نہ گئی۔ ۱۶۲ھ میں حسن بن قَحْطَبَہ جیسا تجربہ کار امیر اس مہم پر مامور ہوا، اس نے ۸۰ ہزار پیشہ ور سپاہیوں کو لے کر میخائیل کا تعاقب کیا۔ رومیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ ان کی بہت سی چوکیاں فتح اور بکثرت سپاہی گرفتار ہوئے۔ تاہم ان کا زور پوری طرح نہ ٹوٹ سکا۔ آخر کار ۱۶۲ھ میں مہدی ایک عظیم لشکر لے کر خود محاذ پر گیا اور فوج کی کمان اپنے بیٹے ہارون الرشید کے سپرد کی جس نے میخائیل دشکستِ فاش دے کر صلح پر مجبور کر دیا۔

تاہم کچھ ہی مدت بعد میخائیل نے عہد شکنی کر کے ۹۰ ہزار سپاہیوں کے ساتھ سرحدوں پر بہت بڑا حملہ کیا اور عباسی سالار عبدالکبیر کو شکست دے دی۔ یہ سن کر مہدی نے ہارون الرشید کی قیادت میں ایک لاکھ سپاہی سرحد پر بھیجے۔ یہ لشکر رومیوں کو متواتر شکستیں دے کر ۱۶۵ھ میں خلیج قُسطَنطِینِیَّہ تک پہنچ گیا۔ وہاں اس وقت ملکہ ''رینی'' حکومت کر رہی تھی۔ اس نے خراج قبول کر کے صلح کر لی، یوں جنگوں کا یہ سلسلہ مسلمانوں کی فتح پر اختتام پذیر ہوا۔ ①

زندقہ کا فتنہ اور مہدی کا کردار:

یہ وہ دور تھا کہ جہم بن صفوان جیسے عقل پرستوں کے افکار لادین تحریکوں کی آبیاری کر رہے تھے۔ ایسے میں خراسان کے علاقے ''کش'' سے ایک باغی کا ظہور ہوا جو اتنا بدصورت تھا کہ اپنی شکل کو چھپانے کے لیے سونے کا نقاب استعمال کرتا تھا؛ اس لیے وہ ''مُقنّع'' (نقاب پوش) کہلاتا تھا۔ وہ جادوگر تھا اور ساحری کے بل بوتے پر اس نے ایسا مصنوعی چاند بنایا تھا جو ایک کنویں سے طلوع ہوتا تھا اور دو ماہ کی مسافت سے دکھائی دیتا تھا۔ اس بدبخت نے خدا کے اپنے جسم میں حلول کر جانے کا دعویٰ بھی کر دیا جس کے باعث جاہل لوگ اسے سجدے کرنے لگے۔ آخر ۱۶۳ھ میں سرکاری فوج نے اس کے مرکز کو گھیر لیا۔ مُقنّع نے راہِ فرار مسدود دیکھ کر خودکشی کر لی۔ ②

اس دور میں نسلی منافرت کی بنیاد پر ابھرنے والی ''شعوبی تحریک'' زندیقیت کو عام کر رہی تھی۔ اس تحریک کے کچھ لوگ صرف عربوں کو تنقید و مذمت کا نشانہ بناتے تھے مگر بعض لوگ اسلامی عقائد اور شرعی احکام کا بھی تمسخر اڑاتے۔ وہ اسلام سے اس لیے نالاں تھے کہ اس مذہب کو عربوں نے پھیلایا تھا۔ انہوں نے قدیم ایرانی فلسفیوں: مانی، مزدک اور زرتشت کی تعلیمات کو زندہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ③ مہدی نے اس فتنے کے استیصال میں اپنے طور پر کوئی کسر نہ چھوڑی

① البدایۃ والنہایۃ، تاریخ خلیفۃ بن خیاط: سنۃ ۱۶۱ھ تا ۱۶۵ھ۔

② البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۱۶۳ھ، المختصر فی اخبار البشر: ۹/۲؛ الملل والنحل للشہرستانی: ۱۵۴/۱، ط مؤسسۃ الحلبی

③ الحیوان للجاحظ: ۱۳۱/۷، ط دار الکتب العلمیۃ

اور عمر کلواذی نامی امیر کی سرکردگی میں ایک مستقل محکمہ قائم کردیا جس کا کام ایسے بے دینوں کا سراغ لگانا اور انہیں سزا دینا تھا۔ ① مہدی نے اپنے ولی عہد موسیٰ الہادی کو بھی وصیت کی تھی کہ اس فتنے کی سرکوبی میں کوئی کسر نہ چھوڑنا۔ ②

تعمیری وترقیاتی کام:

مہدی نہایت سخی اور فیاض تھا۔ اسے تعمیری وترقیاتی کاموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس زمانے تک مسجد الحرام کا صحن کسی باقاعدہ نقشے کے مطابق نہ تھا۔ مہدی نے مسجد الحرام اور اس کے صحن میں اس طرح توسیع کرائی کہ کعبہ صحن کے بالکل بیچ میں ہوگیا۔ اس وقت تک پرانے غلاف اتارے بغیر کعبہ کو نئے غلاف پہنائے جاتے تھے مہدی نے یہ رسم ختم کی، پرانے غلاف ہٹوا کر نیا غلاف چڑھایا۔ مسجد نبوی میں بھی توسیع کرائی، اور وہاں سنگ مرمر کے ستون لگائے۔

بصرہ کی جامع مسجد میں توسیعی اور آرائشی کام کرایا۔ پوری مملکت کی تمام جامع مساجد کے منبر تبدیل کرا کے نئے منبر رکھوائے اور پابندی لگائی کہ کوئی منبر مسجد نبوی کے منبر سے بلند نہ ہونے پائے۔ حاجیوں کے قافلوں کو تمام ممکنہ سہولتیں دیں، ان کے راستوں میں جگہ جگہ مسافر خانے تعمیر کرائے۔ سنگِ میل نصب کیے اور حوض بنوائے تاکہ کہیں بھی پانی لینے میں تکلیف نہ ہو۔ گزشتہ ادوار میں قیدیوں کے کھانے پینے کی ذمہ داری ان کے گھر والوں کے سر ہوتی تھی، وہ گھروں سے ان کے لیے کھانا بھیجا کرتے تھے۔ مہدی نے اسے حکومت کی ذمہ داری قرار دیا اور جیل خانوں میں ہی کھانا پکا کر قیدیوں کو مہیا کرنے کا انتظام شروع کرایا۔ کوڑھیوں اور جذام کے مریضوں کو گھر بیٹھے خرچہ بھیجنے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کیا۔ غرض اس نے فلاحی اور ترقیاتی کاموں میں بے دریغ خرچ کیا۔ ③

ولی عہدی کا معاملہ:

سفاح نے اپنے بعد اپنے بھائی منصور اور پھر اپنے چچازاد عیسیٰ بن موسیٰ کو بالترتیب جانشین بنایا تھا۔ مگر منصور نے سفاح کی وصیت کے خلاف عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہدی سے استعفاء دینے پر مجبور کردیا۔ طے ہوا کہ اس کے بعد اس کا بیٹا مہدی خلیفہ ہوگا اور مہدی کے بعد عیسیٰ بن موسیٰ۔ مگر مہدی نے عیسیٰ بن موسیٰ کو ایک بار پھر ولی عہدی سے استعفاء دینے پر مجبور کیا اور اپنے دو بیٹوں: ہادی اور ہارون الرشید کو یکے بعد دیگرے ولی عہد بنادیا۔ مہدی کے گیارہ سالہ دور میں یہ ایک واقعہ ایسا ہے جو اس کی ساکھ کو متاثر کرتا ہے۔ ④

وفات:

۲۲ محرم ۱۶۹ھ کو مہدی شکار کھیلتے ہوئے شدید زخمی ہو کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس نے ۴۳ سال عمر پائی اور دس سال سے کچھ دن زائد حکومت کی۔ اچھے اخلاق نے اسے ہر طبقے کا محبوب بنادیا تھا۔ ⑤

---

① تاریخ الطبری: ۱۶۵/۸، سنۃ ۱۶۷ھ ② تاریخ الطبری: ۲۲۰/۸؛ تاریخ الطبری: ۱۹۰/۸ سنۃ ۱۶۹ھ
③ تاریخ یعقوبی، ص ۲۷۰ تا ۲۷۳؛ البدایۃ والنہایۃ: ۵۴۱/۱۳ تا ۵۳۹؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۰۱ تا ۲۰۶، ط نزار
④ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۱۶۰ھ، ۱۶۷ھ ⑤ البدایۃ والنہایۃ: ۵۵۱/۱۳، ۵۵۲؛ تاریخ خلیفۃ بن خیاط، ص ۴۴۳ تا ۴۴۵

الہادی بن مہدی

موسیٰ بن محمد

محرم ۱۶۹ھ......تا......ربیع الاول ۱۷۰ھ

جولائی ۷۸۵ء......تا......ستمبر ۷۸۶ء

مہدی کا بیٹا موسیٰ ہادی بائیس سال کی عمر میں خلیفہ بنا۔ اس نے اپنے باپ کی وصیت کے مطابق زنادقہ کو چن چن کر ختم کیا۔ ہادی پہلا خلیفہ ہے جس نے ہتھیار بند سپاہیوں کے جلوس میں باہر نکلنے کی رسم شروع کی۔ ①

حسین بن علی کا خروج:

ہادی کی خلافت کے آغاز پر مدینہ منورہ سے ایک فاطمی بزرگ حسین بن علی بن حسن نے خروج کیا۔ ہادی نے ان کے خلاف ایک بڑا لشکر بھیج دیا۔ مکہ سے چھ میل دور ''فخ'' کے مقام پر سرکاری لشکر اور حسین بن علی کے حامیوں میں جھڑپ ہوئی جس میں حسین بن علی سمیت کئی روسائے سادات جاں بحق ہوگئے۔ کچھ سادات حجاز سے نقل مکانی کر کے افریقہ چلے گئے جن میں نفس زکیہ کے بھائی ادریس بن عبداللہ نمایاں تھے۔ انہوں نے افریقی قبائل کے لاتعداد لوگوں کو اپنا مرید بنالیا۔ ②

ولی عہدی کا مسئلہ اور ہادی کی اچانک موت:

ہادی نے تخت نشینی کے پہلے ہی سال اپنے بھائی ہارون کی جگہ منصب ولی عہدی اپنے کم سن بیٹے جعفر کے لیے طے کرانے کی کوشش شروع کردی۔ اس کی والدہ ملکہ خیزران نے اسے روکا جس سے ماں بیٹے میں ناچاقی ہوگئی۔ اس کے بعد ہادی اپنے بیٹے کی جانشینی کے اعلان سے پہلے اچانک ۱۵ ربیع الاول ۱۷۰ھ کی شب فوت ہوگیا۔ اس کے پیٹ میں ایک پھوڑا نکل آیا تھا جو مہلک ثابت ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہادی کی موت میں خیزران کا ہاتھ تھا؛ کیوں کہ وہ ہارون کو ولی عہد برقرار رکھنا چاہتی تھی جس پر ہادی آمادہ نہ تھا۔ ہادی کی مدتِ خلافت ایک سال دو ماہ تھی۔ ③

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۰۷، ۲۰۸

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۵۵۳ تا ۵۵۴؛ تاریخ الطبری: ۸/۱۹۳ تا ۲۰۳؛ الاعلام زرکلی: ۱/۲۷۹

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۵۵۶

مشق

(برائے دورِ سفاح تا ہادی)

سوالات کے جوابات دیجیے:

① ابوالعباس سفاح کے کردار پر روشنی ڈالیے؟
② ابوالعباس سفاح نے حکومت سنبھال کر گزشتہ دور کی کن بدعات کا ازالہ کیا؟
③ منصور اور ابومسلم خراسانی میں کشیدگی کیوں پیدا ہوئی اور ابومسلم کا انجام کیا ہوا؟
④ نفسِ زکیہ کی تحریک کے اسباب اور اس کے انجام پر روشنی ڈالیے۔
⑤ بغداد کی آبادی اور تعمیر کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
⑥ منصور کے دور میں فقہ حنفی وفقہ مالکی کی تدوین پر مختصر مضمون لکھیے۔
⑦ مہدی عباسی کے دور میں زندیقوں نے کیا فتنے پھیلائے اور ان کے خلاف کیا کارروائی کی گئی؟
⑧ مہدی عباسی کے کردار اور اس کے دور میں کیے گئے تعمیری وترقیاتی کاموں پر روشنی ڈالیے۔

عملی کام:

❁ ایسا نقشہ دیکھیے جس میں منصور کے دور میں دولتِ عباسیہ کی حد بندی واضح کی گئی ہو۔
❁ عباسی کے دور میں فقہ کے مراکز شہروں کی قدیم یا جدید تصاویر جمع کر کے انہیں عملی کاپی پر چسپاں کریں۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ تاریخ الخلفاء: عباسی دور: ابوالعباس سفاح تا الہادی
❁ تاریخ الدولة العباسية، از نبيلة حسن محمد، مطبوعه دارالمعرفة الجامعية، مصر
❁ التاریخ الاسلامی العام، از دکتور علی ابراہیم حسن (باب دولتِ عباسیہ)

❁❁❁

(یونٹ: 2.8)

ہارون الرشید بن مہدی

ہارون بن محمد

ربیع الاول ۱۷۰ھ......تا......جمادی الآخرہ ۱۹۳ھ

ستمبر ۷۸۶ء......تا......اپریل ۸۰۹ء

ہارون ۱۴۸ھ میں پیدا ہوا۔ ۲۳ سال کی عمر میں مسندِ خلافت پر بیٹھا اور الرشید کا لقب اختیار کیا۔ وہ ایک رحم دل اور فیاض انسان تھا۔ شہ سواری اور مجاہدانہ زندگی کا شیدائی تھا۔ دن بھر امورِ مملکت میں مشغولیت کے باوجود شب کو روزانہ سو رکعت نفل ادا کرتا تھا۔[1] امام ابو یوسف رحمہ اللہ، امام محمد بن حسن الشیبانی رحمہ اللہ، ابو العتاہیہ، عباس بن احنف، اصمعی، مروان بن ابی حفصہ، ابراہیم موصلی، اسحق موصلی اور واقدی جیسے مشاہیر اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ امام مالک بن انس رحمہ اللہ اور عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ جیسے فقہاء، فضیل بن عیاض رحمہ اللہ اور رابعہ بصریہ رحمہا اللہ جیسی عابد و زاہد ہستیاں، خلیل بن احمد رحمہما اللہ اور سیبویہ جیسے ائمۂ عربیت اور امام کسائی رحمہ اللہ جیسے قاری اس کے معاصر تھے۔[2]

ایرانی اثرات:

ہارون الرشید کی تعلیم و تربیت میں دربار سے وابستہ ایک فارسی گھرانے برامکہ کا بڑا حصہ تھا؛ لہٰذا اسے اہلِ فارس سے بڑی محبت تھی؛ اسی لیے اس کے دور میں فارسیوں کو بڑے بڑے عہدے ملے۔ فوج کے بہت سے بڑے جرنیل فارسی تھے۔ لباس اور وضع قطع میں بھی عرب کا سادہ تمدن متروک ہونے لگا اور فارسی تمدن کی چھاپ گہری ہوتی گئی۔[3]

اندرونی مہمات

مستحکم حکومت اور عوامی مقبولیت کے باوجود ہارون کو اندرونی مہمات سے سابقہ پڑا جن کا ذکر مختصراً کیا جا رہا ہے:

بغاوتیں:

۱۷۸ھ میں مصر میں بغاوت ہوئی جہاں قیس اور قضاعہ کے عرب قبائل پر مشتمل ایک جماعت نے جسے حوفیہ کہا جاتا تھا، عباسی حاکم کے خلاف خروج کیا۔ ہارون نے ہرثمہ بن اعین کو بھیج کر اس بغاوت پر قابو پایا۔

① البدایۃ والنہایۃ: ۲۹/۱۴

② تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۱، ط نزار

③ التاریخ الاسلامی العام، علی ابراہیم حسن، ص ۳۷۱، ۳۷۲

اسی سال دوسری بغاوت افریقہ میں ہوئی جہاں عبدویہ نامی ایک جرنیل اٹھ کھڑا ہوا۔ وزیرِ مملکت یحییٰ برمکی نے کچھ معتمد جرنیل بھیج کر اس باغی کو مذاکرات کے ذریعے رام کیا اور بغداد بلا کر انعام واکرام اور عہدے سے نوازا۔ ①

۱۷۸ھ میں بنوتغلب کے خارجی سردار ولید بن طریف نے الجزیرہ میں اودھم مچادیا تاہم انجام کار وہ سرکاری افواج کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ ایشیا میں یہ خوارج کی آخری شورش تھی۔ اس کے بعد ان کا زور بالکل ٹوٹ گیا۔ ②

۱۸۳ھ میں خاقانِ ترکستان نے بحیرۂ خزر کے کوہستانی درّے عبور کر کے آذربائی جان اور آرمینیا پر حملہ کردیا اور ایک لاکھ کے لگ بھگ مسلمانوں کو قیدی بنالیا، تاہم ہارون کی افواج نے کئی لڑائیوں کے بعد خاقان کو پسپا کردیا۔ اس کے بعد کوہستانی درّوں کو بند کردیا گیا تاکہ ترکستانی وہاں سے دخل اندازی نہ کرسکیں۔ ③

یحییٰ بن عبداللہ ہاشمی کا خروج:

منصور کے عہد میں قتل ہونے والے نفسِ زکیہ کے حقیقی بھائی یحییٰ بن عبداللہ نے دَیلم بغاوت کی تاہم ہارون کے حکم سے فضل بن یحییٰ برمکی نے فوج کشی کی اور یحییٰ کو امان دے کر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرلیا۔ ہارون نے شروع میں یحییٰ بن عبداللہ کو اچھی طرح اپنے پاس رکھا۔ پھر کچھ حاسدین کی اشتعال انگیزی کے باعث بدگمان ہوکر انہیں نظر بند کردیا۔ ④

دولتِ ادارسہ کا قیام:

نفسِ زکیہ کے دوسرے بھائی ادریس بن عبداللہ نے شمالی افریقہ جاکر ۱۷۲ھ میں بربر قبائل کی مدد سے مراکش میں ایک خودمختار حکومت قائم کی جو "دولتِ ادارسہ" کہلائی۔ ادریس بن عبداللہ نے ۱۷۷ھ تک حکومت کر کے وفات پائی۔ مگر اس خاندان میں حکومت کا سلسلہ چلتا رہا۔ مراکش اور الجزائر کا علاقہ اس کے تسلط میں رہا۔ ⑤

افریقی قبائل کی شورش اور دولتِ اغالبہ کا قیام:

۱۸۱ھ سے ۱۸۷ھ تک ہارون الرشید کو افریقہ میں بربر قبائل کی شورش کا سامنا رہا جسے دبانے کے لیے ہارون نے ابراہیم بن اغلب کو ایک بڑی فوج دے کر مستقل طور پر افریقہ کے اہم عسکری شہر قیروان میں تعینات کردیا۔ ابراہیم بن اغلب نے اتنی بڑی فوج کی قیادت سے سیاسی فائدہ اٹھایا اور کچھ ہی مدت بعد وہاں اپنی ایک مستقل ریاست قائم کرلی۔ جو دولتِ اغالبہ کے نام سے مشہور ہوئی اور تقریباً ایک صدی تک قائم رہی۔ ⑥

برامکہ کا عروج وزوال:

بنوعباس کی تحریک، حکومت کے قیام اور استحکام سے عروج تک خاندانِ برامکہ کی خدمات نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس

① تاریخ الطبری: سنۃ ۱۷۸ھ ② تاریخ الطبری: سنۃ ۱۷۸ھ، ۱۷۹ھ، تاریخ ابن خلدون: ۲۱۲/۳

③ العبر فی خبر من غبر: ۲۲۱/۱ ④ البدایۃ والنہایۃ: ۵۸۱/۱۳، ۵۸۲

یہاں ایک روایت یہ ہے کہ ہارون نے کچھ دن بعد انہیں باعزت آزاد کردیا۔ (البدایۃ والنھایۃ: ۵۸۲/۱۳) دوسری روایت کے مطابق وہ جعفر برمکی کی نگرانی میں نظر بند رہے۔ پھر جعفر نے انہیں رہا کردیا جس پر ہارون سخت ناراض ہوا۔ (الکامل فی التاریخ: ۵ ص ۳۴۹) یہی روایت راجح ہے۔

⑤ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۷۲ھ، ۱۷۷ھ ⑥ تاریخ ابن خلدون: ۱۸/۴، ۱۹، ۲۵۰

خاندان کا جدِ امجد خالد برمکی سفاح کے دور میں وزیر اور منصور کے دور میں مہدی کا اتالیق تھا۔ خالد برمکی کا بیٹا یحییٰ برمکی ہارون الرشید کے دور میں وزیر تھا اور ملک کا نظم ونسق عملاً اسی کے ہاتھ میں تھا۔ یہاں تک کہ ہارون نے مہرِ خلافت اور ذاتی انگشتری بھی اسی کو دے دی تھی۔ یحییٰ نے ہارون کو بداعتماد کیے بغیر حکومتی امور میں اپنے چاروں نوجوان لڑکوں: فضل، جعفر، محمد اور موسیٰ کو بھی حکومت میں شریک کر لیا۔ جعفر برمکی ہارون الرشید کا بے تکلف دوست تھا اور دونوں میں سگے بھائیوں سے زیادہ محبت تھی۔ آخر میں ہارون نے اسے وزیر بنالیا۔ اس طرح عباسی خلافت کا نظم ونسق بڑی حد تک اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اسے اپنے عہدِ وزارت میں وہ مقام ملا جو اس کے باپ دادا کو بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ برامکہ کے محلات کی شان وشوکت، لباس کی وضع قطع اور ان کی محفلوں کی سج دھج نے عجم کے بادشاہوں کی یادیں تازہ کردیں۔ اہلِ علم وادب کا جمِ غفیر ان کے گرد جمع تھا۔ خلیفہ کے محل سے کہیں زیادہ چہل پہل برامکہ کے محلات میں دکھائی دیتی تھی۔ لوگ ہارون سے کہیں زیادہ سخاوت وفیاضی کی امید برامکہ سے کرتے تھے اور قصرِ خلافت کو چھوڑ کر برامکہ کی چوکھٹ پر قطار باندھے کھڑے رہتے تھے۔

برامکہ کو اس قدر اختیارات دے دینا ہارون کی سیاسی غلطی تھی۔ اُدھر برامکہ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے خاندان کو ملک کا کرتا دھرتا بنادیا۔ ہارون الرشید اس صورتحال کو زیادہ عرصے تک نظر انداز نہ کر سکا۔ مگر ایک مدت تک ہارون متضاد کیفیات ورجحانات میں مبتلا رہا۔ ایک طرف برامکہ سے گھریلو تعلقات، ان کی خدمات، استادی شاگردی کا ناطہ، طبعی محبت اور دلچسپ ہم نشینی کے مناظر تھے اور دوسری طرف موروثی اقتدار کے یکدم چھن جانے کا خوف تھا۔ ہارون الرشید کو برامکہ کے خلاف بھڑکانے میں اس کے ایک مصاحب فضل بن ربیع کا بہت اہم کردار تھا۔

آخر ۱۸۷ھ میں ہارون نے اچانک برامکہ کو بے اختیار کر ڈالا۔ وجہ یہ ہوئی کہ یحییٰ بن عبداللہ ہاشمی کو ہارون نے جعفر برمکی کی تحویل میں دے رکھا تھا؛ کیوں کہ ہارون کو ان سے خروج کا خطرہ تھا۔ جعفر برمکی نے انہیں چپکے سے رہا کر دیا۔ مگر کسی مسافر نے یحییٰ ہاشمی کو کسی سرائے میں دیکھ کر پہچان لیا اور آکر ہارون کو اطلاع دے دی۔ ہارون نے جعفر برمکی کو بلا کر یحییٰ ہاشمی کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو اس نے شروع میں غلط بیانی کی مگر پھر ہارون کا موڈ خراب دیکھ کر سچ بات بتادی۔ اس دن ہارون برامکہ سے انتہائی بداعتماد ہوگیا اور اس نے انہیں جڑ سے اکھاڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے بڑی رازداری سے اپنے نہایت قابلِ اعتماد سپاہیوں سے یہ کام لیا اور یکم صفر ۱۸۷ھ کی شب اچانک کارروائی کر کے برامکہ کے تمام عمائد کو گرفتار کر لیا۔ جعفر برمکی کو اسی وقت قتل کر دیا گیا جبکہ یحییٰ برمکی اور فضل برمکی مرتے دم تک جیل میں رہے۔ یوں نصف صدی تک بنوعباس کی تاریخ پر چھائے ہوئے برامکہ محض ایک داستان بن کر رہ گئے۔ ①

① تاریخ الطبری: سنۃ ۱۵۸ھ، ۱۵۹ھ؛ تاریخ الطبری: سنۃ ۱۷۹ھ؛ تاریخ الطبری: ۸/ ۲۷۰ تا ۲۹۲؛ البدایۃ والنھایۃ: سنۃ ۱۸۷ھ؛ تاریخ ابن خلدون ۳/ ۲۸۰، باب اخبار البرامکہ؛ سیر اعلام النبلاء: ۹/ ۶۰، تر: جعفر برمکی؛ التاریخ الاسلامی العام لعلی ابراھیم حسن، ص ۳۷۷

بیرونی مہمات

رومیوں سے جنگیں:

ہارون نے اپنے والد مہدی کے دور میں سلطنتِ روما کے خلاف ایک بڑی جنگ لڑ کر قسطنطینیہ کی ملکہ رینی کو صلح پر مجبور کر دیا تھا مگر ہارون کے دور میں رومیوں کے ایک فوجی افسر نقفور نے ملکہ کا تختہ الٹ دیا اور خود بادشاہ بن کر دولتِ عباسیہ سے کیا گیا معاہدہ منسوخ کر دیا اور ہارون کو ایک اہانت آمیز مکتوب بھیجا۔ اسے پڑھ کر ہارون آگ بگولا ہو گیا اور اس نے اسی خط کی پشت پر یہ جواب لکھ دیا:

"ہارون الرشید کی طرف سے رومی کتے نقفور کے نام! اے کافرزادے! میں نے تیرا خط پڑھا۔ تو اپنے پیغام کا جواب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا، سننے کی نوبت نہیں آئے گی۔"

یہ کہہ کر ہارون اسی دن فوج لے کر ایشیائے کوچک کی طرف نکلا اور رومیوں کی بستیوں کو فتح کرتا چلا گیا۔ نقفور نے دب کر سابقہ معاہدے کی پابندی کا وعدہ کیا۔ مگر ہارون کے لوٹتے ہی اس نے پھر عہد شکنی کی۔ ہارون نے ایک فوج بھیج کر اسے پسپا کر دیا اور ۱۹۰ھ میں ایک لشکرِ جرار لے کر خود سرحد پر پہنچا اور رومیوں کو پے در پے شکستیں دیں۔ آخر کار قیصر نقفور نے مجبور ہو کر صلح کا پیغام بھیجا اور ہارون نے سخت شرائط عائد کر کے اس کی درخواست قبول کی۔ ۱۹۳ھ میں قیصر نقفور مر گیا اور اس کے بعد برسوں تک امن سکون رہا۔ ①

فرانس سے دوستانہ تعلقات:

ہارون نے فرانس سے دوستانہ مراسم رکھے۔ شاہِ فرانس شارلیمین اور دولتِ عباسیہ کے مابین سفیروں کی آمد و رفت اور تحائف کا تبادلہ مسلسل ہوتا رہا۔ ہارون الرشید نے شارلیمین کو ایک سدھایا ہوا ہاتھی بھیجا تھا۔ ایک عجیب و غریب گھڑی بھی دی تھی جس کے بارے میں اہلِ یورپ ایک مدت تک سمجھتے رہے کہ یہ جادو سے چلتی ہے۔ شارلیمین کی درخواست پر ہارون نے اہلِ یورپ کو بیت المقدس کی زیارت کی بھی اجازت دے دی۔ ②

ہارون کی وفات:

ہارون کی زندگی کے آخری سالوں میں وسطِ ایشیا میں رافع بن لیث نامی ایک رئیس نے بغاوت کر دی تھی۔ شعبان ۱۹۲ھ میں ہارون خود اس مہم کے لیے نکلا۔ مگر راستے میں شدید بیمار پڑ گیا اور اسے طوس میں ٹھہرنا پڑا اور وہیں ۳ جمادی الآخرہ ۱۹۳ھ کو اس کی وفات ہو گئی۔ اس کی عمر ۴۵ سال تھی۔ ③

① تاریخ الطبری: سنۃ ۱۸۷ھ تا سنۃ ۱۹۳ھ
② التاریخ الاسلامی العام لعلی ابراھیم حسن، ص ۳۸۲، ۳۸۳
③ تاریخ الطبری: ۸/۳۳۰تا۳۴۰؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۱۹۳ھ

ہارون الرشید کے عہد اور کردار پر تبصرہ

ہارون الرشید بنوعباس میں وہی حیثیت رکھتا تھا جو بنوامیہ میں ولید بن عبدالملک۔ اس میں اپنے باپ مہدی اور دادا منصور کی عادات جمع ہوگئی تھیں۔ ذاتی طور پر وہ اپنے دادا منصور سے بڑا متاثر تھا اور اس کا اخلاق و کردار اپنانے کی کوشش کرتا تھا۔ تاہم منصور جس قدر کفایت شعار طبیعت اور فولادی دست و باز و رکھتا تھا، ہارون اسی قدر فیاض اور مہربان تھا۔ ہاں باغیوں کو سزا دیتے ہوئے وہ ہوبہو منصور کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ اس دور میں خلافتِ عباسیہ پوری دنیا کی سب سے بڑی اور طاقتورترین حکومت تسلیم کی جاتی تھی۔ روم جیسی عظیم سلطنت کو اس نے خراج دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ فرانس کا بادشاہ ہارون کو تحائف بھیجتا تھا۔ اندلس، مراکش اور تیونس کو چھوڑ کر سارا عالم اسلام اس کے زیرِ نگیں تھا۔ عوام خوشحال اور فارغ البال تھے، زندگی کی ہر آسائش انہیں میسر تھی۔ کوئی لوٹ مار تھی نہ ٹیکسوں کی سختی تھی بلکہ حکومت دل کھول کر ان پر خرچ کر رہی تھی اس کے باوجود ہارون کی وفات کے وقت سرکاری خزانہ بیس کروڑ پچیس ہزار دینار کی مالیت تک پہنچ چکا تھا۔ آج کل کے لحاظ سے یہ رقم تقریباً ۶۲ ارب ۱۸ کروڑ ڈالر سے زائد ہے۔ ①

حضورِ اکرم ﷺ سے اسے گہری محبت تھی۔ جب بھی نام نامی سنتا تو بے ساختہ کہتا: ''صَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِیْ۔''

ابو معاویہ رحمہ اللہ نے ایک بار یہ حدیث سنائی کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام میں مباحثہ ہوا۔ ایک شخص بیچ میں بول پڑا کہ ان دونوں ہستیوں کی ملاقات بھلا کہاں ہوئی تھی؟ یہ سنتے ہی ہارون غصے سے بے قابو ہوگیا اور بولا: ''میری تلوار لاؤ۔ زندیق! بے دین! نبی ﷺ کی حدیث پر اعتراض کرتا ہے!!'' ابو معاویہ رحمہ اللہ نے بمشکل سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔

بہادر اور جہاد کا دلدادہ تھا۔ ایک محدث یہ فرمان نبوی سنا رہے تھے: ''مجھے پسند ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید کیا جاؤں۔'' ہارون یہ سن کر بہت رویا۔

صحابہ کا نہایت ادب واحترام کرتا تھا۔ ایک بار کوئی خوشامدی بولا: ''امیر المؤمنین نے رعایا کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا ہے کہ لوگ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو بھول گئے۔'' یہ سن کر ہارون مشتعل ہوگیا اور بولا: ''کیا بکتا ہے؟ عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں تو ہم خاموش ہو بھی جائیں مگر تو کیا سمجھتا ہے، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ گستاخی ہم برداشت کرلیں گے۔'' ②

علماء کی بڑی عزت و توقیر کرتا تھا۔ انہیں عطیات سے خوب نوازتا۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کو ایک لاکھ درہم کا ہدیہ پیش کیا۔ ابو معاویہ رحمہ اللہ ایک نابینا محدث تھے۔ ہارون نے ان کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد خود ان کے ہاتھ دھلائے اور کہا: ''آپ کے علم کی تعظیم میں ایسا کر رہا ہوں۔''

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۸

② تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۰، ۲۱۱

ایک بار ابن سماک واعظ رحمۃ اللہ علیہ اس کے پاس گئے۔ ہارون بڑی انکساری سے پیش آیا۔ ابن سماک بولے: ''آپ کا اس مرتبے کے باوجود تواضع کرنا، اس خلافت سے بھی بڑا مقام ہے۔'' پھر کچھ نصیحت کی تو ہارون رونے لگا۔

ہارون فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے گھر جا کر ان سے نصیحت لیتا۔ ایک بار فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''اے حسین چہرے والے! تجھ سے اس اُمت کے بارے میں سوال ہوگا۔'' ہارون پر اتنا گریہ طاری ہوا کہ چیخیں نکل گئیں۔

ہارون نہایت رقیق القلب انسان تھا۔ عموماً نصیحت کی باتیں سن کر، دعاؤں کے وقت اور قبولیت کے مقامات پر وہ بے تحاشا رو دیتا تھا۔ اس دور کے علماء کہتے تھے کہ فضیل اور ہارون سے زیادہ رونے والا کوئی نہیں دیکھا گیا۔ ①

ہارون الرشید مدح وستائش کو پسند کرتا تھا اور اس کے بدلے دل کھول کر انعامات دیتا تھا۔ خود بھی شعر کہا کرتا تھا۔ مروان بن ابی حفصہ کا قصیدہ سن کر اتنا خوش ہوا کہ پانچ ہزار دینار، خلعت، شاہی گھوڑا اور دس رومی غلام عنایت کیے۔ ② ایک بار اسحق موصلی کو دو لاکھ درہم دیے۔ اصمعی کا ایک مدحیہ شعر سن کر پانچ ہزار اشرفیاں دیں۔ ③

بعض بشری کمزوریوں اور ان کے تحت ہونے والے چند جذباتی فیصلوں کو چھوڑ کر مجموعی طور پر ہارون الرشید، عباسی دور کا گلِ سرسبد تھا۔ اس کی زندگی خوبیوں کا مرقع اور اس کی داستانِ حیات کامیابیوں سے بھرپور تھی۔

فقہ حنفی کا عروج:

ہارون الرشید کے دور میں فقہ حنفی کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔ اس سے قبل عباسی خلفاء مہدی اور ہادی کے زمانے میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ قاضی بنے تو فقہ حنفی عدالتوں میں متعارف ہوئی۔ مگر ۱۷۰ھ میں خلیفہ ہارون الرشید نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو ''قاضی القضاۃ'' کا عہدہ دیا اور تمام شہروں کے قاضی حضرات ان کے ماتحت شمار ہوئے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فقہ حنفی کے مطابق فیصلے کرتے تھے؛ لہٰذا یوں فقہ حنفی عدالتوں کا عمومی دستور بن گئی۔ اس کے بعد سقوطِ بغداد تک دولتِ عباسیہ میں زیادہ تر فقہ حنفی ہی کا رواج رہا۔ اگرچہ بعض فقہاء حنبلی، شافعی اور مالکی فقہ پر بھی فتویٰ دیتے تھے اور درمیان میں کبھی کبھی معتزلہ اور دیگر فرقوں کے علماء بھی عدلیہ اور امورِ سلطنت میں دخیل ہوئے مگر یہ ادوار عارضی ثابت ہوئے۔ عمومی طور پر خلافت عباسیہ کی عدلیہ میں فقہ حنفی کا غلبہ رہا۔ ④

❁❁❁

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۱۱

② تاریخ الاسلام للذہبی: ۱۳ ص ۱۵، ت تدمری

③ تاریخ الخلفاء: ص ۲۱۱، ط نزار

④ وفیات الاعیان: ۶/۷۹ تا ۳۸۲؛ ۵/۳۰۹ تا ۳۱۲؛ العبر فی خبر من غبر: ۱/۲۱۹؛ سیر اعلام النبلاء: ۶/۳۰۰ تا ۳۰۵

امین بن الرشید

محمد بن ہارون

جمادی الآخرہ ۱۹۳ھ......تا......محرم ۱۹۸ھ

اپریل ۸۰۹ء......تا......اکتوبر ۸۱۳ء

ہارون الرشید نے اپنی زندگی میں ہی سلطنت کو بیٹوں میں اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ مامون الرشید کو خراسان کی ولایت دی تھی جبکہ امین الرشید کو بغداد میں مسندِ خلافت کا جانشین بنا دیا تھا۔ چنانچہ ہارون کی وفات کے بعد امین الرشید بغداد میں مسندِ خلافت پر براجمان ہوا جبکہ مامون الرشید نے خراسان میں ٹھہر کر وہاں کی حکومت سنبھال لی۔

امین الرشید ناتجربہ کار اور کھیل کود کا شوقین تھا لہٰذا حکومتی امور وزیر فضل بن ربیع کے ہاتھ میں آ گئے۔ اس کے بہکانے پر امین نے صفر ۱۹۵ھ میں خراسان کی ولایت سے مامون کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ اس کے نتیجے میں شعبان ۱۹۵ھ میں دونوں بھائیوں کی افواج میں جنگ ہوئی۔ امین کو شکست ہوئی اور مامون نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔① جب امین کو شکست کی خبر دی گئی تو اس وقت وہ اپنے غلام کے ساتھ مچھلیاں شکار کر رہا تھا۔ اس نے خبر سنانے والے کو ڈانٹتے ہوئے کہا: ''چپ رہو! میرا غلام کوثر صبح سے دو مچھلیاں پکڑ چکا ہے اور میرے ہاتھ ایک بھی نہیں لگی۔''②

۱۹۷ھ میں مامون کے سپہ سالاروں: ہرثمہ اور طاہر بن حسین نے بغداد کو گھیر لیا۔ بغداد میں صورتحال نہایت ابتر ہو گئی۔ امین الرشید ایسے حالات میں بھی کھیل کود میں مگن تھا۔ یہاں تک کہ اس کے لیے راہِ فرار بھی نہ بچی۔ چودہ ماہ کے محاصرے کے بعد ۲۵ محرم ۱۹۸ھ کی شب امین نے مامون کے سپہ سالار ہرثمہ بن اعین سے رابطہ کیا اور خلافت سے دستبردار ہو کر خلیفہ کے شعائر یعنی تبرکاتِ نبوی اس کے حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ امین رات کی تاریکی میں دریا کے راستے ایک کشتی میں ہرثمہ کے پاس جانے لگا مگر اس سے پہلے ہی طاہر بن حسین نے اسے پکڑ کر قتل کر دیا۔③

مامون کو امین کے قتل پر بہت رنج ہوا، تاہم اس نے طاہر بن حسین سے اس بارے میں کوئی باز پرس نہ کی،④ کیوں کہ بہر صورت طاہر بن حسین نے یہ کام کر کے اس کے راستے کا سنگِ گراں ہٹا دیا تھا۔

❁❁❁

① تاریخ الطبری: ۸/۳۶۳ تا ۴۳۰ ② البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۶۲

③ تاریخ الطبری: ۸/۴۳۳ تا ۴۹۸۔ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۱۹۷ھ، ۱۹۸ھ

④ تاریخ الخلفاء، ص ۲۲۱؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۱۰۶

مامون بن الرشید

عبداللہ بن ھارون

محرم ۱۹۸ھ......تا......رجب ۲۱۸ھ

اکتوبر ۸۱۳ء......تا......اگست ۸۳۳ء

مامون الرشید ربیع الاول ۱۷۰ھ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ وہی رات تھی جس میں خلیفہ ہادی کی وفات ہوئی تھی اور مامون کا باپ ہارون مسندِ خلافت پر بیٹھا تھا۔ مامون کی تعلیم وتربیت نامور اہلِ علم کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس نے بچپن میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے اسے قرآن مجید اور صرف ونحو، ادب اور علوم عربیت کی تعلیم دی۔ جبکہ علامہ یزیدی اس کی اخلاقی تربیت پر مامور تھے۔ ابومعاویہ، ہشیم، حجاج اعور، عباد بن عوام اور یوسف بن عطیہ رحمہم اللہ جیسے محدثین سے اس نے حدیث پڑھی تھی۔ اس کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ جو چیز ایک بار پڑھ یا سن لیتا وہ کبھی نہ بھولتا۔ ذکاوت ایسی تھی کہ غیر محسوس قسم کے اشارے سے بھی بہت دور کی بات حتمی طور پر سمجھ لیتا تھا۔ ①

خلافت کا آغاز اور خاندان سہل کا تسلط:

مامون کی خلافت کا آغاز امین کے قتل کے بعد ۲۶ محرم ۱۹۸ھ کو ہوا۔ مگر کئی برس تک اس کا شیعہ وزیر فضل بن سہل تمام امورِ مملکت پر حاوی رہا۔ اس دوران فضل کے مشورے پر مامون نے اپنا قیام خراسان میں رکھا اور فضل بن سہل کا بھائی حسن بن سہل بغداد کے سیاہ وسپید کا مالک بنا رہا۔ یہ دونوں فارسی نژاد بھائی عالمِ اسلام کے سیاسی امور پر پوری طرح حاوی ہوگئے اور مامون کو مہرہ بنا کر استعمال کرتے رہے۔ ②

فتنہ وفساد اور خروج کی تحریکیں:

مامون کی بغداد میں عدم موجودگی اور انتظامی امور پر حسن بن سہل جیسے خودغرض کی بالادستی سے ملک میں ہر طرف صورتحال ابتر ہوگئی۔ عراق، فارس، حجاز اور یمن میں جابجا علویوں نے بغاوتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع

---

① تاریخ الطبری: سنۃ ۱۷۰ھ؛ سیر اعلام النبلاء: ۲۷۳/۱۰؛ المختار من نوادر الاخبار للانباری، ص ۲۲، ۲۳، ط دار کنان بغداد؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۳۰، ۲۳۱؛ المامون، شبلی نعمانی، ص ۱۷، ۱۸ بحوالہ الحکم والآداب للیاقوت المستعصمی، ص ۷۱

② تاریخ الخلفاء: ص ۲۲۶؛ الاعلام زرکلی: ۱۴۹/۵؛ وفیات الاعیان: ۴۱/۳؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۰۹/۱۴

کر دیا۔ بغاوتوں کی یہ آگ ۱۹۹ھ میں بڑی تیزی سے اٹھی مگر مامون کے جرنیلوں کی مستعدی اور چابک دستی کی بدولت دو سال کے اندر اندر اس کے شعلے بجھا دیے گئے۔ اس مہم کی کامیابی میں سب سے بڑا کردار ہرثمہ بن اعین کا تھا۔

اُدھر مامون کی بغداد سے غیر حاضری کے باعث وہاں نظام بالکل تلپٹ ہو چکا تھا۔ انہی دنوں مامون نے یکا یک حضرت علی رضا بن موسیٰ کاظم رحمہ اللہ کو اپنا ولی عہد مقرر کرنے کا اعلان کر دیا جن سے اس کی گہری دوستی تھی۔ مگر امرائے بغداد کی اکثریت نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر کے ۲۵ ذوالحجہ ۲۰۱ھ کو اعلانِ بغاوت کر دیا۔ فضل بن سہل نے اتنی بڑی خبر بھی مامون سے چھپائے رکھی۔ مگر حضرت علی رضا رحمہ اللہ نے مامون کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا جس کے بعد مامون فی الفور بغداد روانہ ہو گیا۔ راستے ہی میں فضل بن سہل پر اچانک قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ مارا گیا۔ مامون نے حملہ آوروں کو سزائے موت دے کر اس کارروائی سے خود کو بری الذمہ قرار دیا۔

مامون طوس پہنچا جہاں اس کے والد ہارون کی قبر تھی۔ یہیں حضرت علی رضا رحمہ اللہ ہیضے میں مبتلا ہو کر دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ مامون نے سخت رنج و غم کا اظہار کیا اور انہیں اپنے والد ہارون الرشید کے پہلو میں دفن کر دیا۔ شیعہ مؤرخین نے مامون پر انہیں زہر دے کر قتل کرنے کا الزام لگایا ہے مگر یہ درست نہیں۔ مامون کی زندگی گواہ ہے کہ اس نے خروج کرنے والے سادات کا بھی احترام کیا اور قابو پانے کے بعد انہیں عزت و توقیر سے رکھا۔ مخالفین سے حسنِ سلوک کرنے والا بھلا علی رضا رحمہ اللہ جیسے محسن پر ظلم کیوں کرتا۔

آخر کار مامون ۱۶ صفر ۲۰۴ھ کو بڑی شان و شوکت سے بغداد میں داخل ہو کر مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ ①

طاہر بن حسین کا خراسان میں تقرر:

طاہر بن حسین نے مامون کی حکومت بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا مگر مامون جب بھی طاہر کو دیکھتا، اس کے دل میں ٹیس اٹھتی کہ اسی کے ہاتھوں اس کے بھائی امین کا قتل ہوا تھا۔ طاہر بھی مامون کی کیفیت سے واقف ہو گیا اور مامون سے خراسان کی ولایت کا پروانہ لے کر ۲۰۵ھ میں وہاں چلا گیا اور پھر عمر بھر وہیں رہا۔

۲۰۷ھ میں طاہر بن حسین فوت ہو گیا اور مامون نے خراسان کی ولایت اس کے بیٹے طلحہ کے سپرد کر دی۔ اس کے بعد ایک طویل مدت تک خراسان کی حکومت طاہر بن حسین کی اولاد میں چلتی رہی اور آگے چل کر اس نے ایک مستقل ریاست کی شکل اختیار کر لی جو "دولتِ طاہریہ خراسان" کے نام سے موسوم ہوئی۔ ②

خراسان اور یمن کی نئی حکومتیں۔ دولتِ طاہریہ۔ دولتِ زیادیہ:

۲۱۳ھ میں یمن کی ولایت محمد بن ابراہیم زیادی کو دی گئی۔ اس صوبے کی حکومت آگے نسل در نسل اسی خاندان میں

① البدایۃ والنہایۃ: ۲۱۰/۱۴ تا ۲۲۱، ۳۱۰؛ تاریخ بغداد: ۱۳۵/۱۹، ترجمۃ علی رضا، ط العلمیۃ؛ العبر فی خبر من غبر: ۲۵۶/۱؛ عمدۃ الطالب: ۳۳۸/۱؛ تاریخ ابن خلدون: ۳۰۵/۳، ۳۰۶؛

② تاریخ الطبری: سنۃ ۲۰۵ھ؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۰۵ھ؛ وفیات الاعیان: ۵۲۲/۲

چلتی رہی اور یہ علاقہ بھی آگے چل کر خود مختار ہو گیا۔ تیونس میں خود مختار دولتِ اغالبہ پہلے ہی قائم ہو چکی تھی۔ یہ تینوں ریاستیں یعنی: خراسان، یمن اور تیونس رسمی طور پر خلافتِ عباسیہ سے منسلک تھیں کہ وہاں سے خراج کی کچھ رقم بغداد بھیج دی جاتی تھی اور خطبے میں خلیفہ کا نام پڑھا جاتا تھا۔ باقی معاملات میں یہ ممالک خود مختار تھے۔ ①

بابک خرمی کا ظہور:

مامون کے عہد میں بابک نامی ایک باغی نے ایسے عقائد کو پھیلانا شروع کیا جن میں خوش رہنے کے لیے ہر حرام چیز کو حلال کر دیا گیا تھا۔ اس باغی کے پیروکار خرمی کہلائے اور اسی لیے بابک کو "بابک خرمی" کے نام سے شہرت ملی۔ وہ ماژندران کے پہاڑوں کو مرکز بنا کر بستیوں کو قتل و غارت کا نشانہ بناتا رہا۔ ۲۰۶ھ، ۲۰۹ھ اور ۲۱۲ھ میں اس کے خلاف بار بار فوج کشی کی گئی مگر ہر بار ناکامی ہوئی۔ ②

علمی و سائنسی سرگرمیاں:

مامون کو نت نئے علوم و فنون کا چسکہ تھا۔ لہٰذا اس نے ہر قوم اور مذہب کی کتب منگوا کر ان کے تراجم کرانا شروع کیے۔ اس مقصد کے لیے "بغداد" میں ایک ادارہ "دار الترجمہ" قائم کیا گیا۔ اس سے عالمِ اسلام میں حکمت کے مختلف شعبوں کو ترقی ملی اور طب، ریاضی، طبعیات، کیمیا، فنِ تعمیر اور فلکیات کے میدانوں کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم ہوئی۔ چنانچہ دار الترجمہ کے ایک رُکن حکیم محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے فنِ ریاضی پر "الجبر والمقابلہ" جیسی بے مثل کتاب تصنیف کی جس میں الجبرا کے بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں۔ الخوارزمی نے ایک بہترین جنتری بھی ترتیب دی۔ مامون کے دور میں اسلامی تاریخ کی پہلی رصدگاہ (خلائی تحقیق کا ادارہ) قائم کی گئی جس میں نہایت بیش قیمت آلاتِ رصد نصب کیے گئے۔ ③

مگر ترجمہ شدہ یونانی علوم کا ایک بڑا حصہ خالص فلسفیانہ مباحث اور عقلی موشگافیوں پر مشتمل تھا۔ ان ابحاث میں پڑنے سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ بعض اہلِ علم نے قرآن و سنت سے ثابت شدہ خالص اعتقادی مسائل کو عقلیات کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا۔ اور جہاں کوئی اعتقادی مسئلہ انہیں اس معیار پر پورا اترتا نہ دکھائی دیا، انہوں نے اس کا انکار کر دیا یا اس کی ایسی تاویل شروع کر دی جو اسلاف سے منقول نہیں۔ علمائے راسخین نے اس غلط طرزِ فکر کو "اعتزال" کا نام دیا۔ یہ فتنہ اس قدر پھیلا کہ مامون بھی اس کا شکار ہو گیا کیوں کہ وہ خود ان ابحاث میں حصہ لیتا تھا۔

مامون کی سرپرستی کی وجہ سے جلد ہی معتزلہ دربارِ خلافت میں ایک مؤثر قوت بن گئے۔ انہوں نے عقیدۂ خلقِ قرآن

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۲۰۵ھ، ۲۰۶ھ؛ وفیات الاعیان: ۵۲۲/۲؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/ص ۲۷۲، ۲۸۳

② تاریخ الطبری، البدایة والنهایة: سنة ۲۱۲ھ، ۲۱۱ھ، ۲۰۹ھ، ۲۰۶ھ، ۲۰۱ھ

③ المامون از شبلی نعمانی، ص ۱۲۵ تا ۱۳۲؛ اخبار العلماء باخبار الحکماء، ص ۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۹۹، ۲۰۵، ۲۱۶، ۲۷۳ تا ۲۸۰؛ وفیات الاعیان: ۱۲۲/۵، ۱۲۳، ط دار صادر؛ کشف الظنون از حاجی خلیفہ: ۹۰۵/۱، ۹۰۶، ط دار الکتب العلمیة؛ عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ص ۱۰۳ تا ۱۰۵، ۱۳۳، ۲۶۰، ص ۲۸۵ تا ۲۸۹؛ الاعلام زرکلی: ۲۸۷/۲

(یعنی کلام اللہ مخلوق ہے) کو اپنے گروہ کا شعار بنا لیا اور اس کی مخالفت کرنے والوں پر سختی کی انتہاء کر دی۔ راسخ العقیدہ علماء جو عقل کی جگہ قرآن وحدیث پر اعتماد کرتے تھے، اس دور میں حکومت کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنے۔ ①

مامون کا اعتقادی انحراف دو حصوں میں بٹا ہوا تھا: ایک تشیع۔ دوسرا اعتزال۔ تشیع کی طرف میلان کی وجہ یہ ہے کہ وہ ماں کی طرف سے فارسی تھا اور بہت سے اہلِ فارس تشیع کی طرف میلان رکھتے تھے۔ پھر فضل بن سہل جیسا شیعہ اس کا مقرب تھا جو بعد میں اس کا وزیر بنا۔ وہ مامون کے ذہن پر جس قدر حادی ہوتا، کم تھا۔ تشیع سے متاثر ہونے کی بناء پر ایک بار اس نے "متعہ" کے جواز کا حکم جاری کر دیا۔ تاہم قاضی یحییٰ بن اکثم کے سمجھانے سے اس نے وہ حکم واپس لے لیا۔ ② مگر خلقِ قرآن کے مسئلے میں اس نے نہایت تشدد اختیار کیا اور علماء سے جبراً اس عقیدے کی ہم نوائی چاہی۔ ③

رومیوں سے جہاد:

۲۱۴ھ میں قُسطنطینیہ میں قیصر توفیل تخت نشین ہوا جس نے شام کے ساحلی علاقوں پر حملے شروع کر دیے۔ آخرکار مامون الرشید ۲۷ محرم ۲۱۵ھ کو بہت بڑی فوج لے کر سرحدوں کے دفاع کے لیے بغداد سے نکلا اور محاذِ جنگ پر پہنچ گیا۔ رومیوں نے دب کر صلح کر لی مگر جب مامون واپس ہوا تو وہ عہد شکنی کر کے پھر حملے کرنے لگے۔ مامون اسی خطرے کے پیشِ نظر دِمشق میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ۲۱۶ھ میں اس نے جوابی حملہ کیا اور اپنے بھائی معتصم کے ساتھ ایشیائے کوچک میں گھس کر جگہ جگہ رومیوں کو پسپا کیا۔ ④

زبیدہ خاتون کا انتقال۔ زبیدہ کی سیرت وکردار۔ نہرِ زبیدہ:

مامون ان مہمات میں مصروف تھا کہ جمادی الاولیٰ ۲۱۶ھ میں اس کی سوتیلی ماں زبیدہ خاتون بغداد میں وفات پا گئی۔ وہ خلیفہ منصور کے بیٹے جعفر کی نورِ چشم تھی۔ اصل نام اَمۃُ العزیز تھا۔ بچپن میں دادا اس کے ساتھ کھیلتا اور "زبیدہ زبیدہ" کہتا۔ یہی نام مشہور ہو گیا۔ ہارون الرشید نے اس سے ۱۶۵ھ میں نکاح کیا تھا۔ ایسی چہیتی ملکہ تھی کہ ہارون نے عمر بھر دوسرا نکاح نہ کیا۔ زبیدہ کی سو باندیاں تھیں جو سب کی سب قرآن مجید کی حافظات تھیں۔ ان کا کام مسلسل تلاوت کرنا تھا۔ زنانہ محل میں ان کی ہلکی ہلکی صدائے تلاوت ہر وقت سنائی دیتی تھی۔ ۱۸۶ھ میں زبیدہ خاتون حج کے لیے گئی تو وہاں پانی کی کمی کے باعث حاجیوں کی پریشانی دیکھ کر بڑی فکرمند ہوئی۔ اس نے بے پناہ دولت خرچ کر کے طائف کے چشموں سے ایک نہر نکال کر مکہ، منیٰ، مزدلفہ اور میدانِ عرفات تک پہنچائی۔ اس منصوبے پر سترہ لاکھ دینار خرچ ہوئے (جو آج کے لحاظ سے ۵۲ کروڑ ۸۵ لاکھ ڈالر بنیں گے)۔ آج بھی یہ نہر موجود ہے اور ہنگامی حالات میں کام آتی ہے۔ ⑤

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۱/۶۹ ا تا ۱۷۱؛ الاعلام زرکلی: ۱/۱۲۳

② وفیات الاعیان: ۶/۱۵۰ الترجمہ: یحییٰ بن اکثم ③ تاریخ الطبری: ۸/۶۳۱ تا ۶۳۲

④ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۲۱۵ھ، ۲۱۶ھ؛ العبر فی خبر من غبر: ۱/۲۵۹ تا ۲۷۰

⑤ وفیات الاعیان: ۲/۳۱۴؛ الاعلام زرکلی: ۳/۴۲؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۲۱۶ھ؛

مسئلہ خلقِ قرآن۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی گرفتاری

مامون رومیوں کے خلاف مہم کی کمان کے لیے شام کے شہر طرطوس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسی دوران اس نے بغداد کے والی اسحاق بن ابراہیم کو حکم جاری کیا کہ جو علماء معتزلی عقائد کو قبول نہ کریں انہیں عہدوں سے معزول کر دیا جائے اور سخت سزائیں دی جائیں۔ اس سختی نے بڑے بڑے علماء کو مرعوب کر دیا۔ اکثر نے بادلِ نخواستہ مامون کی تائید کر دی۔ علمائے بغداد میں سے صرف امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح رحمہما اللہ ثابت قدم رہے۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ کلام اللہ، رؤیت باری اور اس جیسے مسائل کی صحیح تعبیر وہی ہے جو اسلاف سے چلی آرہی ہے۔ اسی پر اجمالی ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اس سے ہٹ کر فلسفیانہ طرز اختیار کرنا گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے تھے:

"قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں کہتا۔"

مامون کو یہ اطلاع ملی تو ان علماء کو گرفتار کر کے اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا چنانچہ امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح رحمہما اللہ کو مامون کے پاس شام روانہ کر دیا گیا۔ مامون تلوار لیے ان کا منتظر تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتے کی قسم کھا کر کہہ رہا تھا کہ اگر ان علماء نے عقیدہ تبدیل نہ کیا تو وہ انہیں قتل کر دے گا۔ مگر اس کے بعد مامون اچانک بیمار پڑ گیا اور ۱۸ رجب ۲۱۸ھ کو اس کی وفات ہوگئی۔ اس کی عمر ۴۸ سال تھی، اس نے ساڑھے بیس سال تک حکومت کی تھی۔

افسران نے امام احمد اور محمد بن نوح رحمہما اللہ کو واپس بغداد روانہ کر دیا۔ سفر کی مشقت کی وجہ سے محمد بن نوح رحمہ اللہ راستے میں وفات پا گئے۔ امام احمد رحمہ اللہ رمضان ۲۱۸ھ میں واپس بغداد پہنچے تو انہیں قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ ①

عہدِ مامونی پر ایک تبصرہ

مامون بلاشبہ ایک نامور حکمران تھا مگر اس کی وجہِ شہرت اس کی علمی وفنی مہارت اور اخلاقی خوبیاں ہیں۔ درحقیقت وہ حکمران سے زیادہ ایک فلسفی کا ذہن رکھتا تھا۔ بہرکیف وہ فیاض، رحمدل، منصف مزاج اور بنوہاشم کی روایتی غیرت وشجاعت سے آراستہ تھا۔ مگر افسوس کہ اعتزال میں بھٹکنے اور علماء پر تشدد کے باعث اس نے اپنا دامن داغ دار کر لیا۔ ②

❁❁❁

---

① البدایۃ والنہایۃ: سنہ ۲۱۷ھ، ۲۱۸ھ

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۲۲۳، ۲۲۴

معتصم باللہ بن الرشید

ابو اسحاق محمد بن ہارون، المُعْتَصِم

رجب ۲۱۸ھ......تا......ربیع الاوّل ۲۲۷ء

اگست ۸۳۳ء......تا......دسمبر ۸۴۱ء

معتصم باللہ کا اصل نام محمد تھا۔ وہ مامون الرشید کا بھائی تھا اور اس کی وصیت کے مطابق خلیفہ بنا۔ اس نے معتصم باللہ کا لقب اپنایا۔ وہ پہلا حکمران ہے جس نے ایسا لقب اختیار کیا۔ بعد میں تمام عباسی خلفاء نے یہی طرز اختیار کرلیا۔ معتصم علوم وفنون سے عاری اور فنونِ حرب کا دلدادہ تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ اتنا مضبوط تھا اس کے جسم میں دانت نہیں گڑتے تھے۔ قوی سے قوی آدمی کی کلائی کو دو انگلیوں میں دبا کر توڑ سکتا تھا۔ ①

محمد بن قاسم علوی کا خروج:

معتصم کے دور میں حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کے پڑپوتے محمد بن قاسم نے اہلِ خراسان کی ترغیب پر جوز جان سے خروج کیا مگر شکست کھائی اور قیدی بن گئے۔ بعد میں وہ قید سے فرار ہو گئے اور پھر ان کا کوئی نام ونشان نہ ملا۔ ②

ترک افسران کی ترقی:

معتصم کی اپنی تربیت فوجی ماحول میں ہوئی تھی جہاں ترکوں کی بڑی تعداد تھی اس لیے معتصم نے ایرانی اور عرب امراء کو چھوڑ کر ترک امراء اور سپاہ پر اعتماد کیا اور انہی کو اہم عہدے دیے۔ چنانچہ ہر سطح پر ترکوں کا دور دورہ ہو گیا۔ ③

معتصم کے بعد بنوعباس کے اگلے کئی خلفاء ترک امراء کے بل بوتے پر تخت نشین رہے، اور جیسے جیسے خلفاء کمزور پڑتے گئے، ترک امراء کو بالادستی حاصل ہوتی گئی، یہاں تک کہ خلافتِ عباسیہ ترکوں کی زیرِ دست بن گئی۔

نیا شہر......سامرا:

بغداد میں ترکوں کی کثرت کی وجہ سے عوام کو دِقت ہونے لگی؛ کیوں کہ یہ لوگ شہر میں سرپٹ گھوڑے دوڑاتے تھے۔ معتصم نے یہ دیکھ کر ۲۲۱ھ میں بغداد سے ۱۲۵ کلومیٹر شمال مغرب میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک نیا شہر بنوایا

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۴۳، ۲۴۴

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۱۹ھ؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۲۱۹ھ

③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۴۴

جس کا نام "سُرَّ مَن رَأی" (جو دیکھے خوش ہو جائے) تجویز کیا۔ بعد میں یہی لفظ مختصر ہو کر "سامرا" رہ گیا۔ معتصم نے اسی شہر کو دار الخلافہ قرار دیا اور وہیں منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد سات عباسی خلفائ: واثق، متوکل، منتصر، مستعین، معتز، مہتدی اور معتمد نے اسی شہر کو مرکزِ خلافت بنائے رکھا۔ ①

بابک خُرَّمی کا خاتمہ:

معتصم باللہ نے اقتدار سنبھالتے ہی بابک خُرَّمی کی سرکوبی پر توجہ دی جس کا فتنہ پورے ایران میں پھیل چکا تھا۔ بابک کے پیروکار "مُحَمَّرَہ" (سرخ پوش) کہلاتے تھے۔ تین سال تک بابک کے خلاف لڑائی جاری رہی۔ آخر میں معتصم نے اپنے ترک سالار افشین حیدر کو ایک لشکرِ جرار دے کر اس مہم پر بھیجا جس نے رمضان ۲۲۲ھ میں بابک کے فصیل بند مرکز "برزند" کو فتح کر لیا تاہم بابک نے بھاگ کر ایک پادری کے ہاں پناہ لی جس نے انعام کے لالچ میں اسے گرفتار کرا دیا۔ معتصم نے افشین کو اس کارنامے پر گراں قدر انعامات سے نوازا اور بابک کو قتل کرا دیا۔ ②

رومیوں سے جہاد:

بابک خرمی گرفتاری سے پہلے قیصر روم "توفیل" کو عالمِ اسلام پر حملے کے لیے اُکسا چکا تھا۔ چنانچہ ۲۲۳ھ میں "توفیل" نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ اسلامی سرحدوں پر یلغار کر دی۔ بابک کے باقی ماندہ مفرور سرخ پوش بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ قیصر نے مَلَطْیَہ پر قبضہ کر کے ہزاروں مرد و زن گرفتار کیے اور ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ ان قیدیوں میں ایک ہاشمی خاتون بھی تھی، اس نے چیخ کر کہا: "وَا مُعْتَصِمَاہ..." (ہائے معتصم!)

قید سے بچ نکلنے والے کسی شخص نے آ کر یہ دردناک صدا معتصم باللہ کو سنائی۔ وہ اس وقت تخت پر بیٹھا تھا۔ یہ خبر سن کر غیرت اور جوش سے بے حال ہو گیا: "لبیک ...... لبیک" کہتا ہوا تخت سے نیچے اترا اور آواز لگائی: "اَلنَّفِیْرَ اَلنَّفِیْرَ" (چلو جہاد کے لیے۔ چلو جہاد کے لیے۔) اس دوران قیصر کا دھمکی آمیز مراسلہ آن پہنچا جس کے جواب میں معتصم نے فقط اتنا لکھوایا: "جواب تو خود دیکھ لے گا۔ عن قریب کفار کو اپنا انجام معلوم ہو جائے گا۔" ③

۲ جمادی الاولیٰ ۲۲۳ھ کو معتصم لشکر لے کر روانہ ہوا اور اپنے ترک سالاروں: اَفشین، اِیتاخ اور اَشناس کو مختلف سمتوں سے یلغار کا حکم دیا۔ رومیوں کو ہر جگہ پسپا کرنے کے بعد شعبان ۲۲۳ھ میں معتصم عَمُّورِیَہ کی طرف بڑھا جو قیصر کا اہم مرکز تھا۔ قیصر شہر کو ایک نائب کے سپرد کر کے بھاگ نکلا۔ معتصم نے گھمسان کی جنگ کے بعد شہر فتح کر لیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس جنگ میں تیس ہزار دشمن قتل اور اتنے ہی گرفتار ہوئے۔ ④

ترکوں کی بغاوت:

معتصم نے ترک سرداروں کو غیر معمولی اختیارات بخش دیے تھے، جس کے باعث مملکت کے سپہ سالار افشین نے

---

① البلدان للیعقوبی، ص ۵۲ تا ۶۲؛ معجم البلدان: ۱۷۳/۳ ② البدایۃ والنہایۃ: ۲۳۹/۱۴ تا ۲۴۹

③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۲۳ ہجری؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲۸۵/۱۴ ④ البدایۃ والنہایۃ: ۲۸۵/۱۴

خودمختاری کے خواب دیکھنا شروع کر دیے اور اپنے دستِ راست مازیار کے ساتھ مل کر وسیع پیمانے پر بغاوت کی تیاری کر لی تھی مگر ان کا منصوبہ ناکام رہا۔ شعبان ۲۲۶ھ میں افشین کو سزائے موت دے دی گئی۔ اس کے بعد اسحٰق بن یحییٰ کو نیا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔ ①

مسئلہ ”خلقِ قرآن“ پر شدت:

مامون وفات کے وقت معتصم کو ”مسئلہ خلقِ قرآن“ جبراً منوانے کی وصیت کر گیا تھا؛ اس لیے معتصم نے اختیارات سنبھالنے کے بعد اس کے مطابق کارروائی شروع کی اور مامون سے کہیں زیادہ انتہا پسندی کا ثبوت دیا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ مامون کے دور سے گرفتار تھے۔ اس دوران انہیں بار بار ڈرا دھمکا کر کوشش کی گئی کہ وہ اپنے موقف سے دستبردار ہو جائیں اور قرآن مجید کو مخلوق کہہ دیں، مگر امام صاحب کمالِ پامردی سے حق پر جمے رہے۔ آخر رمضان ۲۲۱ ہجری میں معتصم نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو حتمی فیصلے کے لیے دربار میں طلب کیا۔ یہاں معتزلی علماء نے ان سے بحث کی مگر منہ کی کھائی۔ آخر معتصم نے انہیں سرِ دربار اتنے کوڑے لگوائے کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کو جو کوڑے مارے گئے ان میں سے ایک کوڑا اگر کسی ہاتھی کو مارا جاتا تو وہ چیخ مار کر بھاگ جاتا۔ ② امام احمد رحمہ اللہ پر ستم ڈھا کر خود معتصم کو بھی ندامت ہوئی۔ اس نے انہیں آزاد کر دیا۔ امام صاحب تین سال سے زائد مدت قید و بند میں مبتلا رہنے کے بعد سرخروئی کے ساتھ آزاد ہوئے۔ انہوں نے خلیفہ سمیت ان تمام لوگوں کو معاف کر دیا جن سے انہیں ایذا پہنچی۔ امام احمد رحمہ اللہ کی اولوالعزمی اور استقامت نے تاریخ کا دھارا موڑ دیا اور اُمت کو ایک زبردست اعتقادی لغزش میں مبتلا ہونے سے بچا لیا۔ ③

معتصم کی وفات:

معتصم باللہ نے ۸ سال آٹھ ماہ حکومت کر کے اپنے پایۂ تخت سامرا میں ۱۸ ربیع الاوّل ۲۲۷ھ کو وفات پائی۔ ④

معتصم کی زندگی میں آٹھ کا عدد اہم رہا ہے۔ وہ بنو عباس کا آٹھواں خلیفہ تھا، حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ کی آٹھویں پشت سے تھا، اپنے باپ کا آٹھواں بیٹا تھا، اس نے ۴۸ سال عمر پائی، ۲۱۸ھ میں تخت نشین ہوا، آٹھ سال آٹھ ماہ اور آٹھ دن حکومت کی، اس کے آٹھ بیٹے تھے اور آٹھ بیٹیاں، اس نے آٹھ دشمنوں کو قتل کیا اور آٹھ فتوحات حاصل کیں۔ ⑤

❁❁❁

① تاریخ الطبری: سنۃ ۲۲۳ھ، ۲۲۵ھ، ۲۲۶ھ

② تاریخ الخلفاء، ص ۲۳۳؛ تاریخ الاسلام للذہبی: ۱۸/ ۱۱۲، ت تدمری؛ صفوۃ الصفوۃ، ابن جوزی: ۱/ ۳۴۷

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/ ۳۰۳، ۳۰۵؛ تاریخ بغداد: ۱۳/ ۳۲۸، ط العلمیۃ؛ وفیات الاعیان: ۵/ ۲۰۷، ط دار صادر

④ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/ ۲۸۲، ۲۸۳

⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۲۳۳، ط نزار

الواثق باللہ بن معتصم

ہارون بن محمد

ربیع الاوّل ۲۲۷ھ......تا......ذوالحجہ ۲۳۲ھ

دسمبر ۸۴۱ء......تا......اگست ۸۴۷ء

معتصم کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا ہارون، ''الواثق باللہ'' کا لقب اختیار کر کے خلیفہ بنا۔ وہ بھی پکا معتزلی تھا۔ اسی سال عالمِ اسلام کا سب سے بڑا حریف قیصر توفیل فوت ہو گیا تھا، جس کے بعد ایک مدت تک رومیوں کا کوئی حملہ نہ ہوا۔ ①

اس دوران واثق نے سلطنتِ روما کے جیل خانوں میں قید مسلمانوں کو چھڑانے اور بدلے میں نصرانی قیدی دینے کا معاہدہ کیا۔ واثق نے اس دوران حکم دیا کہ جو قیدی معتزلہ کے عقائد کا اقرار کرے اسے لے لیا جائے۔ جو انکار کرے، اسے واپس رومیوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس طرح چار ہزار ۲۶۳ قیدی آزاد ہو کر اپنے گھروں کو واپس پہنچے۔ ②

واثق کے دور میں بھی ترک امراء امورِ حکومت کے مختار رہے۔ سالارِ فوج اشناس نے واثق کے دور میں بہت ترقی کی اور نائب حکومت کا مقام پایا۔ تاہم آخر میں واثق نے احتیاطاً اس کے اختیارات کم کر دیے۔ ③

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی روپوشی اور امام احمد بن نصر کا قتل:

واثق نے آتے ہی علمائے حق کا جینا دوبھر کر دیا اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو شہر بدر کر دیا۔ وہ واثق کی وفات تک روپوشی کی زندگی گزارتے رہے۔ ④

واثق کے دور میں عراق کے نامور محدث اور عابد و زاہد بزرگ احمد بن نصر رحمہ اللہ بغداد میں خروج کی تیاری کرنے لگے تھے۔ مگر ان کے کارکنوں میں نظم و ضبط بالکل نہ تھا، اس لیے حکام کو فوراً خبر ہو گئی۔ احمد بن نصر رحمہ اللہ اور تحریک کے سرکردہ افراد کو فی الفور گرفتار کر لیا گیا۔ واثق نے احمد بن نصر رحمہ اللہ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور سر کاٹ کر بغداد کی عام

① البدایۃ والنہایۃ: ۲۸۹/۱۴؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۲

② البدایۃ والنہایۃ: ۳۱۰/۱۴

③ البدایۃ والنہایۃ: ۲۸۹/۱۴ ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۲

④ تاریخ الاسلام للذہبی: ۱۱۶/۱۸، ت تدمری

شاہراہ پر نصب کرادیا۔ ان کے قتل کا افسوس ناک واقعہ ۲۹ شعبان ۲۳۱ھ کا ہے۔ ①

امام ابوعبدالرحمٰن الازدی رحمہ اللہ کی حق گوئی:

وفات سے کچھ مدت پہلے واثق باللہ کے خیالات میں بھی مثبت تبدیلی آگئی۔ ہوا یہ کہ اس کے جیل خانے میں امام ابوعبدالرحمٰن الازدی رحمہ اللہ بھی قید تھے۔ ایک دن واثق نے انہیں دربار میں بلوایا۔ انہوں نے معتزلی علماء کے پیشوا اور سلطنت کے قاضی القضاۃ احمد بن ابی دُواد کو بحث میں ایسا لاجواب کیا کہ واثق بھی ششدر رہ گیا۔ اس نے امام ابو عبدالرحمن سے معافی مانگی اور انہیں آزاد کردیا۔ واثق کا بیٹا مہتدی کہتا تھا: ''میں نے اسی مجلس میں غلط عقیدے سے توبہ کرلی تھی اور میرا گمان ہے کہ واثق نے بھی اپنی رائے سے رجوع کرلیا تھا۔''

اس طرح علمائے حق کی کوششیں رنگ لا کر رہیں اور معتزلہ کو ایک بار پھر حکومتی ایوانوں میں منہ کی کھانا پڑی۔ ②

واثق کی وفات:

واثق استسقاء ③ کے مرض میں مبتلا ہو کر ۲۴ ذوالحجہ ۲۳۲ھ کو فوت ہوا۔ اس نے پانچ سال نو ماہ حکومت کی اور ۳۶ سال عمر پائی۔ ④

❁❁❁

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۴/۳۱۰تا۳۱۹

② کتاب الاعتصام للشاطبی: ۱/۳۰۸تا۳۱۱ط دار ابن عفان؛ الشریعۃ للآجری: ۱/۴۵۳، ط دار الوطن؛

③ استسقاء سے مراد ایسا مرض ہے جس میں پانی رگوں میں سرایت کرنے کی بجائے پیٹ میں بھر جاتا ہے۔ پیٹ اس کے باعث پھول جاتا ہے اور انسان کو بار بار سخت پیاس لگتی ہے۔ اس مرض کو اُردو میں ''جلندھر'' کہتے ہیں۔

④ البدایۃ والنہایۃ: ۱۴/۳۲۵،۳۲۶،۳۳۰

المتوکل علی اللہ

جعفر بن محمد المعتصم

ذوالحجہ ۲۳۲ھ......تا......شوال ۲۴۷ھ

اگست ۸۴۷ء......تا......دسمبر ۸۶۱ء

واثق کے انتقال کے بعد اس کا بھائی جعفر بن معتصم ''متوکل علی اللہ'' کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ وہ معتزلہ، فلاسفہ اور شیعوں کا سخت مخالف تھا۔ اس نے حکومتی صفوں سے بدعتی اور بدعقیدہ افراد کو چن چن کر نکال دیا اور گزشتہ خلفاء کے دور میں بدعقیدگی کی مخالفت کے باعث قید کیے گئے لوگوں کو آزاد کر دیا۔ اس نے تمام صوبوں میں احکام بھیج دیے کہ سنتِ نبویہ کی اشاعت اور اہلِ سنت کی حمایت کی جائے۔ اس نے عقیدۂ خلقِ قرآن پر پابندی عائد کر دی اور معتزلی وفلسفیانہ نظریات کی تردید کے لیے محدثین کی خوب حوصلہ افزائی کی اور انہیں انعامات سے نوازا۔ اس طرح اعتزال اور فلسفے کو پسپائی ہوئی۔ علمی مجالس میں یہ نظریات اگرچہ باقی تھے مگر ان کا زور وشور کم ہو گیا تھا۔

معتصم اور واثق کے دور میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے فتاویٰ اور درس پر پابندی تھی، متوکل نے ہر پابندی اٹھا دی اور ان کے اعزاز واکرام میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ معتزلہ کے پیشوا قاضی احمد بن ابی دُواد کو برطرف کر کے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مشورے سے نامور عالم دین یحییٰ بن اکثم رحمہ اللہ کو قاضی القضاۃ مقرر کر دیا گیا۔ ①

قاضی احمد بن ابی دُواد نے گزشتہ ادوار میں علمائے حق کو جی بھر کے مشقِ ستم بنایا تھا۔ اب مکافاتِ عمل کے دور میں پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ پھر وہ عہدے سے معزول ہوئے پھر ان کی دولت اور جاگیروں کو ضبط کر لیا گیا۔ پھر ان کے بیٹے ابوالولید کو گرفتار کیا گیا۔ ذوالحجہ ۲۳۹ھ میں ابوالولید فوت ہوا۔ محرم ۲۴۰ھ میں ابن ابی دُواد کا انتقال ہو گیا۔ ②

کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مزار پر زائرین طرح طرح کی بدعات کیا کرتے تھے۔ ۲۳۶ھ میں متوکل نے نہ صرف وہاں زائرین کی آمد پر سخت پابندی عائد کر دی بلکہ مقبرے کو منہدم کرا کے بے نشان کر دیا۔ اس اقدام کو نہ صرف شیعہ بلکہ سنی علماء نے بھی ناپسند کیا اور اس اقدام سے متوکل کی ساکھ کو بڑا نقصان پہنچا۔ ③

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۵۳، ۲۵۵، ۲۵۶؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۲/ ۳۱، ۳۲، ۳۶؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/ ۳۵۰

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/ ۳۳۵، ۳۳۹؛ الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیۃ، ص ۹۲، ۹۱

③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۵۴؛ تاریخ الطبری: سنۃ ۲۳۶ ہجری

جہادی مہمات:

متوکل کے دور میں ۲۳۸ھ میں رومی بحریہ نے مصر کے شہر دمیاط پر حملہ کر کے بہت سے مسلمانوں کو قیدی بنالیا۔ مگر متوکل کے نائب علی بن یحییٰ نے جوابی حملہ کیا اور رومیوں کے جزائر سے بہت سے لوگوں کو قیدی بنالایا۔ مجبوراً رومی حکومت قیدیوں کے تبادلے پر آمادہ ہوگئی اور یوں مسلمان قیدی چھڑا لیے گئے۔

کچھ مدت بعد رومی بحریہ نے ساحل پر دوبارہ اسی قسم کا حملہ کیا۔ متوکل نے پہلے علی بن یحییٰ کو جوابی کارروائی کا حکم دیا اور پھر ۲۴۴ھ میں خود دار الخلافہ سامرا سے نکلا اور شام میں ڈیرے ڈال دیے۔ دو ماہ بعد خلیفہ کو واپس عراق آنا پڑا مگر امیر بُغا کبیر کی قیادت میں رومی مقبوضات پر کارروائیاں جاری رہیں۔ ۲۴۶ھ میں متوکل نے ایک بہت بڑی فوج کو کئی سمتوں سے رومی مقبوضات کی طرف بھیجا۔ آخر رومیوں نے صلح کر لی اور امن وامان قائم ہو گیا۔ ①

متوکل کا قتل:

۲۳۵ھ میں متوکل نے اپنے تین بیٹوں: منتصر، معتز اور مؤید کو یکے بعد دیگرے جانشین طے کر دیا تھا ② مگر اس کی چہیتی ملکہ قبیحہ اپنے بیٹے معتز کو جانشین دیکھنا چاہتی تھی۔ ③ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ منتصر تشیع واعتزال کی طرف مائل تھا جبکہ متوکل ردِّ تشیع میں مبالغے کے باعث ناصبی رجحانات کا حامل ہو گیا تھا اور اس کی مجلس میں کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تنقیص بھی کرتے رہتے تھے۔ منتصر نے اس پر احتجاج کیا تو متوکل نے اسے طمانچے لگوا کر معزول کر دیا۔ ④ منتصر یہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے کچھ ترک امراء کو ساتھ ملایا اور ۵ شوال ۲۴۷ھ کو متوکل پر حملہ کرا کے اسے قتل کرا دیا۔ ⑤

متوکل کی عمر چالیس سال تھی۔ اس نے چودہ سال دس ماہ حکومت کی۔ اس دور میں کئی زلزلوں، آسمانی آفتوں اور ناگہانی حوادث کا ظہور ہوا۔ شاید یہ اشارے تھے کہ خلافتِ اسلامیہ پر ایک طویل دورِ زوال طاری ہونے کو ہے۔ ⑥

اخلاق وکردار اور کارنامے:

متوکل سخاوت میں مشہور تھا۔ کہا جاتا تھا کہ شعراء کو جتنا اس نے نوازا اس کی مثال ماضی میں کہیں نہیں ملتی۔ متوکل نے تعمیراتی کام بھی کرائے مثلاً: ۲۴۵ھ میں دو لاکھ دینار خرچ کر کے جعفریہ نامی ایک نیا شہر آباد کیا۔ ⑦

وہ عباسیوں کے دورِ عروج کا آخری خلیفہ تھا۔ اس کے بعد خلافتِ عباسیہ بڑی تیزی سے زوال پذیر ہوئی، اُمت مسلمہ میں انتشار وافتراق کے دروازے کھل گئے اور خود مختار حکمرانوں نے ہر طرف اجارہ داری قائم کر لی۔

❁❁❁

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۴۴ھ تا ۲۴۶ھ

② تاریخ الطبری: ۹ ص ۱۷۷

③ العبر فی خبر من غبر: ۱ ص ۳۵۳؛ تاریخ الخلفاء: ص ۲۵۵

④ تاریخ ابن خلدون: ۳ ص ۳۷۹ ⑤ تاریخ الطبری: ۹ ص ۲۲۷

⑥ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۲۴۷ھ ⑦ تاریخ الخلفاء، ص ۲۵۴؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۴۵ھ

مشق

(برائے دورِ ہارون الرشید تا متوکل عباسی)

سوالات کے جوابات دیجیے:

❶ ہارون الرشید کا دور عباسیوں کا "عہدِ زرّیں" کیوں کہلاتا ہے؟

❷ برامکہ کون تھے، ان کے عروج وزوال پر کم از کم بیس سطریں لکھیے۔

❸ مامون الرشید اور امین الرشید میں اختلافات کیوں ہوئے اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

❹ مسئلہ خلقِ قرآن پر مامون اور معتصم کی شدت کے بالمقابل امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا کیا کردار رہا؟

❺ معتصم باللہ نے سامرا کو دارالخلافہ کیوں بنایا؟

❻ معتصم باللہ کے رومیوں کے خلاف جہاد اور عموریہ کی فتح پر مختصر مضمون لکھیے؟

❼ واثق باللہ کے معتزلی خیالات میں تبدیلی کس طرح آئی؟

❽ متوکل عباسی کے اپنے ولی عہد منتصر سے کیا اختلافات تھے؟

عملی کام:

- ایک چارٹ پر سفاح سے متوکل تک تمام خلفاء کے اصل نام اور القاب کو خوش خط لکھیے۔
- پنسل اور رنگوں سے ایک تمثیلی تصویر بنائیے جس میں بغداد کی گلیوں اور عمارتوں کی منظر کشی کی گئی ہو۔

کتب برائے مطالعہ:

- المامون، علامہ شبلی نعمانی
- تاریخ ابن خلدون: ہارون تا متوکل
- الامام احمد بن حنبل، حیاتہ وعصرہ وآراؤہ، از محمد ابوزہرہ

دوسرا باب

دولتِ عباسیہ:

دورِ زوال

منتصر کی مسند نشینی سے مستعصم کے قتل تک

(۲۴۷ھ تا ۶۵۶ھ)

تقریباً ۴۰۹ سال

اہداف:

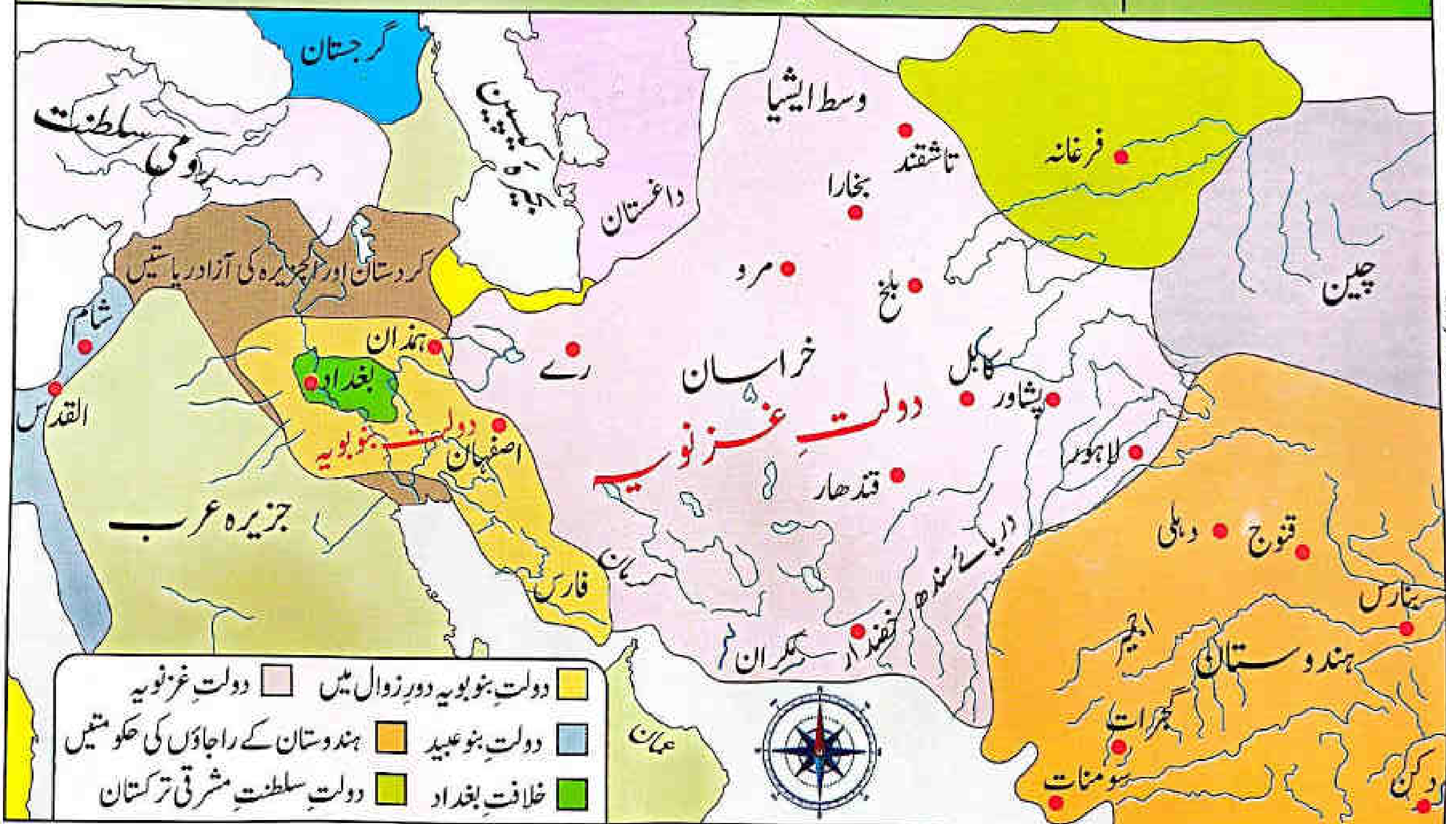
یہ باب پڑھ کر آپ ان شاء اللہ اس قابل ہوں گے کہ:

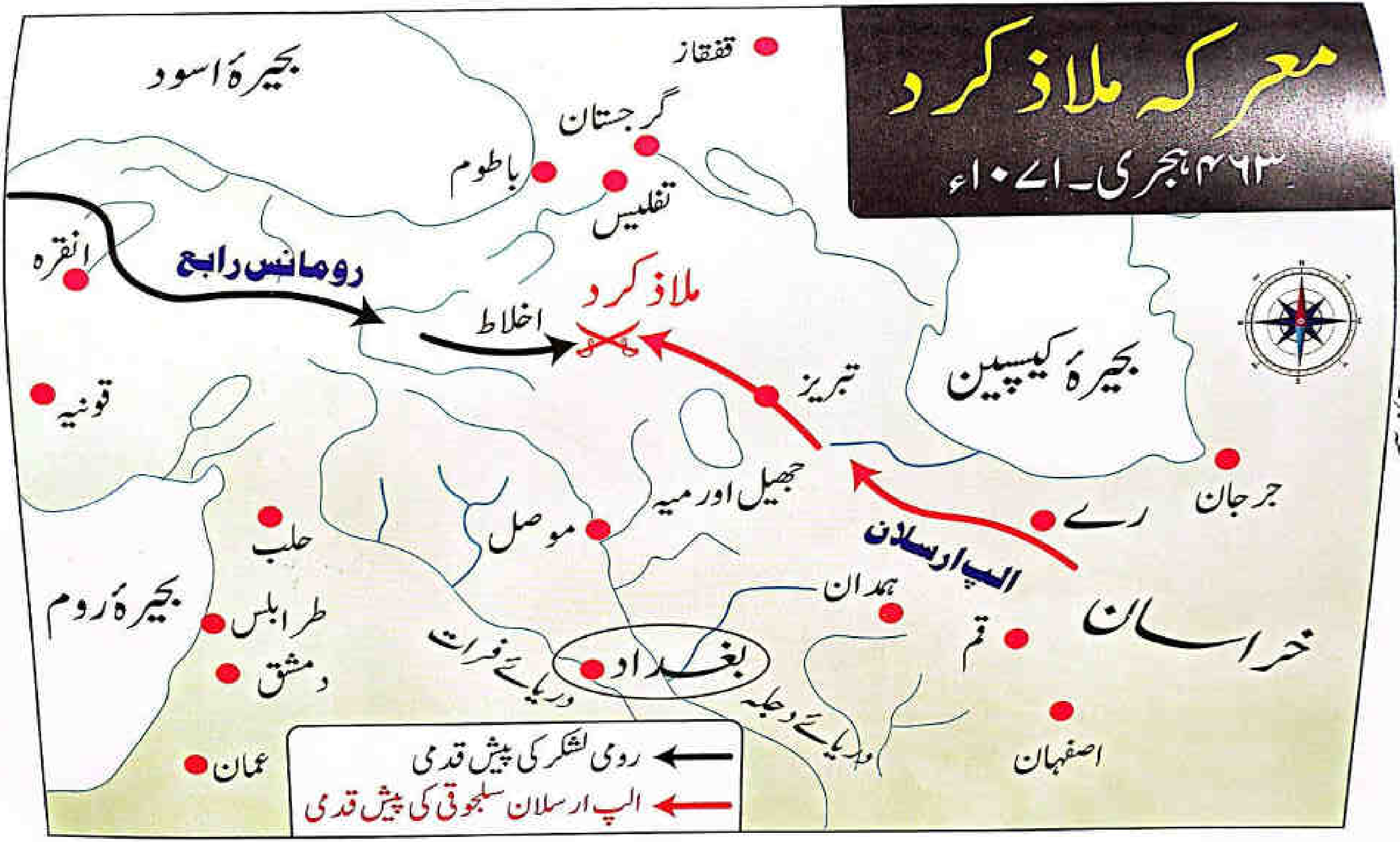
① دورِ زوال کے عباسی خلفاء سے اجمالی طور پر متعارف ہو سکیں۔

② ان تحریکوں اور عوامل سے شناسا ہوں جن کے باعث دولتِ عباسیہ کمزور اور تقسیم ہوئی۔

③ خلافتِ بغداد سے بنو بُویہ، غزنوی سلطنت اور سلجوقی سلطنت کے تعلقات سے واقف ہو سکیں۔

عالمِ اسلام کا نقشہ ۵ ویں صدی ہجری کے آغاز میں




معرکہ ملاذ کرد
۴۶۳ ہجری۔ ۱۰۷۱ء
بحیرۂ اسود
قفقاز
گرجستان
باطوم
تفلیس
انقرہ
رومانس رابع
ملاذ کرد
اخلاط
تبریز
بحیرۂ کیسپین
قونیہ
جھیل ارمیہ
جرجان
رے
موصل
حلب
الپ ارسلان
ہمدان
بحیرۂ روم
طرابلس
قم
خراسان
دریائے فرات
بغداد
دمشق
دریائے دجلہ
اصفہان
عمان
رومی لشکر کی پیش قدمی
الپ ارسلان سلجوقی کی پیش قدمی

(یونٹ:2.9)

بنوعباس۔ عہدِ زوال کے چھ مراحل

بنوعباس کا عہدِ زوال تقریباً ۴۰۹ برس طویل تھا۔ اس زمانے کو ہم چھ مراحل میں تقسیم کر سکتے ہیں:

1. ترکوں کا تسلط...... منتصر کے قتل سے معتمد کی معزولی تک۔ (۲۴۷ھ تا ۲۷۹ھ) تقریباً ۳۲ سال
2. وقارِ خلافت کی بحالی کا عارضی دور...... مُعتَضِد کی خلافت سے مکتفی کے انتقال تک (۲۷۹ھ تا ۲۹۵ھ) ۱۷ سال
3. انتشار اور اضطراب کا دور...... مقتدر کی خلافت سے متقی تک۔ (۲۹۵ھ تا ۳۳۴ھ) ۳۹ سال
4. بنوبُوَیہ کا تسلط...... المطیع سے القائم تک (۳۳۴ھ تا ۴۵۰ھ) ۱۱۶ سال
5. خلافتِ عباسیہ سلجوقی سلاطین کے سائے میں...... القائم سے المقتفی تک (۴۵۰ھ تا ۵۴۷ھ) ۹۷ برس
6. خلافت کی آزادانہ حیثیت کی بحالی اور پھر تباہی۔ ۵۴۷ھ تا ۶۵۶ھ (۱۰۹ برس)

پہلا مرحلہ: اس میں ۳۲ برس تک ترکوں کا خالص تسلط رہا۔ اس دوران خلافت زوال پذیر رہی۔ خلفاء کا پایۂ تخت سامرا تھا جہاں ترکوں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ نظامِ مملکت ابتر تھا۔ علوی مسلسل خروج کر رہے تھے۔ ایوانِ اقتدار میں ترک ہی غالب تھے۔ وہ ایک خلیفہ کو اتارتے اور دوسرے کو بٹھاتے۔ ضرورت سمجھتے تو قتل بھی کر ڈالتے۔ اس دوران صرف مہتدی باللہ میں حکمرانی کی آن بان تھی مگر ترکوں کے آگے وہ بھی بے بس رہا اور انہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اس دور کا سب سے بڑا فتنہ "علی بن محمد" (صاحب الزنج) کا خروج تھا۔ اس بدبخت نے علوی ہونے کا دعویٰ کر کے ہزاروں لوگوں کو ساتھ ملا لیا اور چودہ سال تک بصرہ سمیت عراق کے اکثر حصے پر قابض رہا۔ لاکھوں مسلمان اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ آخر کار ۲۶۷ھ میں خلیفہ معتمد کے بھائی مُوَفّق اور اس کے بیٹے ابوالعباس نے جو بعد میں مُعتَضِد باللہ کے لقب سے خلیفہ بنا، فوج کشی کر کے تین سال کی مسلسل لڑائیوں کے بعد اس کی سرکوبی کی۔

اس دور میں خلافتِ عباسیہ کا سیاسی جغرافیہ بھی بدل گیا۔ بعض صوبے مرکز سے الگ ہو کر خود مختار ہو گئے۔ مراکش میں آزاد دولتِ ادارسہ، تیونس میں باج گزار دولتِ اغالبہ اور خراسان میں وفادار دولتِ طاہریہ تو پہلے ہی قائم ہو چکی تھیں۔ ان ۳۲ سالوں میں شام اور مصر بھی ہاتھ سے نکل گئے اور وہاں دولتِ طولونیہ قائم ہو گئی۔ وسطِ ایشیا میں دولتِ سامانیہ اور خراسان میں دولتِ صَفّاریہ نے جنم لے کر دولتِ طاہریہ کا خاتمہ کر دیا۔ فارس اور عراق کا خاصا حصہ بھی ایک طویل مدت تک زنجی شورش پسندوں کے پاس رہا۔

دوسرا مرحلہ: یہ تقریباً سترہ سال کا تھا۔ اس میں مُعتَضِد باللہ کی جرأت و بصیرت سے خلفاء کے اختیارات خاصی

حد تک بحال ہو گئے۔ سامرا کی جگہ بغداد پھر مرکزِ خلافت بن گیا اور امورِ مملکت سدھرنے لگے۔ تاہم یہ مرحلہ مختصر رہا۔

تیسرا مرحلہ: یہ تقریباً ۳۸ برس کا تھا۔ جو نہایت اضطراب وانتشار کا تھا۔ اس میں سیاسی ابتری بڑھتی چلی گئی۔ ان ۳۸ سالوں میں ہر طرف باطل فرقوں کا غلبہ تھا جو کسی نہ کسی لحاظ سے رافضیت کے مختلف روپ تھے۔ افریقہ اور مصر پر بنوعبید، حجاز پر قرامطہ اور بغداد سمیت پورے ایران وعراق پر آلِ بُوَیہ قابض ہو گئے۔

چوتھا مرحلہ: چوتھا مرحلہ تقریباً ۱۱۶ سال کو محیط تھا۔ یہ خلفاء کی انتہائی زبوں حالی اور منصبِ خلافت کی حد درجہ پامالی کا تھا۔ اس مدت میں خلفائے بنوعباس دَیلَم کے بُویہی امراء کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہے۔ ان امراء بنوبُوَیہ نے خلفاء کو یرغمال بنالیا اور ان کے اختیارات سلب کر لیے۔ ایک طویل مدت بعد خلیفہ القادر نے اپنی ہمت اور سلطان محمود غزنوی کی پشت پناہی کے باعث اپنے اختیارات کسی حد تک بحال کرالیے اور خلیفہ کی حیثیت پہلے سے بہتر ہو گئی۔

پانچواں مرحلہ: یہ مرحلہ ۹۷ برس طویل تھا جو بنوبُویہ کے خاتمے اور القائم باللہ کی دوبارہ تخت نشینی سے شروع ہوا۔ اس مرحلے میں سلجوقی ابتداءً خلفاء کے محافظ رہے پھر انہوں نے خلفاء کو دبانا شروع کر دیا مگر اس بار خلفاء نے جھکنا قبول نہیں کیا جس سے سلاطین اور خلافتِ بغداد میں کش مکش شروع ہو گئی جو تقریباً ۷۰ برس تک جاری رہی۔ آخر سلطان مسعود کی موت اور سلطان سنجر کی ترکانِ غز کے ہاتھوں گرفتاری کے ساتھ سلجوقیوں کا دم خم ختم ہو گیا۔

چھٹا مرحلہ: سلجوقیوں کے زوال کے بعد خلافتِ عباسیہ کی آزادانہ حیثیت بحال ہو گئی۔ یہ زمانہ ۱۰۹ برس تک طویل رہا۔ اگرچہ اب خلافت پہلے کی طرح وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی نہیں تھی مگر اس کی دولت وثروت اور شان وشوکت ایک حد تک لوٹ آئی تھی۔ اس دور میں عراق اور شام میں اتابک امراء کا اقتدار قائم تھا۔ کچھ مدت بعد مصر میں ایوبی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی جو چند سالوں بعد شام کو بھی محیط ہو گئی۔ اتابک اور ایوبی امراء نے خلفاء کا احترام قائم رکھا اور ان پر مسلط ہونے کی کوشش نہ کی۔ چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں خراسان اور وسطِ ایشیا کی خوارزم شاہی سلطنت نہایت طاقتور ہو گئی اور اس نے سلاجقہ کی طرح بغداد پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش بھی کی جس کے باعث دونوں مملکتوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے۔ اسی دور میں چین سے تاتاری حکمران چنگیز خان کا ظہور ہوا اور خلفائے بغداد نے خوارزم کے مقابلے میں تاتاریوں سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ ہمسایہ حکومتوں سے دشمنی، غلط سیاسی فیصلوں، جہاد سے گریز اور غداروں کی سازشوں کی وجہ سے خلافت غیر محسوس طور پر تباہی کی جانب بڑھتی رہی یہاں تک کہ تاتاری حملہ آوروں نے اسے مٹا ڈالا۔ اس اجمالی جائزے کے بعد ہم بنوعباس کے دورِ زوال کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

❀❀❀

اَلْمُنْتَصِرُ بِاللّٰہ

محمد بن جعفر المتوکل

شوال ۲۴۷ھ تا ربیع الآخر ۲۴۸ھ (دسمبر ۸۶۱ء تا مئی ۸۶۲ء)

منتصر سخی، دلیر اور باصلاحیت خلیفہ تھا مگر اس نے اقتدار کی خاطر باپ کو قتل کیا تھا تو بھائیوں کا بھلا کیا لحاظ کرتا، لہٰذا تخت نشین ہو کر اپنے بھائیوں معتز اور مؤید کو بھی ولی عہدی سے استعفاء دینے پر مجبور کر دیا۔ وہ تشیع کی طرف مائل تھا۔ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقبرے کی زیارت کو بحال کر دیا۔ اس کا دورِ اقتدار مختصر رہا۔ متوکل کو قتل کر کے ترکوں کی بے باکی حد سے بڑھ چکی تھی، آخر بُغا کبیر اور وصیف ترکی نے جو نہایت بارسوخ ترک افسران تھے اور متوکل کے قتل میں پیش پیش تھے، فقط چھ ماہ بعد منتصر کے خلاف بھی سازش کی اور ان کے کہنے پر شاہی طبیب نے نئے خلیفہ کو پچھنے لگانے کے لیے زہر آلود نشتر استعمال کیا۔ منتصر کے جسم میں زہر پھیل گیا اور ۵ ربیع الآخر ۲۴۸ھ کو وہ چل بسا۔ ①

❁❁❁

اَلْمُسْتَعِیْنُ بِاللّٰہ

احمد بن محمد المعتصم

ربیع الآخر ۲۴۸ھ تا محرم ۲۵۲ھ (مئی ۸۶۲ء تا فروری ۸۶۶ء)

منتصر کو مارنے کے بعد ترک امراء نے خلیفہ معتصم کے بیٹے احمد کو خلیفہ بنایا جس نے مستعین باللہ کا لقب اپنایا۔ وہ نیک مگر نہایت کمزور حکمران تھا۔ اس کے دور میں رومیوں نے سرحدوں پر حملے شروع کر دیے۔ ۱۵ رجب ۲۴۹ھ کی ایک جنگ میں مسلمانوں کو بہت بڑی شکست ہوئی جس سے مضطرب ہو کر عوام نے جگہ جگہ ہنگامے شروع کر دیے۔ ②

علویوں کا خروج:

اس دور میں علویوں یا علویوں کی طرف منسوب لوگوں نے جابجا بغاوتیں کیں۔ ۲۵۰ھ میں ابوالحسین (یحییٰ بن عمر بن یحییٰ) نے کوفہ میں خروج کیا۔ ۲۵۱ھ میں تین علوی کھڑے ہوئے: کوفہ میں حسین بن محمد، مکہ میں اسماعیل بن یوسف اور قزوین میں حسین بن احمد کوکبی نے خروج کیا۔ مگر آخر کار سب کو شکست ہوئی۔ تاہم یہ تینوں علوی گرفتار نہیں ہو سکے۔ ③

مستعین کا قتل:

اس دوران خلیفہ مستعین ترک امراء سے بددل ہو کر محرم ۲۵۱ھ میں سامرا سے بغداد منتقل ہو گیا۔ ترک امراء نے اسے واپس بلایا مگر وہ نہ مانا۔ آخر ترکوں نے متوکل کے بیٹے معتز باللہ کو خلافت کے لیے کھڑا کر کے مستعین سے جنگ

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۴۷ھ، ۲۴۸ھ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۰؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/۳۵۰

② تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۱؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۴/۳۶۸ تا ۳۷۲ ③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۱؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۴/۳۶۸ تا ۳۷۲

شروع کردی۔ مستعین نے مجبور ہو کر ۴ محرم ۲۵۲ھ کو استعفیٰ دے دیا اور جان کی امان کے وعدے پر معتز باللہ کی بیعت کرلی مگر معتز نے اس معاہدے کا کوئی پاس نہ کیا اور اسے نو ماہ تک قید رکھنے کے بعد ۳ شوال ۲۵۲ھ کو قتل کرادیا۔ ①

❁❁❁

اَلْمُعْتَزّ باللہ

محمد بن جعفر المتوکل

محرم ۲۵۲ھ تا رجب ۲۵۵ھ (فروری ۸۶۶ء تا جولائی ۸۶۹ء)

معتز ۱۹ برس کی عمر میں مسندِ خلافت پر بیٹھا مگر اس دور کے دو سب سے نامور ترک امراء: وصیف ترکی اور بُغا صغیر اس پر مسلط رہے۔ وہ خلیفہ سے منہ مانگی رقمیں مانگتے تھے یہاں تک کہ خزانہ خالی ہوگیا۔ جب معتز مزید رقم دینے سے عاجز آگیا تو ترک امراء نے ۲۷ رجب ۲۵۵ھ کو اسے مار پیٹ کر معزول کردیا اور کچھ دنوں بعد اسے قتل کردیا۔ معتز کی مدتِ حکومت دو سال دس ماہ تھی۔ ②

مصر میں دولتِ طولونیہ کا قیام

اس دور میں احمد بن طولون نے مصر میں خود مختار حکومت قائم کرلی جو ''دولتِ طولونیہ'' کہلائی۔ احمد بن طولون نے ایسے وقت میں شام اور مصر کو سنبھال کر رومیوں کے تسلط سے بچایا جب خلافتِ عباسیہ سرحدوں کی حفاظت سے عاجز آچکی تھی۔ خراسان کی ''دولتِ طاہریہ'' اور تیونس کی ''دولتِ اغالبہ'' کی طرح یہ حکومت بھی عباسیوں کی وفادار تھی جہاں خطبے میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا اور خلیفہ کو سالانہ خراج بھیجا جاتا تھا۔ یہ خود مختار حکومت ۲۹۲ھ تک قائم رہی۔ ③

دولتِ صَفّاریہ کا قیام:

معتز کے دور میں خراسان میں دولتِ صَفّاریہ قائم ہوئی جس کا بانی یعقوب بن لیث صَفّاری تھا۔ اس نے ۲۵۳ھ میں اپنی آزاد حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' اس حکومت کا شعار تھا۔ ④

❁❁❁

اَلْمُهْتَدِی بِاللہ

محمد بن ہارون الواثق

رجب ۲۵۵ھ تا رجب ۲۵۶ھ (جولائی ۸۶۹ء تا جولائی ۸۷۰ء)

ترکوں نے معتز کی موت سے پہلے خلیفہ واثق کے بیٹے محمد کو بغداد سے سامرا بلوا کر امورِ خلافت اسے تفویض کردیے

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۱؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۳/۳۷۸ تا ۳۹۰

② تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۲؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/۳۶۵، ۳۶۶

③ تاریخ ابن خلدون: ۳/۳۸۶، ۳۸۷؛ التاریخ الاسلامی، محمود شاکر: ۶/۱۰۷ ...

تھے۔ ۲۷ رجب ۲۵۵ھ کو وہ مہتدی باللہ کے لقب سے مسند نشین ہوا۔ وہ عابد و زاہد اور متقی انسان تھا۔ عمر بن عبدالعزیز اس کی پسندیدہ شخصیت تھے اور وہ ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا تھا۔ اس نے گزشتہ خلفاء جیسی شان و شوکت ترک کر دی تھی۔ ہمیشہ نفلی روزے رکھتا اور نہایت سادہ زندگی گزارتا تھا۔ کھلی کچہری لگاتا تھا اور عوام کے مسائل سنتا تھا۔ ①

وہ تُرک امراء سے نہ دبا اور منصبِ خلافت کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر ترک امراء نے سازشیں شروع کر دیں اور آخر قصرِ خلافت پر حملہ کر دیا۔ مہتدی بڑی دلیری سے لڑا مگر آخر میں گرفتار ہو گیا اور قتل کر دیا گیا۔ یہ ۱۶ رجب ۲۵۶ھ کا واقعہ ہے۔ اس نیک حکمران کی خلافت فقط ساڑھے گیارہ ماہ تک رہی۔ ②

❁❁❁

اَلْمُعْتَمِدعَلَی اللّٰه

احمد بن جعفر المتوکل

رجب ۲۵۶ھ تا اواخرِ محرم ۲۷۹ھ (جولائی ۸۷۰ء تا مارچ ۸۹۲ء)

تُرک امراء نے متوکل کے ایک بیٹے احمد کو خلافت سونپ دی۔ وہ برائے نام خلیفہ تھا اور عیش و عشرت میں منہمک رہتا تھا۔ وہ ۲۳ برس تک خلیفہ رہا حالانکہ اس سے پہلے ۹ سالوں میں پانچ خلفاء تبدیل ہوئے تھے۔ ③

دولتِ طالبیہ طبرستان:

۲۵۰ھ میں یحییٰ بن عمر زیدی نے خروج کر کے جان کی بازی ہار دی مگر اسی سال حسن بن زید طالبی نے طبرستان پر قبضہ کر کے "دولتِ زیدیہ طالبیہ" قائم کر لی۔ ۲۵۶ھ میں علی بن زید نے کوفہ پر قبضے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ ④

صاحب الزنج علی بن محمد کا فتنہ:

معتمد کے دور میں علی بن محمد نامی ایک فتنہ پرور اور مکار شخص نے جھوٹی کرامتوں اور شعبدہ بازیوں کے ذریعے ہزاروں لوگوں کو گمراہ کیا۔ اس کے پیروکار زیادہ تر حبشی غلام تھے، اس لیے اسے "صاحب الزنج" (حبشیوں کا سردار) کہا جاتا تھا۔ وہ اپنی جوشیلی تقاریر سے ایرانیوں اور غلاموں کو مشتعل کر کے حکومت سے لڑاتا رہا۔ وہ مسلمانوں کا قتل عام کراتا اور عورتوں کو باندیاں بناتا رہا۔ وہ شیعانِ علی کو ساتھ ملانے کے لیے خود کو سید ظاہر کرتا تھا مگر یہ دعویٰ بالکل جھوٹا تھا۔ ⑤

۲۶۱ھ میں اس نے اہواز پر حملہ کر کے پچاس ہزار مسلمانوں کو قتل اور چالیس ہزار مرد و زن کو قیدی بنایا۔ ⑥

آخر کار ۲۶۷ھ میں خلیفہ معتمد کے بھائی مُوَفّق نے اپنے ۲۵ سالہ بیٹے احمد ابو العباس (جو بعد میں مُعتَضِد باللہ کے

---

① سیر اعلام النبلاء: ۱۲/ ۵۳۵ تا ۵۳۸؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۴/ ۵۲۳؛ المنتظم: ۱۲/ ۸۲ تا ۸۳

② الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۵۵ھ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۴/ ۵۱۹؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۳۷۲، ۳۷۳؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۳

③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۳ تا ۲۶۷ ④ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۵۰ھ، سنۃ ۲۵۶ھ

⑤ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۲۵۷ھ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۴/ ۵۱۲ تا ۵۱۳ ⑥ البدایۃ والنہایۃ: ۱۴/ ۵۳۵ تا ۵۵۵

لقب سے خلیفہ بنا) کو دس ہزار گھڑسوار دے کر اس دجال کے خلاف بھیجا اور خود ایک بڑا لشکر لے کر پیچھے روانہ ہوا۔ اس لشکر نے تین سال تک کی مہم جوئی اور طویل محاصروں کے بعد صاحب الزنج کے مراکز کو مسخر کرلیا۔ صاحب الزنج ایک علاقے سے دوسرے کی طرف فرار ہوتا رہا مگر آخر کار ۲۷۰ھ میں ایک معرکے کے دوران وہ مارا گیا۔ ①

رومیوں کے حملے:

اس دور میں رومی ہر دوسرے تیسرے سال عالم اسلام کی سرحدوں پر حملے کرکے کبھی ایک دو قلعوں پر قبضہ کر لیتے اور کبھی لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے۔ ۲۷۰ھ کو ایک لاکھ رومیوں نے شام کے شمالی شہر طرطوس پر حملہ کیا مگر اسے شکستِ فاش ہوئی۔ یعنی اس گئے گزرے دور میں بھی مسلمانوں کی قوتِ مزاحمت زندہ تھی۔ ②

دولتِ سامانیہ:

۲۶۱ھ میں وسطِ ایشیا میں امیر نصر بن احمد سامانی نے اپنی حکومت قائم کی جس میں خلافتِ عباسیہ کا خطبہ قائم رہا۔ یہ حکومت لگ بھگ سوا صدی تک چلی۔ ③

ولی عہد کی تبدیلی:

معتمد کا بیٹا جعفر کم سن تھا، اس لیے معتمد نے اپنے بھتیجے ابوالعباس احمد کے مطالبے پر اُسے ولی عہد قرار دے دیا۔ اس فیصلے کے چند ماہ بعد ۱۸ رجب ۲۷۹ھ کو معتمد کا انتقال ہوگیا۔ ④

❁❁❁

اَلمُعتَضِد باللّٰہ

احمد بن طلحة المُوَفق بن المتوكل

محرم ۲۷۹ھ تا ربیع الآخر ۲۸۹ھ (مارچ ۸۹۴ء تا اپریل ۹۰۲ء)

سابق خلیفہ معتمد نے اپنے بھائی مُوَفّق کے بیٹے ابوالعباس احمد کو ولی عہد بنایا تھا۔ وہ مُعتَضِد باللہ کا لقب اپنا کر ۱۹ رجب ۲۷۹ھ کو مسند نشین ہوا۔ وہ بیدار مغز اور حوصلہ مند تھا۔ اس نے سامرا کو چھوڑ کر قدیم دارالخلافہ بغداد میں جا کر قیام کیا اور اس کی مرکزی حیثیت کو بحال کر دیا۔ یوں اس نے ترکوں کے دباؤ کو کم کر کے مسندِ خلافت کو با اختیار بنا دیا۔ مؤرخین اسے ''سفّاحِ ثانی'' کہتے ہیں؛ کیوں کہ اس نے دم توڑتی خلافتِ عباسیہ کو دوبارہ قائم کیا تھا۔ ⑤

---

① البدایة والنهایة: ۵۳۰/۱۳ تا ۱۸۶؛ سیر، خبر من غبر: ۳۸۰/۱ تا ۳۸۷

② البدایة والنهایة: ۵۳۷/۱۳، ۵۳۶، ۵۶۹، ۵۸۰ تا ۵۸۶، ۵۸۷

③ الاعلام زرکلی: ۲۳/۳ ط دار العلم؛ موجز التاریخ الاسلامی للعسیری، ص ۲۲۳ ط مکتبة الملک فهد

④ الکامل فی التاریخ: سنة ۲۷۹ھ ⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۲۶۸، ۲۶۹ ط نزار؛ العبر فی خبر من غبر: ۴۰۰/۱ تا ۴۰۵

مگر افسوس کہ معتضد تشیع کے اثرات سے نہ بچ سکا اور ایک بار کچھ لوگوں کے بہکانے پر اس نے اعلان کرایا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر دعائے رحمت اور بھلائی کے ساتھ نہ کیا جائے۔ پھر اس نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت کا حکم جاری کرنے کا بھی ارادہ کر لیا (نعوذ باللہ) تاہم قاضی ابوعمر محمد بن یوسف رحمہ اللہ نے بڑی حکمت کے ساتھ معتضد کو سمجھایا اور اس نے یہ ناپاک حکم واپس لیا۔ ①

قرامطہ کا ظہور:

۲۸۶ھ میں "قرامطی تحریک" کا ظہور ہوا جس کا بانی ابوسعید قرامطی تھا۔ معتضد کو اس پر قابو پانے کی مہلت نہ مل سکی۔ اس کے بعد اس تحریک نے بے پناہ فساد پھیلایا یہاں تک کہ حرمین شریفین کا تقدس بھی محفوظ نہ رہا۔

مُعتَضِد بیمار ہو کر ۲۲ ربیع الآخر ۲۸۹ھ کو چل بسا۔ اس کا دور کم از کم بغداد کی حد تک امن وامان کا تھا۔ اس نے بہت سے ٹیکس ساقط کر کے عوام کو خوشحال بنا دیا تھا۔ اس کے دور میں لوگ نہایت آرام وسکون سے زندگی بسر کرتے رہے۔ ②

❀❀❀

اَلْمُکْتَفِی باللہ

علی بن احمد المُعتَضِد

ربیع الآخر ۲۸۹ھ تا ذوالقعدہ ۲۹۵ھ (اپریل ۹۰۲ء تا اگست ۹۰۸ء)

مُعتَضِد کے بعد اس کا بیٹا علی، مُکْتَفِی باللہ کا لقب اختیار کر کے خلیفہ بنا جو ایک انصاف پسند حکمران تھا۔ ③ قرامطہ کو شام میں سرگرم دیکھ کر وہ خود ان کی سرکوبی کے لیے نکلا اور ان کی قوت پر کاری ضرب لگائی۔ ④

دولتِ طولونیہ کا خاتمہ:

مصر کی دولتِ طولونیہ اب کمزور پڑ چکی تھی۔ موقع غنیمت جان کر ۲۹۲ھ میں خلیفہ مُکْتَفِی نے اپنے جرنیل محمد بن سلیمان کو بھیج کر مصر سے دولتِ طولونیہ کا خاتمہ کر دیا اور اسے دوبارہ خلافتِ بغداد کا صوبہ بنا دیا۔ ⑤

جہاد:

۲۹۳ھ میں وسطِ ایشیا کے شمال میں آباد روس کی نیم وحشی قوموں کا سیلاب ماوراء النہر پر ٹوٹ پڑا مگر امیر اسماعیل سامانی نے سخت جنگ کے بعد انہیں پسپا کر دیا۔ ۲۹۱ھ میں ایک لاکھ رومیوں نے سرحدوں پر حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ ۲۹۳ھ میں انہوں نے صلح کر لی۔ کچھ مدت بعد انہوں نے بے خبری میں "قورس" پر شب خوں مار کر ہزاروں مسلمانوں کو شہید اور گرفتار کیا اور فرار ہو گئے۔ اگلے سال مسلمانوں نے جوابی کارروائی کی اور بکثرت رومیوں کو گرفتار کیا۔ ⑥

---

① تاریخ الطبری: ص ۱۰ ص ۵۵ تا ۶۳ ② تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۰، ۲۷۱
③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۸۹ھ ④ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۲۹۱ھ
⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۳، ۲۷۴؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۹۲ھ ⑥ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۲۹۱ھ، ۲۹۳ھ، ۲۹۴ھ

مُکْتَفِی نے ساڑھے چھ سال تک کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ آخر کار ۲۹۵ھ میں بیمار ہوا اور کئی ماہ تک مبتلائے مرض رہنے کے بعد ۱۲ ذوالقعدہ ۲۹۵ھ کو دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کی عمر ۳۳ سال تھی۔ ①

❁❁❁

اَلْمُقْتَدِر بِاللہ

جعفر بن احمد المُعتَضِد

ذوالقعدہ ۲۹۵ھ تا شوال ۳۲۰ھ (اگست ۹۰۸ء تا نومبر ۹۳۲ء)

مُکْتَفِی کے بعد امرائے سلطنت نے تیرہ سالہ شہزادے جعفر بن معتضد کو خلیفہ بنادیا جو مقتدر باللہ کے لقب کے ساتھ مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ اس کی کم عمری سے فائدہ اٹھا کر امرائے دربار من مانی کرنے لگے اور نظام بگڑ گیا۔ ②

عبیدیوں کا تیونس، مصر اور مراکش پر قبضہ:

اس دوران مہدی ہونے کے جھوٹے دعوے دار عبیداللہ بن میمون نے تیونس کی دولتِ اغالبہ کا خاتمہ کردیا۔ ۳۰۵ھ میں اس نے مراکش کی دولتِ ادارسہ کو بھی شکست دے دی۔ ۳۰۸ھ میں اس نے دریائے نیل کے مغرب کا سارا علاقہ زیرِ نگین کرلیا۔ عبیداللہ نے دنیا کو فریب دینے کے لیے اپنی حکومت کو "دولتِ فاطمیہ" کا نام دیا۔ ③

منصور حلاج کو سزائے موت:

۳۰۱ھ میں مشہور صوفی حسین بن منصور حلاج کو گرفتار کرکے بغداد لایا گیا اور منادی کی گئی کہ یہ قرامطیوں کا داعی ہے۔ آٹھ سال قید رکھنے کے بعد ۳۰۹ھ میں قاضی ابوعمر کے فتوے کے مطابق حلاج کو سزائے موت دے دی گئی۔ ④

رومیوں سے صلح اور جنگ:

۳۰۵ھ میں قیصرِ روم نے اندرونی خلفشار کی وجہ سے خلیفہ سے صلح کرلی مگر اپنی حکومت مضبوط ہوتے ہی اس نے عالمِ اسلام پر حملے شروع کردیے۔ ۳۱۴ھ میں مَلَطْیَہ، اگلے سال دمیاط اور ۳۱۶ھ میں اَخلاط کو تاراج کردیا۔ ⑤

دیلمی شیعوں اور قرامطہ کی یورش

اسی زمانے میں دَیلَم کے مجوسی حکمران مَرداویج نے رے پر قبضہ کرکے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ اُدھر حجاز تک قرامطہ کا تسلط ہوگیا۔ ۳۱۶ھ میں انہوں نے حاجیوں کے قافلوں کو اس قدر لوٹا کہ مکہ کے راستے بند ہوگئے۔ ⑥

---

① الکامل فی التاریخ: سنة ۲۹۵ھ

② تاریخ الخلفاء، ص: ۲۷۴، ۲۷۵؛ العبر فی خبر من غبر: ۱/۳۳۱ ③ الاستقصاء لاخبار دول المغرب الاقصی: ۱/۲۰۳ تا ۲۲۸

④ تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۶؛ العبر فی خبر من غبر: ۱/۳۴۱..... منصور حلاج کو علماء کا ایک طبقہ زندیق قرار دیتا ہے جبکہ دوسرے طبقے کے نزدیک حلاج کو مجذوب مانا جاتا ہے اور ان اقوال وافعال کو جن پر علماء نے سزائے موت کا فتویٰ دیا تھا، غلبۂ حال اور جذب پر محمول کیا جاتا ہے۔

⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۷ ⑥ تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۷

۳۱۷ھ میں قرامطہ مکہ میں گھس گئے اور حجرِ اسود کو اکھاڑ کر لے گئے۔ بیس سال تک حجرِ اسود انہی کے پاس رہا۔ ①

خواتین کا راج اور ناکام بغاوت:

مقتدر کی ناتجربہ کاری اور حد سے زیادہ فضول خرچی کے باعث ملکی انتظامات دن بدن ابتر ہوتے گئے۔ یہ دیکھ کر اس کی والدہ نے امورِ مملکت سنبھال لیے مگر وہ بھی کوئی بہتری نہ لا سکی۔ آخر کچھ امراء نے محرم ۳۱۷ھ میں مقتدر کے بھائی کو قاہر باللہ کا لقب دے کر خلیفہ بنایا مگر مؤنس خادم کی مدد سے فقط ایک دن بعد مقتدر دوبارہ برسرِ اقتدار آ گیا۔ ②

۳۱۹ھ میں قَرامِطہ کوفہ تک پہنچ گئے اور دَیلَم کے شیعہ، دِینور تک آن پہنچے اور اہلِ بغداد کو اپنا شہر بھی خطرے کی زد دکھائی دینے لگا۔ اُدھر مقتدر کی حد سے زیادہ فضول خرچی نے سرکاری خزانہ خالی کر دیا تھا اور فوج کی تنخواہیں ادا کرنا دوبھر ہو چکا تھا آخر ۲۷ شوال ۳۲۰ھ کو ایک درباری مؤنس خادم نے بربروں کو ساتھ ملا کر بغاوت کر دی اور خلیفہ کو قتل کر دیا۔ مقتدر پچیس سال تک مسندِ خلافت پر رہا۔ اس کی عمر ۳۸ سال تھی۔ ③

❁❁❁

القاہر باللہ

محمد بن احمد المُعتَضِد

شوال ۳۲۰ھ تا جمادی الآخرہ ۳۲۲ھ (نومبر ۹۳۲ء تا جون ۹۳۴ء)

مقتدر کی جگہ اس کے ۲۴ سالہ بھائی محمد بن مُعتَضِد کو خلیفہ بنا دیا گیا جس نے قاہر باللہ کا لقب اختیار کیا۔ وہ بڑا سخت گیر تھا۔ اس نے سابق خلیفہ مقتدر کے پورے خاندان کو انتقام کا نشانہ بنایا۔ اسی طرح مؤنس خادم سمیت متعدد سرکردہ امراء کو قتل کر کے ان کے کٹے ہوئے سروں کی نمائش کرائی۔ اس کے بھتیجے شہزادہ محمد بن مُکتَفِی نے اسے خلیفہ بنوانے میں اہم کردار ادا کیا تھا مگر قاہر نے اس شک کی بناء پر کہ کہیں وہ مستقبل میں بغاوت نہ کر دے، اسے ایک کوٹھری میں بند کرا کے اس پر مٹی کا پلستر کرا دیا اور وہ بے چارہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ ④

دیلمیوں کا تسلط۔ قاہر کا انجام:

۳۲۲ھ میں دَیلمیوں کا سردار عَمّاد الدولہ اصفہان اور شیراز سمیت پورے فارس پر قابض ہو گیا اور عباسی عمل داری صرف عراق تک محدود رہ گئی۔ اسی سال قاہر سے تنگ آئے ہوئے امراء اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۶ جمادی الآخرہ ۳۲۲ھ کو انہوں نے قاہر کو گرفتار کر لیا اور اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں گھونپ دیں۔ قاہر گیارہ سال تک قید رہا اور رہائی کے بعد ۳۳۹ھ میں گمنامی کی موت مر گیا۔ ⑤

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۸؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳۳۹ھ

② تاریخ الخلفاء، ص ۲۷۷ ③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۵۹/۵؛ العبر فی خبر من غبر: ۷/۲

④ تاریخ الخلفاء: ص ۲۷۹، ۲۸۰ ⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۱، ۲۸۲

الراضی باللہ

محمد بن جعفر المقتدر

جمادی الآخرہ ۳۲۲ھ تا ربیع الاول ۳۲۹ھ (جون ۹۳۴ء تا دسمبر ۹۴۰ء)

قاہر کی جگہ سابق خلیفہ مقتدر باللہ کے ۲۵ سالہ بیٹے محمد کو راضی باللہ کا لقب دے کر مسندِ خلافت پر بٹھایا گیا۔ وہ عالم فاضل، ادیب وشاعر اور مہربان اور شریف النفس تھا۔ ①

دولتِ بنو بُوَیہ کا قیام:

راضی کی حکومت کے پہلے سال ۳۲۲ھ میں دیلمیوں کا سردار "مرداویج" جو فارس پر قابض ہو چکا تھا، اپنے تُرک افسر بَجکم کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اُدھر اس کا منحرف سپہ سالار علی بن بُوَیہ ایران میں اپنی آزاد حکومت قائم کر چکا تھا جو "دولتِ بنو بُوَیہ" کہلائی۔ اُس نے خلیفہ سے اظہارِ وفاداری کیا تو خلیفہ نے اس پر اعتبار کر کے اسے سندِ حکومت کے ساتھ "عماد الدولہ" کا لقب بھی عطا کر دیا۔ مگر اسی "دولتِ بنی بُوَیہ" نے آگے چل کر خلفاء کو یرغمال بنا لیا۔ ②

ابن رائق کی خودمختاری۔ حکمرانِ اندلس کا دعوائے خلافت:

راضی باللہ بہت کمزور خلیفہ تھا؛ اس لیے اس کی حکومت کے تیسرے برس ۳۲۴ھ میں واسط کا حاکم محمد بن رائق عراق کا خودمختار حکمران بن بیٹھا اور دربارِ خلافت کو محصولات کی فراہمی بند ہو گئی۔ یہ دیکھ کر ۳۲۵ھ میں اندلس کے خودمختار اُموی امیر عبدالرحمن سوئم نے وہاں خلافت کا دعویٰ کر دیا اور "الناصر لدین اللہ" کا لقب اختیار کر لیا۔ ③

دولتِ اِخشید یہ کا قیام:

راضی باللہ کے عہدِ خلافت میں مصر وشام کی "دولتِ اِخشیدیہ" قائم ہوئی۔ اس کا بانی ایک ترک سردار ابوبکر محمد بن طُغج تھا۔ اس نے افریقہ سے یلغار کرنے والے بنوعبید کا بڑی پامردی سے مقابلہ کر کے مصر کو محفوظ بھی رکھا جس کے صلے میں عباسی خلیفہ راضی باللہ نے ۳۲۳ھ میں شام کی حکومت بھی اسی کو سونپ دی اور اسے "اِخشید" کا لقب عنایت کیا جو ترکی زبان میں "امیر الامراء" کے ہم معنیٰ ہے۔ ④

امراء کی خودمختاری:

راضی باللہ کے آخری سالوں میں خلافت کا اختیار بغداد اور گردونواح تک رہ گیا تھا۔ بصرہ پر محمد بن رائق، فارس و ایران پر علی بن بُوَیہ اور اس کا بھائی حسن بن بُوَیہ، مُوصل، الجزیرہ اور کردستان پر بنوحمدان، طبرستان پر مرداویج کے جانشین دیلمی اور بحرین وحجاز پر قرامطی قابض تھے۔ ⑤

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۲ ② البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/۱۷، ۸۱، ۹۵؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/۳۹۰ تا ۳۹۵، ط دار الفکر
③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۳ ④ تاریخ الاسلام ذہبی: ۲۵/۱۱۲، ت تدمری ⑤ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۲۳ھ

سیاسی لحاظ سے راضی باللہ کا دور سراسر ناکامی کا مرقع تھا۔ وہ آخری خلیفہ تھا جو جمعے کا خطبہ خود دیتا تھا۔ ۱۵ ربیع الاوّل ۳۲۹ھ کو وہ بیمار ہو کر چل بسا۔ اس کے بعد خلفاء نے خطبۂ جمعہ کی ذمہ داری بھی اپنے نائبین کو سونپ دی۔ ①

❁❁❁

المُتَّقی للّٰہ

ابراهيم بن جعفر المقتدر

ربیع الاوّل ۳۲۹ھ تا صفر ۳۳۳ھ (دسمبر ۹۴۰ء تا اکتوبر ۹۴۴ء)

راضی کی موت کے بعد اس کا بھائی ابواسحق المتقی للہ کے لقب سے مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ وہ پرہیزگار اور عابد وزاہد انسان تھا۔ تاہم وہ صرف نام کا حکمران تھا۔ سارے اختیارات امراء کے پاس تھے۔ ②

اس دور میں دارالخلافہ کے چاروں طرف خود سر اور سرکش امراء فوجیں لیے ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہے تھے۔ ان میں سے جس کا جی چاہتا وہ بغداد میں گھس کر خلیفہ سے اپنا ہر مطالبہ منوا لیتا تھا۔ پہلے خلفاء پر صرف ترکوں کی اجارہ داری تھی۔ اب ہر طالع آزما یہ شوق پورا کرنا چاہتا تھا۔ دیلمی شیعوں، بنو بُوَیہ کے رافضیوں اور ترک امراء میں سے ہر ایک ''امیر الامراء'' یعنی بغداد کا بادشاہ گر بننا چاہتا تھا۔ ③

بیرونی حملے:

سرحدیں اس قدر غیر محفوظ ہو گئیں کہ ۳۳۱ھ میں رومی کردستان تک آن پہنچے۔ نصیبین اور میافارقین میں انہوں نے جی بھر کے غارت گری کی اور لوگوں کو قیدی بنا لیا۔ ۳۳۲ھ میں روسیوں کا ایک لشکر گرجستان کے دریائے کُرّ کو عبور کر کے مسلم آبادیوں تک پہنچ گیا۔ تاہم ''بَرذَعہ'' کے رئیس مَرزُبان بن محمد نے رضا کاروں کا لشکر تیار کر کے اسے پسپائی پر مجبور کر دیا۔ ④

خلیفہ متقی کا قتل:

۳۳۱ھ میں تُوزُون نامی ایک سرکش سردار بغداد میں آدھمکا اور خلیفہ سے زبردستی ''امیر الامراء'' کا منصب لیا۔ اس کی زیادتیوں سے تنگ آکر خلیفہ نے بغداد چھوڑ دیا اور شام کے شہر رقہ میں اپنے وفادار خاندان بنو حمدان کے پاس پناہ لی۔ ⑤ مگر ۳۳۲ھ میں تُوزُون نے جھوٹی خوشامدیں کر کے متقی کو واپسی پر آمادہ کر لیا۔ خلیفہ بغداد روانہ ہوا تو تُوزُون نے راستے میں اسے اغواء کر کے اندھا کر دیا اور جیل میں ڈال دیا جہاں وہ چوبیس سال بعد ۳۵۷ھ میں فوت ہوا۔ ⑥

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۳؛ العبر فی خبر من غبر: ۳۲/۲ تا ۳۸
② تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۳ ③ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۳۳۰ھ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۳
④ تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۳، ۲۸۵ ⑤ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۳۲ھ
⑥ تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۳، ۲۸۵؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۳۳ھ؛ الاعلام زرکلی: ۳۵/۱، ط دار العلم

اَلْمُسْتَكْفِي بالله

عبداللہ بن علی المکتفی

صفر ۳۳۳ھ تا جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ (اکتوبر ۹۴۴ء تا فروری ۹۴۶ء)

صفر ۳۳۳ھ میں متقی کو جیل میں ڈالنے کے بعد تُوزُون نے سابق خلیفہ مُکتَفِی کے بیٹے ابوالقاسم کو مسندِ خلافت پر بٹھادیا جو مُستَکفِی کے لقب سے مشہور ہوا۔ تُوزُون جلد ہی مرگیا مگر ایک اور عجمی سردار ابن شیرزاد بغداد پر حاوی ہوگیا۔ پھر جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ میں بنوبُوَیہ کا حاکم احمد بن بُوَیہ ابن شیرزاد کو بھگا کر بغداد پر مسلط ہوگیا۔ ①

بنوبُوَیہ کا تعارف:

یہاں سے اُمت کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا جو ۳۳۴ھ سے ۴۵۱ھ تک محیط تھا اور اس میں نہ صرف بغداد بلکہ پورے ایران اور عراق کا اکثر حصہ دَیلم کے اثنا عشری شیعوں ''بنوبُوَیہ'' کے چنگل میں تھا۔ اس کہانی کا آغاز تیسری صدی ہجری کے وسط میں ہوا جب زیدی شیعوں کے ایک رئیس حسن بن زید علوی نے شمالی ایران کے ضلع طبرستان میں ''دولتِ زیدیہ طالبیہ'' کے نام سے ایک آزاد حکومت قائم کرلی۔ ان کے بعد ان کی جگہ ان کے بھائی محمد بن زید نے سنبھالی مگر ۲۸۷ھ میں خراسان پر قبضے کی کوشش کے دوران وہ سامانی حاکم اسماعیل بن احمد کے مقابلے میں قتل ہوگئے جبکہ اس خاندان کے ارکان کوہستان دیلم میں روپوش ہوگئے، جن میں حسن بن علی اطروش کا نام نمایاں ہے۔ یہ مقامی لوگوں میں اپنے مذہب کی اشاعت کرتے رہے۔ یاد رہے کہ یہ حضرات روافض نہ تھے بلکہ روافض سے متنفر تھے۔ ②

چوتھی صدی کے آغاز میں شمالی ایران کے اضلاع: طبرستان، جرجان، اور آمد تک ان کا غلبہ ہوگیا۔ اس دوران خلافتِ عباسیہ مسلسل کمزور ہوتی رہی۔ کچھ زمانے بعد شیعیت قبول کرنے والے دولتِ زیدیہ کے دَیلمی افسران نے غداری کرکے اپنے پیشوا زیدی رہنماؤں کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لی۔ دَیلمیوں کا مزاج انتہاء پسندانہ تھا؛ لہٰذا وہ رفض کی طرف مائل ہوتے چلے گئے۔ خلافتِ عباسیہ کو کمزور تر دیکھ کر وہ کوہستانِ دَیلم سے خراسان اور ایران وعراق کے میدانوں میں اتر گئے اور مختلف علاقے فتح کرتے چلے گئے۔ اس دوران یہ دَیلمی سردار جو الگ الگ علاقوں پر حاوی تھے، آپس میں بھی لڑتے رہے مگر آخر میں ایک جنگجو رئیس مَرداوِیج سب پر غالب آگیا۔

دَیلمی افسران میں سے تین بھائی: علی، حسن اور احمد بھی شامل تھے۔ ان کا باپ بُوَیہ ایک غریب ماہی گیر تھا مگر لڑکے مَرداوِیج کی فوج میں شامل ہوگئے اور ترقی کرتے کرتے بڑے افسر بن گئے۔ بُویہی برادران میں سے علی بن بُوَیہ بہت چالاک تھا۔ اس نے اپنی طاقت بڑھا کر مرداوِیج سے بغاوت کردی اور فارس میں ''دولتِ بنی بُوَیہ'' کی بنیاد رکھ دی۔

بنوبُوَیہ نے عجمیوں کو اپنا عقیدت مند بنانے اور اپنا رعب داب قائم رکھنے کی خاطر اپنا نسب قدیم شاہانِ ایران سے

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۶، ط نزار
② السیف المسلول للسبکی، ص ۴۲۰

جوڑ لیا۔ بُویہی برادران میں سب سے چھوٹا احمد بن بُویہ جو اَہواز کا حاکم تھا، زیادہ موقع شناس نکلا۔ اس نے ۱۱ جمادی الاولیٰ ۳۳۴ھ کو بغداد پر قبضہ کر کے وہ شہرت پائی کہ باقی بھائیوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ (۱)

خلفاء اور بنوبُویہ کے تعلقات:

بغداد پر احمد بن بُویہ کے قبضے سے تاریخ کا وہ ۱۱۶ سالہ سیاہ دور شروع ہوتا ہے جسے ''عہدِ بُویہی'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ ایام خلفاء کی بے بسی اور عوام کی انتہائی تباہ حالی کے تھے۔ اس دوران پانچ خلفاء گزرے:

❶ مُستَکفِی ❷ مطیع ❸ طائع ❹ قادر ❺ قائم

مگر ان کی حیثیت شطرنج کے مہرے سے زیادہ نہیں تھی جن سے بنوبُویہ مختلف چالیں چلتے تھے۔ خلفاء کے پاس کچھ محافظ، سپاہی اور نوکر چاکر ضرور ہوتے تھے مگر ان کا بغداد کے اندر بھی بس نہیں چلتا تھا۔ ہاں قاضی القضاۃ کا تقرر خلیفہ کے ہاتھ میں تھا اور یہ واحد اختیار تھا جس میں بنوبُویہ آڑے نہیں آتے تھے۔ اس طویل دور میں بدعقیدگی کو وہ فروغ ملا کہ الامان والحفیظ۔ شیعہ امامیہ مذہب کا دور دورہ اسی زمانے میں ہوا۔ یوں وہ رفض جو خلفائے اسلام اور علمائے کرام کی مساعی کے نتیجے میں زیرِ زمین چھپا ہوا تھا، بڑی تیزی سے ابھرا اور مشرق تا مغرب پھیل گیا۔

خلیفہ مُستَکفِی کی جبری معزولی:

بغداد پر احمد بن بُویہ کے قبضے کے وقت خلیفہ مُستَکفِی مسند نشین تھا۔ اس نے احمد بن بُویہ کو ''مُعزّ الدولہ''، اس کے بھائی علی بن بُویہ کو ''عماد الدولہ'' اور دوسرے بھائی حسن بن بُویہ کو ''رکن الدولہ'' کا خطاب دیا۔ تاہم احمد بن بُویہ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خلیفہ سے ''مَلِک'' کا خطاب بھی لیا۔ جلد ہی اس نے خلیفہ کی حیثیت بالکل مٹا دی۔ سکے تک اپنے نام کے جاری کرا دیے۔ کچھ دنوں بعد اسے شک ہوا کہ خلیفہ اس کا مخالف ہے۔ چنانچہ اس کے اشارے پر دیلمی افسران نے بھرے دربار میں خلیفہ کو تخت سے گھسیٹ کر نیچے پھینک دیا اور اندھا کر کے جیل میں ڈال دیا۔ یہ واقعہ ۲۲ جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ کا ہے۔ مُستَکفِی وہیں ۳۳۸ھ میں دنیا سے چل بسا۔ (۲) مُستَکفِی ایک سال چار ماہ مسندِ خلافت پر رہا اور ۲۲ جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ کو معزول کر دیا گیا۔ اس کی حکومت برائے نام تھی۔

❁❁❁

المطیع للّٰہ

الفضل بن جعفر المقتدر

جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ تا ذوالقعدہ ۳۶۳ھ (فروری ۹۴۶ء تا اگست ۹۷۴ء)

بنوبُویہ کے مقرر کردہ پہلے خلیفہ مطیع للہ عباسی کا اصل نام ابوالقاسم الفضل تھا۔ وہ سابق خلیفہ مقتدر بن مُعتَضِد کا بیٹا تھا۔ جمادی الآخرہ ۳۳۴ھ میں اس کا تقرر ہوا۔ بنوبُویہ کا تسلط شروع ہوتے ہی عالم اسلام قدرتی آفات کی زد میں

(۱) الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۸۷ھ، ۳۰۱ھ، ۳۳۴ھ۔ موجز التاریخ الاسلامی، ص ۲۲۰ (۲) الکامل فی التاریخ: سنۃ ۳۳۴ھ

آ گیا۔ ۳۴۴ھ میں مصر شدید زلزلے کا شکار ہوا۔ ۳۴۶ھ میں ایران سے خراسان تک ہولناک زلزلہ آیا اور سینکڑوں بستیاں تباہ ہوگئیں۔ ۳۴۷ھ میں قُم، حُلوان اور ایران کے کوہستانی علاقوں میں زلزلے سے ہزاروں لوگ مارے گئے۔ ۳۴۸ھ میں زلزلے سے بغداد کے بعض محلے تباہ ہوگئے۔ پھر ٹڈی دل دیہاتوں پر چھا گئے اور اناج کا کوئی دانہ چھوڑا۔ ہر طرف قحط پھیل گیا اور گرانی عام ہوگئی۔ لوگ چند من گندم کے بدلے جائیدادیں فروخت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ①

حجرِ اسود کی واپسی:

حجرِ اسود بیس سال سے قُرامِطہ کے پاس تھا۔ اس دور میں ایک علوی بزرگ عمر بن یحییٰ رحمہ اللہ خلیفہ مطیع کی طرف سے سفیر بن کر قُرامِطہ کے پاس بحرین گئے۔ قرامطہ ان کی عزت کرتے تھے، لہٰذا ان کی سفارش پر حجرِ اسود واپس کر دیا۔ ②

شیعہ سنی فساد اور ماتمی جلوسوں کا آغاز:

بغداد میں سوا دو سو سال سے ہر مسلک اور فرقے کے مسلمان امن وامان سے رہ رہے تھے۔ کبھی فرقہ ورانہ فسادات کا نام بھی نہیں سنا گیا، تمام مذہبی اختلافات علمی سطح پر رہتے تھے مگر بنو بُوَیہ کے دور میں روافض کھلے عام صحابہ کرام کی کردار کشی کرنے لگے جس سے سخت اشتعال پھیلا اور بار بار فرقہ ورانہ فسادات ہونے لگے۔ ③

۳۵۲ھ میں احمد بن بُوَیہ نے عاشورہ کے جلوس اور ماتم کی رسم شروع کی اور حکم دیا کہ اس دن بازار بند رہا کریں گے، لوگ بوسیدہ کپڑے پہنے شہادتِ حسین کے غم میں جلوس نکالیں گے۔ عورتیں بھی چہرے کھولے، بال بکھیرے، سینہ کوبی کرتی ہوئی جلوس کے ساتھ چلیں گی۔ اسی طرح ۱۸ ذوالحجہ کو "عیدِ غدیرِ خم" منانا شروع کی گئی۔ ④

عالمِ اسلام روافض کے نرغے میں:

۳۵۶ھ میں ۵۳ سالہ احمد بن بُوَیہ ۲۱ برس حکومت کرکے مرگیا اور اس کا بیٹا بختیار "عز الدولہ" کے لقب کے ساتھ عراق کا نیا حکمران بن گیا۔ ۳۵۸ھ میں افریقہ پر قابض بنو عبید نے مصر پر قبضہ کرلیا۔ ۳۶۳ھ میں حجاز بھی ان کے ماتحت آ گیا۔ اس طرح ایران وعراق سے لے کر حجاز، شام اور مصر تک روافض کا تسلط ہوگیا۔ ⑤

رومیوں کے تباہ کن حملے:

عالمِ اسلام کی یہ حالت دیکھ کر قیصرِ روم نقفور اور اس کے ارمنی جرنیل دُمُستق نے عالمِ اسلام پر ہر سال حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ شام سے ایشیائے کوچک تک سینکڑوں بستیاں اور بڑے بڑے شہر تباہ ہوگئے جن میں حلب بھی شامل تھا۔ مسلمانوں کا قتل اور عورتوں کا باندیاں بننا معمول بن گیا مگر بنو بُوَیہ عالمِ اسلام کی تباہی کا تماشا دیکھتے رہے۔ فقط خاندانِ بنو حمدان کے بہادر امیر سیف الدولہ نے جہاد کا حق ادا کیا اور بار بار رومیوں کو پسپا کیا۔

① تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۶، ۲۸۷؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳۴۴ھ، ۳۴۵ھ

② آثار البلاد واخبار العباد، ص ۷۸ ③ آثار البلاد واخبار العباد، ص ۷۸

④ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۳۵۲ھ ⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۲۸۸؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۳۵۶ھ، ۳۵۹ھ، ۳۶۰ھ

۳۵۶ھ میں سیف الدولہ کی وفات کے بعد رومی زیادہ جوش وخروش سے حملے کرنے لگے۔ ۳۵۷ھ میں انہوں نے انطاکیہ کا محاصرہ کیا اور بارہ ہزار مسلمانوں کو گرفتار کر کے واپس ہوئے۔ ۳۵۸ھ میں حمص پر حملہ ہوا اور یہاں گردونواح سے ایک لاکھ مسلمان قیدی بنائے گئے۔ ۳۵۹ھ میں قیصر نے انطاکیہ پر دوبارہ حملہ کیا اور بارہ ہزار عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر شہر پر باقاعدہ قبضہ کر لیا۔ اسی سال قیصر نے شام کے ۱۸ شہروں کی جامع مساجد کو مسمار کیا، ہزاروں افراد کو جبراً نصرانی بنایا اور ایک لاکھ لڑکوں اور لڑکیوں کو پکڑ کر لے گیا۔ مسلمانوں نے ایسی رسوائی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ①

۳۶۱ھ میں رومیوں کی تاخت وتاراج دیارِ بکر اور الجزیرہ تک آن پہنچی۔ مظلوموں کے نمائندے بغداد پہنچے تاکہ خلیفہ کو اپنی مظلومیت کا حال بتا کر امداد چاہیں مگر انہیں خلیفہ سے ملنے نہ دیا گیا۔ بختیار بن بُویَہ سے جہاد کی تیاری کے لیے رقم فراہم کرنے کی درخواست کی گئی تو اس نے ایک پیسہ تک نہ دیا بلکہ خلیفہ کو حکم بھیجا کہ وہ چار لاکھ درہم بھیجے۔ خلیفہ نے کہلوایا: ''اگر ملکی محصولات میرے پاس جمع ہوتے ہوں تو میں یقیناً مسلمانوں کی ضرورت پر خرچ کرتا۔ مگر میرے پاس ایسا کوئی سرکاری مال نہیں کہ آپ کو بھیجوں۔ خزانہ آپ کے پاس ہے، آپ یہ ضرورت پوری کریں۔''

مگر بختیار نے خلیفہ کو دھمکایا۔ آخر کار خلیفہ نے محل کی چھت، دروازے، کھڑکیاں اور ذاتی کپڑے فروخت کر کے یہ رقم حاصل کی اور بختیار کو بھیج دی مگر اس نے یہ رقم اپنی عیاشی میں اڑا دی۔ اس واقعے نے خلیفہ کو بے حال کر دیا۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ معذور ہو گیا۔ ۱۳ ذوالقعدہ ۳۶۳ھ کو اس نے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور دو ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا رسمی عہدہ ۲۹ سال سے چند ماہ اوپر تک رہا۔ ②

❁❁❁

الطائع للہ

عبدالکریم بن الفضل المطیع

ذوالقعدہ ۳۶۳ھ تا شعبان ۳۸۱ھ (اگست ۹۷۴ء تا نومبر ۹۹۱ء)

مطیع للہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالکریم ''طائع للہ'' کے لقب سے رسمی خلیفہ بنا۔ اس کے دور میں بنو بُویَہ کے ایک اور سیاست دان عَضُد الدولہ نے بختیار کو بغداد سے بھگا دیا اور ملک کی زمامِ اختیار سنبھال لی۔ عَضُدُ الدولہ قدیم شاہانِ ایران کی طرح ہیرے جواہرات سے مرصع تاج پہننے اور اپنے محل کے سامنے نقارے بجوانے لگا۔ اس نے خلیفہ سے فرمائش کر کے ''تاج الملۃ'' کا خطاب بھی حاصل کیا اور بعد میں ''شہنشاہ'' کا لقب بھی اپنا لیا۔ ③

اس دور میں بنو بُویَہ کے مخالف کمزور ہو چکے تھے؛ اس لیے اس نے پے در پے جنگیں کر کے بُویہی حکومت کا دائرہ

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۲۱۹/۱۵ تا ۲۲۲، ۲۱۹/۱۵ تا ۲۵۰، ۲۵۵ تا ۳۲۲؛ العبر فی خبر من غبر: ۵۰/۶ تا ۹۳

② البدایۃ والنہایۃ: ۳۳۰/۱۵ تا ۳۳۷؛ العبر فی خبر من غبر: ۷۰/۲ تا ۷۸؛ الکامل فی التاریخ، سنۃ ۳۶۱ھ؛ تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۰

③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۱، ۲۹۲؛ البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۳۶۵ھ

دور دور تک پھیلا دیا۔ قرامطہ کو ساتھ ملا کر اس نے سارا عراق ہتھیا لیا۔ بنوبُویہ کا سابق حاکم بختیار کوچۂ اقتدار میں واپسی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ عَضُدُ الدولہ نے ایک جنگ کے بعد اسے گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔ ①

عَضُدُ الدولہ کی موت: بنوبُویہ میں خانہ جنگی:

۴۸ سالہ عَضُدُ الدولہ شوال ۳۷۲ھ میں مرگی کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اس کے بیٹے نے "صمصام الدولہ" اور "شمس الملۃ" بن کر تخت سنبھال لیا مگر ۳۷۶ھ میں اس کے بھائی شرف الدولہ نے اسے شکست دے دی اور گرفتار کر کے آنکھیں پھوڑنے کا حکم جاری کیا۔ حکم پر عمل سے پہلے خوف سے صمصام الدولہ کی حرکتِ قلب بند ہوگئی۔

شرف الدولہ نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ وہ گزشتہ بویہی حکمرانوں کی بہ نسبت نرم مزاج تھا۔ اس نے شہر میں امن و امان قائم رکھا، ترقیاتی کام کرائے اور ایک بڑی رصد گاہ بھی بنوائی۔ ②

۳۷۹ھ میں شرف الدولہ مر گیا اور اس کا بھائی ابونصر بہاؤالدولہ حکمران بنا۔ اس نے کسی بات پر ناراض ہو کر شعبان ۳۸۱ھ میں خلیفہ طائع کو معزول کر دیا۔ طائع مزید بارہ سال زندہ رہا اور یکم شوال ۳۹۳ھ کو فوت ہوا۔ ③

❀❀❀

القادر باللہ

احمد بن اسحاق المقتدر

شعبان ۳۸۱ھ تا ذوالحجہ ۴۲۲ھ (نومبر ۹۹۱ء تا دسمبر ۱۰۳۱ء)

طائع کے بعد خلیفہ مقتدر کے پوتے احمد بن اسحاق قادر باللہ کو مسندِ خلافت پر بٹھایا گیا۔ قادر باللہ کو علم و فضل اور زہد و عبادت میں علماء اور مشائخ کے ہم پلہ کہا جاتا ہے۔

قادر باللہ کا دور اکتالیس سال تک محیط رہا۔ اس دوران سلطنتِ روما اپنے اندرونی بحران کی وجہ سے حملوں سے رکی ہوئی تھی جبکہ روافض کی حکومتوں میں خاندانی کش مکش کی وجہ سے توڑ پھوڑ شروع ہو چکی تھی۔ ④

عمید الجیوش کا دورِ نظامت۔ جلوس بند۔ فسادات ختم:

بغداد میں شیعہ سُنی فسادات ہوتے رہتے تھے۔ نیز غنڈہ گردی اور لوٹ مار عام تھی۔ بہاؤالدولہ نے حالات ابتر دیکھ کر ۳۹۲ھ میں ایک امیر ابوعلی الحسین کو جو "عمید الجیوش" کے لقب سے مشہور تھا، پورے عراق کا انتظام سونپ دیا۔ اس نے کئی چوروں ڈاکوؤں کو پکڑ کر قتل کرا دیا اور اہلِ سنت اور شیعہ دونوں کو شاہراہوں پر اپنے مذہبی مظاہروں سے

---

① البدایۃ والنہایۃ: سنۃ ۳۶۷ھ ② تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۳
③ تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۲ تا ۲۹۳؛ العبر فی خبر من غبر: ۱۴۷/۲ تا ۱۳۰
④ تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۵، ۲۹۶؛ العبر فی خبر من غبر: ۱۵۱/۲ تا ۱۷۰

منع کر دیا چنانچہ ۳۹۳ھ میں عاشوراء کا ماتمی جلوس نہیں نکلا اور شیعہ سنی فسادات بند ہو گئے۔ ①

عمید الجیوش ابو علی کا انتظامی عہدہ دس سال تک رہا جس میں ماتمی جلوسوں پر پابندی رہی اور امن وامان قائم رہا۔ ۴۰۱ھ میں عمید الجیوش فوت ہو گیا اور نئے ناظم شہر فخر الملک نے ماتم کی اجازت دے دی۔ چنانچہ محرم ۴۰۲ھ سے ایک بار پھر شاہراہوں پر جلوس نکلنے لگے۔ ساتھ ہی شیعہ سنی فساد بھی شروع ہو گئے۔ ②

بنو بُوَیہ کے مابین اقتدار کی کش مکش:

۴۰۳ھ میں بنو بُوَیہ کا حکمران بہاؤ الدولہ مر گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان الدولہ کا خطاب اپنا کر حکمران بنا۔ ۴۱۱ھ میں سلطان الدولہ اور اس کے بھائی حاکمِ عراق مشرف الدولہ میں اقتدار کی کش مکش ہوئی اور مشرف الدولہ نے سلطان الدولہ کو ہٹا کر بغداد کی حکومت سنبھال لی۔ ۴۱۶ھ میں مشرف الدولہ مر گیا اور بغداد کی حکومت بہاؤ الدولہ کے ایک بیٹے جلال الدولہ کو مل گئی۔ ③

خلیفہ قادر باللہ اور سلطان محمود غزنوی:

اس دوران خلیفہ قادر باللہ نے اہلِ سنت کے حقوق کے لیے بعض اقدامات کیے جس کی وجہ سے عوام اسے پسند کرنے لگے۔ خلیفہ بنو بُوَیہ کے مقابلے میں کچھ مضبوط ہو گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ غزنی کے فرمانروا سلطان محمود غزنوی نے اسی زمانے میں خراسان، وسطِ ایشیا اور ہندوستان کے بہت بڑے رقبے پر قائم ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر دی تھی۔ محمود غزنوی نے عباسی خلیفہ کے ساتھ نیاز مندانہ تعلق رکھا جس کے باعث خلافتِ بغداد کی ساکھ بہتر ہو گئی۔ ④

اسی بناء پر ۴۰۸ھ میں خلیفہ القادر نے جرأت کر کے بغداد کے علماء سے اعتزال اور رافضیت سے اظہارِ برأت کا تحریری اقرار لیا اور طے پایا کہ جو شخص اس قسم کے خلافِ اسلام عقائد کا پرچار کرے گا اسے سخت سزا دی جائے گی۔ ایسا ایک مراسلہ سلطان محمود غزنوی کو بھی بھیجا گیا اور تاکید کی گئی کہ وہ عقائدِ باطلہ کی بیخ کنی کی کوشش کرے۔ چنانچہ سلطان نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں قَرامِطہ، اسماعیلیہ، معتزلہ وجہمیہ کو تائب ہونے کی ترغیب دی۔ انکار کرنے والوں کو پابندِ سلاسل کیا گیا اور بہت سے سرکشوں کو قتل بھی کیا گیا۔ ⑤

سلطان محمود غزنوی رفتہ رفتہ مغرب کی طرف بڑھتا گیا اور بُویہی جو اپنے باہمی اختلافات کا تصفیہ نہ کر سکے تھے، پسپا ہوتے گئے۔ ۴۱۹ھ میں ہندوستان اور ترکستان کے تمام محاذوں سے فراغت کے بعد ایران پر سلطان کا فیصلہ کن حملہ شروع ہوا۔ ۴۲۰ھ میں سلطان نے اصفہان سمیت پورے ایران پر قبضہ کر لیا اور بُویہیوں کا اہم مرکز رَے

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/۳۸۳، ۳۹۶، ۵۰۰؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۷/۲۳۱

② البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/۳۹۶، ۵۰۰، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۳۷، ۵۶۳، ۵۷۳، ۶۲۹، ۶۳۶، ۶۴۱، ۶۹۷، ۷۰۷، ۷۱۰؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/۱۷۰ تا ۲۰۰

③ العبر فی خبر من غبر: ۲/۲۰۳ ④ تاریخ الخلفاء، ص ۲۹۳ تا ۲۹۶؛ المنتظم لابن الجوزی: ۱۵/۲۱۱؛ البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/۵۴۳، ۶۳۳، ۶۰۲ ⑤ البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/۵۷۳

(موجودہ تہران) کو زیرِ نگین کر کے بہت سے بے دین رافضیوں اور باطنیوں کو سولی پر لٹکا دیا۔ یہاں تک کہ بلادِ جبل اور شمالی ایران کے ضلع قزوین کو بھی بنی بویہ سے بازیاب کرالیا گیا۔ ①

۴۲۱ھ میں سلطان محمود غزنوی کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک سلطان نے بنی بُویہ کو بڑی حد تک پسپا کر دیا تھا اور اب اس خاندان کے پاس فقط عراق رہ گیا تھا۔ اگلے سال ۱۱ ذوالحجہ ۴۲۲ھ کو قادر باللہ بھی ۴۱ سال تین ماہ کی طویل خلافت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ②

❀❀❀

القائم بِامْرِاللہ

عبداللہ بن احمد القادر

ذوالحجہ ۴۲۲ھ تا شعبان ۴۶۷ھ (دسمبر ۱۰۳۱ء تا اپریل ۱۰۷۵ء)

۱۲ ذوالحجہ ۴۲۲ھ کو قادر باللہ کا فرزند ابوجعفر عبداللہ، القائم بامر اللہ کے لقب کے ساتھ مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ وہ ایک نیک سیرت مگر کمزور آدمی تھا۔ اُدھر سلطان محمود غزنوی بھی رخصت ہو چکا تھا جس کے سہارے خلافتِ بغداد کی ساکھ قائم تھی۔ سلطان محمود کے جانشین باہم دست و گریباں ہونے کے باعث اس قابل نہیں تھے کہ بغداد کی کوئی مدد کر سکتے۔ دوسری طرف بُویہی بھی باہم لڑ بھڑ کر کمزور ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بغداد میں لاقانونیت کا دور دورہ ہو گیا۔ ۴۲۲ھ سے ۴۳۵ھ تک پورے تیرہ سال وہاں غنڈوں کا راج رہا۔ اس زمانے میں مغربی بغداد پر ایک ترک شیعہ سردار بساسیری (ارسلان ترکی) حاوی ہو گیا جس نے بغداد کے عوام پر بڑے مظالم ڈھائے اور خلیفہ کو بھی طرح طرح کی ایذائیں دیتا رہا۔ جبکہ بُویہی حاکم جلال الدولہ کا اختیار فقط مشرقی بغداد پر رہ گیا۔ ③

سلجوقیوں کا ظہور:

۴۳۴ھ میں خلیفہ نے مایوس ہو کر بغداد کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایسے میں وسطِ ایشیا سے ابھرنے والے نومسلم سلجوقی خلافت کے محافظ بن کر ابھرے۔ اس سلطنت کا بانی طُغرل بیگ نامی ایک دیندار حاکم تھا جس نے چند سالوں میں وسطِ ایشیا سے خراسان اور طبرستان تک کا وسیع علاقہ فتح کر لیا۔

سلجوقی خاندان کا جدِ امجد سلجوق نامی ایک نومسلم ترک تھا جو اپنے قبیلے کے ساتھ بلادِ خزر سے نقل مکانی کر کے وسطِ ایشیا آیا اور یہاں مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی جہاد کے لیے وقف ہو گئی۔ جب چینی حکمران ایلک خان نے حاکمِ بخارا نوحِ ثانی کے خلاف حملہ کیا تو سلجوق نے دفاع میں سرفروشانہ کارنامے دکھائے۔ سلجوق نے اپنے

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/ ۶۳۵؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴۲۰ھ ② البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/ ۶۲۸؛ ۶۳۷

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/ ۶۲۹، ۶۳۶، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۵۳، ۶۵۰، ۶۵۸، ۶۹۷، ۷۰۳، ۷۰۷، ۷۲۹، ۷۱۰؛ الکامل فی التاریخ: ۷/ ۷۵۹، ۷۶۵، ۷۶۳

اپنی اولاد کو کڑی تربیت دے کر انہیں اُمورِ حرب وسیاست کے تمام رموز سکھا دیے۔ سلجوق ۱۰۷ سال کی عمر پا کر فوت ہوا۔ اس کا جوان بیٹا میکائیل قبیلے کا سربراہ ہوا۔ کچھ عرصے بعد میکائیل بھی سرحدی جہاد میں شہید ہو گیا اور قبیلے کی قیادت اس کے بھائی ارسلان اسرائیل نے سنبھال لی اور اسے بہت طاقتور بنا دیا۔

۴۱۹ھ میں ارسلان اسرائیل کو سلطان محمود غزنوی گرفتار کر کے ہندوستان لے گیا، چنانچہ قبیلے کی ذمہ داریاں میکائیل کے نوجوان بیٹوں طغرل بیگ اور چغری بیگ کے کاندھوں پر آ پڑیں۔ طغرل کا اصل نام محمد تھا۔ وہ ۳۸۵ھ میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کو منظم کر کے وسطِ ایشیا کے بڑے رقبے کو فتح کر لیا۔ پھر خراسان، خوارزم اور رَے بھی مسخر کر لیا۔ یہ ساری فتوحات صرف پانچ سالوں میں ہوئیں۔ طغرل بیگ نے اس ریاست کو اپنے دادا کے نام پر ''دولتِ سلجوقیہ'' کا نام دیا۔ سلجوقیوں کا ظہور سچ مچ ایک کرشمۂ قدرت تھا جس نے بدعقیدہ حکومتوں کی بیخ کنی کر کے اسلام کو از سرِ نو زندہ کیا اور خلافتِ عباسیہ میں ایک نئی روح ڈال کر اُسے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ سلجوقیوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو انہوں نے دو مراکز بنا لیے: رَے ایران وعراق کا سیاسی مرکز قرار پایا جہاں طغرل کا دربار لگتا تھا۔ مرو ترکستان کا مرکز بنا جہاں طغرل کا بھائی چغر بیگ حکومت کرتا تھا۔ دونوں بھائی اتحاد واتفاق سے کام کرتے تھے۔

طغرل بیگ خلافت کا وقار بحال کرنا ضروری سمجھتا تھا؛ لہٰذا اس نے ۴۳۵ھ میں جلال الدولہ بُویہی کو مراسلہ لکھ کر تاکید کی کہ وہ عوام سے حسنِ سلوک کرے اور خلافت مآب کا احترام برقرار رکھے ورنہ اسے سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔ ① مگر جلال الدولہ اس حکم کی تعمیل سے قبل فوت ہو گیا اور اس کا بھائی ابوکالیجار ''سلطان الدولہ'' اور ''محی الدین'' کے القابات لگا کر بغداد کا عملاً حکمران بن گیا۔ ۴۴۰ھ میں وہ بھی فوت ہو گیا اور اس کے بیٹے ابونصر فیروز نے ''الملِک الرحیم'' کا لقب اپنا کر یہ عہدہ سنبھالا۔ وہ بنو بُویہ کا آخری حکمران تھا۔ ②

سلطان طغرل بیگ کو بغداد کے پُرآشوب حالات کی اطلاعات بھی مسلسل مل رہی تھیں۔ چنانچہ رمضان ۴۴۷ھ میں اس نے بغداد آ کر کے انتظامی امور کو درست کیا اور الملک الرحیم کو معزول کر کے دولتِ بنو بُویہ کا خاتمہ کر دیا۔ ③

طغرل کی واپسی کے بعد بغداد کے فتنہ پرور رافضی امیر بساسیری نے خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ کرنے کے لیے مصر کے عبیدی حکمرانوں سے رابطہ کر کے نیابت کی سند حاصل کی اور ۴۵۰ھ میں سلطان طغرل کے خلاف بغاوت کی آگ لگا دی۔ ۸ ذوالقعدہ ۴۵۰ھ کو بساسیری نے شیعوں کے مسلح جتھوں کے ساتھ بغداد پر قبضہ کر لیا اور خلیفہ قائم کو گرفتار کر کے بغداد سے باہر ایک قلعے میں تنہا نظربند کر دیا گیا۔ قصرِ خلافت کو مکمل طور پر لوٹ لیا گیا اور بغداد کے اہلِ سنت سے جی بھر کے انتقام لیا گیا۔ کتنے ہی لوگ دجلہ میں ڈبو دیے گئے اور کتنوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ خلیفہ کے وزیر ابوالقاسم بن مسلمہ رحمہ اللہ کو جو بڑے عالم، محدث اور متقی تھے، جبڑوں میں لوہے کی کنڈیاں ڈال کر سولی دی گئی۔ ④

---

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/ ۲۶۹تا ۲۸۹ ② البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/ ۲۸۹، ۷۰۶

③ البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/ ۲۷۷؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/ ۲۹۷ ④ البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/ ۷۵۷تا ۷۵۹

اس دوران سلطان طغرل دیگر محاذوں پر بغاوت کے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے میں مصروف تھا۔ فرصت پاتے ہی اس نے ایک دھمکی آمیز خط بھیجا اور مطالبہ کیا کہ خلیفہ کو منصب پر بحال کیا جائے ورنہ سلجوقی لشکر کو بغداد کا رخ کرنا پڑے گا۔ مگر بساسیری جنگ پر اڑ گیا اور واسط پہنچ کر جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔ سلطان طغرل نے دوسری سمت سے بغداد پہنچ کر خلیفہ القائم کو دوبارہ مسندِ خلافت پر بٹھا دیا اور پھر بساسیری کو سبق سکھانے کے لیے نکلا۔ اس جنگ میں رافضی بڑی تعداد میں مارے گئے اور بساسیری کا سر کاٹ کر بغداد میں قصرِ خلافت کے سامنے نصب کر دیا گیا۔ یوں ایک طویل مدت بعد عباسی خلفاء بدعقیدہ امراء کے تسلط سے آزاد ہوئے۔ خلیفہ القائم زوال کی انتہاء دیکھنے کے بعد یہ عزت وتوقیر ملنے پر بارگاہِ الٰہی میں سراپا شکر بن گیا اور زیادہ وقت عبادت میں گزارنے لگا۔ (1)

بنو بُوَیہ کا دور ایک نظر میں:

بنو بُوَیہ لگ بھگ ڈیڑھ صدی تک عراق وفارس پر حکمران رہے جس میں ۱۱۶ سال تک بغداد بھی ان کا محکوم رہا۔ اس خاندان نے مسلمانوں کے مرکزِ وحدت کو ایک سازش کے تحت غلام بے دست و پا بنا کر پورے عالمِ اسلام میں انتشار وافتراق کو ہوا دی۔ اس دور میں عالمِ اسلام کی بقا مسلسل خطرے میں رہی۔ رومی اسلامی سرحدوں کو روندتے رہے اور مسلمانوں کی عزت وناموس کی آئے دن دھجیاں اڑائی جاتی رہیں۔ مگر عجمی شراب میں مست بُوَیہی اس سے بالکل بے فکر تھے۔ وہ اہلِ سنت کو ستانے، ان کے شعائر کی توہین کرنے اور فرقہ وارانہ فسادات کو شہ دینے میں مصروف رہتے تھے۔ انہوں نے اس ڈیڑھ صدی میں قدیم تشیع کی جگہ رافضیت کو شیعیت اور حقیقی اسلام کے طور پر متعارف کرانے کی کوشش کی اور ایسی ایسی بدعات رائج کیں جو آج تک مسلمانوں میں فتنہ وفساد کا باعث ہیں۔

یاد رہے کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کا کام یہود اور منافقینِ مدینہ نے شروع کیا تھا۔ پھر یہودی گماشتے عبداللہ بن سبا نے اصل اسلام کی جگہ ایک متبادل مذہب لانے کی پوری کوشش کی۔ یہ درست ہے کہ اہلِ عراق میں تشیع حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں مبالغے سے شروع ہوا تھا اور دورِ یزید میں کیے گئے مظالم بہت سے مسلمانوں کو تشیع کی طرف مزید مائل کر دیا تھا اور اس طرح شیعانِ علی کی ایک مستقل جماعت پیدا ہو گئی تھی جس کے اکثر ارکان اموی حکومت سے بددل تھے۔ مگر ان اعتدال پسند اہلِ تشیع کا جمہور علماء سے اختلاف کوئی اتنا بڑا نہیں تھا۔ معاشرے میں سب شیر و شکر تھے۔ ان کے علماء میں باہم استادی شاگردی کا تعلق برابر قائم تھا اسی لیے اہلِ سنت کے جلیل القدر فقہاء ومحدثین کے متعدد شیوخ شیعی تھے۔ شیعی اکابر اور بعض سادات کا اگر حکومت سے کوئی اختلاف تھا تو وہ بھی ایک سیاسی کش مکش تھی نہ کہ عقیدے کی۔ چونکہ خروج کی کوششیں کرنے والے سادات کا موقف شرعاً مضبوط نہیں تھا؛ اس لیے ان کی کوششیں جمہور کے نزدیک زیادہ قابلِ التفات نہ ہوئیں۔ مگر ابن سبا کی سوچ سے متاثر تشدد پسند لوگ ڈیڑھ صدی تک شیعانِ علی کو ورغلا کر انتہا پسندی پر آمادہ کرتے رہے۔ ابن سبا کا پیش کردہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصیِ رسول ہونے کا نظریہ تیسری

(1) البدایۃ والنہایۃ: ۱۵/۵۶۵ تا ۵۷۲

صدی ہجری میں شیعہ مذہب کا بنیادی رکن عقیدۂ امامت بن چکا تھا؛ اس لیے روافض کو ہر وقت کسی امام کی تلاش رہتی تھی۔ اس تلاش وجستجو میں ان کا اختلاف بھی ہوتا رہتا تھا اور بیک وقت روافض کی مختلف ٹولیاں آلِ علی رضی اللہ عنہ کے الگ الگ بزرگوں کو "امام" مانتی رہتی تھیں۔ مگر متوکل جیسے باعظمت خلفاء کے دور تک رافضیت کو نہ تو عام مسلمانوں میں پذیرائی ملی نہ ہی اعتدال پسند اہلِ تشیع میں، کیوں کہ خود مشہور ومعروف اکابر سادات اس وقت موجود تھے اور وہ روافض کے عقائد سے برأت ظاہر کرتے رہتے تھے۔ یہ بات طے ہے کہ جب تک یہ معروف سادات موجود تھے، تشیع اپنی حدود وقیود میں تھا۔ ان کی وفات کے بعد ہی تشیع سے یکدم مختلف شاخیں پھوٹیں اور ہر شاخ نے ایک الگ مذہب کی شکل اختیار کرلی۔ ان اکابر سادات کے دنیا سے گزر جانے کے پچاس ساٹھ سال بعد جب خلافت انتہائی کمزور پڑ چکی تھی اور ہر طرف چھوٹی چھوٹی حکومتیں بننے سے باطل فرقوں کے لیے اپنے عقائد کی کاشت آسان ہوچکی تھی، تو ایسے میں تشیع کے بطن سے رافضیت کی نت نئی شاخوں نے جنم لیا۔ "اثنا عشریہ" فرقہ شیعوں کے لگ بھگ ستر فرقوں میں سے ایک تھا جو عقائد کے اعتبار سے بنو بُویہ کے سیاسی مقاصد کے لیے بہت موزوں تھا۔ بنو بُویہ کے ظہور کے زمانے میں اثنا عشریوں کی "صحاحِ اربعہ" مدوّن ہوئیں جن کی بہت سی روایات قرآن وسنت کی واضح نصوص سے کھلم کھلا متصادم ہیں۔ بنو بُویہ خود تو سادات ہونے کا دعویٰ کرنہیں سکتے تھے؛ کیوں کہ ان کا دَیلمی عجمی ہونا ظاہر تھا۔ مگر اقتدار کے ان عاشقوں کو سادات کے عشق کا دعویٰ کرکے بھی کسی طرح یہ گوارا نہیں ہوسکتا تھا کہ سربراہِ حکومت سیّد ہو۔ حالانکہ اہلِ تشیع کے تمام فرقوں کے نزدیک حکومت سادات ہی کا حق ہے۔ اب جبکہ تین صدیوں کے انتظار کے بعد خود کو عاشقانِ اہلِ بیت کہلانے والے بُویہی بادشاہ گر بن چکے تھے تو انہیں سادات کو حکومت سونپنے میں کیا رُکاوٹ تھی؟

اس کی وجہ یہی تھی کہ بنو بُویہ جس اسلام کو متعارف کرا کے مسلمانوں کو دین وایمان سے محروم کرنا چاہتے تھے، اسے حقیقی ساداتِ کرام کبھی قبول نہیں کرسکتے تھے۔ سادات میں یقیناً بعض حضرات تشیع سے متاثر رہے تھے اور بعض نے روافض کی منافقت اور سادات سے ان کے اظہارِ عقیدت، ان کے پیمانِ حمایت اور کھوکھلے وعدوں سے متاثر ہوکر امویوں اور عباسیوں کے خلاف خروج بھی کیا تھا مگر اب جبکہ بنو بُویہ تشیع کی حدود پار کرکے کھلم کھلا رفض اور زندقہ پھیلانے پر تلے تھے، یہ بہت بعید تھا کہ کوئی صحیح النسب عالم فاضل سیّد ان کی سرپرستی کرتا اور یہ حقیقت بنو بُویہ بھی جانتے تھے کہ سادات سے ان کا کام نہیں نکل سکتا۔ نیز بنو بُویہ کا اصل ہدف اقتدار تھا۔ اگر وہ کسی سید کو سیاسی حاکم بناتے تو یقیناً اختیارات اسی کو منتقل ہوجاتے، اس طرح بنو بُویہ کے اقتدار کا خاتمہ ہوجاتا؛ لہٰذا ایک صدی سے زائد حکومت کے دوران انہوں ایک بار بھی کسی سید کو حکمرانی کا موقع نہ دیا تاکہ اپنا اقتدار محفوظ رہے۔

❁❁❁

بنو بُویہ کے حکمرانوں کی فہرست

۱	عماد الدولہ۔ علی بن بُویہ	۳۲۲ھ تا ۳۳۴ھ (۹۳۴ء تا ۹۴۶ء)	ایران وفارس پر قبضہ، بانی سلطنت
۲	مُعزّ الدولہ۔ ابوالحسین احمد بن بُویہ	۳۳۴ تا ۳۵۶ھ (۹۴۶ء تا ۹۶۷ء)	بغداد پر قبضہ کر کے خلیفہ کو قتل کر دیا۔ خلفاء بے بس۔
۳	عزالدولہ، بختیار بن احمد بن بُویہ	۳۵۶ھ تا ۳۶۴ھ (۹۶۷ء تا ۹۷۵ء)	عیاش، بے رحم
۴	عضد الدولہ بن حسن بن بُویہ	۳۶۴ھ تا ۳۷۲ھ (۹۷۵ء تا ۹۸۲ء)	طاقتور، سخت گیر اور ظالم
۵	صمصام الدولہ بن عضد الدولہ	۳۷۲ھ تا ۳۷۶ھ (۹۸۲ء تا ۹۸۶ء)	بنو بُویہ میں خانہ جنگی
۶	شرف الدولہ بن عضد الدولہ	۳۷۶ھ تا ۳۷۹ھ (۹۸۶ء تا ۹۸۹ء)	نرم مزاج۔ ترقیاتی کام ہوئے
۷	بہاؤ الدولہ بن عضد الدولہ، ابونصر فیروز	۳۷۹ھ تا ۴۰۳ھ (۹۸۹ء تا ۱۰۱۲ء)	سنی شیعہ کش مکش کی انتہاء
۸	سلطان الدولہ بن بہاؤ الدولہ	۴۰۳ھ تا ۴۱۱ھ (۱۰۱۲ء تا ۱۰۲۰ء)	خلیفہ طاقتور، بُویہی کمزور
۹	مشرف الدولہ بن بہاؤ الدولہ	۴۱۱ھ تا ۴۱۶ھ (۱۰۲۰ء تا ۱۰۲۵ء)	بنو بُویہ میں انتشار
۱۰	جلال الدولہ بن بہاؤ الدولہ	۴۱۶ھ تا ۴۳۵ھ (۱۰۲۵ء تا ۱۰۴۳ء	خلیفہ پھر کمزور، بُویہی طاقتور
۱۱	ابوکالیجار سلطان الدولہ بن بہاؤ الدولہ	۴۳۵ھ تا ۴۴۰ھ (۱۰۴۳ء تا ۱۰۴۸ء)	ظالم وجابر
۱۲	الملک العزیز بن جلال الدولہ	۴۴۰ھ تا ۴۴۲ھ (۱۰۴۸ء تا ۱۰۵۰ء)	برائے نام حکمران
۱۳	الملک الرحیم بن ابوکالیجار۔ ابونصر فیروز	۴۴۲ھ تا ۴۴۷ھ (۱۰۵۰ء تا ۱۰۵۵ء)	آخری بُویہی حکمران

مشق

(برائے منتصر تا القائم)

سوالات کے جوابات دیجیے:

1. منتصر کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح کیجیے کہ بنو عباس کے زوال میں اس کا کیا حصہ ہے؟
2. مہتدی باللہ کی خوبیوں پر روشنی ڈالیے۔
3. صاحب الزنج کون تھا اور اس نے کس عباسی خلیفہ کے دور میں فتنہ پھیلایا؟ اس کی سرکوبی کس نے کی؟
4. معتضد باللہ کو "سفاحِ ثانی" کیوں کہا جاتا ہے؟ اس کے اچھے اور برے کاموں پر مختصر نوٹ لکھیے۔
5. کون کون سے عباسی خلفاء کا پایۂ تخت "سامرا" تھا؟
6. بنو بُوَیہ کون تھے؟ انہوں نے عباسی خلفاء اور اہلِ بغداد کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟
7. عباسی خلیفہ القادر باللہ کی پشت پناہی کس بادشاہ نے کی اور اس سے کیا مثبت اثرات ظاہر ہوئے؟
8. القائم باللہ کو کس نے خلافت سے معزول کیا اور اس کی دوبارہ مسند نشینی کس طرح ہوئی؟

عملی کام:

- ایران و عراق کا نقشہ دیکھیے اور اس میں دولتِ بنو بُوَیہ کی حدودِ اربعہ کی نشاندہی کیجیے۔
- سلطان محمود غزنوی یا سلجوقیوں کے حالات پر کوئی کتاب تلاش کر کے اس کا مطالعہ کیجیے۔

کتب برائے مطالعہ:

- تاریخ الخلفاء: المنتصر تا القائم
- تاریخ فرشتہ، از محمد قاسم فرشتہ (فارسی یا اُردو ترجمہ) سلاطینِ غزنویہ کے حالات
- العوامل السياسية واثرها فی ضعف الخلافة العباسية: مساعد بن مساعد الصوفی

(یونٹ:2.10)

القائم (دوبارہ حکمرانی)

ذوالقعدہ ۴۵۱ھ تا شعبان ۴۶۷ھ (۱۴ جنوری ۱۰۶۰ء تا ۱۴ اپریل ۱۰۷۵ء)

طغرل سلجوقی کی مدد سے القائم نے ۲۵ ذوالقعدہ ۴۵۱ھ کو دوبارہ اقتدار سنبھالا۔ اس نے شعائرِ اسلام کو پھر زندہ کیا اور ہر طرف امن وامان ہوگیا۔ علماء کے مشورے سے دربارِ خلافت سے حکم جاری ہوا کہ صحابہ کی توہین کرنے والے خارج از اسلام سمجھے جائیں گے۔ سلجوقی وزیر نظام الملک کے تعاون سے ۱۰ ذوالقعدہ ۴۵۹ھ کو بغداد میں مدرسہ نظامیہ کا اجراء ہوا۔ اسی سال امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے ساتھ احناف کا ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا۔ بنوبُوَیہ کے دور میں مے خانے اور جسم فروشی کے اڈے عام ہوگئے تھے۔ علماء نے خلیفہ کو آگاہ کر کے ان برائیوں کو بند کرایا۔ اقتدار کے ۴۴ سال پورے کر کے القائم بیمار ہوگیا اور ۱۳ شعبان ۴۶۷ھ میں انتقال کر گیا۔ عمر تقریباً ۷۵ سال تھی۔[1]

طغرل بیگ کی وفات:

القائم کی دوبارہ تخت نشینی کے کچھ عرصے بعد ۴۵۵ھ میں اس کا سرپرست سلطان طغرل فوت ہوگیا۔ وہ رعایا پرور اور دیندار انسان تھا۔ مساجد کی تعمیر اور صدقہ وخیرات کا شائق تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی اور اس کے انتقال سے پہلے اس کا بھائی چغر بیگ بھی فوت ہو چکا تھا؛ لہٰذا طغرل کے بعد اس کا بھتیجا یعنی الپ ارسلان بن چغر بیگ بادشاہ بنا۔[2]

الپ ارسلان اور جنگِ ملاز کرد:

الپ ارسلان کے دور میں عراق، خراسان، آذربائی جان اور ایشیائے کوچک تک سلجوقی پرچم لہرانے لگے۔ اسی زمانے میں قیصرِ روم ارمانوس نے یورپی ممالک کی افواج کو ساتھ ملا کر تین لاکھ سپاہیوں کا لشکر تیار کرلیا تھا۔ اسے فتح کا اس قدر یقین تھا کہ اس نے کوچ سے قبل الگ الگ اسلامی ممالک مختلف نوابوں کے نام کردیے تھے۔ ۴۶۳ھ میں قیصر نے یکدم یلغار کی اور ایشیائے کوچک کی سرحدیں روندنے لگا۔

الپ ارسلان فقط پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ شام میں تھا۔ باقی افواج دور دراز کے علاقوں میں تعینات تھیں۔ ادھر قیصر پیش قدمی کرتا ہوا ''ملاز گرد'' تک پہنچ گیا تھا۔ الپ ارسلان کو معلوم تھا کہ اگر وہ پیچھے ہٹا تو عراق وخراسان تک اس طوفان کو روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ وہ انہی پندرہ ہزار سپاہیوں کو لے کر محاذ کی سمت بڑھا۔ جمعہ ۲۷ ذوالقعدہ ۴۶۳ھ کو زوالِ آفتاب کے وقت ملاز کرد کی ''رہوہ'' نامی وادی میں طبلِ جنگ پر چوٹ پڑی۔ الپ ارسلان نے پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھائی۔ پھر سر بسجود ہو کر دیر تک روتے ہوئے نصرت کی دعا مانگی۔ اس کے بعد اعلان کیا:

''اب کوئی سلطان ہے نہ ماتحت۔ جو واپس جانا چاہتا ہے، چلا جائے۔ میں تمہاری طرح عام مجاہد ہوں۔ ساتھ

① البدایۃ والنہایۃ: ۱۶/۷، ۱۳، ۳۷؛ المنتظم لابن الجوزی: ۱۶/۱۱۱ ② المنتظم: ۸/۲۳۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۸/۴۰۹ تا ۱۱۱

دینے والے کے لیے مالِ غنیمت ہے یا جنت۔ بھاگنے والے کے لیے دوزخ ہے یا ذلت۔‘‘

سب نے بیک آواز کہا: ’’ہم آپ کے تابعدار ہیں۔ آپ حملہ کریں۔ ہم ساتھ ہیں۔‘‘

اب دونوں لشکر بری طرح ٹکرائے اور گھمسان کی جنگ ہونے لگی۔ چند گھنٹوں کی خونریز لڑائی کے بعد الپ ارسلان نے حریف کے قلب پر دھاوا بول دیا اور اڑھائی لاکھ کے ٹڈی دل کو چیر کر رکھ دیا۔ رومیوں کے قدم اس طرح اکھڑے کہ دوبارہ نہ جم سکے۔ وہ اندھا دھند راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب شروع کیا جو پوری رات جاری رہا۔ رومیوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور ان کے بے شمار افراد قیدی بن گئے جن میں قیصر ارمانوس سمیت کئی شہزادے اور نواب شامل تھے۔ ارمانوس کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان نے اس سے پوچھا:

’’بتاؤ! اگر تم مجھے گرفتار کرتے تو کیا سلوک کرتے؟‘‘ وہ بولا: ’’بہت برا۔‘‘

سلطان نے کہا: ’’تم نے سچ کہا۔ تم لوگ ایسا ہی کرتے۔ اب مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو کہ میں کیا کروں گا؟‘‘

کہنے لگا: ’’قتل کرو گے یا قیدی بنا کر ان شہروں میں تماشا دکھاؤ گے جنہیں میں فتح کرنے نکلا تھا۔ تیسری بات تو ہو نہیں سکتی کہ تاوان لے کر مجھے چھوڑ دیں۔‘‘ سلطان نے کہا: ’’مگر میں یہی تیسری صورت اختیار کروں گا۔‘‘

سلطان نے پندرہ لاکھ دینار کی ادائیگی اور روم میں قید ہر مسلمان کو رہا کر دینے کی شرطیں منوا کر قیصر کو واپس بھیج دیا۔ وہ اپنے ملک پہنچا تو امرائے روم اتنے بددل تھے کہ انہوں نے اسے معزول کر کے ایک اور رئیس کو تخت پر بٹھا دیا۔

الپ ارسلان کی فتوحات کا دائرہ پھیلتا چلا گیا، وہ مصر فتح کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ۴۶۵ھ میں اچانک ایک قیدی کے حملے کا نشانہ بن کر قتل ہوگیا۔ اس کی عمر چالیس سال تھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ تخت نشین ہوا۔ ①

❁❁❁

اَلْمُقْتَدِی بِاَمْرِ اللّٰہ

عبداللہ بن محمد بن عبداللہ القائم

شعبان ۴۶۷ھ تا محرم ۴۸۷ھ (اپریل ۱۰۷۵ء تا فروری ۱۰۹۴ء)

القائم کے بعد اس کا پوتا المقتدی لامر اللہ کے لقب کے ساتھ خلیفہ بنا۔ اس کا زمانہ بڑا بابرکت رہا۔ معیشت روبہ ترقی تھی۔ سارے حکمران خلیفہ کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ حرمین، بیت المقدس اور شام میں اسی کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ اس نے بغداد سے گویوں اور گلوکاراؤں کو نکال دیا اور اسے ایک مثالی اسلامی معاشرہ بنانے کی پوری کوشش کی۔ ②

تین مجاہد صفت بادشاہوں کا عروج:

اس کے دور میں تین عظیم مجاہد صفت بادشاہوں کو عروج حاصل ہوا: ایک ملک شاہ سلجوقی، جس نے چین سے ایشیائے

① المنتظم: ۸/۲۷۶ تا ۲۷۸؛ دول الاسلام للذھبی: ۱/۲۷۲، ۲۷۳

② البدایۃ والنھایۃ: ۱۶/۵۰؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/۳۵۵

کوچک تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ دوسرا اسلاجقۂ روم کا حکمران سلیمان بن قُتُلمِش: جس نے ۴۷۷ھ میں رومیوں سے انطاکیہ اور رُہا واپس لے لیے۔ تیسرا یوسف بن تاشفین: جس نے مراکش کا شہر آباد کیا اور شمالی افریقہ میں مرابطین کی عالی شان امارت قائم کردی۔ خلیفہ نے اسے ''امیر المسلمین'' کا لقب دیا۔ ①

سقوطِ صِقلّیہ:

تاہم اسی دور میں صِقلّیہ (سسلی) کے سقوط کا سانحہ رونما ہوا جو بحیرۂ روم کا اہم عسکری وتجارتی جزیرہ تھا۔ یہاں اڑھائی صدیوں سے اسلامی حکومت قائم تھی اور یہ اسلامی تہذیب وتمدن کا شاندار مرکز تھا جہاں بڑے نامور اہلِ علم و ادب پیدا ہوئے۔ تاہم ۴۸۴ھ میں یہاں نصرانی قابض ہوگئے۔ صِقلّیہ پہلا ملک تھا جو مسلمانوں سے چھینا گیا۔ ②

خلیفہ مقتدی ۱۹ سال ۵ ماہ حکومت کرکے ۱۸ محرم ۴۸۷ھ کو فوت ہوا۔ اس کی عمر ۳۹ سال تھی۔ ③

ملک شاہ:

خلیفہ مقتدی کے دور میں خلافتِ بغداد کا سرپرست ملک شاہ سلجوقی تھا جو الپ ارسلان کا جانشین تھا۔ ملک شاہ نے ۲۲ سال حکومت کی اور مسلسل فتوحات کے ذریعے اتنی بڑی حکومت قائم کی جو شرقاً غرباً چین کے صوبے کاشغر سے مصر کی سرحد تک، اور شمالاً جنوباً خلیج قُسطَنطِینِیَه سے بحرِ ہند تک وسیع تھی۔ اس کے دور میں ماوراء النہر، آذر بائی جان، الجزیرہ، شام کا اکثر علاقہ اور ایشیائے کوچک سمیت متعدد ممالک سلجوقی سلطنت میں شامل ہوگئے۔ وہ ایک عادل اور علم دوست حکمران تھا۔ اس نے ہر قسم کے ٹیکس معاف کرکے عوام کو خوش حال کردیا تھا۔ سیر وشکار اور عمارتیں بنوانے کا شوقین تھا۔ اس نے بکثرت مساجد، مدارس، پل اور قلعے تعمیر کرائے۔ بغداد کی سب سے بڑی مسجد جامع کبیر اس کی یادگار تھی۔ شوال ۴۸۵ھ میں وہ بیمار پڑ کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کی عمر ۳۹ سال تھی۔ ④

نظام الملک طوسی:

ملک شاہ کا وزیر نظام الملک طوسی اسلامی تاریخ کی مشہور ومعروف شخصیت ہے۔ ملک شاہ کی حکومت کو مثالی بنانے میں اس کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ ملک شاہ فتوحات کرتا جاتا اور نظام الملک نہایت خوش اسلوبی سے مختصر وقت میں مفتوحہ علاقوں کے انتظامی امور قابلِ رشک بنادیتا تھا۔ وہ دفتری کام کے لیے ہمیشہ باوضو بیٹھتا اور دو رکعت نفل پڑھ کر کام شروع کرتا۔ علماء، بزرگان دین اور صالحین کا بے حد احترام کرتا۔ بغداد کا شہرۂ آفاق ''مدرسہ نظامیہ'' اسی کا تعمیر کردہ تھا۔ یہ پہلی جامعہ تھی جہاں مختلف علوم وفنون کے ماہرین جمع تھے اور طلبہ کی خوراک ورہائش کا انتظام بھی تھا۔ اس کی تعمیر کا آغاز ۴۵۷ھ میں ہوا اور ۴۵۹ھ میں تعلیمی سلسلہ شروع ہوگیا۔ نظام الملک نے نیشاپور اور اصفہان میں بھی ایسی درسگاہیں قائم کیں۔ نیز طوس، مرو، ہرات، بلخ اور بصرہ میں بھی مدارس کھلوائے جن میں سے ہر ایک ''مدرسہ نظامیہ''

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴۸۲ھ، ۴۷۷ھ ② الکامل فی التاریخ، سنۃ ۴۸۳ھ

③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۳؛ العبر فی خبر من غبر: ۳۵۵/۲ ④ وفیات الاعیان: ۲۸۳/۵؛ سیر اعلام النبلاء: ۵۶/۱۹

کہلایا۔ سلجوقی سلاطین عدلیہ اور انتظامی عہدوں کے لیے قابل افراد انہی درسگاہوں سے حاصل کرتے تھے۔

نظام الملک کے دورِ وزارت میں مشہور اسماعیلی داعی حسن بن صبّاح کا ظہور ہوا۔ وہ ایران سے مصر گیا اور دولتِ بنوعبید کا کارندہ بن کر واپس آیا۔ پھر اس نے ایک دہشت گرد گروہ تیار کرلیا جس کا ایک کارکن رمضان ۴۸۵ھ میں درویش بن کر نظام الملک طوسی سے ملا اور خنجر سے اسے قتل کردیا۔ طوسی کے آخری الفاظ یہ تھے:

''قاتل کو کچھ نہ کہنا۔ میں نے اسے معاف کیا۔ لا الٰہ الا اللہ'' ①

سلجوقی حکمرانوں کی مختلف شاخیں:

سلجوقی حکمرانوں نے لگ بھگ ڈیڑھ صدی تک وسطِ ایشیا، خراسان، ایران، عراق اور شام پر حکومت کی۔ ان کے عروج کا دور تقریباً ۶۰ سال تک رہا۔ ملک شاہ کی وفات کے بعد مختلف علاقوں میں سلجوقی نوابوں اور امراء نے خود مختاری اختیار کرلی جس کی وجہ سے سلجوقی حکومت کمزور ہوگئی۔ تقریباً ۲۵ سال تک خانہ جنگی کا شکار رہنے کے بعد سلطان سنجر سلجوقی کے زمانے میں اس خاندان نے دوبارہ قدم جمانے کی کوشش کی مگر اسے سابقہ عروج نصیب نہ ہوا۔ چھٹی صدی ہجری کے اواخر تک سلجوقیوں کی صرف ایک قابلِ ذکر حکومت باقی رہ گئی جو ایشیائے کوچک میں تھی۔

بنوعباس کے حالات کے ضمن میں سلاجقہ کا تذکرہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اس دور میں عالمِ اسلام کی سیاست کا اہم ترین کردار تھے۔ اب آگے ہم دوبارہ خلفائے بنوعباس کے حالات بیان کرتے ہیں۔

❀❀❀

اَلْمُسْتَظْهِر بِاللّٰه

احمد بن عبداللہ المقتدی

محرم ۴۸۷ھ تا ربیع الآخر ۵۱۲ھ (فروری ۱۰۹۴ء تا اگست ۱۱۱۸ء)

المقتدی کے بعد اس کا ۱۷ سالہ بیٹا احمد ''اَلْمُسْتَظْهِر'' کا لقب اختیار کر کے خلیفہ بنا۔ وہ نیک، مہربان، خوش اخلاق، عادل اور عوام کا محبوب حکمران تھا۔ تاہم اس کا دور فتنوں اور افراتفری سے بھرپور تھا۔

اس دور میں ملک شاہ سلجوقی کے جانشینوں میں پھوٹ پڑگئی تھی۔ ملک شاہ کا بھائی تاج الدولہ تتش شام، الجزیرہ اور عراق کے وسیع علاقوں پر قابض ہوگیا اور ملک شاہ کے ۱۳ سالہ بیٹے سلطان برکیارُق سے حکومت چھیننے کے لیے لڑتا رہا یہاں تک کہ ۴۸۸ھ میں تتش خود اسی کش مکش میں قتل ہوگیا۔ سلطان برکیارُق قدم جمانے کے بعد اپنے چچا ارسلان ارغون سے خراسان چھیننے کے لیے آمادۂ پیکار رہا یہاں تک کہ ارسلان ارغون ۴۹۰ھ میں ایک قاتلانہ حملے کے دوران مارا گیا۔ خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر شام کے سلجوقی امراء خود مختار بن گئے اور اس عظیم ملک کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ ②

---

① طبقات الشافعیہ للسبکی: ۳۱۲/۳؛ المنتظم: ۶۷/۹، ۶۸؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۴۸۵ھ

② تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۳، ط نزار؛ العبر فی خبر من غبر للذھبی: ۳۵۶/۲، ۳۶۲

یورپ میں بیت المقدس کی بازیابی کی تحریک:

بیت المقدس کو مسلمانوں، یہودیوں اور نصرانیوں: تینوں کے ہاں مقدس شہر کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں نصرانیوں کی مزعومہ مرقدِ مسیح تھی جو ان کے نزدیک مقدس ترین مقام تھا اور اسی لیے وہ صدیوں سے اس کی بازیابی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اُدھر مصر کے عبیدی حکمران شاہانِ یورپ کو شام پر حملے کے لیے اکسا رہے تھے تاکہ ان کے مخالف سلجوقی دب جائیں مگر یورپی دُنیا سلجوقیوں سے خائف تھی تاہم سلجوقی حکمران ملک شاہ اچانک فوت ہوا اور شہزادوں میں خانہ جنگی کے باعث شام کی سلجوقی حکومت کئی ٹکڑوں میں بٹ کر کمزور ہوئی تو یورپی بادشاہوں کی ہمت بڑھ گئی۔

انہی دنوں ایک جنونی راہب پطرس دی ہرمٹ بیت المقدس کی زیارت کے لیے آیا اور واپس یورپ جا کر اس نے نفرت انگیز تقریر کر کے لوگوں کو یقین دلایا کہ مسلمان ان کے مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ اس مذہبی اشتعال نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور پوپ اربن ثانی اس کا سرپرست بن گیا۔ اس نے ذوالقعدہ ۵۸۸ھ (نومبر ۱۰۹۵ء) میں فرانس کے شہر کلرماؤنٹ میں ایک عظیم مذہبی کانفرنس بلا کر اعلان کیا کہ جو القدس کی بازیابی کی جنگ میں شامل نہیں ہوگا وہ دینِ مسیح سے خارج ہوگا۔ یورپی بادشاہ اپنی ساکھ برقرار رکھنے کی خاطر جبکہ نواب اور سردار نئی جاگیروں اور مالِ غنیمت کے لالچ میں جنگ پر آمادہ ہو گئے اور کئی ماہ تک جنگی تیاریاں ہوتی رہیں۔ اس جنگ کو کروسیڈ (صلیبی جنگ) کا نام دے دیا گیا۔ لوگوں نے اپنے کپڑوں کو سرخ صلیب سے سجا لیا۔ ①

سقوطِ بیت المقدس:

آخر کار جمعہ ۱۵ اگست ۱۰۹۶ء کو پوپ اربن ثانی نے وینس کے مقام پر پہلی صلیبی جنگ کا اعلان کیا اور فرانس کے حکمران گاڈفرے کی قیادت میں کئی لاکھ صلیبی شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اُدھر سے مصر کے بنو عبید نے بھی شام کی طرف پیش قدمی کی اور بیت المقدس کو سلجوقیوں سے چھین لیا۔ چند ماہ بعد صلیبیوں کا سیلاب شام آن پہنچا جس نے ۹ ماہ کے محاصرے کے بعد جمادی الاولی ۴۹۱ھ (مئی ۱۰۹۸ء) میں شمالی شام کے اہم شہر انطاکیہ پر قبضہ کر لیا اور پھر بیت المقدس کی طرف بڑھنے لگا۔ مسلمان باہمی اختلافات کے باعث کہیں بھی صلیبیوں کا جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔

رجب ۴۹۲ھ میں القدس کا محاصرہ شروع ہو گیا جو بیالیس دن تک جاری رہا۔ اس دوران کہیں سے بھی محصورین کو امداد نہ پہنچ سکی۔ آخر شعبان ۴۹۲ھ (جولائی ۱۰۹۹ء) میں صلیبی شہر میں گھس گئے اور شہریوں کا بری طرح قتلِ عام کیا۔ کم از کم ستر ہزار مسلمان شہید کیے گئے۔ مسجد اقصیٰ میں مقتول مسلمانوں کا اتنا خون بہا جس میں صلیبیوں کے گھوڑے گھٹنوں تک ڈوب گئے تھے۔

بیت المقدس کے سقوط کے بعد مسیحی اقوام نے مقبوضہ شام و فلسطین کو تقسیم کر کے الرُّھا، انطاکیہ، بیت المقدس اور طرابلس کی چار مستقل صلیبی ریاستیں قائم کر لیں، جہاں یورپی بادشاہوں کے نائبین آزادانہ حکومت کرتے تھے۔

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۰، ۳۰۵؛ الکامل فی التاریخ: سنة ۴۹۰ھ، ۴۹۱ھ، ۴۹۲ھ

یہ ریاستیں اگلے چند عشروں میں مزید پھیلتی گئیں۔ شام کی تقریباً تمام اہم بندرگاہیں جو بحیرۂ روم کے ساتھ لگتی تھیں، رفتہ رفتہ یورپ کے ہاتھ آ گئیں۔ غزہ سے لے کر انطاکیہ کے شمال تک تمام ساحل ان کے پاس چلے گئے۔ ①

(بیت المقدس پر صلیبیوں کے قبضے اور صلیبی جنگوں کی تفصیل جلد دوئم میں آئے گی۔)

سلجوقیوں میں جنگ اور صلح:

مسلم حکمران اس دوران بھی باہمی تنازعوں کا شکار تھے۔ ملک شاہ کا ایک بیٹا محمد اپنے بھائی سلطان برکیارُق کے خلاف کھڑا ہو گیا اور اسے خراسان سے دھکیل دیا۔ خلیفہ نے محمد کو سلطان مان لیا اور بغداد میں دستور کے مطابق اس کا نام خطبے میں شامل کر دیا۔ مگر برکیارُق نے محمد کو سلطان تسلیم نہ کیا اور آمادۂ پیکار رہا۔ ۴۹۳ھ اور ۴۹۴ھ میں دونوں بھائیوں کے درمیان دو بڑی جنگیں ہوئیں۔ ۴۹۵ھ میں مزید دو لڑائیاں ہوئیں۔ ۴۹۶ھ میں پانچواں معرکہ ہوا۔

پانچ سالہ خانہ جنگی کے بعد ۴۹۷ھ میں عمائد اور علماء و فضلاء نے بیچ میں پڑ کر صلح کرائی۔ ۴۹۸ھ میں برکیارُق فوت ہو گیا اور محمد بن ملک شاہ اس کے پانچ سالہ بیٹے کی ولی عہدی منسوخ کرا کر خود سلطان بن گیا۔ ②

شام میں فرنگیوں کی مسلسل فتوحات:

خلیفہ مقتدی کے دور میں فرنگیوں کے دھاوے جاری رہے۔ ۵۰۳ھ میں وہ بانیاس، طرطوس اور طرابلس پر قابض ہو گئے۔ ۵۰۴ھ میں حصنِ اثارب، بیروت اور صیدا بھی ان کے قبضے میں چلے گئے۔ ③

باطنیوں کا فتنہ:

خلیفہ مستظہر کے دور میں حسن بن صبّاح کا فتنہ ہر طرف چھا گیا تھا۔ اس کے خنجر بردار ایران سے شام تک پھیل چکے تھے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی شخصیت ان خنجروں کا نشانہ بن جاتی تھی۔ بعض مواقع پر سلجوقی امراء نے بھی باطنیوں کا سراغ ملنے پر ان کے خلاف سخت کارروائیاں کیں اور ان کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ④

سلطان محمد سلجوقی اور خلیفہ مستظہر کی وفات:

سلطان محمد کی حکومت ۵۱۱ھ تک رہی۔ وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا محمود بن محمد حکمران بن گیا۔ ⑤ اگلے برس ۱۶ ربیع الآخر ۵۱۲ھ کو خلیفہ مستظہر باللہ خناق کے مرض میں مبتلا ہو کر چل بسا۔ اس کی عمر ۴۲ سال تھی۔ مدتِ حکومت ۲۵ سال تھی۔ ⑥

❁❁❁

---

① الحروب الصلیبیۃ فی المشرق والمغرب لدکتور محمد العروسی المطوی: ص ۲۹ تا ۳۵؛ موجز الحروب الصلیبیۃ از مصطفی وھبہ: ص ۲۰ تا ۳۱، ط مکتبۃ الایمان، قاہرہ؛ تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی بحوالہ تاریخ یورپ، اے جے گرانٹ، ص: ۲۵۷

② تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۵، ۳۰۴؛ العبر فی خبر من غبر: ج ۲ ص ۳۶۸، ۳۷۰، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۶

③ العبر فی خبر من غبر: ۲/ ۳۷۴، ۳۸۴، ۳۸۵؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۵

④ تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۶؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/ ۳۹۳، ۳۹۷؛ الکامل فی التاریخ: ۸/ ۳۵۴، ۴۱۳، ۴۲۳، ۴۳۰، ۴۵۰، ۴۵۴

⑤ العبر فی خبر من غبر: ۲/ ۳۹۷ ⑥ العبر فی خبر من غبر: ۲/ ۳۹۷

اَلْمُسْتَرْشِد باللہ

الفضل بن احمد المستظہر

ربیع الآخر ۵۱۲ھ تا ذوالقعدہ ۵۲۹ھ (اگست ۱۱۱۸ء تا ستمبر ۱۱۳۵ء)

مستظہر کے بعد اس کے بیٹے ابو منصور الفضل نے اَلْمُسْتَرْشِد باللہ کا لقب اختیار کر کے مسندِ خلافت سنبھالی۔ وہ نیک، عبادت گزار، سادگی پسند اور جنگجو حکمران تھا۔ اون کا موٹا لباس پہنتا۔ لڑائیوں میں بذاتِ خود حصہ لیتا تھا۔ ①

حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "مُعتَضِد کے بعد مسترشد سے زیادہ بہادر خلیفہ کوئی نہیں گزرا۔ وہ دلیر، شجاع، آگے بڑھ کر حملہ کرنے والا، انتہائی رعب دار، سمجھدار، بیدار مغز اور عالی ہمت تھا۔" ②

عراق میں خانہ جنگیاں:

المسترشد باللہ کے دور میں عراق مسلسل خانہ جنگیوں کا شکار رہا۔ سلجوقی بادشاہت کے وارث آپس میں بری طرح دست و گریباں رہے۔ بغداد پر کبھی ایک مسلط ہوتا کبھی دوسرا۔ خراسان پر سلطان سنجر سلجوقی کی حکومت تھی اور عراق میں سلطان محمود بن محمد سلجوقی حکمران تھا۔ ان کے علاوہ سلطان مسعود سلجوقی بھی اس منظرنامے کا اہم حصہ تھا۔ بصرہ کا حاکم عماد الدین زنگی اور عرب سردار دبیس بن صدقہ بھی ان لڑائیوں میں شریک رہے۔ ③

دُبیس بن صدقہ کا فتنہ:

مسترشد کے دور میں عراق کے ایک شیعہ عرب جاگیردار دبیس بن صدقہ الاسدی نے بڑا فتنہ برپا کیا جو فصاحت و بلاغت اور ادباء و شعراء کی قدردانی کے علاوہ سفاکی اور عیاری میں بھی مشہور تھا۔ ۵۱۶ھ میں اس نے دربار خلافت سے کھلم کھلا باغی ہو کر عراق میں اس قدر اودھم مچایا کہ عازمینِ حج، حجاز نہ جا سکے۔ آخر محرم ۵۱۷ھ میں خلیفہ مسترشد اس کے مقابلے پر نکلا۔ تین صدیوں بعد یہ پہلی لڑائی تھی جس میں خلیفہ خود قیادت کر رہا تھا۔ جنگ میں دُبیس بُری طرح شکست کھا کر بھاگا۔ ۵۱۹ھ میں اس نے سلجوقی شہزادے محمد بن طغرل کو ساتھ ملا کر بغداد پر دوبارہ حملہ کیا۔ اس بار بھی خلیفہ نے اسے شکست دی۔ ۵۲۶ھ میں دُبیس نے تیسری بار بغداد پر قبضے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ④

سلطان مسعود سلجوقی اور خلیفہ کے مابین کش مکش:

۵۲۵ھ میں سلطان مسعود سلجوقی تخت نشین ہوا اور خلیفہ مسترشد نے بغداد میں اس کے نام کا خطبہ شروع کرا دیا مگر اس کے باوجود بعض وجوہ سے سلطان مسعود خلیفہ سے ناراض ہو گیا اور فوج لے کر بغداد کی طرف روانہ ہو گیا جس کا

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۷ ② العبر فی خبر من غبر: ۲/۴۳۳

③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۷، ۳۰۸؛ دول الاسلام للذھبی: ۲/۵ تا ۴۳

④ سیر اعلام النبلاء: ۱۹/۲۱۳؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۷؛ المنتظم لابن الجوزی: ۱۷/۲۰۹، ۲۱۷، ۲۲۹، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۳، ۲۷۱

ہراول دستہ دُبیس کی کمان میں تھا۔ اُدھر سے مسترشد نے بھی یلغار کی۔ ۱۰ رمضان ۵۲۹ھ کو ہمدان کے قریب جنگ ہوئی جس میں امرائے بغداد نے غداری کر کے خلیفہ کو تنہا چھوڑ دیا اور سلطان مسعود نے خلیفہ کو گرفتار کر لیا۔ اس واقعے سے بغداد میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ عورتیں تک خلافت کی رسوائی کا ماتم کرنے لگیں۔ عوام غم کی شدت سے بے حال تھے۔ ①

اس کے بعد عراق میں یکے بعد دیگرے کئی زلزلے آنے لگے۔ خراسان کے سلجوقی حکمران سلطان سنجر کو ان حالات پر اتنا دکھ ہوا کہ اس نے سلطان مسعود کو فوراً ایک ملامت آمیز خط لکھ کر خلیفہ سے معافی مانگنے اور بغداد واپس بھیجنے کی تاکید کی۔ سلطان مسعود یہ مراسلہ پڑھ کر خلیفہ مسترشد کے خیمے میں حاضر ہوا، معافی مانگی اور دُبیس کو ہاتھ پاؤں باندھ کر خلیفہ کے سامنے پیش کر دیا اور کہا: ''ہمارے درمیان جو کچھ ہوا، اس کا ذمہ دار یہی شخص ہے۔''

خلیفہ مسترشد نے سلطان کا عذر قبول کر لیا اور دُبیس کو بھی معاف کر دیا۔ مگر اس سے پہلے کہ خلیفہ کو بغداد واپس روانہ کیا جاتا، کچھ باطنی خلیفہ کے خیمے میں گھس گئے اور اسے خنجر مار کر شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۷ ذوالقعدہ ۵۲۹ھ کا ہے۔ متعدد مؤرخین کا کہنا ہے کہ سلطان مسعود نے خود باطنیوں کو خلیفہ کے خیمے پر حملے کے لیے بھیجا تھا۔ اس خبر سے بغداد میں ماتم کا سماں ہو گیا اور عورتیں روتی پیٹتی گھروں سے نکل آئیں۔ مسترشد کی عمر ۴۳ سال تھی۔ اس نے سترہ سال چھ ماہ حکومت کی۔ وہ آخری خلیفہ تھا جو جمعے اور عیدین کا خطبہ دیا کرتا تھا۔ ②

❁❁❁

الراشد باللہ

منصور بن الفضل المسترشد

ذوالقعدہ ۵۲۹ھ تا ذوالقعدہ ۵۳۰ھ (ستمبر ۱۱۳۵ء تا اگست ۱۱۳۶ء)

خلیفہ مسترشد کی شہادت کے بعد بغداد میں اس کا بیٹا ابوجعفر منصور راشد باللہ کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔

سلطان مسعود نئے خلیفہ کو اپنے زیرِ نگین رکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے خلیفہ سے سات لاکھ دینار طلب کیے۔ خلیفہ نے اپنے امراء سے مشورہ کر کے سلطان کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

سلطان مسعود سلجوقی نے یہ دیکھ کر خلیفہ کو معزول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بغداد آ کر علمائے شہر کے سامنے استفتاء پیش کیا کہ خلیفہ نے برے کاموں، خونریزی اور ناجائز امور کا ارتکاب کیا ہے، کیا وہ اس کے بعد بھی خلیفہ رہ سکتا ہے؟

سلطان کے نائب کے ڈرانے دھمکانے پر ۱۶ ذوالقعدہ ۵۳۰ھ کو بعض علماء نے خلیفہ کی معزولی کا فتویٰ دے دیا اور سلطان نے راشد باللہ کے چچا سابق خلیفہ مستظہر کے بیٹے محمد کو خلیفہ طے کر دیا۔ راشد کو معزول کر دیا گیا۔

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۷، ۳۰۸؛ الکامل فی التاریخ سنۃ ۵۲۹ھ؛ المنتظم: ۲۹۲/۱۷، ۲۹۳

② المنتظم: ۲۹۷/۱۷؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۸؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۲۹ھ؛ البدایۃ والنہایۃ: ۳۰۵/۱۶، ۳۰۶؛ العبر فی خبر من غبر: ۲۳۳/۲؛ وفیات الاعیان: ۲۶۵/۲

راشد باللہ سلطان کی بغداد آمد سے پہلے ہی گرفتاری کے ڈر سے فوج سمیت فرار ہو گیا تھا۔ وہ علماء سے اتنا ناراض ہو چکا تھا کہ بعض علماء کی ڈاڑھیاں منڈوادیں۔ ۲۶ رمضان ۵۳۲ھ کو کچھ لوگوں نے حملہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حملہ باطنیوں نے کیا تھا۔ ①

❁❁❁

اَلْمُقْتَفِی لِاَمْرِاللہ

محمد بن احمد المستظہر

ذوالقعدہ ۵۳۰ھ تا ربیع الاول ۵۵۵ھ (اگست ۱۱۳۶ء تا مارچ ۱۱۶۰ء)

۵۳۰ھ میں راشد باللہ کے فرار کے فوراً بعد سلطانِ عراق مسعود سلجوقی کی حمایت سے بغداد میں مقتفی کو خلیفہ بنادیا گیا۔ وہ نیک وصالح اور قابل تھا مگر سلطان مسعود اس پر مسلط تھا؛ اس لیے خلیفہ تقریباً بے بس تھا۔

اس دوران خراسان کے سلجوقی کمزور پڑ چکے تھے اور ان کے علاقے میں "تُرکانِ غُز" اودھم مچا رہے تھے۔ ۵۳۶ھ میں سلطان سنجر سلجوقی کو ترکانِ غُز کے مقابلے میں شکستِ فاش ہوئی اسے اپنی حالت درست کرنے میں کئی سال لگے۔ ۵۴۸ھ میں بلخ کے قریب سنجر کی "ترکانِ غُز" سے ایک اور بڑی جنگ ہوئی جس میں وہ خود گرفتار ہو گیا۔

تُرکانِ غُز کے پاس تین سال چار ماہ تک یرغمال رہنے کے بعد رمضان ۵۵۱ھ میں وہ موقع پا کر فرار ہو گیا اور اپنے پایۂ تخت مرو آ گیا مگر فقط چھ ماہ بعد ربیع الاوّل ۵۵۲ھ میں اس کی وفات ہو گئی۔ عمر ۷۲ سال تھی۔ اس کی وفات سے وسطِ ایشیا اور خراسان میں سلجوقیوں کی بادشاہت ختم ہو گئی۔ ②

دنیائے اسلام کا نیا محافظ، عمادالدین زنگی:

انہی سالوں میں مُوصل کے خود مختار حکمران عمادالدین زنگی کو عروج ملا جس نے شام کے ساحل پر قابض صلیبیوں سے جنگیں لڑ کر مسلمانوں کی پژمردہ مدافعانہ قوت کو نئی زندگی بخش دی۔ اس نے جمادی الآخرہ ۵۳۹ھ میں نصرانی ریاست اڈیسہ کے مرکز رُہا کو فتح کر لیا جس سے دنیائے اسلام میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خلیفہ مُقتفی نے عمادالدین زنگی کا نام بغداد میں خطبے میں داخل کر لیا۔ مؤرخین اس واقعے* "فتح الفتوح" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ ③

نورالدین زنگی اور دوسری صلیبی جنگ:

عمادالدین کے بعد اس کی مملکت دو حصوں میں بٹ گئی: شام اس کے چھوٹے بیٹے نورالدین محمود زنگی کے پاس

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۰۹، ۳۱۰؛ المنتظم: ۱۷/ ۳۰۰؛ البدایۃ والنہایۃ: ۲/ ۲۳۷

② تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۰؛ العبر فی خبر من غبر: ۳/ ۴، ۲۷؛ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۳۶ھ، ۵۴۸ھ، ۵۵۱ھ، ۵۵۲ھ، ۵۵۳ھ، ۵۵۶ھ؛ وفیات الاعیان: ۲/ ۳۲۷، ۳۲۸

③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۵۳۹ھ؛ عیون الروضتین فی اخبار الدولتین لابی شامہ: ۱/ ۳۳، ط مؤسسۃ الرسالہ؛ الکامل فی التاریخ: ۹/ ۱۳۲، ۱۳۳

آ گیا جبکہ مُوصل اور الجزیرہ کی حکومت اس کے بڑے بیٹے سیف الدین غازی کو مل گئی۔ نور الدین زنگی اپنی وفات تک شام کے نصرانیوں سے لڑتا رہا۔ اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد یورپی نصرانیوں نے ۵۴۲ھ میں شام پر مشترکہ حملہ کیا جو دوسری صلیبی جنگ کے نام سے موسوم ہوا۔ ۵۴۳ھ میں وہ دِمَشق تک پہنچ گئے تاہم نور الدین زنگی اور امرائے دمشق کی بہترین دفاعی وسیاسی تدابیر کی بدولت نصرانیوں کو آخر کار ناکام ونامراد ہو کر واپس لوٹنا پڑا۔ ①

سلطان مسعود اور خلیفہ کے مابین کش مکش:

ادھر خلافتِ بغداد اور عراق کے سلجوقی حکمران سلطان مسعود کے درمیان کش مکش جاری تھی۔ سلطان مسعود نے خلیفہ مُقتفِی کو اسی طرح دبانے کی کوشش کی جیسے بنو بُوَیہ خلفاء کو مغلوب رکھتے تھے۔ خلیفہ کی معیشت مفلوج کر دی گئی تھی۔ اس کے اصطبل میں چار گھوڑوں اور آٹھ خچروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ خلیفہ نے تنگ آکر قنوتِ نازلہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایک مہینہ پورا ہونے سے قبل سلطان مسعود کا بستر پر انتقال ہوگیا۔ یہ ۵۴۷ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد خلافتِ بغداد آخر تک بیرونی حکمرانوں کے تسلط اور دباؤ سے محفوظ رہی۔ ②

سلاجقہ کے دور پر ایک نظر:

سلجوقیوں کا ظہور اس وقت ہوا تھا جب اُمتِ مسلمہ کے سیاسی ایوان باطل فرقوں کے قبضے میں تھے۔ سلجوقیوں نے سیاست کے اس بگاڑ کو ختم کر کے خلافتِ عباسیہ کے پامال شدہ وقار کو ایک بار پھر بحال کر دیا۔ البتہ انہوں نے عسکری طاقت اپنے پاس ہی رکھی اور اس لحاظ سے وہ خلافتِ عباسیہ سے زیادہ طاقتور تھے اور بعض اوقات وہ عملی طور پر یہ باور بھی کراتے رہتے تھے۔ اس طرح عالم اسلام میں طاقت کا مرکز الگ اور سیاسی وحدت کا مرکز الگ ہوگیا۔ سلجوقی شاہِ جنگ تھے اور خلیفہ شاہِ سیاست۔ یہ ایک پیچیدہ صورتحال تھی اور طاقت کے دونوں مراکز کے مابین توازن رکھنا بڑی وسیع النظر فی اور تدبّر کا تقاضا کرتا تھا۔ یہ فریقین کی سیاسی سوجھ بوجھ اور دور اندیشی کا بہت بڑا امتحان تھا۔ جب تک سلجوقی سلاطین اور خلفاء کے مابین خلوص، نیک نیتی اور احترام کے جذبات قائم رہے معمولی لغزشیں نظر انداز بھی ہوتی رہیں مگر آگے چل کر فریقین میں سرد مہری آگئی اور بات سخت کشیدگی تک جا پہنچی۔

سلجوقیوں کے زوال کے اسباب:

سلجوقیوں کے زوال کا پہلا سبب ان کی آپس کی خانہ جنگی تھی۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ ان کی ساری طاقت فوجی عناصر پر مشتمل تھی۔ ہر سپہ سالار اپنے علاقے کا صوبے دار تھا۔ اس لیے جونہی مرکزی حکومت کمزور پڑی، ان سپہ سالاروں نے جگہ جگہ خود مختار حکومتیں بنالیں۔

تیسرا سبب ان کے آخری چند حکمرانوں کا خلفاء کے ساتھ نامناسب سلوک اور جارحانہ رویہ تھا۔ اس رویے نے

① وفیات الاعیان: ۱۸۳/۵، ۱۸۵؛ العبر فی خبر من غبر: ۲/ ۴۶۳، ۴۶۴ ② تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲

سلجوقی حکمران صالحین کی دعاؤں اور عوام کی دلی حمایت سے محروم
افتراق اور خانہ جنگی کو جنم دیا اور آخری دور کے منتشر ہوتے ہوتے آخرِ کار منظرِ عام سے غائب ہوگئے۔
ہوگئے۔ یوں اللہ کی نصرت کا سایہ اٹھ گیا اور وہ بھی کمزور اور

خلیفہ مُقْتَفِی آزادانہ حیثیت کی بحالی کے بعد:

خلیفہ مُقْتَفِی آزادانہ حیثیت کی بحالی کے بعد بغداد کی قدیم آزادانہ حیثیت ازسرِ نو بحال ہوگئی۔
۵۴۷ھ میں سلطان مسعود سلجوقی کی وفات کے بعد خلافتِ بغداد کی قدیم آزادانہ حیثیت ازسرِ نو بحال ہوگئی۔
مدت سے بغداد کی پیشہ ور فوج فقط چھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ مُقْتَفِی نے ۵۴۹ھ میں تین لاکھ دینار خرچ کر کے
اسے دوگنا کردیا۔ ۵۵۰ھ میں خلیفہ نے ''دقوقا'' اور ''خوزستان'' کی طرف فوجیں بھیجیں۔ مدتوں بعد ایسا ہوا کہ[1]
خلیفہ نے خود کسی علاقے پر لشکر کشی کی ہو۔ اگرچہ دونوں مہمات میں کوئی علاقہ فتح نہ ہوسکا مگر خوزستان کے حاکم ملک شاہ
بن محمد نے بعد میں از خود خلیفہ سے معافی مانگی۔ الغرض اب خلیفہ کی حیثیت ماضی کے مقابلے میں بہت بلند ہوگئی تھی۔[2]
۵۵۱ھ میں رے کے سلجوقی حکمران محمد بن محمود نے خلیفہ سے مطالبہ کیا کہ اس کا نام خطبے میں شامل کیا جائے مگر
خلیفہ نے انکار کردیا۔ محمد بن محمود نے ناراض ہوکر ۵۵۲ھ کے آغاز میں بغداد پر یلغار کردی مگر بغداد کی فوج اور عوام نے[3]
مل کر سلجوقی لشکر کو پسپا کردیا۔ واپسی کے سفر میں اس لشکر کو بیماریوں نے گھیر لیا اور محمد بن محمود بھی بیمار ہوکر چل بسا۔
آٹھ برس تک حکومت کرنے کے بعد ۲ ربیع الاوّل ۵۵۵ھ کو خلیفہ مُقْتَفِی کا انتقال ہوگیا۔ عمر ۶۶ سال تھی
اور مدتِ خلافت ۲۴ سال ساڑھے تین ماہ۔[4]

❁❁❁

اَلْمُسْتَنْجِد باللہ

یوسف بن محمد المقتفی

ربیع الاوّل ۵۵۵ھ تا ربیع الآخر ۵۶۶ھ (مارچ ۱۱۶۰ء تا دسمبر ۱۱۷۰ء)

مُقْتَفِی کے بعد اس کا بیٹا مُسْتَنْجِد باللہ خلیفہ بنا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح علم دوست، ذہین، عادل اور نیک سیرت تھا۔ اس نے عوام پر کوئی ٹیکس باقی نہیں چھوڑا، ظالم حکام کو معزول کر دیا اور ہر قسم کے شر و فساد کا خاتمہ کر دیا۔ وہ کتبِ فلاسفہ کو سخت مضر تصور کرتا تھا چنانچہ اس نے اس قسم کی کتب کے ایک بڑے ذخیرے کو تلف کرا دیا۔[5]

نورالدین زنگی کے کارنامے:

مُسْتَنْجِد باللہ کے دور میں سلطان نورالدین زنگی کا ستارۂ اقبال عروج پر تھا۔ اسلام کے اس محافظ نے ۵۵۹ھ

---

① البداية والنهاية: ۳۹۳/۱۶؛ تاريخ الخلفاء، ص ۳۱۱، ۳۱۲؛ العبر في خبر من غبر: سنة ۵۴۹هـ
② الكامل في التاريخ: سنة ۵۵۰هـ ③ الكامل في التاريخ: سنة ۵۵۱هـ
④ البداية والنهاية: ۳۹۳/۱۶؛ تاريخ الخلفاء، ص ۳۱۱، ۳۱۲ ⑤ تاريخ الخلفاء، ص ۳۱۳؛ البداية والنهاية: ۴۳۳/۱۶

میں فرنگیوں کا مضبوط ترین قلعہ ''حارم'' فتح کرلیا۔ اس جنگ میں دس ہزار فرنگی مارے گئے اور ان کے بڑے بڑے نامور سپہ سالار اور نواب گرفتار ہو گئے۔ ۵۶۲ھ میں نور الدین زنگی نے مصری حکمران العاضد کی درخواست پر اپنے امیر شیر کوہ کو ایک فوج دے کر مصر کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ یہ اقدام مصر پر مکمل قبضے کی تمہید ثابت ہوا۔ ①

مُسْتَنْجِد کی وفات:

مُسْتَنْجِد باللہ کا دور بہت پر امن گزرا۔ گیارہ برس تک عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد وہ بیمار ہو کر ۸ ربیع الآخر ۵۶۶ھ میں فوت ہو گیا۔ عمر ۴۸ برس تھی۔ ②

اَلْمُسْتَضِیْءُ بِاَمْرِاللّٰہِ

الحسن بن یوسف المستنجد

ربیع الآخر ۵۶۶ھ تا شوال ۵۷۵ھ (دسمبر ۱۱۷۰ء تا اپریل ۱۱۸۰ء)

مُسْتَنْجِد باللہ کے بعد اس کا بیٹا حسن ''مُسْتَضِیْء'' کے لقب سے خلیفہ بنا۔ وہ ایک نیک سیرت، بردبار، فیاض اور خوش قسمت حکمران تھا۔ بغداد میں امن و امان تھا، شعائرِ اسلامیہ زندہ تھے اور رفض دب چکا تھا۔ علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس نے عدل اور کرم کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اس کی نظیر ہم نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ اس نے بنو ہاشم اور علویوں کو بہت نوازا۔ علماء، مدارس اور خانقاہوں پر خوب خرچ کیا۔ خلیفہ مُسْتَضِیْء کو علماء سے بہت محبت تھی۔ علامہ ابن جوزی کی مجلسِ وعظ میں وہ عموماً شریک ہوتا تھا۔ علامہ اس کی اصلاح کے لیے خصوصی کلمات ارشاد فرماتے تھے۔ ③

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اس دور میں بغداد کے روافض اتنے پست ہو گئے تھے کہ گزشتہ اڑھائی سو سال میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ توہینِ صحابہ پر مشتمل تمام کتب تلاش کر کے تلف کر دی گئی تھیں۔ ④ اس دور میں خراسان میں غزنوی خاندان کی جگہ غوری حکمران چھا گئے جبکہ وسطِ ایشیا میں سلجوقیوں کی جگہ خوارزم شاہیوں نے لے لی۔

مصر میں بنو عبید کی حکومت کا خاتمہ۔ ایوبی سلطنت کا قیام:

۵۶۷ھ میں مصر کے ناظم صلاح الدین ایوبی نے مصر کی عبیدی حکومت کا خاتمہ کر کے وہاں خلافتِ عباسیہ کا خطبہ جاری کر دیا۔ یوں تین صدیوں بعد خلافتِ عباسیہ کا سایہ عراق، حجاز، شام، یمن اور مصر تک محیط ہو گیا۔ نور الدین زنگی کی وفات کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر کے ساتھ شام پر بھی قبضہ کر کے ''دولتِ ایوبیہ'' کی بنیاد رکھی۔ جو کئی عشروں تک خلافتِ بغداد کی خدمت گار اور نصرانیوں کے سیلاب کے آگے فولادی دیوار بنی رہی۔ ⑤

---

① البدایہ والنہایہ: ۱۶/۴۱۰؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۴، ۳۱۵ ② تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۱، ۳۱۲؛ البدایہ والنہایہ: ۱۶/۴۴۳
③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۶؛ المنتظم لابن الجوزی: ۱۸/۱۹۱، ۲۵۰ ④ تاریخ الاسلام للذہبی: ۳۹/۳۰، ت تدمری
⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۶؛ البدایہ والنہایہ: سنۃ ۵۷۱ھ، ۵۷۲ھ، ۵۷۳ھ

خلیفہ کی بیماری اور وفات:

مُستَضِیء بیمار ہو کر ۲۹ شوال ۵۷۵ھ کو وفات پا گیا۔ عمر ۳۹ سال تھی اور مدتِ خلافت نو سال تین ماہ رہی۔ ①

❁❁❁

اَلنَّاصِرلِدِیْنِ اللہ

احمد بن الحسن المستضیء

شوال ۵۷۵ھ تا رمضان ۶۲۲ھ (اپریل ۱۱۸۰ء تا اکتوبر ۱۲۲۵ء)

مُستَضِیء کے بعد اس کا ۲۲ سالہ بیٹا احمد ابوالعباس، الناصر لدین اللہ کے لقب کے ساتھ مسندِ خلافت پر براجمان ہوا۔ اس کی مدتِ خلافت ۴۷ سال رہی۔ اتنی طویل مدت کسی اور خلیفہ کو نصیب نہیں ہوئی۔ الناصر کا نظامِ خبر رسانی حیرت انگیز تھا، جس کے بل بوتے پر اس نے اپنے دشمنوں کا قلع قمع کر دیا اور اپنے خلاف بغاوت کرنے والے ہر ایک کو نیست و نابود کر دیا، اس کے جاسوس دنیا بھر کے درباروں کی خبریں اس کے پاس لایا کرتے تھے۔ ②

وہ ایسے باریک داؤ پیچ، پوشیدہ سازشوں اور چالوں کا عادی تھا جنہیں کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ دو دوست بادشاہوں کے درمیان دشمنی ڈال دیتا اور انہیں احساس تک نہ ہوتا۔ وہ دو دشمن حکمرانوں کو متحد کرا دیتا اور کسی کو خبر نہ ہوتی۔" ③

الناصر رعایا کے حق میں بدسلوک اور ظلم و ستم کی طرف مائل تھا۔ اس کے دور میں عراق ویران ہو گیا۔ شہریوں نے اس کا ملک چھوڑ دیا اور اس نے ان کی دولت اور جائیدادیں دبالیں۔ اس کے اقدامات باہم متضاد ہوا کرتے تھے۔ اس نے اہلِ بغداد پر عائد کچھ خاص ٹیکس ختم کیے، پھر انہیں دوبارہ لاگو کر دیا۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کے برخلاف شیعہ امامی مذہب کا قائل ہو گیا تھا۔ خلیفہ ناصر کے بعض وزراء بھی شیعہ تھے جو اسے ایسی حرکات پر ابھارتے تھے۔ ④

اس کے دور میں عاشوراء کے ماتمی جلوس جو ایک صدی سے زائد مدت سے بند تھے، پھر شروع ہو گئے اور شیعہ سنی فسادات بھی دوبارہ بھڑک اٹھے۔ ⑤

خلیفہ کی عالمِ اسلام کے مسائل سے بے اعتنائی:

الناصر کا دور اس لحاظ سے بے حد نازک تھا کہ ایک طرف صلیبی جنگیں چھڑیں اور دوسری طرف منگولیا سے چنگیز خان کی قیادت میں تاتاریوں نے حملہ کیا اور وسطِ ایشیا کو تودۂ خاک بنا دیا۔ مگر الناصر کی توجہ بغداد پر ہی رہی اور جہاد پر

---

① البدایہ والنہایۃ: ۵۴۰/۱۶

② تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۸

③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۸

④ مفرج الکروب لابن واصل: ۱۶۳/۳، ۱۶۴۔ ط المطبعۃ الامیریہ مصر

⑤ العبر فی خبر من غبر: سنۃ ۵۸۲ھ

اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ بلکہ اس کے برعکس اس کے دور میں معاشرے میں حربی فنون سے بے اعتنائی بڑھ گئی کیوں کہ خلیفہ ناصر کی توجہ کبوتر بازی اور نمود و نمائش کے کاموں پر تھی۔ یوں فنون حرب کے ماہر لوگ کم ہوتے چلے گئے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

"یہ سب حکومت کے زوال اور اس کے حکمرانوں سے حکومت چھن جانے کا پیش خیمہ تھا۔"①

ناصر پر فالج کا حملہ اور وفات:

زندگی کے آخری سالوں میں الناصر مفلوج اور بصارت سے محروم ہوگیا۔ وہ بستر سے زبانی احکام جاری کرتا تھا جنہیں ایک باندی تحریر کرکے مہر لگا دیتی تھی۔ آخری دنوں میں اسے پتھری کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ انجام کار شاہی طبیب نے مثانہ چیر کر پتھری نکالی۔ اس زخم کی تاب نہ لاتے ہوئے ۲۹ رمضان ۶۲۲ھ کو ۷۰ سالہ خلیفہ دنیا سے چل بسا۔②

صلیبی جنگیں اور تاتاری حملہ:

الناصر کے دور میں تاتاری عالم اسلام کے مشرقی حصے پر قبضہ کر چکے تھے جبکہ مغرب میں صلیبی جنگیں جاری تھیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھائی الملک العادل اور اس کے بعد اس کے بیٹوں: الکامل، المعظم اور الاشرف نے صلیبیوں سے شام و مصر کا بخوبی دفاع کیا مگر تاتاریوں سے جنگوں میں خوارزم کے بادشاہ علاؤ الدین محمد کو شکست ہوئی اور تاتاری آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس حملے نے ایشیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا اور ہر طرف تباہی پھیلا دی۔

(تاتاریوں کے عالم اسلام پر حملے اور خوارزمی سلطنت کی تباہی کی تفصیل جلد دوم میں ملاحظہ کیجیے۔)

الظاهر بامر الله

محمد بن احمد الناصر

رمضان ۶۲۲ھ تا رجب ۶۲۳ھ (اکتوبر ۱۲۲۵ء تا جولائی ۱۲۲۶ء)

خلیفہ ناصر کی موت کے بعد اس کا ۵۲ سالہ بیٹا محمد ابونصر، الظاہر بامر اللہ کے لقب کے ساتھ مسند نشین ہوا۔ وہ نہایت متقی، رحم دل، عابد و زاہد آدمی تھا۔ علامہ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے:

"اگر کہا جائے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ایسا نیک سیرت خلیفہ اور کوئی نہیں گزرا تو یہ سچ ہوگا۔"③

وہ سرکاری خزانے جو اس کے آباؤ اجداد نے جمع کیے تھے، اس نے غریبوں اور مستحق افراد پر بے دریغ خرچ کیے اور لطف و احسان سے سب کو گرویدہ بنا لیا۔ اپنے باپ کے برعکس وہ صحیح العقیدہ تھا اور پوری اُمت کے نفع و نقصان کو سامنے

---

① تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۸؛ تاریخ ابن خلدون: ۳/۶۶۰، ط دار الفکر؛ مفرج الکروب: ۴/۱۶۴، ۱۶۵

② تاریخ الخلفاء، ص ۳۱۷ تا ۳۲۳؛ الکامل فی التاریخ ۶۱۶ھجری تا ۶۲۳ھجری

③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۲۲ھجری

رکھ کر کوئی فیصلہ کرتا تھا۔ جہاد کو بڑی اہمیت دیتا تھا اور امت کے اتحاد کا داعی تھا۔ ①

تاتاریوں کا خطرہ بدستور موجود تھا مگر سلطان جلال الدین خوارزم شاہ نے بڑی پامردی کے ساتھ انہیں مزید پیش قدمی سے روکا ہوا تھا۔ الظاہر نے سلطان جلال الدین کی بڑی حوصلہ افزائی کی مگر بات مزید آگے نہ بڑھ پائی۔ ②

اس نیک سیرت انسان کو صرف نو ماہ چوبیس دن حکومت کا موقع ملا۔ ۱۴ رجب ۶۲۳ھ کو اس کی وفات ہوگئی۔

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں: ''جب سے الظاہر خلیفہ بنا تھا، تو زمانے کی پر آشوبی اور اہل زمانہ کا فسادی پن دیکھ کر مجھے اندیشہ لاحق تھا کہ اس کی حکومت مختصر ہوگی۔ اور میں اپنے بہت سے دوستوں سے کہہ چکا تھا: ''مجھے کس قدر خوف ہے کہ اس کا زمانہ مختصر ہوگا؛ کیوں کہ ہمارا دور اور آج کل کے لوگ اس کی خلافت کے مستحق نہیں۔'' پس ایسا ہی ہوا۔ ③

❁❁❁

اَلْمُسْتَنْصِرُ بِاللّٰہ

منصور بن محمد الظاہر

رجب ۶۲۳ھ تا جمادی الآخرہ ۶۴۰ھ (جولائی ۱۲۲۶ء تا دسمبر ۱۲۴۲ء)

الظاہر کے بعد اس کا چالیس سالہ بیٹا ابوجعفر منصور، المستنصر باللہ کے لقب کے ساتھ خلیفہ بنا۔ وہ خوش اخلاق اور نیک آدمی تھا اور علمی اور فلاحی کاموں کا شوقین تھا۔ ④ اس نے بغداد میں ایک عظیم درسگاہ ''المستنصریہ'' قائم کی جو ۶۲۵ھ میں شروع ہوئی اور ۶۳۱ھ میں مکمل ہوئی۔ اس میں تفسیر وحدیث کے ساتھ ائمہ اربعہ کی فقہ کی اعلیٰ تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ شعبہ علم طب میں ایک ماہر طبیب دس طلبہ کو طب کی اعلیٰ تعلیم دیتا تھا۔ طلبہ کو ہر سہولت مفت میسر تھی۔ ان کی غذا میں روٹی سالن اور گوشت کے علاوہ حلوے اور پھل بھی شامل تھے۔ انہیں جامعہ کے شفاخانے میں مفت علاج میسر تھا۔ جامعہ کا کتب خانہ نادر و نایاب کتب سے پُر تھا۔ وقف شدہ جاگیروں سے جامعہ کے اخراجات کے لیے بہت سی جاگیریں وقف تھیں۔ ⑤ مستنصر کو اس مدرسے سے ایسا لگاؤ تھا کہ اُس نے مدرسے سے متصل ایک نہایت دلکش باغ تعمیر کرایا جس میں ایک حویلی تھی۔ وہ اس کے جھروکوں سے اکثر مدرسے کی رونق دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ ⑥

رفاہی کام:

مستنصر تعمیری اور فلاحی کاموں کا شائق تھا۔ اس نے بہت سی مساجد بنوائیں، مزارات کی دیکھ بھال اور خدمت پر

---

① الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۲۲ ہجری

② سیرۃ سلطان جلال الدین النسوی: ص ۱۲۷، ۱۲۸

③ الکامل فی التاریخ: سنۃ ۶۲۳ ہجری

④ تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۵

⑤ تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۵، ۳۲۶؛ تاریخ الاسلام للذھبی: ۳۶/۵۳ ت تدمری

⑥ تاریخ مختصر الدول: ۱/ص ۲۵۳

توجہ دی، شاہراہوں پر سرائے خانے کھلوائے۔ ① کئی شفاخانے قائم کیے۔ ② اس دور میں بغداد خوب آباد ہو گیا تھا۔ ③

سلطان جلال الدین کا انجام:

مستنصر کے زمانے میں سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی قوت کم ہوگئی۔ آخر میں تاتاریوں کے ایک حملے کے بعد سلطان کا کوئی پتہ نہ لگا۔ مشہور روایت کے مطابق سلطان کو کردستان کے سرحدی لٹیروں نے تنہا پا کر قتل کر دیا جبکہ دوسری روایت کے مطابق سلطان درویشانہ لباس میں روپوشی کی زندگی بسر کرتا رہا۔ واللہ اعلم ④

عظیم الشان فوج:

مستنصر نے تاتاریوں سے حفاظت کے لیے عسکری شعبے کو مضبوط بنایا اور ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد گھڑسواروں کی فوج تیار کی۔ اس سے پہلے تین صدیوں میں بغداد میں اتنی بڑی فوج مرتب نہیں ہوئی تھی۔ ⑤

۱۰ جمادی الآخرہ ۶۴۰ھ کو مستنصر کا انتقال ہو گیا۔ ⑥

❁❁❁

اَلْمُسْتَعْصِم باللّٰہ

عبداللّٰہ بن منصور المستنصر

جمادی الآخرہ ۶۴۰ھ تا صفر ۶۵۶ھ (دسمبر ۱۲۴۲ء تا مارچ ۱۲۵۸ء)

مستنصر کے بعد اس کا بھائی ''خفاجی'' خلافت کا بہترین حق دار تھا۔ وہ بڑا اولوالعزم جرنیل تھا اور بغداد کی حفاظت کے لیے اس قدر پرعزم تھا کہ دریائے آمو عبور کر کے تاتاریوں سے دو دو ہاتھ کرنے پر آمادہ تھا۔ مگر ''خفاجی'' کی صلاحیتوں سے خود غرض امراء کو خدشہ تھا۔ ان ارکانِ دربار نے مستنصر کے ۳۱ سالہ فرزند عبداللہ ابواحمد کو خلیفہ مقرر کر دیا تاکہ اس کی نرم طبعی سے فائدہ اٹھا کر خود حکومت کریں۔ اس طرح ابواحمد ''مستعصم باللہ'' کا لقب لگا کر خلیفہ بن گیا۔ وہ عباسی خلفاء کا آخری چشم و چراغ تھا۔ وہ حافظ، دین دار اور نیک سیرت تھا مگر حوصلہ مندی اور فہم و فراست سے عاری اور مال و دولت جمع کرنے کا شوقین تھا۔ ⑦

---

① مرآۃ الزمان: ۲۲ ص ۳۷۶ ② تاریخ الاسلام للذهبی: ۳۵۳/۴۶، ت تدمری

③ تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۵، ۳۲۶ ④ تاریخ جہاں کشا جوینی: ۲ ص ۱۹۱؛ سیرۃ سلطان جلال الدین: ص ۳۴۶

ملحوظہ: سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کی جدوجہد کا ذکر قدرے تفصیل سے جلد دوم میں آئے گا جبکہ زیادہ تفصیلات کے لیے راقم کی تصنیف ''شیر خوارزم، سلطان جلال الدین اور تاتاری یلغار'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔

⑤ تاریخ الاسلام للذهبی: ۳۵۳/۴۶، ت تدمری؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۶ ⑥ تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۷

⑦ تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۸؛ البدایة و النهایة: ترجمة مستعصم بالله، سنة ۶۵۶ھ؛ طبقات الشافعیه للسبکی: ۸ ص ۲۶۳؛ سیر اعلام النبلاء: ۱۷۵/۲۳؛ تاریخ الخلفاء، ص ۳۲۸

قال ابن کثیر: ولکن کان فیه لین و عدم تیقظ و محبة للمال و جمعه۔ (البدایة والنهایة: ۱۷ ص ۳۶۶، ط دار هجر)

سقوطِ بغداد۔ خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ:

اس دور میں وسطِ ایشیا، خراسان اور ایران پر تاتاری قابض تھے۔ اُدھر مستعصم نے سادہ لوحی میں ابن علقمی نامی ایک غالی شیعہ کو وزیر بنا کر اُمورِ مملکت اُسی کو سونپ دیے تھے۔ ۶۵۵ھ میں بغداد میں شیعہ سنی فساد ہوا جس پر قابو پانے کے لیے سرکاری سپاہیوں نے کارروائی کی تو اس کی زد میں ابن علقمی کے بعض رشتہ داروں کے گھر بھی آگئے۔ اس واقعے سے مشتعل ہو کر ابن علقمی نے خلافتِ عباسیہ کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور ایران کے تاتاری حاکم ہلاکو خان کو خفیہ مراسلہ بھیج کر اسے بغداد پر قبضے کی دعوت دی۔ ہلاکو خان نے جواباً مطالبہ رکھا کہ پہلے بغداد کی فوج کو کم کیا جائے۔ چنانچہ ابن علقمی نے خلیفہ کو سمجھایا کہ بڑی فوج خزانے پر خواہ مخواہ کا بوجھ ہے، پس اسے کم کرنا مفید ہے۔ یوں مستعصم کو فریب دے کر ابن علقمی نے فوج میں کمی کا سلسلہ شروع کر دیا حتیٰ کہ بغداد میں دس ہزار سے بھی کم گھڑسوار بچ گئے۔ اب ہلاکو خان فوج لے کر نکلا اور محرم ۶۵۶ھ میں اس نے بغداد کو دو سمتوں سے گھیر لیا۔ بغداد کی فوج نے باہر نکل کر مقابلہ کیا اور ایک سمت سے تاتاریوں کو پسپا کر دیا مگر ابن علقمی نے فوج کے پڑاؤ کے قریب نہر کا بند کھلوا دیا جس سے خیمہ گاہ زیرِ آب آگئی اور فوج کی حالت اتنی بدتر ہوگئی کہ تاتاریوں نے اسے آسانی سے روند دیا۔

خلیفہ نے مایوس ہو کر ابنِ علقمی کو ہلاکو خان سے مذاکرات کے لیے بھیج دیا۔ اس نے واپس آکر خلیفہ کو بتایا کہ ہلاکو خان اس سے ملاقات کا خواہاں ہے اور انتہائی اعزاز اکرام پر آمادہ ہے۔ آخر خلیفہ شاہی اعیان اور علماء وفقہاء کے ساتھ ہلاکو خان کی خیمہ گاہ میں چلا گیا جہاں اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مستثنیٰ کر کے باقی سب کو قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد تاتاری فوج بغداد میں گھس گئی اور چالیس دن تک وہاں قتلِ عام کرتی رہی۔ پچیس لاکھ آبادی کے اس شہر میں لگ بھگ بیس لاکھ افراد قتل ہوئے جن کے خون سے دریائے دجلہ سرخ ہوگیا۔ اس کے بعد شہر بھر کے کتب خانوں سے لاکھوں کتابیں اٹھا کر دریا برد کر دی گئیں جن کی روشنائی سے کئی دن تک دریا کا پانی سیاہ رہا۔ ۱۴ صفر کو ہلاکو خان نے خلیفہ مستعصم کو بھی قتل کرا دیا۔ اس طرح خلافتِ بغداد کا خاتمہ ہوگیا۔ اس خاندان میں کل ۳۷ خلفاء گزرے۔ پہلا ابو العباس سفاح اور آخری مستعصم تھا۔①

(خلافتِ عباسیہ کے سقوط اور بغداد کی تباہی کی مزید تفصیلات جلد دوئم میں ملاحظہ کیجیے۔)

❁❁❁

① البدایہ والنہایہ: سنۃ ۶۵۶ھ؛ طبقات الشافعیہ للسبکی: ۲ص ۲۶۳؛ المنہل الصافی والمستوفی بعد الوافی از ابن تغری بردی: ۷ص ۱۳۸؛ تاریخ الخلفاء للسیوطی، ص ۳۲۸، ۳۳۲؛ سمط النجوم العوالی فی انباء الاوائل والتوالی للعصامی المکی: ۳ص ۵۱۹، ط العلمیۃ

عباسیوں کے زوال کے اسباب

قوموں کا عروج وزوال بے سبب نہیں ہوتا بلکہ اس کے پسِ پردہ بعض طاقتور عوامل ہوا کرتے ہیں۔عباسیوں کے زوال پر مؤرخین نے خوب بحث کی ہے اور بہت سے اسباب گنوائے ہیں۔ان کا مقصد عباسی دور کی علمی، فنی اور تمدنی خدمات کی نفی کرنا نہیں تھا مگر ان پہلوؤں کی ستائش کے ساتھ وہ اسبابِ زوال کو بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔چنانچہ ہمیں بھی بنوعباس کی خوبیوں کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف کرنے کے ساتھ اس پہلو کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ذیل میں بنوعباس کے زوال کے اہم ترین اسباب بیان کیے جارہے ہیں:

❶ جس طرح اُموی خلفاء نے خلافتِ راشدہ کے شورائی نظام کی جگہ سلطنت کو شخصی اور اقتدار کو موروثی بنادیا تھا اسی طرح بنوعباس نے جو احیائے سنت کا پرچم لے کر کھڑے ہوئے تھے، بنواُمیہ کے اسی شاہی نظام کی پیروی اُن سے بھی بڑھ کر کی۔اس بناء پر قصرِ خلافت میں خلفاء اور ممکنہ جانشینوں کو زہر دینے کے واقعات بھی پیش آئے۔کئی بار بات سازشوں سے بڑھ کر باقاعدہ جنگوں تک جاپہنچی۔متوکل علی اللہ اگر چہ بڑا قابل حکمران گزرا ہے جسے اشاعتِ سنت اور ازالۂ بدعات کے باعث ''محیّ السنۃ'' کہا جاتا ہے، مگر اس کا بھی یہ حال تھا کہ اس نے پہلے اپنے تین لڑکوں: منتصر، معتز اور مؤید کو یکے بعد دیگرے جانشین مقرر کیا مگر معتز کی والدہ قبیحہ خلیفہ کی چہیتی تھی جس نے متوکل کو مجبور کیا کہ وہ منتصر کی جگہ اس کے بیٹے معتز کو بخش دے۔اس عمل نے منتصر کو ایسا مشتعل کیا کہ اُس نے باپ کو قتل کروادیا۔جس بیٹے نے اقتدار کے لیے باپ کو نہ چھوڑا ہو، وہ بھائیوں کی کیا پروا کرتا۔چنانچہ اس نے اپنے بھائیوں معتز اور مؤید کو بھی ولی عہدی سے استعفاء دینے پر مجبور کردیا۔یہی وہ موڑ تھا جہاں سے عباسیوں کے زوال کا آغاز ہوا۔

❷ معتصم باللہ نے ہزاروں کی تعداد میں ترک غلام فوج میں بھرتی کیے جو چند برسوں میں سلطنت کے اہم عہدوں پر فائز ہوگئے۔انہی کی خاطر معتصم نے بغداد کو چھوڑ کر ''سامرا'' کو دارالخلافہ بنایا۔جب تک خلفاء کی ہیبت قائم تھی، ترک افسران باادب رہے مگر جب منتصر کے ہاتھوں متوکل کے قتل کے بعد مسندِ خلافت کا وقار پامال ہوگیا تو ترک افسران کے حوصلے بھی حد سے بڑھ گئے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے خلفاء کو معزول اور قتل کرنے کا سلسلہ شروع کردیا۔وہ جسے چاہے خلیفہ بناتے اور جب اُس سے ناخوش ہوتے تو اُتار کر دوسرے کو بٹھادیتے۔سب سے پہلے خود منتصر ان کی خفگی کا شکار ہوکر مارا گیا۔پھر معتز اور اس کے بعد مہتدی جیسا نیک سیرت خلیفہ بھی انہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

❸ معتضد نے آکر ترک اُمراء کا زور توڑ دیا اور ''سامرا'' کے قفس سے نکل کر دوبارہ بغداد کو زینت بخشی۔اس کے دور میں ایسا لگتا تھا کہ عباسیوں کا دورِ عروج لوٹ آیا ہے مگر افسوس کہ ایسے قابل خلیفہ نے بھی ولی عہدی کے معاملے میں وہی سنگین غلطی کی جو پہلے ہوتی رہی۔اس نے دو بیٹوں: مکتفی اور مقتدر کو یکے بعد دیگرے جانشین مقرر کردیا جبکہ اُسے خوب اندازہ تھا کہ مکتفی گلے کی گلٹیوں کے سبب زیادہ مدت زندہ نہ رہے گا اور مقتدر کو کم عمری میں

خلافت مل جائے گی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مقتدر انتہائی فضول خرچ ہے اور اقتدار ملنے پر خزانہ خالی کردے گا۔① مگر اس دوراندیشی کے باوجود معتضد کی شفقتِ پدری اس سے مانع رہی کہ وہ مقتدر کا نام ولی عہدی کی فہرست سے نکال دیتا۔ چنانچہ کم سنی میں مقتدر کو اقتدار ملتے ہی زوال کی رفتار پہلے سے بھی تیز ہوگئی۔

④ دورِ عروج کے عباسی خلفاء بھی سلطنت کے پیچیدہ اور دقیق کام وزیر کے لیے چھوڑ دیتے تھے اور خود صرف اہم فیصلے کیا کرتے تھے۔ مگر دورِ زوال کے خلفاء کا ہاتھ بٹانے کے لیے وزیر کے علاوہ خلفاء کی والدہ اور بیگمات بھی متحرک رہیں۔ بعض مواقع پر خواجہ سرا، غلام اور چہیتے خدام بھی خلفاء پر حاوی دکھائی دیتے ہیں۔ یوں خلیفہ کی حیثیت محض رسمی رہ گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر اس رسمی خلافت کو بنو بویہ نے مسلط ہو کر محض علامتی بنا دیا۔

⑤ بنوعباس نے اپنی فراخ دلی کے باعث نہ صرف ہر رنگ و نسل کے لیے ایوانِ سلطنت کے دروازے کھلے رکھے بلکہ اس کشادہ دلی کا حال یہ تھا کہ وہ بدعقیدہ لوگوں کو بھی اہم ترین عہدے دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہمیں بعض اَدوار میں سلطنت کا نظم و نسق متعصب شیعہ وزراء کے ہاتھوں میں دِکھائی دیتا ہے۔ یہ بھی تاریخ کی گواہی ہے کہ ان وزراء نے نمائشی اقدامات کے ذریعے ظاہراً تو سلطنت کی کچھ خدمت کی مگر اندر ہی اندر وہ اس کی جڑیں کاٹنے میں مشغول رہے۔ چنانچہ مامون کے وزیر فضل بن سہل، مستعین کے وزیر جعفر بن محمود اسکافی اور الناصر کے وزیر مؤید الدین قمی کی اس قسم کی سازشیں تاریخ میں مرقوم ہیں۔ آخر میں مستعصم کے وزیر ابن علقمی نے خلافت کی تباہی کا ایسا انتظام کردیا کہ سقوطِ بغداد جیسا مشکل ہدف منگولوں کے لیے آسان ہوگیا۔

⑥ بنوعباس کے دَورِ زوال میں بھی اکثر خلفاء نیک سیرت تھے اور معاشرے میں علماء و صلحاء کی کوئی کمی نہ تھی مگر زوال بڑھتا چلا گیا اور اسلام دشمن طاقتیں سیاسی منظرنامے پر حاوی ہوتی گئیں۔ دراصل کامیاب اسلامی حکومت کے لیے صرف حکمران کا اسلام پر عمل پیرا ہونا یا معاشرے میں علماء و صلحاء کی موجودگی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے عمومی دینی رجحان درکار ہے۔ اگر عوام میں دینی جوہر کمزور پڑ جائے تو نیک سے نیک حکمران بھی مطلوبہ اہداف حاصل نہیں کرسکتا بلکہ لوگ خود ایسے دیندار حاکم کے خلاف ہوجاتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اس دینی جوہر اور اسلامی رجحان کو "الوازع الدینی" کا نام دیا ہے اور اسی کو خلفائے راشدین کی کامیابی کی اصل وجہ قرار دیا ہے۔②

⑦ قدرتِ الٰہیہ کا ایک ضابطہ جسے تاریخ بھی ثابت کرتی ہے، یہ ہے کہ جسے جو کچھ ملتا ہے، وہ اس کے ظرف، استعداد اور صلاحیت کے مطابق ملتا ہے۔ جس سے جو چھینا جاتا ہے وہ اس کی کم ظرفی اور خراب استعداد کی وجہ سے چھینا جاتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں بنوعباس کی سیاسی استعداد اتنی خراب ہو چکی تھی کہ کوئی صورتِ اصلاح کامیاب نہ ہو پاتی تھی۔ پس مشیتِ الٰہیہ نے انہیں نشانِ عبرت بنا کر حکومت دوسری قوموں کو سونپ دی۔ سدا رہے نام اللہ کا۔

① المنتظم لابن الجوزی: ۱۳/ص ٦٦ ② مقدمہ ابن خلدون، ص ۲٦۳۔ ط دار الفکر

دورِ عروج کے عباسی خلفاء

نمبر	خلیفہ	دورِ حکومت	کردار	خاص انقلاب
۱	ابوالعباس سَفاح	۱۳۲ھ تا ۱۳۶ھ ۷۴۹ء تا ۷۵۴ء	سخت گیر، فیاض	عباسی خلافت کا قیام
۲	ابوجعفر المنصور	۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ ۷۵۴ء تا ۷۷۵ء	سخت گیر، کفایت شعار	باغیوں کی سرکوبی، بغداد کی تعمیر
۳	المہدی	۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ ۷۷۵ء تا ۷۸۵ء	نیک سیرت، فیاض، نرم	زندیقوں کا قلع قمع، قیدیوں کی آزادی، سخاوت اور مہربانی،
۴	الہادی	۱۶۹ھ تا ۱۷۰ھ ۷۸۵ء تا ۷۸۶ء	سخت طبع	برامکہ کا اثر ورسوخ بڑھ گیا
۵	ہارون الرشید	۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ ۷۸۶ء تا ۸۰۹ء	نیک، عادل، دلیر، سخی	علاقائی حکومتوں کے قیام کا آغاز
۶	امین الرشید	۱۹۳ھ تا ۱۹۸ھ ۸۰۹ء تا ۸۱۳ء	نیک، اعلیٰ نسب، ناسمجھ	ملک تقسیم، بغداد کا محاصرہ، مامون سے جنگ میں قتل
۷	مامون الرشید	۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ ۸۱۳ء تا ۸۳۳ء	ذہین، علم دوست، کج فکر	فلسفیانہ علوم، تشیع اور اعتزال کا دوردورہ
۸	معتصم باللہ	۲۱۸ھ تا ۲۲۷ھ ۸۳۳ء تا ۸۴۱ء	ان پڑھ، بہادر، جنگجو	ترکوں کا عروج، جہادِ روم
۹	واثق باللہ	۲۲۷ھ تا ۲۳۲ھ ۸۴۱ء تا ۸۴۷ء	نیک طبع، معتزلی	آخر میں اعتزال سے تائب ہوگیا
۱۰	متوکل علی اللہ	۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ ۸۴۷ء تا ۸۶۱ء	ابتداءً سنت کا شیدائی، بعد میں ناصبیت کی طرف میلان	معتزلہ وشیعہ کا زوال۔ بیٹے منتصر نے ترکوں کے ہاتھوں قتل کرایا۔

دورِ زوال کے عباسی خلفاء

نمبر	خلیفہ	دورِ حکومت	کردار	خاص انقلاب
۱	منتصر	۲۴۷ھ تا ۲۴۸ھ (۸۶۱ء تا ۸۶۲ء)	کمزور، جلد باز	ترکوں کا غلبہ۔ قتل ہوا
۲	مستعین	۲۴۸ھ تا ۲۵۲ھ (۸۶۲ء تا ۸۶۶ء)	کمزور، نیک سیرت	معزول اور پھر قتل ہوا
۳	معتز	۲۵۲ھ تا ۲۵۵ھ (۸۶۶ تا ۸۶۹ء)	کمزور، بدسیرت،	خراسان میں دولتِ صفاریہ اور مصر میں دولتِ طولونیہ کا قیام، قتل ہوا۔
۴	مہتدی	۲۵۵ھ تا ۲۵۶ھ (۸۶۹ء تا ۸۷۰ء)	نیک اور ہوشیار	باغیوں سے لڑتے ہوئے قتل
۵	معتمد	۲۵۶ھ تا ۲۷۹ھ (۸۷۰ تا ۸۹۴ء)	کمزور، بے اختیار	وسطِ ایشیا میں دولتِ سامانیہ کا قیام، صاحب الزنج کا فتنہ
۶	مُعتضد	۲۷۹ھ تا ۲۸۹ھ (۸۹۴ء تا ۹۰۲ء)	مضبوط اور ہوشیار	خلافت کی آن بان بحال
۷	مکتفی	۲۸۹ھ تا ۲۹۵ھ (۹۰۲ء تا ۹۰۸ء)	نیک اور متقی	قرامطہ سے کش مکش
۸	مقتدر	۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ (۹۰۸ء تا ۹۳۲ء)	کمزور، فضول خرچ	خواتین حکومت پر غالب، قتل ہوا
۹	قاہر	۳۲۰ھ تا ۳۲۲ھ (۹۳۲ء تا ۹۳۴ء)	ظالم وجابر	معزول اور قید ہوا
۱۰	راضی	۳۲۲ھ تا ۳۲۹ھ (۹۳۴ء تا ۹۴۰ء)	کمزور، بے اختیار	
۱۱	متقی	۳۲۹ھ تا ۳۳۳ھ (۹۴۰ء تا ۹۴۴ء)	کمزور، بے اختیار	اُمراء کی سرکشی، معزول اور قید
۱۲	مستکفی	۳۳۳ھ تا ۳۳۴ھ (۹۴۴ء تا ۹۴۶ء)	کمزور، بے اختیار	بنوبُویہ کا تسلط، معزول اور قید
۱۳	مطیع	۳۳۴ھ تا ۳۶۳ھ (۹۴۶ء تا ۹۷۴ء)	کمزور، بے اختیار	رومیوں کے حملے، مسلم شہر پامال
۱۴	طائع	۳۶۳ھ تا ۳۸۱ھ (۹۷۴ء تا ۹۹۱ء)	کمزور، بے اختیار	بنوبُویہ میں خانہ جنگی
۱۵	قادر	۳۸۱ھ تا ۴۲۲ھ (۹۹۱ء تا ۱۰۳۱ء)	ہوشیار۔ نیک۔ فقیہ	محمود غزنوی کا ظہور، بنوبُویہ کے مقابلے میں خلیفہ کی قوت بہتر

۱۶	قائم	۴۲۲ھ تا ۴۶۷ھ (۱۰۳۱ء تا ۱۰۷۵ء)	نیک سیرت، علم نواز اور خوش قسمت	سلاجقہ کا ظہور، بنو بُویہ کا خاتمہ، وقارِ خلافت بحال
۱۷	مقتدی	۴۶۷ھ تا ۴۸۷ھ (۱۰۷۵ء تا ۱۰۹۴ء)	نیک، سعادت مند	الپ ارسلان کی فتوحات
۱۸	مستظہر	۴۸۷ھ تا ۵۱۲ھ (۱۰۹۴ء تا ۱۱۱۸ء)	نیک سیرت	سلجوقی کمزور۔ سقوطِ بیت المقدس
۱۹	مسترشد	۵۱۲ھ تا ۵۲۹ھ (۱۱۱۸ء تا ۱۱۳۵ء)	بہادر، عوام کا محبوب	قتل ہوا۔ سلجوقیوں میں خانہ جنگی
۲۰	راشد	۵۲۹ھ تا ۵۳۰ھ (۱۱۳۵ء تا ۱۱۳۶ء)	کمزور، تیز مزاج	معزول اور قتل ہوا
۲۱	مقتفی	۵۳۰ھ تا ۵۵۵ھ (۱۱۳۶ء تا ۱۱۶۰ء)	نیک سیرت، مضبوط	دوسری صلیبی جنگ، خلافت مضبوط
۲۲	مستنجد	۵۵۵ھ تا ۵۶۶ھ (۱۱۶۰ء تا ۱۱۷۰ء)	نیک سیرت	نور الدین زنگی کا عروج اور جہاد
۲۳	مستضئ	۵۶۶ھ تا ۵۷۵ھ (۱۱۷۰ء تا ۱۱۸۰ء)	نیک سیرت	صلاح الدین ایوبی کا عروج، بنو عبید کا خاتمہ
۲۴	ناصر	۵۷۵ھ تا ۶۲۲ھ (۱۱۸۰ء تا ۱۲۲۵ء)	سخت گیر، سازشی، جاسوسی نظام قوی،	صلیبی جنگیں، خوارزم شاہیوں کا عروج، تاتاریوں کا عالم اسلام پر حملہ،
۲۵	ظاہر	۶۲۲ھ تا ۶۲۳ھ (۱۲۲۵ء تا ۱۲۲۶ء)	نیک سیرت	سلطان جلال الدین کی فتوحات
۲۶	مستنصر	۶۲۳ھ تا ۶۴۰ھ (۱۲۲۶ء تا ۱۲۴۲ء)	نیک، سخی، فلاحی کاموں کا شوقین	تاتاریوں کے خلاف مضبوط فوج کی تیاری
۲۷	مستعصم	۶۴۰ھ تا ۶۵۶ھ (۱۲۴۲ء تا ۱۲۵۸ء)	نیک، کم حوصلہ، ناسمجھ	غداروں کا غلبہ، ہلاکو خان کا حملہ، ابن علقمی کی سازش، سقوطِ بغداد

مشق

(برائے دورِ القائم تا سقوطِ خلافتِ بغداد)

سوالات کے جوابات دیجیے:

1. الپ ارسلان نے معرکۂ ملازکرد میں کس طرح کامیابی حاصل کی؟
2. نظام الملک طوسی کے کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
3. ''مُستَضِیء'' کے دور کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
4. خلیفہ مُقتَفِی کے دور میں عباسیوں کی آزادانہ حیثیت کیسے بحال ہوئی؟
5. مسترشد باللہ کی خوبیوں پر دس سطری نوٹ لکھیے؟
6. خلیفہ ناصر کا کردار کیسا تھا؟ عالم اسلام کو اس کے باعث کونسی مصیبتِ عظمیٰ کا سامنا کرنا پڑا؟
7. خلیفہ ظاہر کی سیرت پر مختصر نوٹ تحریر فرمائیے۔
8. مستنصر باللہ نے کونسی عظیم درسگاہ قائم کی تھی اور بغداد کے دفاع کے لیے اس نے کیا قدم اٹھایا تھا؟

عملی کام:

❁ عباسیوں کے اسبابِ زوال پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مذاکرہ کیجیے۔

❁ عباسیوں کے دورِ زوال کے تین علماء کے حالات کا مطالعہ کیجیے اور ان کے چند اہم اقوال اپنی بیاض پر لکھیے۔

کتب برائے مطالعہ:

❁ البدایۃ والنہایۃ: القائم تا مستعصم

❁ فی التاریخ العباسی والفاطمی، از احمد مختار العبادی، مطبوعہ دار النهضة العربية، بیروت

❁ دولة السلاجقة، از دکتور علی محمد الصلابی

❁❁❁

یادداشت

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

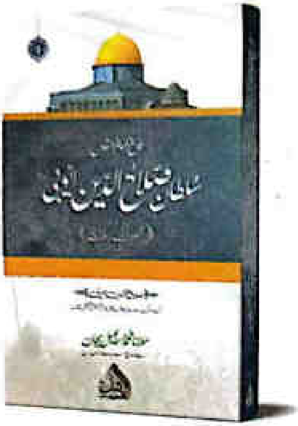
....

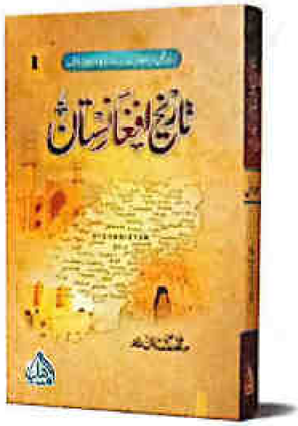
یادداشت

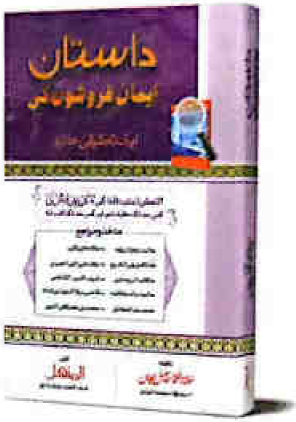


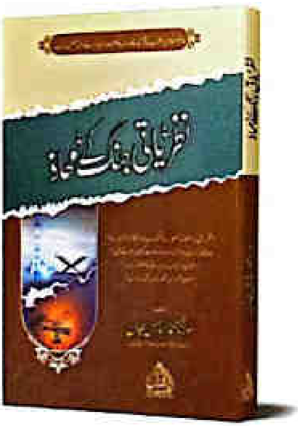


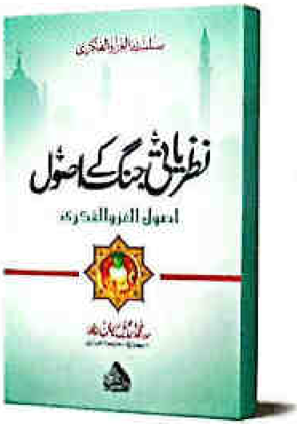





تاریخ افغانستان


داستان




نظریاتی جنگ کے اصول

